آجکل

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
نیپال
ہندوستان
عربستان
برما

جان بیرڈ -- آلۂ غیب بینی کا موجد۔

جان بیرڈ اپنے بنائے ہوئے ایک ٹیلی وژن ریسیور کے سامنے بیٹھے رنگین تصاویر دیکھ رہے ہیں۔ بعد جنگ کی منصوبہ بندیوں کے سلسلے میں برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ ایسے سیٹ ساڑھے چار پانچ سو روپے میں تیار ہو جایا کرینگے۔

آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے جب ٹیلیفون ایجاد ہوا اور لوگوں نے پہلے پہل کئی میل کے فاصلے سے اس نئے آلے کے ذریعے آواز سنی تو ایک شخص نے کہا۔ "بھائیو آج ہم تم میلوں پرے کی آواز اور بات چیت سن رہے ہیں۔ ایک دن ایسا آئیگا جب ہمیں میلوں پرے چلتے پھرتے آدمی اور ہلتی جلتی چیزیں گھر بیٹھے نظر آیا کرینگی"۔ اس بات میں محض امکان کی طرف اشارہ تھا لیکن کچھ عرصہ بعد اسکاجستانی نوجوان نے، جسکی تصویر اوپر شائع کی گئی ہے، اس بات کو واقعی ایک ٹھوس حقیقت کرکے دکھا دیا۔ جان بیرڈ پر مفصل مضمون اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۸ سے ملاحظہ کیجئے۔

K UNIVERSITY LIB
118232
17.12.75

لڑکیوں کی شادی کا ایک اچھا تحفہ

رضیہ کا شاہی دسترخوان
کھانا پکانے کی بہترین کتاب
قیمت ہے ر
علاوہ محصول

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری
کشیدہ کاری کا حسین مجموعہ
قیمت ہے ر — علاوہ محصول

رضیہ کے خطوط
زنانہ خطوط بطرز جدید
قیمت عمر

باپ کا خط بیٹی کے نام
باپ کی نصیحت
قیمت بارہ آنے

تازیانہ
دلچسپ ناول
قیمت ڈیڑھ روپیہ

فاطمہ رضؓ کا لال
شہادت حسینؑ پر رونگٹے کھڑے کر دینے والی کتاب
قیمت — ۱۲ر

پتھر سے ہیرا
اخلاقی ناول
قیمت عہ ر

چھالے
نئے افسانوں کا مجموعہ
قیمت ۳ ہے ر

مذکورہ کتابوں کا سیٹ ہے۔ پورے سیٹ کی قیمت سترہ روپے چار آنے ہے۔ پورا سیٹ منگانے پر محصول ڈاک وغیرہ معاف

نیا کتاب گھر اردو بازار (۱۷) سی، دہلی

ALLAMA IQBAL LIBRARY
118732

ہندوستان کا مستقبل

ڈاکٹر راجیندر پرشاد (سابق صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس) کی شہرۂ آفاق کتاب جس کا ایک عرصہ سے انتظار تھا شائع ہو گئی۔ اس کتاب میں ملک کے موجودہ سیاسی بحران کے سبب اور ہندو مسلم مسئلہ کے راز کا مصنف نے نہایت غائر اور عالمانہ تجزیہ کیا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی مؤرخانہ تحلیل اور ہندوستان کے سیاسی مسائل کی نہایت مخلصانہ انداز میں تفسیر کی گئی ہے۔ جو لوگ سیاست، تاریخ اور عہدِ حاضر کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری نہیں شرط لازم کی حیثیت رکھتا ہے۔ قیمت مجلد ساڑھے تین روپے۔

ہماری دوسری کتابیں

خطباتِ اقبال رح

یہ حضرت علامہ اقبال کے وہ خطبات ہیں جو مرحوم نے صدر کی حیثیت سے مختلف علمی و سیاسی مجالس میں دیے تھے اور علمی حلقے میں بڑی تلاش تھی۔ رضیہ فرحت بانو صاحبہ نے بڑی کاوش سے مرتب کیے ہیں۔ شروع میں جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز کا مقدمہ بھی ہے

قیمت مجلد:- ایک روپیہ چار آنہ

بیوہ منشی پریم چند (ناول) عہ/
ماہِ درخشاں بیگم احمد علی " ۲ ے/
شمیم فیاض علی " ۲ ے/
تصویر۔ اے آر خاتون " للعہ/
خونی اختر انصاری (افسانے) ۲ عہ/
واردات۔ منشی پریم چند " عہ/
آب گینے۔ اختر انصاری (قطعات) ۲ عہ/
تجلیات بہر عثمانی (غزلیں) عہ/
مسدس حالی صدی ایڈیشن ۲ عہ/
جاپانی شاعری سعید انصاری (ادب) ۲ ر/
خارستان آغا شاعر " ۲ عہ/
آبِ حیات کے لطیفے از محمد حسین آزاد ۱۲ ر/
مقالات مولانا اسلم جیراجپوری (ادب) ۲ عہ/

مضامین ابوالکلام آزاد۔ دوم (سیاسی) للعہ/
نئی تہذیب، نئی تعلیم۔ ترجمہ برکت علی فراق (تعلیم) ۲ عہ/
اٹھارہ مہینے ہندوستان میں۔ از جواہر لال نہرو (سیاست) ۲ ے/
غبار خاطر۔ از ابوالکلام آزاد (ادب) للعہ/
مضامین ابوالکلام آزاد اول (مذہب) للعہ/

پیتھک لارنس سے خطاب (سیاسی) ۳ ر/
اقبال کا نظریۂ پاکستان " ۶ ر/
تاریخ آزاد ہند فوج از منشی عبدالقدیر (تاریخ) ے ر/
لندن کے ہوائی حملے۔ از آغا محمد اشرف (معلومات) ۱۲ ر/
خیالِ آفریں دماغ تمثیل ۶ ر/
حسن حسینؑ (مذہب) ۷ ر/
اسلام کیسے شروع ہوا " ۲ ے/
اسلام کیسے پھیلا اول " ے ر/
" " " دوم " ۲ ۱۲ ر/
سامانِ آخرت (خواجہ غلام الثقلین) عہ/
اسلامی نظمیں از نیر صاحب ۱۰ ر/
وطنی نظمیں " ۱۳ ر/
سبھاش بابو کس طرح جاپان گئے ۲ عہ/

حالی پبلشنگ ہاؤس (بی)، دہلی

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ تصویری رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۷ | فہرست | یکم ستمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی۔اے (علیگ)، ایل۔ایل۔بی

نائب مدیران
راجندر ناتھ شیدا
ایم۔اے

فضل حق قریشی
دہلوی

مشیر احمد
ایم۔اے

ادارہ مطبوعات متحدہ
پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ دہلی

رفتار زمانہ

سفر حج اور ہوائی جہاز

اس سال تقریباً نو فیصدی حاجیوں کو ہوائی جہاز کے ذریعہ حجاز لیجانے کے انتظامات عمل میں آرہے ہیں۔ پہلا جتھا حج شروع ہونے سے تین ہفتے قبل جدّہ پہنچے گا۔ حج سے پہلے ہی ان حاجیوں کو زیارت مدینہ کرادی جائے گی اور حج ختم ہوتے ہی وہ واپس آجائیں گے۔ دوسرا جتھا حج شروع ہونے سے چند ہی دن پہلے جدّہ پہنچے گا۔ اس میں جانے والے حاجی حج سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ شریف کی زیارت کریں گے۔ ان کی واپسی تین ہفتے بعد عمل میں آئے گی۔ حکومت ہند نے ہوائی جہازوں کی کمپنیوں سے جہاز کرائے پر مانگے ہیں۔ یہ سفر صرف اسی وقت شروع ہوسکے گا جبکہ ہر پھیرے کے لئے پورے تینتیس۳۳ مسافر اپنی اپنی نشستیں مخصوص کرالیں۔ ہر حاجی کا کل خرچ جس میں آنا جانا شامل ہے تقریباً چار ہزار روپے ہوگا۔ ہر مسافر اپنے ساتھ پچاس پونڈ وزن لے جاسکے گا۔ دو سال سے کم عمر کے بچوں سے کرایہ کا دس فیصدی لیا جائے گا لیکن اسباب میں کوئی رعایت نہیں ہوگی۔ دو سال سے زیادہ عمر کے بچوں کو پورا کرایہ دینا ہوگا۔ انھیں علیحدہ سیٹ بھی مل سکے گی۔ پردہ نشین خواتین کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں ہوگا۔ سفر کا معیار بالکل وہی ہوگا جو عام یورپین مسافروں کیلئے ہوا کرتا ہے۔

ارجنٹائن کی مکئی

حال ہی میں ہندوستان کا خوراکی وفد دیوان چمن لال کی قیادت میں ارجنٹائن پہنچا ہے۔ خط و کتابت ہی کے ذریعہ تین لاکھ ٹن مکئی ہندوستان کے لئے خریدی جاچکی ہے۔ اس میں سے ساٹھ ہزار ٹن مکئی جہازوں پر لادے جانے کے لئے بندرگاہ پر موجود ہے صرف برآمدی لائسنس ملنے میں کسی قدر دشواری کا سامنا ہو رہا ہے۔ دیوان صاحب کا کہنا ہے کہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ارجنٹائن کی حکومت اس لائسنس کے جاری کرنے میں کیوں تاخیر کر رہی ہے۔ تاہم انھیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد اس مرحلے کو طے کرلیں گے۔ اور باقی دو لاکھ چالیس ہزار ٹن مکئی بھیجنے کا انتظام بھی ممکن ہوجائے گا۔ وہ اس ملک کی حکومت سے دوسری اشیائے خوراک خریدنے کے لئے بھی بات چیت کریں گے۔ ان میں چاول بھی شامل ہوگا۔

ان چیزوں کے تبادلہ میں سن کا کپڑا اور ٹاٹ وغیرہ دیا جائے گا۔ وفد مذکور جنوبی امریکہ جانے سے پہلے ایکویڈور سے بھی چاول خریدنے کی کوشش کریگا۔ ارجنٹائن میں غلے وغیرہ کی اس قدر بہتات ہے کہ لڑائی کے زمانے میں مشینوں کو چلانے کے تیل نہ ملنے کی صورت میں تقریباً بیس لاکھ ٹن مکئی اور چھیانوے ہزار ٹن گیہوں جلا دینا پڑا۔ لیکن اس سے اس ملک کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اناج بیچنے والی کمپنیاں بہت فائدے میں رہیں۔ نیز روشنی اور حرارت فراہم کرنے والے کارخانے بدستور کام کرتے رہے۔

جرمنی میں ہندوستانی

سرکاری ریکارڈ کے مطابق ننانوے ہندوستانی جنگ چھڑنے کے وقت جرمنی میں موجود تھے۔ ان میں سے اٹھتر اشخاص کا جائزہ لیا جاچکا ہے۔ اکھتر اب بھی جرمنی میں موجود ہیں۔ دو ڈنمارک میں ہیں اور باقی پانچ کا تبادلہ عمل میں آچکا ہے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ باقی لوگوں کا بھی سراغ مل جائے۔ اس سلسلے میں ایک وفد جس کے قائد میجر جنرل اسٹوورٹ ہیں۔ جرمنی میں تحقیق و تفتیش کر رہا ہے۔ اس کے ذمے تین اہم کام ہیں۔ اہل جرمنی کے ہتھکنڈوں کا مطالعہ کرنا خصوصاً اس اعتبار سے کہ دوران جنگ میں کن چالبازیوں کے ساتھ جرمن دستوں نے ہندوستانی دستوں کا مقابلہ کیا۔ ہندوستانی اسیران جنگ کو تلاش کرنا جو لاپتہ اشخاص کی فہرست میں شامل ہیں۔ اور ہندوستانیوں کو اپنے وطن یا کسی دوسری جگہ پہنچنے میں مدد دینا۔ نصف سے زیادہ ہندوستانی واپس آنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ باقی سہولت سفر نصیب ہوتے ہی وطن بھیج دئے جائیں گے۔ ان ہندوستانیوں کی قبریں جو جرمنی میں مارے گئے" سرفہرست لائی جارہی ہیں۔ فیصلہ ہوا ہے کہ ان کی یادگار قائم کرنے کے لئے ایک عمارت تعمیر کردی جائے۔ ان تین ہندوستانیوں میں سے جو دوران جنگ میں برلن سے اردو زبان کی تقریریں نشر کرتے تھے ڈاکٹر فاروقی اور مسٹر حبیب الرحمٰن برطانوی علاقے میں مقیم ہیں۔ ان پر کسی قسم کی سختی نہیں کی جارہی ہے سوائے اس کے کہ وہ ہر مہینے میں دو بار فوجی حکام کے سامنے آکر اپنی موجودگی کا

ثبوت پیش کرتے ہیں۔ مسٹر عبدالرؤف ملک سقوط المانیہ کے وقت برلن میں موجود تھے۔ لیکن اس کے بعد وہ لاپتہ ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسوقت سوئستان میں ہیں۔

انگریز عورتیں مردوں کے دوش بدوش

برطانیہ کی مقامی حکومتوں کے ہر شعبے میں عورتوں کی علمی سرگرمیاں بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ اس وقت وہ مردوں کے بالکل دوش بدوش ہیں۔ اکیس یا اکیس سال سے زیادہ عمر کی ہر عورت کو رائے دینے یا انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے حصّہ لینے کا حق حاصل ہے۔ پورے اعداد و شمار کا علم نہیں تاہم یہ یقین ہے کہ رائے دہندگی کے سلسلے میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں مجلس بلدیہ کا انتخاب ہوا تو لندن کے دس انتخابی علاقوں میں عورتوں کے چار لاکھ چونتیس ہزار اور مردوں کے تین لاکھ باون ہزار ووٹ تھے۔ ایسی مجالس کے اراکین میں بھی عورتیں اپنے قدم جمارہی ہیں۔ بلکہ کئی شہروں میں تو انھوں نے میئر تک کی حیثیت حاصل کر لی۔ مثلاً لورپول میں جو انگلستان کا چوتھا بڑا شہر ہے ایک ہی عورت نے دوبار "لارڈ میئر" کے عہدے پر کام کیا۔ اس میں شک نہیں کہ عورتیں ایسے عہدوں پر زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں کیونکہ شہری نظام کے بہت سے شعبے عورتوں ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کا عمل دخل دفتروں میں بھی بڑھ رہا ہے۔ اعلیٰ افسران کی اسامیوں سے لے کر معمولی محرروں تک وہ ہر جگہ چھا گئی ہیں۔ اسکی ایک خاص وجہ ہے۔ لڑائی چھڑ جانے پر مقامی حکومتوں کے ایک لاکھ پچاس ہزار میں سے تقریباً پچاس ہزار افسران میدان جنگ میں بھیج دئے گئے۔ قدرتی طور پر ان کی جگہ عورتوں نے لے لی۔ ان سرکاری ملازمتوں سے قطع نظر مختلف اقسام کے کاروبار میں بھی ان کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ انھوں نے ہر کام میں ہاتھ ڈال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ دماغی قابلیت اور جسمانی قوت، دونوں لحاظ سے مردوں کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

ایرانی کابینہ کے نو نکات

ایران کی نئی حکومت کے لائحہ عمل میں جو عوام کی فلاح و بہبود کے لئے مرتب کیا گیا ہے نو نکات خاص طور پر قابل ذکر اور اہم ہیں۔ وزیر اعظم قوام السلطنت نے اس سلسلے میں ایک اعلان حال ہی میں فرمایا ہے۔ وہ اہم نکات حسب ذیل ہیں:-

(۱) ملکی اقتصادیات کی تنظیم اور سرمایہ لگانے کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کرنا (۲) بجٹ کی رقم کے بہت بڑے حصّہ کو تعلیم، حفظان صحت اور زراعت کی ترقیوں کے ضمن میں صرف کرنا (۳) جمہوری اصولوں اور اقوام متحدہ کے میثاق کے مطابق قوانین ملک میں اصلاح کرنا (۴) ان لوگوں کو سزائے موت دینا جو سرمایۂ عوام کو ضائع کریں یا جو مسلح ہو کر لوٹ مار مچائیں (۵) باغیوں کو مناسب سزائیں دینا (۶) زمینداروں اور کسانوں کے مابین تعلقات استوار کرنا (۷) زراعتی طریقوں میں اصلاح اور کسانوں میں اراضیات تقسیم کرنا (۸) ملک کے نظام زر میں اصلاح پیدا کرنا۔ اور (۹) عوام کی فلاح و بہبود کے لئے دوسرے مفید کام انجام دینا۔

نیستی میں آٹا گیلا

اسوقت دنیا بھر میں خوراک کا مسئلہ ایک نازک صورت اختیار کر گیا ہے حتیٰ کہ وہ ممالک بھی جن کے پاس غلہ ہمیشہ فالتو مقدار میں جمع رہا ہے اور وہ اس سے دوسرے ملکوں کی مدد کرتے رہے ہیں اسوقت اپنے کھیتوں کے خزاں رسیدہ مستقبل کا اندازہ لگا کر کسقدر پریشانی ظاہر کر رہے ہیں ہر جگہ کوشش کی جارہی ہے کہ اناج کا ایک دانہ یا روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ضائع ہونے نہ پائے لیکن بعض دفعہ قدرت کا کھلنڈرا پن انسانی منصوبوں میں رخنہ ڈال دیتا ہے۔ حال ہی میں ایک اطلاع ملی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس اطلاع نے بڑی مایوسی پیدا کر دی ہے کہ امریکہ کا ایک جہاز جو امریکہ سے آٹھ ہزار ٹن سامان خوراک لے کر برطانیہ کی جانب روانہ ہوا تھا بحر الکاہل میں ایک دوسرے جہاز سے ٹکرا کر نذر امواج ہو گیا۔ نہ سامان بچا نہ سامان لے جانے والے۔ اس آٹھ ہزار ٹن سامان خوراک میں پانچ ہزار چار سو پچاسی ٹن گیہوں بھی شامل تھا۔ ہرچند یہ مقدار کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن موجودہ قحط کے زمانے میں اسے ایک نعمت سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں نیستی میں آٹا گیلا ہونا۔

ترکی کابینہ کا نیا دور

گذشتہ ماہ بالکل غیر متوقع طور پر ترکی میں سراج اوغلو کی وزارت نے استعفےٰ دیدیا۔ صدر جمہوریت عصمت انونو نے نئی کابینہ تیار کرنے کے لئے ایم پیکر کو دعوت دی جو کچھ عرصہ پہلے قومی مدافعت اور امور داخلی کے وزیر تھے۔ انھوں نے مئی ۱۹۴۳ء میں ناسازی طبع کی بنا پر اپنے عہدے سے استعفےٰ دیا تھا۔ انھوں نے صدر جمہوریت کا دعوت نامہ ملنے پر ارباب سیاست سے گفتگو شروع کر دی ہے۔ قیاس ہے کہ سراج اوغلو کی وزارت کا کوئی رکن نئی کابینہ میں شریک نہیں کیا جائے گا سوائے حسن سکا کے جو وزیر خارجہ تھے۔ ڈاکٹر سراج اوغلو کی وزارت کا نام "پیپلز ری پبلکن پارٹی" تھا اور اس کو ترکی کی قومی مجلس میں اکثریت حاصل ہے۔ ابھی دو مہینے ہوئے نئے انتخابات میں اس جماعت کے اراکین کو ۳۹۶ نشستیں حاصل ہوئی تھیں جبکہ مخالف جماعت کے صرف ۶۲ امیدوار منتخب ہو سکے۔ مخالف جماعت کا نام "ڈیموکریٹک" پارٹی ہے۔ یہ صورت صرف اسی سال پیدا ہوئی ہے ورنہ کمال اتاترک کے زمانہ سے صرف ایک ہی جماعت برسر اقتدار رہی اور اسی نے کثرت رائے کے ساتھ ترکی کی قسمت کے ہر معاملہ کا فیصلہ کیا۔ سراج اوغلو کے استعفے کے دوسرے ہی دن

صدر جمہوریت کا انتخاب عمل میں آیا۔ اکثریت کی بنا پر جنرل عصمت انونو ایک بار پھر صدر مجلس منتخب ہو گئے۔ اس سلسلے میں کبھی رائے دہندگی کی صورت صرف اسی سال پیدا ہوئی ورنہ یہ انتخاب ہمیشہ اتفاق رائے سے ہوا ہے۔ مخالف جماعت کے اراکین نے مارشل چقماق کے حق میں ووٹ دئے۔

چین اور ہندوستان میں تجارت

فروری ۱۹۴۶ء میں ہندوستان سے ایک تجارتی وفد چین گیا تھا۔ چھ ہفتے میں اس کے اراکین نے آٹھ ہزار میل کا ہوائی سفر کیا۔ اس اثنار میں اہم صنعتی مرکزوں کا دورہ کرنے کے علاوہ انھوں نے چین کے مشہور تاجروں اور سرکاری افسروں سے ملاقاتیں کیں۔ وہ جنرلیسمو چیانگ کائی شیک سے بھی ملے جنھوں نے ہندوستانی معاملات میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ وفد مذکور کا خیال ہے کہ اشیائے خام کی کمیابی اور ذرائع حمل و نقل کے نقدان کے باوجود یہ امید قائم کی جاسکتی ہے کہ مستقبل قریب میں چین اور ہندوستان کے مابین حسب سابق تجارتی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ شروع میں ان کا نو زیادہ نہیں ہو سکے گا لیکن یہ کمی عارضی رہے گی کیونکہ ہندوستان کی بہت سی چیزیں چین کے لئے ضروری ہیں۔ جرمنی اور جاپان کو ایک مدت طویل کے لئے چین کی منڈیوں سے نکال دیا گیا ہے۔ اب ہندوستان ہی چین کی ضروریات پوری کرسکے گا۔ یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ چین اور ہندوستان کے تعلقات کوئی نئے نہیں ہیں بلکہ یہ رشتہ صدیوں پہلے سے قائم ہے۔

دو ہزار سال پرانی لاش

مالبورو کے قریب علاقہ فالمڈین میں چند مزدور ایک کھائی کھود رہے تھے کہ اچانک ایک شخص کی لاش برآمد ہو گئی۔ ماہرین علم الاجسام نے تحقیقات کے بعد اندازہ لگایا کہ وہ شخص تقریباً دو ہزار سال پہلے زندہ تھا۔ اس کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا۔ مرنے کے وقت اس کی عمر تقریباً ستر سال تھی لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کے منہ میں پورے دانت موجود تھے۔ اس لاش کو دیکھ کر اس قدیم زمانے کے لوگوں کے قد و قامت، عمر اور عام جسمانی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ علمی تحقیقات کے سلسلے میں کوئی ایسی دریافت بیش بہا خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی سمجھی جاسکتی ہے۔

وھیل مچھلی کا شکار

دنیا بھر میں مختلف روغنوں اور چربیوں کی کمی محسوس کرتے ہوئے جنرل مک آرتھر نے جاپانیوں کو اجازت دیدی ہے کہ جنوبی سمندروں کی طرف جاکر وھیل مچھلی کا شکار دوبارہ شروع کردیں۔ انھوں نے ایک مختصر سا بحری بیڑا استعمال کرنے کا اختیار دیدیا ہے جس میں کارخانوں کے دو جہاز، وھیل مچھلی کے بارہ شکارے اور باربرداری کی سات کشتیاں شامل ہیں۔ یہ اجازت ماہ دسمبر سے ماہ مارچ تک کے لئے ہے۔ کیونکہ اس قسم کے شکار کے لئے یہی مناسب موسم ہے۔ اس مچھلی کا گوشت اور تیل کثیر مقدار میں صرف ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں چیزوں میں جزو بدن بننے کی زبردست صلاحیت ہوتی ہے۔ گوشت کا زیادہ حصہ جاپان ہی کی منڈیوں میں ختم ہو جائیگا البتہ اس کی چربی دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی بھیجی جائے گی۔ ان کا یہ دورہ تقریباً چھ ہزار میل کے دائرے میں لگے گا اور وہ مقررہ چار ماہ کے اندر بڑی تعداد میں مچھلیاں مار کر دنیا بھر کی ضرورت پوری کرسکیں گے۔

ہندوستان کی امداد کیلئے پرزور اپیل

ہم آجکل کے پچھلے شمارے میں امریکہ کے اس خوراکی وفد کی بابت اظہار خیال کرچکے ہیں جو غیر سرکاری طور پر غذائی صورت حالات کا مطالعہ کرنے ہندوستان آیا تھا۔ اب چند دن ہوئے اس کے ایک رکن مسٹر جوزف وکلن نے جن کو بہت قریب سے ہندوستان کے صحیح حالات کے مطالعے کا موقع ملا تھا، نہایت پرزور الفاظ میں حکومت امریکہ خصوصاً ورلڈ فوڈ کونسل سے اپیل کیا ہے کہ ہندوستان کو ۳۱ دسمبر سے پہلے پہلے ۲۰ لاکھ ٹن اناج لازمی طور پر مل جانا چاہئے۔ ان کا بیان ہے کہ اگر جلدی ہی اس امداد کا سلسلہ شروع نہ کیا گیا تو آئندہ رونما ہونے والا قحط ایک قومی سانحہ عظیم کی صورت اختیار کرے گا۔ مسٹر وکلن نے واشنگٹن کے موجودہ نظام کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اناج کاشتکاروں سے حاصل کرنے اور عوام میں تقسیم کرنے کے اتنے اچھے طریقے اختیار کئے گئے ہیں کہ اب ۱۹۴۳ء والے حادثۂ بنگال کی بازگشت کسی حصۂ ملک میں ممکن نہیں ہوسکے گی۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ یہ خبر سننے میں آئی ہے کہ ۱۳ اگست ۱۹۴۶ء کی شام کو چار بجے دنیائے ادب کے مشہور و معروف مصنف ایچ جی ویلز کا انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر ۷۹ سال تھی۔ موصوف کو عرصۂ دراز سے ذیابطیس کی شکایت لاحق تھی اور انجام کار یہی موذی مرض ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ سائنس، سیاست، تاریخ اور ناول نگاری کے میدان میں ویلز کو اتنا بلند مرتبہ حاصل تھا کہ ایسا سرزمین برطانیہ ان کا نعم البدل مشکل ہی سے پیدا کرسکے گی۔ انھوں نے غور و فکر کی ایسی نئی راہیں نکالیں کہ متمدن دنیا کا کوئی شخص بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مندرجہ بالا موضوعات پر انکی متعدد کتابیں موجود ہیں جن کا مطالعہ لاکھوں آدمی کرچکے ہیں۔ سینما کی دنیا میں انکی کہانیوں پر تیار کئے ہوئے کئی فلم بھی بے حد مقبول ہوچکے ہیں۔

حال و قال

سیماب اکبر آبادی

فسردگی یاس کی ہے دل میں شکستگی کا خیال بھی ہے
یہ آئینہ ماند ہی نہیں ہے اس آئینے میں تو بال بھی ہے

ہے سہل اس کا وصال لیکن، یہ حال ہی تو محال بھی ہے
تجھے تو ہے فکر ماسوا ابھی، تجھے تو اپنا خیال بھی ہے

عروج عالم ابھی ہے مشکل، عروج عالم محال بھی ہے
ابھی تو دنیا میں آدمیت ذلیل بھی پائے مال بھی ہے

نثارِ منزل میں کھونے والو! تمہیں کچھ اس کا خیال بھی ہے؟
تمہاری اس رہ گزار میں اک مسافر پائمال بھی ہے

ہے تیرا ہی آئینہ یہ انسان، تو کیوں اسی میں تجھے نہ دیکھوں؟
اسی میں تیرا جمال بھی ہے، اسی میں تیرا جلال بھی ہے

وہی تباہی ہے یا الٰہی، وہی ہے جینا وہی ہے مرنا
ہے داستانِ طویل دنیا، مگر کچھ اس کا مآل بھی ہے

تمہاری محفل میں باریابی، ہے قابل رشک کامیابی
اگر نہ ہو ناگوارِ خاطر تو حسرتِ عرضِ حال بھی ہے

فقیر مجھ کو سمجھ کے، خاموش بیٹھے، کیا منہ کو تک رہے ہو؟
زبان دی ہے تو یہ بھی پوچھو کہ تیرا کوئی سوال بھی ہے؟

خموش و سرگشتۂ تحیر نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے
جو تیری تصویر کی ہے صورت وہی تصوّر کا حال بھی ہے

وہ اک جمال لطیف و تنہا اور اس پہ ہنگامۂ تماشا!
خیال سب کو ہے اپنا اپنا، کسی کو اس کا خیال بھی ہے؟

وہ دل میں پیوستہ جلوہ گر ہو تو روح بھی اس سے بہرہ ور ہو
یہی تقرّب کا ہے خلاصہ یہی مرادِ وصال بھی ہے

خزاں ہے دیباچۂ بہاراں، ہے آخر شب سحر کا عنواں
زوال سے تو ہو کیوں پریشاں، زوال ہی میں کمال بھی ہے

ملال سے بھی تجھے خوشی ہو، اگر سمجھ لے یہ بات میری
خوشی میں تھا جو شریک تیری وہی شریک ملال بھی ہے

ہے سبزہ پژمردہ، میں ہوں آزردہ، آشیاں ہے شرار خوردہ
کلی فسردہ ہے پھول مردہ، چمن میں کوئی نہال بھی ہے؟

یہ نہر تسنیم و حوضِ کوثر، یہ صاف شیشے، یہ پاک ساغر!
یہاں کہیں خستہ و شکستہ ہمارا جام سفال بھی ہے؟

میں طور و موسیٰ کے دور ہی سے جلال کا آپ کا ہوں قائل
یہ صرف ہے پاس پردہ داری کہ اعترافِ جلال بھی ہے

میں اہلِ کردار بھی ہوں سیمابؔ، مرد گفتار ہی نہیں ہوں
یہ خاصّہ ہے مری غزل کا کہ حال بھی اور قال بھی ہے

جان بیرڈ

آلۂ غیب بینی کا موجد

مشیر احمد

سائنس نے فی زمانہ اسقدر ترقی کرلی ہے کہ کوئی بات ناممکن نہیں رہی ہے۔ اگر آج کوئی بات بظاہر ممکن نہیں بھی معلوم ہوتی تو کل وہی بات ایک امر واقعہ بن کر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے جب ٹیلیفون ایجاد ہوا تھا اور لوگوں نے پہلے پہل کئی میل کے فاصلہ سے اس نئے آلہ کے ذریعہ آواز سنی تھی تو ایک شخص نے کہا تھا: "بھائیو! آج ہم تم میلوں پرے کی آواز اور بات چیت سن رہے ہیں۔ ایک دن وہ آئے گا جب میلوں کی دوری پر چلتے پھرتے آدمی اور ہلتی جلتی چیزیں گھر بیٹھے نظر آیا کریں گی" اس بات میں محض ایک امکان کی طرف اشارہ تھا۔ ویسے نہ اس کہنے والے کو نہ سننے والوں کو یہ خبر تھی کہ کچھ ہی عرصہ بعد ایک اسکاچ نوجوان جان بیرڈ اس بات کو واقعی ایک ٹھوس حقیقت کر کے دکھا دے گا۔

ٹیلی ویژن کا موجد جان بیرڈ اسکاچستان میں بمقام ہیلینسبرگ پیدا ہوا۔ بیرڈ کے والد پریس بیٹیرین مذہب کے پیرو اور ایک گرجا میں پادری تھے۔ بیرڈ کو بچپن ہی سے سائنس میں خاص دلچسپی تھی اور وہ جس زمانہ میں مدرسہ ہی میں پڑھتا تھا اسکا دماغ ہر وقت سائنسی ایجادات و اختراعات میں لگا رہتا تھا۔ اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ اس نے خود اپنے ہاتھ سے ایک ٹیلیفون بنایا جسکے ذریعہ سے وہ اپنے چار ہم جماعتوں سے ان کے گھروں پر بات چیت کرسکتا تھا۔ ٹیلیفون رسیور اس نے اپنے سونے کے کمرے میں پلنگ کے پاس رکھا تھا اور عام طور پر یہ معصوم مگر ذہین بچے سونے سے پہلے بہت بہت دیر تک مزے مزے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ اس نے اس ٹیلیفون کے تار اپنے گاؤں کی سڑک پر (شاید درختوں سے) باندھے تھے۔ ایک روز رات کو ایک ایسا دلچسپ واقعہ پیش آیا جو بیرڈ کے لئے سخت ہمت شکن ثابت ہوا اور اس نے کچھ عرصہ تک کے لئے بیرڈ کی طفلانہ سائنسی سرگرمیوں کے سلسلہ کو منقطع کر دیا۔ بات یہ ہوئی کہ اس رات کو آندھی زور کی چلی اور بیرڈ کے ٹیلیفون کے تار اپنی جگہ سے اکھڑ کر ایک گاڑی بان کی گردن سے جو اس وقت ادھر سے گذر رہا تھا لپٹ گئے۔ گاڑی بان گاڑی سے نیچے گر پڑا۔ اگلے دن اس نے "نیشنل ٹیلیفون کمپنی" پر جو اسی زمانہ میں قائم ہوئی تھی ہرجانہ کا دعویٰ کر دیا۔ کمپنی نے تحقیقات کی تو بیرڈ کے ٹیلیفون کا حال معلوم ہو۔ چونکہ یہ کارروائی خلاف قانون تھی اسلئے بیرڈ کے اس ٹیلیفون کو اکھاڑ دیا گیا۔ اگر بیرڈ اسقدر کم عمر نہ ہوتا تو شاید اس کو زیادہ خمیازہ بھگتنا پڑتا۔

اسکول کے بعد بیرڈ نے رائل ٹیکنیکل کالج اور گلاسگو یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ اب بھی اسکا خاص مضمون سائنس ہی رہا۔ اس زمانہ میں اسکا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی پرانی مشین یا موٹر وغیرہ اونے پونے خرید لاتا تھا۔ اس پر خوب طبع آزمائی کرتا اور اپنے فطری جوہر کو جلا دیتا۔ کل پرزوں کی دنیا سے وہ اس قدر مانوس ہو گیا کہ اس نے یونیورسٹی کی تعلیم ختم کر کے موٹروں کے ایک کارخانہ میں بحیثیت ایک مستری کے ملازمت کرلی۔ اس ملازمت نے اس کو محنت و مشقت کا عادی بنا دیا۔ کیونکہ یہ کارخانہ صبح کے ساڑھے پانچ بجے کھل جاتا تھا اور وہاں رات تک کام کرنا پڑتا تھا۔ بیرڈ کو اکثر پو پھٹنے سے پہلے ہی گھر سے چل دینا پڑتا اور رات کو بہت اویر سے گھر میں گھسنا نصیب ہوتا۔ کچھ عرصہ تک اس کارخانہ میں مستری کا کام کرنے کے بعد اسکو "اسکاٹش الیکٹریسٹی کمیشن" کے ماتحت "کلائڈ ویلی الیکٹریکل پاور کمپنی" میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کی جگہ مل گئی۔ ملازمت کے کچھ ہی عرصہ بعد جنگ عظیم چھڑ گئی۔ بیرڈ نے ایک سچے محب وطن کی طرح اپنی خدمات فوجی ملازمت کے واسطے پیش کردیں۔ لیکن بیرڈ کی صحت اچھی نہ تھی اس لئے اس کو فوج میں ملازمت نہیں مل سکی۔ البتہ جنگ کے دوران میں وہ "پاور کمپنی" میں ملازم رہا اور اسی حیثیت سے ملک و قوم کی خدمت کرتا رہا کیونکہ کلائڈ کے اسلحہ جات کے کارخانوں میں بجلی اسی کمپنی سے جاتی تھی۔

صحت کی خرابی کی وجہ سے بیرڈ کو یہ ملازمت بھی ترک کرنا پڑی۔ اب پھر فرصت ملی تو اس نے سائنسی ریسرچ کے کام کی طرف پھر توجہ دی لیکن کمزور صحت کی بنا پر وہ زیادہ محنت نہ کرسکا۔ بیرڈ کا دماغ سائنسدان کے علاوہ ایک پکے تاجر کا ایسا بھی تھا۔ پچھلی جنگ کے بعد جب وہ بیکار تھا تو اس نے ایک ایسا موزہ ایجاد کیا جس میں ہر موسم میں پاؤں گرم و خشک رہ سکتے تھے۔ ان موزوں کا کاروبار خوب پھیلا اور بیرڈ نے بہت سا روپیہ کما لیا۔ کچھ تو روپیہ کی طرف سے بے فکری کچھ صحت کی خرابی اس بات کی محرک ہوئی کہ وہ اس تجارت کو چھوڑ دے۔ چنانچہ اس نے گلاسگو کے ایک بیوپاری کو اپنے موزوں کا کاروبار سونپ دیا۔ اب اس کو سفر کا شوق چرایا۔ روپیہ تو پاس تھا ہی جزائر غرب الہند کی سیاحت کو چلا گیا۔ وہاں سیر و تفریح بھی کرتا رہا اور آسٹریلیائی شہد کی تجارت بھی۔ اس کام میں بھی خوب منافع ہوا لیکن طبی مشورہ پر اس کو یہ کاروبار بھی چھوڑنا پڑا اور اگست ۱۹۲۱ء میں وہ واپس اپنے وطن آگیا۔ یہاں آکر اس نے صابون کی تجارت شروع کردی لیکن پھر ڈاکٹروں نے یہی مشورہ دیا کہ صحت کی خاطر کاروبار چھوڑ دینا چاہئے۔ بیرڈ نے اس کے بعد پھر کوئی کاروبار نہیں کیا بلکہ جب بھی صحت اجازت دیتی یہ اپنے سائنسی تجربات میں منہمک ہو جاتا۔

ٹیلی ویژن بنانے کی دھن ایک مدت سے متعدد سائنسدانوں کو لگی ہوئی تھی۔ جس زمانہ میں بیرڈ اسکول میں پڑھتا تھا مو تب بھی وہ اکثر اسکا چرچا سنتا رہتا تھا۔ لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اسے یہی معلوم ہوا کہ امریکہ اور یورپ کے سائنسدانوں میں سے کوئی بھی اس تمنا میں ایک

آگے نہ بڑھ سکا تھا اور اس سائنسی دریافت میں کوئی خاص ترقی اس وقت تک نہ ہوئی تھی۔ دوسرے سائنسدانوں کی ناکامی سے مایوس ہونے کے بجائے بیرڈ اور بھی مستعد اور کمربستہ ہو گیا۔ اس نے ہیسٹنگز میں ایک دکان کے اوپر کمرہ کرایہ پر لے لیا اور چند مہینہ تک رات دن اسی دھن میں لگا رہا کہ ٹیلی ویژن کا آلہ تیار کر لے۔ آپ کو یہ سن کر تعجب بھی ہوگا اور ہنسی بھی آئے گی کہ بیرڈ کا وہ آلہ جس نے اس کو کامیابی کی پہلی جھلک دکھائی تھی، چائے کے ایک پرانے صندوقچہ، بسکٹوں کے ایک خالی ڈبے، ایک ایسے لینس جو دس پنس میں آیا تھا اور بجلی کے ایک ایسے کھلونے پر مشتمل تھا جس کی قیمت چھ شلنگ سے بھی کم تھی۔ یہ بھدا اور مضحکہ خیز آلہ آج بھی ساؤتھ کینسنگٹن کے "سائنس میوزیم" میں محفوظ ہے۔ نہیں معلوم بیرڈ اپنی کوششوں کے تکمیل کے درجہ پر پہنچ جانے کے بعد جب اس آلہ کو دیکھتا ہوگا تو اس کے دلی جذبات کیا ہوتے ہوں گے۔

بیرڈ کے اس آلہ سے جو نتائج مرتب ہوئے وہ کچھ نئے نہ تھے کیونکہ امریکی سائنسدان جینکنس بھی اس منزل تک پہنچ چکا تھا لیکن اس آلہ کو اس لئے اہمیت حاصل ہے کہ اس سے پہلی دفعہ بیرڈ کو اپنی مساعی میں پوری پوری کامیابی ہوتی نظر آئی۔ اس نے ایک روشن مستقبل اپنے سامنے دیکھا۔ کامیابی کی سندر دیوی اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگی۔ بیرڈ کے اس تجربہ اور مشاہدہ کا حال جب اخبارات میں شائع ہوا تو سینما ٹوگرافی کے ایک کارخانہ کے مالک کو اس طرف دلچسپی پیدا ہو گئی۔ وہ شخص بیرڈ سے ملا۔ اس نے اس کے آلہ کو پرکھا اور پردہ پر نظر آنے والی تصویر کو دیکھ کر وہ بیرڈ کی ذہانت کا قائل ہو گیا اور اس کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ وہ ایک نہ ایک دن ایک مکمل ٹیلی ویژن بنانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ اس نے دو سو پونڈ کا ایک حصہ بیرڈ سے خرید لیا تاکہ اس سے بیرڈ کو مالی امداد مل جائے۔ ہیسٹنگز میں اس دکان پر جس کے اوپر کے کمرے میں بیرڈ نے اپنا پہلا آلہ بنایا تھا اس یادگار میں اب تک ایک بورڈ لگا ہوا ہے۔

پہلے پہل ٹیلی ویژن کے پردے پر صرف ایک پرچھائیں سی نظر آتی تھی۔ اس کے بعد روشنی کے عکس نظر آنے لگے۔ یہ ترقی کا اگلا قدم تھا۔ مزید تجربات کرنے کے لئے زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس جستجو میں بیرڈ لندن آیا۔ یہاں فرتھ اسٹریٹ (سوہو) میں اس نے ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ یہ جگہ وہ تھی جہاں قریب ہی کے ایک کمرے میں فریز گرین نے سینما ٹوگرافی کی پہلی مشین بنائی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب ایڈیسن کینیٹو اسکوپ بنانے کی دھن میں لگا ہوا تھا۔ بیرڈ لندن آ تو گیا لیکن اس وقت تک وہ اپنا کل اندوختہ خرچ کر چکا تھا اور اس کے پلے اب ایک پائی بھی نہ رہی تھی۔ کسی اہل زر کو اس کے کام میں دلچسپی نہ تھی کیونکہ کسی کو اس کی کامیابی کا یقین نہیں تھا۔ آخرکار مجبور ہو کر (بیرڈ کو اس زمانہ میں فاقے بھی کرنے پڑے تھے) اس نے اپنے احباب کے آگے دست سوال دراز کیا اور اس میں شک نہیں کہ انھوں نے کما حقہ اس کی امداد کی۔ تھوڑے سے سرمایہ سے ایک چھوٹی سی کمپنی قائم کی گئی اور پورے جوش و انہماک کے ساتھ بیرڈ نے ریسرچ کا کام از سر نو شروع کر دیا۔ اپریل ۱۹۲۵ء میں بیرڈ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ہلکے خاکوں اور بیرونی خطوط کی ترسیل میں تو کامیاب ہو گیا لیکن انسانی چہرہ یا کسی چیز کے رنگوں کی تدریجی کیفیت نہیں نظر آتی تھی۔ البتہ اکتوبر ۱۹۲۵ء میں یہ مہم بھی سر ہو گئی۔

اپنے تجربہ کے لئے بیرڈ کاغذ کی ایک مورت استعمال کرتا تھا۔ شروع شروع میں پردے پر اس مورت کی صرف ہلکی سی پرچھائیں نظر آتی تھی مگر اکتوبر ۱۹۲۵ء میں ایک روز سہ پہر کے وقت یہ مورت اپنی پوری تفصیلات اور رنگوں کی تدریجی کیفیتوں کے ساتھ نظر آگئی۔ بیرڈ کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ فوراً دوڑا دوڑا زینہ سے اتر کر نیچے سڑک پر آیا تاکہ مورت کی جگہ کسی آدمی کو بٹھا کر تجربہ کو پورا کرے۔ سب سے پہلا شخص جس کو نیچے سڑک پر نظر پڑا وہ نیچے والے دفتر کا چپراسی تھا۔ چپراسی ایک نو عمر لڑکا تھا اس لئے اپنے اوپر تجربہ کرانے کے واسطے بڑی مشکل سے تیار ہوا۔ بیرڈ نے اس کو اوپر کمرے میں لا کر ٹرانسمٹر کے سامنے بٹھایا اور خود دوسرے کمرے میں پردے پر اس کی شبیہ دیکھنے کے لئے چلا گیا۔ بیرڈ نے ہر چند آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن پردہ بالکل سپاٹ رہا۔ بیرڈ کو بڑی مایوسی ہوئی اور وہ اپنی ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اس کمرے میں آیا جہاں وہ لڑکے کو بٹھا کر گیا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اصل سبب کھل گیا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ لڑکا تیز روشنی کی تاب نہ لا کر ٹرانسمٹر کی طرف پشت کر کے اور زیادہ فاصلہ پر بیٹھ گیا۔ بیرڈ نے اس کی بڑی دلجوئی کی اور پورے طور پر اطمینان دلایا کہ اس کو ٹرانسمٹر کے آگے منہ کر کے بیٹھنے سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پھر بھی لڑکا ڈرتا ہی رہا۔ آخرکار بیرڈ نے اس کو ایک ہاف کراؤن دیا تب جا کر وہ مقررہ جگہ پر بیٹھا اور امید کے مطابق اس کا چہرہ دوسرے کمرے میں پردے کے اوپر صاف طور پر نظر آگیا۔ سائنسی تاریخ کا یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ وہ پہلا انسان جس کو ٹیلی ویژن کے ذریعہ دیکھا گیا رشوت لے کر اس کام کے لئے تیار ہوا تھا۔

تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اس لئے بیرڈ نے چاہا کہ ملک کے ماہرین سائنسدان اس کی ایجاد کو تنقیدی نظر سے دیکھیں۔ چنانچہ رائل انسٹی ٹیوشن آف گریٹ برٹین کو اس نے اس مقصد سے دعوتی رقعہ بھیجا۔ اس کی دعوت اس ادارے کے پچاس اراکین نے منظور کی اور وہ مقررہ دن بیرڈ کے کمرے پر آئے لیکن اس کمرے میں صرف چھ آدمیوں کی سمائی ہو سکتی تھی اس لئے ان پچاس اشخاص نے چھ چھ کی ٹکڑیاں جا کر بیرڈ کے آلہ کا مشاہدہ کیا۔ تجربہ واقعی کامیاب تھا اور جیتے جاگتے انسان کا چہرہ پردہ پر صاف طور پر نظر آرہا تھا۔ مڈلسیکس ہاؤس کے پرنسپل ڈاکٹر رسل نے اخبار "نیچر" میں اس مظاہرہ کے بارے میں لکھا "ہم نے پہلی دفعہ اصلی

ٹلی ویژن دیکھی ہے اور جہاں تک ہمیں علم ہے مسٹر بیرڈ پہلے آدمی ہیں جنہوں نے اس عجیب و غریب کام کو سرانجام دیا"

اس تجربہ کا عام مظاہرہ کئی بار کیا گیا۔ سب کو کامیابی کا یقین ہو گیا! اب روپیہ کی بھی کمی نہ رہی تھی۔ چنانچہ بیرڈ وہ تنگ کمرہ چھوڑ کر ایک بڑی وسیع جگہ چلا گیا جہاں تجرباتی سامان زیادہ سے زیادہ سما سکتا تھا پہلے تجربہ میں آدمی کی تصویر ایک سے دوسرے کمرے میں نظر آئی تھی لیکن دو سال بعد تصویر دو منزلوں کی دوری پر نظر آ گئی۔ پھر نہ صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا بلکہ ہونٹوں کی تمام حرکات صاف طور پر دکھائی دینے لگیں۔ بیرڈ کی کوششیں یہیں ختم نہیں ہوئیں بلکہ وہ برابر اسی دھن میں لگا رہا کہ آلہ میں زیادہ سے زیادہ قوت اور کمال پیدا کرے۔ چنانچہ فروری ۱۹۲۷ء میں ترقی کی یہ منزل آ گئی کہ جن لوگوں کی تصویریں نیویارک میں دیکھی گئیں وہ بالکل اصل کے مطابق تھیں اور دیکھنے والوں نے ان کو فوراً پہچان لیا۔ ایک اور دشوار گزار وادی اگلے سال طے ہو گئی جس سے معلوم ہوا کہ جہاز کی حرکات اور ہوا کی خلل اندازیاں بھی اس سلسلہ میں حارج نہیں ہوتیں۔ وہ اس طرح ہوا کہ جہاز "بیرنگاریا" کے وائرلیس آفیسر مسٹر براؤن نے اپنی منگیتر کو پردے پر دیکھ لیا جو اس وقت لندن میں ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلہ پر ٹرانسمٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔ اب تصویر میں رنگ بھی آنے لگے تھے۔

بیرڈ کی یہ شاندار کامیابی دیکھ کر امریکہ اور یورپ کے سائنسدان پوری تن دہی کے ساتھ اس طرف لگ گئے یہاں تک کہ بعضوں کو خیال ہونے لگا کہ اب برطانیہ اس دوڑ میں پیچھے رہ جائے گا۔ ۱۹۳۲ء میں بی بی سی سے ٹلی ویژن کا خاص پروگرام پابندی کے ساتھ ہونے لگا۔ مگر محسوس کیا گیا کہ کام زیادہ اطمینان بخش طریقہ پر نہیں ہو رہا ہے۔ اسلئے ۱۹۳۴ء میں ایک مجلس مشاورت مقرر ہوئی۔ اسکی کوششیں اگست ۱۹۳۶ء میں بار آور ہوئیں۔ حتیٰ کہ آج انگلستان کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ وہاں بہترین اور جدید ترین آلہ غائب بینی موجود ہے۔ برطانوی ٹلی ویژن کا مرکز مِلگز انڈ رابلیس ہے۔

اس ایجاد سے فارغ ہو کر بیرڈ نے "ٹلی ویژن ٹلی فلمز" کی ریسرچ کا کام شروع کر دیا تھا اسکی انتہائی ترقی اور تکمیل اسکے سامنے نہ ہو سکی "ٹلی ویژن" کو مکمل تشکیل ۱۹۴۱ء میں دیکھ چکا تھا ۱۹۴۴ء میں وہ ٹلی کرڈم بھی ایجاد کر چکا تھا۔ جان بیرڈ کی کوششوں احسانات اور خدمت خلق کے جذبہ کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ دنیا کو یہ مفید اور تفریحی آلہ دینے کے لئے جان بیرڈ نے رات دن ایک کر دیئے تھے۔ اسی دھن میں انہوں نے کئی کئی روز فاقے بھی کئے اور لوگوں کے آگے ہاتھ بھی پھیلایا۔ اس میں انکی کوئی ذاتی غرض پنہاں نہ تھی بلکہ اس کے پیچھے صرف خدمت خلق کا جذبہ کام کر رہا تھا۔ ری بیرڈ جسکا ٹلی فون بہ یک چشم زدن کمال بے رحمی کے ساتھ اکھاڑ کر پھینک دیا گیا تھا آگے چل کر ایک ایسی چیز کا موجد ہوا جس کو دنیا ہمیشہ ہمیشہ سراہتی رہے گی۔ جان بیرڈ کا انتقال اٹھاون سال کی عمر میں ۱۴ جون ۱۹۴۶ء کو بکس ہل کے مقام پر ہو گیا۔

بادِ شمال — خورشید الاسلام

جس پہ ہے آج ہمیں ریزۂ مینا کا گماں
یہ جہاں بادۂ گلرنگ کبھی تھا کہ نہیں
یوں تو ہمدم یہ جہاں خون بھی ہے سنگ بھی ہے
موجۂ خون رگِ سنگ کبھی تھا کہ نہیں
جس تلاطم میں ہے آواز مگر سوز نہیں
اس تلاطم میں بھی آہنگ کبھی تھا کہ نہیں

جو مرے شیشے میں باقی ہے وہ آنسو بھی نہیں
تیرے شیشے سے جو چھلکی تھی وہ مے کیا ہوگی
جو مرے ساز سے نکلی ہے نوا سے کم ہے
جو ترے ساز سے نکلی تھی وہ لے کیا ہوگی
نرم کرنوں میں لجاتی ہوئی نرگس کا خمار
اے مرے دیدۂ بے خواب وہ شے کیا ہوگی

نہ فسوں ہے نہ فسانہ نہ تسلی نہ فریب
تجھ پہ اے پیرِ مغاں ناز کریں یا نہ کریں
دل میں پرواز کی حسرت تو ہے اے جذبۂ دل
ہمنفس ہمتِ پرواز کریں یا نہ کریں
سر میں یہ دورِ قیامت ہے تو اے تشنہ لبی
پھر نئے دور کا آغاز کریں یا نہ کریں

خم کے خم پر ہیں خیالِ مے و مینا کے نثار
خم کے خم تر ہیں اِدھر بادِ شمال آتی ہے
میکدہ آج کفِ دست پہ نلپے تو کہیں
اس خرابے سے مگر بوئے جمال آتی ہے
لاؤ تیشہ کہ درِ میکدہ پھر باز کریں
میکشو آؤ کہ وہ جانِ وصال آتی ہے

آخری تاجدار اودھ کے منظوم خطوط

تاریخ شاہد ہے کہ انسانی فطرت کا اپنے ماحول سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ اور یہ ایسی حقیقت ہے جس کے لئے اب کسی مزید استدلال کی ضرورت باقی نہیں۔ اس لئے کہ چھان بین کرنے والوں نے جدید تحقیقات کی روشنی میں جو معلومات بہم پہونچائی ہیں وہ اس بات پر بالتصریح دلالت کرتی ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ طبقہ کا کوئی جز و بھی ایسا نہیں جو قدرت کے اس اٹل قانون کا پابند نہ ہو۔ یہ چیز دوسری ہے کہ ہمارا فطری رجحان اپنے میدان عمل میں اپنے مذاق کے مطابق ایک نئی شاہراہ اختیار کرلے لیکن اس امتیازی صورت میں بھی جو چیز سب سے پہلے ہمارا سہارا بنتی ہے وہ ہمارے گرد و پیش کے تاثرات ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہمارا ماحول ایک سانچہ ہے جس میں ہمارے ذوق سلیم کی تکمیل ہوتی ہے، ایک سرچشمہ ہے جس سے احساس لطیف سیراب ہوتا ہے، ایک پس منظر ہے جس کے اشارے پر زندگی رقص کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کسی ادیب کا ادبی کارنامہ۔ کسی شاعر کا شعر۔ کسی مصنف کی تصنیف یا کسی اہل فن کا فنی شاہکار تصویر ہوتی ہے ان تاثرات کی جن کی آغوش میں اس کی ذہنی قوتیں پرورش پاتی ہیں۔ اپنی انفرادی صلاحیتوں کے باوجود یہ کام اس کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ ان تاثرات سے دامن بچا کر نکل جائے۔ اس کے ہر لفظ میں اس کے گرد و پیش کی جھلک اور اس کے ہر نقش میں اس کے ماحول کی کارفرمائی موجود ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اسے بذات خود اس چیز کا علم نہ ہو لیکن یہ تاثرات غیر محسوس طریقہ پر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اس کی فطرت غیر ارادی طور پر ان سے اثر قبول کرتی رہتی ہے۔

سید اقبال عظیم

اس کلیہ کے پیش نظر جب وقت ہم آخری تاجدار اودھ یعنی سلطان عالم نواب واجد علی خاں اختر کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کے زندگی کے دو مختلف اور متضاد دور ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک روشن اور دوسرا تاریک۔ روشن دور کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب زندگی کی تمام رنگینیاں سلطان عالم کے قدموں پر سربسجود تھیں۔ یعنی تخت و تاج دولت و ثروت۔ جاہ و حشمت اور عز و وقار کے ساتھ ساتھ انہیں وہ سب کچھ میسر تھا جو شاہی اقتدار کا حصہ ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اس لئے کہ رنگ و شباب کے اس دور میں چہل رقص و سرود اور لہو و لعب کا بازار گرم تھا سلطان عالم نے اپنے فرائض منصبی کی طرف سے بھی آنکھیں بند کرلی تھیں تاکہ زندگی کا ایک واحد لمحہ بھی فکر و بے اطمینانی سے مکدر نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ ان کا وہ کلام جو اس دور کی پیداوار ہے شوخ و شاداب تو ضرور ہے لیکن بے اثر اور بے کیف ہے اس میں وہ ہوک نہیں جو دلوں کو تڑپا دے، وہ کسک نہیں جو روح کو بھڑکا دے۔ بقول حالیؔ۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں ... پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دلگداز تو

شعر اسی وقت شعر ہے جب اس میں سوز و گداز ہو، اور اس سوز و گداز کے لئے درکار ہے ایک دل دردمند جس میں ناکامی اور حرمان و یاس کی تڑپ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ سلطان عالم کی زندگی جس رنگین ماحول میں سانس لے رہی تھی وہاں ان چیزوں کا ذکر کہاں! نتیجہ لازمی طور پر وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی از ابتدا تا انتہا ان کا وہ کلام جو اس زمانہ سے متعلق ہے پھیکا اور بے مزہ ہے۔

لیکن زمانہ کی گردش کو اپنا کمال دکھانا مقصود تھا۔ وقت کا پانسہ پلٹا اور زندگی نے کروٹ لی۔ اودھ کی وہ پرکیف فضائیں جو گھنگروؤں کی جھنکار اور شیریں نغموں کی الاپوں سے گونج رہی تھیں یک بیک خاموش اور اداس ہوگئیں یعنی تاجدار اودھ نے ہمیشہ کے لئے تخت و تاج کو خیرباد کہا اور حاکموں کی صف سے نکل کر محکوموں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔ دل پر ایسا کاری زخم لگا کہ وہ درد و کرب کی شدت سے چیخ اٹھا اور یہ شعر پڑھتا ہوا باحسرت و یاس اپنے وطن سے رخصت ہوا

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں ... خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

یہ شعر گویا سلطان عالم کے اس دیوان کا مطلع اول تھا جو ان کی زندگی کے تاریک دور کے ہاتھوں مرتب ہوا۔ اب سلطان عالم شاہ اودھ نہ تھے بلکہ ایک شاعر تھے اور محض ایک شاعر اس لئے کہ اب ان کے سامنے عالم رنگ و بو کے بجائے محرومی و ناکامی کا ایک بحر ناپیدا کنار تھا اور ان کے دل میں وہ تڑپ تھی جو ایک شاعر سے شعر کہلواتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب ہمارے سامنے ان کا وہ کلام آتا ہے جو اس دور کی تصنیف ہے تو اکثر و بیشتر ہماری آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے۔

اس سلسلے میں ان کے کلام کا جو حصہ بالخصوص قابل توجہ ہے وہ

سلطان عالم کے وہ منظوم خطوط ہیں جو انہوں نے عالم غربت میں اپنی محبوب بیگمات کے نام لکھے ہیں۔ چنانچہ ان کی وہ شہرۂ آفاق مثنوی جس کا خطاب سیمتن کی طرف سے ہے اور جسمیں لکھنؤ سے لیکر کلکتہ تک کی دل ہلا دینے والی روداد غم بیان کی گئی ہے اپنی مثال آپ ہے۔ فن اور بیان کے لحاظ سے تو خیر اس کی جہاں تک تعریف کی جائے کم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں روانی، سلاست اور فصاحت اس بلا کی ہے کہ وہ اردو کی کسی اچھی سے اچھی مثنوی سے ٹکر لے سکتی ہے۔ تلخ حقائق کو شاعر نے تاثرات قلبی میں کچھ اس طرح حل کیا ہے کہ اس مثنوی کو ایک ادبی شاہکار تسلیم کرتے ہی بن پڑتا ہے۔ اگر سلطان عالم تقدیر کے ہاتھوں ایسی گہری چوٹیں نہ کھاتے تو شاید ان کا یہ کارنامہ کبھی عالم ظہور میں نہ آتا۔ اس خط کی ابتدا ملاحظہ ہو ؎

اے مری جان مونس و غمخوار — حال لکھتا ہے تیرا اختر زار
دل بھر آتا ہے خدا کی قسم — کیا ہی بیدست و پا ہوئے ہیں ہم
درد سر، لب پہ آہ، نالہ و زار — نہ کوئی دوست، نے شفیق، نہ یار
خوف صحرا و خار ہجر وطن — پھاڑے کھاتا ہے مجھکو سندر بن
جبسے آئے ہیں شہر کلکتے — دامن دل کے ہو گئے لتے
سیمتن تیری یاد میں واللہ — کھو گیا رو رو کے نور نگاہ
کبھی آنکھوں سے اشکباری ہے — کبھی یہ شعر لب پہ جاری ہے
اپنے اختر کی لے خبر جانی — کشتی دل ہوئی ہے طوفانی

اس جانکاہ سفر کے دوران نواب کو جن جن مصائب و مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ان کا دردناک بیان بالتفصیل اس خط میں منظوم ہے۔ کانپور میں جو مکان انہیں قیام کے لئے ملا تھا اس کا ذکر خود انہیں کی زبانی سنئے ؎

وہ برنٹن کا ایک بنگلا تھا — اپنی ٹوپی سے بھی تھا تنگ سوا
رات دن سیکے دم میں خطرۂ جاں — پاؤں پھیلے تو پھر عدم کو رواں
پارچہ ٹینے کا کہنہ سا چھپر — ساتھ سایے کے دھوپ ٹھیٹھ بہر
لوں کے جھونکے ہوائے گرم و تیز — جائے ماندن نہیں، نہ پائے گریز

گویا صاف شفاف پانی کا ایک چشمہ ہے کہ ابلتا چلا جاتا ہے۔ نادر تشبیہات، خوبصورت استعارات اور پھر محاورات فارسی کا اسقدر بے تکان صرف! اس قیام کے سولہ دن بعد جہاز کا سفر شروع ہوتا ہے۔ پڑھئے اور دیکھئے کہ جس نازک نواب نے کبھی پھولوں کی سیج اور مخمل و کمخواب کے فرش سے باہر قدم نہ نکالا تھا اپنی بدنصیبی کی بدولت کہاں سے کہاں پہونچتا ہے ؎

سولہویں دن جہاز پر بیٹھے — جل گس جا کے پانی پہ بیٹھے
کیا کہیں کیسے رنج و غم پائے — کیسے دورے فلک نے دکھلائے
آندھیاں وہ جہاز پر ان رات — نکلتی تھی منہ سے بھی کچھ بات

برق کا شور، رعد کا وہ زور — برق کی روشنی سے چشم تھی کور
دور تجھ سے جو سیمتن ہوں میں — مثل فرہاد کوہکن ہوں میں
لیلیٰ دلبر مہربانی کر — اپنے ہاتھوں سے کچھ نشانی کر

سلطان عالم کو زبان پر جو ملکہ اور قدرت حاصل ہے ہر ہر لفظ اس کا گواہ ہے۔ بالخصوص آخری دو شعر قابل صد تحسین و آفریں ہیں کہ شاعر نے کس خوبصورتی سے گریز کیا ہے یہ خلوص تخاطب اور یہ التجائے معصوم! سبحان اللہ!

غالب نے نثر میں خطوط نویسی کا ایسا نرالا ڈھنگ نکالا ہے کہ آج تک صحیح معنوں میں اس کی تقلید کسی سے نہ ہو سکی لیکن اب یہ بھی دیکھئے کہ سلطان عالم نے کس خوبی سے نظم میں اسی نثر کا لطف پیدا کیا ہے جو غالب کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہی سلیقۂ خطاب۔ وہی بے تکلفی۔ وہی روزمرہ اور وہی روبرو گفتگو کی چاشنی۔ معاملات حسن و عشق کو اس برجستگی اور سادگی سے نظم کرنا کچھ آسان کام نہیں ؎

باد رنج میں یہ حال پہونچا ہے — رونگٹوں تک ملال پہونچا ہے
ملکۂ سیمتن خدا کے لئے — خط لکھو، اتنو خوب لکھ دیئے
ایک پرچہ لکھا نہ اے گل تر — اپنے احوال کی بھی کی نہ خبر
کیا احوال آج کیسا ہے — دل لگا ہے، مزاج کیسا ہے
اپنے عاشق کو بھول جاتے ہیں! — اتنا پردیس میں ستاتے ہیں؟
جلد لکھکر جواب بھجوانا — اپنے اختر کے پاس پہونچانا

ایک دوسرے خط کا جو ملکہ امتیاز محل کے نام ہے آغاز یوں ہوتا ہے ؎

اے مری جان امتیاز محل — یاد کرتا ہوں میں تمہیں پل پل
خط جو آیا تو مہربانی کی — محضر عشق پر نشانی کی
دیکھکر اس کو دل ہوا خرم — اشک شادی مرے بہے پیہم
اس کی ہر بیت بیت ابرو تھی — سطر ہر ایک چشم آہو تھی

کچھ دور آگے بڑھ کر شاعر نے دو شعر ایسے لکھدئے ہیں جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے لاجواب ہیں ؎

گو ستاتے تھے ہم حسینوں پاس — پر بندھی رہتی تھی یہ طلب آس
پاس رہتی ہے وہ پری جہاں — جا ہی پہونچیں گے ایک پل میں وہاں

سب کچھ کہے جانے کے بعد سلطان عالم اپنی اس ملکہ کو دلاسا دیتے ہیں جو ان کی جدائی میں بےچین اور بیتاب ہے اور اس دلاسے میں اپنی تسکین قلب بھی منظور ہے۔ یہ وہ منزل ہے جب انسان پے در پے ناکامیوں کے بعد تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کا سہارا صرف وہ امید رہ جاتی ہے جو دم توڑ رہی ہے لیکن اس انتہائی مایوسی کے عالم میں بھی تقدیر سے جنگ جاری ہو ؎

درد دل کی ہمیں دوا سمجھو — مرض ہجر کو گیا سمجھو
کیا جدائی کبھی نہیں ہوتی — ہجر میں آنکھ کیا نہیں روتی
وصل بھی پھر نصیب ہوتا ہے — روئے جاناں قریب ہوتا ہے

(بقیہ بر صفحہ ۴۸)

برمیوں کے رنگ ڈھنگ

نریندر کمار

برما کے معاملات میں ہندوستانیوں کو بڑی گہری دلچسپی رہتی ہے۔ برما کی ترقی اور خوشحالی میں ہندوستان بڑے پرانے زمانہ سے برما کی امداد کرتا رہا ہے۔ ابھی کی بات ہے کہ ہندوستان نے اس کو جاپانیوں کے چنگل سے بچانے میں نمایاں حصہ لیا اور آج بھی یہ برما کی نئی تنظیم میں برابر اس کا مددگار بنا ہوا ہے۔ یہ بھی ایک قدرتی امر ہے کہ ہندوستان اپنی بعد از جنگ تدابیر کا مقابلہ برما کی تجویزوں اور خاکوں سے کرتا رہتا ہے کیونکہ آخر کار ان کی ایک دوسرے پر اثر اندازی لابُد ہے۔

اگرچہ برما کی سرزمین پر ساڑھے تین سال کی لڑائی کی تباہ کاریوں کے اثرات اب بھی موجود ہیں لیکن وہاں سیاسی بیداری اور حقوق کی مانگ بھی پیدا ہو چکی ہے اور بڑی حد تک اہل برما کے جائز مطالبات پورے بھی کئے جا رہے ہیں۔ سول حکومت کا قیام وہاں اکتوبر ۱۹۴۵ء میں ہو گیا تھا اور اب وہاں کی حکومت گورنر کے ہاتھ میں ہے اور وہ مجلس مشاورت اور مجلس آئین ساز کی مدد سے وہاں کا کام چلا رہا ہے۔ حالانکہ ۱۷ مئی ۱۹۴۵ء کے برطانوی قرطاس ابیض، کا منشا یہ تھا کہ ۱۹۳۵ء کے برما ایکٹ کا احیا دسمبر ۱۹۴۸ء میں ہو لیکن دارالعوام کے تازہ بل کے مطابق نئے انتخابات اپریل ۱۹۴۷ء میں ہو جائیں گے۔

برما کی سیاسی فضا

برما کی سیاست بڑی عجیب ہے۔ ایک طرف تو انتہائی ترقی پسندی نظر آتی ہے اور دوسری طرف ذاتیات کی بنا پر کشمکش اور تنازعات۔ برما کی موجودہ سیاسی جماعتوں میں فاشیت کی مخالف جماعت "پیپلز فریڈم لیگ" بہت نمایاں ہے۔ اس جماعت کے نوجوان لیڈر جنرل "اونگ سان" ہیں۔ اس جماعت کا خاص مطالبہ یہ ہے کہ برما میں فوری طور پر عارضی قومی حکومت قائم کر دی جائے اور آئین ساز مجلس کے اعیان وہ ہوں جنہیں جمہور انتخاب کریں۔ (۱۸ سال سے اوپر کے ہر مرد و عورت کو رائے دہندگی کا حق حاصل ہونا چاہیے)۔ یہ جماعت شروع ہی میں مجلس مشاورت اور مجلس آئین ساز کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی کیونکہ گورنر اس وقت اس مجلس کے تمام مطالبات ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس جماعت کے رویّہ میں اور بھی زیادہ شدت پیدا ہو گئی ہے۔ اس واقعہ سے کہ گورنر نے اس جماعت کے رضا کاروں کو فوجی پریڈ وغیرہ کرنے سے منع کر دیا۔ دوسری مضبوط جماعت سنیا تھا جماعت ہے جس کے خیالات مذکورہ بالا جماعت کے خیالات سے بہت ملتے جلتے ہیں لیکن یہ لوگ اب تک ڈاکٹر با مو ہی کے متعلق ہیں جو اب تک جاپانی قید میں ہیں۔ برما کی اشتراکی جماعت بھی کافی مضبوط ہے لیکن اس جماعت میں اندرونی طور پر بہت سے تفرقے ہیں۔

برما کا نیا بل

اس پس منظر کا خیال رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ۲۸ جون ۱۹۴۶ء کو جو بل پاس ہوا ہے اس سے آگے چل کر برما کی تمام سیاسی خواہشات پوری ہو ہی جائیں گی۔ اول تو یہی کہ دارالعوام میں مسٹر ہنڈرسن نے جو وعدہ کیا ہے اس سے امید پڑتی ہے کہ برما میں آئینی حکومت کے احیا کی تاریخ ڈیڑھ سال ورے آ گئی ہے۔ اپریل ۱۹۴۷ء میں نئے انتخابات ہو جائیں گے۔ تقریباً ہر بالغ برمی رائے دے سکے گا۔ اس سے برما کے رائے دہندگان کی تعداد تیس لاکھ کی بجائے ستر لاکھ ہو گئی ہے۔ وزارت انتخابات کی تابع ہو گی اور ایک آئین ساز مجلس قائم کر دی جائے گی۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسٹر ہنڈرسن نے کہا: "حکومت برطانیہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ برما میں کسی قانون کا نفاذ زبردستی کیا جائے"۔

یہ ظاہر ہے کہ برما کے دیہات میں شدت پسندی کا بہت زور ہے۔ مسلح ڈاکوؤں کے جتھے کسانوں کو ڈراتے اور لوٹتے پھرتے ہیں۔ برما کے قائم مقام گورنر سر ہنبری نائٹ نے کہا "ڈاکو برما کا سب سے بڑا دشمن ہے"۔ برما کی حکومت اس مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور اس ہم کا حل سوچ رہی ہے لیکن یہ ضرور کہا جائے گا کہ گزشتہ مارچ سے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔

ہندوستان کی امداد

برما کے مذکورہ بالا سیاسی حالات اور جرائم وغیرہ کی کثرت کی وجہ سے اس لئے برمی لوگ مثلاً زمیندار، کاشتکار، بیوپاری اور مزدور اقتصادی نئی تنظیم کے بڑے خواہاں ہو رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ پچھلے سال کی بہ نسبت اس سال بیس لاکھ ایکڑ زیادہ زمین جوتی اور بوئی جائے گی اور وہاں تقریباً بیس لاکھ ٹن چاول بچ رہے گا جس کی برآمد کی جائے گی۔ ہندوستان کی مدد سے اگلی فصل میں یہ مقدار اور بھی بڑھ سکتی ہے۔ آٹھ کروڑ کا برطانوی قرضہ جس پر کوئی سود نہیں لیا جائے گا۔ برما کو تنظیم نو میں کافی مدد دے گا۔ اس قرضہ کا کچھ حصہ ہندوستانی سکوں میں بھی تبدیل کیا جا رہا ہے تاکہ برما اپنی ضرورت کی اشیا ہندوستان سے

(بقیہ بر صفحہ ۱۸)

قاتلہ

افسانہ

مصنفہ
محمود کامل (مصری)

مترجمہ
صلاح الدین قریشی دہلوی

اسکندریہ کی فوجداری عدالت میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہزاروں آدمی خیریہ خانم فوزی کے مقدمے کی کارروائی دیکھنے کے لئے عدالت کے کمرے میں جمع ہو گئے تھے۔ خیریہ فوزی پر الزام تھا کہ اس نے پستول سے اپنے خاوند تسلیم بک فوزی کو عمداً قتل کر دیا ہے۔

اخبارات میں اس خبر کے شائع ہو جانے کے بعد لوگوں کا اس طرح عدالت میں جمع ہو جانا اور اس واقعہ کی اہمیت کا بڑھ جانا بالکل قدرتی امر تھا۔ اس سلسلے میں جو تفتیش ہوئی تو قطعی دلائل اور خود مقتول کے مختلف رشتہ داروں کے بیانات نے یہ ثابت کر دیا کہ ملزمہ کو اپنے خاوند سے بیحد محبت تھی۔ اسلئے یہ ناممکن سی بات ہے کہ وہ اسکے قتل کی مرتکب ہو یا اسے کوئی معمولی سی اذیت پہنچانے کا بھی خیال کرے۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ملزمہ لوہے کے کٹہرے میں آئی اور بالکل آخر میں حاکم کی میز کے قریب سر و قد کھڑی ہو گئی۔ اسکا چہرہ بالکل ستا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود حسن اور جوانی کے تیور دہی تھے۔ اسکی عمر تائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ لمبا قد، چھریرا جسم اور متناسب اعضا۔ وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے متعجبانہ انداز میں کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اسکا ہاتھ کبھی کٹہرے پر نظر آتا اور کبھی ایک چھوٹا سا رومال اس میں چھپنے لگتا۔ اس کی کنپٹیاں بار بار سختی سے دانت بھینچنے کی وجہ سے ابھرتی نظر آ رہی تھیں جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت اعصابی کشمکش اور روحانی الجھن میں مبتلا ہے۔

حاکم عدالت مع جیوری اور سرکاری وکیل کے کمرے میں داخل ہوا۔ ان لوگوں نے اپنا مخصوص لباس پہن رکھا تھا۔ ملزمہ انہیں دیکھکر لرز اٹھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت ضروری چیز کی تلاش میں ہے۔

لوگوں نے جب اسے رہ رہ کر دروازے اور وکیلوں کے بنچ کی طرف تکتے دیکھا تو اسکا مقصد سمجھ گئے۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ ملزمہ نے فوجداری مقدمات کے ماہر اور شہر کے مشہور وکیل عبدالرؤف بک سلام کو اپنا وکیل مقرر کیا ہے، لیکن وہ موجود نہیں تھے اور کہیں ان کا پتہ نہیں تھا۔

مجسٹریٹ نے پکارا:۔ خیریہ فوزی!

نوجوان ملزمہ نے دبی ہوئی گلوگیر آواز میں جواب دیا:۔ جی حضور!

اسی وقت استاد ابراہیم عدلی اپنی جگہ سے اٹھا اور اصل وکیل استاد عبدالرؤف بک کی طرف سے اچانک بیمار ہو جانے کی وجہ سے حاضر نہ ہونے کی معذرت کرتے ہوئے ملزمہ کی طرف سے خود پیش ہونے کی اجازت چاہی۔

ابراہیم عدلی اسوقت تک اکثر دوسرے نوجوان وکیلوں کی طرح مشہور تھا۔ عدالت کے کمرے میں جو لوگ موجود تھے انہوں نے جب ایک نوجوان کو جس کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہیں تھی ملزمہ کی طرف سے پیش ہوتے دیکھا تو ایک حد تک ناامید ہو گئے۔ اسکا رنگ گورا، بال سنہری اور آواز دھیمی تھی۔ شرم اور ہیبت اسکی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے لوگ ایک پرانے عمر رسیدہ وکیل کی امید پر بیٹھے تھے جو دور دور مشہور تھا۔ اس ناامیدی کا اثر سب سے زیادہ ملزمہ کے رشتہ داروں پر تھا۔ وہ لوگ لڑکی کے بری ہو جانے سے قطعی مایوس ہو چکے تھے۔ حالانکہ عبدالرؤف بک نے انھیں پورا یقین دلایا تھا کہ یا تو لڑکی کو بالکل بری کر دیا جائیگا یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کی قید کی سزا ہو سکے گی۔ لیکن نوجوان وکیل نے جب لڑکی کی طرف سے بحث شروع کی تو لوگوں کی مایوسی آہستہ آہستہ دور ہونے لگی یہانتک کہ بالکل ختم ہو گئی۔ بلکہ اس کے بجائے لوگوں کو مقدمے کی تفصیلات کے بارے میں اسکی باریک بینی اور صحیح سوجھ بوجھ پر ایک قسم کی حیرت ہونے لگی۔

اس نے خاص طور پر ان جذبات انگیز واقعات پر زور ڈالا جس سے مغلوب ہو کر ملزمہ نے اقدام قتل کیا تھا اور ساتھ ہی یہ چیز خصوصیت سے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قطعی دلائل سے یہ حقیقت بالکل صاف ہے کہ لڑکی کو اپنے خاوند سے بہت محبت تھی۔ اس کے ثبوت میں اس نے ان دونوں کے وہ عشقیہ خطوط پیش کئے جو شادی سے پہلے اور اس کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے تھے۔ ان تمام چیزوں سے یہ ثابت تھا کہ لڑکی اپنے خاوند کی رضامندی اور خوشی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو ہر وقت تیار تھی۔ اسکا خاوند تسلیم بک فوزی انجینیر تھا اور ایک غیر ملکی کمپنی میں ملازم تھا۔ کسی نہ کسی طرح دونوں کی ملاقات ہو گئی۔ لڑکی اس زمانے میں قاہرہ کے ایک انگریزی اسکول میں تعلیم پا رہی تھی یہ سلسلہ دونوں تک قائم رہا یہانتک کہ وہ دل دے بیٹھی اور اسکی محبت کا دم بھرنے لگی۔ آخر اس نے اپنے خاندان کی سخت مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔ شادی کے بعد وہ اسکے ساتھ اسکندریہ چلی آئی جہاں وہ ملازم تھا۔ یہاں وہ آٹھ سال تک اپنے خاوند کے ساتھ رہی۔ اس دوران میں اسکی محبت برابر بڑھتی رہی۔ وہ ہمیشہ ایسے کام کیا کرتی تھی جن کے متعلق وہ جانتی تھی کہ اس کے خاوند کو خوشی ہوگی، یہی نہیں بلکہ وہ ان فرائض کو بہت ہی خوش اسلوبی

سے انجام دیتی تھی تفتیش کے دوران میں اس قسم کا ایک عجیب واقعہ علم میں آیا۔ سلیم کا یہ معمول تھا کہ اکثر اتوار والے دن وہ شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔ وہ اکثر افسوس کیا کرتا تھا کہ بندوق نہ چلانے کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ اس کے ایک دوست کی بیوی، اپنے خاوند کے ساتھ برابر شکار کو جاتی ہے اور ایک حد تک ہر کام میں شریک رہتی ہے۔ خیریہ نے اپنے خاوند کو خوش کرنے کے خیال سے اسکا ریوالور لیا اور نشانہ کی مشق کرنے لگی۔ ایک دن وہ ریوالور میں کارتوس رکھ رہی تھی کہ وہ چل گیا اور اسکی پنڈلی میں بڑا سخت زخم آیا ایسا کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی......آہ! اسکا پیارا شوہر! لیکن خیریہ کی اس گہری اور خاموش محبت کا جواب کبھی نہیں ملا۔ ایک دوسرے کے ساتھ اتنا طویل عرصہ گزارنے کے بعد سلیم کا جی بھر گیا کچھ دنوں بعد وہ گھر کے کام کاج کے لئے قاہرہ سے ایک ملازمہ کو لایا جو اس کے والد کے یہاں ملازم تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور جب تک اس نے شادی کر کے گھر کے ترجیبری اپنی شرعی بیوی کی طرح اسے ایک دوستان میں آباد نہ کر لیا بیچاری خیریہ کو خبر تک نہ ہونے پائی۔

خیریہ نے بیوی کی حیثیت سے اپنی اتنی بڑی توہین ہونے پر بھی اس سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ اس کے باوجود وہ سلیم سے برابر محبت کرتی رہی! یہ چیز اسکے ایک خط سے ثابت ہوئی جو اس نے سلیم کی نئی بیوی کے گھر پر اس کے نام بھیجا تھا اور مرنے کے بعد اس کے کاغذات میں سے نکلا۔ اس میں لکھا تھا:-

"......سلیم پیارے میں تم سے اب بھی محبت کرتی ہوں...... میں ان لمحوں کو کبھی نہیں بھولوں گی جو میں نے تمہاری حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گذارے ہیں میں تم سے ناراض ہونا نہیں چاہتی۔ میرا اب یہ حق نہیں ہے کہ تمہیں زبردستی اپنے سینے سے لگاؤں۔ یہ حق اب ایک دوسری عورت کے حصے میں آ چکا ہے۔ میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ تمہیں اس انتخاب میں ذرا سمجھ سے کام لینا چاہئے تھا ویسے بھی تمہیں میرے گھر والوں کی مخالفت کا حال معلوم ہی ہے...... تم نے جو مجھے تکلیف پہنچائی ہے میرے نزدیک اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ تمہارا اپنا فعل ہے میں تم سے اس سلسلے میں معذرت چاہتی ہوں۔ اسلئے کہ ہر مرد کی روح میں ایک ایسا گوشہ ضرور ہوتا ہے لیکن میں تو اب بھی تم سے محبت کرتی ہوں اور جب اپنے پیارے بچے شکری کی آنکھوں کو دیکھتی ہوں تو بے اختیار تم یاد آ جاتے ہو...... کیا تم کبھی آنے کی تکلیف گوارا نہیں کرو گے؟ ہمیں اس معصوم ننھے بچے کے مستقبل کا کوئی انتظام کرنا ہے۔"

ظالم شوہر نے اس عاجزانہ درخواست کو قبول کر لیا اور خیریہ نے اس سے اپنے لڑکے شکری کے متعلق کچھ باتیں کرنی چاہیں۔ اس نے جب یہ کہا کہ شکری کو اسکا آخری سہارا سمجھ کر اسی کے پاس چھوڑ دیا جائے تو سلیم نے بڑی سختی کیساتھ جواب دیا:-

"میں اپنے لڑکے کو ایک مطلقہ عورت کے پاس چھوڑنا نہیں چاہتا۔"

خیریہ نے اس سے دریافت کیا:- "کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ ایک ملازمہ اسکی تربیت کرے؟"

سلیم نے اٹھتے ہوئے جواب دیا:- "وہ اب میری بیوی ہے، میں اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔"

اس نے سلیم کا دامن پکڑ لیا اور چلّانے لگی: "لیکن مجھے میرا لڑکا چاہئے ......میں اسے کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی ...... پیارے فوزی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔"

سلیم نے زبردستی اس کو فرش پر دھکیل دیا آنسو برابر اسکی آنکھوں سے جاری تھے۔ دروازے کی طرف رُخ کرتے ہوئے اس نے جواب دیا:-

"وہ تجھ سے زیادہ بہتر ہے!"

اس کے بعد ہی اسکا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف بڑھا اس نے فائر کیا گولی پیٹھ پر لگی اور وہ وہیں گر پڑا، ساتھ ہی خیریہ بھی اس کی لاش کو چومتی ہوئی اور اس کے خون سے اپنا چہرہ رنگتی ہوئی اس کے پہلو میں گر پڑی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور شور مچا رہی تھی......

لوگوں کو نوجوان وکیل کی بحث کے دوران میں ان تمام واقعات کا پتہ چلا اور ہر شخص کو خواہ مخواہ اس سے ہمدردی ہو گئی۔ ان واقعات کا علم ہو جانے کے بعد لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ وہ قاتلہ نہیں بلکہ دیوانی ہے!

سرکاری وکیل کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ یہ جرم جذبات سے مغلوب ہو کر سرزد ہوا ہے اور اس اعتبار سے یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی طرف فرانس میں خاص طور پر توجہ دی جاتی ہے اور اکثر بری کر دیا جاتا ہے۔ اسکا خیال تھا کہ اس وقت مصر کی موجودہ سوسائٹی بھی کچھ ایسے ہی حالات سے گذر رہی ہے۔ آخر میں اس نے عدالت سے درخواست کی کہ ملزمہ کو جو حالات درپیش تھے انہیں ضرور سامنے رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مختلف دلائل سے جرم کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور ملزمہ کو ایک قاتلہ کی حیثیت سے سزا دینے کی طرف توجہ دلائی۔

عدالت جیوری سے مشورہ کرنے کی غرض سے برخاست ہوئی اور تھوڑی دیر بعد خیریہ فوزی کو چھ مہینے کی سزا کا حکم سنا دیا گیا فیصلے میں ان مختلف حالات کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا گیا تھا جو ملزمہ کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنے کے متقضی تھے۔

خیریہ عدالت کے کٹہرے سے سنسنی خوشی نکلی چونکہ وہ اب پھانسی کی کال کوٹھری سے بچ کر نکل آئی تھی۔ وہ اپنے وکیل کی طرف شکریہ ادا کرنے کے خیال سے بڑھی اور اسے بتایا کہ اپنی زندگی کے لئے وہ ہمیشہ اسکی کوششوں کی احسان مند رہیگی۔

خیریہ اس نوجوان وکیل کے متعلق سوچتی ہوئی گھر آئی اور دیر تک اس راز پر غور کرتی رہی جس نے ابراہیم عدلی کو ایسے عجیب طریقے پر اسکی وکالت کرنے پر مجبور کیا...... ادھر ابراہیم عدلی بھی خیریہ کے مقدمے کا فائل جسمیں

اس عشق و محبت سے لبریز واقعہ کی تفصیلات، مقتول شوہر کے نام اس کے محبت بھرے خطوط، اسکی فطرت کی باریک سے باریک حقیقتیں، اور عشق و جنون سے گرمائے ہوئے جذبات، یہ سب چیزیں لپٹی ہوئی تھیں جو اپنی بغل میں دبائے گھر آیا۔

وہ دیر تک اس عورت کے متعلق سوچتا رہا جس کے مقدمے نے اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک غیر معمولی درجہ حاصل کر لیا تھا..... آہستہ آہستہ وہ اس مقتول شوہر کی حالت پر ایک قسم کا رشک کرنے لگا جو ایک زمانے میں اس نعمت سے مالامال تھا جسکی کہانی کے مختلف اجزاء اس کے سامنے کھلے ہوئے فائل میں بکھرے پڑے تھے۔ اچانک اسے اس گہری حقیقت کی جھلک نظر آئی جو اس کی روح کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی..... اس نے سمجھ لیا کہ خیریہ کے مقدمے میں اسقدر جانفشانی اور جیل کی کال کوٹھری سے بچا لینے کے لئے اسکی یہ تمام جدوجہد صرف اس لئے تھی کہ وہ — صرف وہ اسے اپنا بنا سکے۔

⁂

دن گزرتے گئے۔ خیریہ خانم اپنی ضمانت کی رقم کے سلسلے میں کئی مرتبہ عدلی کے دفتر میں آئی..... عدلی کے سینے میں بھی بعض دوسرے نوجوانوں کی طرح جذبات کا شعلہ بھڑک رہا تھا۔ ادھر خیریہ خانم کے دل کا زخم بھی اس منحوس حادثہ پر کافی عرصہ گذر جانے کے بعد آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا..... چنانچہ عورت اور مرد کی محبت کے پرانے قصے کے تار و پود پھر نئے سرے سے بنے جانے لگے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی اور نتیجے کے طور پر ان کی شادی ہو گئی۔

ابھی کچھ دن گزرنے نہ پائے تھے کہ مصیبت کی گھٹائیں پھر گھر گھر کر اٹھنے لگیں۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ جب خیریہ کے لئے سکون و اطمینان کے اسباب مہیا ہوں پریشانیاں اسکو ہر طرف سے گھیر لیں۔

یوں تو خیریہ سے شادی کر لینے کے بعد ابراہیم عدلی کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس سے واقعی محبت کرتی ہے اور اس کو اس سلسلے میں ذرا بھی شک نہیں تھا... لیکن اس کے ساتھ ہی وہ محسوس کرتا تھا کہ یہ محبت بالکل بیجان، بیحد سنجیدہ اور کچھ گھٹی گھٹی سی ہے۔ ایک ایسی محبت جو اس محبت سے بالکل مختلف تھی، جسکا اظہار وہ اپنے پہلے خاوند سے کیا کرتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ عدلی اپنی لائبریری کے دروازے بند کر کے اپنی بیوی کے مقدمے کی فائل کو بار بار پڑھا کرتا تھا اور رشک و حسد کے شعلے اس کے سینے کو جھلسائے دیتے تھے۔ وہ اپنے مقتول شوہر کو کیسے کیسے خط لکھا کرتی تھی اور کس کس طرح اسے خوش کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی! اس نے اپنے خاوند کے ساتھ کیسے کیسے خاص انداز میں فوٹو کھنچوائے تھے۔ ہر فوٹو سے اپنے خاوند کے لئے اسکی شدید محبت کے جذبات ٹپکے پڑتے تھے۔

عدلی نے دیکھا کہ خیریہ کچہری جاتے وقت صرف ایک بیجان سا بوسہ لیکر دروازے تک اسے پہنچانے آتی ہے لیکن اس نے ایک خط میں جو پہلے خاوند کو لکھا گیا تھا، پڑھا:-

"..... تم جانتے ہو کہ اکثر کچہری جاتے وقت صرف ایک دفعہ تمہارا بوسہ لے لینے سے مجھے چین نہیں آتا تھا بلکہ بعض اوقات میں تمہارے پیچھے دوڑتی تھی اور جلدی جلدی سیڑھیوں سے اترتی تھی کہ جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر تمہارے جسم کو چوم سکوں خود تمہاری آنکھوں کے سامنے! ایک مرتبہ جب تم قاہرہ گئے تو میں نے اپنی روزانہ زندگی میں ایک غم آلود کمی محسوس کی۔ اسی غرض سے میں نے اپنے معمول کو نہیں چھوڑا۔ میں روزانہ شکری کو عین اسی وقت جگانے لگی جس وقت تم کو جگایا کرتی تھی۔ پھر میں اس کے رخساروں کو چوم لیا کرتی تھی اور جب وہ سیڑھیوں سے اترتا تھا تو میں دوڑ کر دوبارہ اس کی آنکھوں کے بوسے لیتی تھی..... یہ تم خود جانتے ہو کہ شکری کی آنکھیں بالکل تمہاری جیسی ہیں!..."

اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ محبت کے بارے میں معمولی سے معمولی چیز کو شک کی نظروں سے دیکھا کرتی تھی ..... یہانتک کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اسکی کوئی قریب ترین عزیزہ بھی اس سے ملنے گھر پر آئے۔ خود مقتول کے ایک رشتہ دار نے گواہی دی تھی کہ اس نے ایک دفعہ خود اسکے خاوند کو کہتے سنا۔

"تم آخر اتنا شک کیوں کرتی ہو؟ کیا تمہیں میری محبت کے سلسلے میں کسی قسم کی بدگمانی ہے؟"

اس پر خیریہ نے جواب دیا: "نہیں، نہیں، ہرگز نہیں، میں یہ چاہتی ہوں کہ تم صرف میرے لئے ہو اور میرے سوا کوئی تمہیں نہ دیکھے!"

عدلی کے سامنے یہ سب حقائق موجود تھے۔ ان کے علاوہ روزانہ زندگی کے بعض معمولی معمولی واقعات تھے، جنہیں دیکھکر اس کے سینے میں رشک و حسد کا طوفان امنڈ آتا تھا... یہ سب بدگمانیاں بیچارے مرحوم سلیم فوزی کی وجہ سے تھیں۔ اس پہلے شوہر کی وجہ سے جسکا سایہ ہر وقت اس کے پیچھے لگا رہتا تھا... عدالت میں.... دفتر میں.... گھر میں.... بستر پر، ہر جگہ یہ سایہ اسکے پیچھے تھا اور اس کی زندگی حرام کر دی تھی۔

⁂

عدلی کی پریشانیاں اس زہریلے احساس کی وجہ سے جس نے اسکی گھریلو زندگی کو تباہ کر کے رکھدیا تھا، برابر بڑھتی چلی گئیں۔ حالانکہ ابھی ازدواجی زندگی کی ابتدا ہوئی تھی اور اسکا خیال تھا کہ یہ دن بڑے آرام سے گزریں گے خیریہ کی حرکات میں جو سنجیدگی اسے نظر آتی تھی اور اسکی فطرت میں جو اچانک ایک انقلاب رونما ہوا تھا ان سب سے اس کی سرد مہری اور بے پروائی ظاہر ہوتی تھی۔ ان تمام واقعات کے لئے کوئی ایسی معقول تاویل گھڑ لینا جس سے اسکا قلب مطمئن ہو جائے اور بے چینی اور پریشانی کے بادل چھٹ جائیں عدلی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسلئے کہ اور تمام باتوں میں وہ دیکھتا تھا کہ اسکا برتاؤ

محبت سے لبریز ہے۔ وہ گھر سے باہر بہت کم جاتی تھی۔ خانہ داری کے تمام کام پوری دلچسپی سے انجام دیتی تھی اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھی اور بغیر کہے ہر چیز تیار رکھتی تھی۔

ایک دن عدلی کی چچازاد بہن اس سے ملنے آئی۔ خیریہ سے شادی ہونے سے پہلے ان دونوں کی نسبت ہو چکی تھی اور اس نے عدلی کی طرف سے نا امید ہو جانے کے بعد شادی کر لی تھی۔ اب وہ اپنے خاوند سے طلاق لینے کے سلسلے میں اس سے کچھ مشورہ کرنے آئی تھی۔ ... ملاقات کے کمرے میں وہ اس کے ساتھ بالکل تنہا تھی۔ اس نے عدلی کو اپنا وعدہ یاد دلایا اور بتایا کہ شادی سے اسکی کیسی کیسی امیدیں وابستہ تھیں۔ ... باتیں کرتے کرتے وہ اس کے قریب آگئی اور اسکا ہاتھ کھینچکر اپنے چہرے پر رکھ لیا، اس کے بعد محبت، غصے اور امید سے بھری ہوئی نظروں سے اسکی طرف تکنے لگی!

دروازہ اچانک کھلا اور خیریہ سامنے سے آتی نظر آئی جب اس نے یہ منظر دیکھا تو دروازہ فوراً بند کر دیا اور چپ چاپ چلی گئی۔

دونوں اس حادثے سے بوکھلا گئے، اور لڑکی فوراً وہاں سے چلدی۔ عدلی بیوی کے سامنے آنے کے خیال سے جھجکتا رہا، لیکن آخرکار اس نے خود بیوی کے کمرے میں جاکر معذرت کرنا مناسب سمجھا۔ اسکا خیال تھا کہ وہ اسے اصل بات بتا دے یہی کہ اس لڑکی سے پہلے اسکی نسبت ہو چکی تھی اور اسی وجہ سے وہ اس طرح بے تکلف باتیں کرنے کی عادی ہے اس میں اس کی کوئی خطا نہیں بلکہ خود میری غلطی ہے کہ میں نے اس کو یہ نہیں بتایا کہ میری شادی ہو چکی ہے اور اب اسکی حیثیت اس گھر میں بالکل مہمان کی سی ہے۔ ... عدلی نے بیوی کے کمرے میں جانے سے پہلے ان تمام باتوں کو خوب سوچ لیا۔ ... پھر وہ بوکھلایا ہوا کمرے میں داخل ہوا، لیکن جونہی اس نے خیریہ کو کرسی پر بیٹھے اور لڑکی کو سینے سے لگائے اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتے دیکھا تو لرز اٹھا۔ خیریہ نے جب اس کو دیکھا تو بے پروائی سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی، اسوقت وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی وہ طعن آمیز لہجے میں پوچھنے لگی:۔

"کیا آپ کی بہن آگئی ہیں؟"

اس کے ساتھ ہی پھر اس نے اپنے لڑکے کو سینے سے لگا لیا اور خوب پیار کرنے لگی۔ اس دوران میں وہ رہ رہ کر اسکی آنکھوں کو دیکھے جا رہی تھی۔ عدلی یہ منظر دیکھکر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اسی لمحے اچانک اسکے خیالات بدل گئے۔ ذرا سی دیر پہلے وہ اپنی غلطی سے شرمندہ تھا اور بیوی کے غصے سے ایک حد تک ڈر رہا تھا، اب الٹے خود اسکو غصہ آنے لگا گویا خیریہ سے کوئی بڑا جرم سرزد ہوا ہے ..... جب اس نے اس روکھے برتاؤ کا مقابلہ پہلے خاوند کے ساتھ اس کے پرجوش اور محبت آمیز رکھ رکھاؤ سے کیا تو یہ خیال اسکے دماغ میں اور بھی جم کر رہ گیا وہ اس کے قریب آیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا:۔ "آخر تم چپ کیوں ہو؟"

اس نے اپنے لڑکے کے بالوں کو سنوارتے ہوئے جواب دیا:۔ "آپ مجھ سے کیا سننا چاہتے ہیں؟"

اس نے ذرا جھک کر خیریہ کے بازو پکڑ لئے اور کہنے لگا: "کیا آج ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جسکے متعلق کچھ کہا جا سکے؟"

"اس سلسلے میں کچھ کہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

اسپر عدلی نے اسکو سختی سے جھنجھوڑا اور چلا اٹھا: تم نہیں جانتی کہ مجھے تمہارے اس رویے سے کتنی تکلیف پہنچی ہے ..... تمہاری یہ بے رخی اور لاپروائی مجھے پاگل بنائے دے رہی ہے، سنا تم نے؟ واقعی پاگل بنائے دے رہی ہے۔

یہ سنکر وہ سہم گئی، آنسو اسکی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگے۔ اس نے پوچھا:۔ میری وجہ سے؟ یہ کیسے؟

عدلی برابر گرجتا رہا:۔

اچھا تو تم یہ بھی نہیں جانتیں کہ کیسے؟ اس لئے کہ تم مجھکو ایک بیوی کی طرح بالکل محبت نہیں کرتیں۔ میں یہ سب جانتا ہوں تمہیں مجھ سے بالکل محبت نہیں ہے۔

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا:۔

تم غلطی پر ہو عدلی! مجھے تم سے واقعی محبت ہے اور میں تمہاری احسانمند ہوں میں قسم کھا کر کہتی ہوں مجھے تم سے بہت محبت ہے!

نہیں ..... جیسی محبت تم اپنے پہلے شوہر سے کرتی تھیں مجھ سے تمہیں وہ محبت نہیں ہے ..... جسطرح تم نے اس کی زندگی کو خوشی، محبت اور پیار سے گرما دیا تھا میرے ساتھ کچھ بھی نہیں کرتیں ..... جیسے تم نے اس کو اپنا لیا تھا مجھے اپنا نہ بنا سکیں ..... میں نے اس بارے میں بہت سوچا ہے اس خیال نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں نے ہر طرح تمہاری دونوں زندگیوں کو جانچ لیا ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہارا برتاؤ میرے ساتھ بہت برا ہے۔ کیا اس سے بڑھکر کوئی لعنت ہو سکتی ہے، کہ تم مجھے ایک ایسے شخص سے جلنے پر مجبور کرو جو مر چکا ہے۔ یہ اذیت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی، ہرگز نہیں ہو سکتی۔ خیریہ کرسی سے اٹھی اور عدلی کے کندھے پر ہاتھ رکھکر بڑے پیار سے بولی:۔

آپ کیوں خواہ مخواہ ایسی باتیں سوچتے ہیں۔ میں بار بار آپ کو یقین دلا چکی ہوں کہ واقعی مجھے تم سے محبت ہے اور ..... بات ختم کرنے سے پہلے عدلی نے اسے دھکیل دیا اور کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا۔

ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں خوب جانتا ہوں تمہیں اس سے بہت محبت تھی۔ مجھ سے بھی زیادہ۔!

یہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ بہت ممکن ہے اسکی وجہ یہ ہو کہ اسوقت میری نوجوانی تھی۔ جب میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ عدلی! جوانی کی محبت میں ذرا جوش، شدت اور تڑپ ہوتی ہی ہے۔ اس سے ابتدائے زندگی میں مجھے واسطہ پڑا تھا۔ وہ اس دنیا کا پہلا دروازہ تھا جو میری نگاہوں کے سامنے کھلا .....

لیکن تم تو اب تک اس سے محبت کرتی ہو؟ اس کا چہرہ پھر تمتما اٹھا اور کہنے لگی: یہ آپ سے کس نے کہدیا؟

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل ٹھیک ہے۔ تم جب اپنے لڑکے کی آنکھوں کو دیکھتی ہو بے اختیار اس کی یاد آجاتی ہے۔۔۔۔ تم نے بار بار اسے لکھا ہے کہ اس کی آنکھیں اس کے باپ جیسی ہیں۔ میں تو اس کے تصور سے پاگل ہو جاتا ہوں، حالانکہ وہ بیچارا کبھی کا مر چکا ہے۔ جب یہ لڑکا بڑا ہو کر بالکل اپنے باپ جیسا ہو جائے گا تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تمہارا پہلا شوہر اس طرح دوبارہ زندہ ہو جائے اور میرا جینا حرام کر دے۔

اوہو! تو یوں کہئے آپ کو میرے بچے کی محبت بھی بری معلوم ہوتی ہے، میرے اکلوتے بچے کی محبت!

ہاں! تم اس سے اس کے باپ کی وجہ سے محبت کرتی ہو۔ تم جب اس کو سینے سے لگاتی ہو یا اس کے لبوں کو چومتی ہو اس کے باپ کا تصور تمہارے سامنے ہوتا ہے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا!

خیریہ نے سر جھکا لیا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہ نکلے اور اس نے اپنا چہرہ اپنے معصوم بچے کے بالوں میں چھپا لیا جو حیرت سے کھڑا دونوں کو تک رہا تھا۔ پھر وہ حسرت و غم کے بوجھ سے دبی ہوئی آواز سے کہنے لگی:

تب تو پیارے! ہمیں ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہیئے۔

عدلی دروازے کی طرف پلٹا اور باہر نکلتے ہوئے کہنے لگا:

ہاں! ہاں!! ضرور

کچھ دنوں بعد ابراہیم عدلی نے خیریہ ہانم کو طلاق دے دی۔ بیچاری خیریہ اپنے اکلوتے لڑکے کو لے کر تاہرہ اپنے گھر واپس آگئی۔ اس کے سینے میں دونوں شوہروں کی یاد دفن تھی —— ایک سے اس نے محبت کی لیکن وہ محبت نہ کر سکا —— دوسرے سے اس نے محبت کرنی چاہی لیکن وہ خواہ مخواہ پہلے شوہر سے جلنے لگا، حالانکہ وہ بیچارہ اس دنیا میں موجود نہ تھا۔

برمیوں کے رنگ ڈھنگ —— بقیہ صفحہ ۱۲

لے سکے۔ اس طرح سے گویا برما کو ہندوستانیوں کی پوری ہمدردی حاصل ہے۔ ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ حکومت ہند نے برما کو ۹۶ لاکھ گز کپڑا ہندوستان سے لینے کی اجازت دی ہے۔ برما کے وفد کو حکومت ہند کے محکمہ جات کے ذریعہ پوری پوری سہولت دی جا رہی ہے کہ وہ ہندوستان سے اپنی ضرورت کا کل کپڑا، ادویات وغیرہ، سیمنٹ، لوہا اور کوئلہ یہاں سے حاصل کر سکے حالانکہ ان چیزوں کی خود ہندوستان میں بڑی کمی اور ضرورت ہے

تبرکات سخا دہلوی مرحوم

وہ چند ہو گیا وہ بناؤ سنگھار سے
قدر کتاب بڑھ گئی نقش و نگار سے

پیہم صدا بلند ہے خلخال یار سے
دیکھوں تو کون کون نہ اٹھے مزار سے

میں نے کیا قیاس رخ و زلف یار سے
روز فراق کم ہے شب انتظار سے

دوزخ بھڑک رہا ہے دل شعلہ بار سے
منکر نکیر دور کھڑے ہیں مزار سے

میں مر مٹا تو عارض تاباں چمک اٹھی
آئینے صاف ہوتے ہیں ایسے غبار سے

جاؤں بہشت میں کہ نہ جاؤں یہ فکر ہے
کہنے میں مختلف ہیں ذرا کوئے یار سے

رونے پہ ہچکیوں پہ عتاب آپ کیوں کریں
نکلے گی کچھ نہ کچھ تو صدا آبشار سے

اچھا ہوا کہ معجزہ کی بات رکھ لی
موسیٰ کو سابقہ نہ پڑا زلف یار سے

آنکھیں لڑی ہیں غیر کو دیکھیں وہ کس طرح
سی دی ہے چشم یار نگاہوں کے تار سے

دعویٰ صفائی کا ہے تو اچھا ثبوت دو
ڈھلواؤ آئینہ مرے سنگ مزار سے

مانا کہ انتظار قضا سے شدید ہے
ارماں شدید تر ہے مگر انتظار سے

کیا کم ہے روز دست حنائی کا چومنا
کیوں دست کش ہو کوئی لگے روزگار سے

کوئی نہ آئے دل میں پری زادوں کے سوا
میں نے حصار کھینچا ہے اس انہماک سے

ہیں تو ملک اب بھی وہ اپنے شہید سے
تلوار صاف کرتے ہیں خاک مزار سے

اس بت نے التجا پہ بڑے ناز سے کہا
مانگو دعائے وصل نہ پروردگار سے

اس سے پر ضیا کو نہ پہنچے گا آفتاب
آگے نکل گیا ہے یہ پیدل سوار سے

سے چھوڑوں آج وعدۂ فردا کس طرح
نو لغو مجھکو اپنے میں تیرہ دہار سے

مر کر بھی ایک جا نہیں قسمت میں بیٹھنا
یعنی بگولے اٹھتے ہیں خاک مزار سے

اے کاش اٹھتے عاشق و معشوق حشر میں
دو چادروں میں لپٹے ہوئے اک مزار سے

جینے سے تنگ ہوں مجھے زندہ ہی گاڑ دو
لے لو حلف جو مر کے بھی نکلوں مزار سے

پستی کا نام ہجر بلندی کا نام وصل
پر ہے طریق عشق چڑھاؤ اتار سے

درد الم کی یوں ہے مرے دل میں پرورش
پلتے ہیں جس طرح سے مجاور مزار سے

گن گن کے ہوگی حشر میں عصیاں کی باز پرس
اور کیوں جی گر گناہ ہوں باہر شمار سے

ذلت کے بعد دل ہی مٹے بعد ہجر
یہ دائرہ بنا ہے چڑھاؤ اتار سے

زنجیر پا بنیں گے یہ بڑھ کر شباب میں
بچپن میں ہی دغدغہ تھا جسے زلف یار سے

وہ ہی سخا جو کل تھے وہاں اب خدا کی شان
منبر پہ وعظ کہتے ہیں کس افتخار سے

مرسلہ جناب ضیاء الحسن نقوی

مرد برائے صحتِ جلد ریکسونا استعمال کرتے ہیں

ایسی رائے جلدی قائم نہ کیجیے کہ ریکسونا صرف مستورات ہی کی خوبصورتی کیلئے ہے۔ یہ ٹائیلیٹ صابن ہر اس فرد و بشر کیلئے نہایت مفید ہے جو کہ صحتِ جلد کا خواہشمند ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ قسم کا صابن ہے جو کہ جسم کو قوت تر و تازگی اور راحت بخشتا ہے اس کے استعمال کا لطف خاصکر مرد ہی اٹھاتے ہیں

سب سے بڑا فائدہ اس ہلکا سبز اور زود جھاگ پیدا کرنیوالے صابن کا یہ ہے کہ اس میں حفظانِ صحت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مضر جراثیم کو نیست و نابود کر دینے والی۔ بدن کو فرحت دینے والی کیڈائل نام دوائی آمیزش کی گئی ہے جس سے ریکسونا کی بہت جلدی اور بہت پیدا ہونیوالی جھاگ جلد کے ہر مسام تک بہم پہنچاتی ہے اور خاصکر ان اجزا میں جہاں عام طور پر جلد کو ضرب پہنچانیوالی مہلک بیماریاں یعنی کھجلی وغیرہ اور مذہب داغ پیدا ہونے لگتے ہیں اسطرح سے آپکا سارا بدن تندرستی بیماریوں سے مبرا ہشاش بشاش اور صاف رہتا ہے

آپ اس سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر آسانی اور بہت جلدی ریکسونا کے باقاعدہ استعمال سے جلد کی صحت درست کی جا سکتی ہے اور اُسے ہر طرح سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایسے سبز اور زود جھاگ دینے والے ادویات سے مرکب صابن کو آج ہی سے فوراً عمل میں لائیں اور اس کے استعمال کو جاری رکھیں۔

نوٹ:- یہ ایک نقطہ خاص قابلِ ذکر ہے کہ جلد کی صحت پر ہی خوبصورتی کا انحصار ہے اور ہر مرد کو اپنے بدن کی جلد کو عمدہ اور محفوظ رکھنے کا اُتنا ہی فخر حاصل ہے جو کہ ایک عورت کو۔

THE NEW Rexona MEDICATED SOAP

Rexona MEDICATED SOAP CONTAINING CADYL

جھاگ سے لبریز اب خوشبو سے معطر

ریکسونا بچے کیلئے:- یہی ریکسونا جو کہ باپ استعمال کرے بچہ بھی کرے۔ اس کی جھاگ بدن کے مضر جراثیم سے محفوظ رکھتی ہے۔ ننھے بچوں کو غسل کراتے وقت ریکسونا کا استعمال فرمائیں تاکہ وہ بچے کے نازک جلد کو ٹھنڈک پہونچائے اور اسے ہر طرح کی کھجلی و خارش و سوزش سے بچائے رکھے۔

★ کیڈائل ریکسونا میں ایک خاص قسم کی جراثیم کش۔ آرام دہ تقویت دہ جسیلوں کا مرکب ہے جو کہ جلد کی صحت کو برقرار رکھنے میں اپنا خاص اثر رکھتا ہے۔ کیڈائل کے جلد کو ٹھنڈہ اور مہلک بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے فوائد کو بڑے بڑے ماہران سائنس نے تسلیم فرمایا ہے اور اس کے ہر روز کے استعمال کو ترجیح دی ہے

ریکسونا مرہم کا استعمال کیجیے:- دردوروں۔ سوزش۔ پھوڑے۔ داد۔ ناسور۔ مہاسے۔ پتّیے۔ جلن اور دوسری تمام جلدی امراض کیلئے۔ گو مال کی کمی ہے مگر پھر بھی کوئی ڈبیہ بہت سے تاجروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

REXONA OINTMENT

RP. 22-23 UD

REXONA PROPRIETARY LIMITED

مشہور و معروف حلوہ سوہن کی قدیمی شاہی دکان

حلوہ سوہن کی ہر قسم حبشی۔ پستی۔ جوزی، بادامی، پپڑی۔ پپڑی گری۔ ملکھنی پپڑی و زعفرانی وغیرہ ہمارے ہاں تیار رہتی ہیں۔
اس کے علاوہ تمام ہندوستانی مٹھائیاں بھی ملتی ہیں۔
نوٹ:۔ آرڈر آنے پر مال بذریعہ وی۔پی بھی بھیجا جاتا ہے۔

شیخ عبدالخالق۔ شاہی حلوہ سوہن والے
چاندنی چوک دہلی

اردو کی خدمت کیجئے

ہر قسم کی اردو کی کتابیں

ہم سے طلب کیجئے

بک ڈپو انجمن ترقی اردو۔ اردو بازار دہلی

سیدالانبیاء، خاتم النبیئن، محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم

کی

سیرت پر مشہور عالم کتاب

رحمۃ اللعالمین کامل تین جلد

(سیرت النبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہ وبارک وسلم)

مصنفہ:۔ علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری

رحمۃ اللعالمین نے شائع ہوتے ہی سیرت رسولؐ کے شیدائیوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ اور اس کو جملہ حلقوں میں مستند قرار دیکر پسند کیا گیا۔ اب اس کی جگہ تینوں جلدیں نیا رہو گئی ہیں۔

یقیناً اُس کتاب کو ملاحظہ فرما کر تڑپ جائیں گے۔ اتنی دلچسپ اتنی مکمل اور اتنی اعلیٰ کتاب سیرت النبی صلعم پر آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔ طرزبیان محبت اور عقیدت کے رنگ میں سلجھا ہوا طریقۂ استدلال سنجیدہ ہے۔ سیرۃ کے ساتھ ساتھ مختلف مذہبی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اسکی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔

کتابت روشن اور خوشخط   کاغذ چکنا عمدہ دبیز   طباعت دیدہ زیب   جلد پائدار ولائتی کپڑے کی
گردپوش سہ رنگا خوبصورت

کامل تین حصہ مجلد ——— سترہ روپے

فہرست مفت طلب فرمایئے   ہم اسلامی و ادبی کتابیں۔ قرآن مجید اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں   فہرست مفت طلب فرمایئے

ملنے کا پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ناشران کتب۔ کشمیری بازار۔ لاہور

ہندوستانی ثقافت و فنون پر مصری اثرات

کے حسین

فراعنہ نے خصوصاً اور مصریوں نے عموماً نوع انسان کے جملہ افراد سے اپنے آپ کو کہیں زیادہ برتر و اعلیٰ سمجھا۔ انھوں نے غیر ملکیوں کے ساتھ میل جول رکھنے سے احتراز کیا اور ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کی صورت ان کے حاشیۂ خیال میں بھی کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ یہی سب سے بڑی دقت تھی جس کا سامنا رومیوں اور یونانیوں کو کرنا پڑا جب وہ علم نجوم و سطحات سیکھنے اور طب و جراحی کے ضمن میں معلومات بہم پہنچانے کے ارادہ سے مصر میں وارد ہوئے۔ غیر ملکیوں سے اجتناب و احتراز کا سبب یہ تھا کہ مصری اپنے جسم صفاچٹ رکھتے اور دن میں دو تین بار غسل کرتے تھے۔ ان کے برعکس نو واردوں کی لمبی گھنی ڈاڑھیاں اور میلے کچیلے غلیظ کپڑے ان کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتے تھے۔ چنانچہ سبھی غیر ملکیوں کو پلید سمجھا جانے لگا۔ بادشاہ کا گھٹنا چومنے کی اجازت وہ سب سے بڑا اعزاز ہوتا جو فرعون کی طرف سے کسی درباری کو عطا کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑی حد تک یہی برتری کا احساس ہندوستان کے ہندوؤں کو ورثے میں ملا ہے۔ اگرچہ ہندوستان پر انگریزی تسلط ہونے کے بعد سے بہت کچھ حالت بدل گئی ہے تاہم جذبۂ تنفر ابھی تک اپنا رنگ جمائے ہوئے ہے اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ صدہا سال تک ان کا قریبی تعلق مصریوں کے ساتھ رہا ہے۔ یہ ربط ضبط سکندر یونانی کے حملے کے وقت تک قائم رہا۔ لفظ "فرعون" دو مصری لفظوں سے مرکب ہے۔ "فیرا" بمعنی "بڑا مکان" اور "اون" بمعنی "رب رع" یا "سورج دیوتا"۔ اب اگر اس کا تقابل ہندی لفظ "مہاراجہ" سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ تین ٹکڑوں کے ملنے سے بنا ہے۔ "مہا" بمعنی "بڑا"، "را" (رع) بمعنی "سورج دیوتا" (بزبان مصری) اور "جہ" بمعنی "بچائے" یا "پسر فلاں"۔

جب ہم سوچتے ہیں کہ تقریباً دو سو سال میں انگریزوں سے قریبی تعلق رہنے کے باعث ہندوستانی ثقافت، رنگ ڈھنگ، طرق بود و معاش اور فکر و خیال میں کتنی زبردست تبدیلیاں ہوتی ہیں تو یہ باور کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان اصلی آریاؤں کی زندگی میں بھی جو دریائے سندھ کے کنارے آباد ہوئے تھے ایسے ہی تعلقات کی بنا پر صدہا سال کی مدت میں بہت کچھ تغیرات رونما ہوئے ہوں گے۔

ابتدائی حالات کا جائزہ لینے پر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ علم التشریح البدن پر سب سے پہلی کتاب دوسرے شاہ مصر آتھوتھس نے لکھی جو تقریباً ۴۳۶۶ ق۔م میں حکومت کرتا تھا۔ اس طرح توت نے جس کا یونانی نام ہرمیس تھا علم الادویات پر چھ کتابیں لکھیں جو مندروں میں رکھی رہتی تھیں۔ ادویات کے موضوع پر چار اہم بردی مخطوطات بھی ملے ہیں۔ ایک مسودہ لکسر کے قریب ایبرز نے برآمد کیا جس کا وہ ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ دوسرا جو کسی قدر ضائع بھی ہو گیا برلن کے عجائب خانہ میں ہے۔ تیسرا برطانیہ کے عجائب خانے میں ہے۔ اس پر اٹھارویں خاندان کی تاریخ ہے جو تقریباً ۱۷۰۰ ق۔م میں حکومت کرتا تھا۔ چوتھا ایک امریکن کے ہاتھ لگا اور وہ اس نے نیویورک ہسٹوریکل سوسائٹی کو پیش کر دیا۔ بعض کا موضوع تاریخ ہے اور بعض تشخیص امراض اور طریقۂ علاج سے متعلق ہیں۔ ہومر کی نظموں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کو ایک ایسی مفید سرزمین بتایا گیا ہے جس میں دوائیں بکثرت موجود ہیں۔ کچھ اچھے کاموں کے لئے ہیں اور کچھ برے کاموں کے لئے اور وہاں ہر شخص طبیب ہوتا ہے اور اس کی واقفیت عام لوگوں سے ہوتی ہے۔ وہ سب کے سب صحت و تندرستی کے دیوتا کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔

ہیرودوطوس (۴۰۰ ق۔م) کا بیان ہے کہ سب سے اہم علاج عمدہ غذاؤں اور غذائی پابندیوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ آنکھوں، سر، دل اور دانتوں کے علاج کے لئے الگ الگ ماہرین فن ہوتے تھے۔ دندان ساز بھی موجود تھے۔ اور وہ کھوکھلے دانتوں میں سونا یا چاندی بھر دیتے تھے۔ (ملاحظہ ہو "قدیم اہل مصر" مصنفہ ولکنسن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۵۰) فوج کے سپاہیوں کا علاج بلا اجرت کیا جاتا تھا۔ اگر غلط طریقۂ علاج سے کوئی مریض مر جاتا تو طبیب پر قتل انسانی کا الزام لگایا جاتا تھا۔ ان ڈاکٹروں کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی لیکن اہم مشوروں کے سلسلے میں وہ فیس وصول کر لینے کا حق رکھتے تھے۔ علاج زیادہ تر جڑی بوٹیوں کے عرقوں، ستے اور دواؤں، پرہیز دل یا دوا کی ہلکی خوراکوں سے کیا جاتا تھا۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ بہت سی بیماریاں ضرورت سے زیادہ کھانے اور معدے کی خرابی یا سوء ہضمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بلائنی کا بیان ہے کہ اہل مصر نوعیت مرض کی تحقیق و تشخیص کے سلسلے میں مرنے والے کے مردہ جسم کا معائنہ کرتے تھے

تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ موت کس وجہ سے واقع ہوئی ہے۔

ایتھنیہ اور روما کے لوگ مصری طبیبوں سے بہت زیادہ مشورہ لیتے تھے ان کی شہرت اتنے دور دراز حصوں تک پھیل گئی تھی کہ سیاڈنش (۶۰۰ ق م) اور دآراد (۵۲۹ - ق م) نے مصر سے طبیبوں کو بلا بھیجا۔

نیرو کے زمانے میں طبابت کرنے والے ایک شخص پیڈوبیس ڈائیوسکوردیز کے کچھ ایسے نسخے ہاتھ آئے ہیں جو بالکل ان نسخوں کی نقل ہیں جو مذکورہ بالا بردی کاغذات پر نقش ہیں پٹنہ کی خدابخش لائبریری میں ڈائیوسکوردیز کا ایک ترجمہ موجود ہے جو ہارون الرشید کے بیٹے اور خلیفہ المامون کی خاطر آرمینیہ کے ایک عالم اسٹیفن نے کیا تھا۔ یہ کتاب جو اپنی قسم کا واحد نسخہ ہے "کتاب الحشیش" کہلاتی ہے۔ تقریباً یہی طریقۂ ادویات آریاؤں کے ابتدائی عہد میں بھی رائج تھا۔

یقین کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے علم طب کا بہترین زمانہ سسترت سے چرک تک تھا جن کا ذکر مہابھارت میں کیا گیا ہے لیکن ترمیم و تنسیخ ہوتے رہنے کے باعث اس کی قدامت حملۂ سکندر سے زیادہ پہلے کی نہیں سمجھی جا سکتی بالفاظ دیگر اسے ۳۲۷ قبل مسیح سے ۷۵۰ سن عیسوی تک کہا جا سکتا ہے۔

بالکل مصریوں کی طرح ہندوؤں میں بھی پجاریوں کو طب اور جراحی کے اسرار و رموز کا محافظ سمجھا جاتا تھا حقیقت یہ ہے کہ ویدوں اور طبی کتابوں کا علم اس فن کا ایک حصہ بن گیا وہ صرف ہندوستان کے پجاریوں سے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ طب و جراحی کے ضمن میں ہندوستان میں رہنے والے آریائی لوگ بدھی زمانہ کے دوران میں پورا عروج حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ امر بھی یقینی ہے کہ مصر انکا وطن تھا ہو سکتا ہے کہ حملے کے بعد یونانیوں سے تعلقات بڑھنے پر کچھ ترقیاں ہوئی ہوں۔ ہندوستان کے ہندو اب بھی ایسے منتر جپنے کے عادی ہیں جو مصریوں کے قدیم عہد میں مریضوں کے علاج کا ایک جزو سمجھے جاتے تھے قدیم آریاؤں کی نباتاتی ادویات کے سلسلے میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جڑی بوٹیوں کو چاند کی خاص خاص تاریخوں میں توڑا جاتا تھا اور اس اعتبار سے بھی قدیم مصریوں اور ہندوستان کے ہندوؤں میں مشابہت کا پتہ چلتا ہے۔ اب بھی جلدی امراض اور دوسری متعدی بیماریوں کے سلسلے میں منتروں کو سازوں کے ساتھ گا بجا کر علاج معالجہ کیا جاتا ہے۔

عربی اور فارسی لفظ "یونانی" دراصل یونانی زبان کے لفظ "آئیونین" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ سنسکرت میں بھی لفظ "یوانا" ہے جو یونانیوں کے لئے بولا جاتا تھا۔ ڈاکٹر اولیری نے اپنی کتاب "عرب قبل از محمد" (صفحہ ۶۶) میں لکھا ہے: — "برہمی رسم الخط

تاثرات

زہے ناخنِ غم کی سینہ خراشی۔ کہ قلب و جگر ہو گئے پارا پارا
ہوئے اپنے ناوک سے ہم آپ زخمی۔ کسی کی نگاہوں نے کیا تیر مارا؟
یہ مانا محبت نے اب تک کسی کی۔ نہ دنیا بنائی نہ دیں کو سنوارا
خدا کی قسم پھر بھی ترکِ محبت۔ نہ ان کو گوارا نہ مجھکو گوارا
اگرچہ خرد نے بہت کھیل کھیلے۔ اگرچہ جنوں نے بہت زور مارا
مگر یہ طلسمِ مشیت نہ ٹوٹا۔ ازل سے یہی تجربہ ہے ہمارا
وہ کب کے گئے بھی۔ مگر دل کو ابتک نہیں ترکِ شوق و تمنا گوارا
جہاں کوئی آہٹ ہوئی میں یہ سمجھا کہ جیسے وہی آرہے ہیں دوبارا
ہر اک منزلِ نشو و بالیدگی میں۔ یہ کیوں خار و گل کی نگہباں ہے فطرت
اگر پردۂ رنگ و بو میں تمہیں ہے۔ کوئی جلوہ گستر کوئی مجلہ آرا
کوئی لاکھ عزلت گزیں ہو جہاں میں۔ حوادث سے ممکن نہیں رستگاری
بھلا بیچ طوفاں سے کیا بچ سکیگا۔ کوئی لاکھ ساحل سے کرلے کنارا
دو عالم سے پیہم صف آرا رہوں گا کہ ہے میرا مقسوم زور آزمائی
ہزیمت کا اپنی مجھے غم نہیں ہے۔ مقدر سے لڑکر مقدر سے ہارا
کوئی یہ حوادث کو پیغام دیدے۔ ابھی میرے دل میں تمنا ہے باقی
کوئی بادِ صرصر سے جاکر یہ کہدے۔ مری خاک میں ہے ابھی اک شرارا
بہارِ چمن کروٹیں لے رہی ہے خزاں کی غم انگیز ویرانیوں میں
شبِ غم کی ظلمت پتہ دے رہی ہے رئیس اپنی قسمت کا چمکا ستارا

رئیس امروہوی

بلاشبہ ساتن مادّے سے نکلا ہے اور اگر پوری صحت کے ساتھ اس کی تاریخ کا تعین کرتے ہوئے یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ ساتویں صدی قبل مسیح میں رائج ہوا تو پھر یہ تسلیم کرنا آسان ہو جائے گا کہ باہمی تعلقات اس وقت سے مسلسل قائم رہے۔ حالانکہ قدیم ترین ہندوستانی کتبہ جو دستیاب ہو سکا ہے تیسری صدی عیسوی کا ہے۔ (روزنامہ "ڈان" کے شکریہ کے ساتھ)

حشر کا ڈرامہ

عشرت رحمانی

مجلۂ "آجکل" کی اشاعت مورخہ ۱۵ راکتوبر ۱۹۴۵ء میں جناب محمد عمر (نور الٰہی) کا ایک مضمون عنوان بالا کے تحت شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون جناب جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی کے اس مضمون سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ جو "آجکل" کی اشاعت مورخہ ۱۵ رمئی ۱۹۴۵ء میں درج ہوا تھا۔ اور اس سلسلہ میں راقم الحروف رسالۂ "آجکل" کی کسی گذشتہ اشاعت میں ایک مختصر مقالہ پیش کر چکا ہے۔ مکرمی محمد عمر صاحب کا یہ مضمون بیتاب صاحب کے مضمون پر ایک حاشیہ سمجھنا چاہیئے جس کا مقصد اس کے آغاز سے واضح ہے۔

محمد عمر صاحب (نور الٰہی مرحوم) سے ادبی دنیا متعارف ہے اور ناٹک ساگر کے مصنف سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ کم سے کم اردو ڈرامہ نگاری کے ابتدائی ابواب پر انہیں معقول عبور ہوگا لیکن آغا حشر مرحوم سے جس قسم کی ناواقفیت کا اظہار انھوں نے اس مضمون میں فرمایا ہے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اور بقول "پردہ نگاری" چاک ہوتا نظر آتا ہے۔ واللہ اعلم۔

جناب بیتاب بریلوی کو جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور انھوں نے آغا حشر مرحوم سے ذاتی واقفیت کے پردہ میں جس ناواقفیت کا اظہار فرمایا ہے میں اپنے مضمون میں کسی حد تک تفصیل سے بحث کر چکا ہوں۔ اس لئے یہاں اس سے گریز ہی مناسب ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بیتاب صاحب کے وہ کون سے انکشافات ہیں جن کی نسبت محمد عمر صاحب جیسے فنِ ڈرامہ کے دعویدار یہ فرمانے پر مجبور ہو گئے کہ "ایسے انکشافات کئے جن کی بڑی ضرورت تھی اور جو مجھے ناٹک ساگر کی تکمیل میں بڑا کام دیں گے۔" یہاں سب سے پہلے تو یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ "آیا ناٹک ساگر اسی قسم کی معلومات سے مکمل کی گئی ہے، کیا ڈرامہ کے فن اور فنکاروں کے بارے میں اسی قسم کی بے پر کی تو نہیں جمع کر دی گئی ہیں؟" حالانکہ جہاں تک میں واقف ہوں ایسا نہیں ہے۔ ناٹک ساگر اس فن میں وقعت کے قابل اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ مجھے محمد عمر صاحب سے جو غائبانہ تعارف حاصل ہے اور جو مضامین انھوں نے عرصہ دراز ہوا میرے رسالہ نیرنگ اور نیرنگستان کے لئے لکھے وہ سنجیدہ معلومات پر مبنی تھے۔ اس لئے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ڈرامہ کے فن پر انھیں سطحی عبور بھی نہیں۔ انھیں وجوہ کی بنا پر مجھے تعجب ہے کہ ایک ایسے غیر معتبر مقالہ سے وہ اس قدر متاثر کیوں ہوئے اور بیتاب صاحب کے "ذاتی الہامات" کو "انکشافات" کیوں تصور فرما بیٹھے۔ جبکہ انھیں خود آغا حشر مرحوم سے اس سے زیادہ حد تک واقف ہونا چاہیئے ان سب امور پر غور کرنے کے بعد ان کے اس مضمون کا انداز صرف بتا دیتا ہے کہ ان کے لئے "چھٹر ندامت کہ بھرے بیٹھے ہیں،" والی مثل صادق آتی ہے۔ اور غالباً حشر مرحوم کے بارے میں جو کچھ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ ایسے ہوتے یا ایسے مانے جاتے وہ بیتاب صاحب کے غیر ذمہ دار قلم کے ذریعہ انھیں مل گیا۔

اس مضمون میں محمد عمر صاحب خود مانتے ہیں کہ "حشر ہندوستانی ڈرامہ کے ایک دور کے خاتم ہیں"۔ چونکہ جناب بیتاب کے متن پر پہلے لکھ چکا ہوں اسلئے محمد عمر صاحب کے حاشیہ پر لکھنا ضروری ہے۔ مجھے سب سے پہلے اپنے ایک سہو کا اعتراف کرنا ہے کہ ناٹک چترا بکاؤلی کو میں سہواً اپنے گذشتہ مقالہ میں احسن لکھنوی مرحوم کی تصنیف کہہ چکا ہوں۔ درحقیقت وہ منشی کریم الدین بریلوی مرحوم کی تصنیف ہے۔

محمد عمر صاحب نے حشر مرحوم کے مقلدین کا ذکر کر کے رحمت کو بھی ناٹک نویس مانا ہے۔ یہ ادر تعجب کی بات ہے۔ حالانکہ انکی حیثیت ایک نقال سے زیادہ کی نہیں۔ گو وہ ڈائرکٹر بننے کے بھی دعویدار رہے۔ مگر اپنے دور اور رنگ کے ایک اچھے ایکٹر اور پیڑباز ضرور تھے۔ اور یہ صحیح ہے کہ انھوں نے محشر اور عباس کے ساتھ نام بھی پیدا کیا۔ اس حقیقت کو سب سے زیادہ جناب محشر شیرازی جانتے ہیں۔ اس دور کے ناٹکوں کا ذکر کرتے ہوئے پلاٹ وغیرہ کی جو خصوصیت بتائی ہے اس میں محمد عمر صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ "ٹریجیڈی سے شاذ ہی اعتنا کیا جاتا تھا۔ انجام یا عاقبت کبھی بخیر نہ ہوتی تھی"۔ تعجب ہے آپ نے یہ کس دور کے ناٹکوں کا ذکر فرما دیا۔ حالانکہ ان ناٹکوں کی سب سے پہلی خصوصیت تو جاننے والے یہی مانتے ہیں کہ انجام "سب خوش" ہونا لازمی تھا۔ اور اسی کو ان میں سے اکثر ناٹکوں کا نقص سمجھا جاتا ہے کہ پلاٹ سے انجام میں خوشی پیدا ہو یا نہ ہو Anti-climax ہی کیوں نہ بنادیں۔ مگر کھینچ تان کر المیہ پلاٹ کو بھی کومیڈی بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ خود آغا حشر مرحوم کے کئی ناٹکوں میں یہ نقص نمایاں ہے۔ جو اگر سیدھے سادھے انداز میں پلاٹ کی مطابقت کے لحاظ سے جائز Climax پر ختم ہوتے تو نیچرل اختتام ہوتا۔ مگر عوام کو انجام کے وقت خوش خوش اٹھانے کے لئے غیر فطری کھینچ تان کے ذریعہ سب کردار خوشی خوشی ملا کر "عاقبت بخیر" کر دکھائی ہے۔ اور یہ یقیناً مالکان کمپنی کی مرضی کے مطابق مجبوراً کرنا پڑتا۔ بنگالی ڈرامہ کے بارے میں جو بیتاب صاحب نے تذکرہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ حشر مرحوم کے ڈراموں پر اس طرز نگارش کا اثر بہت کچھ ہوا۔ یہ بات محمد عمر صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی یا سمجھ کر اسے الجھانے کی کوشش کی ہے۔ آپ دریافت فرماتے ہیں کہ "آغا حشر مرحوم نے کن بنگالی ڈراموں سے اثر قبول کیا؟" بندہ نواز! میں یہ دریافت کروں گا کہ آپ نے آغا حشر مرحوم کے کون کون سے ڈرامے ملاحظہ فرمائے ہیں؟ زیادہ طویل بحث یا تمہید کی ضرورت نہیں۔ آغا صاحب مرحوم کے تیسرے دور کے ناٹک "بن دیوی" کو بنگالی ڈرامہ کے ایک کامیاب اثر کا بلند نمونہ سمجھئے۔ اس کے بعد ان کے آخری دور کے ناٹک "پریمی بالک" "دھرمی بالک" "آنکھ کا نشہ"، "دل کی پیاس"، "ہندوستان" اور "پہلا پیار" میں ہندی اور بنگالی کا

سمویا ہوا دلکش اور موثر انداز موجود ہے۔ یاں یہ میں بھی نہ سمجھ سکا۔ آپ نے جو دریافت فرمایا ہے کہ "یہ بتایئے آغا صاحب کس اسکول سے موثر ہوئے؟" یہ تو پہلے آپ کو بتانا ہے کہ موثر ہونے سے آپ کی مراد کیا ہے؟

آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ "جب تھیٹر ختم ہوگیا اور متکلم فلم نے ڈرامہ کی سرپرستی قبول کرلی تو بھی حشر اسکول کا ڈرامہ اسے وراثت میں ملا اور اسی کو اس نے سنگ میل بنایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حشر اسکول میں سنگ میل بننے کی بدرجہ اتم صلاحیتیں موجود تھیں اور اس کے سوا اور کوئی راستہ کسی کے سامنے نہ تھا۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ "پہلی بولتی فلم "عالم آرا" میں حشر اسکول کی گہری جھلک نظر آتی ہے۔ شیریں فرہاد (دہلی) میں بھی حسینی میاں ظرافت جھلکتے ہیں۔" یہاں یہ عرض کرنا ہے کہ آپ سیدھی بات کہہ کر بھٹک گئے۔ حشر اسکول سے حسینی میاں ظرافت کو کیا نسبت؟ یہ غور نہیں فرمایا شاید۔ آپ فرماتے ہیں "خود آغا ڈرامہ "یہودی کی لڑکی" فلم میں عہد عتیق کی یادگار رہے۔ دور حاضر کے ڈرامہ نگار حکیم احمد شجاع اپنے فلموں میں حشر اسکول کو یاد کرجاتے ہیں۔

قبلہ! ایک "یہودی کی لڑکی" ہی کیا، عہد عتیق کی کامیاب یادگاریں تو آجتک فلم میں بکثرت ہیں۔ آپ کس کس کا رونا روئیے گا۔ دھارمک اور تاریخی فلموں میں شروع سے آجتک حشر اسکول کی خوشہ چینی ہے۔ کیا دور حاضر کی ایک کامیاب ترین فلم "رام راجیہ" حشر مرحوم کے "سیتا بن باس" سے الگ ہے؟ فلم "پکار"، اور "سکندر"، "بابر"، اور "ہمایوں" وغیرہ میں کس اسکول کے چربے ہیں؟

حالانکہ یہ کچھ زیادہ خوشی کی بات نہیں مگر مجبوری کا کیا علاج کہ ہمارے آج کے اکثر ڈرامہ نگار جدت سے قاصر ہیں۔ اور فلم کمپنیاں بھی لکیر کی فقیر ہیں۔ علاوہ ازیں آغا حشر مرحوم کو آپ کسی انداز میں بھی دیکھئے اور کچھ بھی نقائص نکالئے لیکن ڈرامہ کی دنیا مرحوم کے احسانات نہیں بھول سکتی۔ مکرمی حکیم احمد شجاع سے بھی آپ واقف ہیں۔ وہ حشر اسکول کو کیسے بھول سکتے ہیں؟ جبکہ وہ اپنے آپ کو اس اسکول کا قابل فخر شاگرد سمجھتے ہیں۔ (حوالہ کے لئے ملاحظہ فرمایئے حکیم صاحب کی تازہ شائع شدہ "آپ بیتی" "خوں بہا") آغا حشر مرحوم کی تصانیف آپ نے ملاحظہ کی ہوتیں تو یقیناً اس انداز کی ناواقفیت کا اعتراف نہ فرماتے۔ سوشل فلموں میں بھی حشر مرحوم کے ڈراموں کے چربے موجود ہیں۔ دور کیوں جایئے "فیشن" دیکھ لیجئے اور "دل کی پیاس" پڑھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا ہے "کلکتہ بمبئی۔ میرٹھ اور بریلی میں انگریزی تھیٹروں کے قیام نے ہندوستانی ڈرامہ میں انقلاب کی داغ بیل کردیا" یہ انگریزی تھیٹروں سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تشریح طلب معمہ ہے۔ کہ ان شہروں میں انگریزی تھیٹر کب قائم ہوئے۔ اس کے بعد آپ کا یہ تحریر فرمانا کہ "فلم حشر اسکول سے فرار پر مجبور ہوگئی۔ پلاٹ ایک رہ گیا۔ زبان مقفیٰ ہونے کے بجائے سادہ روزمرہ میں تبدیل ہوگئی۔ بیت بازی ختم۔ مکالمہ چھوٹے فقروں میں۔ یہ انقلاب تھا جو ڈرامہ میں آیا اور حشر اسکول کو بہالے گیا۔" شاید درست"

والا معاملہ ہے۔ حشر اسکول کے تتبع کا تذکرہ تو مندرجہ بالا سطور میں کرچکا ہوں کہ آج بھی فلمی دنیا حشر اسکول کی خوشہ چینی کررہی ہے۔ تازہ ترین ہندوستانی فلمیں ملاحظہ فرماکر انصاف سے بتادیجئے کہ پچاس فیصدی سے زیادہ میں حشر اسکول بول رہا ہے یا نہیں۔ اب رہا پلاٹ، زبان اور مکالمہ کا مسئلہ۔ تو گذارش احوال واقعی یہ ہے کہ حشر مرحوم کے آخری دور کی تصانیف (جو جدید دور کے رجحانات کا تقاضہ ہیں) ہیں بھی سب خصوصیات موجود ہیں۔ آپ کی معلومات کے لئے چند ڈراموں کے نام یہ ہیں، "آنکھ کا نشہ"، "دل کی پیاس"، "پہلا پیار" — انھیں پڑھئے اور فرمایئے کہ ان کے پلاٹ میں یکسوئی، زبان سادہ اور روزمرہ ہے یا نہیں۔ بیت بازی آغا صاحب مرحوم اس دور میں خود ہی متروک قرار دے چکے تھے۔ آپ کے سامنے اُن کے جدید دور کی ایک تصنیف بھی نہیں ورنہ آپ یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ "حشر اسکول کا انقلاب (دقیانوسی) ڈرامہ نویسی کو بہالے گیا اور حشر اسکول کے ہاتھوں چند ادنیٰ اسکول وغیرہ "کی مٹی عزیز ہوگئی" اور یہی ہے وہ قلمرو ئے سخن جس کا بادشاہ حشر کو سمجھا جاتا ہے۔ بیتاب صاحب بھی سب کچھ کہہ کر ٹھنڈے دل سے یہی ماننے پر مجبور ہوئے اور یقیناً طالب و احسن اس کے حقدار نہیں۔ بیتاب صاحب کے اس دعوے کو آپ نے "ہنگامی زاویہ" فرمایا ہے۔ یہ بھی تشریح طلب ہے!

یہ "ہنگامی زاویہ" یعنی چہ؟

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ (۱) دوسرے ڈرامہ نگاروں سے حشر کی استعداد علمی زیادہ تھی۔ (۲) آغا نے دوسرے ڈرامہ نگاروں سے بڑھ کر ادب کی خدمت کی۔ (۳) آغا نے دنیائے ادب میں جو حشر بپا کیا اس کی تفصیل رسالہ "آجکل" کی گذشتہ اشاعت میں آپ نے میرے مضمون میں ملاحظہ فرمالی ہوگی۔ رہا فن ڈرامہ میں حشر کی اصلاح کا سوال۔ تو حقیقت یہ ہے کہ حشر کی استعداد علمی کا تقاضہ تھا کہ انھوں نے زمانہ کے ساتھ ساتھ اپنی روش اور انداز کو بدلا۔ اور ان کی تصانیف کا ہر دور ایک نیا انقلاب لے کر آیا۔ اگر کسی نقاد کی نظر میں خوبصورت ملا آج کے فن ڈرامہ کے لحاظ سے نکتہ چینی کے قابل ہے تو یہ فنکار کا قصور نہیں۔ اسے نقاد کی کم نگاہی ماننا پڑے گا۔ آغا صاحب مرحوم نے جس دور میں جو ڈرامے لکھے اور جس مقصد سے لکھے اس عہد کے رجحانات کا وہی تقاضہ تھا۔ اگر ایک مصلح عام روش کے خلاف آواز بلند کرے اور جبر و اکراہ سے عوام کی اصلاح کرنا چاہے تو قطعاً ناممکن ہوگا۔ عوام کی بغاوت اسے کامیابی کے رُخ پر آنے سے پہلے ہی ختم کرڈالے گی۔ اور اس کی آواز "صدا بصحرا" ثابت ہوکر گم ہوجائے گی۔ اس کلیہ کو ایک کامیاب مصلح بخوبی سمجھتا ہے اور اگر وہ اصلاح کا بیڑا اٹھاتا ہے تو رفتہ رفتہ صحیح راستہ پر لانے کے لئے عمل پیرا ہوتا ہے۔ یہی انداز حشر مرحوم کا ہے۔ ان کے ابتدائی دور سے لے کر آخری عہد تک کے ڈرامے غور سے پڑھ کر انصاف کی نظریں اس حقیقت کو پرکھ لیتی ہیں، کہ انھوں نے وقت کی مصالح اور عوام کے رجحانات کا غائر مطالعہ کرکے رفتہ رفتہ دنیائے ادب میں حشر جگایا اور افسوس ہے کہ اس کی تکمیل سے پہلے موت نے

بے رحم جنگل نے انھیں اس دنیا سے چھین لیا۔ ورنہ آج ہمارے سامنے انکی حشر انگیز اصلاحی پروگرام کی وہ مکمل تصویریں ہوتیں جن کی آج کے زمانہ کو ضرورت ہے اسلئے یہ کہنا یقیناً بجا ہوگا کہ "اگر حشر مرحوم اس زمین سے نہ اٹھائے جاتے تو اسی زمین کو ادب کا ساتواں آسمان بنا دیتے" اب تو غالباً محمد عمر صاحب کے لئے) اس اختصار کو کسی مزید توضیح کی ضرورت نہیں۔

اب رہ گیا اداکاری کا مسئلہ! یہ آپ مانتے ہیں کہ اکثر کامیاب ڈرامہ نگار کامیاب اداکار بھی ہوئے ہیں۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک کامیاب ڈرامہ نگار کو (خواہ عملی حیثیت سے نہ سہی) کم سے کم اداکاری کے فن میں مہارت ضرور ہونا چاہئے۔ ورنہ وہ کامیاب فن کار نہیں بن سکتا۔ اس کے بعد ہی آپ دریافت فرماتے ہیں کہ "وہ (حشر) پردہ کش سے ڈرامہ نگار اور سوتر دھار کی حد تک پہنچے تو خدا کے لئے بتلایئے کہ انھیں ایکٹری سے کیوں بیر ہو گیا اور وہ ایکٹری سے کیوں کنارہ کش ہوئے" بندہ پرور! بیتاب صاحب کو کیا علم پہلے تو آپ یہ فرمائے کہ "حشر پردہ کش کب تھے؟" اور یہ "اڑتی خبر" اگر آپ تک پہنچی ہے "زبانی طیور" کی۔ تو خدا کے لئے صاحب طیور کا نام آپ بتلایئے۔ اب حقیقت سنئے! حشر نے ناٹک کی دنیا میں جب قدم رکھا تو ڈرامہ نگار ہی بن کر۔ اور رفتہ رفتہ اسی حیثیت سے اداکاری اور تمثیل نگاری کا فنی طور پر غائر مطالعہ کرکے عملی حیثیت سے کامیاب فن کار بنے۔ آپ کہتے ہیں "وہ ادنے پارٹ بھی نہ سنبھال سکے، اور اسٹیج پر ان کے قدم نہ جمے" چہ خوش! اناٹمک ساگر کے مؤلف کے قلم سے ایسی بے پر کی زیب نہیں دیتی۔ تھوڑی بہت پوچھ گچھ کر لیا کیجئے۔ یہ جدید تنقید کی دنیا ہے۔ نئی تحقیق کا دور ہے۔ یہاں چھان بین کے بعد مستند بیان مانا جاتا ہے۔ آغا حشر مرحوم کے معمولی معمولی سے شاگرد بھی آج اسٹیج اور فلم کی دنیا میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا کر کامیاب ہو رہے ہیں اور انھیں اس پر فخر ہے کہ آغا صاحب نے اداکاری کا فن سکھایا۔ ذرا اپنے قریب ہی حکیم احمد شجاع صاحب اور سید امتیاز علی صاحب تاج سے دریافت کرکے دیکھئے کہ حشر کا اداکاری کی دنیا میں کیا درجہ تھا؟ پھر آپ کو قرائن دوڑانے اور مزید تجسس کی ضرورت نہ رہے گی۔

باقی جو پھبتیاں آپ نے کس کر آغا صاحب سے کسی "للّٰہی بغض" کی شہادت دی ہے۔ اس کی نسبت کچھ کہنے کی حاجت اس لئے نہیں کہ یہ سب باتیں سنجیدگی سے گری ہوئی ہیں۔ علمی، ادبی، تنقیدی دنیا میں ہر قسم کی ذاتیات معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ آپ بیتاب صاحب کے اس بیان کو اعجاز کا رتبہ دے رہے ہیں کہ "آغا مرحوم نے کسی یورپین خاتون کو رفیقۂ حیات بنا لیا"، اور پھر خود ہی اس کو ایک "کہانی" بھی لکھتے ہیں، یہ واقعی ایک لغو کہانی ہے جس کا پلاٹ بیتاب صاحب نے بنایا اور آپ نے اس پر حاشیہ آرائی فرمائی۔ حیرت ہے کہ اس فرضی یورپین خاتون کو اپنے قرائن سے بلند مرتبہ قرار دیتے ہوئے آغا صاحب مرحوم کو "جمالیات سے محروم۔ ناخواندہ، لاؤ ابالی، سدا کا تنگ دست" گردانا ہے اور مرحوم کا قصور یہ قرار دیا گیا کہ وہ انگریزی اخلاق سے بے بہرہ تھے یہ بیتاب صاحب یا آپ کا کمال نہیں، بلکہ ہماری غلامانہ ذہنیت کا تقاضہ ہے کہ انگریزی اخلاق سے بے بہرہ ہونا سوعیبوں کا ایک عیب ہے جس کا آپ کو بھی (لِلّٰہ انصاف) ماتم کرنا چاہئے۔ یہ سب افترا پردازی ہے ورنہ واقعہ دراصل یہ ہے کہ ایک انگریز خاتون جو مغربی اور مشرقی علم و ادب کی ماہر اور ہندوستانی ڈرامے سے دلچسپی رکھتی تھی۔ آغا صاحب مرحوم کے کمالات فن کی معترف تھی۔ موصوف نے آغا صاحب کو دیکھا تک نہ تھا۔ صرف ان کے ڈرامے دیکھ اور سن کر اس نے مرحوم سے خط و کتابت شروع کی جس کا سلسلہ کچھ مدت تک جاری رہا۔ وہ خطوط آغا صاحب مرحوم کے بے بہا ذخیرہ میں ابھی تک موجود ہیں اور میں بنارس میں انھیں دیکھ چکا ہوں۔ اس سے زیادہ کوئی جائز یا ناجائز تعلق اس داستان کا کچھ نہیں۔

علاوہ ازیں شیکسپیئر کے ناٹکوں کا ترجمہ (براہ راست یا بوساطت) آغا صاحب کے لئے چنداں وجہ امتیاز بھی نہیں۔ ڈرامہ نگاری کے جوہر ان کی طبع خداداد میں قدرت نے ودیعت کئے تھے۔ اور اہل نظر ان سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔

آغا صاحب مرحوم کے ہندی ڈراموں کے بارہ میں بیتاب صاحب کے بیان کو جو آپ نے سراہا ہے اس کی نسبت اتنا عرض کرنا ہے کہ خاکسار کے پچھلے مضمون میں اس کی پوری صراحت شائع ہو چکی ہے جس میں تفصیل سے روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ (حشر نگاری، کی اہلیت کسی دوسرے میں نہ تھی۔ اس ثبوت کے لئے کہ ہندی ڈراموں کا مصنف کوئی غیر شخص تھا جو ہندی داں ہونے کی حیثیت سے حشر کا ہم پلہ گردانا گیا) حشر کی طرز نگارش کو کیوں نہیں پرکھ لیا جاتا۔ حشر کے اردو ڈراموں کا جیتا جاگتا انداز حشر کے تہذیبی ڈراموں میں کیسے آیا۔ اس پر جب آپ یا کوئی معترض بھی غور کرے تو حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ "بن دیوی" ہو یا "گنگا اوترن" "سیتا بن باس" یا "بھیشم پرتگیہ"۔ حشر اسٹائل کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں اور بلا شک حشر کی تصانیف۔ ان میں سے ایک لفظ بھی کسی غیر کا لکھا ہوا نہیں، البتہ حشر مرحوم کے منشی جنہیں مرحوم پورے پورے ڈرامے بول کر لکھایا کرتے اگر یہ دعویٰ کریں کہ نقل کا نام تصنیف ہے اور اس لئے وہ ان ڈراموں کے مصنف ہیں اور بلا دلیل بیتاب صاحب یا آپ انھیں مان لیں تو کس کا اجارہ ہے۔ ورنہ ایک نہیں بے گنتی واقفین موجود ہیں جو شاہد ہیں کہ آغا صاحب مرحوم کو ہندی زبان پر کافی عبور تھا۔ آخر میں آپ کا بیان کہ "کردار نگاری سے آغا صاحب کو کیا واسطہ" افسوسناک ہے۔ آپ کی اس لاعلمی پر مجھے بیحد حیرت ہے کہ "آغا حشر اس صنعت (کردار نگاری) ہی سے ناآشنا تھے" ورنہ کوئی نہیں جانتا کہ حشر کے ڈراموں کے چھوٹے چھوٹے کردار بھی چلتی پھرتی زندہ یادگاریں ہیں حقیقت یہ ہے کہ حشر کی کردار نگاری پر ایک مستقل مبسوط باب کی ضرورت ہے۔

"یہودی کی لڑکی کا عذرا۔ سلور کنگ کا افضل اور پرودین، خوبصورت بلا کا توفیق۔ سورداس، میں رام داس (باپ کا کیرکٹر) خود بلوا منگل (سورداس)، چنتامنی (طوائف)، رمبھا (بیوی) آنکھ کا نشہ میں بیٹی، جگل، کام لتا، سروجنی اور کامنی۔ سیتا بن باس، میں سیتا جی اور رامچندر جی کے کردار، سہراب و رستم میں تہمینہ

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

پیا پیا مت بول

بول بول رے پران پپیہے! اگت کی بانی بول
ایسی بولی بول رے پنچھی! اُر کی لاگی دونی ہوئے
جیون کے سب سوت کھلیں اور من بھومی میں دھونی ہوئے
بھاڑ میں ڈاروں ان شبدوں کو نیک نہ بولن دونگی توئے
آگ لگے اس جیب کو تیری، رام کرے یہ گونگی ہوئے

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بول بول پپیہے! اگت کی بانی بول
ہردے بھیتر کیا بیتت ہے؟ کہا بتادے بھولی نار
کلپے، تڑپے، ٹس مس رو دے، رہے مسوسا مار
آہ، کراہ کی تن گن پاکے پیٹ میں لیتا ڈار
ہے رے مورکھ باورے! تو کوک پھر اسنسار

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے! اگت کی بانی بول
اونچا اُڑ اُڑ بادل پھاڑے، اِت اُت ڈولے ڈانواڈول
ٹکی مار کے پنچھی رودے، ٹپ ٹپ انسوا ہیں آن مول
ڈھکی چھپی سب رہنے دے! دبی لگی مت کھول
چھبتن لاگی کوئی نہ جانے، تو کیوں پیٹت ڈھول

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے! اگت کی بانی بول
اُت بیت کی یہ بھول ہے پنچھی! اگھاؤ لگے اب کچھ نا ہوئے
کاچے پھل جب پاک گئے تو جتنا کئے اب کچھ نا ہوئے
ہونی تھی سو ہوگئی پیارے! تیرے مَتھے اب کچھ نا ہوئے
گیا سمے پھر ہاتھ نہ آوے، ہاتھ ملے اب کچھ نا ہوئے

پیا پیا مت بول

کوئی سواگت بولی بول پپیہے! اگت کی بانی بول
بول بول رے پران پپیہے! اگت کی بانی بول

سوامی مارہردی

نظروں کا سلام

اس عشق کے ہاتھوں ایسا بھی اک منظرِ عام آجاتا ہے
خود حسن تماشا کرنے کو کھنچ کر لبِ بام آجاتا ہے

تارے ڈوبے نبضیں چھوٹیں ایسے میں تمہیں غمخوار نہیں
یہ وقت وہ نازک ہوتا ہے جب غیر بھی کام آجاتا ہے

تم نے تو نہیں توڑا دل کو تم کس لئے برہم ہوتے ہو
جب ظلم کے قصے چھڑتے ہیں ظالم کا بھی نام آجاتا ہے

جب عشق کے جلوے ہوتے ہیں عرفان نظر کی منزل میں
خود حسن تقاضا کرتا ہے اک ایسا مقام آجاتا ہے

دامن کا کوئی بھی گوشہ بیکار نہیں ہے دامن میں
جو پھولوں سے بچ رہتا ہے کانٹوں کے وہ کام آجاتا ہے

جب ملتا ہوں تو دانستہ ہوتے ہیں تجاہل آمادہ
جب کھنچتا ہوں تو چپکے سے نظروں کا پیام آجاتا ہے

ہنستی ہوئی کلیوں سے کہہ دو پھولیں نہ شمیم گلشن پر
اک ایسی ہوا بھی چلتی ہے رونے کا مقام آجاتا ہے

میں درد کو یوں بھی تعظیماً سینے سے لگائے رکھتا ہوں
جس وقت یہ کروٹ لیتا ہے لب پر ترا نام آجاتا ہے

بیگانہ رہی مری آنکھوں پر اے دوست مگر بے غرض آئی
دنیا اسے اپنا کہتی ہے جو وقت پہ کام آجاتا ہے

وہ نیم کشا وہ چلمن سے محجوب نگاہی کا عالم
جس طرح نکلتے سورج کی کرنوں کا سلام آجاتا ہے

جب نیت صادق ہوتی ہے زحمت نہیں ہوتی اٹھنے کی
جس جام پہ نظریں جمتی ہیں اُٹھ کر وہی جام آجاتا ہے

ان کافر گیسو والوں سے اللہ بچائے ہر دل کو
جب زلفیں بکھرا دیتے ہیں عالم تہ دام آجاتا ہے

وہ ہم سے گریزاں ہو بھی چکے مدت ہوئی اس کو اے محشر
لیکن اب بھی لگا ہے گا ہے نظروں کا سلام آجاتا ہے

فاروق محشر بدایونی

آجکل ہندوستان کے طول و عرض میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس غیر معمولی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اسکی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے۔
آجکل کے صفحات میں اشتہارات دے کر اپنی تجارت کو فروغ دے سکتے ہیں مفصل حلیات حاصل کرنے کیلئے مینجر۔ ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۱۶ دہلی

یہاں وہاں سے
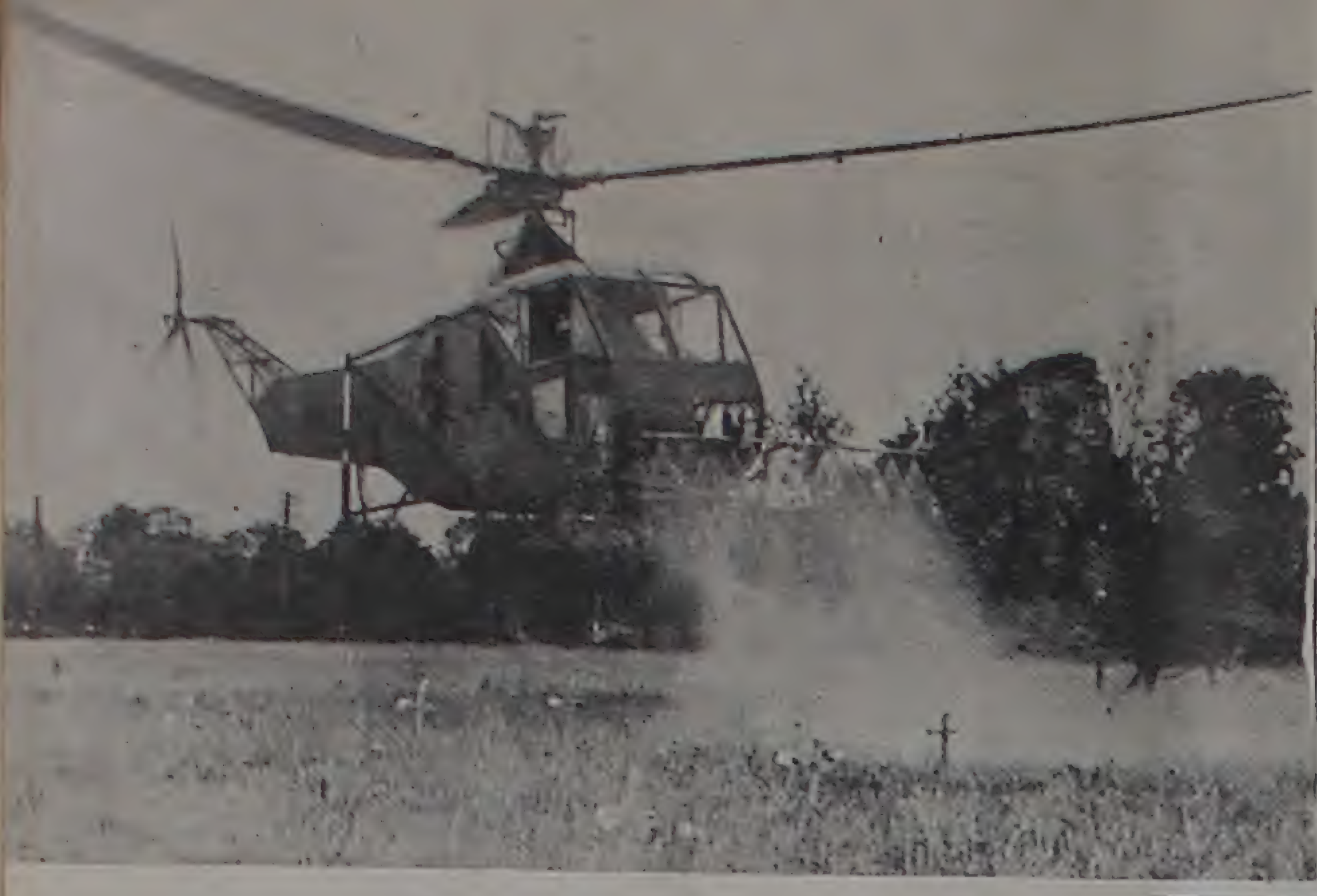
لڑائی ختم ہوچکنے کے باعث یہ «ہیلی کو پٹر» (بالائی پنکھے کا جہاز) کھیتوں میں ایسی ادویات چھڑک رہا ہے جس کے اثر سے نہ صرف خس و خاشاک کا بلکہ بیماری اور تباہی پھیلانے والے کیڑوں کا قلع قمع ممکن ہے۔ یہ طریقہ بہت ہی مفید ثابت ہوا ہے۔

→ دریائے ٹیمز کے کنارے ایک کشتی میں نئی وضع کا بانی کاٹ انجن لگا کر اسکا معائنہ کیا جارہا ہے۔ یہ انجن رولس رائس کمپنی کے ایک انجینئر کی ایجاد ہے۔ عنقریب ایسے انجن بہت تعداد میں تیار کرکے باہر بھیجے جائینگے۔

فٹ بال کا کھیل عراق کے لوگوں کو بہت زیادہ پسند ہے۔ اس تصویر میں عراقی «ہوائی بیڑے» اور متحدہ۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی ایک ساتھ نظر آرہے ہیں۔ حال ہی میں ایک مقابلہ کے آخری کھیل میں عراق کے قائم مقام بادشاہ تشریف لائے اور انعامات تقسیم کئے۔

کے قدیم نمونے

ایک هوشیار ماهر فن مٹتے هوئے نقوش کو دوباره اجال رها هے۔ یه ظروف اپنے زمانے کے قابل یادگار نمونے هیں۔

آج سے سینکڑوں سال پہلے آرٹ کے یه بیش قیمت نمونے جو چین' ایران' ترکی اور هسپانیه سے مصر لائے گئے تھے حوادث روزگار کے باعث مٹی کے نیچے دب گئے۔ حال هی کی کھدائی میں انکو برآمد کیا گیا هے۔ پانچ سال بعد ان کی عام نمائش شروع هوئی۔ انهیں دیکھکر عهد قدیم کی لائق تحسین صناعی کا اندازه هوتا هے۔

مٹی کا بنا هوا ایک ... جو چھ سو سال ... ایرانی کاریگروں نے تیار کیا تھا۔

تانبے کا بنا هوا چھ سو سال پرانا جھاڑ جسکے باره پہلو هیں۔ تیل میں ڈوبی هوئی متعدد بتیاں اسے روشن رکھتی هیں۔

چودهویں صدی کے ایرانی فن کا نمونه۔ قرمزی رنگ کی اس اونٹ پر خواتین کے بیٹھنے کی محمل بھی بہت خوب هے۔

کانسی کا ایک خوبصورت آفتابه۔ ٹونٹی کی جگه ایک مرغ اپنے پر پھیلائے کھڑا هے۔
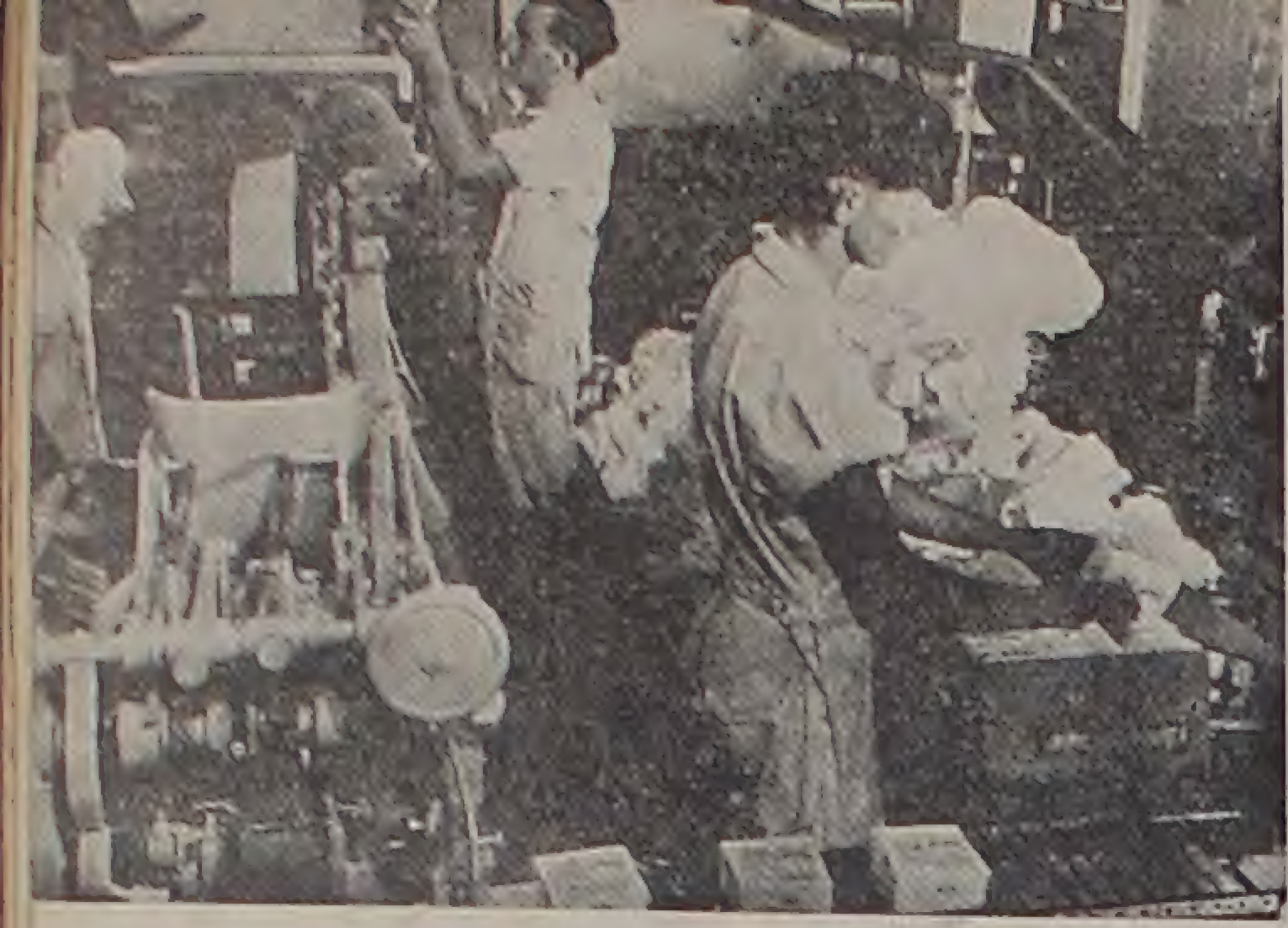
مکھن کی ٹکیاں کاٹنے اور کاغذوں میں لپیٹنے کی مشین

مکھن بنانے کی مشین میں سے مکھن نکل رہا ہے۔
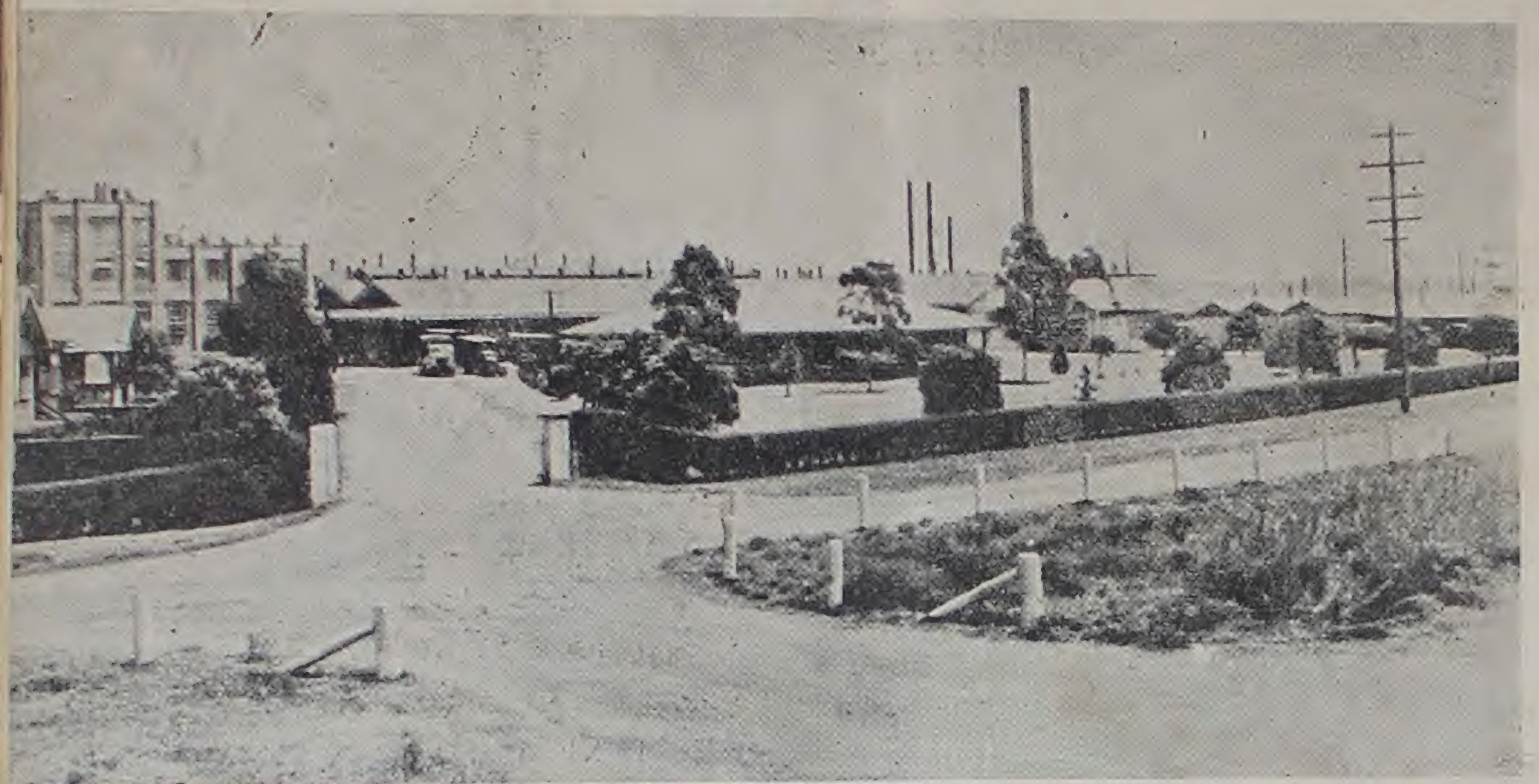
آسٹریلیا کے ڈیری فارم

نیو ساؤتھ ویلز میں مکھن بنانے والے ایک کارخانے کا عام نظارہ۔

مکھن بنانے والے کارخانے کی ایک لیباریٹری۔

صحت و صفائی کا لحاظ رکھتے ہوئے مکھن کے ڈبے بند کئے جارہے ہیں
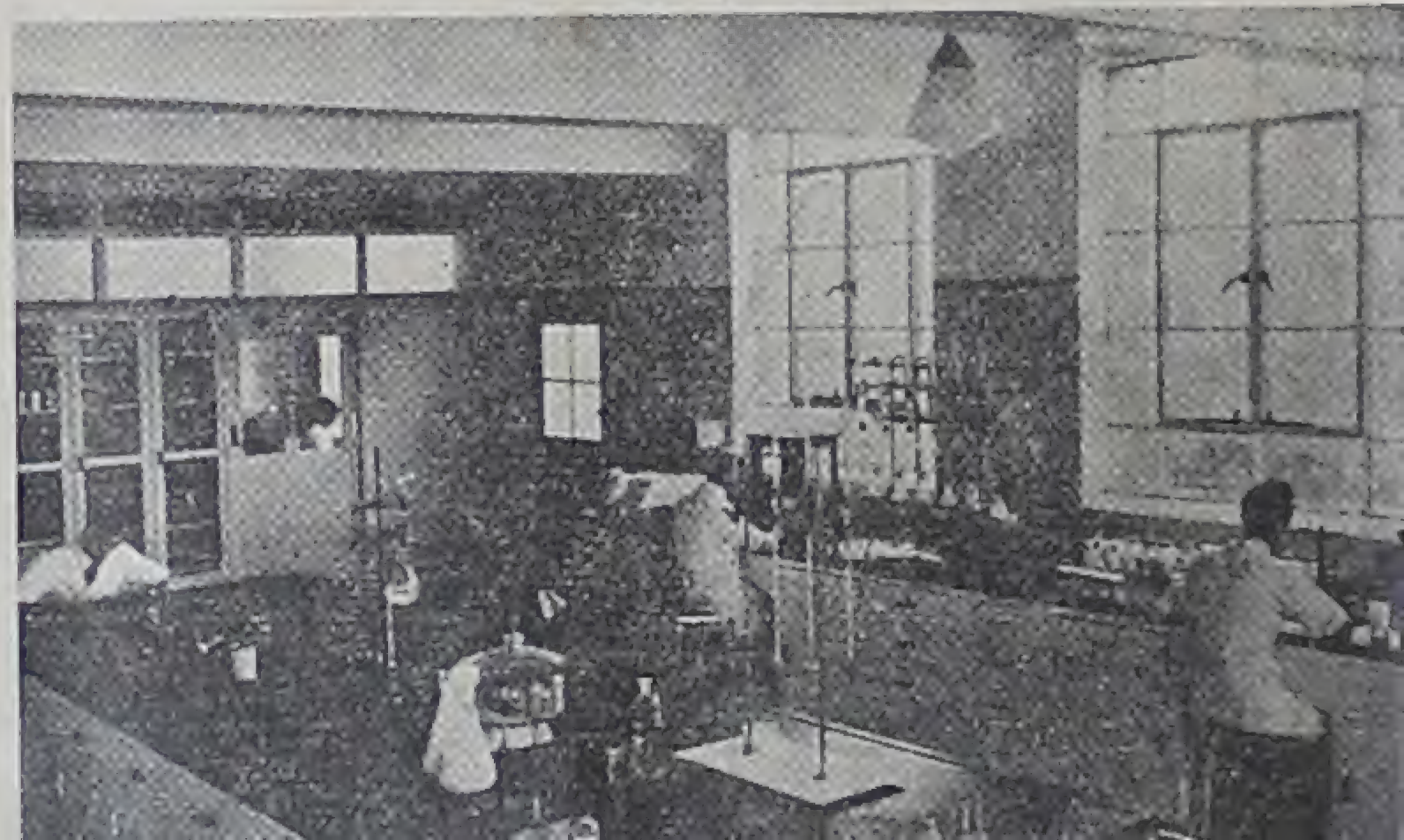
روشن اور ہوادار کمرے جنمیں کیڑے اور انڈے
پرورش پاتے ہیں۔

ہندوستان میں ریشم
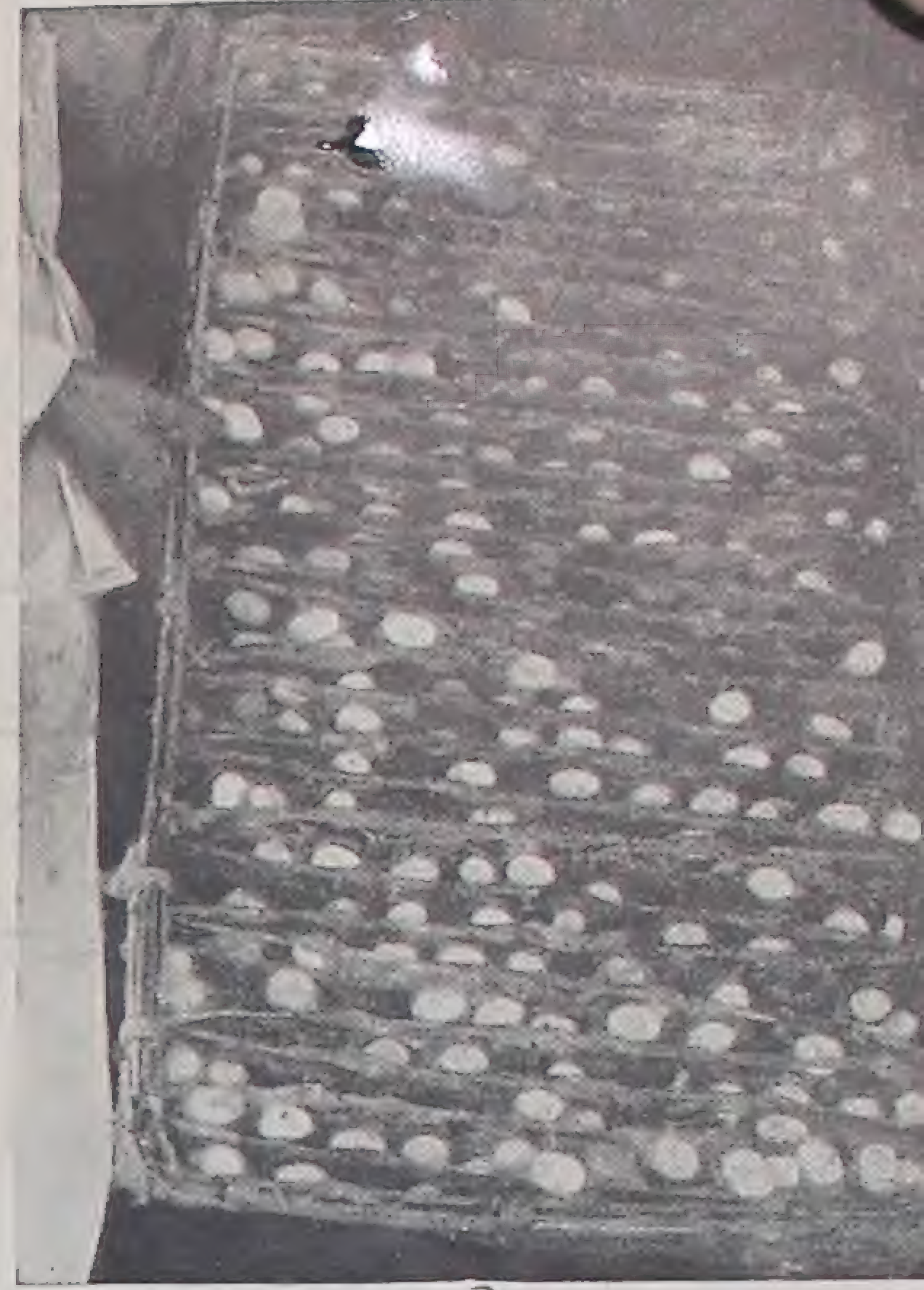
ی کشتی میں ریشم کے کوئے۔ ایسی ہی
ں میں ریشم کے کیڑے کوئے تیار کرتے ہیں۔

یں چین کے بعد ہندوستان بھی ریشم سازی کی صنعت کے
ہور ہے۔ قدیم ترین زمانے سے یہاں ریشم کے کیڑے
یار ہوتے رہے ہیں۔ اس وقت اس صنعت کا سب سے بڑا
یاست میسور میں ہے۔ ورنہ قابل ذکر کارخانے تو دوسرے
میں بھی موجود ہیں۔ ریشم کے کیڑے شہتوت کے
ر پرورش پاتے ہیں اسلئے کیڑوں اور انکے انڈوں کی
ال کے علاوہ شہتوت کے درختوں کی صحیح نشو و نما کا
ال رکھا جاتا ہے۔ اچھا ریشم صرف اسی کارخانے میں تیار
ہے جسکے زیر اہتمام کیڑوں اور انڈوں کا سائنسی معائنہ
یلئے عمدہ تجربہ گاہیں ہوں۔ شہتوت کے پتوں کو چاٹ
ننھے کیڑے خاصے بڑے ہو جاتے ہیں انہیں کیڑبلز
تا ہے۔ تقریباً چھ ہفتے بعد وہ اپنے ہی جسم کے گرد تار
لگتے ہیں۔ چند دن بعد وہ مکوڑوں کی شکل میں
ے باہر آجاتے ہیں اور پر نکلنے تک آرام کرتے ہیں۔
ں سے ماداؤں کو خاص طور پر ریشم کی تھیلیوں میں بند
جاتا ہے تاکہ وہ حدود سے باہر جاکر انڈے نہ دے سکیں۔

کے ایسے کیڑوں سے بھری ہوئی کشتی جنکی عمر
صرف سات یوم ہے۔

میسور کے صنعتی کارخانوں میں اتنے زیادہ انڈے نکلوائے جاتے ہیں کہ ریشم سے قطع نظر انکی تجارت بجائے خود بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ دوسرے شہروں کے چھوٹے ریشم ساز ان کیڑوں کو خرید کر اپنا کام چلاتے ہیں۔ ہندوستان کا ریشمی کپڑا یا صرف ریشم بڑی مقدار میں آس پاس کے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حکومت بھی خاطر خواہ مدد دیتی ہے تاکہ یہ ہندوستانی تجارت اچھی طرح فروغ پاسکے۔

کی صنعت

مائکروسکوپ والے کیمرے کے ذریعہ ریشم کے انڈوں کی تصویریں لی جا رہی ہیں۔ انہیں دیکھ کر اندازہ لگایا جائیگا کہ کونسے کارآمد ہیں اور کونسے بیکار۔

کیڑوں کی مادائیں انڈے دے رہی ہیں۔ انکی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ لگانے کیلئے انکا شجرۂ نسب محفوظ رکھا جاتا ہے۔

ذخیرے کے کمرے میں کوئے ٹوکروں میں بھرے رکھے ہیں۔ یہ ہندوستان بھر کے ریشم سازوں کو بھیجے جائینگے۔ ←

چینی طالبات

چین کی نئی پود ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ اس سلسلے میں لڑکیاں لڑکوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں ہیں۔ لڑائی کے خطرناک ماحول کے باوجود انہوں نے دوسرے مشاغل کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھی ہے۔ اس صفحے کی تصاویر میں گن لنگ زنانہ کالج کی لڑکیاں نظر آرہی ہیں جو صوبہ ذی شوان کے شہر چنگ ٹو میں واقع ہے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے کالج چین کو حیات نو بخشنے میں بڑی مدد دینگے

کالج کی چند طالبات مطالعے میں مصروف ہیں۔ پشت کی جانب دیوار میں لگا ہوا سونے کا تختہ غور طلب ہے۔ ←

ایک طالبہ اپنے ذاتی کمرے میں۔ اسکا لباس بالکل نئی وضع کا ہے جس کا رواج سارے ملک میں ہو چلا ہے۔

کالج کی عمارتوں اور میدانوں کا ایک خوشنما منظر۔ اس حصہ ملک کو جاپانی بمباری سے نقصان پہنچ چکا ہے۔

عراق

عراق کی سرزمین قدیم زمانے سے آج تک عظیم الشان محلوں اور مستحکم مقبروں کیلئے مشہور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طرز تعمیر میں ہمیشہ تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن نفاست و پاکیزگی کا ہمیشہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر محل اور مقبرے کے ساتھ شاداب باغیچے اور عمدہ روشیں بنائی جاتی ہیں۔ سابق شاہ عراق کو بھی عمارتیں
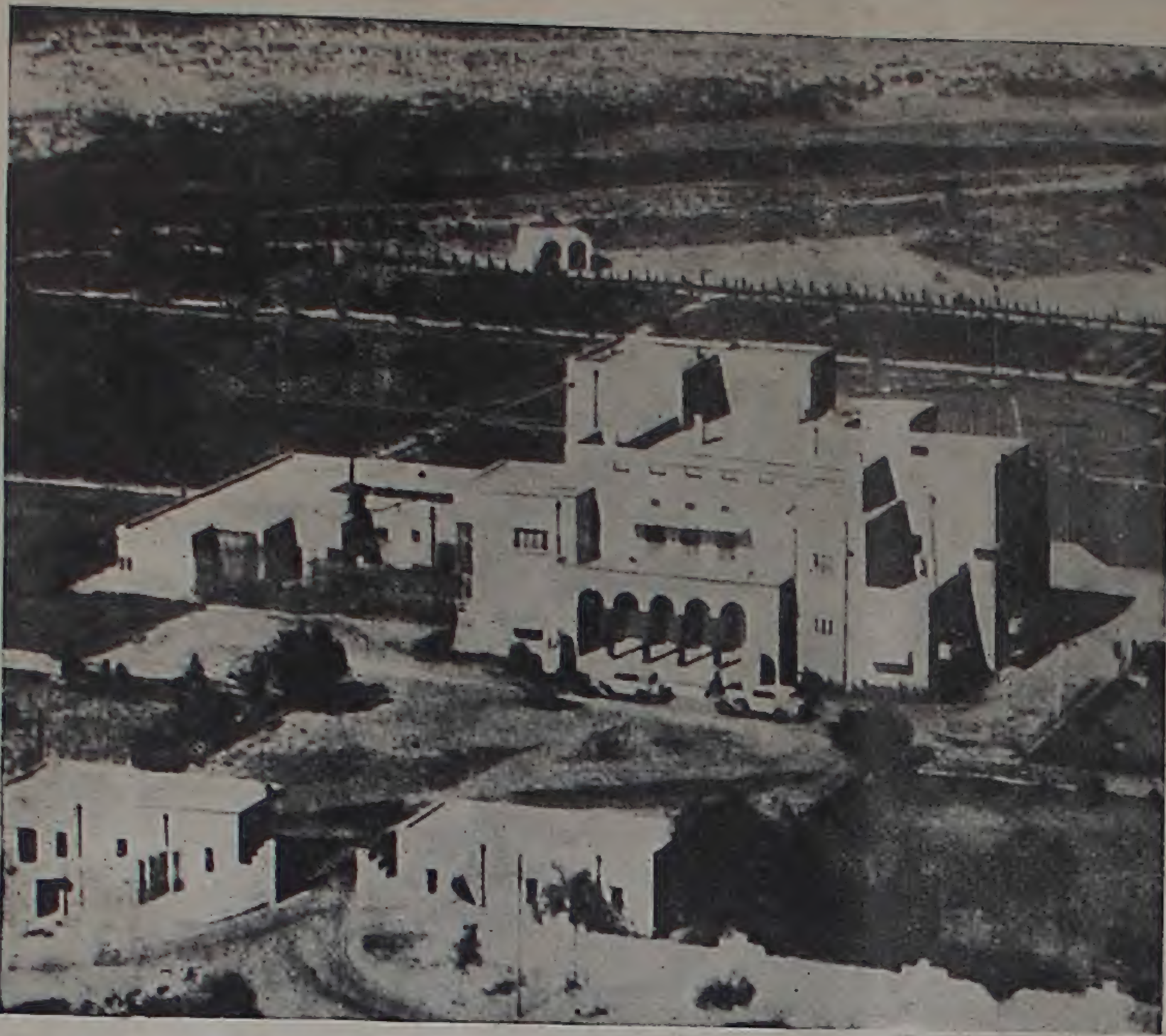
قصر الرحاب کا ایک دلکش منظر۔ آجکل اس میں عراق کے قائم مقام بادشاہ رہتے ہیں۔ یہ تصویر عراق کے فضائی محکمے نے کھینچی ہے۔

بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ انکے عہد کے دو محل قصر الزھور اور قصر الرحاب خاص طور پر مشہور ہیں۔

سابق شاہ فیصل کے مقبرے کا طائرانہ منظر۔ یہ تصویر بھی عراق کے فضائی محکمے نے کھینچی ہے۔ ←

مس ستارہ — فلم ایکٹرس

ترجیح

افسانہ

دیوندر ستیارتھی
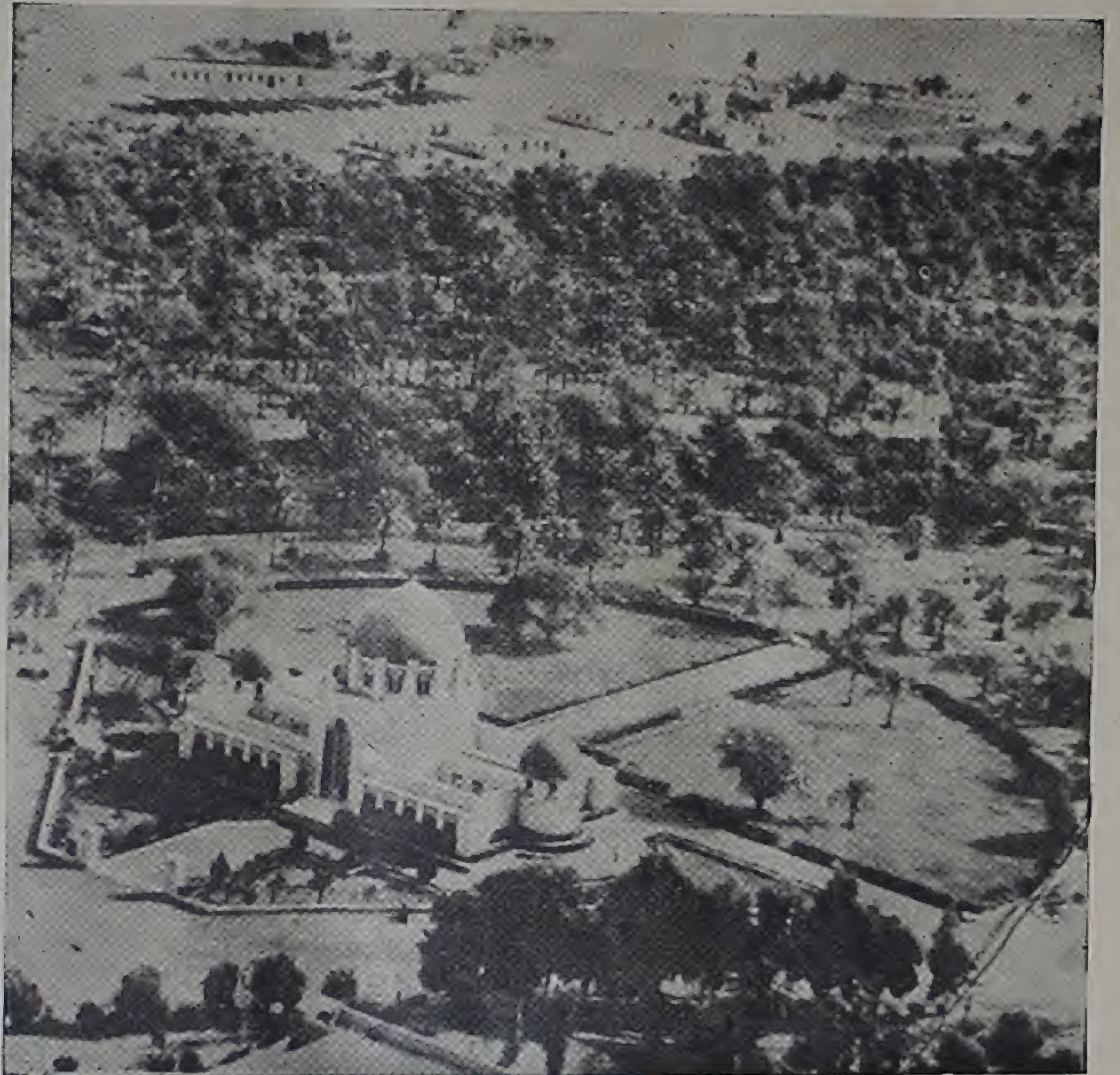
یہ نمائش کا آخری دن تھا۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے تیوریوں کا عجیب سا ترشول بنایا جو نیل کمل کی منہ بولی اماں یعنی اس کی بڑھیا پڑوسن کے ماتھے پر اکثر نظر آجاتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کنگھی چوٹی کی اور سڑک پر آگئی۔ یہ طے تھا کہ وہ ٹھیک وقت پر نیل کمل کے ہاں پہنچے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ آج نمائش کے راستے میں وہ دل کی بات کہہ ڈالے گی۔ آخر کوئی کب تک راز کو چھپا کر رکھ سکتا ہے؟ اس سے فائدہ؟ ایک لطیف سا خوف اس کی روح کی پہنائیوں سے ابھرتا اور چلتے چلتے اس کے پاؤں دھیمے پڑ جاتے۔ آخر یہ بات وہ نیل کمل سے کیسے کہے گی؟ وہ کیسے اسے سمجھائے گی کہ اس کی سوہنیا خوشی اور غم کے درمیان معلق ہے۔ وہ کیسے اسے جتائے گی کہ اسے دنیا والوں سے ڈر لگتا ہے۔ ان دنیا والوں سے خدا ہی بچائے۔ انکی ایک ہی تہمت عورت کو کچل کر رکھ سکتی ہے۔ آج اسے نیل کمل کی مدد کی ضرورت تھی آج اسے بے پناہ خلوص کا ثبوت ملنا چاہئے۔ ورنہ بات پھیل جانے کے بعد معاملہ بگڑ جائے گا۔ جیسے وہ ایک گہری جھیل میں ڈوب رہی ہو۔ نمائش کا خیال آتے ہی وہ سنبھل گئی۔ یہ طے تھا کہ آج نیل کمل نہ سبھی چیزیں خریدے گا جنہیں وہ دو تین دکانداروں سے ریزرو رکھنے کو کہہ آئے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ نمائش سے لوٹتے ہوئے نیل کمل سے اپنا قصہ کہے گی، پہلے نہیں۔ اس کی بے چینی کسی قدر کم ہو گئی اور وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ نیل کمل غیر حاضر ہے۔ بڑھیا پڑوسن نے حسب معمول ماتھے پر تیوریوں کا ترشول بنا کر اس کے ہاتھ میں چابی تھماتے ہوئے کہا! تم بیٹھو، سوہنیا۔ نیل کمل کا تو سبھاؤ ہی ایسا ہے۔ وعدہ کر کے بھول جاتا ہے!

وہ چاہتی تھی کہ اکیلی ہی نمائش کا راستہ ناپے۔ شاید ادھر کہیں نیل کمل بھی مل جائے۔ لیکن بے دلی سے کمرہ کھول کر وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ بڑھیا اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ چلو اچھا ہوا اس نے سوچا، اس چڑیل سے تو چھٹی مل گئی۔ یہاں آبیٹھتی تو وہی پرانا راگ چھیڑ دیتی — یہ آجکل کی لڑکیوں کو کیا ہو گیا، سوہنیا۔ نہ لاج نہ شرم۔ تم ان سے الگ ہو نیل کمل ہمیشہ تمہیں سراہتا ہے۔

دیوارگیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ یہ مجسمہ اسے پسند تھا۔ فنکار نے ایک حسینہ کو کچھ اس انداز میں پیش کیا تھا کہ دیکھنے والے کو خواہ مخواہ خیال آجائے کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کا رنگ کچھ اس طرح بدل گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا آنے والے مہمان کے خیال ہی سے اسے کوفت ہو رہی ہے۔

صوفے کے قریب فرش پر ڈھیر کی ڈھیر کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اٹھ کر انہیں درست کرنے لگ جاتی۔ اس وقت اس کی یہ حالت تھی جیسے کسی نے اسے دنیا کی لطف مسرتوں سے محروم کر دیا ہو۔ اسے یاد تھا کہ ایک روز نیل کمل نے اسے ایک کتاب سے کسی عورت کے جذبات پڑھ کر سنائے تھے — پہلے وقتوں میں دیوتا دھرتی پر اترتے تھے اور عورتوں سے محبت کرتے تھے۔ اب وہ نیچے نہیں اترتے۔ اگر وہ مر چکے ہیں یا بوڑھے کھوسٹ ہو چکے ہیں تو کیا مجھے وہ محبت نصیب نہ ہو گی جو زندگی کے ساز پر درد بھرے گیت چھیڑ سکے؟ ......

اٹھ کر وہ اس کتاب کی تلاش کرنے لگی۔ یہ خیال اسے گدگدانے لگا کہ نیل کمل معمولی انسان نہیں، کوئی دیوتا ہے جو آسمان سے دھرتی پر اتر آیا ہے۔ ایک کالی کلوٹی لڑکی کے روبرو محبت کا اظہار کرنے والا شخص ضرور کوئی دیوتا ہو گا۔ لیکن اپنی مشکل کا خیال اسے بری طرح ستا رہا تھا۔ آج وہ سب بات کہہ ڈالے گی اگر دیوتا نے مجھے ٹھکرا دیا تو میرا کیا حشر ہو گا؟ یہ فنکار قسم کے لوگ بہت بے پروا ہوتے ہیں۔ لیکن اب اس کا بھی کیا علاج کہ نیل کمل کا نام میری روح پر کچھ اس طرح نقش ہو گیا ہے۔ جیسے کسی نے مرمریں سطح پر نوکدار چاقو سے اپنا نام کندہ کر دیا ہو۔ دیوارگیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف اس نے اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔

آئینے کے سامنے اس نے پھر سے بال کھول ڈالے اور تیزی سے کنگھی کرنے لگی۔ کمرے کی بکھری ہوئی چیزوں پر اسے غصہ آرہا تھا۔ کنگھی نہ کی جائے تو بال الجھ جاتے ہیں۔ کمرہ بھی صفائی چاہتا ہے۔ بھلا کوئی پوچھے کیلے کے چھلکے میز کے پاس کیوں پڑے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تو دیوارگیر کے مجسمے کو منہ چڑا رہے ہیں۔ چھت کے قریب مکڑی نے جالے تن رکھے ہیں۔ دیواروں پر شاید برسوں سے سفیدی نہیں کرائی گئی۔ یہ فنکار قسم کے لوگ اپنے لئے تھوڑا بہت اصول وضع کر لیں تو ذرا بہتر طور پر زندگی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ہم مل کر رہیں گے، مل کر کمائیں گے۔ نیل کمل میری آواز پر مرتا ہے۔ کہتا ہے، سوہنیا تیری آواز تو بلبل کو شرماتی ہے۔

مجسمے کے قریب رک کر وہ اسے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ مجسمے کی حسینہ اس جیسی سو لڑکیوں پر بھاری ہے لیکن جب ایک بار نیل کمل اسے اپنی کہہ چکا ہے تو وہ اپنا فیصلہ کبھی رد نہ کر سکے گا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ مجسمے کے قریب سے ہٹ گئی۔ کیلے کے چھلکے اٹھا کر اس نے باہر پھینک دئے اور فرش پر بیٹھ کر کتابوں کو قرینے سے رکھنے لگی۔ اچانک اس کے دل میں یہ چاہت پیدا ہوئی کہ بڑھیا بھی آجائے

اور اس کی مدد کرے۔ اس نے بڑھیا کو آواز دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ شاید وہ کہیں باہر چلی گئی۔ اسے خیال آیا کہ بڑھیا ابھی یہاں چلی آئے تو پھر سے یہی رٹ لگانے لگے کہ چاند سورج کی جوڑی اچھے کرموں سے بنتی ہے۔ ایک کالی کلوٹی لڑکی کو چاند سے تشبیہ دینا، یہ کچھ بڑھیا ہی کے حصہ میں آیا ہے۔ اس کے جی میں آیا کہ فوراً اٹھ کر آئینے میں اپنا روپ دیکھے۔

نمائش کا آخری دن ہے اور رونق یوں اٹھتا چلا جائے۔ وہ گھبرا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی اکیلی ہی نمائش کا رخ اختیار کرے آخر اس حماقت کا کیا مطلب کہ نمائش کا آخری دن یوں بدمزگی کا شکار ہو جائے۔

نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اب نیل کمل کبھی اس کمرے میں نہیں آئے گا۔ جیسے اس کا سر درد کے مارے پھٹا جا رہا ہو۔ ان تین مہینوں میں انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اب اسے دوبارہ آنکھ مچولی کھیلنے کی ضرورت کیوں محسوس ہو گی؟ نہ میں نے اس پر یقین کیا ہوتا نہ آج میری یہ حالت ہوتی۔ میری بد دعائیں اسے لگ جائیں گی۔ بس وہ انتقام لوں گی کہ دنیا میری ہمت کی داد دے گی۔ لیکن نیچے زینے سے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ سنبھل کر بیٹھ گئی جیسے کوئی نرتکی باہیں پھیلائے گت کا انتظار کر رہی ہو۔

"مجھے معلوم تھا کہ کمل ابھی تک نہ آیا ہو گا" بڑھیا نے نیچے سے آ کر کہنا شروع کیا "بس ایسا ہی ہے میرا منہ بولا بیٹا سونیا۔ اس سے تو تم ہی اچھی ہو"

بڑھیا دہلیز پر بیٹھ گئی۔ سونیا اٹھ کر سڑک کی طرف کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ رات اتر آئی تھی۔ قمقمے روشن ہو اٹھے تھے وہ اندھیرے میں دور کہیں کسی کو آتے ہوئے دیکھنے کیلئے بیقرار ہو اٹھی۔ ایک بھاری بھرکم ٹرک سڑک کی چھاتی کو دہلاتا ہوا نکل گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بھی ایک سڑک کی طرح ہو۔

اس نے مڑ کر دیوار گیر کے مجسمے کی جانب دیکھا جس کے انگ انگ سے درد زہ کا علامتی تصور روشن ہو اٹھا تھا۔ اس نے سوچا کیوں نہ اپنی بات بڑھیا سے کہہ ڈالے

بڑھیا کہہ رہی تھی "تم اداس کیوں ہو، سونیا؟ آؤ تمہیں ایک کہانی سناؤں"

کہانی! ـــ کیسی کہانی؟ اس سے پیشتر کہ وہ ہاں یا نہ کہتی، بڑھیا نے کہنا شروع کیا "بہت پہلے دیس میں بہت بھیانک کال پڑا۔ چشمے، تالاب اور کنوئیں، سب سوکھ گئے۔ رات کا وقت تھا۔ ایک لڑکی پانی کی تلاش میں نکلی۔ تھک ہار کر اس نے مٹکی زمین پر رکھ دی

اور سو گئی۔ آنکھ کھلی تو آنسو امڈ آئے۔ بھگوان کی کرپا سے اس کی مٹکی تازہ پانی سے بھر گئی۔ وہ بہت پیاسی تھی۔ لیکن ماں کو پانی پلائے بغیر ایک بوند تک حلق میں ٹپکانا پسند نہ تھا۔ مگر پہنچی تو ماں کے سرہانے جم دوت کھڑے تھے۔ ماں بولی "بیٹی میرا آخری وقت قریب ہے۔ اب پانی تمہارے لئے ہے" جونہی اس نے کٹورا بھر کر پانی پینا چاہا کہیں سے ایک راہی آ نکلا۔ لڑکی نے اپنا کٹورا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سات قطرے لڑکی کی گود میں آ گرے۔ مٹکی سے ایک ندی بہہ نکلی جو آسمان پر پہنچ کر آکاش گنگا (کہکشاں) بن گئی۔ اور وہ سات قطرے سات ستارے بن گئے"...... کوئی اور وقت ہوتا تو سونیا یہی کہتی کہ تم نے یونہی نیل کمل پر رعب جما رکھا ہے۔ یہ بکواس ہے کہ مٹکی سے گنگا بہہ نکلی۔ بھلا یہ گنگا آسمان پر کیسے جا پہنچی؟ راہی کے ہاتھ میں تھامے ہوئے کٹورے سے لڑکی کی گود میں سات قطرے گرے، اور جیسا کہ نیل کمل نے مشہور کر رکھا ہے، تم بھی سات بیٹیوں کی ماں رہ چکی ہو۔ یہ بہت بڑی گپ ہے۔ دیکھو تمہاری گیان گودڑی۔ اسے نیل کمل کے سامنے ہی کھولا کرو۔ لیکن یہ سوچ کر کہ یہ وہی بڑھیا ہے جس نے ابھی کہا تھا ـــ بس ایسا ہی ہے میرا منہ بولا بیٹا، سونیا۔ اس سے تو تم ہی اچھی ہو۔ وہ بڑھیا سے کہنا چاہتی تھی کہ دادی اماں، تمہاری یہ آکاش گنگا والی کہانی تو بہت بڑی حقیقت ہے شاید میں ہی وہ لڑکی ہوں جو پیاسی ماں کیلئے پانی کی تلاش میں بھٹکتی رہی تھی۔ تمہارا یہ نیل کمل ایک راہی کی طرح ہمارے ہاں چلا آیا اور میں نے وہی سلوک کیا جو ہمیشہ ایک مہمان کا حق ہوتا ہے۔

ایک طرف صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی رنگین تصویر آویزاں تھی جو ابھی اگلے ہی روز اپنے جنم دن کے موقع پر اس نے نیل کمل کو پیش کی تھی اور جسے بیتے ہوئے اس نے ایک ادیب کا کوئی اچھوتا خیال پڑھ کر سنایا تھا ـــ "اپنی معصوم بھیڑوں پر کئے گئے ظلم کی خدا کا بیٹا تاب نہ لا سکا اور اس نے صلیب پر چڑھنا قبول کیا یہی نجات کا ایک صحیح طریقہ ہے" اس کے ذہن میں نجات کا خیال بجلی کی سی کوندے کی طرح لپکا۔ اور وہ کھڑکی سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

بڑھیا نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔ وہ بول اٹھی "لڑکی کے لیکھ تو سبھی جنم سے پہلے ہی لکھے جاتے ہیں، سونیا!"

سونیا نے ایک ریشمی سی مسکراہٹ چھینکتے ہوئے بڑھیا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو یہ لیکھ ویکھ کا قصہ میری سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ وہ بولی "چھوڑو کوئی کام کی بات کرو، دادی اماں"

بڑھیا نے اس روکھے جواب سے ذرا برا نہ مانا۔ وہ تو اپنی گذشتہ زندگی کے خیال میں الجھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا سوچ کر وہ کہہ اٹھی "اداسی

روٹی کو پھر سے سینک کر کھانے میں مزہ آتا ہے سونیا!"

سونیا چاہتی تھی کہ بڑھیا سے کہے، یہ پہیلیاں کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ مجھے نپٹ انجان مت سمجھو۔ تم یہی کہہ رہی ہو نا کہ ہمارا بیاہ ہو جائے تو تمہیں کسی کے ہاں کام کر کے روٹی کمانے کی ضرورت ہی نہ رہ جائے۔ یہ سچ ہے کہ اگر ہم تمہیں گھر کا کام سونپ دیں گے تو تمہاری بیتی ہوئی خوشیاں پھر سے لوٹ آئینگی۔ باری باری تمہاری زندگی میں سات بیٹے آئے۔ مگر کچھ بھی تو نہ رہا۔ نیل کمل تمہارا منہ بولا بیٹا ہے۔ کبھی کبھار تمہارے ہاتھ پر دو چار آنے رکھ دیتا ہے تو تم خوش ہو جاتی ہو۔ ہمارا بیاہ ہو جائے تو میں اور بھی خوش کیا کرونگی۔

بڑھیا اپنے تمام خیالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے بولی۔ "میں تو تمہارے بیاہ پر تمہیں چاندی کا چھلا بھی نہیں دے سکونگی، سونیا"

اس کے جواب میں سونیا جھٹ کہہ اٹھی۔ "وہ تم نے ہی تو کہا تھا، دادی اماں کہ روپ کو سنگار نہیں چاہیئے"

بڑھیا کھسیانی سی ہو گئی۔ میں دھنوان ہوتی تو بہو کو سونے میں پیلی کر دیتی۔ میں تو تمہارے بیاہ کے دن گن رہی ہوں، سونیا!

سونیا مسکرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ بیکار دن گنتے رہنے سے کیا فائدہ۔ کل کل کرتے رہو تو وہ کل کبھی آتا ہی نہیں کل کا نصیبہ دھندلا ہے۔ یہ آج، بہت انتظار کے بعد آیا ہے۔ اگر یہ آج بھی بیکار چلا گیا تو سمجھ لو دو زندگیاں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے پرے ہٹ گئیں دیوار گیر پر رکھے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھتے ہوئے اب اسے پہلی سی کوفت محسوس نہ ہوئی غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں صلیب پر چڑھتے ہوئے مسیح کی طرف گھوم گئیں۔

بڑھیا کی آنکھوں میں آنسو چمک اٹھے۔ جیسے سات بیٹوں کو کھو کر آٹھواں بیٹا پا لیا ہو۔ اب اس بیٹے کا بیاہ ہوگا۔ بہو بری نہیں کرسٹان ہے تو کیا ہوا وہ میموں کی طرح بال تو نہیں کٹاتی۔ جیسا دیس کا رواج ہے، وہ ساڑھی پہنتی ہے سونیا کی سفید ساڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کہہ اٹھی۔ سانولے رنگ پر سفید کپڑا ہی سجا دیتا ہے، سونیا"

سونیا نے ہنس کر کہا "مگر بیاہ کے موقع پر تو لال ساڑھی چاہیئے نا کیوں دادی اماں؟"

بڑھیا جھٹ کہہ اٹھی۔ اپنے ہاتھ سے میں تیری مانگ میں سیندور بھرونگی، سونیا"

سونیا کہنا چاہتی تھی کہ نیل کمل تمہارا بہت ادب کرتا ہے۔ تم کہو گی تو کل ہی مجھ سے بیاہ کرے گا۔ ہاں، اب تو فیصلہ ہو ہی جانا چاہیئے۔ آج میں نیل کمل کو اپنی حالت سے آگاہ کر دوں گی۔ مہینے ڈیڑھ مہینے کا حساب تو آسانی سے اِدھر اُدھر کیا جا سکتا ہے۔ اگر نیل کمل انکار کر دے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ میری ماں بھی شاید میری مدد نہ کرے۔ چھوٹی بہن مجھے بیوقوف سمجھ سکتی ہے۔ شاید میں یونہی ڈرتی ہوں۔ نیل کمل خوشی سے اچھل بھی تو سکتا ہے۔

وہ چاہتی تھی کہ صوفے سے اٹھ کر بڑھیا کے قریب دہلیز پر جا بیٹھے اور اس سے کہے کہ خدا نے چاہا تو کل ہی میرا بیاہ ہو جائے گا۔ نیل کمل بازار سے لال ساڑھی لیتا آئے گا۔ سیندور تم دے دو گی۔ لیکن نہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ سکی نہ منہ سے ہی کچھ کہہ سکی۔ پہلیرن کی طرح بیٹھی اپنے جذبات کو بیاہ کے دھاگے میں پروتی رہی۔ اسے یقین تھا کہ نیل کمل کی رگوں میں ایک شریف گھرانے کا خون دوڑ رہا ہے اور تھوڑا سا زور ڈالنے ہی سے وہ مان جائے گا۔ آج تو اب ختم ہو رہا ہے۔ کل ہمارا بیاہ ہو جانا چاہیئے۔ بڑھیا سب سے پہلے بدھائی دے گی۔ نیل کمل کے دوست کتنے خوش ہونگے۔ سب سے زیادہ خوشی سُشنکر کو ہوگی جو ابھی اس روز ہنس کر کہہ رہا تھا۔ کمل بھیا، تمہارے بیاہ پر میں تمہارے ساگوان کے صوفے پر نیا پالش کرا دوں گا۔ پھر دیکھنا یہ کتنا خوبصورت نظر آنے لگا۔ جواب میں نیل کمل نے آداب عرض کرتے ہوئے کہا تھا۔ خوبصورتی پالش نہیں چاہتی۔ اسے یاد تھا کہ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی تھی جبکہ نیل کمل کا کندھا جھنجھوڑتے ہوئے سُشنکر کہہ اٹھا تھا سچ ہے، میاں مجنوں ...... اور وہ جو رومن نے کہا تھا۔ خوبصورتی اور بدصورتی کے درمیان ہمیشہ ایک مرئی یا غیر مرئی حد فاصل موجود رہے گی لیکن فن کی سطح تک ابھرنے پر بدصورتی بھی بدصورتی نہیں رہتی۔ دیوار گیر کے مجسمے کی طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اس نے سوچا نہ جانے رومن کیا کہنا چاہتا تھا۔ کل ہی ہمارا بیاہ ہو جائے تو نہ جانے رومن کیا بھینٹ لائے گا۔

بڑھیا کہہ رہی تھی۔ "ایسی سب گن پوری بہو تو ہر ساس کو ملے سونیا"

جواب میں سونیا کہنا چاہتی تھی کہ تم دیکھ لو گی، دادی اماں، میں ناشکری نہیں ہوں۔ خوبصورتی تو صرف ایک گن ہے۔ اس دیوار گیر کے مجسمے کی حسینہ ہی کو لے لو۔ وہ خوبصورت ضرور ہے۔ سب گن پوری نہیں۔

ہر لحظہ ایک اچھی بہو بننے کا خیال اس کے خون کو گرمانے لگا۔ وہ جو اس روز رومن نے پدمنی، چترنی، ہستنی اور سنکھنی کا قصہ چھیڑ دیا تھا۔ اور عورت کی ان چار قسموں کا ذکر کرتے ہوئے نیل کمل کہہ اٹھا تھا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ پدمنی خوبصورت ترین ہونے کے باوجود بدصورت ترین دماغ رکھتی ہو۔ رومن بابا، مجھے پدمنی نہیں چاہیئے۔ وہ بڑھیا سے کہنا چاہتی تھی کہ مجھے تم سے کوئی زیور نہیں چاہیئے، دعا ہی کافی ہے۔

بڑھیا کہے جا رہی تھی۔ "لال ساڑھی نہ بھی لائی جا سکی تو اکیلا سیندور ہی بہت ہے، سونیا!"

سونیا نے جواب میں صرف اتنا کہا۔ "نیل کمل چاہے گا تو مجھے سیندور سے مانگ بھرانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ روحوں کے ملاپ کیلئے بیاہ تو ضروری ہے۔"

ایک بار سونیا کا خیال اپنی سہیلیوں کی طرف چلا گیا۔ ہر کسی نے اپنی پسند کا دولہا چنا تھا۔ موہنی کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ اچھا خاوند وہی ہے جو ہر روز جارجٹ کی نئی ساڑھی لا سکے۔ جارجٹ کی ساڑھی! اس کے پندار کو ٹھیس سی لگی۔ کیا روحوں کے ملاپ کیلئے جارجٹ کی ساڑھیاں نہایت ضروری ہیں؟ درشنی شہرت کی بھوکی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک فلم ایکٹر سے شادی کر لی۔ لاجی کو نہ جارجٹ کی ساڑھیاں چاہئیں نہ شہرت۔ اس نے سو فیصدی مرد قسم کا خاوند چن لیا ہے۔ مجھے بھی چاہئے کہ نیل کمل کو ہر قیمت پر خوش رکھوں۔ فنکار قسم کا شخص غریب ضرور رہتا ہے۔ لیکن اگر اس کا انتخاب کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہے تو بیاہتا زندگی مزے سے گزر سکتی ہے۔ نیل کمل ہی میری مشکلات کا واحد حل ہے۔ مکمل مرد تو بھلا کہاں ملے گا؟ مکمل مرد! جیسے نیل کمل کو مکمل مرد سے کچھ کم نمبر دے کر اسے امتحان میں اول رکھنے کے باوجود اسے ذہنی کوفت ہو رہی ہو۔ اور مکمل عورت! ـــ اس کا بھی صرف تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب روحوں کا ملاپ ہو جاتا ہے تو مرد عورت کا جوڑا دنیا بھر کی خوشیاں محسوس کرتا ہے۔

وہ اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ سڑک پر بے حرکت سائے رینگ رہے تھے۔ ان سایوں میں لحظہ بہ لحظہ اپنی طرف آتے ہوئے نیل کمل کا تصور اس کے ذہن کو گدگدانے لگا۔ اسے خیال آیا کہ ادھر کچھ دنوں سے نیل کمل پر ایک فلمی کہانی لکھنے کا خبط سوار ہے۔ میں لاکھ سمجھا چکی ہوں کہ یہ ایک چٹان سے ٹکر لینے والی بات ہے۔ فلم والے کہانی نہیں چاہتے، چوں چوں کا مربہ چاہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، ایک کہانی بک جائے تو تین چار ہزار روپیہ آ جائے۔ میں کہتی ہوں فلم کمپنی والوں کا بھی ایک نہ ایک چور دروازہ ضرور ہوتا ہوگا۔ فلمی کہانی لکھنے سے پیشتر اس دروازے کا پتہ چلا لو۔ شاید وہ اس وقت اسی دروازے کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہو...... کھڑکی کے باہر جیسے تاریکی کی سطح پر دھندلے دھندلے حلقوں سے ترتیب دیا ہوا "سواگتم" (خوش آمدید) ابھرنے لگا۔ وہ بڑی شدت سے نیل کمل کی فلمی کہانی کا تجزیہ کرنے لگی۔ سات سال تک ایک کشمیری لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کیلئے ایک خوبصورت شال پر "سواگتم" کاڑھتی رہتی ہے اور اس کے ڈیزائن میں قدیم اور جدید فن کا امتزاج دکھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ لیکن راستے ہی میں اس کے ہونے والے شوہر کی دلچسپیاں کسی اور نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ پھر ادھر سے مایوس ہو کر وہ اپنی منگیتر کے ہاں پہنچتا ہے۔ وہ متواتر مخلصانہ طور پر اس کی راہ دیکھتی رہی تھی۔ لیکن "سواگتم" بھینٹ کرتے وقت اس کے ہاتھ کانپتے ہیں اور اس کی دہشت زدہ روح ڈوبنے لگتی ہے۔ لحظہ بہ لحظہ اس کی زندگی میں وہ زہر سرایت کرنے لگتا ہے جس سے وہ اب تک بچی ہوتی تھی۔ شوہر کو اس ماحول میں ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس کے ناقابل ہے۔ اور جو چیز وہ "سواگتم" کے جواب میں پیش کر سکتا ہے، اسے وہ راستے ہی میں کھو آیا ہے۔

.... وہ نیل کمل کے روبرو اس المیہ کی بیحد تعریف کر چکی تھی۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ کوئی کمپنی اسے فلمانا منظور نہ کرے گی۔

بڑھیا نہ جانے کیا سوچ کر کہہ اٹھی۔ "برہما خوش ہو تو اچھا پتی ملتا ہے، سونیا۔"

سونیا نے بے دلی سے بھی ہنکارا بھرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اسے ڈر تھا کہ بڑھیا کوئی فرسودہ روایتی قصہ نہ چھیڑ دے۔ اس کی ذہنی کیفیت مائل پرواز ابابیل سی تھی جسے بار بار خیال آ رہا ہو کہ اڑنے سے پہلے اپنی منزل کا فیصلہ کر لینا چاہئے۔ وہ کسی فلم کمپنی کی ایکٹریس ہی کیوں نہ ہو۔ میں نیل کمل کے قابل ہوں اور نیل کمل میرے قابل۔ فیصلے بار بار نہیں کئے جاتے۔ اسے یاد آیا کہ ابھی اگلے ہی روز کمل کہہ رہا تھا ـــ عورت کو چاہئے کہ حسد کو چین کی دیوار کی طرح راستہ روکنے کا موقع نہ دے........

پھر اسے خیال آیا کہ بڑھیا کی پیٹھ پر زور سے ایک ٹھوکر جما کر کہے۔ دور ہو جا یہاں سے بڑھیا چڑیل۔ بڑی آئی ہے وہ۔ میری ساس۔ اونہہ! میں کسی ساس کو نہیں پہچانتی۔ اس نے زہر آلود نگاہوں سے بڑھیا کی طرف دیکھا اور دیر تک دانتوں سے ناخن نوچتی رہی۔ وہ ہمیشہ کے لئے اس پریشانی کا حل ڈھونڈ لینا چاہتی تھی۔ بڑھیا خاموش تھی، جیسے کوئی فرسودہ روایت ماضی کے کھنڈروں کے پیچھے ہمیشہ کی نیند سونے کا بہانہ نہ پاکر افسوس کر رہی ہو۔ نیل کمل سے کہہ کر یہ گھر بدلنا ہوگا۔ ہم اپنی جوانی پر اس چڑیل کا عکس کیوں پڑنے دیں۔

اسے گھٹن سی محسوس ہو رہی تھی۔ غیر شعوری طور پر اس کا غصہ نیل کمل کی بجائے بڑھیا کی طرف منتقل ہوتا چلا گیا۔ اسے خیال آیا کہ اگلے ہی روز نیل کمل کہہ رہا تھا ـــ غصے کو ہمیشہ کے لئے تھوک دو، سونیا۔ .... اور نیل کمل نے یہ بھی تو کہا تھا کہ تم بلا کی انتہا پسند ہو سونیا۔ زندگی ہمیشہ یک رخی اختیار کرنے والوں کو سزا دیتی ہے۔ بیحد نفرت اچھی ہے نہ بیحد پیار ہی۔ بیحد غصہ اچھا ہے نہ بیحد رحم۔ انتقام نہ خدمت

زندگی ہے اعتنائی، عزت افزائی نہ تذلیل، ان میں سے کسی کو بھی ہمارے احساس کے گرد تیزی سے گردش کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہئے جبھی یہ ممکن ہے کہ ہماری رگوں میں خون یکساں رفتار سے چلتا رہے۔ جبھی وہ سکون ممکن ہے جس کی تلاش فنکار کو پریشان کئے رہتی ہے۔ کاش نیل کمل باہر سے جھٹ آجائے اور ہم نمائش ختم ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر پھر سے بال ٹھیک کر لوں۔ اب تو اسے آہی جانا چاہئے۔

بڑھیا نہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی۔ پھر وہ کہہ اٹھی "میں نیل کمل سے کہونگی، سونیا کہ پچھلے جنم میں کوئی سو سو موتی دان کرتے تو سب گن لوی دلہن ملتی ہے۔"

سونیا نے فیصلہ کر لیا کہ بڑھیا کی کسی بات کا جواب نہ دے گی۔ غصے کی لہر کے نیچے یہ خیال بھی دب گیا کہ وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر پھر سے بال بنائے۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے نیل کمل کی زبان سے سنے ہوئے اس خیال کا تجزیہ کرنے لگی کہ "حسن تخیل حسین صورتوں کی نسبت زیادہ مسحور کن ہوتا ہے .... اسے خیال آیا کہ بڑھیا تو جوانی کے ساتھ سب حسن تخیل بھی لٹا چکی ہے۔ لے دے کے اس کا دماغ فرسودہ روایتوں کے گرد ہی گھوم سکتا ہے۔ یہ کہاں کا حسن تخیل ہے؟ میرا حسن تخیل بہت بلند ہے۔ اور یوں بھی تو میں ایک حسینہ ہوں! جیسے کسی نے اسے چونکا دیا ہو۔ جھٹ سنبھل کر وہ سوچنے لگی کہ نیل کمل کے ہاں حسن کا پندار نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ میں اس کے جوہر قابل کی نشو و نما میں ہاتھ بٹا سکتی ہوں، تخلیقی کام میں برابر کا ساتھی بن سکتی ہوں۔ میرے پاؤں بتا سکیں گے کہ منی ٹھیک گت بجا رہا ہے یا نہیں۔ مجھ میں صلاحیت ہے کہ رقص کو عروج تک لے جاؤں۔

بڑھیا پھر کہہ اٹھی۔ "جب بیاہ ہونا ہے تو سو رگ دیوتا آنند سے پھولے نہیں سماتے، سونیا!"

سونیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے خیال آرہا تھا کہ ابھی اگلے ہی دن نیل کمل کہہ رہا تھا کہ حسن مثبت ہے، منفی نہیں........ اس نے بڑے غور سے بڑھیا کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اپنی بے سری باتوں کو بند بھی کرو گی یا نہیں۔

یک لخت نیچے زینے سے تیز تیز اٹھتے ہوئے قدموں کی آواز آنے لگی اور بڑھیا سنبھل کر بیٹھ گئی۔ سونیا بدستور صوفے پر جم کر بیٹھی رہی۔ اس وقت اس کی نگاہیں نہ دیوار گیر کے مجسمے کی طرف اٹھ سکتی تھیں نہ صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی تصویر کی طرف۔ وہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں بہت جلد نیل کمل کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا چاہتا تھا۔

نیل کمل نے اندر آتے ہی نیلگوں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پرے رکھتے ہوئے سونیا کی طرف بازو پھیلا دئے۔ سونیا نے نہ اس کے ہاتھ جھٹکے، نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ وہ کتنی شدت سے اس کے انتظار میں بیٹھی رہی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، جیسے کہنا چاہتی ہو "تمہیں کچھ یاد نہیں رہتا، تم فنکار جو ہوئے۔"

بڑھیا کہہ اٹھی "آج بیاہ کا فیصلہ کر لو، بیٹا ---- کل بیاہ کر لو۔"

نیل کمل اور سونیا ہنسی کے ٹھٹھوں میں کھو گئے۔ سونیا چاہتی تھی کہ بڑھیا اور آگے بڑھ جائے۔ وہ نیل کمل سے مخاطب ہونے ہی کو تھی لیکن جیسے جھینک آتے آتے رک جائے، وہ پھر چپ کی چپ رہ گئی۔

نیل کمل برابر ہنس رہا تھا۔ سونیا شرما کے بولی "ہاں ہاں ---- آج فیصلہ کر لو، کل بیاہ ہو جائے۔ دادی اماں سچ ہی تو کہتی ہے۔"

نیل کمل کی ہنسی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا، ایک رنگ جا رہا تھا۔

گیلی لکڑیوں کے عجیب سے دھوئیں کی طرح آنے والے مہمان کا خیال سونیا کے ذہن پر چھا گیا۔ دیوار گیر کے مجسمے پر اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ اسے خیال آیا کہ یہ مجسمہ کمرے کی زینت میں اضافہ کر رہا ہے۔ نہ اپنی تشویش نیل کمل پر واضح کر دینا چاہتی تھی لیکن موضوع سخن اس کے ہونٹوں تک پہنچ کر خاموشی کی پہنائیوں میں کھو جاتا تھا۔

نیلگوں کاغذ کو الگ کرتے ہوئے ایک مجسمہ نکال کر نیل کمل نے اسے دیوار گیر پر پہلے مجسمے کے بالمقابل رکھ دیا۔ سونیا نے ادھر توجہ نہ دی۔ وہ کہہ اٹھا "ادھر دیکھو سونیا! اِدھر دیکھو۔"

یہ ایک جشن کا مجسمہ تھا، جسے پیتل میں ڈھال کر ایک خاص عمل کی مدد سے چاکلیٹ کا رنگ دے دیا گیا تھا۔

سونیا نے نئے مجسمے پر نظریں گاڑ دیں، وہ کہنا چاہتی تھی کہ یہ سوجے ہوئے موٹے موٹے ہونٹ، اونہہ۔ یہ پکوڑا سی ناک۔ بال تو جیسے سوکھی ہوئی گھاس۔ بھدی بے ڈول گردن۔ دائیں بازو کے بالمقابل بری طرح اوپر کو اٹھا ہوا بایاں بازو۔ چھاتیاں ایسی جیسے پھوڑے ابھر رہے ہوں۔

پہلے مجسمے کی طرف انگلی اٹھا کر وہ کہہ اٹھی "معلوم ہے نیل کمل کہ اس حسینہ کی طرح میں بھی اپنا بدل پیش کرتے جا رہی ہوں۔ ہمیں اب دنیا کے میاں بیوی کی حیثیت سے کھڑے ہو جانا چاہیے۔"

نیل کمل نے نئے مجسمے کو نئے انداز سے دیوار گیر کے ایک سرے پر رکھتے ہوئے کہا "مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟ تم اور جشن، زندگی اور فن، بدصورتی اور خوبصورتی، ان میں بہت تضاد ہے۔ فن میں بدصورتی بھی خوبصورتی میں بدل جاتی ہے مگر زندگی تو زندگی ہے۔ نہیں سونیا، نہیں ----"

بڑھیا دہلیز پر گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ سونیا نے دونوں مجسموں کی طرف دیکھتے ہوئے صلیب پر چڑھے ہوئے مسیح کی طرف آنکھیں گھمائیں اور بغیر کچھ کہے سنے بجلی کی طرح لپک کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

البانیہ

کرشن چیتنیہ

البانیہ ناہموار پہاڑی چوٹیوں اور کالے پہاڑی کوؤں کا ملک ہے۔ اس کے متعلق انگریز مورخ گبن نے کہا ہے کہ اس ملک کے متعلق، جو اٹلی سے بالکل قریب ہے، امریکہ کے اندرونی حصوں سے بھی کم معلومات حاصل ہو سکی ہیں۔ لیکن یہ کہے ہوئے ایک زمانہ گزر چکا اور اب البانیہ اور امریکہ کے اندرونی حصوں کے بارے میں ہماری معلومات کافی وسیع ہو چکی ہیں۔

اگر البانیہ میں امن چین رہتا تو بلقانی ریاستوں کا سوئزرلینڈ بن سکتا تھا۔ اب بھی ممکن ہے یہ کسی روز یورپ میں سوئزرلینڈ کے مقابلہ میں تفریح گاہ بن جائے۔ اگرچہ اس کے پہاڑ جو ساڑھے آٹھ ہزار فٹ تک اونچے ہیں سوئزرلینڈ کے آلپس نامی پہاڑ جتنے اونچے نہیں ہیں لیکن شمالی البانیہ کے مسلسل مناظر کو سوئزرلینڈ کے بہترین مناظر کے مقابلے کا کہا جاتا ہے۔ البانیہ ویناریک آلپس کے کوہستانی سلسلہ کے آر پار پھیلا ہوا ہے لیکن شمال میں ڈالمیشیا اور جنوب میں یونان کے خلاف، یہ سلسلہ یہاں سمندر سے فاصلہ پر ہے کیوں کہ اس کے اور سمندر کے درمیان نشیبی زمین ہے جس کو کئی دریا پار کرتے ہیں لیکن جب شمال اور جنوب دونوں میں پانی کے کنارے پر پہونچنے کے پتھروں کی پہاڑیاں نظر آنے لگتی ہیں تو ساحل کی نشیبی زمین غائب ہو جاتی ہے۔ یہاں سمندر کا پانی صاف ہلکے نیلے رنگ کا نظر آتا ہے جبکہ درمیانی علاقہ میں دریاؤں کی بہائی ہوئی مٹی سے ساحل کا پانی گدلا ہو جاتا ہے۔

ساحل کے عقب کے علاقہ میں پہاڑی چٹانوں نے اونچی اور الگ تھلگ وادیاں پیدا کر دی ہیں۔ ان وادیوں میں بہت کافی پیداوار ہوتی ہے اور ان میں کافی گنجان آبادی کی گزر اوقات ہو سکتی ہے حالانکہ باہر سے یہاں آنے والوں کے لئے صرف خچروں کا راستہ ہے۔ جب لارڈ بائرن اس ناہموار جگہ سے گزر رہا تھا تو یہ اسے بہت پسند آئی تھی۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی نظم "چائلڈ ہیرلڈ" کا پہلا اور دوسرا باب کہا تھا۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ یونان میں بھی، جس کا روایات اور تاریخ میں اس قدر ذکر آتا ہے، البانیہ جیسی خوبصورت پہاڑیاں اور وادیاں نہیں ہیں۔

اس چھوٹے سے ملک کی آب وہوا ایک سی نہیں ہے۔ ساحل کے قریب کی نشیبی زمین کی آب وہوا بحیرۂ روم کے ملکوں جیسی ہے۔ گرمیوں میں بارش نہیں ہوتی اور کبھی کبھی درجہ حرارت بہت بڑھ جاتا ہے۔ مگر جیسے جیسے بلندی بڑھتی جاتی ہے آب وہوا میں فرق آتا جاتا ہے اور بارش کسی قدر زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اندرونی البانیہ کے جنوبی حصہ میں کم سے کم دہانوں کے قریب گرمی زیادہ پڑتی ہے لیکن سردیوں میں کہر پڑتا ہے۔ آب وہوا کے اختلاف کی وجہ سے نباتات کی پیداوار میں بھی اختلاف ہے۔ ساحل کے قریب بحیرۂ روم کے ملکوں کی مخصوص جھاڑیاں وغیرہ پیدا ہوتی ہیں۔ جنوب میں شاہ بلوط کے درخت بہت عام ہیں اور پھر وہ بھی ایسے کہ سدا بہار ہوں اور خشک سالی کو برداشت کر سکیں۔ یہ بطور ایندھن ہی کام میں نہیں آتے بلکہ سردیوں میں مزید چارہ کی طرح بھی استعمال ہوتے ہیں۔ البانیہ کے مویشی اور گھوڑے نہایت مضبوط، محنتی اور صابر ہوتے ہیں۔ وہ شاہ بلوط کے پتے کھانے سے نہیں اکتاتے۔ شمال میں بارش بڑھنے کے ساتھ ہی ساتھ شاہ بلوط کے جنگلات کی جگہ ملے جلے گھنے جنگلات نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں صنوبر اور ایک قسم کے سرو کے درخت ہیں مگر زیادہ تعداد بیچ کے درختوں کی ہے۔

البانیہ کے شہر وادیوں جتنی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس کا دارالخلافہ تیرانہ، جدید کشادہ سایہ دار سڑکوں اور تنگ گلیوں کا عجیب وغریب مجموعہ ہے۔ جدید قسم کے ایک سرکاری دفتر کے باہر ایک عام لوگوں کے خط لکھنے والا بیٹھا رہتا ہے۔ اگر آپ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تو وہ بہت ہی کم اجرت لے کر آپ کے لئے جذبات سے پر خطوط لکھ سکتا ہے۔ اس کا خاص صنعتی علاقہ کورتزا ہے جو البانیہ کا مانچسٹر کہلاتا ہے اور خاص بندرگاہ دورازو ایک ایسے میدان میں، جہاں ملیریا پھیلا رہتا ہے، نہایت کریہہ جگہ ہے اس کی بندرگاہ کی تہہ میں بہت جلد کیچڑ جم جاتی ہے۔ دوسرے شہر اتنے اہم نہیں ہیں جتنے کہ خوبصورت۔ اگر البسان میں، جو جغرافیائی اعتبار سے مرکز میں ہے، پہنچنا آسان ہو جائے تو یہ سیاحوں کیلئے جنت بن جائے۔

البانیہ کی تاریخ بھی طرح طرح کے واقعات سے پر ہے۔ اٹلی سے محض چالیس میل، بحیرۂ ایڈریاٹک کے پار، ہونے کی وجہ سے اس کا سلطنت روما میں شامل ہونا ضروری تھا۔ اس سلطنت کے خاتمہ پر اس پر کئی مرتبہ گوتھوں، سربیوں، بلغاریوں، یونانیوں، وینسیوں، سسلی والوں اور یہاں تک کہ نارمنوں نے حملے کئے۔ اکثر حملہ آور صرف ساحلی علاقوں پر قابض ہو سکے اور وہاں کی آبادی ہٹ کر اپنے پہاڑی قلعوں میں چلی گئی۔ ترکی حکومت پندرھویں صدی کے وسط سے ۱۹۱۲ء تک) بھی اندرونی پہاڑی علاقوں میں محض برائے نام تھی۔ اس پر انیسویں صدی میں ۱۸۳۵ء، ۱۸۳۶ء، ۱۸۴۲ء، ۱۸۴۹ء، ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۲ء کے نصف درجن سے زیادہ بلووں سے

شدید ضربیں لگیں۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں البانیہ نے آخرکار ترکی حکومت کا قصہ پاک کردیا، بڑی طاقتوں نے اس کی آزادی کو تسلیم کیا اور ایک جرمن شہزادے ولیم فان ویڈ کو عنان حکومت سونپ دی۔ یہ حکمران اوپریٹیا (ایک ایکٹ کی ناچیہ غنائی تمثیل) کا بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔ ورازو میں اس کا محل جلدی جلدی بنوایا گیا لیکن وہ پہنچنے سے پیشتر ہی بڑے جلیبوں اور میکوں کے تمغے ایجاد کرچکا تھا۔ شاہی دستے کی وردیوں کا خاکہ اس نے خود ہی بنایا تھا۔ وہ شاہی محل کے اٹھاسی چھوٹے بڑے منتظموں کو ساتھ لیتا گیا۔ یہ سب بڑے بڑے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے مگر وہ البانوی زبان کی لغت تحریری بھول گیا۔ اطالویوں کی سازشوں نے چھ مہینے کے اندر اندر اس کی شاہانہ شان وشوکت کا خاتمہ کردیا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد البانیہ نے دوبارہ آزاد ہوکر جمہوری حکومت قائم کرنے کا اعلان کردیا ہے۔

بلقانی ممالک کے لوگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں لیکن غالباً البانیہ والوں سے زیادہ نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انھیں انسانیات کا علم نہ ہو لیکن اگر آپ انھیں بتائیں کہ وہ یورپ کے چند قدیم ترین قبیلوں (یعنی پلاسجیوں، تھریسیوں اور الیریوں) کی نسل سے ہیں تو شاید وہ بتائیں کہ ہمیں اس کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ یہ "عقاب کے بچے" جیسا کہ وہ خود کو کہتے ہیں اپنے قدیم نسب پر بڑا فخر کرتے ہیں۔ جنوبی البانیہ کے ناخواندہ گڈریے آج بھی "زا" اور "ایتھانا" کی قسمیں کھاتے ہیں جو محض یونان کے قدیم دیوتا اور دیوی "دیوز" اور "اتھنیا" کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ مشہور تاریخی شخصیتوں میں جنھیں وہ البانوی بتاتے ہیں، سکندر اعظم، اپیرس کا بادشاہ پرہس جو قدیم روم کے خطرناک ترین دشمنوں میں تھا، بتر بطین کا شہنشاہ جیستیں اور پاپائے روم کلیمنٹ یازدہم شامل ہیں۔ ان کا قومی ہیرو پندرھویں صدی کا سکندر بیگ ہے جس نے بیس برس تک مراد ثانی اور محمود فاتح کے عثمانی سپاہیوں کو روکے رکھا۔ جب وہ آزادی کی حالت میں مرا تو اس کی قبر پر قبضہ کرلیا گیا لیکن البانیہ کے دیہاتی گیتوں میں یہ یقین دلایا گیا ہے کہ کسی نہ کسی دن سکندر بیگ دندانے دار پہاڑ کی چوٹیوں سے روشنی کی شعاعوں پر چل کر واپس آئے گا۔

اہل البانیہ فرقوں اور قبیلوں میں منقسم ہیں۔ ان کے خاندانی جھگڑے اور لڑائیاں قدیم معاشی زمانہ سے چلی آرہی ہیں۔ البانیہ والوں کی اس قومی خصوصیت کے متعلق جو آج بھی بدستور قائم ہے، بہت سی رومانی کہانیاں مشہور ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اپنے کسی اہل خاندان کی موت واقع ہوجائے، خواہ اتفاقیہ ہی کیوں نہ ہو، تو اس کے بدلے مجرم یا اس کے کسی رشتہ دار کو قتل کرنا ضروری ہے لیکن اس سنگدلانہ جذبہ کے ساتھ ہی عورتوں کو قتل کرنے کی ممانعت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لڑائیوں میں اہل البانیہ دشمن کی کسی عورت کو قتل کرنا ایسا ہی احمقانہ فعل خیال کرتے ہیں جیسا کہ اپنی کسی بکری کو ذبح کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ زوغو کو جسے کم سے کم آٹھ سو آدمیوں کے خون کا ذمہ دار خیال کیا جاتا تھا اپنے محل میں تقریباً محبوس رہنا پڑا جبکہ اس کی چھ بہنیں کہیں بھی آجا سکتی تھیں لیکن ان لڑائیوں کا تعلق "بیا" یعنی قول سے بھی ہے جس شخص کو قول دے دیا جاتا ہے وہ بالکل محفوظ رہتا ہے۔ بیا کل عورتوں کو بچاتی ہے ساتھ ہی ہر وہ شخص بھی محفوظ رہتا ہے جو عورتوں کے ساتھ ہو۔ اسی طرح سولہ برس سے کم کے لڑکے، مذہبی لوگ اور عموماً وہ سب جو ہتھیار استعمال نہیں کرسکتے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ لوگ بیا کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ آخری عثمانی سلطان عبد الحمید نے قدآور جسیم اور بیباک البانویوں کو اپنا محافظ بنایا اور انہی کی وجہ سے وہ محفوظ رہا کیونکہ انھوں نے اس کی حفاظت کا وعدہ کرلیا تھا۔

اسٹوئن پیپی چیورچ جو بلقانیوں کی تاریخ کا ماہر ہے ایک کہانی بیان کرتا ہے جو ان ہنگامہ آرا لوگوں کی مہمان نوازی پر روشنی ڈالتی ہے۔ کافی سال گزرے ایک البانوی چھاپہ مار کو جو ترکوں کے خلاف لڑ رہا تھا، مقدونیہ کے وزیر نے پکڑ کر پھانسی کا حکم دیا۔ جلاد پھانسی دینے کو تیار ہی تھا کہ وزیر نے کہا "ٹھہرو" اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑے ہوئے بے حس البانوی کی طرف رخ کر کے چپکے سے کہا: "تم مرنے سے پہلے مجھے ایک بات بتاؤ کیا تم کبھی اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالت میں رہ چکے ہو؟" اس نے منہ پھیرتے ہوئے کہا "ہاں"۔ "وہ کب؟" وزیر نے حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔ البانوی نے انتہائی شرمندگی کے ساتھ کہا: "دو مرتبہ دوست میرے گھر آئے اور میرے پاس انھیں کھلانے کے لئے روٹی تک نہ تھی اس لئے وہ بغیر کھائے ہی سو گئے"۔ وزیر نے ایک لمحہ کے لئے خاموشی سے آنکھیں نیچی کرلیں اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے رہا کردو۔

یورپ میں مسلمانوں کے اس چھوٹے سے ملک میں، جس کی دس لاکھ سے زیادہ آبادی میں سے ستر فی صدی مسلمان ہیں، شان اور رنگینی صرف روایات تک محدود ہے اور حقیقتیں بے رنگ اور تلخ ہیں۔ کل زمین کا رقبہ ۱۰،۶۰۰ مربع میل ہے لیکن تقریباً دس فی صدی قابل کاشت ہے۔ اقتصادی حالت کو، جس کا انحصار انگور، تمباکو، شہتوت اور چاول کی کاشت اور بھیڑیں پالنے پر ہے، بہت ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ اسی صورت میں ملک کا معیارِ حیات بلند ہوسکے گا۔ مستقبل میں اس چھوٹی سی جمہوریت کے سامنے یہی سب سے بڑا مسئلہ ہوگا۔ دوسرا مسئلہ قبائلی

رسوم سے آہستہ آہستہ نجات حاصل کرنا ہے کیونکہ یہ جدید حالات کے لئے مناسب نہیں ہیں۔ ملک کی قانونی روایات کی بنیاد لکسے کے قوانین پر ہے۔ یہ سینکڑوں برس گزرے البانیہ میں رہتا تھا۔ ان قوانین نے خود حضرت موسیٰ کے قوانین سے "لات کی جگہ لات گھونسے کی جگہ گھونسہ" کا مقولہ اخذ کیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے ازراہ مردانگی عورتوں، بچوں اور غیر ملکیوں کو ان لڑائیوں کے ضابطوں کی سخت گرفت سے مستثنیٰ کر دیا ہے پھر بھی ان کے قائم رہنے سے جدید ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے۔ اقتصادیات میں مناسب درستی کرنے اور قانونی روایات میں اصلاحات کرنے سے ثقافتی مسائل بہت جلد ہو جائیں گے۔ صرف پینتیس برس گزرے، جبکہ البانیہ کے بچے تیرانا کے امریکی اسکول میں انگریزی یا یادرازو اور روالنا میں "پاک دل بہنوں" کے ساتھ فرانسیسی یا کسی اطالوی نوآبادی میں اطالوی سیکھ سکتے تھے، لیکن البانوی زبان لکھنا سکھانا منع تھا اور اس کے لئے سخت سزائیں مقرر تھیں۔ عثمانی حکام البانوی زبان کی کتابوں کو پوشیدہ ڈائنامیٹ سے بھی زیادہ خطرناک خیال کرتے تھے۔ لیکن آج البانیہ کا مستقبل خود اس کے ہاتھوں میں ہے اور ہم امید کر سکتے ہیں کہ البانیہ کی چھوٹی سی لیکن مضبوط جمہوریت بہت جلد اپنے مسائل خود حل کر لے گی۔

تفسیر حقانی اردو کامل آٹھ جلد

مصنفہ

فاضل اجل علامہ مولانا عبد الحق صاحب حقانی مفسر دہلوی

آج تک اردو زبان میں ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس عام فہم تفسیر کی خوبیاں مختصر طور پر یہ ہیں کہ عوام الناس، طلبا، علما، صوفیائے کرام، غرض ہر طبقے کے لوگ اس سے یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں

یہ تفسیر مع اصل متن قرآن مجید وہ مستند اور معرکتہ الآرا مشہور تصنیف ہے جو پچاس سال سے اسلامی دنیا میں مقبول خاص و عام ہے۔ بچے بوڑھے جوان مرد۔ عورتیں اس کے مطلب خیز مضامین سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تفسیر اردو، عام فہم نہایت سلیس و بامحاورہ روایات سے ہے۔

حوالہ کتب۔ ربط آیات، ترکیب، شان نزول سانحہ سانحہ قصص اور واقعات جملہ مسائل کے سب باتیں اس تفسیر کلام پاک میں درج ہیں۔ یہ تفسیر عرصہ سے نایاب تھی اور تشنگان عالم کے بے پناہ اصرار پر اس زمانہ ناسازگار میں جبکہ کاغذ۔ سیاہی اور اشاعت کتب کی تمام دیگر ضروریات بے حد مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔ اس کا نواں ایڈیشن بہت مختصر تعداد میں شائع کیا گیا ہے۔

کامل آٹھ جلدیں کوئی اڑھائی ہزار (۲۵۰۰) صفحات پر مشتمل ہیں۔

ہر جلد پر علاوہ خوبصورت مضبوط ٹائیٹل ہے

قیمت کامل آٹھ حصے بے جلد پچیس روپے

قیمت کامل آٹھ حصے مجلد اکتیس روپے

ہم اصلاحی و ادبی کتب۔ قرآن مجید اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں۔ فہرست مفت طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ناشران کتب کشمیری بازار۔ لاہور

ونمالا آپ سے کہتی ہے۔ کہ کس قدر لکس ٹائیلیٹ صابن ہی اسکے حُسن کا نرالا راز ہے

میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا بھرپور جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر بلائمیت لگاتی ہوں۔

اسکے بعد میں صاف وستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔

آخر ش باہستگی اپنا چہرہ نرم تولئے سے خشک کرتی ہوں +

تمام خوبصورت اور دانشمند فلمی اسٹارس یہ خوب جانتی ہیں کہ لکس ٹائیلیٹ صابن ہی ان کی جلد کو بے عیب اور پنکھڑی کے مانند خوشنما بناتا ہے، اسی لئے وہ اس پر ناز کرتی ہیں۔ اس کا ملائیم اور موثر جھاگ ہر ایک مسام میں سرائیت کر جاتا ہے اور گرد و غبار اور غلاظت و گندگی سے جلد کو پاک کر دیتا ہے + ونمالا کا ایک ۱۰ کا دیا ہوا خوبصورتی کا درس، آپ خود مشق کریں۔ آپ اسکے ملائیت صفائیت کرنیوالی خاصیت سے خوش ہوں گے +

LUX
TOILET SOAP

فلمی اسٹارس کا حسن بخش صابن

LTS. 135-23 UD

LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

آپ بیمار ہیں

دنیا میں کامیابی کا راز دو لفظوں میں یہ ہی کہ محنت کیجئے اور خوب محنت کیجئے محنت سے دولت پیدا ہوگی اور دولت سے عیش و آرام، مگر اس کیلئے تندرستی کی ضرورت ہے
اگر یہ نہیں اور آپ بیمار ہیں تو محنت، دولت آرام صرف خواب و خیال، ساری عمر تکلیف و مصیبت میں گزارنا ہوگی کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

بیماری

خدا دشمن کو بھی نہ دے، پیسہ کا خرچ، روزگار بند، مصیبت پر مصیبت علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہ رہا ہے، مگر فائدہ نہیں مرض بڑھتا گیا۔
جوں جوں دوا کی۔ یہ مرض کیوں بڑھ رہا ہے فائدہ کیوں نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے کہ مرض کی تشخیص نہ ہو سکی، دوا خالص اور عمدہ نہیں
ملی، ہٹری گلی دواؤں نا تجربہ کار طبیب سے فائدہ کی کیا امید ہو سکتی ہے
اگر آپ کے دوستوں میں سے کوئی صاحب کسی پیچیدہ اور پرانے مرض
میں گرفتار ہیں تو اُن کے حالات ناظم شعبہ تشخیص مجلس طبا
پوسٹ بکس نمبر ۵۹ شہر دہلی کو فوراً لکھ کر روانہ کیجئے!
یہاں مرض کے حالات تجربہ کار کہنہ مشق طبیبوں کی مجلس میں
پیش ہوتے ہیں اس مجلس کے صدر دہلی کے مشہور طبیب و فیسر
حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سینیر ہاؤس فزیشن وائس پرنسپل
جامعہ طبیہ، و ایڈیٹر رسالہ مسیح الملک ہیں
مجلس اطبا میں مرض کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے۔ بحث
ہوتی ہے۔ ہر طبیب اپنے تجربہ کی بنا پر رائے ظاہر کرتا ہے، اور
بالآخر متفقہ رائے سے مرض کی صحیح تشخیص عمل میں آتی ہے دوا تجویز
ہوتی ہے مریض کو اطلاع دیجاتی ہے اور اس طرح روزانہ صدہا پیچیدہ
مسئلے حل ہوتے ہیں تشخیص و تجویز کا یہ طریقہ اس قدر صحیح اور بہتر
ثابت ہوا ہے۔ کہ اب صرف ملک کے ہر گوشے کے مریض۔ بلکہ بہت سے
طبابت پیشہ اصحاب ڈاکٹر، حکیم اور وید بھی اپنے زیر علاج مریضوں کے پیچیدہ امراض کی بابت مجلس اطبا کا مشورہ طلب کرتے ہیں اس طرح ہزاروں
مایوس مریض اس مجلس کی صحیح تشخیص کی بدولت نئی زندگی حاصل کر چکے ہیں اگر آپ کسی پیچیدہ یا پرانے مرض میں گرفتار ہیں اور آپ کا وقت خراب
ہو چکا ہے اور دولت برباد ہو چکی ہے، تو ایک بار ہمیں حالات لکھ کر یا اجملی شفاخانہ باڑہ ہندو راؤ میں تشریف لاکر مشورہ کیجئے۔ جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ
یا لفافہ آنا ضروری ہے، رسالہ مسیح الملک بطور نمونہ طلب فرمائیے، اوقات مشورہ صبح ۱۰ سے ۱۲ بجے تک، شام ۶ سے ۸ بجے شب تک

عہد حاضر کا مایہ ناز طبی شاہکار

مسیح الملک کا علاج

رعایتی قیمت پر

جو ماہنامہ مسیح الملک کی جانب سے اپریل ۱۹۴۶ء میں خاص نمبر کی صورت میں شاندار طریقہ پر شائع کیا گیا ہے اس میں سر سے پاؤں تک کے وہ تمام پیچیدہ اور پرانے امراض نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جن کے علاج میں اکثر مریضوں اور معالجوں کو ناکامی ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ہی ہر ایک مرض کے ذیل میں اجمل اعظم مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے خاص تشخیصی رموز و نکات طریقہ علاج اور وہ بیش قیمت مجربات پیش کئے گئے ہیں جن کی تلاش میں دنیا بے چین ہے ضخامت دو سو صفحات سے زائد کتابت طباعت نہایت نفیس اور قیمت دو روپے ہونے کے باوجود صرف بکر خاص رعایت۔ لیکن جو لوگ تین روپیہ سالانہ چندہ دیکر ماہنامہ مسیح الملک کے مستقل خریدار بنیں گے اُن سے دو روپیہ کے بجائے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ لی جائیگی، اور اس طرح وہ پانچ کے بجائے چار روپیہ میں حاصل کر سکیں گے، لہٰذا آپ بھی آج ہی مبلغ چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجئے، ایکسال تک مسیح الملک بھی پڑھئے اور بیش قیمت مجربات کا ذخیرہ بھی رعایت کے ساتھ حاصل کیجئے منی آرڈر بھیجنے والوں کے لئے محصول ڈاک معاف۔ بطور نمونہ مفت طلب کیجئے

دفتر مسیح الملک پوسٹ بکس نمبر ۵۹ شہر دہلی

مینیجر مجلس الاطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ شہر دہلی

نئی شاعری

شوکت تھانوی

میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں بڑے سے بڑا ظلم، سخت سے سخت گالی، بدصورت سے بدصورت فلم اسٹار، مگر نہیں معلوم کیوں تاریخی غلط بیانی پر خون کھولنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مورخ کی تاریخ دوات نکال کر رکھدوں۔ مثلاً آجکل آزاد شاعری کو دور جدید کی صنعت یا بدعت کہا جا رہا ہے اور بڑے بڑے ذمہ دار لوگ تاریخ کیلئے یہ غیر ذمہ دارانہ بیان دے رہے ہیں کہ شاعری کی یہ غیر شاعرانہ قسم اسی زمانہ کی پیداوار ہے، حالانکہ خود ہمارے خاندان میں اب سے تقریباً سو برس پہلے ایک ترقی پسند بزرگ گذرے ہیں اور ان کے ترقی پسندانہ کلام کا جو نمونہ سینہ بسینہ ہم تک پہنچا ہے وہ ہمارے اس دعوے کی ایک مستحکم دلیل ہے کہ ترقی پسند شاعری کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ بزرگ نوجوانی، جوانی اور پیرانہ سالی کے ابتدائی دور تک اچھے خاصے شاعر تھے۔ اس کے بعد بیچارے سٹھیا کر ترقی پسند شاعر بنگئے اور اب ان کا یہ حال ہو گیا کہ ایک مصرعہ بحر طویل میں ہے تو دوسرا بحر بسیط میں اور تیسرا بحر خفیف میں۔ بلکہ اکثر مصرعے بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس میں بھی ہونے لگے۔ اسوقت کے رجعت پسند لوگ ان کی طرف توجہ بھی نہ کرتے تھے۔ کلام کی داد دینا تو درکنار۔ جو سنتا تھا یہی کہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ کاش ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ جن بزرگ کو وہ مرفوع القلم اور مخبط الحواس سمجھ رہے ہیں وہ کس پایہ کے ترقی پسند شاعر ہیں اور جس کلام کو مجذوب کی بڑ سمجھا جا رہا ہے وہ اب سے سو سال بعد لٹریچر میں کیسی ممتاز جگہ حاصل کر سکتا ہے۔

خیر یہ تو ایک مثال تھی مگر میری قطعی رائے یہ ہے کہ ترقی پسند شاعری میں ترقی کی تمام علامتیں جیتی جاگتی نظر آتی ہیں۔ شاعری کی بھی یقیناً "ایک عمر" تھی۔ اردو شاعری ولی کے ساتھ پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں تک آغوں آغوں کرتی رہی پھر تتلا کر بولی۔ پھر بھولی بھولی باتیں کرنے لگی۔ اس کے بعد ہوش کی آنکھیں کھولیں۔ نپی تلی باتیں ہونے لگیں۔ شباب آیا تو باتوں باتوں میں شوخی ابھری۔ شباب ڈھلا تو باتوں میں متانت پیدا ہو گئی۔ بات بات میں عاقبت اندیشی شروع ہو گئی۔ پند و نصیحت کے سلسلے شروع ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان بڑی بی نے بوکھلانا اور سٹھیانا شروع کر دیا۔ یہانتک کہ وہ آزاد شاعری بن گئیں۔ اب چاہے کوئی انپر ہنسے یا انکو منہ لگائے اور چڑھائے مگر ان کی عمر میں ترقی سے انکار کی گنجائش نہیں۔ دنیا اسی کا نام ہے اور دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔

اور صاحب سو باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ ہم شاعر ہیں شاعری کرتے ہیں۔ نہ ہم نجار ہیں اور نہ کسی گھڑونچی کو ہمارا نتیجۂ فکر بننا ہے کہ بیٹھے ناپ رہے ہیں اس کا ایک ایک پایہ کہ اگر ذرا بھی کوئی چھوٹا یا بڑا ہو گیا تو گھڑا ڈھلک جائے گا۔ اور نہ ہم خیاط ہیں کہ گز بیونت لیں سر کھپاتے رہیں تاکہ دامن کی جگہ گریبان نہ پہونچ جائے اور جیب کی جگہ چولی نہ آجائے۔ ہم ٹھہرے شاعر ہم کو اس ناپ تول اور کتر بیونت سے کیا واسطہ۔ ایک تخیل ہمارے ذہن میں آتا ہے ہم اسکو ہر تکلف اور ہر تکلیف سے آزاد رہ کر من و عن پیش کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر وہ برجستگی کے ساتھ بحر رمل میں آجاتا ہے تو شوق سے آئے اسکا گھر ہے لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ اس تخیل کے اب جسقدر اجزاء ذہن میں آئیں ان سب کو بحر رمل ہی میں آنا چاہئے ورنہ وہ تشریف لانے کی زحمت ہی گوارا نہ کریں۔ حالانکہ ہو یہ جاتا ہے کہ ایک سلسلۂ خیال ہے اس کا ایک حصہ بحر رمل میں نظم ہو گیا، دوسرا بحر مضارع میں، تیسرا بحر خفیف میں، چوتھا بحر مجتث میں اور کوئی ٹکڑا ایسا بھی ہے جو کسی بحر کے کسی ایک آدھ رکن میں ادا ہو رہا ہے۔ تو اب اس کے لئے پورا مصرعہ ضائع کرنا فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی مقصد تو یہ ہے کہ شاعر کے ذہن میں جو خیال پیدا ہوا ہے وہ کسی نہ کسی طرح بغیر کسی خارجی آمیزش کے ادا ہو جائے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اس کے لئے اتنی پابندیوں کی کیا ضرورت ہے کہ وہ خیال اور اس خیال کا ہر جزو اور ہر جزو کا ہر خفیف سے خفیف جزو گریباں، گلستاں، بیاباں وغیرہ قوافی کے ساتھ "سے" کی ردیف لیکر بحر مقتضب مثمن مطوی مقطوع ہی میں ادا ہو اور فاعلات مفعولن فاعلات مفعولن کے دائرے سے ذرا بھی نہ آگے بڑھے نہ پیچھے ہٹے۔ گویا مصرعہ نہ ہوا نقب زنی کا مجرم ہوا اور شاعری نہ ہوئی کوئی قابل دست اندازی پولیس جرم ہوا۔ باز آئے صاحب ہم اس شاعری سے ہم لنڈورے ہی بھلے۔

لنڈورے پر یاد آیا کہ آخر شاعری کی اس قسم کو لنڈوری کیوں نہ کہا جائے۔ ردیف کا یہاں ذکر نہیں۔ قافیہ سے اسکو سروکار نہیں۔ بحر کا طوطا یہ نہیں پالتی۔ مطلع اس کے یہاں نہیں۔ مقطع اس کے متروکات میں۔ ایطائے جلی ہونا ہو تو خفی اور ہو بھی کہاں سے۔ ان ہی تمام امراض کی وجہ سے مطلع تک ہاتھ سے دھو بیٹھی کہ نہ بانس رہے گا نہ بانسری بجے گی۔ مطلع کہینگے نہ شاعری کے تھانہ دار صاحبان ایطائے جلی یا ایطائے خفی کا وارنٹ دکھا کر گرفتار کرینگے۔ مختصر یہ کہ اس قسم کی کوئی پابندی ہے ہی نہیں۔ جو جی چاہے کہتے چلے جاؤ اور اگر کوئی ناسمجھ پوچھ بیٹھے کہ کیا کہہ رہے ہو تو کہہ دیا جائے کہ یہ علمی معاملات ہیں ان میں دخل نہ دو اور اگر پھر بھی دخل دے تو اسی قسم کی دو تین نظمیں سنا دو۔ خدا کی ذات سے امید ہے کہ سر پر پیر رکھکر بھاگے گا اور پھر تمہارے علمی مشاغل میں کبھی مخل نہ ہوگا بلکہ خود اسکو تمہارے دماغ میں خلل کا یقین ہو جائے گا جو تمہارے لئے یقیناً مفید ہے۔

اس شاعری کے نقصانات تو خیر وہ لوگ گنائینگے جو ردیف و قوافی

کے گنبد میں پرواز چڑھکر مفعول فاعلات مفاعیل و فاعلن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور ر۔ م۔ نام اس قید کا رکھا ہے رہا ہو جانا۔ مگر فوائد ہم سے پوچھیئے وہ بھی ایک دو نہیں ہزار دو ہزار بلکہ بے شمار۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کو شاعری کا یہ ڈھنگ اختیار کرنے کے بعد اس موذی سے ہمیشہ کیلئے نجات مل سکتی ہے جسکو مصرعہ طرح کہتے ہیں۔ امتحان کا پرچہ کہیں کا کمبخت جس نے ہزاروں کو بر سر مشاعرہ ذلیل کیا ہے۔ لاکھوں کے پول کھولے ہیں۔ سینکڑوں کو شاعر ہونے سے روکا ہے یعنی جو اسی نمونے کی مکھی پر مکھی بٹھا سکے وہ تو گویا شاعر ہے، باقی سب چڑی مار ہیں گویا مشاعرہ گھوڑی ہوتا ہے اس بدبخت کے بدولت۔ دنگل ہوتا ہے، اچھا خاصہ دنگل جہاں ایک سے ایک پہلوان ایک سے ایک رستم سخن ایک ایک قافیہ۔ اپنے داؤں دکھاتا ہے اور سننے والے مصرعے اس طرح اٹھاتے ہیں گویا شاعر کو اٹھا کر پٹخ ہی دینگے۔ اس عذاب سے نجات حاصل کرنا کوئی معمولی بات ہے یہ سمجھ لیجئے کہ مصرعہ طرح سے آزاد ہو جانا ایک قسم کا ادبی سوراج ہے جس کے بعد شاعری آپ کی ہوگی۔ جو چاہیں کہیں اور جس زمین میں چاہے کہیں۔ اور یاد رکھئے کہ مصرعہ طرح سے اگر آپ ایک مرتبہ آزاد ہوگئے تو وہ دن دور نہ رہیگا جب مشاعروں سے بھی آپ کو نجات حاصل ہو جائے اور اس رات رات بھر کی جگائی اور چیخ پکار سے جو یقیناً کسی مہذب قوم کا مشغلہ نہیں ہو سکتا آپ کی جان چھوٹ جائے گی۔ پھر تو چھوٹا سا ایک جلسہ سر شام ہو جایا کرے گا جس میں غزل کے صرف ایک شعر کو بہتر ٹکڑوں میں تقسیم کر کے سنا دیا گیا۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ یہ نہیں کہ نو بجے رات سے ڈنڈا لیکر مصرعہ طرح کے پیچھے جو پڑے تو سویرا کر دیا۔ دو موٹے موٹے فائدے تو اس شاعری کے یہ ہوئے۔ باقی فائدے کہاں تک سنئے گا۔ مثلاً ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ اس قسم کی شاعری کرنے کے لئے کچھ یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ شاعر ہی ہوں۔ جی نہیں۔ اگر آپ بساطی ہیں تو بھی شعر کہہ سکتے ہیں۔ اگر آپ کے یہاں بندر پکڑنے کا کاروبار ہوتا ہے تو بھی آپ اس قسم کے مختلف البطن مصرعے پکڑ سکتے ہیں۔ اگر آپ کو محض ریس کا شوق ہے تو بھی آپ ان چھوٹے بڑے ہلکے اور بھاری مصرعوں کا ہینڈی کیپ خود مقرر کر لینگے اور اگر آپ کچھ بھی نہیں ہیں تو اس شاعری کے بدولت کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائینگے۔ سب سے بڑی خوبی جو خداوند کریم نے اس شاعری کو عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا جا اور بے جا استعمال درگاہوں کے قوال، اعراس کے مغنی، مجروں کے مطرب اور مطربات نہ کر سکینگے۔ یعنی یہ شاعری گائی بجائی نہ جا سکے گی۔ اور اگر گانے والے اس کے باوجود مصر رہے تو ان کو اس ترقی پسند شاعری کے ساتھ ہی ساتھ ترقی پسند سرگم اور ترقی پسند ہارمونیم فوراً بنانا پڑینگے۔ البتہ اس شاعری کا ایک مصرف تھوڑی سی توجہ کے ساتھ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ فلم کمپنیاں اس شاعری کی سرپرستی شروع کر دیں۔

اسلئے کہ اس راز کو ابھی تک پولیس والے بھی نہیں سمجھ سکے ہیں کہ ترقی پسند شاعری فلمی گانوں کی ماں ہے یا فلمی گانوں نے اس شاعری کو جنم دیا ہے۔ بہر حال سی۔ آئی ڈی کی تازہ رپورٹ سے یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ دونوں کا خون کیمیاوی امتحان کے لئے بھیجا گیا تھا اور اس میں ایک دوسرے سے مشابہ قسم کے جراثیم پائے گئے ہیں۔ اگر یہ بات واقعی تصدیق کی حد تک پہنچ گئی تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ ترقی پسند سرگم اور ترقی پسند سازوں کی بھی ضرورت نہیں یہی ساز جو عام طور پر رواج میں ہیں۔ اس شاعری کو بھی ٹھو لینگے اور یہ "بے بحری" شاعری کم سے کم "بے سری" نہ ہونے پائے گی۔ خواہ وہ سُر ہندوستانی موسیقی سے تعلق رکھتے ہوں یا انکو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو۔ اگر یہ شاعری فلموں کے لئے سازگار ثابت ہوئی تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ شاعری پر نحوست اور ادبار کا جو الزام نسلوں سے چلا آ رہا ہے وہ یقیناً دور ہو جائے گا اور پھر تو یہ شاعری ہن برسانے لگے گی۔

میں چونکہ ترقی پسند شاعری کی حمایت کرنا چاہتا ہوں لہٰذا میں ترقی پسند شاعروں کو ایک دوستانہ مشورہ یہ بھی دینا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی تائید میں یہ دلیل کبھی پیش نہ کریں کہ اس بے۔ ردیا شاعری کے ماتحت شاعر اپنے نفسی تجزیہ اور جذباتی تسلسل کے بہاؤ میں ہم آہنگی پیدا کر کے ذہن لاشعور میں سے آزاد تسلسل کو وجود میں لاتا ہے۔ یہ دلیل ذرا بودی ہے اسلئے کہ اگر خدانخواستہ میں خود اپنی مالی حالت سے مجبور ہو کر پرانے شاعروں سے رشوت لینے کیلئے مجبور ہو گیا تو پھر مجھ ہی کو یہ کہنا پڑے گا کہ ان حالات میں شعر کہنا ہی حماقت ہے۔ ان رہی سہی پابندیوں کو بھی توڑ کر آدمیوں کی طرح نثر کیوں نہ بولو۔ رہ گیا تسلسل وہ اس لنگڑی لولی شاعری کے علاوہ اپنے پورے خد و خال کے ساتھ نثر میں بھی ممکن ہے اگر میرے اس جواب پر بھی آپ نے ہٹ دھرمی سے کام لیا تو میں ٹھہرا صاف آدمی مجھکو مجبوراً یہ بھی کہہ دینا پڑیگا کہ حضرات آپ شاعری سرے سے کرتے ہی نہیں۔ بلکہ سچ پوچھیئے تو نثر کی توڑ مروڑ کو شاعری سمجھ بیٹھے ہیں۔ لہٰذا میں پھر آپ کو یہ مشورہ دونگا کہ یہ کمزور دلیل آپ بحث ہی میں نہ لائیں تو اچھا ہے کیا فائدہ کہ اچھے بھلے بنے ہوں اور پھر کوئی فائدہ بھی نہ ہو۔ ہاں آپ اپنی اس شاعری کے جواز میں اور بہت سی باتیں کہہ سکتے ہیں مثلاً یہ کہ یہ زمانہ راشننگ کا ہے۔ ہر چیز پر کنٹرول ہے ہوا کے برتھ کے۔ مصرعے کے ارکان بھی پرمٹ پر ملتے ہیں اور یونٹ کے حساب سے یہ تو شاعری ہے مٹی کا تیل تک آپ حسب حوصلہ صرف نہیں کر سکتے۔ پاجامے کیلئے چھالٹین تک تو ملتی نہیں، آپ لئے پھرتے ہیں مصرعوں کیلئے ردیف اور قافیہ۔ آپ معترض سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھائی سنو وقت وہ آ لگا ہے کہ کم کھاؤ زیادہ بچاؤ۔ لہٰذا ہم اگر ایک آدھ مصرعہ میں بچت دکھاتے ہیں تو اس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آئندہ سال کا بجٹ شاندار ثابت ہو بلکہ آپ صاف صاف یہ کہہ دیجئے

کہ جناب یہ کنجوسی نہیں بلکہ کفایت شعاری ہے۔ مطلب اگر آدھے مصرعے میں پورا ہو جاتا ہے تو باقی آدھا مصرعہ محض تقطیع پوری کرنے کیلئے ضائع کرنا غلط ہے۔ باقی آدھا مصرعہ ان غریبوں کے کام آسکتا ہے جنکو پورا راشن نہ ملنے کی وجہ سے طرح طرح کی معدے کی شکایتیں پیدا ہو گئیں ہیں اور جو محض ہماری فضول خرچیوں کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ جب فارغ البالی تھی، جب قحط نہیں پڑا تھا ہم نے جسطرح چاہا اپنے مفہوم کو ادا کیا مگر اب ہم غلہ غریبوں کیلئے چھوڑ رہے ہیں جو دال روٹی کو ملا کر مطلع عرض کرتے رہیں۔ ہم کو وقت کی ضرورت کا احساس ہے۔ ہم انڈا مچھلی، پھل اور دودھ پر گذارہ کر رہے ہیں۔ اس کو آپ چاہے بدعت کہیں یا آزاد شاعری لیکن ہم اس کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اس قسم کی باتوں کے دو ہی نتیجے ہو سکتے ہیں یا تو مخاطب آپ کو فاترالعقل سمجھکر صبر کرلے یا آپ کا قائل ہو کر قدموں پر گر پڑے۔ ایک بات آپ اور بھی سمجھا سکتے ہیں کہ موزونیت تو خیر تھوڑی بہت ہر گانے اور رونے والے کو قدرت کی طرف سے ملتی ہے لیکن باضابطہ سخن طرازی ہمارے امکان میں نہیں اور اس سلسلہ میں بلیک مارکیٹ کی حوصلہ افزائی بھی ہم کو منظور نہیں۔ لہذا حاضر میں حجت نہیں۔ جو ہمارے امکان میں ہے ہم پیش کر رہے ہیں گر آپ اس سے مطمئن نہیں ہیں تو ملک الشعراء کا خطاب آپ لے جائیے۔ ہم کو صرف زندہ رہنے کا حق بخش دیجئے۔ اگر آپ ہماری شاعری کو شاعری تسلیم کرنا نہیں چاہتے تو آپ اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش۔ زیادہ سے زیادہ داد کی "واہ" سے محروم کر دیجئے گا۔ ہم سمجھ لینگے کہ ہماری شاعری خود ہمارے لئے ہے آپ کے لئے نہیں۔ اور اگر ان تمام باتوں کے باوجود معترض فوجداری پر تل جائے تو یہ گر بھی گرہ میں باندھ لیجئے کہ آپ نہایت اعتقاد کے ساتھ اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر دیجئے گا واضح رہے کہ پرانے شاعروں کی سب سے شہ زور کمزوری یہی ہے کہ اگر آپ نے ان کو استاد تسلیم کر لیا تو آپ کے سات خون مع ذاتی خودکشی کے معاف ہو جائیں گے۔ پھر چاہے آپ استادی سے زندگی بھر ترقی پسند شاعری کراتے رہئے۔ نہ صرف وہ خاموش رہینگے بلکہ آپ کو جملہ آفات ارضی سماوی سے بچانے کے لئے ایک آدھ تعویذ بھی دے گذریں تو کوئی تعجب نہیں۔ استادی کا یہ آخری گر بتانے کے بعد اب ہم آپ سے صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے لئے دعائے مغفرت میں ترقی پسندی سے کام نہ لیں کم سے کم اس دعا کے تمام ارکان برابر کے ہوں تو اچھا ہے۔

چلتے چلاتے ایک بات اور سنتے جائیے آپ عوام کے سامنے تو آزاد شاعری کے متعلق ہر ڈینگ ہانکنے کے لئے آزاد ہیں مگر کسی پڑھے لکھے آدمی سے الجھنے کی کبھی کوشش نہ کیجئے گا۔ مثلاً آپ لوگ ایک بات عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ ہماری تخیئل اچھوتی ہے، ہماری فکر بلند ہے اور ہم عنقا کے آشیانے سے اپنا آرٹ لاتے ہیں۔ ان تمام باتوں کو ممکن ہے کہ وہ لوگ کوئی اہمیت دیکیں جنکو شاعری سے ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا ہو۔ ورنہ ہر وہ معمولی سمجھ کا آدمی جس نے کبھی کوئی شعر دیکھا یا سنا ہے آپ کو ان باتوں کا کوئی ایسا جواب دیدے گا کہ آپ تو خیر کیا مگر ہمکو آپ کی ہمدردی میں شرمندہ ہونا پڑے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تمام کہی ہوئی باتیں آپ بھی فرماتے ہیں البتہ فرق یہ ہے کہ پہلے ان باتوں کو ذرا سلیقہ سے کہا گیا تھا اور اب آپ سلیقہ کے قائل نہیں رہے ہیں۔ مثلاً ایران میں ہم سب کے ایک چچا گذرے ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ اسکو اتنا زمانہ گذر چکا ہے کہ تخیل گننی بھول جائے۔ بہر حال ان ہی ایرانی چچا کے چار مصرعے سنئے ؎

من آن مورم کہ از پایم بمالند — نہ زنبورم کہ از نیشم بنالند
چہ گونہ شکرِ این نعمت گذارم — کہ زورِ مردم آزاری ندارم

اسی مفہوم کو آپ کی آزاد شاعری کے چودہ مصرعے والے ایک شاہکار میں جس کا عنوان شرابی ہے یوں پیش کیا گیا ہے ؎

آج پھر جی بھر کے پی آیا ہوں میں
دیکھتے ہی تیری آنکھیں شعلہ ساماں ہو گئیں
شکر کر اے جان کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
صدر اعظم یعنی دریوزہ گر اعظم نہیں
ورنہ اک جامِ شرابِ ارغواں
کیا بجھا سکتا تھا میرے سینۂ سوزاں کی آگ
غم سے مر جاتی نہ تو
آج پی آتا جو میں
جام رنگیں کے بجائے
بے کسوں اور ناتوانوں کا لہو
شکر کر اے جاں کہ میں
ہوں درِ افرنگ کا ادنیٰ غلام
اور بہتر عیش کے قابل نہیں

اور اگر یہی شاعری ہے تو لیجئے شرابی کے ساتھ ایک نظم اس خاکسار کی بھی سن لیجئے۔ عنوان ہے "جواری" ؎

ہار آیا ہوں جوئے میں آج میں
دیکھکر جبیں مری غصہ ہوا تجھ پر سوار
شکر کر بھیا کی ماں

میں ہوں اک ادنیٰ جواری تاش کا
عشق گھوڑے کا نہیں میں ریس کا رسیا نہیں
ورنہ یہ اتنی سی ہار
ریس میں جاتا ہزاروں لیکے میں سودی ادھار
دم نکل جاتا ترا
یاد کر آتا جو میں
چند نوٹوں کے بجائے
سو کے دس، اور دس کے سو
شکر کر بھیا کی ماں
میں ہوں اک ادنیٰ جواری تاش کا
کم سے کم یونجی ریس کے قابل نہیں۔

اس قسم کی نظمیں تو جتنی کہیئے کہتے چلے جائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی معلوم ہوگا کہ اونٹ ببول چر رہا ہے۔ لیکن سعدی کے چار مصرعوں کے جواب میں سوائے لغلیں جھانکنے کے اس اونٹ کیلئے بھی اور کوئی چارہ نہیں۔ تو مطلب یہ کہ کہنے کا تو خیر آپ کو اختیار ہے مگر ڈینگ ہانکنے سے پرہیز کرنا خود آپ کے لئے مفید ثابت ہوگا اور خدا کرے ہمارے لئے بھی مضر نہ ہو۔

آخری تاجدار اودھ کے منظوم خطوط

بقیہ صفحہ ۱۲

بندگانِ خدا ہیں دست کشا — خالی جائیگی کیا سبھوں کی دعا

غرض یہ ہے کہ سلطان عالم نے اپنے اس دور میں جو کچھ بھی کہا ہے اس کا بیشتر حصہ ان کے کلام کے برعکس سوز و گداز کا حامل ہے۔ چنانچہ ان کے متعدد خطوط ان کی محبوب بیگمات کے نام نظم کی صورت میں موجود ہیں اور ان سب میں بالعموم یاد وطن، عالم غربت اور فراقِ دورِ ماضی کی المناک روداد بیان کی گئی ہے۔ جن بیگمات کے نام نمایاں طور پر اس سلسلے میں لئے جا سکتے ہیں وہ یہ ہیں۔ ملکۂ پرپوش ملقبیس النساء۔ نواب سلیمان محل صاحبہ۔ نواب خرد علی صاحبہ۔ نواب سلطان جہاں علی صاحبہ۔ نواب چنبر محل صاحبہ۔ نواب بیگم صاحبہ۔ نواب شہنشاہ محل صاحبہ اور نواب اختر پیاری صاحبہ۔ گو جیسے جیسے نواب کے زخم مندمل ہوتے گئے ہیں ان کے خطوط کا رنگ بھی پھیکا ہوتا گیا ہے لیکن ان میں بھی جہاں کہیں جذبات و محسوسات کو دخل ہے اکثر و بیشتر تیز نشتر بن جاتے ہیں۔ اور یہ سب کارفرمائی ہے ان بے پناہ چرکوں کی جو نواب نے اپنے دور ادبار میں کھائے۔

طوفان

کامل رشید

یہ اندھیری رات یہ طوفان کی آمد کا شور — چشمکیں بجلی کی بادل کی گرج پانی کا زور
یہ گھٹائیں ناشکیبا، یہ ہوائیں ناصبور — خامشی کے کان میں پھونکا ہو ہنگامے صور
تیرگی میں حل ہوئی جاتی ہو ساری کائنات — شورش عالم کو سوتے سے جگا بیٹھی ہو رات
تند زلزلے ہیں رقصاں زلزلوں کے ساز پر — چاک ہو گردوں کا سینہ برق کی پرواز پر
بج رہے ہیں بھیگتی وادی میں شیطانوں کے ڈھول — تیز جھونکوں میں ہیں بل کھائے ہوئے بھوتوں کے غول
جھکڑوں میں اڑتے پھرتے ہیں جناتوں کے راگ — ہو سمندر کی جنوں انگیزیوں سے منہ میں جھاگ
وہ اٹھے لہرا کے بادل وہ گری بوندوں کے تار — ہیں کہ اک دیوتا بادل کے گھوڑوں پر سوار
جاگ اٹھیں وحشتیں خاموش آہیں سو گئیں — سربگردوں چوٹیوں کی گردنیں خم ہو گئیں
بادلوں کے ساز بھیگے راگ برسانے لگے — چھاتیوں پر جھیل کی گرداب چکرانے لگے
آندھیاں غرا کے اٹھیں جھکڑوں میں کھو گئیں — کوہساروں کی جبیں کالی گھٹائیں دھو گئیں
کانپتی کمزور دیواروں سے در ہٹنے لگے — اونگھتے بوڑھے مکانوں کے جگر پھٹنے لگے
بچھ گئے میدان کے سینے پر درختوں کے مزار — ہو گئی باغوں میں بے ترتیب پودوں کی قطار
بھیگے بھیگے جھونکے درختوں کا لہو پینے لگے — تار بوندوں کے زمینوں کی قبا سینے لگے
رفتہ رفتہ تیز سانسیں وقت کی رکنے لگیں — وحشتیں سنجیدگی کے سامنے جھکنے لگیں
کم ہوا طوفان دیوانی ہوائیں تھم گئیں — سرپھری جھیلوں پہ نیلی کائیاں پھر جم گئیں
بادلوں کی اوٹ سے پھر مسکرایا ماہتاب — پھر سکوں چھایا ہوا آبادیاں ہیں غرق خواب

مسکراتا ہے فلک پھر گنگناتی ہے زمیں
میرے سینے کا مگر طوفان کم ہوتا نہیں

حشر کا ڈرامہ

بقیہ صفحہ ۲۵

(وطن پرست خاتون)، اور رستم و سہراب کے کردار ان کے علاوہ کو مک کیرکٹر زماسٹر خیر سلا۔ تمبو۔ نیل کنٹھ۔ سدا رنگ وغیرہ۔ کس کس کو گنایا جائے۔

حشر مرحوم کی اکثر تصانیف کو میلو ڈرامہ۔ دور جدید کی ڈرامہ نویسی سے دور۔ گذرے ہوئے زمانہ کی یادگاریں۔ یا بعض میں پلاٹ کی خامیاں یہ سب کچھ آپ کہتے تو تسلیم کے قابل ہو سکتا ہے لیکن انصاف کی آنکھیں اس طرح تو بند نہیں کی جا سکتیں۔ حشر کا ہر ڈرامہ کردار نگاری کا ٹکسالی نمونہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ ان کی کردار نگاری صحیح اور سچے مطالعہ کا زندہ نتیجہ سمجھی جاتی ہے۔ ان کے کردار ضرب المثل کے طور پر شہرت پا چکے ہیں۔ اس قسم کی ناواقفیت کے نتائج سے اگر آپ ناٹک ساگر کو مکمل کرنا چاہتے ہیں تو اس دور میں ایسی ناقص تالیف ناقدین کی نظر سے گر جائے گی۔ براہ کرم حشر کے تمام ڈرامے غور سے پڑھیئے اور چند واقفین سے صحیح معلومات فراہم کیجئے۔ یہ زمانہ حقیقی علمیت اور سچی تنقید کا ہے سنی سنائی سے کام نہیں چلتا۔ ؎ بر رسولاں بلاغ باشد و بس"۔

چوہے کا ارتقا

ویسٹر انسٹی ٹیوٹ (امریکہ) نے نسل کشی اور تربیت کے ذریعہ چوہوں میں ایک نسل برآمد کی ہے جس کی اولاد تاریکی سے زیادہ روشنی کو پسند کرتی ہے۔ کھیلنے کے واسطے کھانا چھوڑ دیتی ہے آدمیوں سے اسقدر مانوس ہے کہ انکی آہٹ سے نہیں بھاگتی بلکہ لوٹ کر ان کی طرف دوڑتی ہے اور پیارے پیارے بلی کتوں کی طرح ان کے پیر چومتی اور گود اور بغل تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ساز اور موسیقی سے اثر قبول کرتی ہے اور کسی مستقل عبادت خانہ میں توجہ کے ساتھ مصروف عبادت بھی ہو سکتی ہے۔

ان چوہوں کے چوہوں جیسے قد و قامت پر صاف ستھرے سفید بال بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور جب یہ بے خوف ہوکر اپنی ننھی ننھی گلابی آنکھوں کو اپنے پالنے والوں کو دیکھتے اور ننھے ننھے لال پنجوں سے ان کے پنجوں کو گدگداتے اور لپکتے ہیں تو بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سلاس نے جنہوں نے اس تجربہ گاہ کا معائنہ کرکے ان چوہوں کی ترقی یافتہ کیفیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ پہلی مرتبہ جب میں نے ان چوہوں کو دیکھا اور یہ دوڑ کر میری طرف آئے تو میں جھجکا۔ لیکن معاً یہ دیکھا کہ وہ اپنی گرد اور خاتون کے جس نے چوہے گھر کا دروازہ کھول کر ان کو باہر نکلنے کا موقعہ دیا تھا پیچھے دوڑے اور یکبارگی بہت سے چوہے اس پر چڑھ گئے کوئی اس کے مونڈھوں پر جا بیٹھا کوئی بغل میں چھپ گیا کوئی آستین میں چڑھ گیا اور کوئی چھاتی پر کھڑا ہوکر اس کی ٹھوڑی چاٹ رہا تھا۔

میں حیرت سے دیکھتا اور سوچتا تھا۔ انسان۔ تیری دماغ سوزیوں نے ان چوہوں کی طبیعت کو بھی بدل دیا ہے۔ اپنی جلّی عادت بھول جانا اور ڈرنا تو درکنار کسی چوہے میں اسکا خیال بھی نہیں معلوم ہوتا۔ ایسے طبعی انقلاب میں یہ کہنا تو مشکل ہے کہ نسل کشی یا تربیت میں درخہ یا صحبت میں کس کو زیادہ دخل ہے۔ یہ ایسی بحث کا موقعہ بھی نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی ایک میں کوتاہی ہوگی تو دوسری حالت کا اسکا اثر ضرور پڑے گا۔ نسل کشی کا جہانتک تعلق ہے ان میں یہ خوبی متواتر کئی نسلوں کے متواتر تنقیہ اور اصلاح کے بعد آئی ہے۔ آبائی خون اور اسکی خرابیوں کی کشش نے ان کو مدت تک اپنا دامنگیر رکھا ہوگا یعنی جرائم پیشہ چوہوں کو عادات چوری۔ فرار، روپوشی، بچہ کشی برادر موش کشی کے فراموش کرنے کرانے کی بہت سی منزلیں طے کرنی پڑی ہیں تب کہیں یہ فرشتہ سیرت اور پری صورت موش زادے برآمد ہو سکے ہیں۔

چوہا انسان کا بہت قدیمی رفیق ہے یعنی اسوقت کا ساتھی ہے جب اس کو گھر بنا کر انسانوں کی طرح رہنے کا شعور بھی نہ تھا اور دوسرے حیوانوں کی طرح وہ بھی غاروں اور بھٹوں میں رہتا تھا۔ اسوقت یہی چوہے اس کے بچوں میں کھیلا کرتے تھے اور اس کے دسترخوان میں ہاتھ بٹاتے تھے۔ غرضیکہ چوہے کو اس کی پرانی شناسائی ہے اور شاید اسی لئے ویسٹر انسٹی ٹیوٹ کے منتظمین نے چوہوں کی اصلاح کی طرف یہ سمجھ کر توجہ دی ہے کہ چوہا بھی چھوٹی قسم کا انسان ہے جسے قصہ نویسوں نے کہیں کہیں مالشیہ کے خطاب سے بھی یاد کیا ہے لہذا دیکھنا چاہیئے کہ اس کے اندر ارتقا کی کوششیں کس حد تک کارفرمائی کرتی ہیں۔

بقول ڈاکٹر موصوف یہاں کی رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ ان مہذب چوہوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو معیار تہذیب سے تین فیصدی زیادہ ترقی کر چکے ہیں مقصد یہ کہ انکی جسامت پر چربی اتنی غالب آگئی ہے کہ اب انکی زندگی آرام سے بیٹھے لیٹے ہی گزرتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ اگر سوجھ بوجھ ہوتی تو یہ چوہے کھانا تحلیل کرنے کی غرض سے گالف کھیلنے جایا کرتے۔ اب ان میں چہل قدمی کرنے کی بھی ہمت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ سپرنٹنڈنٹ انسٹی ٹیوٹ سے ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جسمانی کیفیت سے زیادہ ان کی دماغی استعداد نے ترقی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ ان چوہوں کا دماغ ان کے بزرگوں کے دماغوں سے پانچ فیصدی زیادہ وزنی ہو گیا ہے۔ اور یہ ان سے بہت زیادہ ذہین اور ذکی ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ اور روشنی اس سلسلے میں نہیں ڈالی گئی جس سے ان کی ذہنی قابلیت کا اندازہ معلوم ہو سکتا اور ہم دیکھ سکتے کہ ہمارے قاضی کے چوہوں سے کتنے فاصلہ پر ہیں۔ کالجوں میں نئے طالب علموں کی بھرتی کے بعد پرانے طالب علم انکی ذہنی قابلیتوں کا جس طرح جائزہ لیتے ہیں شاید ویسا ہی کوئی طریقہ یہاں بھی رائج کیا گیا ہے۔ بہرحال یہ نازک بحث ہے جس نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو بھی خاموش رکھا ہے۔

دسترخوان پر دعوت دینا تو ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے لیکن شکم پری کو اعتدال پر رکھنا اور کھانے سے دستکش کرانا اور وہ بھی چوہوں کو مشکل ہے۔ لیکن انسٹی ٹیوٹ نے اس عقدہ کو گراموفون ریکارڈ بجا کر حل کر لیا ہے بتایا گیا کہ کھانے کے دوران میں جب گانے کے ریکارڈ بجتے ہیں تو یہ ایسے بیخود ہو جاتے ہیں کہ کھانا بھول جاتے ہیں۔ خیال آتا ہے کہ اگر مرثیہ یا سوز کے ریکارڈ بجائے جائیں تو یہ چوہے درد کی ٹیس سے ضرور آبدیدہ ہو جائیں گے۔ ان کا ایک عبادت خانہ بھی تھا۔ ایک کمرہ میں ایک طشت میں دو موم بتیاں جل رہی تھیں بتیوں کے بیچ میں ایک سکہ رکھا تھا۔ اس پر کسی مورت کا ٹھپہ تھا۔ شاید کسی موش دیوی کی مورت تھی۔ یہ تو معلوم نہیں کہ ان کے جذبات مذہبی کو ان کے اخلاق کے بلند کرنے میں کسقدر دخل ہے لیکن

عبدالرشید خاں

بظاہر ہم تو ان خوبیوں کو غذا اور تربیت کا حاصل سمجھتے ہیں۔ ایک مشہور ناول نویس نے اپنے افسانے کے چوہوں کے ذکر پر لکھا تھا کہ وہ کھاتے کھاتے شیر کے قد و قامت کے برابر ہو گئے تھے اور اس جسمانی ترقی کے ساتھ وہ عذاب الہٰی بھی بن گئے تھے اسلئے کہ شیر جیسے ہو کر وہ اس جیسے خونخوار بھی بن گئے تھے پس جسمانی ترقی کے مفید مطلب اچھی غذا اور خاطر خواہ آسائش اسی وقت جائز ہو سکتی ہیں کہ یہ جبائیتں خطرناک صورتیں اختیار کرنے کے بجائے اخلاق و محبت میں بھی ترقی کر سکیں۔ ایسی خوبیاں متوازن خوراک اور پابندی اوقات سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں۔

ان چوہوں میں ایک گروہ ایسا بھی دیکھا گیا جو بظاہر بہت مصیبت زدہ اور غمگین تھا۔ یہ چوہے دُبلے اور سست تھے اور مرجھائے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ شاید ان کو ٹھیک کھانا نہیں ملتا تھا یا نگرانی میں لاپروائی سے کام لیا جاتا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صورت حال برعکس تھی۔ اس گروہ کے چوہوں کو دوسرے چوہوں کی طرح نہ صرف یکساں خوراک ملتی اور نگرانی میں رکھا جاتا تھا بلکہ دوسروں سے زیادہ ایک مقوی بلکہ بھی اور ایسی دیجاتی ہے جس کے اشتہار اخبار اور رسالوں میں بڑے دعووں اور شان کے ساتھ شائع ہوتے ہیں اور صحت اور طاقت کے طلبگار رؤسا حصول طاقت میں اسکی مسیحائی پر ایمان لاکر دائمی وظیفہ بنائے ہوئے ہیں مصلحت اجازت نہیں دیتی کہ اس مفید چیز کا نام بتا دیا جائے۔ تاہم یہ تو واقعہ تھا کہ اس غذا کے نہ کھانے والے چوہوں کی صحت کھانے والے رئیس چوہوں سے بہتر تھی۔ ایسی امتیازی کیفیتیں انسانی طبقوں میں بھی چونکہ ملتی ہیں لہٰذا اگر نئی اور اشتہاری غذاؤں پر رجوع کرنے والے ان کا تجربہ پہلے چوہوں پر کر لیا کریں تو کثیر رقمیں اور ان سے زیادہ بہت سی قیمتی جانیں بچ سکتی ہیں۔ مثلاً انسانی خوراک اور غذاؤں کی نسبت اب تک جتنی معلومات بہم ہوتی ہیں اور ان پر جسقدر عملدرآمد کیا گیا ہے ان کے تلخ نتائج اگر استعمال سے پہلے معلوم ہو جاتے تو ضعف معدہ اور سوکھے کے عارضوں سے لاکھوں جانیں بچ سکتی تھیں۔

ان چوہوں میں سے اب بلوں میں گھسنے اور زمین دوز سوراخوں کی تاریکیوں میں دوڑنے کے شوق زائل ہو گئے ہیں۔ اب وہ آدمی سے نہیں ڈرتے اس لئے اب ان کے لئے چھپنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ اب تو وہ دوڑ کر اس کے پاس آتے ہیں گودیوں میں کھیلتے ہیں ان کو کاٹنے کے موقعے ملتے ہیں مگر نہیں کاٹتے۔ اسکی وجہ وہی ہے کہ دشمنی لڑائی اور خونریزی خوف سے پیدا ہوتی ہیں جب خوف نہیں رہتا تو دشمنی کی بنیاد بھی مٹ جایا کرتی ہیں۔ رہا کتے اور بلی کا خوف، معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ تذکرہ مہذب حیوانات کا ہے جہاں سماج کے تمام اہل معاملہ مہذب اور متمدن ہیں اور اپنے مرشد انسان کے حلقہ ارادت کے مرحول ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ انسٹی ٹیوٹ نے یہ بھی بیان کیا کہ ان چوہوں میں چالیس پشتوں سے دشمنی، خونریزی، نوچ کھسوٹ اور دبا کے آثار دیکھنے میں نہیں آئے لیکن یہ انسان کا کمال ہے کہ وہ قدیم زمانہ سے جنگل کے وحشیوں کو زیر کرکے آگ پانی ہوا اور زمین کے طاقتور عناصر کو سمجھ کر گو اُنسے مانوس ہو گیا ہے اور انھیں مفید مطلب آلہ کار بنائے ہوئے ہے پھر بھی وہ اطمینان سے سانس نہیں لے سکتا۔ اس کو چین نصیب نہیں ہوتا۔ وہ خونریزی قتل، غارتگری وغیرہ سے اگر محفوظ اور مامون نہیں ہے تو غور کیجئے کہ اب اسکو کس کا خوف ہے؟ اب اسکی لڑائی جنگل کے وحشیوں سے تو رہی نہیں۔ سانپ بچھو کا بھی خوف نہیں۔ سمندر کی بے پناہ وسعتوں اور گہرائیوں سے بھی اندیشہ نہیں۔ بجلی اور زلزلوں کا کھٹکا بھی بے معنی ہو گیا۔ ان میں کوئی اسکا مخالف نہیں سب خادم اور چاکر ہیں اب اسکی دشمنی جنگ بے چینی اور خوف اپنے ہم جنس انسان سے ہے یعنی انسان کی ہوس سے حرص اور نفس سے ہے۔ ان چیزوں نے ترقی کرکے منظم طاقتوں کی سلطنتوں کی شکلیں اختیار کر لی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ علم الاخلاق، ادبیات اور اعتقادات میں اصلاح نفس کے نسخوں کے بے شمار ذخیرے موجود ہیں۔ مگر یہ تریاق اسوقت کے ہیں جب امراض اتفاقی کرند اور عارضی ہوا کرتے تھے اور علاج میں چٹکلوں سے کامیابی ہو جایا کرتی تھی۔ اسوقت کے خوفناک طاقتوں کے پیش نظر مقتضائے ضرورت ہے کہ

(باقی صفحہ ۵۴ پر)

رومان، شادی، اور فرض!! — زیب عثمانیہ

عقد در رومان ہیں فطرت ہی کے آئین دونوں — یہ جو باواسطہ ہے تو وہ بلاواسطہ ہے
..توں تو دونوں ہی تصور میں خوش آئند مگر — دیکھنا یہ ہے انھیں فرض سے کیا واسطہ ہے

کوئی رومان کہ انجام ہو جسکا شادی — نوع انساں کے لئے گرچہ ہے پیغام سرور
نہیں لیکن سبب پختگیٔ رشتۂ زوج — کہ ہے کسل بدن و خستگی انجام سرور

ہاں زن و شو کے لئے ہے جو کوئی راہ وثوق — تو وہ تکمیل فرائض کے سوا اور نہیں
گھر کی ہے فرض، محبت کی بنا تھی جذبات — زوج ہے زوج ہی، محبوب کسی طور نہیں

یوں محبت کو سزا ہے کوئی گنتا ہی مگر — بھول سکتا نہیں یہ بات زمانہ ہرگز
فرض ہے زیست کا وہ تلخ تقاضا اے زیبؔ — قند الفت سے مزا جس کا نہ بدلا ہرگز

ہندوستان میں شکر سازی کی تاریخ

بی۔ این استھانا

شکر ہندوستان میں بہت ہی پرانے زمانہ سے بنتی چلی آرہی ہے گنّا درالاصل خاص ہندوستان ہی کی پیداوار ہے اور تمام دنیا میں جس قدر آراضی میں گنا بویا جاتا ہے اُس کا نصف حصہ ہندوستان کی آراضی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکر سازی کی صنعت ہندوستان کی صنعت وحرفت کی تاریخ کا ایک دلچسپ اور رنگین باب ہے۔ چونکہ مناسب محصولات اس کی پشت پر ہیں اس لئے اس صنعت نے عالمگیر اقتصادی کساد بازاری کے زمانہ میں بھی نمایاں ترقی کی۔ محافظتی قانون نافذ ہونے کے بعد دس سال سے بھی کم عرصہ میں ہندوستان میں اتنی شکر بننے لگی جو اس کی اپنی ضروریات کے واسطے کافی تھی۔

ہندوستان میں شکر سازی کی ابتدا بنگال میں ہوئی۔ ۳۲۵ ق.م کے لگ بھگ زمانہ میں ڈیوسکریڈیز (Dioscrides). نے لکھا تھا۔ ہندوستان کے سرکنڈے میں ایک طرح کا میٹھا رس پایا جاتا ہے" ۷۷ء میں پلینی (Pliny). نے لکھا تھا کہ شکر مغربی ممالک میں عربستان اور ہندوستان سے آتی ہے اور یہ کہ ہندوستان کی شکر زیادہ اچھی ہوتی ہے۔ ۱۵۴ء میں ایرین (Arian). نے لکھا کہ سرکنڈے سے نکلے ہوئے رس سے شکر بنائی جاتی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی تجارت ہندوستان اور بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ شکر ہندوستان میں بہت ہی قدیم زمانہ سے بنتی چلی آرہی ہے بلکہ اس کی تجارت بھی غیر ممالک کے ساتھ ہوتی رہی ہے۔ ۲۱۴ء میں سکندر ایفروڈیوکس نے لکھا ہے "جس چیز کو ہندوستانی شکر کہتے تھے وہ ایک طرح کا جما ہوا شہد ہوتا تھا جو سرکنڈے سے نکلتا تھا" اسی طرح مارکوپولو نے بھی ۱۲۹۵ء میں شکر کا ذکر کیا ہے کہ وہ بنگال میں تیار ہوتی ہے گنّے کی باقاعدہ کاشت اور شکر بنانے کی صنعت کا زمانہ ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک میں سولھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ آئین اکبری کی رو سے سولھویں صدی سے بہت پہلے سے ہندوستان میں یہ صنعت پھل پھول رہی تھی۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں شکر بہت بڑی مقدار میں ہندوستان سے باہر بھیجی جاتی تھی شکر کی برآمد کی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی کرتی تھی۔ جو شکر کمپنی ہندوستان سے انگلستان بھیجتی تھی اس پر کمپنی کو پچاس فیصدی کا منافع ہوتا تھا۔ ایک قدیم مورخ نے جو اعداد وشمار دئے ہیں ان کو دیکھ کر اندازہ ہوسکتا ہے کہ کمپنی کو اس سلسلہ میں کس قدر منافع ہوتا تھا۔ وہ اعداد وشمار یہ ہیں :-

۱۷۹۸ء میں کمپنی نے ۵۲۴۴ ٹن شکر انگلستان میں درآمد کی۔ شکر کی قیمت ۹۹۶۸۲ پونڈ تھی۔

جہاز وغیرہ کا کرایہ	۱۰۴۸۳۸	پونڈ
محصول	۶۹۴۶	پونڈ
بکری پر لاگت	۴۹۳۰	پونڈ
کل لاگت	۲۱۶۳۹۶	پونڈ
قیمت فروخت	۳۳۱۳۸۱	پونڈ
منافع تقریباً	۵۰	فیصدی
کل منافع	۱۱۴۹۸۵	پونڈ

جب شکر کی برآمد پر اس قدر منافع ہوتا تھا تو برآمد کی مقدار بڑھنا ایک لازمی امر تھا۔ مندرجہ ذیل گوشوارہ سے پتہ لگے گا کہ مختلف سالوں میں نجی سوداگروں نے کتنی شکر باہر بھیجی :-

سال	قیمت روپیہ	انگلستان کو	امریکہ کو
۱۷۹۶ء	۸۲۰۱۸۹	۳۰۵۵۱	۱۲۶۱۷۱
۱۷۹۸ء	۸۴۶۷۵۲	۱۸۲۶۵۰	۵۱۹۸۴۳
۱۸۰۰ء	۲۳۸۹۶۹۱	۶۹۸۶۶۲	۶۵۹۳۴۰
۱۸۰۲ء	۱۲۰۱۷۹۸	۲۱۷۸۹۹	۲۱۰۳۷۹
۱۸۰۴ء	۱۰۷۱۳۶۶	۶۴	۸۵۳۳۱۲
۱۸۰۶ء	۳۳۲۴۱۶۸	۵۴۴۷۸	۱۱۶۹۲۵۱

۱۸۰۰ء سے ۱۸۰۶ء تک برآمد میں کمی رہی۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہوئی کہ اس کی تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ کرنے لگی۔ دوسرے یہ کہ جزائر غرب الہند میں بھی شکر بننے لگی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان سے شکر کی برآمد بند ہوگئی بلکہ یہاں اس کی درآمد ہونے لگی جن ملکوں سے شکر یہاں آنے لگی ان میں جزائر موریشیس اور جاوا خاص ہیں۔ انگریز، فرانسیسی اور پرتگالی سوداگروں نے انگلستان کی شکر کی منڈی پر قبضہ کرنے کی جوانتھک کوششیں شروع کیں تو اس سے ہندوستانی صنعت کو شدید نقصان پہونچا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے مفاد کے مدنظر شکر کی برآمد کو جاری رکھنے کی کوشش کی لیکن زیادہ کامیابی نہیں ہوئی جب ہندوستانی شکر جزائر غرب الہند کی شکر کا مقابلہ کرنے کو تیار ہوگئی

تاجروں پر محافظتی محصول لگا دیا۔ اسی نا روا رویہ کی وجہ سے شکر کی برآمد میں سنہ ۱۸۰۰ء و سنہ ۱۸۰۶ء سے کمی آتی جاری ہے۔

حالات اور بھی زیادہ خراب اس وقت ہو گئے جب سنہ ۱۸۴۲ء سے یورپ میں چقندر سے شکر بننے لگی۔ امریکہ میں اس شکر پر محصول لگا دیا گیا۔ اور ہندوستان خسارہ میں رہا۔ جاوا میں گنا اگانے کے لئے سائنسی طریقے اختیار کئے گئے جس کی وجہ سے وہاں بہتر قسم کی شکر بننے لگی۔ ان باتوں کی وجہ سے یورپ کی بہت سی منڈیاں ہندوستان کے ہاتھوں سے نکل گئیں۔ آئندہ پچاس سال کے اندر ہندوستان میں اتنی ہی شکر کی درآمد ہونے لگی جتنی کی برآمد ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ آئندہ پچاس سال میں ہندوستان بجائے برآمد کرنے والے ملک کے درآمد کرنے والا ملک بن گیا۔ انیسویں صدی کے اختتام تک صرف یوپی ہی میں تقریباً دو سو شکر سازی کے کارخانے بند کر دینے پڑے۔ کچھ ایسے محصولات لگائے گئے جو ہندوستانی شکر سازی کی صنعت کے لئے مفید ہو سکتے تھے لیکن چونکہ اس صنعت کو محفوظ کرنے کے لئے کوئی باقاعدہ منظم کوشش نہیں کی گئی اس لئے ان محصولات سے بھی کچھ کام نہ بنا۔ غیر ملکی شکر سے مقابلہ بازی کی وجہ سے ہندوستانی شکر کی قیمت گرتی ہی گئی۔ ایک وجہ اس زوال کی یہ بھی ہوئی کہ یہاں شکر گڑ سے بنائی جاتی تھی اور وہ بھی بڑے کھلے اور بھونڈے طریقوں سے جس کی وجہ سے بہت کچھ مال ضائع بھی ہو جاتا تھا۔ پھر بھی ہندوستانی شکر ایسی عمدہ نہیں بن سکتی تھی جیسی غیر ملکی ہوتی تھی۔ شکر بہت کم مقدار میں بنتی تھی اور نئی مشینوں کا استعمال بھی زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ چونکہ حکومت نے راب سے رم (شراب) بنانے کی اجازت نہیں دی اس لئے شکر بنانے والوں کا منافع بھی کم رہا۔

باہر کے گنے کے مقابلہ میں ہندوستانی گنا پتلا ہوتا تھا اور اس میں سے رس بھی کم نکلتا تھا۔ اس کے علاوہ فی ایکڑ پیداوار اتنی کم ہوتی تھی کہ گنا ملک کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ناکافی رہتا تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے بہت سے باشندے سبزی خور ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں البتہ اس صنعت کو جدید سائنسی طریقوں پر ترقی دینے کی باقاعدہ کوششیں شروع ہوئیں۔ حکومت ہند کا محکمہ زراعت سنہ ۱۹۱۰ء سے برابر کوشاں ہے کہ ہندوستان میں گنے کی پیداوار کو بہتر اور زیادہ بنایا جائے۔ ڈاکٹر باربر کے تجربوں نے بہت اچھے نتائج دکھائے ہیں۔ گنوں کی حفاظت کے بہت سے طریقے ایجاد اور اختیار کئے گئے ہیں اور آب و ہوا کے مطابق گنوں کی فصل کو بہتر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ اچھے قسم کے گنے اگانے کے واسطے بہتر قسم کے بیج مہیا کئے جا رہے ہیں۔ کوئمبٹور کے "امپیریل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" اور مختلف صوبوں کے گنوں کے محکمہ جات کی کوششوں سے گنوں کے ایسے قلم نکالے گئے ہیں جن سے زیادہ لمبے، زیادہ موٹے اور زیادہ رسیلے گنے پیدا ہو سکتے ہیں۔ کوئمبٹور کے محکمہ شکر نے جو نئی قسم کے گنے اگائے ہیں (مثلاً کو ۲۱۰، کو ۲۱۳، کو ۲۱۴ کے گنے) وہ دیسی گنوں سے کہیں بہتر ہیں۔ آج یہ گنے تقریباً چالیس لاکھ ایکڑ زمین میں بوئے جاتے ہیں۔

دور حاضر میں شکر سازی کی تاریخ نئے محصولات اور نئی قسم کی پیداوار کی ایک طویل فہرست ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء سے پہلے (جبکہ حفاظتی قوانین پاس ہوئے) صاف شکر کی صنعت بہت ہی خراب حالت میں تھی۔ غیر ملکی مقابلہ بازی، شکر بنانے کے بھدے طریقوں کا نقصان اور رس کی کمی۔ یہ سب چیزیں اس صنعت کی ترقی کی راہ میں حائل رہیں۔ سنہ ۱۸۹۵ء میں صرف برائے نام محصول بشرح ۵ فیصدی لگایا گیا تھا اور اس کا مقصد محض سرکاری آمدنی بڑھانا تھا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں یہ محصول دس فیصدی ہو گیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ۱۵ فیصدی اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ۲۵ فیصدی۔ سنہ ۱۹۲۵ء میں اس معمولی محصول نے چار روپیہ آٹھ آنے فی صدی محصول کی صورت اختیار کر لی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ محصول ۴½ روپیہ سے چھ روپے ہو گیا اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۷¼ روپیہ فیصدی ہو گیا۔ دوران جنگ اور بعد از جنگ کے زمانہ میں مالی خسارہ کو پورا کرنے کی نیت سے درآمدی شکر کے محصول میں بھی زیادتی کی جاتی رہی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں "انڈین شوگر کمیٹی" اس لئے بنائی گئی کہ وہ شکر سازی کی صنعت کو منظم کرے اور اس کو ترقی دے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ "شوگر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" قائم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کچھ بے التفاتی سی ہوتی رہی ہے اور اس کی حفاظت کا کچھ زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ سنہ ۱۹۲۹-۳۰ء میں "امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ" کے ایما پر حکومت نے اس طرف خاص توجہ دی اور حفاظتی قوانین کے زیر سایہ شکر سازی کے محکمے قائم کئے جانے لگے۔ حفاظت کا مسئلہ "ٹیرف بورڈ" (Tariff Board) کے حوالہ کیا گیا۔ "فسکل (مالی) کمیشن" نے جو شرائط لگائی تھیں ان کی روشنی میں اس بورڈ نے کل معاملہ پر غور کیا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں "شوگر انڈسٹری پروٹیکشن ایکٹ" پاس ہوا۔ پہلے سات سال کے لئے ۷¼ روپیہ فیصدی کا محصول لگایا گیا اور آئندہ آٹھ سال کے لئے ۶½ روپیہ فیصدی کا۔ یہ بھی شرط رکھی گئی کہ ضرورت کے وقت اس شرح میں زیادتی کی جا سکتی تھی۔ یہ صورت حال گویا بہتر ہو گئی تھی۔

لیکن بدقسمتی سے درآمدی شکر پر سرکاری محاصل کے نقصانات کو پورا کرنے کی غرض سے سنہ ۱۹۳۴ء سے آبکاری محصول بہ شرح ۱۰/ کھنڈساری پر اور بشرح ۱؍ فی صدی کارخانہ کی شکر پر لگایا گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس محصول کی رقم میں سے کچھ روپیہ (جس کی مقدار سات روپیہ تک پہنچ گئی تھی)

ایک آنہ فیصدی کے حساب سے تمام صوبوں کو دیا گیا تاکہ وہ اس روپیہ سے کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کریں جو گنا پیدا کرنے والے کسانوں کی امداد کریں۔ گنا اور شکر کی صنعت کو ترقی دینے کے واسطے دس لاکھ روپیہ امپیریل کونسل آف ایگریکلچر ریسرچ، کو دیا جانا طے ہوا۔ محصول درآمد ۲۵ فیصدی کر دیا گیا اور جو سرچارج (بالائی محصول) ۱۹۳۱ء میں لگا تھا وہ ۵/۴ سے عہ کر دیا گیا فروری ۱۹۳۴ء سے ڈیوٹی ۹/ کر دی گئی اور سرچارج ڈیوٹی بشرح عہ فی ہنڈرڈ ویٹ ملک تیار ہونے والی شکر پر لگا دی گئی۔ اس سے شکر پر کل درآمدی محصول ۹/ ہو گیا۔ کھنڈساری پر جو آبکاری محصول تھا اس میں بھی عہ روپیہ کی کمی کر دی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں ٹیرف بورڈ نے سفارش کی کہ حفاظتی محصول کو ۱۲ فیصدی کر دیا جائے اور کھنڈساری پر آبکاری محصول ۸ فیصدی کم کر دی جائے۔ یکم مارچ ۱۹۴۰ء سے حفاظتی محصول پھر ۱۲ کر دینا پڑا۔ کیونکہ آبکاری محصول عہ سے ۱۲ ہو گیا تھا۔ حفاظتی محصولات سے شکر سازی کی صنعت کو بڑی تقویت پہونچی لیکن آبکاری محصول کے لگ جانے سے کھنڈساری کی پیداوار میں بڑی کمی آگئی۔

جس اراضی میں گنے کی کاشت ہوتی تھی اس کی مقدار بھی بڑھتی ہی رہی ہے۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں ۲۶,۷۰,۰۰۰ ایکڑ زمین میں گنا بویا جاتا تھا لیکن ۱۹۳۶-۳۷ء میں اس کی مقدار ۴۱,۳۲,۰۰۰ ایکڑ ہو گئی۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں تقریباً ۹,۴۰,۰۰۰ ٹن شکر کی ہندوستان میں درآمد ہوئی تھی لیکن ۱۹۳۱-۳۲ء سے درآمد کی مقدار برابر گھٹتی رہی یہاں تک کہ ۱۹۳۶-۳۷ء میں اس کی مقدار صرف ۲۳,۰۰۰ ٹن رہ گئی۔ ۱۹۲۹ء میں شکر سازی کے کارخانوں کی تعداد ۲۹ تھی لیکن ۱۹۳۱-۳۲ء میں یہ تعداد ۳۲ ہو گئی اور ۱۹۴۰-۴۱ء میں ۱۴۸ تک پہونچ گئی۔ یہ کارخانے زیادہ تر بہار اور یوپی میں ہیں۔ ۱۹۴۰-۴۱ء میں یو۔پی میں ۷۱ کارخانے تھے اور بہار میں ۳۲۔ حالانکہ ۱۹۳۲ء میں یو۔پی میں صرف ۴ تھے اور بہار میں ۱۲۔ محافظتی محصول کے لگ جانے سے ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کو بڑی تقویت پہونچ گئی۔ ۱۹۲۹-۳۰ء میں یہاں صرف ۹۰,۰۰۰ ٹن شکر بنتی تھی لیکن ۱۹۴۰-۴۱ء میں یہ مقدار ۱۲,۴۴,۰۰۰ ٹن تک پہنچ گئی۔ اس میں سے یوپی میں ۵,۹۵,۰۰۰ ٹن بنی اور بہار میں ۲,۴۳,۱۰۰ ٹن۔ ۱۹۳۲ء کے حفاظتی قانون سے اس صنعت کی جو توسیع اور ترقی ہوئی اس کا اثر قدرتی طور پر درآمد پر پڑا۔ درآمد کی مقدار میں جو کمی ہوئی اس سے ملک کو ۱۸ کروڑ کی بچت ہوئی اور حکومت کو تقریباً ۸ کروڑ کا منافع ہوا۔

ہندوستان کی اس صنعت کی ترقی کی داستان بہت دلچسپ ہے اس کی خاص وجہ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے وہی ۱۹۳۲ء کا قانون ہوا جس کے بغیر یہ ترقی اس سرعت کے ساتھ ناممکن تھی۔ اس ترقی کے کچھ اور اسباب بھی تھے جو اسیقدر اہم ہیں۔ اقتصادی کساد یعنی مشینوں اور دوسری چیزوں کی ارزانی نے بھی اس سلسلہ میں بڑی مدد کی۔ اس کے علاوہ سود کی شرح کی کمی بھی کافی ممد ثابت ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں زمینوں کی قیمت بھی گری ہوئی تھی اور بجلی کے کنوؤں اور آبپاشی کی دوسری سہولتوں کی وجہ سے بھی بڑی آسانی بہم پہونچ گئی۔ اس صنعت کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ اس کے مزدوروں کی اجرت مقابلتہً کم ہوتی ہے اور اس کے کارخانے انہی مقامات میں ہیں جہاں گنا بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ شکر سازی کے علاقوں میں ریلوں کے جال بچھے ہوئے ہیں اور کچا اور پکا مال بھی سستے داموں میں اِدھر اُدھر بھیجا جا سکتا ہے۔ "امپیریل شوگر انسٹی ٹیوٹ"، کی مساعی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غرض ان تمام اسباب نے مل جل کر اس صنعت کو اس قدر نمایاں ترقی بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان دنیا کے سب سے بڑا شکر ساز ملک ہے۔ اس صنعت میں جس قدر سرمایہ لگا ہوا ہے اس کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ ۲۵ اور ۳۰ کروڑ کے درمیان ہے۔

اس صنعت نے جو اس قدر سرعت کے ساتھ ترقی کر لی ہے اس نے کئی الجھنیں بھی پیدا کر دی ہیں مثلاً گنے کی پیداوار کے علاقوں کی تخصیص، شکر سازی کے کارخانوں کو گنے کی باقاعدہ اور مسلسل بہم رسانی، گنے کی کم از کم قیمت کا تعین،

پیامِ سجدہ

سلام ساگری

کسی کی بزم میں کرنا ہیں کچھ دن رائیگاں مجھکو
کہاں لیجا رہی ہے اے مری عمرِ رواں مجھکو

جلالِ برق کا مقصود ہے اب امتحاں مجھکو
بنانا ہے ابھی ہر شاخ پر اک آشیاں مجھکو

جتاتا کس شبابِ انجمن کا رنگ آنکھوں میں
جہاں دیکھا وہیں ہر شے نظر آئی جواں مجھکو

جہاں تک میری رودادِ وفا سے وہ نہ اکتائیں
سنانی ہے وہیں تک زندگی کی داستاں مجھکو

سمجھتا ہوں بخوبی گردشِ ایام کا پہلو
زمانہ آزماتا ہے وہاں اُن کو یہاں مجھکو

جہاں گرتا ہوں تھک کر ڈھونڈ لیتا ہوں میں منزل
غبارِ کارواں سمجھیں نہ اہلِ کارواں مجھکو

تماشا غیر دیکھیں میں یہ کیوں کر دیکھ سکتا ہوں
ترے جلوے کی ارزانی بھی ہوتی ہے گراں مجھکو

بیانِ عشق کی خاطر زباں سے کام لینا ہے
تمہارے سامنے آنکھیں رکھنی ہے زباں مجھکو

سلام اپنی محبت اصل میں خود دار ہے لیکن
"پیامِ سجدہ" دیتا ہے کسی کا آستاں مجھکو

کارخانوں اور ٹھیکہ داروں کو لائسنس دینا، تول اور قیمت کی ادائیگی کی نگرانی، حمل و نقل کی سہولتیں اور مزدوروں کے فائدہ اور آرام کی باتیں۔ حکومت نے ان تمام مسائل پر کماحقہ اپنی توجہ صرف کی ہے۔

ہندوستان میں اور بالخصوص یو۔پی اور بہار میں یہ صنعت بہت ہی منظم صورت میں ہے۔ گنّے کی قیمت مقرر کرنے کے لئے حکومت نے ۱۹۳۴ء میں گنّے کا قانون "شوگر کین ایکٹ" پاس کیا۔ اس کی رو سے صوبہ جاتی حکومتوں کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ قیمت مقرر کرنے، تول اور گنّے کی خرید کو منظم کرنے کے مناسب قوانین بنائیں۔ حکومت یو۔پی نے گنّے کی قیمت "ہمہ کمیٹی" کی سفارش پر مقرر کی۔ اس کمیٹی میں کسانوں اور کارخانہ جات کے مالکوں، دونوں کے نمائندے شریک تھے۔ شکر کی منڈی پر بھی نگرانی رکھی گئی اور اس کام پر نظر رکھنے کے لئے انسپکٹروں کا تقرر ہوا۔ حکومت نے اس سلسلہ میں جو مزید دلچسپی لی اس کا اندازہ ۱۹۳۸ء کے "شوگر فیکٹریز ایکٹ" سے ہو سکتا ہے۔ یہ ایکٹ مندرجہ ذیل امور پر حاوی تھا۔

(ا) شکر کے کارخانوں کو لائسنس دینا۔
(ب) کارخانوں کو گنّا مہیا کرنا۔
(ج) "شوگر کنٹرول بورڈ" اور مشاورتی مجلسوں کا قیام
(د) گنّے کی کم از کم قیمت کا تعین۔
(ہ) گنّے کی بکری پر محصول لگانا۔

حکومت نے جو اقدامات ۱۹۳۰ء کے بعد سے کئے ان سے اس صنعت کو بڑی تقویت پہونچی۔ حکومت نے یہ قوانین اس لئے بنائے تاکہ اس صنعت کی سریع ترقی سے جو مشکلات پیدا ہو گئی تھیں وہ حل ہو جائیں۔

اس صنعت کو دو دفعہ بڑے نازک دوروں سے بھی گذرنا پڑا۔ پہلی دفعہ ۱۹۳۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۴۰ء میں۔ ۱۹۳۷ء میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شکر کی قیمت بڑھتی ہی چلی جائے گی اس لئے گنّے کی پیداوار زیادہ سے زیادہ کی جانے لگی۔ شکر ۰۰۰ر۳۰ر۱۲ ٹن تک تیار ہونے لگی حالانکہ اس کی کھپت کا اندازہ ۰۰۰ر۵۰ر۱۱ ٹن کا تھا۔ کثرت پیداوار کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی قیمت گر گئی۔ اس کثرت پیداوار اور اندرونی مقابلہ بازی سے منافع میں جو کمی آ گئی تھی اس کو روکنے کے لئے "شوگر سنڈیکیٹ" بنا اور "شوگر کنٹرول ایکٹ" بنائے گئے۔ ۱۹۳۷ء میں شکر کے بارے میں جو معاہدہ ہوا اس میں ہندوستان کی صنعت شکر سازی کا قطعی کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ اس معاہدہ کی رو سے ہندوستان سے شکر سمندر کے راستہ سوائے برما کے اور کہیں نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ اگرچہ ہندوستان میں اس زمانہ میں شکر کی پیداوار ضرورت سے زیادہ ہوئی لیکن یہ اپنے ہمسایہ ممالک مشرق وسطی کو اپنی زائد شکر نہیں بھیج سکا۔ ۱۹۴۰ء میں جبکہ ہندوستان میں انتہائی کثرت سے شکر تیار ہوئی یہاں سے لاکھوں ٹن شکر بڑی آسانی سے باہر بھیجی جا سکتی تھی۔ اس بین الاقوامی معاہدہ سے ہندوستان کی اس صنعت کو بڑا نقصان پہونچا اور ۱۹۴۰ء میں تو اس کے لئے ایک بہت ہی نازک دور آ گیا۔

ہندوستان کی اس صنعت کو بہت سی دقتیں پیش آئیں لیکن ان تمام مشکلات کے باوجود یہ صنعت برابر ترقی کرتی رہی یہانتک کہ آج شکر سازی ہندوستان کی سب سے بڑی صنعتوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ آبکاری محصول کی زیادتی اور مرکزی حکومت اور صوبہ جاتی حکومتوں کے درمیان یکسانی کے فقدان نے اس صنعت کو ہر قدم پر نقصان پہونچایا۔ گنّے کی کوئی ایک قیمت کبھی مقرر نہیں ہوئی جس کی وجہ سے زیادہ پیداوار اور کم پیداوار کے سالوں میں قیمتیں برابر گھٹتی بڑھتی رہیں۔ ۱۹۴۲ء میں جبکہ شکر کی گرانی نے اس کی پیداوار میں بڑی زیادتی کر دی تھی حکومت سمندر کے راستے اس کی برآمد کا انتظام نہ کر سکی۔ اگر ایسا ممکن ہو جاتا تو ۱۹۴۰ء والا نازک دور کبھی نہ آتا۔

ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت دوسرے درجہ پر ہے۔ پہلے درجہ کی صنعت سوت کی ہے۔ حفاظتی محصول کی مدد سے اس صنعت نے بڑی نمایاں ترقی کر لی ہے اور تقریباً ۱۲ لاکھ آدمی اس صنعت کی بدولت پیٹ پال رہے ہیں۔ ان میں ۰۰۰ر۳۰ گر یجویٹ بھی شامل ہیں۔ اس صنعت نے نہ صرف یہ کیا کہ لاکھوں روپیہ دوسرے ملکوں کو جانے سے بچا لیا بلکہ لاکھوں کسانوں اور مزدوروں کو خوش حال بنا دیا۔ کارخانوں کے حصہ داروں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اس صنعت کا مستقبل بہت روشن ہے۔ بمبئی کے تاجروں کی جو منصوبہ بندی ہمارے طریقہ حیات کو بلند تر کرنا چاہتی ہے وہ اس صنعت کو بھی یقیناً تقویت پہونچائے گی۔

چوہے کا ارتقا

بقیہ صفحہ ۵۰

طبیعت یا اہلِ ذوق ان کی بنیادوں کو جانچیں۔

انسان نے جب سے سکّے کو ذریعہ خرید و فروخت بنا کر اس کے اندر دستورِ فطرت کی تقلید میں قوتِ تولید جنسی یعنی سود کو جائز قرار دیا ہے وہ قرض کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اس کے لئے کوئی چیز اتنی خوفناک نہیں ہے بیاہ نہیں جتنی تقاضہ دار کی شکل۔ صدیوں سے انتقام کا تصور درحقیقت اپنی ہی کے تخیل ہیں۔ خوف کی شکلوں اور ضخامتوں کی قسمیں مختلف ہیں۔ نام سرق ہیں۔ لیکن بنیاد خوف اسی غیر فطری مولود کا قیام ہے جسکو انسان نے ابھی تک نہیں سمجھا ہے ❊

۲

ریختی اور جان صاحب

مشیر احمد

جان صاحب نے اپنے زمانہ کی دگرگونی، سیاسی ابتری، انقلابِ زمانہ اور گردشِ دوراں کا ذکر بھی بڑے درد انگیز اور موثر طریقہ پر کیا ہے۔ ان کی آنکھوں نے دیکھا کہ بڑے بڑے خاندانی رئیس نانِ شبینہ کو محتاج ہو گئے اور کم ذلت اجلاف دولت سے مالا مال اور بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے اور اپنی کم ظرفی سے بڑوں کے منہ کو آئے تو ان کا حساس دل چیخ اٹھا۔ ان کی چیخ درد میں بھری ہوئی اور زہر میں بجھی ہوتی ہے:-

انڈی کا تیل جن کو میسر نہ ہو کبھی
روشن کریں وہ قوم کے کوری چراغ شمع

ہے خدا کی شان وہ افضل نسا خانم بنی
بیچتی پھرتی تھی گلیوں میں جو کھرنی فالسے

مغربی معاشرت کے اثرات نوابی زمانہ میں ہی لوگ قبول کرنے لگے تھے۔ ولائتی کپڑوں اور انگریزی لفظوں کا چلن ہو چلا تھا۔ بہت سے امیر کبیر ہندوستانی فرنگی عورتوں سے بیاہ شادی بھی کرنے لگے تھے لیکن جان صاحب مشرقیت پسند اور پکے وطن پرست تھے ان کو یہ مغربی ہوا ذرا نہ بھاتی تھی۔ وہ نئے فیشن کو برا سمجھتے تھے اور اس پر سخت نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اپنی بے بسی پر افسوس کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ پاتے تھے۔

کلو نظر آنے لگے اب لاکھوں ہی گورے
در گور ہوا لکھنؤ کمپو سے زیادہ

مجکو تو ڈالا گھر میں، فرنگن کے ہو مرید
مسجد بنائی آپ نے گرجا کے سامنے

(طنز ملاحظہ ہو)

پہن کے کپڑے انگریزی میاں خورشید نکلتے ہیں
نئے موتی محل سے بن کے اب لُولُو نکلتے ہیں

(اکبر الہ آبادی کا رنگ)

نیا رنگ اختیار کرنے سے انکار ؎

کپڑا انگریزی نہ پہنوں گی میں موتی خانم
ماں جو لُولُو ہو تو کیا بیٹی بھی لُولُو ہو جائے

ایک بات سن کر شاید آپ کو تعجب ہو کہ وہی جان صاحب جس کو آپ سنی سنائی کے بھروسے ایک فحش گو اور عریانی پسند شاعر سمجھتے ہیں وہ ایک اعلیٰ درجہ کا اخلاقی شاعر تھا۔ اس کے کلام میں وہ تاثیر ہے جو بڑے بڑے واعظوں کی زبان میں نہیں۔ "قدرِ عافیت بعد زوال" کے مضمون کو کس اچھوتے انداز میں ادا کیا ہے ؎

کھلتی ہے جبھی ٹھوکریں کھانے کی حقیقت
سر پر جو کوئی چاہنے والا نہیں رہتا

"مالِ موذی نصیبِ غازی" ؎

جس نے دولت قدم روپے گاڑے
مال وہ موذیوں کا مال ہوا

زمانہ سفلہ پرور ہے۔ صاحبانِ کمال کی قدر نہیں ہوتی ؎

جان صاحب رہا وہ تنگ سدا
جس کو حاصل کوئی کمال ہوا

عجیب زمانہ میں اندھیرا ہے بدرِ جہاں
کسی کمال کا کوئی نہ قدرداں دیکھا

کورانہ عقیدت اور غلط قسم کے مذہبی عقائد پر چوٹ کس انداز سے کی ہے ؎

ہے منافع جو مسئلے سے روا
سود کھانا بھی اب حلال ہوا

چپکے رہنے میں تھا حرام وہ کام
ایک دو بولوں سے حلال ہوا

مزارات کی فی زمانہ جو درگت بنی ہوئی ہے اور عرس وغیرہ کے موقعوں پر وہاں جو جو کچھ ہوتا ہے اس سے کون واقف نہیں۔ ان بداعمالیوں کا جان صاحب نے یوں پردہ فاش کیا ہے ؎

یہ جتنیاں ہیں تماش بینیں نہیں یاد سے کام ان کو
یہی ہے مطلب کہ جائیں درگاہ مردوں کا کریں نظارا

پرانی روش کا مذاق ؎

ہوئی ضعیف میں رنڈیا نہ وہ شباب رہا
عجب ہی ہم دولہن جان ہی خطاب رہا

رضا اور توکل کی تعلیم ؎

روٹی خدا کے ہاتھ ہے لے جان گھر میں بیٹھ
کیوں باندھے باندھے پھرتا ہے تو دربدر کمر

مروجہ تعلیم کے خراب اثرات کی وضاحت:-

پڑھائی کیوں زلیخا مولوی صاحب نے یوسف کی
کیا خانہ خراب اس کو دکھایا کوچہ الفت کا

بزرگوں کے ادب کی تعلیم و تلقین ؎

بدزبانی نہ کرو ان سے۔ بڑی بوڑھی ہیں
ساس سسر ہوں تو ہے دولہن جانی بڑا کار لحاظ

مردوں کی بے وفائی ہرجائی پن اور حسن پرستی کا پردہ اس طرح چاک کیا ہے ؎

یہ حسن کے ہیں گاہک مردوں کو خوب دیکھا
یوسف بنا رہے گا بی بی کا غلام کب تک

حسن و عشق چند روزہ ہوتے ہیں اور جوانی کے جوش کا اُبال ؎

جوانی بیٹھے موئے عارضی ہیں بس دونوں
یہ حسن و عشق نہیں اعتبار کے قابل

عالی ظرفی، خود داری اور بلند حوصلگی ؎

اس کو قربان کروں اپنے گزی گاڑھے پر
میری جوتی سے میسر ہے اگر تاش تمہیں

موت برحق ہے اور دنیوی عیش و آرام زوال پذیر اور فانی ہیں ؎

زناخی سدا جو ہیں پھولوں پہ سوتے
انھیں ایک دن خاک پر دیکھتے ہیں

دنیا چند روزہ ہے ؎

پایا ہوا کے کاندھے پہ تھا جنکے تخت کا
وہ تاج چتر والے نہ مسند نشیں رہے

دنیا سرا ہے لوگ مسافر عدم کے ہیں
کوئی نہیں رہے گا زناخی یقیں رہے

جان صاحب نے اپنے زمانہ کا حال بھی مفصل بیان کیا ہے۔ ان کا شہر آشوب سودا کے شہر آشوب سے کم نہیں بلکہ سودا کے ہاں شاعری ہے اور جان صاحب کے ہاں واقعیت۔ حکومت کو زوال ہو چلا تھا، ہر طرف بدنظمی کا دور دورہ تھا، رشوت کا بازار گرم تھا، عدالت میں بجائے انصاف

کے جھوٹ کی داد ملتی تھی، وکیل، موکل اور خود منصف جھوٹ بولتے اور بلواتے تھے، سچ کی ہر جگہ ہار تھی اور سچ بولنے والا بجائے اپنا حق پانے کے اُلٹا خود ہوتا تھا۔ چوری ہوئی تو بجائے چور کا سراغ لگانے کے پولیس الٹا گھر والے کو ستاتی تھی۔ روپیہ ہی کا سکہ چلتا تھا بے زر کو کوئی نہ پوچھتا تھا خواہ کتنا ہی فنی علم اور صاحب کمال ہو۔

عدالت کا حال ؎

کیا اجل میں داب کے ایمان بیٹھے بیچیا　　　　بی دوگانا پاس خالق کا نہ ہے قرآن کا
ڈاڑھی منڈوں سے ہیں لیتے ڈاڑھیوں والے سو　　　　حق کو ناحق کرتے ہیں ناحق کو حق یہ برملا
نوج دکھلائے خدا ایسی عدالت آج کل

پولیس کی کیفیت :-

کوتوالی والوں نے باندھی کمر انصاف پر　　　　الٹا راضی نامہ دے کچھ اور خرچے آن کر
پھر جو ہو چوری تو دہشت سے نہ ہو کوئی خبر　　　　پہلے گھر والے بندھیں اس کے ہو چوری جس کے گھر
تھانہ داروں نے نکالی ہے یہ حکمت آج کل

رشوت کی گرم بازاری :-

لالچی بندے یہ لینا ہی سمجھتے ہیں ثواب　　　　ڈر نہیں مرنے کا ہے کس کھیت کی مولی عذاب
صاف ٹکرا توڑ کر دیتے ہیں کا زندے جواب　　　　جو بہت دے اس کا کہنا ہو جو کم دے ہو خراب
ہر کچہری میں ہے کرتی کام رشوت آج کل

عام بدنظمی اور سلطنت کی دگرگونی :-

جب گنواروں کو ہو عامل کے نہ رہنے کا یقین　　　　کس طرح پیسا چلے دستور ہے یہ بھی کہیں
سال میں بارہ بدلتے ہیں بوا عامل یہیں　　　　بی امانی سال بھر کا کچھ اجارہ ہی نہیں
جو اضافہ دے وہی بس پہنے خلعت آج کل

بڑی ناانصافی اور حق ناشناسی ہوگی اگر جان صاحب کی علمی اور ادبی عظمت کا بھی اعتراف نہ کیا جائے۔ یہ آپ کا کمال ہے کہ آپ نے کسی شعر میں (باستثنا ایک قصیدے کے جس کا ذکر آگے آئے گا) نہ فارسی کی اضافت استعمال کی نہ فارسی کا حرفِ عطف۔ غریب اور نامانوس الفاظ سے بھی احتراز کیا ہے۔ سادگی اور سلاست آپ کے کلام کا خاص جوہر ہیں اور تشبیہات تو بہت ہی دلکش اور نئی نویلی ہیں۔ چند ایک سے آپ بھی لطف اندوز ہوجیئے :-

پان کھا کر جو ہنسی گوہر تو اس کے عکس سے　　　　موتیوں کا ہو گیا باجی گلے میں ہار سرخ
پروانے اڑ کے آتے ہیں پھبتی کہوں بوا　　　　ہے کھیلتی بٹیر کا گویا شکار شمع
تل نہیں مانگ میں زنا خی کے　　　　یہ کنھیا کھڑا ہے گوکل میں
کالی چادر کو نہیں پھینک کے چمکی مہتاب　　　　کوندکے اودی گھٹا سے نکل آئی بجلی

جان صاحب کا ایک قصیدہ بھی دیکھنے میں آیا ہے جو ایک رنڈی حسین باندی کی شان میں ہے۔ بڑی دھوم دھام کا قصیدہ ہے۔ شان و شوکت پیدا کرنے کے لئے صنائع بدائع کا خوب استعمال کیا ہے۔ سراپائے ممدوحہ خاص طور پر جاذبِ نظر ہے۔ حسین باندی سے جان صاحب کا کیا تعلق اور رشتہ تھا اور وہ کون سا جذبہ تھا جو اس قصیدہ کا محرک ہوا یہ ایک دلچسپ داستان ہے جس کی لطافت ہمارے بیان کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ آپ خود جان صاحب ہی کی زبان سے سن لیجئے ؎

کہتا نہ کیوں سراپا تیرا حسین باندی؟　　　　شیدا کا ہوں میں تیرے شیدا حسین باندی

سراپا کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

گردن تو ہے صراحی آنکھیں ہیں جامِ صہبا　　　　ہے اس میں خطِ ساغر سُرمہ حسین باندی
بازو ہیں ترے دونوں بس موجِ آبگوہر　　　　مضمون یہ ہاتھ کا ہے پایا حسین باندی
جو ہے ہلالِ گردوں اے آسمانِ شوکت　　　　ترشا ہوا ہے ناخن ترا حسین باندی
شفّاف ایسا پایا پائے نگاہ پھسلے　　　　عالم غضب شکم کا دیکھا حسین باندی
بلور کے ستوں ہیں رانوں سے ساق پا تک　　　　تصویرِ نقشِ پا کا نقشہ حسین باندی

یہ خیال غلط ہے کہ ریختی محض شہوانی خیالات کے اظہار کا آلہ تھی بلکہ دیگر اصنافِ سخن کی طرح اس نے بھی ادب اور سماج کی خدمت انجام دی ہے اور جان صاحب میں تو ترقی پسندی اور جدّت کے تمام عناصر موجود تھے۔ وہ اپنے ماحول کے غلام بن کر نہیں رہے بلکہ اپنے زمانہ کا ہر عیب اور ہر برائی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے بیہودہ باتوں کی طرف رغبت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بیزاری ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ان کا ہر شعر ایک طنز ہے اور ہر قہقہہ ایک زہرخند۔

ریختی میں جذبات، واردات، محسوسات اور خیالات سب زنانہ ہیں لیکن جدید ادب کی طرح اس میں جنسی بھوک کا شائبہ بھی نہیں بلکہ ریختی گویوں نے عورتوں کے صحیح خیالات اور معاملات کی ترجمانی کر کے ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ کہیں کہیں خیالات پست ضرور ہیں لیکن اس کی وجہ خود شاعر کی پست مذاقی یا دنایت نہیں ہے بلکہ بات یہ ہے کہ شاعر نے ہر درجہ، ہر طبقہ، ہر منصب اور ہر حیثیت کی عورت کے دل و دماغ کی ترجمانی کی ہے۔ اس سے ریختی اور ریختی گو شاعر کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا بلکہ اس صنفِ شعر کی ہمہ گیری کا ثبوت ملتا ہے اور ہم کو شاعر کی دقتِ نظر اور وسعتِ معلومات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آج کل کے بعض شاعر اور افسانہ نگار ارزاں شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لئے مختلف پہلوؤں سے عورت کو اپنا موضوع بناتے ہیں لیکن ان کی تحریرات سے ان کی جنسی بھوک اور دماغی ہیجان و خلفشار کا پتہ لگتا ہے جو عورت کی دوری کا نتیجہ ہے ان کے بیانات ذاتی مشاہدات اور تجربات پر مبنی نہیں بلکہ مستعار ہیں اور اسی لئے مبہم بھی۔ ان کے برخلاف ریختی گو شاعروں کے رشحاتِ قلم عورت کے قرب کا نتیجہ ہیں۔ انھوں نے خود عورت کو پرکھا، برتا اور سمجھا۔ "عورت ان کے اعصاب پر سوار نہیں" بلکہ وہ خود عورت کی کائنات پر حادی تھے۔

آسٹریلیا کے ڈیری فارم

جدید طریقوں سے پیداوار میں اضافہ

کرتار سنگھ

جب آسٹریلیا کے کسان اور مزدور فوج میں بھرتی ہو گئے تو آسٹریلیا میں کام کرنے والوں کی کمی محسوس ہونے لگی اور ساتھ ہی مشینوں کا استعمال بڑھ گیا۔ اسکا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آج آسٹریلیا میں پیداوار کے نسبتاً کہیں زیادہ ذرائع موجود ہیں اور ڈیری کی صنعت کو بھی بہت فائدہ پہنچا۔

آسٹریلیا میں مکھن کی سب سے زیادہ پیداوار یعنی ۲،۱۱،۹۸۷ ٹن ۱۹۳۹-۴۰ء میں ہوئی۔ اس کے بعد لڑائی کی وجہ سے آدمیوں کی کمی ہو گئی۔ یہ پیداوار لڑائی اور بُرے موسم کے سبب ۱۹۴۲-۴۳ء میں گھٹ کر تقریباً ۱۵۷،۴۹۸ ٹن رہ گئی جو ۱۹۳۰-۳۱ء تک کے زمانہ میں سب سے کم تھی۔ اس کے خلاف آسٹریلیا نے اپنے اتحادیوں کو خوراک کی بڑی مقدار دینے کا وعدہ کر لیا تھا جس میں دودھ کی پیداواریں بھی شامل تھیں۔

گھریلو استعمال کے لئے مکھن کا ہفتہ وار راشن آٹھ اونس سے گھٹ کر چھ اونس فی کس رہ گیا تھا۔ اس مشکل پر قابو پانے کی ہر ممکن کوشش عمل میں آئی۔ اب آسٹریلیا میں پچھلے کئی سالوں سے دودھ کی پیداوار کے بہتر امکانات ہیں اور برآمد کے لئے مکھن کی بچت بڑھتی جا رہی ہے۔ یکم جولائی ۱۹۴۵ء اور مارچ ۱۹۴۶ء کے درمیانی زمانہ میں مکھن کے ۸۲۸،۲۷،۱۰۰ ٹن باہر بھیجے گئے جن میں سے ہر ایک میں ۵۶ پونڈ مکھن تھا۔ اچھے انتظام اور سخت محنت سے کیا کچھ کیا جا سکتا ہے اس کی ایک مثال ہنری کلٹنر نگ، اس کی بیوی، دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کا کام پیش کرتا ہے۔

کلٹنر نگ نے ۱۹۲۰ء میں ۲۱۱ ایکڑ چراگاہ لی جہیں چالیس انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ یہ جگہ ملبورن سے، جو صوبہ وکٹوریہ کا صدر مقام ہے، نوّے میل مشرق میں واقع ہے۔ اس کے پاس تھوڑا سا روپیہ، کچھ گائیں، کچھ مشینیں اور ڈیری کے کام کا کچھ تجربہ تھا۔

اس وقت تک بحرالکاہل کی جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کے پاس آٹھ کمروں کا ایک لکڑی کا گھر، ایک پیانو، ریڈیو، ریفریجریٹر، گرکش اور جدید قسم کی نالیاں تھیں۔ بجلی اسٹیٹ الکٹریسٹی کمیشن سے حاصل کی جاتی تھی اور پانی ایک چھ ہزار گیلن کے زمین دوز حوض سے جو چھت کے پانی سے بھرا جاتا تھا۔ فارم کے اسوقت کے کاموں اور متعلقات کا بیان حسب ذیل ہے:۔

کلٹنر نگ پانچ بجے صبح کو اٹھتا ہے سو چھ بجے دودھ دوہنا شروع کرتا ہے۔ احاطہ، سائبان، ناندیں اور ٹہلنے کے راستے کنکریٹ کے بنے ہوئے ہیں جو اس جائداد کی ایک خندق سے نکالی گئی ہے۔ چھ مشینیں جن کی موٹر تین ہارس پاور کی ہے ایک گھنٹہ میں ساٹھ گایوں کو دوہ لیتی ہیں۔ دوہتے وقت گایوں کو نلی دار فولادی ٹکڑوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ دودھ کریم کی نلکیوں کے ذریعہ مٹی کی ہوئی بڑی بڑی ناندوں میں جاتا ہے۔ اسی سلسلہ کی دوسری امدادی چیزوں میں پچاس گیلن پانی گرم کرنے کی بجلی کی مشین، دودھ سے مکھن نکالنے کی مشین اور دودھ کا گودام جس میں تاروں کے جالی دار دروازے لگے ہوئے ہیں تاکہ مکھیاں داخل نہ ہو سکیں، شامل ہیں۔

شام کو چار بجے دودھ دوہنا شروع ہوتا ہے ہر مرتبہ دوہنے کے بعد نلی کے ذریعہ احاطہ اور سائبان کو صاف کیا جاتا ہے اور پانی نکال دیتے ہیں جو مکئی کی آبپاشی کے کام آتا ہے۔

کلٹنر نگ کے پاس جزیرۂ جرسی کی عمدہ نسل کے چار سانڈ ہیں۔ وہ ہر بچھڑے بچھڑی کی شناخت اور نسل کی یادداشت رکھتا ہے ہر مہینہ دودھ دینے والے مویشیوں کا معائنہ ہوتا ہے اور جو ایک خاص معیار سے کم دودھ دیتے ہیں انھیں نکال باہر کیا جاتا ہے۔ ہر سال فارم میں پیدا ہونے والی تقریباً ۲۵ نئی دودھ دینے والی گائیں گلہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ بچھڑوں وغیرہ کو اس وقت تک ان خاص احاطوں میں رکھا جاتا ہے جن میں موسم سے بچنے کا انتظام ہو، جب تک کہ وہ دودھ سے خالی مویشیوں کے ساتھ فارم کے پچھلے حصہ میں جانے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد سے وہ بھی دوسرے مویشیوں کی طرح تمام سال میدان میں رہتے ہیں۔ کلٹنر نگ نے خوب بیج بو کر اور کھاد استعمال کر کے چراگاہیں تیار کی ہیں وہ ایک ایکڑ میں چار پونڈ سال بھر رہنے والی رئی، تین پونڈ دوب اور تین پونڈ ملی جلی تپتیا گھاس بوتا ہے، موسم خزاں میں ان کے علاوہ قوی فاسفیٹ بھی ڈالتا ہے۔ اور چراگاہ میں گھاس اگاتا ہے جس میں سے نوّے ٹن خشک گھاس کے گٹھے محفوظ کر لیتا ہے اور ڈیڑھ سو ٹن سبز گھاس پہاڑی کی ایک خندق میں دبا دیتا ہے۔ یہ چارہ سردیوں میں کام آتا ہے۔

میدان کے سامان میں ۲۰ ہارس پاور کا ایک امریکی ٹریکٹر اور ایک آسٹریلیا میں بنی ہوئی گٹھا باندھنے کی مشین شامل ہیں۔

گرمیوں میں اس فارم میں تقریباً ۵،۰۰۰ گیلن پانی کی ہر روز ضرورت پڑتی ہے یہ پانی ایک بجلی کے پمپ کے ذریعہ ایک چشمے سے اٹھا کر دس ہزار گیلن کے کنکریٹ کے حوض میں ڈالا جاتا ہے جو سب سے بلند سطح پر واقع ہے، اور ساری ناندوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ خاص ضروریات میں پانی حاصل کرنے کے لئے ہوا کی چکی لگائی ہوئی ہے۔

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

نقد و نظر

بدلیاں

اس کتاب کی مصنفہ دلی کے مشہور شاعر اور ادیب حضرت آغا شاعر مرحوم کی صاحبزادی ہیں جنہوں نے ادبی ذوق اپنے والد سے ورثہ میں پایا ہے۔
کتاب میں ایک مقدمہ اور سولہ چھوٹے بڑے ادب پارے شامل ہیں۔ ان سب کو افسانے کہنا مشکل ہے کیونکہ ان میں سے اکثر مخصوص لمحات کے ایسے تاثرات کا نتیجہ ہیں جو فنی معنوں میں پوری طرح افسانہ بننے سے پیشتر ہی نذر قرطاس ہو گئے۔

اس کے باوصف محترمہ سحاب کے اظہار و بیان کی روانی اور بے ساختگی ان کی کم سنی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے یہاں تصویر پرستی اور جذباتیت ہی کی قندیلیں روشن نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی مشعل حیات سے زندگی کے شعلے بھی بلند ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہ صنف نازک کی زندگی پر مرد کی تلون مزاجی اور اداکارانہ اظہار عشق کے اثرات کو بھی محسوس کرنے لگی ہیں جس کی عمدہ مثالیں "کس قدر رنگین ہے راہ محبت کا فریب" اور "ٹوٹا ہوا کھلونا" وغیرہ ہیں۔

اگر انھوں نے لکھنے کی مشق جاری رکھی اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے پر توجہ دی تو ان کا ادبی مستقبل یقیناً نہایت شاندار ہوگا۔ افسانوی ادب اور خصوصاً صنف نازک کے ادب میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

ناشرین: ہندوستانی پبلشرز دلی ملنے کا پتہ نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار دلی۔ صفحات ۲۵۸۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ایک کاروباری

اختر اورینوی کا یہ ناولٹ ایک ایسے شخص کی زندگی کا آئینہ ہے جو غریب کمپاؤنڈر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے تعلیم تو برائے نام ہی حاصل کر سکا لیکن اپنی تاجرانہ صلاحیتوں اور انتھک کوششوں کی بدولت ایک اعلیٰ درجہ کا کاروباری ثابت ہوا۔
تاجرانہ کامیابیوں کے برعکس اس کی خانگی زندگی میں نئی نئی پیچیدگیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں اور وہ آخر کار عزم خودکشی تک پر مجبور ہو جاتا ہے۔
درحقیقت یہ کردار کا ناولٹ ہے۔ اس میں کردار نگاری اور تحلیل نفسی کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ کردار کے افعال و افکار کے ربط کو واضح کرنے کے لئے اس کے ہر ضروری پہلو کو روشنی میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی لئے اس کے کردار پلاٹ سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہیں۔
آئندہ واقعات اور پلاٹ کے پیش نظر ابتدا میں چھوٹا ناگپور اور ہیرو کے متعلقین کے حالات کس قدر زیادہ تفصیلی محسوس ہوتے ہیں۔ ممکن ہے شروع کرتے وقت اختر صاحب کا ارادہ خاصہ بڑا ناول لکھنے کا ہو جو آئندہ کسی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا ہو۔

یہ خوبصورت جلد والا ناولٹ $\frac{27 \times 17}{16}$ کے ۴ ۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت ۱۲ آنے۔

ناشرین: ہندوستانی پبلشرز دلی۔ ملنے کا پتہ: نگارستان ایجنسی اردو بازار دلی۔

شاہکار کا بہار نمبر

شاہکار نے گذشتہ سال "ترقی پسند ادب نمبر" نکالا تھا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ اس مرتبہ "بہار نمبر" شائع کیا ہے۔ اس خاص شمارے میں، جس کے شائع ہونے کی اپریل کے آخری ہفتہ میں امید کی جا رہی تھی، مئی کے آخر میں شائع ہو سکا لیکن اندراجات نے اس طویل اور پریشان کن انتظار کی تلافی کر دی۔ بہار نمبر پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے قابل مدیروں کی ساعیٔ جمیلہ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔
حصۂ نظم زیادہ تر بہار ہی سے تعلق رکھتا ہے، جس میں جگر مرادآبادی، اختر شیرانی، جوش ملیح آبادی اور احمد ندیم قاسمی کی نظمیں خاص دلکشی اور رنگینی کی حامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی مشاہیر کی غزلیں اور نظمیں ہیں جو اپنے موضوعات اور انداز بیان کے لحاظ سے نہایت خوشگوار تنوع پیش کرتی ہیں۔
ادبی مقالات کم ہونے کے باوصف نہایت معلومات افزا اور مفید ہیں۔
میرزا ادیب کا افسانہ "شبنم" ایک ایسے سپاہی کی متضاد نفسیات پیش کرتا ہے جس کا تصور کبھی اس کے ذہن میں غم و غصہ کی سرخ آندھیاں چلاتا ہے تو کبھی اس کے دل کو محبت سے سیراب کر کے جنگ، خونریزی، اور فتح و شکست تک کے احساسات سے بلند کر دیتا ہے۔
راجندر سنگھ بیدی کا ڈرامہ "ملچھٹ" اور سلطان داؤد کا افسانہ "میل کرو" بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ ان سب چیزوں کے علاوہ پرچہ میں دو رنگین تصویریں بھی شامل ہیں۔ یہ خاص نمبر دو سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اس لئے اس کی قیمت دو روپے کسی طرح زیادہ نہیں۔

سالنامہ تمثیل (بمبئی)

کاغذ کی کمیابی آجکل بہت سے ماہناموں کو مجبور کر رہی ہے کہ اپنے دو دو مہینے کے متعدد شماروں کو خاص نمبر بنائیں۔ تمثیل کا زیر نظر سالنامہ جنوری سے اپریل تک کے چار شماروں کا واحد نمائندہ ہے۔
حالانکہ اس کے شروع میں "احوال" کے تحت تمثیل کے تین چوتھائی حصہ کو خالص ادبی بتایا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں فلمی پرچہ کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ڈائرکٹروں اور فلموں کے متعلق مضامین، فلمی خبریں، فلمی ستاروں کی متعدد تصاویر اور فلموں پر تنقیدات اور اشتہار، غرض سبھی کچھ موجود ہے۔
اس سالنامہ کے "ادبی" حصہ کی بہترین چیز فراق کی نظم "تقدیر آدم"

ر۔ ن۔ ش

معلوم ہوتی ہے جو غالباً موصوف کی اجازت سے ان کے مجموعے "روح کائنات" سے نقل کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایک مقالہ "ہندی اردو جھگڑا اور ہم" بھی شامل ہے جس میں زبان کے مسئلہ کا حل فرقہ پرستانہ تعصبات اور خاص طبقہ کی شعبدہ بازی سے بچ کر دیہات کی زبان کو جس میں خسرو، رحیم، سورداس اور کبیر نے شعر کہے، اپنانا بتایا گیا ہے۔

سرورق کے علاوہ آرٹ پیپر کے چار صفحوں پر فلمی ستاروں کی خوبصورت تصاویر ہیں لیکن باقی پرچہ میں بادامی کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ابھی تمثیل کے ادبی حصہ کو اور بھی بہترین بنایا جاسکتا ہے۔ موجودہ حالت میں کم از کم فلمی پرچے پڑھنے والوں کو یہ ۱۴۰ صفحات کا سالنامہ ایک روپیہ میں ارزاں اور دلچسپ معلوم ہوگا۔

الکلام کا سالنامہ بنگلور کے روزانہ اخبار "الکلام" کا زیر نظر سالنامہ کئی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کی ترتیب کے وقت ہر قسم اور ہر مذاق کے پڑھنے والوں کی دلچسپی کا خیال رکھا گیا ہے۔ نظموں، غزلوں، افسانوں اور مقالات کے علاوہ اس میں مزاحیہ افسانے مثلاً "چچا چنچلی نے عید کی نماز پڑھی"، عورتوں سے متعلق مضامین مثلاً دکن کی بہادر خواتین اور بچوں کی دلچسپی کی کہانیاں، مثلاً "ننھا کھلونا" وغیرہ شامل ہیں یہی نہیں بلکہ اس کے لکھنے والوں میں بھی عورتوں اور طالب علموں کی کافی تعداد موجود ہے۔ اس سالنامے کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے قریب قریب سارے قلمی معاونین یا تو دکن ہی کے ہیں اور یا فی الحال دکن میں مقیم ہیں۔ اس سے سالنامے کے عام معیار پر تو اثر پڑنا ضروری تھا لیکن اس قسم کی کوششوں سے مخصوص خطوں کے شاعروں اور ادیبوں کی نمائندگی اور ہمت افزائی ضرور ہوتی ہے۔

یہ سالنامہ سائز اور ضخامت کے لحاظ سے بھی اہم ہے اور کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے لیکن نظموں اور سرخیوں کے ڈیزائن اس قدر رنگین ہیں کہ کبھی کبھی ذوق جمالیات پر بوجھ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ایک صفحہ سالنامے میں حصہ لینے والے ادیبوں اور شاعروں کی اور دو صفحے فلموں کی تصویروں کیلئے مخصوص ہیں۔ مجموعی اعتبار سے یہ کافی دلچسپ ہے اور اس کی قیمت ایک روپیہ بہت کم معلوم ہوتی ہے۔

آسٹریلیا کے ڈیری فارم : —— بقیہ صفحہ ۵۷

اس گھر کی جو اپنی ضروریات بڑی حد تک خود پوری کرتا ہے مسز کلٹرنگ نگرانی کرتی ہے۔ فارم کے سارے مرغے مرغیاں اور انڈے گھر کے استعمال میں آتے ہیں۔ دودھ اور مکھن ڈیری سے حاصل ہوتا ہے ساری سبزیاں باورچیخانہ کے باغ میں اگائی جاتی ہیں یہ مسز کلٹرنگ کا خاص کام ہے۔ اس کے علاوہ فارم کی بھیڑوں سے گوشت حاصل ہوتا رہتا ہے۔

نئی کتابیں

معاشیات قومی از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ۔ کتاب کا نفس مضمون نام سے ظاہر ہے دنیا کی قوموں کے اکنامکس کے مدوجزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ نہایت شستہ زبان میں ڈاکٹر صاحب جیسے عالم کے قلم سے۔ آج ہی طلب فرماکر ملاحظہ فرمائیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۵۰۲ صفحات جلد مضبوط کپڑے کی۔ گردپوش خوبصورت۔ قیمت آٹھ روپے۔

ہمارا قائد از زیڈ۔ اے۔ سلیری۔ مائی لیڈر جیسی مشہور و معروف کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ۔ قائداعظم محمد علی جناح کو ہم اپنا قائد کیوں مانتے ہیں۔ یہ کتاب آپ کو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے مدوجزر سے واقف بنائے گی۔ کتاب ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے بھی نظر فریب ہے۔ مجلد۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

ماڈرن اردو ڈکشنری مولفہ ابوالنعیم عبدالحکیم نشتر جالندھری۔ اردو شائقین اور طالب علموں کے لئے نشتر صاحب نے نہایت عرق ریزی سے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ سائز ۲۲×۲۹/۱۶ ۷۰۰ صفحات سہ کالمی۔ دیدہ زیب کتابت۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

کمال اتاترک غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی بہترین سوانحعمری مرحوم کے گہرے دوست ادیب جلیل استاد محمد توفیق پاشا کے جادو نگار قلم سے۔ یہ مسئلہ حقیقت آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہے کہ مجاہد اعظم بطل حریت کمال اتاترک عہد حاضر کے سب سے بڑے جرنیل اور سب سے بڑے ڈکٹیٹر تھے۔ اس طرح یہ امر بھی جریدہ عالم پر زریں حروف میں ثبت ہے کہ آج تک دنیا بھر میں جس قدر سوانحعمریاں غازی مرحوم کی لکھی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی کمال اتاترک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چوتھا ایڈیشن چھپ کر تیار ہے۔ مجلد مع خوبصورت گردپوش قریباً ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے

جدید اردو شاعری (نو ترمیم) از پروفیسر عبدالقادر سروری۔ سروری صاحب کا قلم تعارف کا محتاج نہیں۔ ملک کے تنقید نگاروں میں ان کا درجہ بلند ہے۔ اس میں انھوں نے جدید شاعری کے اسباب و محرکات اور اس کے حامیوں اور مخالفوں کے کلام پر بہت خوبی سے تبصرہ کیا ہے۔ شعرائے حال کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید ہر ایک کے درجہ اور حیثیت کے مطابق ہے۔ حال کا تیسرا ایڈیشن بعد ترمیم و تنسیخ شائع ہو گیا ہے جس کو آپ آج ہی طلب فرماکر ملاحظہ فرمائیے۔ سائز ۱۷×۲۷/۸ قیمت تین روپے۔

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

برطانوی یا ہندوستان کی قومی حکومت میں

بینکوں کی حالت

عوام کی خوش باشی کا زیادہ انحصار روپے پر ہے لیکن روپیہ اس وقت تک چالو نہیں رہ سکتا جب تک اس کو مالی تجربہ نہ ہو اور ہندوستان میں اس تجربہ ہی کی بڑی کمی ہے۔ عموماً پنشن یافتہ، بوڑھے اور بیوائیں جنہیں اس قسم کا ذاتی تجربہ بالکل نہیں ہوتا۔ اس بات کی متوقع رہتی ہیں کہ دنیا میں کیسا ہی انقلاب آجائے ان کا روپیہ جو بینک میں محفوظ ہے کسی طرح کھویا نہ جائے

بینک کے محفوظ رہنے کا دار و مدار بینک کے قائم کرنے والوں کے ذاتی سرمایہ بلا معاوضہ کام کرنے، بے لوث دلچسپی، وسیع تجربہ، (نہ کہ بڑے نام، زیادہ سرمایہ، ملازمین پر اعتماد اور اپنے آدمیوں کے ساتھ ناواجب حمایت) کڑی محنت، سخت نگرانی، شے لطیف کے خاص مادہ، ہوا کے بدلتے ہوئے رخ کے ساتھ بدل جانے کی اہلیت، بہت زیادہ روپیہ لگانے لیکن زیادہ سے زیادہ روپیہ جو مطالبہ پر ادا ہوسکے قرض لینے یا بیچنے کی امید اپنے ذاتی نقد کا تناسب کم رکھنے، ظاہری ٹیپ ٹاپ اور سجاوٹ پر زیادہ خرچ نہ کرنے، سرکاری ضابطہ داری، فوری کامیابی کے لئے مناسب نمود و نمائش، غیر محفوظ زر پیشگی اپنے سرمایہ اور محفوظ رقم کو ضم کر دینے اور چالو سرمایہ پر دو سے تین فیصدی تک منافع لینے لیکن حصہ داروں کو آٹھ سے بارہ فیصدی تک سود دینے پر منحصر ہے۔ بینک چلانے کے واسطے سکون، دلجمعی اور کاروبار کو محفوظ رکھنے کی خاص دماغی صلاحیت کی بھی ضرورت ہے۔ یہ کام رفتہ رفتہ لیکن آگے چل کر مستقل طور پر اپنی صورتوں میں پروان چڑھ سکتا ہے۔

مذکورہ بالا خصوصیتوں یا سرمایہ کی کمی کی وجہ سے پچھلے زمانہ میں اکثر بینک ٹھپ ہوگئے یا جب کسانوں کی فلاح اور رہن جائداد کے اصلاحی قوانین نافذ ہوئے، پھر جب عمارتوں کا کام بہت پھیل گیا، پھر ۱۹۱۳ء اور ۱۹۲۱ء میں سرکاری کاغذات پر، پھر اشیائے خوردنی وغیرہ پر، پھر لڑائی کے زمانہ میں ملایا، بینانگ برما اور سنگاپور میں ان کو سخت نقصانات ہوئے اور عوام کو شدید خسارہ رہا۔ ان باتوں کا دھیان رکھتے ہوئے

دی جوالا بینک لمیٹڈ ——— میں کوئی خامی نہیں ہے۔

مجموعی قرضہ کی رقم : ایک کروڑ — نقد مالیت : ایک کروڑ سات لاکھ

صدر دفتر آگرہ (قائم شدہ ۱۹۲۳ء) شاخیں تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہیں

بمبئی کی شاخ - ہارنبی روڈ۔ سہراب ہاؤس۔

پونا کی شاخ - ایسٹ اسٹریٹ - لائبریری بلڈنگ -

شاعر رومان حضرت اختر شیرانی کا مجموعۂ کلام

شراب شعر و سخن کے متوالوں کو مژدہ ہو کہ

شعرائے ہند کی صف اول کے جادو بیان، شاعر رومان خیام الہند

حضرت اختر شیرانی

کا مجموعۂ کلام چار جلدوں میں شائع ہو گیا ہے۔ کلام کیا ہے ہر شعر کیف و سرور کا چھلکتا ہوا پیمانہ ہے جس میں جذبات کے میکدے لہریں لے رہے ہیں۔

صبح بہار ——— تین روپے

اختر ستان ——— تین روپے

لالۂ طور ——— تین روپے

طیور آوارہ ——— تین روپے

جملہ کتب کا سائز ۲۰×۲۷/۸ کاغذ عمدہ جلد بندی مضبوط گردپوش جاذب نظر ہے۔ آج ہی طلب فرمایئے ——— (فہرست کتب مفت طلب فرمایئے)

کتاب منزل۔ کشمیری بازار۔ لاہور

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس ۱۴۶ سے شائع کیا۔

موتی مسجد، دہلی، کا ایک خوشنما منظر۔

Medicines of Jamarkha
Boric Powder
Alcaline Mixture
John Barrel

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	—	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں ـ ایک سو اسی صفحات ـ دو نقشے ـ کپڑے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) ـ

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) ـ

خاص رعایت «عربی ـ انگریزی جملے» نوے صفحات ـ گتے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ـ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ـ

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد ـ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) ـ

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ ـ دھلی

آجکل

Dahr Nasri

اتحادِ شوروی
چین
تبت
افغانستان
ایران
ترکی
شام
عراق
عربستان
مصر
نیپال
ہندوستان
برما

Ajkal
پندرہ روزہ
۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء
باتصویر
۶
سال ۵

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری - بی۔ اے - ساھتیہ النکار۔ ڈی لٹ - پیرس -
اردو ھندی اور انگریزی کے بہترین انشاپرداز اور افسانہ نگار ھیں۔ انہیں ادب میں ترقی پسند تحریک کا بانی تسلیم کیا گیا ھے - انکی ادبی خدمات پر جناب ظہورالحسن ڈار نے ایک پر مغز مقالہ تحریر فرمایا ھے - اسکی پہلی قسط اسی شمارے کے صفحہ ۸ سے ملاحظہ کیجئے ۔

تپِ دِق کا آخری علاج

رجسٹرڈ

کیلسو

"KELSO"

WONDERFUL FOR TUBERCULOSIS

جب ماتاجی میری زندگی سے مایوس ہوگئیں — اور — پتاجی کی آنکھوں سے ہروقت آنسو نکلنے لگے اور تمام رشتہ داروں نے ڈاکٹروں حکیموں اور ویدوں کی رائے کے مطابق میرے مرجانے کا فیصلہ کرلیا تو ہمارے پتاجی کے ایک سچے اور مخلص دوست نے کیلسو کیمیکل ورکس کی تیار کردہ دوا کیلسو کے استعمال کرانیکا فوری مشورہ دیا، پتاجی نے فوراً روپے بذریعہ تار روانہ کرکے کیلسو کا مکمل کورس منگوایا، اس کے کھاتے ہی میرے جسم میں نئی روح پڑگئی ہر روز بخار، کھانسی، سینہ کا درد، خون تھوکنا. گلے کی خراش، بلغم اور دستوں میں کمی ہونے لگی، بھوک کھل گئی، خون میں سرخی بڑھنے لگی اور چند دنوں میں چہرہ بارونق ہوگیا. ہڈیوں اور سینہ کی جلن بالکل غائب ہوگئی، گھبراہٹ کا نام ونشان نہ رہا اور اب کوئی شخص مجھے دیکھ کر ہرگز یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کبھی تپ دِق کے پنجہ میں گرفتار ہوئی تھی

اِس دوا کو کیلسو کیمیکل ورکس نے ریسرچ کی نئی تھیوری کے مطابق سونا اور سچے موتیوں جیسی قیمتی چیزوں سے تیار کیا ہے. تپ دِق کے ماہر اور دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی وائس پرنسپل جامعہ طبیہ، صدر مجلس اطبا. وایڈیٹر رسالہ مسیح الملک تپدق کے مریضوں کو کیلسو ہی کے استعمال کا مشورہ دیتے ہیں کیلسو جسم میں داخل ہوتے ہی جرثومہ سِل (ٹی بی ٹرو برکلوسس) کو فوراً ہلاک کرکے کمزوری کو دور کردیتا ہے اسی وجہ سے یہ دِق کی ہر قسم میں چاہے پھیپھڑے کی ہو یا آنتوں کی، گلٹیوں کی ہو یا ہڈیوں کی، سِل شدید ACUTE PHTHISIS ہو یا سِل مزمن CHRONIC PHTHISIS کیلئے آخری دوا ہے جن مریضوں نے سنی ٹوریم میں رہ کر علاج کرالیا ہے ان میں سے اکثر نے اپنی لاکھوں روپے کی جان کیلسو ہی کے استعمال سے بچائی ہے.

سنی ٹوریم کے ایک مریض کی رائے

اس وقت تپ دِق کیلئے کیلسو بہترین دوا ہے میں کافی عرصہ سے تپدق میں مبتلا تھا؛ بہت کچھ علاج کئے دہلی سنی ٹوریم میں بھی کافی عرصہ تک رہا. میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس وقت کیلسو سے بہتر تپدق کیلئے کوئی دوا نہیں میری مایوسی دور کرنیوالی یہی دوا ہے. اے. کے قریشی دہلوی.

قیمت مکمل کورس چالیس دوم کیلئے پچیس روپے تین دن کیلئے چودہ روپے دہلی سے باہر والوں کیلئے محصول ڈاک معاف

علاوہ دہلی کیلئے دواخانہ مجلس اطبا بازار بلند دروازہ دہلی اپنے شہر کے انگریزی دوا فروشوں سے خریدیے.

تار کا پتہ ـ کیلسو دہلی

پتہ: منیجر کیلسو کیمیکل ورکس صدر بازار دہلی

KEISO CHEMICAL WORKS, SADAR BAZAR DELHI.

دُنیائے تبسّم

شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین دنیائے اردو میں بہت مقبول ہیں یہ مجموعہ سلسلہ تبسّم کی سب سے کامیاب کڑی ہے ظرافت کے پردے میں ہندوستانی معاشیات پر تنقید کرنیکا جو طریقہ شوکت صاحب نے نکالا ہے، وہ اپنے ہمعصروں سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ عبارت کی روانی، طرز بیان کی دلآویزی، بے تکلف شگفتگی ادبی تصنع شوخی سے کوئی مضمون خالی نہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب شوکت تھانوی صاحب کی بہترین تصانیف میں شمار کی جا سکتی ہے۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے مقدمہ نے جسمیں متانت اور ظرافت آپسمیں آنکھ مچولی کھیلتی ہیں کتاب کے لطف میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے

مجلد معہ گرد پوش — قیمت ڈھائی روپے صرف

نئی تہذیب نئی تعلیم

امریکہ کے مشہور ماہر تعلیم ولیم۔ ایچ کلپٹرک کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب تعلیم کے کام کرنے والوں کیلئے مشعل راہ کا کام دیگی اور دوسرے لوگ بھی اسے پڑھنے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہو جائینگے کہ ہماری تہذیب جامد ہو کر رہ گئی ہے اور یہی ہمارے مصائب کا راز ہے ؛

قیمت مجلد سوا دو روپے صرف ۲؎

ہماری دوسری کتابیں

داروات :۔ از منشی پریم چند (افسانے) .... ۲؍

خونی۔ از اختر انصاری (〃) .... ۲؍

مجنوں کے افسانے از مجنوں گورکھپوری (افسانے) ... ۲؍

ماہِ درخشاں۔ بیگم احمد علی (ناول) .... ۲؍

بیوہ۔ منشی پریم چند ... (ناول) .... ۲؍

آب گینے۔ اختر انصاری (قطعات) .... ۲؍

تجلیات۔ مہر عثمانی .... (نظم) .... ۲؍

مسدس حالی۔ صدی ایڈیشن آرٹ پیپر .... ۲؍

جمالیاتی شاعری۔ سعید انصاری (ادب) ... ۲؍

خمارستان .... آغا شاعر ... (ادب) ... ۲؍

آبِ حیات کے لطیفے۔ محمد حسین آزاد (ادب) ۱۲؍

مقالات اسلم جیراجپوری ...... (ادب) .... ۲؍

خطبات اقبال۔ علامہ اقبال مرحوم .... ۲؍

اٹھارہ مہینے ہندستان میں۔ از جواہر لال نہرو (سیاسی) ۲؍

مضامین ابوالکلام آزاد (اول) (مذہب) ..... للعہ

مضامین ابوالکلام آزاد (دوم) (سیاسی) .... للعہ

مضامین البلاغ .... ۲؍

ہندوستان کا مستقبل۔ از راجندر پرشاد سابق صدر کانگرس ۲؍

غبار خاطر۔ از ابوالکلام آزاد .... للعہ

سرخ چین کا رہنما۔ از اسرار احمد (سوانح) .... ۲؍

بیٹھک لارنس سے .... ۳؍

کیا خوب آدمی تھا ...... (سوانح) .... عہ

اقبال کا نظریۂ پاکستان .... ۲؍

تاریخ آزاد ہند فوج از منشی عبدالقدیر .... ۲؍

بچوں کا لندن .... ۲؍

ہوائی حملے .... ۱۰؍

خیال آفرین دماغ عرش تیموری ... (تخیل) ... ۶؍

حسن حسینؓ .... (مذہب) ... ۷؍

اسلام کیسے شروع ہوا۔ عبدالواحد سندھی (مذہب) ۲؍

اسلام کیسے پھیلا اول 〃 〃 〃 ۲؍

اسلام کیسے پھیلا۔ دوم عبدالواحد سندھی (مذہب) ۱۲؍

سامان آخرت۔ خواجہ غلام الثقلین۔ (〃) ۲؍

بچوں کی دلچسپ سبق آموز کتابیں

نظم

اسلامی نظمیں ۱۰؍ وطنی نظمیں ۱۳؍ بچوں کا تحفہ اول ۱۰؍

بچوں کا تحفہ دوم ۱۰؍ حب وطن ۱۰؍ چپ کی داد ۱۳؍

تحفۃ الاخوان ۱؍ مناجات بیوہ ۳؍ حقوق اولاد ۳؍

کہانیاں

چتن منن ...... از شفیع الدین نیر .... ۳؍

میاں مٹھو ...... 〃 .... ۵؍

ٹلو میاں ۵؍ ... کھلو میاں .... ۸؍

منی کا پرستان ۵؍ طلسمی مینا .... ۵؍

فسانۂ عجائب ۳؍ دیومالا .... ۲؍

حیاتِ حالی .... ۲؍

بلی حج کو چلی .... ۳؍ .... مسولینی .... ۵؍

بیس روپیہ کی کتابیں منگانے والے کو محصول معاف

ہر قسم کی عمدہ کتابیں ملنے کا پتہ

حالی پبلشنگ ہاؤس، اردو بازار (بی)، دھلی

"DAHR" NASRI

ڈاکٹر دہر ناصری

آج

باتصویر رسالہ

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۸ | ۱۵ ستمبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
آغا محمد یعقوب دواشی
بی اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

نائب مدیر
فضل حق قریشی
دہلوی

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶۔ دہلی

رفتارِ زمانہ

لنکا میں ماہی گیری

لنکا کے چاروں طرف سمندر میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کس حصے میں مچھلیوں کا جمگھٹ زیادہ ہے، دوربین لگے ہوئے ہوائی جہاز اڑائے جائیں گے۔ اس کے بعد ماہی گیروں کی کشتیاں فوراً ان مقامات پر پہنچکر اپنے جال ڈال دینگی یہ خاکہ لنکا کے محکمۂ ماہی گیری نے بعدِ جنگ کے لائحہ عمل کے سلسلے میں مرتب کیا ہے۔ اس پندرہ سالہ اسکیم پر تقریباً چھہتر لاکھ روپے خرچ ہوں گے۔ اس رقم میں دخانی کشتیوں، جالوں اور جدید تعمل کی قسم کے ان آلات کی قیمت شامل ہے جو مچھلیاں پکڑنے کے سلسلے میں استعمال ہوں گے مچھلیوں کو خشک کرنے اور دوسرے ملکوں کے لئے انھیں ڈبوں میں بھرنے کے کارخانے قائم ہوں گے۔ جنگ سے پہلے لنکا میں تقریباً ایک کروڑ چونتیس لاکھ روپے سالانہ کی خشک مچھلیاں یا مچھلیوں سے بنی ہوئی چیزیں دوسرے ملکوں سے درآمد ہوتی رہی ہیں۔ اگر جزیرے کی کل آبادی کا لحاظ رکھتے ہوئے اوسط لگائی جائے تو فی کس چودہ پونڈ سالانہ کا حساب پھیلتا ہے۔ حالانکہ جاپان میں تقریباً ساٹھ پونڈ فی کس کے حساب سے مچھلی کھائی جاتی ہے۔ قیاس ہے کہ آئندہ لنکا کے باشندے بھی زیادہ تر مچھلیوں پر گذارہ کرینگے اور وہ خود انہی کے ملک کی پیداوار ہونگی۔

آسٹریلیا میں جنگلی کتے

آسٹریلیا میں بھیڑ بکریوں کی پرورش وہاں کے باشندوں کا سب سے بڑا اور اہم پیشہ ہے لیکن قدرت نے ان جانوروں کے ساتھ ساتھ جنگلی کتے بھی پیدا کر رکھے ہیں جو ہر وقت تباہی اور نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ جب موقع ملتا ہے، ان کی ٹولیاں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ خصوصاً کوئینز لینڈ میں ان کتوں کی افراط وبالِ جان ہو گئی ہے۔ لڑائی سے قبل حکومت نے ایسے کتوں کو تلف کرانے کا انتظام کر رکھا تھا۔ جب کوئی شکاری کسی کتے کو مارکر اسکی کھوپڑی کی کھال لاتا، فوراً سرکاری خزانے سے اسے آٹھ روپے مل جاتے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پچھلے سال تقریباً ساڑھے بائیس ہزار کتے موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ پھر بھی انکی تعداد ہولناک ہے۔ چنانچہ اب فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان کو زہر کے ذریعہ بہت جلد فنا کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے زہریلی گولیاں انگلستان سے منگائی گئی ہیں۔ ہر گولی میں چاول کے برابر اسٹرکنائن شامل ہوگا۔ کوئینز لینڈ میں پہنچتے ہی یہ گولیاں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں میں رکھکر ہوائی جہازوں کے ذریعہ لاکھوں کی تعداد میں ان حصوں پر پھینک دی جائینگی جو جنگلی کتوں کے مرکز ہیں اور جن میں سے اکثر جگہ انسان کی رسائی ممکن بھی نہیں ہو سکتی۔ انھیں کھاتے ہی کتے آن واحد میں فنا ہو جائیں گے اور غریب بھیڑ بکریوں کو آئندہ اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکیگا۔

انگریزی فلم اردو زبان میں

کچھ عرصہ ہوا الیگزنڈر کورڈا کا بنایا ہوا رنگین فلم "بغدادی چور" جس میں سابو نے بھی کام کیا ہے، ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں دکھایا جا چکا ہے۔ اسکا مکالمہ انگریزی زبان میں ہے۔ اب کمپنی کے مالکان نے بڑی کوشش کے ساتھ مکالمے کا ترجمہ اردو زبان میں اس طرح کر دیا ہے کہ عبارت کم یا زیادہ ہونے نہیں پائی۔ بلکہ اجزائے کلام کی تعداد تک تقریباً برابر رہی۔ نتیجہ یہ کہ جب اردو جاننے والے اداکاروں نے نیا مکالمہ یاد کر کے پردے کے پیچھے سے فلم کے ساتھ ساتھ بولنا شروع کیا اور اسکی صدابندی ہوتی رہی تو وہ تصاویر کی نقل و حرکت کے ساتھ بالکل منطبق ہوگیا۔ چنانچہ حال ہی میں اس کی نمائش انگلستان میں جشن فتح کے موقع پر ہوئی تو لوگ یہ دیکھکر محوِ حیرت ہو گئے کہ اصل فلم کے امریکی اداکار بظاہر نہایت صاف اردو بولتے نظر آ رہے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ کسی جگہ بھی تصنع اور بناوٹ کی جھلک محسوس نہیں ہوتی۔ عنقریب اس فلم کی نمائش ہندوستان میں شروع ہو جائیگی۔ اگر یہ کامیاب تجربہ آئندہ بھی عمل میں آتا رہا تو غیر ملکی کمپنیوں کے لئے فلمی کاروبار میں ایک نئے پہلو کا اضافہ ہو جائیگا۔ پھر وہ لوگ بھی جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں، ان اعلیٰ فلموں سے لطف اندوز ہو سکیں گے جو انگریزی اور امریکی کمپنیاں تیار کرتی رہتی ہیں۔

امریکہ میں غیر ملکی طلباء

اس لڑائی کے بعد سے مشرقی دنیا کے کئی ملکوں کو مغرب میں خاصی اہمیت حاصل ہو چلی ہے۔ اس امر کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ حکومتِ امریکہ نے غیر ملکی طلباء کو اپنے ملک میں تعلیم پانے کی اجازت دیدی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ۳۲۹ طلبا سان فرانسسکو پہنچے ہیں۔ یہ ریاستہائے متحدہ کے مختلف کالجوں اور اداروں میں تعلیم حاصل کرینگے۔ ان میں سے تین سو بارہ ہندوستانی طلبا میں سے ایک سو تہتّر کو حکومتِ ہند کی طرف سے سرکاری وظیفہ ملیگا۔ ایک سو بتیس نجی ذرائع سے امداد حاصل کرینگے۔ دو ہندوستانی نرسیں جنہیں شجاعت و بہادری دکھانے کے صلے میں تمغہ جات مل چکے ہیں، صرف سفر خرچ حاصل کرنے کے بعد باقی مصارف خود برداشت کرینگی۔ نیز ایک اور طالب علم کو محکمے کی طرف سے وظیفہ دیا جائیگا۔ حکومتِ ہند کا خیال ہے کہ آئندہ چند برس میں تقریباً دو ہزار طلبا امریکہ کے تعلیمی اداروں میں بھیجے جائیں۔ اسوقت وہاں تعلیم پانے والے طلبا کی تعداد برائے نام ہے۔ شروع میں امریکہ کے اربابِ حل و عقد کے پیشِ نظر یہ سوال زیرِ غور تھا کہ غیر ملکی طلبا لئے جائیں یا نہیں لیکن فیصلہ حق میں ہوا اور اس جوش و خروش کے ساتھ کہ ہر کالج زیادہ سے زیادہ طلبا مانگ رہا ہے اور اس کا مطالبہ پورا نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان اور سونے کی کانیں

ملک ہندوستان معدنیات کے اعتبار سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسری دھاتوں کے علاوہ سونے کی یافت قابلِ ذکر ہے۔ اس سلسلے میں ریاست میسور کی کولار والی کانیں سونے کا مخزن ہیں۔ دنیا بھر میں جتنا سونا برآمد ہوتا ہے، اسکا تقریباً دو فیصدی حصہ یہاں کی سرزمین اگلتی ہے۔ ہندوستان میں سونا کہیں اور نہیں ہوتا۔ یورپ کی چار کمپنیاں کان کنی کا کام انجام دیتی ہیں۔ یہاں کی دو کانیں دنیا بھر میں سب سے زیادہ گہری ہیں۔ ان کا عمق بالکل عمودی حالت میں نو ہزار فٹ سے زیادہ ہے۔ ان کانوں سے ریاست میسور کو مالیانہ کے طور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ ۱۸۸۲ء میں جب کام شروع ہوا تو صرف نو اونس سونا نکلا جس کی قیمت محض ۲۷ پونڈ ۱۳ شلنگ ۵ پنس ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں کل یافت ۵۵۶ اونس ہوئی جس میں ۵۲۷۵ کی قیمت ۲۳،۷۳،۴۰۷۵ پونڈ ہوئی۔ ۱۹۴۳ء میں ۲۵۲،۱۹۳ اونس خالص سونا نکلا جس کی قیمت ۱،۸۷،۳۹،۸۰۵ پونڈ ہوئی۔ شروع سے ۱۹۴۳ء کے آخر تک کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ۱۲،۰۶،۲۰،۹۱۵ اونس سونا نکلا جسکی قیمت ۱،۲۷،۹۳،۴۷۵ پونڈ ہوئی۔ ان تمام کانوں کے سلسلے میں بیس ہزار سے زیادہ مزدور ملازم ہیں۔ اور ان کو اچھی اجرتیں دی جاتی ہیں۔ ان کے قیام و طعام کا انتظام بھی معقول طریقے پر کر رکھا ہے۔

نمکین چینی

چینی کا کال تقریباً ساری دنیا میں شدید دشواریاں پیدا کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں یورپ کے ملکوں کو سب سے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ چینی یا اور دوسری کی مٹھاس کسی قیمت پر نہیں ملتی اور اگر چور بازار میں کبھی اسکی جھلک دکھائی بھی دی تو اتنی قیمت طلب کی گئی کہ خریدنے والوں کو سنتے ہی پسینہ آگیا تاہم پیرس کے ایک بازار میں ایسا عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا کہ شاید اس جیسی مثال دنیا میں کہیں اور نہ مل سکے۔ پیرس کی مونت مارترے اسٹریٹ میں جو اپنی چور بازاری کے باعث آجکل بہت مشہور ہے، ایک شخص بڑا سا تھیلا لئے منظرِ عام پر آیا اور آواز لگانی شروع کی: "عمدہ صاف چینی کوڑیوں کے مول خرید خریدنے والو!" یہ سنتے ہی عورت و مرد چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے۔ ایک ایک سیر چینی کا پیکٹ سوا چھ روپے میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ ہر شخص اپنی جگہ خوش تھا کہ آج مدتوں کے بعد کام و دہن کی تلخی کو شیرینی سے بدلنے کا موقع مل جائے گا لیکن گھر پہنچکر جب سب نے اپنے اپنے پیکیٹ کھولے تو معلوم ہوا کہ چینی کی صرف ایک انچ موٹی تہ کے نیچے کھانے کے معمولی نمک کے سوا کچھ نہیں ہے۔ چینی کی تہ بھی اس طرح لگی ہوئی تھی کہ جب اسے الگ سے اٹھا لینے کی کوشش کی گئی تو نیچے کا نمک اس میں مل گیا اور چینی نمکین ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد کام و دہن کی وہ لذت نصیب نہ ہوسکی ہوگی جسکی لہر عارضی مسرت کے ساتھ تمام لوگوں کے بدن میں دوڑ گئی تھی۔ اس لڑائی کے نتائج نے دردناک حادثات کے ساتھ بعض مضحکہ خیز صورتیں بھی پیدا کی ہیں۔

نوّے منٹ میں ہوائی ڈاک

عنقریب برطانیہ اور امریکہ کے مابین ہوائی ڈاک کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جائے گا کم وزن کے خط اور دوسری ہلکی چیزیں خدنگ نما ہوائی جہازوں میں رکھکر ایک ملک سے دوسرے ملک کی طرف جہاز چلانے والوں کے بغیر پھینکی جائیں گی۔ یہ جہاز تقریباً دو ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے یا بالفاظ دیگر نوّے منٹ میں ساری مسافت طے کر لیا کریں گے۔ ان کی رہنمائی ریڈیائی لہروں کے ذریعہ ہوگی۔ برطانیہ کی فضائی وزارت نے بیڈ فورڈ میں جہری لمبوں کی تجربہ گاہ کے قریب کچھ جگہ لے کر نئی ہوائی ڈاک کا مرکز قائم کیا ہے۔ یہ صورت اگر ممکن ہو گئی اور ممکن نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ آواز کی رفتار سے زیادہ تیز چلنے والے یہ جہاز رسل و رسائل کی شاہراہ پر نئے سنگِ میل کی حیثیت اختیار کریں گے۔

تیل کے میدان اور کارخانے

مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں برطانوی ملکیت کے تیل کے میدانوں اور صاف کرنے کے کارخانوں کی مکرر تعمیر اور ان کو نئے

سازوسامان سے لیس کرنے کے لئے ڈیڑھ کروڑ پونڈ سے زیادہ کے ٹھیکے دیئے گئے ہیں۔ یہ رقم ۱۹۴۵ء میں دیئے جانے والے ٹھیکوں سے بقدر دس لاکھ پونڈ زیادہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ایک عظیم الشان پائپ لائن کا سازوسامان اور کلیں وغیرہ خریدنے کے سلسلے میں ایک کروڑ پونڈ کے ٹھیکے دیئے جائیں گے۔ یہ لائن ۱۹۴۸ء میں مکمل ہو کر شمالی ایران کے ان سلسلوں کو جو حیفہ اور ٹریپولی سے وابستہ ہیں سہ گنا زیادہ قوی بنا دے گی۔ ایک ماہر فن کا خیال ہے کہ مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں خصوصاً بم زدہ علاقوں میں مکرر تعمیر کا کام دو سال میں ختم ہو سکیگا۔ برطانوی حکومت بھی اس کوشش میں ہے کہ وہ تیل کے اعتبار سے دنیا بھر کی منڈیوں پر چھا جائے۔ حکومت امریکہ بھی مشرق وسطیٰ اور ونیز دجلہ میں بے قیاس رقم خرچ کر کے یہی مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس مقابلے کے باوجود یہ فیصلہ ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین نرخ کی کمی بیشی سے کوئی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا۔ ولندیزی جزائر شرق الہند اور برطانوی بورنیو میں تیل کے میدان اور کارخانے سب سے زیادہ زدہ حالت میں ہیں کیونکہ ۱۹۴۲ء میں وہ بری طرح تباہ ہو گئے تھے۔ جاپانیوں نے عارضی تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کی مرمت کرائی تھی لیکن پسپائی کے وقت انھوں نے دوبارہ ان کو نقصان پہنچا دیا۔

حکومت سندھ کا دست تعاون

حکومت ہند کے بنیادی خاکے کے مطابق حکومت سندھ نے ڈیڑھ کروڑ ٹن چاول ان علاقوں میں بھیجے ہیں جہاں قحط کے اثرات سب سے زیادہ رونما تھے۔ اس میں سے چوہتر ہزار ٹن ریاست ٹراونکور، تیس ہزار ٹن ریاست کوچین، پونے پندرہ ہزار ٹن بمبئی اور دس ہزار ٹن مدراس بھیجے گئے۔ تقریباً نو ہزار ٹن مغربی ہندوستان کی ریاستوں کو دیئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۶ء ختم ہونے سے پہلے دس ہزار ٹن چاول کی فالتو مقدار ان علاقوں میں اور بھیجی جائے گی۔ چاول کے علاوہ پینتیس ہزار ٹن چنا بھی صوبہ سندھ ان علاقوں کو دے سکیگا۔ اس مقدار میں سے چھ ہزار ٹن پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ باقی مقدار بھی حاصل کر کے ایک جگہ جمع کر لی گئی ہے اور حمل و نقل کے انتظام کی تیاری کی جا رہی ہے۔

مغربی ممالک میں گیہوں کی افراط

امریکہ کے محکمۂ زراعت نے اعلان کیا ہے کہ سال گذشتہ کے مقابلے میں اس سال یورپ میں گیہوں کی فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ یہ اندازہ ان رپورٹوں کی روشنی میں لگایا گیا ہے جو وہاں کے بارہ ملکوں نے شائع کی ہیں۔ ۱۹۴۵ء میں چونسٹھ کروڑ ستر لاکھ بشل پیدا ہوا تھا۔ اس دفعہ کا تخمینہ تقریباً بیاسی کروڑ بشل کا ہے۔ اس سلسلے میں فرانس سب پر سبقت لے گیا ہے۔ وہاں گیہوں کی فصل اتنی عمدہ ہوئی ہے کہ اس سے قبل فرانس کی تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی۔ فرانس کے وزیر اغذیہ حال ہی میں لندن جانے والے ہیں۔ وہ برطانیہ کے وزیر اغذیہ سے بات چیت کریں گے کہ فرانس سے کتنا گیہوں برطانیہ کے لئے بھیجا جائے۔ کینیڈا میں بھی گیہوں کی فصل عمدہ رہی ہے۔ وہاں سے تقریباً بیس لاکھ بشل اناج دساور کیا جا سکیگا۔ مغرب کے ان اعداد و شمار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ عالمگیر مسئلۂ خوراک کی صورت حالات عنقریب سدھر جائے گی۔

برطانوی پولیس اور ریڈیو

برطانیہ میں پولیس کا سب سے بڑا مرکز اسکاٹ لینڈ یارڈ کہلاتا ہے۔ پولیس کے تمام احکامات اسی جگہ سے نافذ ہوتے ہیں۔ تجویز یہ ہے کہ اب سارے برطانیہ کے مشرقی اضلاع والے پولیس مرکزوں سے ملانے کے لئے ریڈیو کا ایک جال قائم کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں تقریباً چودہ اسٹیشن قائم ہوں گے۔ لاگت کا اندازہ تقریباً دو ہزار پونڈ فی اسٹیشن ہے۔ چیف کانسٹبل کے آئندہ اجلاس میں اس مسئلہ پر پوری طرح غور کیا جائے گا۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ کی ریڈیو پولیس اب تک صرف لندن کے علاقوں سے متعلق ہے۔ اس کے بعد اس کی پہنچ دور دراز حصوں تک ہو سکیگی۔ اس صورت میں مختلف قسم کی واردات و حادثات کی تعداد کم ہو جانے کا امکان ہے۔ ظاہر ہے کہ اس توسیع سے عوام کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا۔

سانحۂ ارتحال

نہایت افسوس کے ساتھ سنا گیا کہ دہلی کے مشہور نوجوان اخبار نویس جناب سید محمود مؤرخ بی اے کسی اچانک صدمے کے باعث راہیٔ ملکِ بقا ہو گئے۔ انا للہ الخ۔ آپ ہفتہ وار "گلفروش" اور روزانہ "مسلمان" کے مالک اور ایڈیٹر تھے۔ اردو ادب میں بھی انکو ایک اچھا مرتبہ حاصل تھا۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ اپنے اخبار جاری کرنے سے قبل مرحوم "تنزیل کمال" میں نائب مدیر تھے۔ خدا نے انکو ایک فطری صلاحیت یعنی سماعت سے محروم کر رکھا تھا لیکن یہ کمی انکے ادبی اور صحافی مشاغل میں حارج نہیں ہوتی تھی۔ ان کی بے وقت موت سے ادب صحافت کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ دعا ہے کہ خدا ان کو غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

تبرکاتِ سائل دہلوی مرحوم

بے حجابی میں سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
اور انگشت نما ہوتے ہو کیا کرتے ہو

تم گلے مل کے جدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
ابھی کیا تھے ابھی کیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

بے سبب ہم سے خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو
دشمنِ اہلِ وفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اب وہ بچپن کا زمانہ نہیں دیکھو دیکھو
نا سمجھ اور رسوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

آگ دینے کے لئے آئے تھے یا لینے کو
جب تم آتے ہو ہوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

غیر کے شکوۂ بیجا سے تو ہو شرمندہ
میری منت پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

پردہ داری میں قباحت ہو تو بتا دو کیا ہے
پردہ در روزِ جزا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

خوگر جور و ستم سے یہ عداوت کیوں ہے
تارکِ وضعِ جفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اور انجان بنے جاتے ہو ہو کر سیانے
کیا سے کیا نامِ خدا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

وقت پر کام نہ آئیں گے تمہارے اغیار
ضد سے تم اور سوا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

اس بناؤ سے بگڑ جائے گا بیمار کا حال
تم تو پیغامِ قضا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

کھولتا ہوں میں تمہیں وصل میں جتنا، او تنے
اور پابندِ حیا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

جانشینِ داغ سے شاعر کا یہی سائل ہے
اور تم اس پہ خفا ہوتے ہو کیا کرتے ہو

ارسلہ

اختر حسین رائے پوری

بحیثیت ادیب

(۱)

ظہور الحسن ڈار

ہند جدید کے اردو ادب میں بیسویں صدی کا چھتیسواں سال یادگار رہے گا۔ یہی وہ موقعہ تھا جب رسالہ اردو کی اشاعت جولائی میں اختر حسین رائے پوری کا مشہور مقالہ "ادب اور زندگی" شائع ہوا اور اس دیس میں نئے اور صحت مند ادب کے بیج بو گیا۔ اس وقت اردو ادب کی حالت روسی ادب کے اس دور سے کچھ مختلف نہ تھی جب زار روس کا سامنتی نظام مغربی و ملکی سرمایہ داری کے بھنور میں پھنس کر پوچھ رہا تھا کہ اب میں کیا کروں۔ روسی کردار یاسیت اور قنوطیت کا پرچار کر رہے تھے، اور احتجاج کا نعرہ زبان پر آتا بھی تھا، تو اس کا ردعمل فرد کی موت کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ ہندوستانی ادیب بھی کم و بیش اسی راہ پر چل رہے تھے۔ ملکی سیاست کے رنگ ڈھنگ کا اثر ادب پر یہ ہوا کہ اس میں قوم پرستی، آزادی، سُدھار، اصلاح اور خود پسندی کے مورچے قائم ہو گئے تھے۔ ایسے متضاد رجحانات میں ظاہر ہے کہ ادب کی حیثیت ایک سماجی فریضے کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے اس میں زندگی کی سچی قدروں کی تلاش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ماحول کے اندھیرے میں کہیں امید اور امنگ کی بجلی تڑپتی بھی تھی تو اسلئے کہ تاریکی کا نقش اور بھی گہرا ہو جائے۔ پرانے ادیب اگرچہ زمانے کے بدلتے ہوئے چلن سے مرجھا رہے تھے، پھر بھی وہ میدان چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ادھر نئے لکھنے والوں کے لئے یہ مصیبت تھی کہ ابھی تک وہ یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیئے۔ کچھ من چلے جو جنگِ عظیم کے بعد یورپ کی خاک چھان چکے تھے اور مغربی ادیبوں کے شاندار کارناموں سے واقف ہو گئے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ ہندوستانی ادب کو بھی اس ہار میں گوندھنے کی فکر میں تھے جس کے سدا بہار پھول چننے میں مغربی فن کاروں کو بڑی جاں کاہی سے واسطہ پڑا تھا۔ مختصراً اس وقت اردو ادب میں زندگی کی ایسی لہر دکھائی نہ دیتی تھی جو اسکے ارتقاء کی خبر دیتی، بلکہ اگر کہیں آندھی کا نشان بھی ملتا تو ناظر کے حصے میں خاک دھول کے سوا کچھ نہ آتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے لق و دق صحرا میں کہیں کہیں ننھے پیڑ پودوں نے سر نکال لئے تھے، مگر ان کی نشو و نما اسی وقت ممکن ہو سکی جب ادبی افق پر ایک نئی بجلی نے کڑک کر "ادب اور زندگی" کا جیکارا بلند کیا اور آناً فاناً صحت مند خیالات کی برکھا سے ہر طرف زندگی کی لہر دوڑا دی۔

"ادب اور زندگی" دراصل اختر رائے پوری کے اس مضمون کا پھیلاؤ تھا، جو "ساہتیہ اور کرانتی" کے عنوان سے تین سال قبل ہندی کے مشہور ماہنامہ وشوامتر کلکتہ میں شائع ہو چکا تھا۔ جس طرح اس مضمون نے ہندی ادب کے سوچ بچار کی، نہج بدل کر ایک نئے دور کی بنیاد ڈالی، اسی طرح اردو ادب میں بھی اس کی اشاعت نے صورِ اسرافیل کا کام دیا۔ نئے دور کے تقاضوں کی پہلی للکار نے جہاں رجعت پسندی اور قدامت پرستی کے قلعوں میں رخنے ڈال دیئے وہاں نئے ادیبوں کے اس گروہ کو بھی راہ دکھلائی جو ابھی تک سوچ رہا تھا کہ ہمیں کیا کہنا چاہیئے اور کیسے کہنا چاہیئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لے دے کے ایک منشی پریم چند کی ذات نظر آتی تھی جس کے کردار خیال کے محلوں سے نکل کر حقیقت کی سڑکوں پر چلنے پھرنے لگے تھے۔ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد سے متاثر ہو کر اب ان کا کسان ستیہ گرہ کرنا بھی سیکھ گیا تھا، اور طالسطائی کے کرداروں کی طرح جوگانِ ہستی کا اندھا سورداس من کے سنسار میں نیکی کی جوت جگا لے نکل آیا تھا۔ پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اجتماعی طور پر اردو ادب کے دھارے کا رخ بدلنے اور ادیبوں کو ادب کا مفہوم اور اسکے مقاصد سمجھانے میں جو کام اختر رائے پوری کے "ادب اور زندگی" نے کر دکھایا، وہ منشی پریم چند کے محض افسانوں کا سے ممکن نہ تھا۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ خود منشی پریم چند نے اختر کے خیالات کو بہت پسند کیا، بلکہ اختر کے ساتھ مل کر ہندوستانی ادیبوں کو ہند جدید کے ادبی تقاضوں سے باخبر کرتے ہیں انہوں نے جو کام کیا، وہ اس تحریک کے پھیلاؤ کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوا۔ "ادب اور زندگی" کی اشاعت کا فوری اثر یہ ہوا کہ اردو ادب میں ہرجائی معشوقوں کی کمی ہونے لگی، رقیب اور عاشق، دونوں پھانسی لگا کر مرنے لگے، فراق یار کے نالے اور آہیں دھیمی پڑ گئیں اور اب اس میں ایسے کردار پیش ہونے لگے جو چلمن کے پیچھے بیٹھ کر جھلک نہ دکھلانے کی بجائے اس دیس کی سڑکوں گلیوں اور کھیتوں میں گھوم پھر کر اپنے دکھ درد کی کہانی سناتے تھے۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کا بڑا مقصد بھی یہی تھا کہ ادب کو اپنے ماحول سے متعلق دکھایا جائے اور جتلایا جائے کہ ادب اور زندگی کے مقاصد ایک ہیں۔ اس مقالے کی تاثیر اور شہرت کے اسباب کی تلاش کچھ اتنی مشکل نہیں۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ نظر آئے گی کہ اس دور کے ہندوستانی ادیب ادب کا کوئی واضح تصور نہ رکھنے کے باعث اپنے آپ سے مطمئن نہ تھے۔ دل میں جذبات کا ہجوم ہو اور اندھیرے میں راستہ نہ سوجھتا ہو، ایسے میں کوئی من چلا مشعل جلا کر دوسروں کو راہ دکھا دے تو اس کی سمت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اس مشعل کی جوت ایسی شفاف اور سہانی تھی کہ نہ صرف ہندوستانی ادیبوں کو اپنی منزل کی جھلک نظر آنے لگی بلکہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر زندہ قوم کا ادبی قافلہ کس جانب رواں ہے۔ کہاں پیشہ ور ادیبوں کی خود پسندی اور "ادب برائے ادب" جیسا مہمل نقطۂ نگاہ اور کہاں اختر رائے پوری کی انسان دوستی اور "ادب برائے زندگی" کی مجاہدانہ صدا۔

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کے بعد ہندوستانی ادب کے دھارے میں ایک عظیم تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔ اپریل ۱۹۳۶ء میں بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے تاریخی جلسے میں جب ہندوستانی ادیب ادب کے مقاصد کی توضیح کے لئے مل بیٹھے تو ظاہر ہو گیا کہ اب ہندوستانی ادب کے مڑتے ہوئے دھارے نے اپنے جوش کا مظاہرہ کرنے کے لئے نیا میدان تلاش کر لیا ہے۔ اس جلسے میں اختر رائے پوری نے ادب اور زندگی کے نعرۂ انقلاب کی تجدید کی اور کھلے الفاظ میں اعلان کیا ——

"ہم سب جانتے ہیں کہ ہماری زندگی کدھر جا رہی ہے، اور اسے کدھر جانا چاہیئے، ادیب انسان بھی ہے اور اسے سماج کی ترقی کے لئے اتحاد کرنا ہی ہے جو ہر انسان کا فرض ہے

انسانیت کے نام پر ہم پوچھتے ہیں کہ آج جب ترقی و پستی کی طاقتوں میں فیصلہ کن جنگ شروع ہو چکی ہے، ادب اپنے آپ کو غیر جانب دار رکھ سکتا ہے؟ کیا حُسن، آرٹ وغیرہ کی نقاب پہن کر وہ کارزارِ حیات سے راہ فرار اختیار کر سکتا ہے؟ کیا وہ واقعہ نگاری کی فصیل پر بیٹھ کر انقلاب و رجعت کی طاقتوں کی تصویر لے سکتا ہے؟ احساس ہر قسم کے آرٹ کی جان ہے، تو پھر غریبوں اور مظلوموں کا حالِ زار ہمیں بے حِس کیوں کر رکھ سکتا ہے؟ اگر زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سماج کے چہرے سے بیکاری، افلاس اور ظلم کے داغ دھوئے جائیں تو حاشا یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ ادب کا اشارہ کس جانب ہو اور کیا کہے کِن سے کہے اور کس طریقہ سے کہے۔ چنانچہ ہندوستانی ادیبوں سے ہماری یہ توقع واجب اور جائز ہے کہ وہ یہ ثابت کر دکھائیں گے کہ ادب کی بنیادیں زندگی میں پیوست ہیں اور زندگی مسلسل تغیر و تبدل کی کہانی ہے۔ زندہ اور صادق ادب وہی ہے جو سماج کو بدلنا چاہتا ہے، اسے عروج کی راہ دکھاتا ہے، اور جملہ بنی نوع انسان کی خدمت کی آرزو رکھتا ہے۔"

ظاہر ہے کہ ان سطور میں ادیب اور ادب دونوں کو انانیت اور خود پسندی کے حجروں سے نکال کر زندگی کے بھرے میلے میں لانے کی کوشش کی گئی ہے یہیں سے ادب اجتماعی زندگی سے آشنا ہوتا ہے، انسانیت کے دکھ درد کو کہنا سیکھتا ہے، قوم و ملت اور رسم و آئین کی پابندیوں کو ہٹا کر زندگی کی یگانگی اور وحدت کا پیغام سناتا ہے اور ان تمام عناصر کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے، جو زندگی کو محدود اور تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کرنا چاہتے ہیں ـــ یہ وہی صدائے حق ہے جسے روس میں میکسم گورکی اور پرنس کروپاٹکن فرانس میں رومان رولاں، اور ہندوستان میں قاضی نذرالاسلام نے بلند کیا اور یہی وجہ ہے کہ ان فن کاروں کے آرٹ میں زندگی کی ایسی جوت جگمگا رہی ہے، جو غم زدہ انسانوں کے تاریک دلوں کو اجالتی ہے، اور محبت کے ساتھ ان کے دکھ درد کی عیادت کرتی ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ اختر رائےپوری کا نظریۂ ادب کسی دل جلے کی پکار نہیں بلکہ اسکے پسِ منظر میں روشنی کی وہ لکیر نظر آتی ہے جو ماضی کا رشتہ حال سے اور حال کا ناتا مستقبل سے جوڑتی ہے۔ اپنے وسیع سیاسی، معاشی اور ادبی مطالعے کی مدد سے ہمارا نقاد جب ہندِ قدیم اور ہندِ جدید کے ادب کا تجزیہ کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بےچین لہر ٹھہرے ہوئے پانی میں تلاطم برپا کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے، ایک عظیم قوت ادبی مزاج سے نبرد آزما ہونے کے لئے میدان میں آگئی ہے، جو ایکا ایکی اس دیس کے ادب کی بے حسی اور بے راہروی کو بہا لے جائیگی۔ چنانچہ حقائق کو ایک نظر دیکھ کر دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ یہ توقع غلط نہیں ثابت ہوئی۔ ہندوستانی ادب میں آج جو خوش آئند تبدیلیاں نظر آتی ہیں، وہ اختر کے ادب اور زندگی ہی کی مرہونِ منت ہیں، ہندِ جدید کے ادب کا معاشی تجزیہ دراصل اختر کے اس قول کی صحت کا ثبوت ہے کہ ادب درحقیقت اپنے ماحول کی نمائندگی کرتا ہے۔

پریم چند جب مزدوروں کو زندگی کی جدوجہد کا پیام سنانے کی بجائے سرمایہ داروں کے من میں نیکی کی جوت جگمگانے کی توقع کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ گنگو رکی طرح انہیں بھی اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ ایک طرح سے یہ ادیب کے عجز کا اظہار ہے کہ وہ اپنی منزل پر پہنچنے کی بجائے تھک ہار کر راستے ہی میں کہتا ہوا بیٹھ گیا! "کیوں نہ سمجھ لوں کہ میں اپنی منزل پر پہنچ گیا" من کے سنسار میں کیسے تبدیلی ہو سکتی ہے، اسے ہزار کوشش کے باوجود پوری طرح سمجھنا مشکل ہے، پھر کسان اور مزدور، زمینداروں اور سیٹھوں کے دل کی تاریکی پگھلنے کی توقع میں کیوں بیٹھے رہیں، سوال یہ ہے کہ زمیندار و کارخانہ دار اور کسان و مزدور کی تمیز ہی کیوں باقی رہے، کیوں نہ پیداوار کے ذرائع پر پوری سماج کا قبضہ ہو، اور اس کی تقسیم مساوات کے اصول پر ہو۔ ادب جب زندگی کا ترجمان اور نقاد ٹھہرا، تو کیا وجہ ہے کہ وہ انسان کی صحیح رہنمائی کرنے کی بجائے اسے قسمت اور صبر کی افیون کھلاتا رہے ـــــ

"ادب اور زندگی" کا مصنف ایسے ادب کا سخت مخالف ہے، جو حقیقت کا سامنا ہوتے ہی راہِ فرار ڈھونڈنے لگتا ہے۔ ادب دراصل حقیقت کا جویا ہے پھول کے حسن اور خوشبو کی تعریف کرتے ہوئے وہ کانٹوں کی بیدردی جتلانا نہیں بھولتا۔ اسی طرح جب وہ بلبل کے نغمے کا ذکر کرتا ہے، تو اس کی دلربائی کے ساتھ سوز و درد کی داستان سنانے سے نہیں چوکتا۔ پھر یہ کیوں ہو کہ ادیب ظلم کو نیست و نابود کرنے کی بجائے مظلوم کو بہلانے میں اپنی قوت صرف کر دے۔ ہندوستانی ادیبوں کی بے راہروی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نہ تو وہ اپنے ماحول سے متعلق کوئی واضح تخیل اپنے ذہن میں رکھتے تھے اور نہ انہیں اپنی شخصیت پر قابو تھا، ورنہ ممکن نہ تھا کہ خالص فرقہ وارانہ جذبات کے زیر اثر ناول لکھے جاتے اور شعر کہے جاتے، یا گھبرا کر ماضی سے لپٹنے کی بے سود تمنا میں آرٹسٹ کی قوت کا بیشتر حصہ برباد ہوتا۔ اختر کے نقطۂ نگاہ سے ایسا ماحول سچے ادب کی تخلیق کے لئے موزوں نہیں ـــ "سچے ادب کی تخلیق صرف اسی وقت ممکن ہے جب شخصیت ماحول کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر حق کے اذن پر لبیک کہے۔ ماحول کو بدلنے سے پہلے ہمیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری شخصیت نے ایثار کا سبق نہیں پڑھا۔ وہ ضبطِ نفس سے بیگانہ ہے۔ وہ خودی کی کینچلی میں دبی ہوئی ہے۔ اس پر تن آسانی نے چربی کی تہیں چڑھا رکھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں، اس میں حقیقت نہیں ہوتی، وہ کذب و افترا کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اور اگر ہماری طبیعت حق کی طرف جاتی ہے تو ماحول سے نامانوس ہو کر نامراد رہ جاتی ہے ـــ"

"ادب اور زندگی" کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر اتنے مضمون لکھے گئے کہ ناظر کو پھر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی، کا خیال آنے لگا۔ ہر ادبی حلقے میں اس مقالے پر بحث اور تفسیر کا سلسلہ چل نکلا، رجعت پسند طبقہ بگڑنے لگا، اور نئے ادیبوں نے مصنف کے خیالات کو مشعل راہ بنا کر اس طرح نئی بنیاد ڈالی جو بعد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۳۳ء سے لیکر ۱۹۳۷ء تک اختر رائےپوری نے باقاعدگی سے ہندوستانی ادب کی راہنمائی کے لئے متعدد مضامین لکھے۔ ان میں وہ تنقیدیں اور تبصرے بھی شامل ہیں جو وہ ناخدا کے نام سے انجمن ترقی اردو کے مشہور رسالہ اردو میں لکھتے رہے۔ ان میں سے کچھ مضامین "ادب اور انقلاب" کے نام سے مجموعے کی صورت میں چھپ چکے ہیں، یہ مضمون اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ انہوں نے ادب میں زندگی کا تنقیدی احساس پیدا کیا اور قدروں کو جانچنے کے لئے ادیب کو ایک سماجی معیار فن سے آشنا کیا۔ "ادب اور زندگی" کے بعد "ادبی ترقی پسندی کا صحیح مفہوم"، "اردو شاعری میں عورت کا تخیل"، "جنگ اور ادب" اور "اردو ادب کے جدید رجحانات" اسی سلسلے کی مضبوط کڑیاں ہیں پچھلے دس سال میں ہندوستانی تنقید نگاری کی جو کایا پلٹ ہوئی وہ براہ راست

انہی مضامین کی اشاعت کا نتیجہ ہے۔

اختر ایک آئیڈیلسٹ نقاد ہے۔ وہ اس تکلیف دہ احساس کے ساتھ مضمون لکھتا ہے کہ ہندوستان میں صحت مند ادب کی تخلیق کے آثار نہیں ملتے۔ یہ احساس اس کی تحریر میں بلا کا جوش اور تیکھاپن پیدا کرتا ہے۔ اس حقیقت کو جتلا کر کہ ادب اور زندگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے، وہ سچے ادب کی قدروں کا تعین کرتا ہے، ان قدروں کی جڑیں زندگی کے بنیادی جذبات میں پیوست ہیں۔

اس کسوٹی پر جب وہ ہندوستانی ادب کو پرکھتا ہے تو اسے اپنے آئیڈیل کی تصویر کہیں نہیں ملتی۔ اس کے ذوق وشوق اور بلند نظری کا یہ عالم ہے کہ وہ اس دیس کی دو عظیم ادبی شخصیتوں ٹیگور اور اقبال تک سے مطمئن نہیں۔ ان کے آرٹ کی عظمت کا وہ قائل ہے مگر نئے دور کے نئے تقاضوں سے آنکھ چرا کر عہد گزشتہ کی کمیں گاہوں میں پناہ کی تلاش کو وہ مطعون قرار دیتا ہے۔ زندگی کے حقائق سے گریز کے اس رجحان کو نظر انداز کرنا اس کے مسلک کے خلاف ہے۔ یاد رہے کہ اس مرحلے پر ادبی حلقوں میں اختر کے خلاف بڑی شورش پیدا ہوئی مگر وہ پوری ثابت قدمی کے ساتھ اس طوفان کو سہہ گیا۔ اپنے خواب کی تعبیر اگر اسے کسی فن کار میں نظر آتی ہے، تو وہ نذرالاسلام ہے۔ جس کی شاعری اس کسوٹی پر پوری اترتی ہے جہاں ادب ظلم کے لئے تلوار اور مظلوم کے لئے صور بیداری کا کام دیتا ہے۔ اختر کے تنقیدی شعور میں گہرائی اور پختگی اور اس کی تنقید میں ضبط و توازن کی حیرت انگیز ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ مصنف کے مطالعے کی وسعت، تجربہ کی گہرائی، خیالات کا ستھرا پن اور انداز بیان کا وہ نکھار ہے جو اس کی تحریر میں جا بجا جھلکتا ہے۔ اس کا خلوص اور تجسس، جس کی کوئی انتہا نہیں، ان خوبیوں کو جلا دیتا ہے، ہر ادبی تحریک میں اس کی باریک بین آنکھ پس منظر کے مدھم سے مدھم نقش کو دیکھ لیتی ہے اور حقیقت نگار قلم اسے کمال خوبی سے اجاگر کر دیتا ہے۔ "ادب اور انقلاب" میں یہ مکمل چھان بین کی یہی صفت ہر موقعے پر آشکار رہتی ہے اور اختر کو ہندوستان کے منفرد نقاد کے روپ میں پیش کرتی ہے۔

سوویٹ روس کے ادب پر اختر کا جامع مقالہ اردو تنقید کے شاندار مستقبل کی خبر دیتا ہے۔ کہاں اردو تنقید کی کم عمری اور خامیوں کا شدید احساس اور کہاں اس حقیقت کا بولتا ہوا ثبوت کہ اب اس میں دنیا کی دوسری زبانوں پر بھی کامیاب تنقید کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے! موضوع کی وسعت کے مقابلے میں مصنف کا اختصار دیکھو تو حیرت ہوتی ہے، کہ ایک پورے ملک کے ادبی ارتقا کی ایسی مکمل تصویر چھوٹے سے چوکھٹے میں کیوں کر سما گئی۔

جن خوبیوں نے اختر کی تنقید کے سر قبول عام کا سہرا باندھا ہے، ان میں طرز بیان کا وہ حسن اور رسیلا پن بھی شامل ہے جس نے اسے پر بہار بنا دیا ہے، اس کی مثال ہمیں "بنگال کا باغی شاعر" میں ملتی ہے۔ یہ مضمون گو نذرالاسلام کی شاعری کے متعلق لکھا گیا ہے، مگر مصنف کے جوشِ عقیدت اور خلوص نے نثر میں بھی شعر و نغمہ کے رنگا رنگ پھول کھلا دیئے ہیں۔ پورے مضمون میں ایک با قافیہ اور حسین نظم کی سی رعنائی پائی جاتی ہے، ہندوستانی تنقید میں ایسے دلربا مضمون کی مثال کہیں نہ ملے گی، جہاں نقاد فن کار کے اس قدر قریب آگیا ہو کہ اس کے احساسات کی خفیف سے خفیف تھرتھری کا نظارہ بھی دکھانے میں کامیاب ہو جائے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں تنقیدی شعور کے ساگر کی وسعت اور گہرائی میں بیکرانی پیدا ہوتی ہے اور تنقید اپنی معراج کو پہنچتی ہے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ صرف یہی ایک مضمون اختر کو ہندوستان کے نقاد کا درجہ دلانے کے لئے کافی ہے۔

دنیا کی ہر زندہ زبان میں ترجمے کو خاص درجہ حاصل ہے اس اعتبار سے اسے بھی ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ ہے بھی بڑا کٹھن کام۔ فن کار کو ادب کی تخلیق میں یقیناً جگر خون کرنا پڑتا ہے، مگر مترجم کو اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فن کار سے بھی زیادہ پتہ مارنا پڑتا ہے۔ اس کی مشکلات کی انتہا نہیں جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اسکے تار چڑھاؤ سے باخبر ہونا اس کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اپنے دیس کی زبان سے۔ کوئی ترجمہ اسی وقت کامیاب کہلائے گا جب مترجم کا رباب فن کار کے گیت کا پوری طرح ہم نوا ہوگا۔ یاد رہے کہ جب تک وہ مصنف کی روح کی لرزش محسوس نہیں کرتا، اس کے جذبات و احساسات کے دھارے میں نہیں بہتا اور اس کی تحریر کے ہر انداز کو نہیں پہچانتا، اس کے ترجمے اور اصلی تحریر میں وہ مکمل ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو کامیاب ترجمے کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اردو میں تراجم کی ویسے ہی کمی ہے، مگر اس کسوٹی پر پرکھئے تو گنے چنے تراجم ہی معیار پر پورے اتریں گے، ایک زمانہ تھا کہ اس میدان میں ظفر علی خاں جیسے پُرتکلف بزرگوں کا سکہ چلتا تھا، مگر ادب کے ہیں بڑا کہ تراجم کا یہ دور جلد ہی ختم ہوگیا اور مولوی عنایت اللہ اور ڈاکٹر عابد حسین جیسے باکمالوں نے اردو ترجمے کا سنگھار نکھارنا شروع کیا۔ تراجم کے لئے صحیح کتابوں کی دیکھ بھال شروع ہوئی، زبان و بیان کی اونچ نیچ کو مدنظر رکھا جانے لگا اور کوشش کی گئی کہ مترجم کی بے راہروی سے مصنف کی تحریر کا خون نہ ہو۔ اس سلسلے کی تکمیل موجودہ دور میں اختر رائے پوری کے ان تراجم سے ہوئی جو انجمن ترقی اردو کی اسکیم کے مطابق وجود میں آئے اور انجمن نے ہی انہیں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اسے اتفاق نہیں بلکہ حسن اتفاق کہئے کہ ادب عالیہ کے تراجم کی جو اسکیم انجمن نے سوچی تھی اسکی تکمیل کیلئے اختر جیسے ادبی مجتہد کا تعاون حاصل ہوا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں کے اشتراک سے کس کو زیادہ فائدہ پہنچا، مگر اردو ترجمے کی خوش قسمتی میں کلام نہیں کہ اختر جیسا گوہر نایاب اس کے ہاتھ لگ گیا۔ اب تک جو ادبی شاہپارے اختر کے ذریعے اردو میں منتقل ہو چکے ہیں، ان میں کالی داس کا مشہور ناٹک "شکنتلا"، نذرالاسلام کی نظموں کا مجموعہ "پیام شباب" "گورکی کی آپ بیتی" اور پرل بک کا شہرت یافتہ ناول "پیاری زمین" (GOOD EARTH) شامل ہیں، ان تراجم کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اردو ترجمہ مدت سے جس انقلاب کی راہ دیکھ رہا تھا اس کا آغاز ہو گیا ہے، یہ امر تعجب خیز ہے کہ ہندوستانی تنقید اور ادب کی طرح اردو ترجمے میں انقلاب کی بنیاد بھی اختر رائے پوری کے قدامت شکن ہاتھوں سے رکھی گئی۔

ہمارے دیس میں اس آمر انقلابی کی شخصیت اس جھومر کی سی ہے جو ادب کی دیوی کے روپ کو نئی شان سے جگمگا رہا ہے۔

اختر کے تراجم کے بارے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کے جو شاہکار اس نے اردو کے سینے میں اتارے ہیں، ادب میں ان کا مقام بہت بلند ہے، ان فن پاروں میں کالی داس، بنکم گورکی، پرل بک اور نذرالاسلام جیسے بین الاقوامی شہرت کے ادیبوں نے اپنی صناعی کا بے مثال کمال دکھایا ہے۔ اس اعتبار سے مترجم کو جن مشکلات سے واسطہ پڑا ہوگا ان کا اندازہ ممکن نہیں، مگر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کی قیامت خیز قوت کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ٹھہرتی، ایک سیلاب کی طرح وہ ہر بلند و پست پر چھا جاتا ہے۔ اور اپنی عظمت کے نقش کو اور بھی گہرا کر دیتا ہے۔

کالی داس کی "شکنتلا" کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے کیا گیا ہے۔ سنسکرت اور اردو کی فطرتوں میں وہی فرق ہے، جو بقول مترجم، کسی مالوا کے پنڈت اور لکھنؤ کے میرزا میں ہو سکتا ہے، اور سنسکرت بھی کالی داس کی، جو اس منجھی منجھائی اور ڈھلی ڈھلائی زبان کا سب سے بڑا صاحب طرز ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آدھی کتاب اس صاحب طرز کی مدھر شاعری سے بھرپور ہے، سنسکرت جیسی وسیع زبان کو جس میں نازک سے نازک احساسات کو حسن و خوبی سے بیان کرنے کے لئے الفاظ کا بہترین ذخیرہ موجود ہے، اردو جیسی تہی دست زبان میں گھلانا، واقعی ایک حد درجہ کٹھن کام تھا لیکن مترجم نے اسے جس خوبی سے کر دکھایا ہے، وہ داد سے مستغنی ہے،

بنکم گورکی کی آپ بیتی کو ادب عالیہ میں جو درجہ حاصل ہے وہ بہت کم فن پاروں کے حصے میں آیا ہے۔ اس کتاب کے ہر لفظ میں آرٹسٹ کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ گورکی کو نہ صرف اپنے احساسات کے اظہار میں کمال حاصل ہے بلکہ وہ زبان و بیان کا بھی بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی رام کہانی زندگی کے رنگا رنگ جذبوں کی سچی تصویر ہے اور غالباً اس کے ادبی رنگ محل کی سب سے البیلی اور موہنی مورت ہے۔ اختر نے جس نفاست سے روسی ادب کے اس شاہکار کو اردو کے قالب میں سمویا ہے، اس کی مثال کہیں نہ ملے گی۔ مترجم یوں بھی گورکی کا شیدائی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ترجمے میں مصنف کی روح کے اس جوہر کو دکھلانے میں کامیاب ہو گیا جو اس کی اصلی تحریر میں ہر جگہ جھلکتا ہے۔ گورکی کی آپ بیتی کے ترجمے میں ایسی دلفریبی اور سچائی پائی جاتی ہے کہ اس پر ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کتاب اردو میں ہی لکھی گئی ہے اور اردو بھی کیسی جس کی رعنائی اور دلکشی ناظر کی سدھ بدھ بھلانے کے لئے کافی ہے

ترجمے کا سچا روپ دکھانے کے لئے ایک دو ٹکڑے پیش کئے جاتے ہیں۔

"کبھی کبھی غروب آفتاب کے وقت آسمان میں لہو کی ندیاں بہنے لگتیں، اور گمان ہوتا کہ ان میں آگ لگ گئی ہے، باغ کے مخملی سبزہ پر آتش پاروں کی بارش سی ہونے لگتی تھی، رفتہ رفتہ ہر شے یک گونہ تاریک ہو کر وسیع تر ہو جاتی، — پھول سی جاتی، اس وقت جب کہ شام کی لالی گہری ہو جاتی تھی، دھوپ میں جھلس کر پتیاں مرجھا جاتی تھیں اور گھاس کے تنکے سر جھکا لیتے تھے، ہر چیز زیادہ نازک معلوم ہوتی، اور ایسی مہک پھیلاتی، جو موسیقی کی ترنگیں کھیتیوں سے اٹھ کر آتیں جہاں لوگ رہ رہ کر کچھ بجانے لگتے تھے، رات آتی۔ اور اس کے ساتھ ماں کے پیار کی سی شگفتگی اور حیات آفریں پیدا ہونے لگتی، سناٹے نے اپنے گرم و گداز ہاتھوں سے دل کو تھپکی دی، اور سارے گرد و غبار کو دھو کر وہ سب کچھ بھلا دیا جسے بھول جانا چاہیے، چت لیٹے ہوئے آسمان کی نامحدود گہرائی — ایسی گہرائی جو اپنی ہر بلندی میں ستاروں کی ایک نئی محفل سجاتی ہے۔ ستاروں کی چمک دمک کے نظارے میں کیسا مزا ملتا تھا، اور اس موقع پر اگر زمین پر قدم رکھو تو گمان ہوتا ہے کہ یا تو دنیا سمٹ گئی ہے، یا تم بہت بڑے ہو گئے ہو، اور اپنے ماحول میں سمائے جا رہے ہو، لمحہ بہ لمحہ تاریکی اور خاموشی بڑھتی جاتی ہے، تاہم نہایت ہی دھیمی اور ناقابلِ احساس آوازوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور ہر آواز — خواہ وہ کسی بلبلِ خوابیدہ کا ترانۂ نیم شب ہو یا کسی خرگوش کا سراسیمہ خرام یا کسی انسان کی زیرِ لب گفتگو — دن کی آوازوں سے قطعاً مختلف ہے، ایک خاص نرالا پن اس کے حساس سکون کے پیچھے چھپا رہتا ہے؟"

چلتے چلاتے اردو میں بنگال کے باغی شاعر نذرالاسلام کے تعارف کا ذکر ضروری ہے، جو تراجم کے سلسلے میں اختر کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ "پیامِ شباب" کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نرم و نازک جذبات کے ساتھ ساتھ انقلاب کے آتشیں ترانوں کو بھی پوری کامیابی سے اپنے فنی طلسم خانے میں سجا سکتا ہے، مثال کے طور پر ایک نظم کا مختصر سا ٹکڑا پیش کیا جاتا ہے۔

"میں دھرتی ماتا کی سرکش اولاد ہوں

اس قدر سعادت فروش اور دغا ناآشنا کہ میں اسے اسی کے آتشِ غم میں جھونک دونگا،

اس آگ کو میں تباہی کے پنکھے سے ہوا دونگا، یہاں تک کہ زمین و آسمان اس میں جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے،

میرے ہاتھوں میں مصائب و آلام کی مشعل روشن ہے۔

بیک آواز تم سب کہو،

"تو سراپا بدعا ہے، تو شیطان ہے، تو مالک اجل ہے،

نہ تو کسی سے ڈرتا ہے، نہ تجھے کوئی مار سکتا ہے،

تو قیامت کا پیامبر ستارۂ تخریب ہے،

تو دیوانگی اور وحشت کی روشنی ہے،

تو دجّال ہے، تو قہر و غضب کا دیوتا ہے،

بجا اور درست! ہاں ہاں۔ میں نقیب قیامت ہوں،

میں ستارۂ تخریب ہوں ————"

(باقی آئندہ)

کچھ ایران کے بارے میں

(ایچ - ڈی - گریوز لا)

یہ مضمون "ایشیاٹک ریویو" بابت اپریل ۱۹۴۴ء میں اور بعد میں اسکا فارسی ترجمہ مجلہ "روزگار نو" لندن میں شائع ہوا تھا۔

گذشتہ دو ایک سال میں انگلستان میں ایران سے متعلق بہت سے اہم اور معلوماتی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ جن لوگوں نے یہ مضامین پڑھے ہیں وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ ایران کے حالات تسلی بخش نہیں ہیں۔ ایران کئی سیاسی، مالی اور معاشی مشکلات کے باوجود جو باہری افواج (اتحادی ہی کیوں نہ ہوں) کے طویل قیام کے سبب زیادہ سنگین ہو گئی ہیں جمہوری طرز حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے اور ایران کے عامتہ الناس، بلکہ ان کے بعض رہنما بھی شکست، تذبذب بلکہ قنوط کے احساسات میں گرفتار ہیں۔

یہ سب مسائل حقیقی اور یہ سب مشکلات اہم ہیں۔ لیکن ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے انھیں نظر انداز کر دیں اور ہو سکے تو اس بات پر غور کریں کہ اس وقت ایران اور ایرانیوں کے دل و دماغ پر کیا کچھ گذر رہا ہے اور ایران کے سیاسی، بین الاقوامی یا انتظامی وجود پر نہیں بلکہ اس کے روحانی وجود پر نظر ڈالیں۔ ایرانی جرائد پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران جو تین ہزار سال آزاد رہا اور شاندار ماضی اور شاندار روایات کا حامل ہے، اگر مرا نہیں تو ایک مہلک مرض میں ضرور مبتلا ہے۔ اسکا روگ اور اس کی عسرت لاعلاج ہے اور تعلیم کی کمی، بھوک اور انتظامی کوتاہیاں اسقدر سنگین ہیں کہ بہتری کی امید نہیں رہی۔ ایران کے مشہور وطن پرست ادیب آقائے رہنما نے اپنے روزنامہ ایران مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۳ء میں "ایرانیوں کے افکار" کے عنوان سے ایک افتتاحیہ سپرد قلم کیا جس میں اس نے لکھا کہ ایسے فارغ البال ایرانی بہت کم ہیں جو کچھ سوچ سکیں، بقیہ لوازم زیست کی فکر میں الجھے رہتے ہیں اور جو فارغ البال ہیں انھیں عیش و راحت کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

کیا ہم اس مایوس کن تشخیص کو جس کی تائید ایران کے قریب قریب سب جرائد کے مطالعہ سے ہوتی ہے بلا چون و چرا صحیح تسلیم کر سکتے ہیں؟ نہیں، بلکہ ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ یہ تشخیص غلط ہے۔ روزنامہ اطلاعات کے مدیر آقائے مسعودی نے ۲۱ دسمبر ۱۹۴۳ء کی اشاعت میں اپنی حکومت اور ملت سے یہ اپیل کی تھی کہ یاس اور قنوط کو ترک کر کے ایران کی حیات نئی بنیادوں پر تعمیر کی جائے۔ یہ اپیل قابل عمل ہے اور اس پر عمل ہو بھی رہا ہے۔

اگرچہ ایران کے مقابلہ میں بہت سے یورپی ممالک کے مصائب کہیں زیادہ سنگین ہیں تاہم اس میں کلام نہیں کہ ایران ایک تاب آزما دور میں سے گذر رہا ہے لیکن ایران کی طولانی تاریخ ثابت کرتی ہے کہ یہ قوم زندہ رہنے پر تلی ہوئی ہے۔ قدرت نے اس قوم کو بڑی قوتیں عطا کی ہیں اور اب اسمیں بیداریٔ فکر اور تجسس کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں۔ ان باتوں کے پیش نظر یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی صلاحیت مر گئی ہے یا مر سکتی ہے۔

جہاں تک ایران کے دل و دماغ کے ارتقا کا تعلق ہے، معلوم یہ ہوتا ہے کہ ایران کو دفعتاً بیسویں صدی میں چھلانگ مارنا پڑی۔ ہماری (اہل مغرب کی) یہ خوش قسمتی تھی کہ ہم نے نہ صرف تعلیم بلکہ ذہنی تفریح کے تمام مدارج دھیرے دھیرے طے کئے۔ انشا پردازی، ناول نگاری، تھیٹر۔ سب اٹھارویں اور بیسویں صدی میں آہستہ آہستہ پروان چڑھے۔ سنیما مغرب میں ایران کی طرح، دفعتاً ظہور میں نہیں آیا۔ تھیٹر سے خاموش فلم، خاموش فلم سے متحرک فلم۔ یہ سب منزلیں سلیقہ اور متانت کے ساتھ طے پائیں۔ لیکن ایران میں معاملہ دگرگوں رہا ہے۔ تقریب قریب دس سال کے اندر اندر ایران کو نہ صرف رنگین فلم بلکہ ریڈیو، فرنگی نغمہ و سرود، جدید عمارات، فرنیچر، لباس اور رسم و رواج سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی اثنا میں اسے یکایک سب سے اہم اور دور رس انقلاب یعنی آزادیٔ نسواں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حالات میں اگر ایران بوکھلا جائے اور اپنی اقدار کا اندازہ نہ کر سکے تو چنداں تعجب کا مقام نہیں ہے۔ سخت گیر آمریت کے اچانک سقوط سے صورت حالات اور بھی بگڑ گئی۔ کہاں وہ جبر و تشدد، کہاں یہ آزادیٔ فکر و اظہار! ایرانی دماغ ڈگمگا گیا ——— وہ دن دور نہیں جبکہ اسے سکون اور توازن میسر ہو جائے گا لیکن سر دست ایران کا ردعمل کیا ہے؟ سب سے پہلے جرائد ہی کو لے لیجئے۔ ادھر دباؤ ہٹا ادھر ہزاروں دبی ہوئی آوازیں ابھرنے لگیں۔ رات رات میں اخبارات ککرمتا کی طرح نمودار ہو گئے۔ گذشتہ دو سالوں میں طہران ہی سے ساٹھ ستر اخبارات شائع ہونے لگے۔ آج بھی چالیس سے تو زیادہ ہوں گے۔ یہ اخبارات کیا کہتے ہیں؟ بہت سے ایڈیٹر ممتاز ادیب ہیں لیکن جو ایرانی اخبارات انگلستان آ رہے ہیں ان کا واسطہ تو زیادہ تر سیاسیات، سماجی اور معاشی مسائل اور دنیا کی خبروں سے ہے میں نے

روزنامہ ایران (جسکا ایڈیٹر آقائے رہنما ہے) کے چار تازہ شمارے اٹھل پچھل چنے ہیں۔ ان کے افتتاحیوں کے موضوع یہ ہیں:- افیون اور شراب کے خلاف جنگ، محکمہ ٹیلیفون کے عملہ کی شکایات، ایرانی کالجوں کی تعلیم، اگست ۱۹۴۱ء (جب اتحادی افواج ایران میں داخل ہوئیں اور رضا شاہ تخت سے دست بردار ہوا) کے باعث عبرت واقعات۔ یہ سب موضوع اہم اور مضامین فکر انگیز ہیں۔ لیکن اگر بڑے سے بڑے ایرانی اخبار کو چھان ماریں تو بھی اکّا دکّا مضمون ایسے ملیں گے جو کسی عام ثقافتی موضوع سے متعلق ہوں یا کہیں کتابوں پر تبصرے ہوں یا کوئی ادبی مباحثہ ہو یا مراسلات کے ذریعہ روزمرہ کی دلچسپی کے واقعات پر اظہار خیال کیا گیا ہو یا سینما کے کھیلوں یا ریڈیو کی خبروں کے بارے میں کوئی دلچسپ اور تُک کی تنقید ہو۔ ان اخبارات کی تعداد اشاعت کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پرچے خریدے کم جاتے ہیں اور لوگ عام طور پر ایک دوسرے سے لیکر پڑھتے ہیں۔ اس سے یہ خیال آتا ہے کہ اگر کم اخبارات چھپیں تو نہ صرف یہ کہ کاغذ کی زیادہ کھپت اور طباعت میں بھی زیادہ آسانی ہوگی بلکہ ادبی ذوق زیادہ مستقل قسم کی ادبیات کی تخلیق میں صرف ہو سکیگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے:- کیا ایرانی اخبارات عام لوگوں کو پہنچتے ہیں۔ یا لوگوں کے دل و دماغ کا انعکاس ہیں یا ان کی رہنمائی کرتے ہیں یا ان کے تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں؟ کیا ایران میں عوامی اخبار ہیں؟ کیا کوئی عوامی ادب بھی ہے؟ کیا حجازی کے لطیف مزاحیہ مضامین یا مسعود فرزاد کی سنجیدہ تنقید یا برق آسا مزاح یا جمال زادہ اور ایسے ہی اوروں کے افسانے عوام تک پہنچتے ہیں یا محض خواص تک؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایران میں نہ عوامی اخبارات ہو سکتے ہیں نہ عوامی ادب، اس لئے کہ عوام اَن پڑھ ہیں۔ ایران کی تمدنی زندگی میں داستان گو کو صدیوں سے ایک ممتاز حیثیت حاصل رہی ہے۔ بچوں کے لئے طلسماتی یا دیگر قسم کی کہانیاں نہیں چھپتیں اور نہ ان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہر دایہ یا نانی یا دادی کو ایسی ہزاروں کہانیاں ازبر ہیں۔ لیکن داستان گو اور دائیاں اب ناپید ہو رہی ہیں۔ اب ان کی جگہ کون لے؟ کیا یہ امید افزا علامت نہیں کہ بچوں کا رسالہ نونہالاں جو حال ہی میں طہران سے شائع ہونے لگا ہے اسکی ہفتہ وار اشاعت بیس ہزار ہو گئی ہے؟ پہلی مرتبہ اب ایرانی لڑکے اور لڑکیاں "روبرٹ آف ہنزد" ایسی ہمت افزا کہانیاں ایرانی زبان میں پڑھنے لگی ہیں۔ وہ دن دور نہیں کہ ایرانی خود اپنے طبعزاد رومان لکھیں گے اور شاید کوئی ایرانی "شرلاک ہومز" جاسوسی کہانیاں لکھنے لگے۔

ایران اپنی صدیوں پرانی ادبی ثقافت اور روایات کے باوصف کیوں اسقدر پھسڈی ہے؟ اسکا جواب آقائے جمال زادہ نے اپنے افسانوں کے مجموعہ "یکی بود یکی نبود" کے دیباچہ میں دیا ہے۔ اسکا کہنا ہے کہ سالہا سال کی مستبدانہ طرزِ حکومت کے باعث معدودے چند فکر اور ثقافت کے ارتقا سے مستفید ہو سکے جو نتیجے اس نے نکالے ہیں کم از کم ان کی صحت میں کلام نہیں۔ یعنی یہ کہ تعلیم عامہ نہونے کے باعث: ایرانی ادیبوں کا روئے سخن خواص کی طرف رہا ہے نہ کہ عوام کی طرف۔ معدودے چند لوگ ادب سے مستفید ہو سکتے تھے اور ادب اور بول چال کے محاوروں میں وسیع فرق ہے۔ ان نتائج کی بنا پر وہ یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ تعلیم عامہ کے علاوہ ایران کی سب سے بڑی ضرورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اظہار خیال ایسی زبان میں کیا جائے جسے عوام سمجھ سکیں اور ایسے محاورے استعمال کئے جائیں (مثلاً ناول میں) جن سے عوام لطف اندوز ہو سکیں۔ اس کی رائے میں ناول یورپی ثقافت کا مضبوط ترین کھمبہ ہے۔ "یکی بود یکی نبود" میں اپنے نظریہ کو دلآویز اور مزاحیہ انداز میں عملی جامہ پہنایا ہے۔ صادق ہدایت ایک اور افسانہ نگار ہے جو ایرانی ادب میں اپنے لئے تیزی سے ایک مخصوص جگہ بنا رہا ہے اور جس کے بارے میں لے دے ہو رہی ہے۔ ایک غیر ملکی کا ایرانی ادب میں اس افسانہ نگار کے موجودہ یا آئندہ مرتبہ کا اندازہ لگانا اس کی جسارت بلکہ حماقت پر محمول ہوگا۔ کیونکہ نہ صرف اس کے طرز نگارش بلکہ اس کے افسانوں کے متن کے بارے میں ارباب نقد و نظر کی رایوں میں شدید اختلاف ہے۔ البتہ میں اتنا کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہدایت بہت لکھتا ہے، اور جو کچھ لکھتا ہے اس میں اپچ اور جاذبیت ہے، تخیل اور دقت نظر ہے۔ اگرچہ وہ اکثر و بیشتر جن کرداروں اور جس ماحول کو پیش کرتا ہے وہ ایک غیر ملکی کے لئے اجنبی ہے۔ تاہم ان کے غم و الم اور ان کے سینے گہری اور ناقابل فراموش حقیقتیں نظر آتی ہیں۔

ہدایت بہت بڑا ادیب ہے یا محض سیانا ٹھیک۔ یا وہ ایک ناخوشگوار حادثہ ہے۔ یہ چنداں اہم سوال نہیں ہے۔ اہم سوال تو یہ ہے۔ اور جسکا جواب ہمیں دل سے مطلوب ہے۔ کیا ہدایت ایک جداگانہ انوکھی ہستی ہے یا نہیں؟ کیا وہ ایران کے نئے مکتب افسانہ نگاری کا پیشرو ہے یا نہیں؟ یہ ایک صحت مند علامت ہے کہ ایرانی اس مسئلہ میں دلچسپی لے رہے ہیں اور بحث و تمحیص رہتی ہے۔ اسوقت ایران میں ہدایت ایسے افسانہ نگار بہت کم ہیں، اور صرف اسی بنا پر اسے کسی لحاظ یا معیار سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں ماہنامہ "سخن" (طہران) جاری ہوا جسمیں ہدایت کے مضامین برابر شائع ہوتے ہیں۔ اس ماہنامہ میں نہ صرف تعلیمی، معاشی، تاریخی اور فلسفی مضامین بلکہ انگریزی، جیکی، چینی اور امریکی نظموں کے ترجمے، موسیقی اور ادبی تنقید سے متعلق مضامین بھی شائع ہوتے ہیں۔ اسکی ہر اشاعت میں حیات ایران کی تجدید کی خواہش پائی جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایران کے چوٹی کے ادیبوں۔ فردوسی، حافظ، رومی، نظامی، سعدی۔ جو صدہا سال سے ایرانی قوم سے خراج عقیدت لیتے رہے ہیں، کی اب کیا حیثیت ہوگی؟ کیا ان کے شاہکار کسی عجائب خانے کی زینت بن کے رہیں گے یا اس دور میں بھی ان کا کوئی عمل دخل ہوگا؟ کیا انکے معیار طاق نسیاں میں ڈالدئے جائیں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ برعکس اسکے یہ سرمایۂ ادب ایران کی حیات ملی کا جزو رہیگا۔ نہ صرف ادب عالیہ کے صحیح نسخے بڑی کاوش سے مرتب کئے جارہے ہیں بلکہ بہت سی فراموش شدہ تصنیفات کو منظر عام پر لانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ قدیم تصانیف کے بیشمار نسخے تدوین اور اشاعت کے منتظر ہیں۔ "سخن" کے ایڈیٹر آقائے خانلری نے کئی پُرمغز مضامین سپرد قلم کئے ہیں جن میں اس نے قدیم اور جدید ادب کا موازنہ کیا ہے۔ اس نے آجکل کے بھونڈے ادبی مذاق اور غیر متعین معیار اور ادب عالیہ سے ناواقفیت کی سخت مذمت کی ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ قدیم شاہکار ادب کے حرف آخر نہیں ہیں اور ان کے طرز فکر و بیان کی غلامانہ تقلید دور حاضر کے حقائق کے منافی ہے۔ اسکا یہ کہنا تو تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ عصر ماضی کے سب بڑے ادیب اپنے زمانے کے عوام کی زندگی اور افکار سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ کم از کم سعدی پر، جو اب بھی ایرانی فکر و دانش کا زندہ مجسمہ ہے، یہ اعتراض عائد نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس حد تک تو آقائے خانلری سے اتفاق کرنا پڑے گا کہ زمانے نے ادیب اور قاری کے باہمی تعلق میں گہری تبدیلی پیدا کردی ہے۔ اگرچہ ایران میں تعلیم عامہ کے دس سالہ منصوبہ کے اجرا کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا لیکن پڑھے لکھوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ اب ادیب اور قاری کے خیالات میں ہم آہنگی ضروری ہوگئی ہے۔ یہ سب صحیح، لیکن ان پڑھوں تک کیسے پہنچا جائے؟ ریڈیو اور سینما نے افکار، تفریح اور ثقافت کی تعلیم کی نئی راہیں نکالدی ہیں یہ بڑا انقلاب ہے۔ جو لوگ ڈرامے یا افسانے نہیں پڑھ سکتے وہ ریڈیو پر سن سکتے ہیں۔ اس سے ان کا شوق بڑھتا جائے گا۔

طہران ریڈیو اپریل سنہ ۱۹۴۰ء میں کھلا اور اب روزانہ ساڑھے آٹھ گھنٹے کا موزوں پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایران میں ریڈیو سٹ بہت ہی کم ہیں لیکن ریڈیو سننے کا شوق اسقدر بڑھ رہا ہے کہ سٹ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوجائے گا۔ جن ان پڑھوں کو ریڈیو سننے کا موقعہ نہیں ملتا ان کے لئے سینما ہے۔ اسوقت ایران میں چالیس ایک سینما ہیں جن میں سے زیادہ جدید قسم کے طہران میں ہیں اور بقیہ دوسرے بڑے بڑے شہروں میں۔ کوئی نصف درجن گاڑیاں جن میں سینما دکھانے کا سامان ہوتا ہے سال بھر دیہاتوں میں گھومتی پھرتی اور سینما دکھاتی رہتی ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ آذربائیجان ہی میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمی ان سینماؤں سے مستفیض ہوتے ہیں؟ اور کرمان کی آبادی کا تو ایک تہائی حصہ سینما دیکھنے کے لئے امڈ آتا ہے۔ سہ رنگے فلم "انگلستان کے باغات" کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ریڈیو سے زیادہ فلم تعلیم عامہ کے لئے مفید ہوسکتا ہے اور ایران کی برٹش کونسل اور ایرانی حکام اس سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

ایران میں انگریزی سیکھنے اور انگریزی کتب پڑھنے کا شوق عام ہوگیا ہے۔ طہران کے ایک کتب فروش سے معلوم ہوا کہ انگریزی رسائل بہت بکنے لگے ہیں۔ ان حالات سے پورا اور منظم طور پر استفادہ کرنا چاہئے۔ انگریزی ادب کے شاہکاروں کے فارسی ترجمے شائع کرنا چاہئیں۔ کچھ ایرانی ادیبوں نے ترجمے کر بھی دئے ہیں۔ اگر ایرانی ادیب اپنے تخلیقی ادب کو ترجیح دیں اور نقالی کو ناپسند کریں تو بھی بہترین خارجی مصنفوں اور ان کے فنی طریقوں کا جاننا ان کو بیحد مفید ہوگا۔ حجازی جو سرتاپا ایرانی ادیب ہے انگریزی ادیب چارلس لیمب کی یاد تازہ کرتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایرانی عورتیں کیا کرتی ہیں۔ یہ تو مسلمہ امر ہے کہ عورتوں کے لئے بہت سے میدان کھلے ہیں۔ "تحریک نسواں" جو علیا حضرت ملکہ فوزیہ کی سرپرستی میں شروع ہوئی ایک منظم تحریک ہے۔ بقول ڈاکٹر رضا زادہ شفق عورتوں کو معاشی، اخلاقی اور سماجی میدانوں میں بہت کچھ کرنا ہے۔ ادب اور فنون کے میدانوں میں بھی وہ بہت کچھ کرسکتی ہیں اور جدید ایران کی مشہور شاعرہ پروین اعتصامی کے نقش قدم پر چل سکتی ہیں۔ طہران ریڈیو میں عورتیں بھی معلن کے فرائض ادا کررہی ہیں اور عورتوں کے لئے ایک مخصوص رسالہ زیر غور ہے اور عنقریب جاری ہونے والا ہے۔ غرض، عورتوں کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایران کو بہت سی سخت پریشانیوں کا سامنا ہے۔ یہ پریشانیاں یکایک رونما ہوئی ہیں اور اسوقت جبکہ ایرانی لیڈر اور بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ جب وہ سیاسی، معاشی اور اصلاحی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہوں تو تخلیق ادب، نئے افکار اور نئے اسلوب اظہار کے مسائل کو طے کرنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ لیکن وقت، امن اور رواداری میسر آئے تو یہ سب مشکلیں آسان ہوسکتی ہیں۔ لیکن قرائن صاف طور پر بتارہے ہیں کہ یہ نئی تحریک بڑھنے لگی ہے اسکے زندہ رہنے اور پھیلنے کے لئے نہ صرف داخلی قوت بلکہ باہری امداد کی بھی ضرورت ہے۔ شانِ ماضی تو بھولی نہیں جاسکتی لیکن اب تو حال اور مستقبل کا مقابلہ کرنا ہے اور قوتِ ایمان، جرأت اور خود اعتمادی کے ساتھ۔ پرکوش اپنے ناول "ساز شکن" میں کہتا ہے:-

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

ایک سوال

(افسانہ)

جی، ایم، درّانی

اس دن بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ طبیعت کی یہ وارفتگی کسی کل بیٹھنے بھی دے گی یا نہیں۔ خیر سے کئی سال ہو گئے ازدواجی زندگی بھی گذارتے ہوئے لیکن وہ جو ایک کمی سی محسوس ہوتی ہے نہ آج ختم ہوتی ہے نہ کل۔ کمی کیا ہے؟ کاش وہ یہی معلوم کر سکتی بس جیسے ساری دنیا سے بیزار۔ تھکی تھکی بدمزہ سی ——— ہنستی بھی تو اس طرح جیسے کوئی روتے کو گدگدا کر ہنسا رہا ہو۔ بقول دیکھنے والوں کے، بڑے بڑے سیٹھوں جیسی زندگی۔ آزادی بھی خاصی نصیب۔ کونسی چیز تھی جو شادی کے بعد اسے نہ ملی ہو۔ لیکن جب کوئی اسکے سامنے اسکے شوہر کی تعریف کرتا تو نہ جانے کیوں اس کا جی چاہتا کہ کمبخت کا منہ نوچ ڈالے۔ اپنے شوہر میں چُن چُن کر عیب نکالے اور اسقدر مذمت کرے کہ تعریف کرنے والے کا منہ بند ہو جائے ——— لیکن وہ اپنے مٹتے ہوئے جذبات روک کر رہ جاتی۔ کیا وہ یہ سب کہہ کر کسی کی نظروں میں عزت حاصل کر سکے گی؟ دنیا تو اسے ہی برا کہے گی اور دنیا کی نظروں میں برے ہو کر جینا بھی دل گردے کا کام ہے۔ وہ بجھے بجھے دل سے تعریف کرنے والوں کا ساتھ ہی دینا بہتر سمجھتی۔ اور اپنے بیقرار دل کو تسلی دینے کے لئے سوچ لیتی کہ انسان بہت سی باتیں اپنی مرضی کے خلاف کرنے پر بھی مجبور ہے۔ انہیں خلاف مرضی باتوں میں سے ایک شوہر کی تعریف ہے۔ سب کچھ سہی لیکن تنہائی میں تو اسے کمبخت نہ جانے کیا کیا ہونے لگتا۔ شادی سے پہلے کے تمام خیالات اسے گھیر لیتے۔ وہی خوبصورت خوبصورت چمیلی کی ڈالیوں کی طرح لچکیلے نازک نازک خیالات جن میں کمسن محبوبائیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ وہ خیالات جن میں زندگی کا حقیقی گھر دراین مفقود ہوتا ہے مگر جب وہ ان سہانے خوابوں سے چونکتی تو سوچنے لگتی کہ آخر وہ اسقدر اچھوتی رنگینیاں کیوں چاہتی ہے جو اسے ازدواجی زندگی میں نہیں مل سکتیں وہ بھی کیوں عام عورتوں کی طرح ہر حال میں خوش رہنا اور شوہر کی مرضی کے مطابق چلنا نہیں سیکھ لیتی۔ کمبخت یہ بھی کوئی عادت ہے کہ ہزاروں مرتبہ بازار جانے پر بھی اس کا دل کچھ خریدنے کو نہ چاہتا۔ کوئی چیز اسے چاہے کتنی ہی پسند کیوں نہ آ جائے لیکن وہ اسے خرید نہ سکتی۔ یونہی بس اسکا جی چاہتا کہ اس کی پسند اس کا شوہر خود کیوں نہیں سمجھتا۔ بیوقوف ہے ——— احمق ہے۔ وہ جیسے اندر ہی اندر سلگ اٹھتی۔ ایک بار دو بار کیا ہزاروں بار یہی ہوتا۔ وہ دو دو دن کنگھی نہ کرتی صرف اس خیال سے کہ شاید اسے اجڑا اجڑا دیکھ کر اس کا شوہر اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر اپنی انگلیوں سے کنگھی کر کے اس سے پوچھے، "اے گرم جوشی سے پیار کر لے بھینچے اور بڑے ہی عشقیہ انداز میں اسے بال سنوارنے پر مجبور کرے۔ لیکن اس کا شوہر تو بڑا ہی سیدھا سلجھا ہوا تھا۔ سب لوگ یہی کہتے۔ پھر اسے اپنی بیوی کے خیالات میں پڑی ہوئی گتھیاں کیسے نظر آتیں۔

شوہر کی عدم موجودگی میں وہ بیٹھ کر سختی سے اپنی بچپن کی رنگین خواہشوں کا احتساب کرتی۔ اپنے آپ پر جھنجھلاتی۔ لیکن جیسے ہی اسکا شوہر اپنی آمد کی اطلاع موٹر کے ہارن سے دیتا، وہ پھر ایک دم چڑ چڑا جاتی۔ اچھی خاصی بیٹھی بیٹھی کھٹ سے بستر پر گر کے تکئے میں منہ چھپا لیتی ——— پھر وہی خواہش کہ اس کا شوہر آ کر اسے منائے، اسکے چاؤ چونچلے کرے مگر اسکے شوہر کو اتنی فرصت کہاں؟ وہ آتا اور اسے یوں پڑا دیکھ کر آہستہ پوچھتا کہ آج بیگم صاحب نے ٹانک پی یا نہیں۔ اگر جواب نفی میں ملتا تو وہ نہایت بجھے ہوئے لہجے میں کہتا: "تمہیں دوا سے نفرت ہے اور صحت ہے کہ گرتی ہی جاتی ہے ہر وقت گری گری سی رہتی ہو۔ اچھا آج تم فلاں ڈاکٹر کو بلا کر دکھاؤ۔"

وہ تلملا کر اٹھ بیٹھتی۔ طبیعت اور بھی چڑ چڑا جاتی۔ مگر یہ سب سمجھنے کی اسکے شوہر کو فرصت کہاں تھی۔ وہ ایک بڑا عہدے دار تھا۔ وہ اسے اٹھتا دیکھکر کہتا! "لیٹی رہو، خانساماں کھانا کھلا دے گا۔ مجھے جلدی ہی جانا ہے۔" وہ کھانا کھا کر پھر چلا جاتا اور وہ گویا اپنی بوٹیاں نوچتی رہتی۔ وہ سوچتی کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں جہاں دولت ہوگی وہاں محبت مر جائیگی۔ کاش اس کی شادی کسی غریب آدمی سے ہوئی ہوتی۔ اور ایک دن ——— شادی تو نہیں ہاں اسے ایک غریب سے آدمی سے محبت ہو گئی۔ وہ غریب آدمی ایک بدقسمت ادیب تھا عرفانی۔ وہ اسکے شوہر کا دوست تھا ——— اسے وہ دن بہت اچھی طرح یاد تھا جب کہ پہلی مرتبہ اسکے شوہر نے عرفانی سے اسے ملایا تھا۔

"آپ سے مل کر دلی مسرت ہوئی۔" اس نے رسماً کہا۔ "مگر محترمہ!" عرفانی نے جواب دیا۔ "میں یہ کہنے سے معذور ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر کسی قسم کی خوشی یا غم ہو۔ ہو سکتا ہے آئندہ چل کر آپ میری مسرت یا غم کا باعث ثابت ہوں۔" وہ بڑی لاپرواہی سے مسکرا رہا تھا۔ اور وہ اس کی صاف گوئی پر کچھ پریشان سی ہو گئی تھی۔

"بیگم! چائے تو پلاؤ عرفانی کو۔ اپنے دوست ہیں۔ کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔" اس کے شوہر نے کہا۔

وہ چائے بنا رہی تھی کچھ کھوئی کھوئی سی۔ کبھی کبھی نیچی نظروں سے

اسے دیکھ بھی لیتی معمولی شکل و صورت کا نوجوان۔ دیکھنے میں کوئی خاص بات بھی تو نہ تھی اس میں لیکن پھر بھی وہ اس سے مرعوب تھی۔ شاید اس کی آنکھوں سے۔ یقیں بھی تو کچھ عجیب سی۔ کچھ کھوئی کھوئی سی مایوس آنکھیں —— بالکل ویسی ہی جیسی اسے اپنی آنکھیں آئینے میں نظر آتی تھیں۔ وہ بے خیالی میں پیالی میں شکر گھولے ہی جا رہی تھی۔

"چلئے ہیں اسقدر شکر حل کر دینے سے زندگی کی تلخی تو نہیں کم ہو سکتی" عرفانی نے کہا۔ اس کا اشارہ شاید اپنی ہی طرف تھا۔ لیکن بعینہٖ یہی کیفیت اس کی تھی۔ وہ غیر محسوس طریقے پر اسکے بہت قریب ہو گئی۔ اسے یہ معلوم کر کے بڑا ہی سکون سا محسوس ہوا کہ عرفانی اسکے گھر پر کچھ دن رہیں گے، جب تک وہ اپنی ماں بہنوں کو نہ بلا لیں۔

اس کا چڑچڑا پن کم ہوتا جا رہا تھا بس یہی جی چاہتا کہ دن بہت طویل ہو جائیں۔ اسکا شوہر یونہی باہر رہے اور وہ عرفانی کے پاس بیٹھی رہے۔ وہ اس کا کسقدر ہم خیال تھا۔ جب وہ باتیں کرتا تو اسے محسوس ہوتا کہ عرفانی اسے بھی پڑھ رہا ہے۔ وہ کہتا! "بغیر محبت کے انسان کیسے جیتا ہے؟" تو اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے شوہر کی شکایتیں کرتے ہوئے اپنا چہرہ اسکے سینے میں چھپا کر چیخ اٹھے۔ "بالکل ٹھیک ہے" مگر وہ ڈرتی کہ عرفانی اسے بری عورت نہ سمجھ لے اور وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتی۔

وہ کنگھی کرتی ہوتی تو عرفانی اس کے بالوں کے پیچ و خم کی تعریف بے جھجک کر جاتا۔ وہ کبھی اس کے ساتھ بازار جاتی تو نہ جانے کیسے عرفانی اس کی نظروں ہی سے پہچان جاتا کہ وہ کیا چیز پسند کر رہی ہے ــ اور نہ! ایک دم کھل کر جیسے مرجھانے لگتی۔ عرفانی اس کا آئیڈیل ہے۔ لیکن وہ شوہر والی

وہ جال میں پھنسی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ اٹھتی۔ دل کی آنچ بڑھ جاتی اور وہ اپنے جذبات کی آندھی کو دبانے کے لئے عرفانی کے آرام و آسائش پہنچانے میں اور بھی سرگرم ہو جاتی۔ اپنے آپ پر ملامت کرتی۔ اپنے آپ کو دنیا سے ڈراتی۔ لیکن دل کی آگ کم نہ ہوتی۔ عرفانی کو دیکھتے ہی اس کا جی چاہتا کہ وہ کہہ دے کہ تم میرے آئیڈیل ہو۔ اور اس دن وہ یہی کہنے والی تھی۔ ریڈیو پر وائلن بج رہا تھا اور وہ دونوں ڈرائنگ روم میں چند لمحوں سے خاموش بیٹھے تھے۔

"سنئے! آپ ——" وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ میرے آئیڈیل ہیں۔ لیکن وہ کہہ نہ سکی۔ عرفانی کی آنکھیں چند لمحوں کے لئے چمک اٹھیں۔

"جی!" اس کی آنکھوں میں بے چینی تھی۔

"آپ آپ ——" اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ "آپ شادی کر لیجئے۔" اور وہ دونوں اس غیر متوقع بات سے حیران رہ گئے۔

"کس سے؟"

"کسی سے بھی، میں کرا دوں گی آپ کی شادی۔" اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ پھر نہ جانے کیسے عرفانی اس کے قریب آ گیا۔ بہت قریب۔ اس نے اس کا کانپتا ہوا ہاتھ سہلاتے ہوئے اسے تسلی دی —— دو مہینے جو اس نے کشمکش میں گذار دیئے تھے ان کا تجزیہ کیا اور وعدہ کیا کہ وہ جس سے کہے گی اس سے وہ شادی کر لے گا۔

قربانی کا نشہ بھی بڑا تیز ہوتا ہے —— وہ اپنے آئیڈیل کو حاصل نہ کر سکی تو کیا ہوا۔ وہ اسے کامیاب زندگی بسر کرنے میں مدد دے گی۔ اس نشے کے تحت اس نے اپنی ایک پڑھی لکھی خوبصورت سہیلی کو

غزل

روش روش پر جنوں کے آگے خرد کی ظالم مقام کب تک
یہ احتیاطِ کرم کہاں تک، یہ زحمتِ گام گام کب تک
رکی سی آہیں، جھکی نگاہیں، وہی حقیقت، وہی فسانہ
یہ بندگی ہے تو بندگی کا فریب رسوائے عام کب تک
حدودِ دیر و حرم سے باہر بھی تیری نظروں کی ہے ضرورت
ترے کنائے "نہ تیرے" دھالے "تری ہلاکت نہیں تو کیا ہے"
یہی جمالِ گل و سخن ہے، تو آ چمن سے دھواں اٹھا دیں
نہ دوش طوفاں پہ آشیانہ، نہ بجلیوں پر کمند تیری
سن او نگاہیں چرانے والے! زمانہ آواز دے رہا ہے؟
نہ نور تیرا، نہ آگ تیری، رباب ٹوٹے، شراب چھوٹی،

جھکی جھکی سی نظر کہاں تک، رکا رکا سا خرام کب تک
نفس نفس میں پیام کب تک، نظر نظر میں سلام کب تک
سکوت تیرا سکوت کب تک، کلام میرا کلام کب تک
لبوں پہ صبحیں تو ہیں مسلّم، مگر سینوں میں شام کب تک
سجود میں سر جھکانے والے یہی ہے سودا تو خام کب تک
ترے سفینوں سے ساحلوں پر یہ موج کا انتقام کب تک
روش روش پر بچھے رہیں گے، یہ لالہ و گل کے دام کب تک
یہی چمن ہے، تو اس چمن میں ترے نشیمن کا نام کب تک
رہیں گی ظالم تری نگاہیں، غریق مینا و جام کب تک
یہ ذلتِ انجمن کہاں تک، یہ تہمتِ جام جام کب تک

اگر نہ برہم ہوں اہلِ محفل، تو اہلِ محفل سے شورؔ پوچھوں
کوئی بتا دے کہ میرے ہونٹھوں پہ اس کا نغمہ حرام کب تک!

شورؔ (علیگ)

عرفانی کے لئے منتخب کیا اور کوشش کرکے ان دونوں کی شادی کرادی۔
اب وہ خواہ مخواہ اپنی سہیلی سے جلنے لگی اندر ہی اندر —— اسے اپنی سہیلی سے حسد ہوتا۔ اس شادی کو وہ اپنی غلطی سمجھتی۔ اس کے باوجود کہ عرفانی اب بھی اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ بسر کرتا تھا —— وہ سوچتی کہ سماج کے بندھن ایسے کیوں ہیں کہ وہ اپنی پسند کی چیز نہیں حاصل کرسکتی ——

لیکن ایک دن اسکے دل کی یہ آگ اس طرح بجھ گئی جیسے چراغ کو کسی نے پھونک ماردی ہو۔

اس کی سہیلی بستر پر پڑی رو رہی تھی کہ وہ پہنچ گئی اور جیسے لڑکھڑا کر رہ گئی۔

اس کے آئیڈیل کی بیوی بھی کیا اسی طرح تکیوں میں منہ چھپا کر رو سکتی ہے؟

"فاطمہ!" اس نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پکارا۔

"کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو میری جان"

"نسرین!" وہ زور سے ہچکیاں لینے لگی۔

"آخر فاطمہ کچھ کہو گی بھی" وہ بیتابی سے پوچھنے لگی۔

"کیا کہوں میری تو قسمت پھوٹ گئی اس کنگال سے۔ اسے میرے جذبات کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ بس ہر وقت پیسہ کمانے کی فکر میں کہانیاں لکھا کرتا ہے۔ رات کے دو دو بجے تک میرے سر پر لائٹ رکھتا ہے اور میں بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی ہوں۔ آخر کوئی کب تک صبر کرے۔ اگر وہ مجھے آرام نہیں دے سکتا تو کیا محبت بھی نہیں دے سکتا؟" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

فاطمہ رو رہی تھی۔ اسکے آئیڈیل کی بیوی۔ وہ بھی اس کی طرح پیاسی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا عورت کو صرف محبوبہ ہونا چاہیئے تھا بیوی نہیں؟۔

کچھ ایران کے بارے میں :

—— بقیہ صفحہ ۱۴

"آزادی ذریعۂ نجات اسوقت ہوسکتی ہے جب اسکا رخ مستقبل کی طرف ہو نہ کہ ماضی کی طرف، عمل کی طرف نہ کہ یاد ماضی کی طرف، جوش اور انقلاب کی طرف نہ کہ احتیاط اور سلامتی کی طرف"

بیشک جوش اور انقلاب۔ انقلاب سے زیادہ جوش۔ ایران میں انقلاب تو ہو رہا ہے — باطنی نہ کہ ظاہری۔ اب ایران اڑان کے لئے تیار ہے:

غزل

وفائیں جتا کر انہیں کیا بلائیں!
وہ مختارِ مطلق ہیں آئیں نہ آئیں!

نئی شان ہر آن ہی اللہ اللہ!
دو عالم بہ دامن ہیں انکی ادائیں

شب و روز پھیرا ہی جنکی گلی میں
جھلک ہی کہیں ان کی ہم دیکھ پائیں!

ادھر کیں اُدھر پھیر لیں مست آنکھیں
پلاتے پلاتے مجھے۔ رک نہ جائیں

بھلائیں اور ان کی توجہ کا مرکز
بھری بزم میں شوق سے وہ ستائیں

یہ دل مجھکو منظور ہے ان کی خاطر
کریں جو بھی چاہیں وہ اپنی چلائیں

میسر ہے جب ہم کو ان کی حضوری
امیں! کیوں خوشی کے ترانے نہ گائیں

امین حزیں

ضروری

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر دیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔

"نقد و نظر" کے سلسلے میں ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر آجکل میں وصول ہونی چاہئیں ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا جائیگا۔

—— (ادارہ)

THE NEW Rexona MEDICATED SOAP

Rexona

اب جھاگ سے لبریز خوشبو سے معطر

مرد برائے صحت جلد ریکسونا استعمال کرتے ہیں

ایسی رائے جلدی قائم نہ کیجئے کہ ریکسونا صرف مستورات ہی کی خوبصورتی کیلئے ہے۔ یہ ٹائیلیٹ صابن ہر اس فرد و بشر کیلئے نہایت مفید ہے جو کہ صحت جلد کا خواہشمند ہو۔ یہ ایک نہایت عمدہ قسم کا صابن ہے جو کہ جسم کو قوت تر و تازگی اور راحت بخشتا ہے اس کے استعمال کا لطف خاصکر مرد ہی اٹھاتے ہیں

سب سے بڑا فائدہ اس عمدہ سبز اور زرد جھاگ پیدا کرنیوالے صابن کا یہ ہے کہ اس میں حفظان صحت کے اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مضر جراثیم کو نیست و نابود کر دینے والی. بدن کو فرحت دینے والی کیڈائل نام دوائی آمیزش کی گئی ہے جیسے ریکسونا کی بہت جلدی اور بہت پیدا ہونیوالی جھاگ جلد کے ہر مسام تک ہم پہنچاتی ہے اور خاصکر ان اجزا میں جہاں عام طور پر جلد کو ضرب پہنچانیوالی مہلک بیماریاں یعنی کھجلی وغیرہ اور بدزیب داغ پیدا ہونے لگجاتے ہیں اسطرح سے آپکا سارا بدن گندی بیماریوں سے بچا رہتا ہے اور جسم تر و تازہ اور ٹھنڈا رہتا ہے

آپ اس سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر آسانی اور بہت جلدی ریکسونا کے باقاعدہ استعمال سے جلد کی صحت درست کی جاسکتی ہے اور اسے ہر طرح سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے ایسے سبز اور زرد جھاگ دینے والے ادویات سے مرکب صابن کو آج ہی سے فوراً عمل میں لائیں اور اس کے استعمال کو جاری رکھیں۔

نوٹ:۔ یہ ایک نقطہ خاص قابل ذکر ہے کہ جلد کی صحت پر ہی خوبصورتی کا انحصار ہے اور ہر مرد کو اپنے بدن کی جلد کو عمدہ اور محفوظ رکھنے کا اتنا ہی فخر حاصل ہے جو کہ ایک عورت کو۔

ریکسونا بچے کیلئے:۔ یہی ریکسونا جو کہ باپ استعمال کرے بچہ بھی کرے۔ اس کی جھاگ بدن کے مضر جراثیم سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہنستے بچوں کو غسل کراتے وقت ریکسونا کا استعمال فرمائیں تاکہ وہ بچے کے نازک جلد کو ٹھنڈک پہونچائے اور اسے ہر طرح کی کھجلی و خارش و سوزش سے بچائے رکھے۔

★ کیڈائل ریکسونا میں ایک خاص قسم کی جراثیم کش۔ آرام دہ تقویت دہ ادویات کا مرکب ہے جو کہ جلد کی صحت کو برقرار رکھنے میں اپنا خاص اثر رکھتا ہے کیڈائل کے جلد کو ٹھنڈا اور مہلک بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے فوائد کو بڑے بڑے ماہران سائنس نے تسلیم فرمایا ہے اور اس کے ہر روز کے استعمال کو ترجیح دی ہے۔

ریکسونا مرہم کا استعمال کیجئے:۔ درد دوں. سوزش. پھوڑے. داد. ناسور. مہاسے. چنبلے. جلن اور دوسری تمام جلد کی امراض کیلئے. گو مال کی کمی ہے مگر پھر بھی کوئی ڈبیہ بہت سے تاجروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

REXONA OINTMENT

RP. 28-23 UD

REXONA PROPRIETARY LIMITED

وسط ایشیا کے چند فنکار

(۱۳)

ابرار ہدایت
ایک ازبک اداکار

ابرار ایک ازبک ایکٹر ہے اور اسکی ڈرامائی صناعت کے اعتراف میں سودیٹ یونین کا خطاب "صناع عوام" ملا ہوا ہے۔ ایک تبصرہ نگار نے لکھا ہے کہ ابرار صحیح معنوں میں عوام کا بیٹا ہے۔ اور تاشقند کے حمزہ تھیٹر میں ابرار کا اوتھیلو اور ہملیٹ پیش کرنا ازبکستان کی صناعتی زندگی کا ایک خاص اور اہم واقعہ تھا۔ ابرار کا صناعانہ جوہر ان ڈراموں کے پیش کرنے ہی سے منظر عام پر آیا۔

ابرار کا باپ تاشقند میں معاذی کا کام کرتا تھا۔ وہ ایک زندہ دل اور خوش باش آدمی تھا۔ اسکا دستور تھا کہ اپنا کام ختم کر کے چائے خانے میں جا بیٹھتا اور وہاں "اسکیا" (ASKIA) یعنی ازبک پھبتی یا ضلع جگت کا کھیل ہی اس کی تفریح کا مشغلہ تھا۔ وہ اس فن میں استاد مانا جاتا تھا۔ داد بھی دل کھول کر ملتی تھی اور داد ملنے سے اسکی طبیعت اور بھی جولانی پر آتی تھی۔ چائے خانے میں بیٹھنے والے خورد و نوش سے اس کی تواضع کرتے اور وہ سب کا غم غلط کیا کرتا۔

نو سال کی عمر ہوئی تو ابرار نے باپ سے کہا کہ "میں پڑھنے جاؤنگا؟" نفرہ باز باپ مسکرایا اور کہنے لگا:-

"کیوں نہیں بیٹا! مگر یہ کام جبھی ہو سکتا ہے کہ مجھے کوئی چھوٹا موٹا دفینہ ملے یا تمہارا استاد فیس طلب نہ کرے۔"

ظاہر ہے کہ دونوں باتیں انہونی تھیں۔ چنانچہ ابرار نے خود ہی راہ نکالی۔ اس نے ایک امیر آدمی خواجہ خاں کے ہاں جھاڑ دینے، اٹھایا دھری اور مویشیوں کی گہوس کی نوکری کر لی۔ اسے دو روبل مہینہ ملتا تھا، وہی وہ اپنے استاد کو دیدیتا تھا۔ اس قسم کی نوکری کر کے ابرار پڑھنے کے لئے وقت بھی نکال لیتا تھا۔ یہ نوکری چھوٹ جانے کے بعد وہ ایسی ہی دوسری نوکریاں کرتا، استاد کا مہینہ دیتا اور پڑھتا رہا۔

۱۹۱۸ء میں پرانے تاشقند میں سب سے پہلا ازبک تھیٹر "توران" وجود میں آیا۔ ورنہ اس سے پہلے ازبک لوگ تھیٹر کے نام سے بھی واقف نہ تھے۔ اس ذیل میں بیت بازی، سوانگ بھرنا، مداری کے کھیل اور کٹھ پتلی کے تماشے کا رواج تھا۔

ایک دن ایک خاص واقعہ پیش آیا جس نے ابرار کے مستقبل پر مہر لگادی۔ ابرار اسوقت ڈراما ایکٹنگ کی ایک کلاس میں شریک تھا جسے توران تھیٹر کے ایکٹر وغیرہ تعلیم دیتے تھے۔ تھیٹر کا منیجر ایک ڈراما "ضحاک ماران" پیش کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے تھیٹر کے منظر کے لئے کچھ آدمیوں کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہیں ان ایکٹروں سے کہا جو اس کلاس کو تعلیم دیتے تھے، اور انہوں نے چند لڑکے منتخب کئے جن میں ایک ابرار بھی تھا۔

اس طرح ابرار پہلی بار صحیح معنوں میں اسٹیج پر آیا۔ تھیٹر کی طرف سے اسے ایک چھ صفحے کا رسالہ دیا گیا۔ اس میں اسکا پارٹ درج تھا۔ یہ پارٹ ابرار نے کوئی غلطی کئے بغیر نہایت خوبی سے ادا کیا۔ تھیٹر کے منیجر الیفور نے جسے اب ازبک جمہوریہ کی طرف سے "صناع عوام" کا خطاب بھی حاصل ہے۔ ابرار کا کام دیکھکر اس کو تھیٹر میں مستقل کر لیا۔

کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ابرار کا تعلق ازبک اسٹیٹ ڈراما تھیٹر سے ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں سول وار شروع ہو گئی۔ اسوقت ابرار ایک ایکٹر بھی تھا اور سرخ سپاہی بھی۔ ترکمان فوجی افسر اعلیٰ نے ابرار کو ایکٹروں کی ایک جماعت کے ساتھ فرغانہ کے محاذ پر بھیجدیا جہاں اس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ ابرار اور اس کے ساتھی سرخ فوج اور چھاپہ مار دستوں کے لئے ڈرامے کھیلتے اور وقتاً فوقتاً انقلاب دشمن بسماچیوں سے بھڑپ بھی لے لیتے تھے۔

ایک موقعے پر ابرار کی پارٹی ایک ڈراما کر رہی تھی اور یہ ڈراما جنگ کے ہی موضوع پر تھا۔ اس میں بندوقیں وغیرہ بھی چلتی تھیں اور نعرہ وغیرہ بھی لگائے جاتے تھے۔ تماشہ ہو ہی رہا تھا کہ اچانک بندوقوں کی آوازیں بہت زیادہ ہو گئیں اور ساتھ ہی "بسماچی!" کا نعرہ بھی سنائی دیا۔ تماشائی اور ایکٹر دوڑ پڑے اور دغاباز بسماچیوں سے جنگ میں مصروف ہو گئے۔ اسوقت طرفین کے اتفاق سے عارضی طور پر جنگ ملتوی کر دی گئی تھی اور قلعے کی حفاظت کے لئے ایک مختصر دستہ مقرر کر دیا گیا تھا مگر مضامین بیگ کی سرکردگی میں قلعے پر اسوقت حملہ کر دیا گیا۔ جب سرخ سپاہی ڈراما دیکھنے میں مشغول تھے۔

ابرار اسوقت ایک بے (زمیندار) کا پارٹ کر رہا اور اسی طبقے کا لباس فاخرہ پہنے تھا۔ سر پر امیرانہ دستار اور بر میں ریشمی عبا کے ساتھ موہنہ پر ایک ریش دراز بھی لگی ہوئی تھی۔ ابرار جب اسٹیج کے پیچھے پہنچا تو ایک قسمائی دو عورتوں کو دھمکا کر ان کا زیور اتروا رہا تھا۔ عورتوں نے ابرار کو دیکھا تو پناہ کی خاطر اسکی جانب لپکیں۔ وہ بسماش ابرار کے لباس اور میک اپ کے دھوکے میں آ گیا اور اسے اپنا حامی تصور

ل۔ احمد

کرکے پوچھنے لگا :۔

"باواجان، سرخ سپاہی کدھر ہیں ؟"

یہ ڈرامائی موقعہ ابرار کے لئے مفت کھودینا دشوار تھا۔ اس نے ایکدم انداز سے عبا کا گریبان کھول دیا اور اندر سے سرخ سپاہی کی وردی دکھا کر دبنگ آواز میں بولا :۔

"کتے ! ایک تو تیرے سامنے کھڑا ہے !"

بسماش نے خنجر سونت لیا مگر ابرار کی انگلیاں تمنچے کے گھوڑے پر پہلے حرکت میں آگئیں۔

سول وار ختم ہوگئی تو ابرار پھر اپنی تعلیم اور مطالعے میں منہمک ہوگیا۔ اسکی بڑی خواہش تھی کہ وہ ماسکو کی تھیٹریکی صناعت کے ماہروں سے ملے۔ اسکی یہ خواہش ۲۲ء میں پوری ہوئی اور وہ ماسکو کے ازبک ڈرامائی اسٹوڈیو میں داخل کرلیا گیا۔ وہاں اس نے تین سال تعلیم پائی اور روسی تھیٹری صناعت کے ماہر پیشکار (پروڈیوسر) ہیٹر اوا یکٹر اس متمار زادے کو فن ایکٹری کے راز بتاتے سکھاتے رہے۔ اور حق یہ ہے کہ ابرار نے اپنے استادوں کا نام روشن کیا۔

تعلیم مکمل کرکے جب وہ اپنے وطن تاشقند واپس پہنچا تو بہت سی ازبک اور غیر ملکی ڈراموں میں ہیرو کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ جن کلاسیکی ڈراموں کی پیشکش میں ابرار نے نام پیدا کیا۔ ان میں گوگول کا "انسپکٹر جنرل" اور غازی کا "شہزادی توران داد" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حمزہ تھیٹر نے ۳۵ء میں تھیٹر کی پندرھویں سالگرہ پر شکسپیر کا ڈراما ہملیٹ پیش کرنا طے کیا تو ہملیٹ کا کردار ابرار کو دیا گیا۔ یہ واقعہ ابرار کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ وہ فطرتاً جوشمند واقع ہوا ہے۔ وہ اپنا پارٹ سمجھنے میں ہمہ تن منہمک ہوگیا۔ گھر میں اور گھر سے باہر سونی سڑکوں اور راستوں پر اپنا پارٹ دھراتا اور اپنے کردار کی فطرت کی گہرائیوں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کی طبیعت کی نزاکتیں سمجھنے کی جستجو میں منہمک تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ اسٹیج پر کو ج کے کونے میں پڑھتے پڑھتے سو گیا ہے اور صبح کو لوگوں نے آکر اٹھایا ہے۔

ابرار کی اسٹیج کی زندگی میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کی بیوی سارہ ایشان تورائی بھی ایکٹریس ہے اور اسی تھیٹر میں کام کرتی ہے۔ بالعموم یہ دونوں ساتھ کام کرتے ہیں اور ہیرو وہیروئین کے کردار سمجھنے میں آپس میں بحث و تکرار بھی کرلیتے ہیں۔

اس کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابرار ہملیٹ اور اوتھیلو کو ایک نئی کرداری قوت دیکر اور اہانات لبریز شخصیت بنا کر پیش کرسکا۔ اس کے بعد ابرار کی صناعت کا سکہ جم گیا اور مان لیا گیا کہ اسکا صناعی مستقبل نہایت درخشاں ہے۔

تاشقند کے حمزہ تھیٹر کو ماسکو سے دعوت آئی اور ماسکو میں ابرار نے شکسپیر کے مشہور عالم کرداروں کو جب اپنی تعبیر اور تفہیم کے ساتھ پیش کیا تو ماسکو کے نقادان فن اس کے کمال کی داد دینے میں سرخ زبان تھے۔

اوتھیلو کے کردار کا ایکٹنگ ابرار کا بانوواں ہیرو ایکٹنگ تھا۔ اس کردار کو پیش کرنے میں خود ابرار کی منور فطرت اور شستگی طبیعت سمو گئے تھے۔

اس پیشکش کی کامیابی میں ازبکستان کے محبوب ترین شاعر غفور غلام کا بھی ہاتھ تھا۔ ازبک زبان میں شکسپیر کو منتقل کرنے میں غفور غلام نے بھی اپنا ادبی کمال دکھا دیا ہے۔

جس رات اوتھیلو پہلی مرتبہ پیش کیا جانے والا تھا۔ اس دن تاشقندی اخبار کے ایک نمائندے نے ابرار سے ملاقات کی تو ابرار نے اوتھیلو کے کردار کی تعبیر کے ذکر میں بتایا کہ :۔

"میرے خیال میں اوتھیلو کی فطرت کو سمجھنے کی کنجی خود اوتھیلو نے تبادی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ میری بیوی حسین ہے، کھانا عمدہ کھلاتی ہے، صحبت احباب کی شائق ہے، گفتگو میں آزاد ہے، گاتی خوب ہے، کھیلتی خوب ہے اور رقص بھی خوب کرتی ہے، یہ باتیں سنکر میرے اندر رقابت کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ بلکہ یہی باتیں اس کی باعصمتی کی ضامن بن سکتی ہیں"۔ دوسرے موقعے پر اوتھیلو کا یہ قول کہ شک کرنے سے پہلے میں دیکھنا چاہونگا اور شک ثبوت کے ساتھ کروں گا اور جب ثابت ہوجائے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ محبت رہے گی نہ رشک و رقابت۔

"بھروسے میں دغا پانا اور بے آبرو ہو جانا، یہ دو ایسی باتیں ہیں جنکا ڈنک موت کی سوئی ہی نکال سکتی ہے"۔

"رچرڈ بوربج شکسپیر کا دوست بھی تھا اور اس کے ڈراموں کا پہلا ہیرو ایکٹر بھی۔ اس نے اوتھیلو کو ایک غمزدہ مور کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ میں نے بھی اسی نوعیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے"۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ابرار ہدایت اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب ہوا۔

رات میں آسمان کے نیلے پس منظر پر دو پرچھائیاں نظر آتی ہیں :۔ ایک کے جسم پر چست شلوکہ، پاؤں میں لانبے چرمی بوٹ اور سر پر ایک ہیٹ ہے جس میں ایک پر بھی ٹنکا ہوا ہے۔ یہ آئیگو ہے۔ دوسری پرچھائیں ڈھیلی ڈھالی عبا پہنے اور عمامہ باندھے ہے، یہ اوتھیلو ہے۔ یہ دونوں زینے پر سے آہستہ آہستہ اتر رہے ہیں۔ اوتھیلو کا انداز پرسکون اور اعتماد انگیز ہے، جیسے کوئی فتحمند فوجی کا ہوتا ہے۔ اس کے اسوقت کے انداز میں ایسی کوئی بات یا اشارہ نہیں ملتا جس سے پتا چلے کہ تھوڑی دیر میں غیظ و غضب کا ایک طوفان

اُبل پڑنے والا ہے۔ انکی نظریں ڈیسڈیمونا کے مسکن پر قائم ہو جاتی ہیں، اور ان نظروں سے نرمی و لطافت اور احسان و محبت ٹپکی پڑ رہی ہے۔ اوتھیلو آئیگو سے باتیں کر رہا ہے مگر محسوس یہ ہوتا ہے کہ اس کی مخاطب صحیح ڈیسڈیمونا ہے، حالانکہ وہ اسوقت اس کی آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔

اسی سین میں کاسیو اسکو بتاتا ہے کہ ڈیوک نے پے بہ پے بارہ پیامی بھیجے ہیں۔ یہ سنکر اوتھیلو کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آجاتی ہے اس کے چہرے بہرے سے کسی قسم کی فکر یا پریشانی کا قطعی اظہار نہیں ہوتا۔ انداز سے وہ یہ سوچتا معلوم ہوتا ہے کہ:۔

"بریانیٹو سے میرا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ وہ کیسی ہی کینہ وری سے کام لے، میں نے سگنوری کی جو خدمت کی ہے وہ اسکی بدگوئی کا مونہہ بند کردے گی!؟"

ان موقعوں پر ابرار نے اپنے ایکٹنگ سے اوتھیلو کے کردار کی نئی تعبیر کی ہے۔ اس وقت جب ابرار کا اوتھیلو بریانیٹو کے نوکروں اور اپنے ساتھیوں کی تکرار رد کردیتا ہے تو اوتھیلو کی آواز میں ایک عجیب طاقت پوشیدہ محسوس ہوتی ہے، وہ ان سے کہتا ہے:۔

"ہاں، اپنی تلواریں طلبند رکھو تاکہ شبنم انہیں زنگ آلود کردے" یہ موقعہ ہوتا ہے جب ابرار تماشائیوں کے دل میں اس مور کے کردار کی عظمت بٹھا دیتا ہے۔

پھر جب اوتھیلو سینیٹ کے سامنے تقریر کرتا ہے تو ابرار کی شخصیت کا جادو ہر تماشائی کو محسوس ہونے لگتا ہے اور ابرار کا اوتھیلو ڈیسڈیمونا سے اپنی محبت کی داستان سناتا ہے تو یقین ہوجاتا ہے کہ وہ محبت کی ان گھڑیوں کو پھر سے جی رہا ہے اور جب وہ ختم کرتا ہے تو اس کے آخری لفظوں میں ظفرمندی کی گونج ہوتی ہے، مردانہ وار عزم کی کھنک ہوتی ہے۔

اور پھر جب ڈیسڈیمونا اپنے دوگانہ فرض کی طرف اشارہ کرکے حق شوہری کو مرجح بتاتی ہے تو ابرار کے اوتھیلو کا احساس فخر و ظفر اس کے سیاہ چہرے کو دمکا دیتا ہے۔ اس موقعہ پر ابرار کا اظہار اسدرجہ حقیقی و فطری ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اس مور کی سادہ فطرتی اور خلوص کا معتقد ہوجاتا ہے۔ ابرار کا اوتھیلو صرف محبت کرنے والا ہی نہیں بلکہ ایک بھروسا کرنے والا اور سادہ فطرت انسان بھی ہے۔

اوتھیلو کی تشدد پسند فطرت، ابرار کی تعبیر کے مطابق، دوسرے ایکٹ میں ظاہر ہوتی ہے۔

محل کے اندر سے خطرے کی گھنٹی بجتی ہے اور اوتھیلو اندر داخل ہوتا ہے تو کہتا ہے "کیا معاملہ ہے؟" اس کے یہ لفظ سکون آمیز سوال کے لفظ ہیں۔ لیکن ابرار کا اوتھیلو کمرے کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی پر غضب ہوچکا ہے۔ اس کے اندر جو سکون و سنجیدگی تھی وہ گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی غائب ہوچکی ہے۔

چنانچہ وہ جب کمرے میں داخل ہوتا ہے تو اس کے قدم تیزی سے اُٹھتے اور بھاری پڑتے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے، کہ سکون میں خلل ڈالنے والا ضرور سزا پائے گا۔

ابرار کی یہ تعبیر کہ اوتھیلو اچانک طور پر نہایت پر غضب ہوسکتا ہے اور کاسیو پر اس کے الطاف و عنایات دفعتاً بھلائے جا سکتے ہیں۔ اوتھیلو کے کردار کا نیا پہلو ہے۔

اسی ڈرامے کا تیسرا ایکٹ ایک ایکٹر کے لئے مشکل ترین ایکٹ ہے۔ اس ایکٹ میں شک و یقین کی معرکہ آرائی ہوتی ہے اور اوتھیلو فریب و اتہام کی عیارانہ چال میں آجاتا ہے۔ یہ مشکل ترین ایکٹ ہی ابرار کی کامیابی و شہرت کا سبب بنتا ہے۔

آئیگو بظاہر معصومانہ انداز میں ڈیسڈیمونا سے کاسیو کی محبت کی طرف اشارہ کرتا ہے تو ابرار کا اوتھیلو بے چین ہوجاتا ہے۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے لیکن اوتھیلو کی صحیح فطرت غصے پر غالب آجاتی ہے اور وہ مزاحی انداز میں باتیں کرنے لگتا ہے۔ اگرچہ اس کے ہاتوں کا نچلا نہ رہنا اوتھیلو کے اندرونی ہیجان کی علامت ہے۔ وہ نہایت اعتماد آفریں لہجے میں سوال کرتا ہے:۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں رشک و رقابت کی زندگی اختیار کروں گا؟"

لیکن رفتہ رفتہ آئیگو اوتھیلو کے اندر اندھی قسم کے جذبۂ رقابت کو ابھار دیتا ہے اور ابرار کا اوتھیلو بغلوں میں ہات دبا کر آئیگو پر نظر جمائے ہوئے ٹہلنے لگتا ہے۔ ایک اُڑتی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر چھا جاتی ہے۔ کیونکہ اس کو یقین نہیں آتا کہ اس کی بیوی بیوفائی کرے گی۔ لیکن عقل و دلیل کا یہ اظہار آخری اظہار ہوتا ہے۔ رشک کا احساس شدید تر ہوتا جاتا اور عقل کی گرفت ڈھیلی پڑتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے اندر ایک طوفان بپا ہوجاتا ہے۔ پھر جب وہ اپنے ہاتوں کو دیکھکر کہتا ہے کہ "میں کالا ہوں" تو لہجے سے کمتری و فروتنی کا احساس ٹپکتا ہے۔ یہ گویا اعتراف گناہ تھا۔ وہ پھر سوچتا ہے کہ اس بے وفائی کا کوئی جواز سمجھ میں آجائے۔ وہ تماشائیوں کی طرف پیٹھ کرکے خود کلامی (آپ ہی آپ باتیں کرنا) کرنے لگتا ہے تو اس کے خیالات تلخ اور محسوسات عقوبت ناک ہوتے ہیں۔ جب اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے تو پہلے رنج و ملال کا اظہار ہوتا ہے اور پھر اچانک غیظ و غضب کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ اور بالآخر یہ شدید قسم کی روحی اذیت اسے اپنی قوت کا علم و احساس کرادیتی ہے:۔ یعنی وہ ایک عزم کرلیتا ہے۔ یہ عزم ایک ایسا بوجھ ہے کہ اسکا سر کوچ کے تکئے پر ٹک جاتا ہے۔

ڈلیسٹر یونا سے گفتگو کرنے میں ابرار کے اوتھیلو کا ایک نیا وصف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیوی کی بیوفائی کا صدمہ ایسے مضبوط آدمی کو بالکل پامال دل شکستہ بنا دیتا ہے۔ بیوی سے سوال جواب کرنے میں معلوم ہوتا ہے کہ اوتھیلو اس دردناک جستجو میں ہے کہ بیوی الزام سے انکار کرے لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ اپنے سوا دنیا کی قوت سے ہی ڈلیسٹر یونا کو دیوار سے بھڑا کر پیس دینا بھی چاہتا ہے۔

آئیگو کے الفاظ میں زہر ملا ڈنک تھا جسکے اثر نے اوتھیلو کے غیظ و غضب کو اس نقطے پر پہنچا دیا ہے کہ اوتھیلو غافل یا بے حواس ہو جاتا ہے۔

پیش کشی کی پہلی رات کو جب ابرار اسطرح غافل ہو کر گرا تو اسکا ہاتھ بے ڈھب طور پر اسکے بدن کے نیچے دب گیا۔ یہ ایکٹنگ اسدرجہ فطری و حقیقی تھا کہ تھیٹر کا ڈاکٹر جو تماشائیوں میں بیٹھا تھا اسنے سمجھ لیا کہ ابرار وفور جذبات کی تاب نہ لا سکا اور اسکی موت واقع ہو گئی۔ چنانچہ وہ بے تحاشا دوڑ کر اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے۔

ابرار کا اوتھیلو اس ٹریجڈی کے آخری حصے میں اتنا بے حال و شکستہ پر ہو جاتا ہے کہ آنکھوں میں چمک نہیں رہتی۔ آواز بھرا جاتی ہے، ہات پانوں کی حرکات سست اور ڈھیلی پڑ جاتی ہیں اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ اسکا آخر وقت ہے۔

تھیٹر سے نکلتا ہوا تماشائی اوتھیلو کی ٹریجڈی کی جو تعبیر از بکستانی صناع عوام ابرار نے کی ہے اسکے اندر کھویا ہوا ہوتا ہے۔

تفسیر حقانی اردو کامل آٹھ جلد

مصنفہ

فاضل اجل علامہ مولانا عبد الحق صاحب حقانی مفسر دہلوی

آج تک اردو زبان میں ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس عام فہم تفسیر کی خوبیاں مختصر طور پر یہ ہیں کہ عوام الناس، طلباء، علماء، صوفیائے کرام، غرض ہر طبقے کے لوگ اس سے یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ تفسیر مع اصل متن قرآن مجید وہ مستند اور معرکتہ آلآرا مشہور تصنیف ہے جو پچاس سال سے اسلامی دنیا میں مقبول خاص و عام ہے۔ بچے بوڑھے۔ جوان۔ مرد۔ عورتیں اس کے مطلب خیز مضامین سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تفسیر اردو، عام فہم نہایت سلیس و بامحاورہ روایات سے ہے۔

حوالہ کتب۔ ربط آیات، ترکیب، شان نزول ساتھ ساتھ قصص اور واقعات جملہ مسائل کے سب باتیں اس تفسیر کلام پاک میں درج ہیں۔

یہ تفسیر عرصے سے نایاب تھی اور تشنگان علم کے بے پناہ اصرار پر اس زمانۂ ناسازگار میں جبکہ کاغذ۔ سیاہی اور اشاعت کتب کی تمام دیگر ضروریات بے حد مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔ اسکا نواں ایڈیشن بہت مختصر تعداد میں شائع کیا گیا ہے۔

کامل آٹھ جلدیں کوئی اڑھائی ہزار (۲۵۰۰) صفحات پر مشتمل ہیں

ہر جلد پر علاوہ خوبصورت مضبوط ٹائیٹل ہے۔

قیمت کامل آٹھ حصے بے جلد پچیس روپے ۔۔۔ قیمت کامل آٹھ حصے مجلد اکتیس روپے

ہم اسلامی و ادبی کتب۔ قرآن مجید اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں۔ فہرست مفت طلب فرمائیے۔

ملنے کا پتہ:- **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کشمیری بازار۔ لاہور**

اُردو تنقید کا پس منظر

ابو اللیث صدیقی

آرٹ مہذب انسانوں کے اجتماعی فعل کا نام ہے خواہ اس کا اظہار نقش و نگار کی صورت میں ہو یا صوت و نغمہ کے پردہ میں، اس لئے آرٹسٹ یا فنکار اپنی فنی تشکیل کے لئے اپنی ذات کے علاوہ کسی حد تک دوسرے اپنے جیسے انسانوں کے وجود کا محتاج ہے جو اس کے فن کو دیکھیں اور سمجھیں، ان کی تعریف و تحسین سے اس کی ہمت بڑھتی ہے، کام کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ ہوتا ہے اور فن کی معراج تک رسائی کا ولولہ باقی رہتا ہے۔ اگر اس کے تخلیق کئے ہوئے نمونوں میں کچھ خامی ہوتی ہے تو تنقید و تبصرہ اسے اپنی اصلاح اور آئندہ عادت پر مائل کرتا ہے۔ اس طرح ناقد کا وجود آرٹ کی ترقی کے لئے ہمیشہ ضروری ہے۔ قدیم تاریخ سے صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ اگر فن کار یا آرٹسٹ کے کام میں دلچسپی لینے والے اور اسے اچھا سمجھنے والے موجود نہ ہوتے تو یقیناً وہ آرٹسٹ کو جماعت کا عضو معطل سمجھ کر زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کر دیتے کیونکہ ترقی کے اس ابتدائی زمانہ میں کسی بیکار چیز کے رہنے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔

اس وقت ہمیں آرٹ یا فن کے صرف ایک شعبہ یعنی شعر و ادب اور اس کی تنقید سے بحث ہے۔ ہر سوسائٹی کا ادب اس کے خاص رجحانات اور زندگی کے متعلق اس کے خاص تصورات کا آئینہ دار ہوتا ہے کیونکہ شاعر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا اور مستقبل کو خود متاثر کرتا ہے۔ ناقد بھی اسی ماحول میں آنکھ کھولتا ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں بھی اسی ماحول میں بیدار ہوتی ہیں۔ زندگی اور اس کے ساتھ شعر و ادب کی قدریں کچھ تو اسے ورثہ میں ملتی ہیں اور کچھ خارجی اور داخلی اثرات کے ماتحت خود قائم کرتا ہے لیکن ماحول کا نقش اس کے ہر تصور پر اپنی مہر لگا دیتا ہے اس لئے جس طرح کسی ادب کا مطالعہ بغیر اس عہد کے ذہنی اور سماجی پس منظر کے پیش نظر ناقص اور نامکمل رہتا ہے، اسی طرح تنقید کے تصورات، خاص اقدار، اور تنقید کی ارتقا کے مسائل بغیر اس پس منظر کے بیان نہیں کئے جا سکتے اس لئے اردو تنقید کا جائزہ لینے والے کے لئے اس عہد کی سماجی حالت، شخصی حکومت اور اس کا اثر، سیاسی انقلابات اور ان کے اثرات، خاص حالات میں خاص اصناف کی ترقی کے اسباب کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

آئیے سب سے پہلے سماجی حالات کا جائزہ لیجئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تو ایران و افغانستان سے آنے والے امیروں اور لشکریوں نے اپنے سماجی تعلقات اسی ملک کے باشندوں سے استوار کر لئے۔ یہیں وہ اپنا وطن بنا کر آباد ہوئے اور شادی بیاہ کر کے ایک ایسی نسل تیار کی جو ہندلمانی (INDO-MUSLIM) تھی۔ یہ آمیزش و آویزش ان کی صورت شکل، تراش خراش، وضع قطع، چال ڈھال غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اپنا رنگ دکھانے لگی لیکن ان تعلقات کی سب سے مبارک یادگار یہی اردو زبان ہے جو خاص ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تمدنی ربط و ارتباط اور آپس کی لین دین کے باعث ظہور میں آئی، اور پہلے پہل ہندوی یا ہندی کہلائی، دکن پہنچ کر اس نے دکھنی نام پایا۔ پھر ریختہ کا خطاب ملا۔ دار الخلافہ کی زبان قرار پائی تو زبان اردوئے معلے کا معزز لقب نصیب ہوا۔ زمانۂ قدیم سے ہندوستانی کے نام سے بھی پکاری گئی۔ یہ سارا زمانہ یہیں گذرا۔ اور یہ تمام نام اسی ملک میں مختلف علاقوں اور زمانوں میں اسے ملے غرض اس خالص ملکی زبان نے رفتہ رفتہ مستقل حیثیت اختیار کر لی اور اس میں شعر و ادب کے ابتدائی نمونے پیدا ہونے لگے۔

اس مشترک ہندلمانی (INDO-MUSLIM) تمدن میں جس کی یادگار یہ زبان ہے ایرانی عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ اگرچہ ایرانی اور ہندی دونوں آریا قوم تھے اور دونوں کی زبانیں اپنے ماخذ میں ایک ہی زبان کا پتہ دیتی ہیں لیکن جب دونوں ملے تو مدت کی جدائی اور خاص ملکی حالات اور اثرات نے دونوں کا رنگ روپ بالکل بدل دیا تھا۔ پہلے کچھ دنوں اجنبیت قائم رہی لیکن جب دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اور رشتہ استوار ہو گیا تو مغائرت کا پردہ درمیان سے اٹھ گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا اثر قبول کیا لیکن حاکم کا اثر محکوم پر زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے ایرانی عناصر نے زیادہ عمل دخل پایا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے اور آداب معاشرت کے دوسرے شعبوں میں ایرانی تمدن زیادہ ترقی کر چکا تھا۔ اس لئے نوواردین نے جو کچھ ہندوستان سے لیا اس کے بدلہ میں اس سے زیادہ ادا کر دیا۔ فارسی شعر و ادب کی ترقی کا ایک خاص سبب اس ماحول میں یہ ہوا کہ ایران میں سیاسی انقلابات کے باعث شعرا اور ادیب ہندوستانی مغلوں کے دربار میں پناہ گزین ہوئے۔ ان کے شعر و سخن سے محفلیں گرم ہوئیں۔ اس وقت دیسی زبانیں زیادہ سے زیادہ مقامی بولیوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور شعر و ادب کے سرمایہ سے محروم تھیں۔ قدرتی طور پر عوام بھی اس نئی طرز کی شاعری اور ادب کی طرف مائل ہوئے۔ اسی ماحول میں ایسے شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے ایران کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی لیکن ان کا کلام ہر اعتبار سے اساتذۂ ایران کے ہم پایہ ہے۔ ابتدائی دور میں اردو

شعر و ادب کے سرمایہ کی کمی کا اصلی سبب ہے۔ پھر جو اردو شاعر اپنی ملکی زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے اور انہیں حکومت کی سرپرستی بھی حاصل تھی وہ یا تو فارسی سے ترجمہ کرتے تھے یا پھر اس طرز پر لکھتے تھے جو ترجمہ نہیں تو کم از کم ماخوذ ضرور ہیں۔ ان کا اندازہ دکھنی ادب کے پہلے دور کا جائزہ لینے سے ہوسکتا ہے۔ نثر میں سب سے پہلا کارنامہ جو ادبی حیثیت سے اہم ہے ملا وجہی کی سب رس ہے۔ اگرچہ ملا صاحب نے کتاب کے طبعزاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اسے اپنے دماغ کی پیداوار بتایا ہے لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری کے فارسی "حسن و دل" سے نقل اڑائی ہے اور طرز بھی ویسا ہی مقفی اور مرصع عبارت کا ہے جس کا اس زمانہ کی فارسی انشاپردازی میں خاص رواج تھا۔ ترجمہ کے سلسلہ میں دکن کا مشہور رزمیہ نگار شاعر کمال خاں رستمی ایک بڑے پتہ کی بات لکھ گیا ہے۔ وہ اپنی مثنوی خاورنامہ میں کہتا ہے کہ اپنی طبیعت سے نیا مضمون اگرچہ پیدا کیا جاسکتا ہے لیکن میں فردوسی یا اس کے ہم پلہ شاعروں کی برابری کا دعویٰ کیا کرسکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے زیادہ مناسب ہے کہ میں کسی بلند پایہ فارسی تصنیف کا دکھنی میں ترجمہ کر ڈالوں۔ چنانچہ ملکہ خدیجہ سلطان کی فرمائش پر اس نے ابن حسام کے فارسی منظوم قصہ کا ترجمہ کر ڈالا۔ یہ قصہ حضرت علی اور ان کی جنگوں سے متعلق ہے اور اس میں چوبیس ہزار اشعار ہیں اردو میں رزمیہ نظم کا اس سے طویل نمونہ اور نہیں ملتا۔ یہ تو ایک مثال تھی۔ دکن میں فارسی نظم و نثر سے جس قدر ترجمے ہوئے ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے

اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری ابتدائی دور میں فارسی کا پرتو نظر آنے لگی۔ اردو شعرا کی کوشش برابر یہی رہی کہ ان کا اردو کلام فارسی کے ہم پلہ ہوجائے بہت بعد میں مرزا غالب جب بڑی حد تک اردو نے اپنی مستقل حیثیت علیحدہ حاصل کر لی تھی یہی کہتے نظر آتے ہیں:-

جو کوئی کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

چنانچہ اردو ناقدین بھی برابر اپنے فنکاروں کی تعریف میں اسی قسم کے جملے استعمال کرتے ہیں کہ انہوں نے اردو کو فارسی کا مرتبہ بخشا۔ مشہور اردو شعرا کو مشہور فارسی شعرا کا ہم رنگ اور ہم مشرب بنا کر ان کی انتہائی تعریف سمجھی جاتی ہے۔ ولی کو اردو شاعری کا رودکی بتایا گیا ہے۔ سودا اپنی مدح و قدح کے کمال سے انوری ہیں۔ ذوق کا ہمہمہ اور شکوہ ان کو خاقانی ہند بناتا ہے، میر تو اردو کے حافظ ہیں، ریاض اور جگر، حافظ اور خیام کے ہم مشرب ہیں۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری فردوسی اسلام کہلاتے ہیں۔

یہ تمام فقرے جو قدیم و جدید شاعروں کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا ذہنیت کی یادگار ہیں۔ ظاہر ہے جو فنکار فارسی کے نمونوں کو سامنے رکھے اور اس کے شاہکاروں کو فن کی معراج قرار دے ہمیں اسے اسی کے اصولوں اور انہیں اقدار پر پرکھنا چاہیئے جو فارسی والوں نے مقرر کر رکھی ہیں۔ اس میں نہ شرم کی کوئی بات ہے اور نہ اس سے اپنی زبان یا اس کی تنقید کی توہین ہوتی ہے ہر نئے راہرو کو رہبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اردو نے فارسی سے بس یہی کام لیا۔

(اس سلسلہ میں دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ شخصی حکومت کے طرز نے شعر و ادب پر کیا اثر ڈالا اور اس طرح بالواسطہ تنقید نے کیا رجحانات قبول کئے۔ غرضیکہ ہماری زبان کے مورخ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ اردو شاہجہان کی درباری زبان کی حیثیت سے وجود میں آئی۔ بعض حضرات نے اسے اکبر کے دربار سے وابستہ کیا۔ غرض یہ معلوم ہونے لگا گویا یہ زبان مسلمان حکمرانوں نے اس ملک پر مسلط کی۔ جدید تحقیقات نے لاعلمی اور جہالت کے پردہ کو اٹھا کر اس غلط فہمی کی تردید کردی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے صوفیا نے سب سے پہلے اس کی سرپرستی کی اور انہیں کے مبارک اقوال اور ملفوظات اس زبان کی قدیم ترین تاریخی دستاویز ہیں۔ ان کے اثر سے متصوفانہ خیالات، بالخصوص پاکیزگی نفس، عشق حقیقی، حسن مطلق، معرفت نفس، ضبط و تحمل، ایثار و استقلال کے مضامین اردو شاعری کے خمیر میں داخل ہوگئے۔ غزل اردو شاعری کی سب سے بدنام صنف ہے لیکن اس میں اعتدال انہیں مضامین سے پیدا ہوا ہے اور انہیں خیالات نے عشق و عاشقی اور ہوسناکی میں حد فاصل قائم کر رکھی ہے جب کبھی اور جہاں کہیں ان سے انحراف کیا گیا ہے وہیں شاعروں کے قدم کو لغزش ہوتی ہے مثال میں لکھنؤ کے تمام شعرا پیش کئے جاسکتے ہیں)

شخصی حکومت کا تقاضہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ شعرا مدح گوئی کی طرف زیادہ مائل ہوتے اور فنی حیثیت سے اردو میں قصیدہ کا بڑا درجہ ہوتا لیکن شاعری کی تمام تاریخ میں سوائے سودا اور ذوق کے صف اول میں اور کوئی نام نہیں ملتا۔ دوسری صف میں کھینچ تان کر غالب اور مومن کو لے آئیے لکھنوی شعرا میں امیر مینائی کا نام لے لیجیئے۔ ان کے بعد فہرست ختم ہو جاتی ہے۔ یوں طبع آزمائی کے لئے یا مصلحت وقت کی خاطر اور شعرا نے بھی توجہ کی ہے لیکن میر اور میر حسن جیسے باکمال بھی اس میدان میں نہ چل سکے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ سلاطین یا امرا کی محفلوں میں شاعروں کی سرپرستی صرف قصیدہ خوانی کے صلہ میں نہیں ہوتی تھی بلکہ یہ اہل فضل و کمال کی سرپرستی کو شان ریاست اور وضعداری سمجھتے تھے۔ ایک دربار بگڑتا تو دوسرا دربار ان باکمالوں کی راہ میں آنکھیں بچھا دیتا۔ اس لئے ان کی سرپرستی نے شاعروں کے مذاق کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ البتہ جب ان کی حالت خود گر گئی تو زوال آمادہ شخصی حکومت کی جملہ خرابیاں سلطنت میں راہ پاگئیں، امیروں کا مذاق بگڑ گیا اور اسی لکھنؤ میں جہاں خان آرزو

سودا، میر تقی میر، جعفر علی حسرت، حیدر علی حیران، مصحفی، انشا اور میر حسن جیسے
باکمالوں نے محفلیں گرم کی تھیں۔ صاحبقران اور رنگین کو نوازا گیا۔ لیکن
لکھنؤ کے بعد رامپور اور پھر حیدر آباد نے اس وضعداری کو آخر تک نباہ
دیا۔ کبھی کبھی شخصی حکومت میں رئیس وقت کے خاص میلانات اور رجحانات نے
خاص ادبیات میں بعض اصناف کی ترقی میں بڑی مدد دی۔ مرثیہ فنی حیثیت
سے لکھنؤ میں اثنا عشری عقیدہ رکھنے والے نوابان اودھ کی سرپرستی میں
پروان چڑھا، انیس و دبیر اور ان کے کارنامے اسی فضا کی پیداوار ہیں ورنہ اس
سے پہلے بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا قوال مرثیہ خوان کہلاتا تھا۔ اس طرح مرثیے
نے لکھنؤ کے بگڑتے ہوئے مذاق کی جس طور پر اصلاح کی وہ بھی بالواسطہ انہیں
کا مرہون منت ہے۔ پھر بعض سلاطین کی خاص دلچسپیوں نے خاص طور پر زبان
کی ترقی اور اس کی رفتار پر اثر ڈالا۔ اردو نظم کا پہلا کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ
نے خود مرتب کیا۔ ہماری قدیم ادبی کتابوں میں یہ تصنیف نہایت اہم ہے۔
اس سے ایک طرف بادشاہ کی دلچسپی اور ملکی زبان سے اس کے لگاؤ کا اندازہ
ہوتا ہے، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجہ کا قادر الکلام
شاعر تھا اور اس کا کلام بیشک کلام الملوک ملوک الکلام کا مصداق ہے۔ یہی
وجہ ہے کہ اس کے بارگاہ گولکنڈہ میں بکثرت شعراء نے دکھنی شاعری کی طرف
توجہ کی اور بادشاہ کے مذاق کے مطابق غزلیں اور عاشقانہ مثنویاں نظم
کیں۔ کمال خان رستمی علی عادل شاہ والی بیجاپور کا تذکرہ اس عقیدت سے کرتا
ہے گویا وہ اس کا استاد ہے اور درحقیقت یہ تاجدار اپنے شعراء کے کلام کو
بغور سنتا اور اس پر اصلاح دیتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر نے غالب کی شاعری کو آخر
دور میں متاثر کیا اور اسے ایک نیا رنگ بخشا۔ واجد علی شاہ کا کلام کسی طرح
اس کے درباری شعراء کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ فنی واقفیت کے اعتبار
سے خود اس کا پایہ ہی بلند رہتا ہے۔

شخصی حکومت نے شاعری کے عام اسلوب پر بڑا اثر ڈالا۔ استعاروں
اور کنایوں کا رواج اسی کا مرہون منت ہے۔ شخصی حکومت میں انفرادی آزادی
کسی نہ کسی حد تک سلب ہو جاتی ہے اور تحریر و تقریر میں دار و گیر کا خوف ہمیشہ
دامنگیر رہتا تھا۔ تقریر کرنے والے اپنی گفتگو میں اور شعراء اور ادیب اپنی
تحریروں میں اپنے آزاد خیالات ظاہر کرنے جھجک محسوس کرتے ہیں بالخصوص
ایسے معاملات میں جہاں شعراء زمانہ کے ماحول، سیاسی بے چینی اور ذہنی
انتشار کا ذکر کرنا چاہتے ہوں، چونکہ ان کی قوت حاسہ شدید ہوتی ہے۔
اس لئے وہ ان حالات کا اثر عوام سے زیادہ ہی قبول کرتے ہیں اور اس کا
اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مجبوراً استعاروں اور کنایوں کا پردہ ڈال
کر اپنے جذبات اور تاثرات سپرد قلم کرتے ہیں۔ ہمارے قدیم شعراء اور
ادیبوں میں اس انداز کے عام رواج کا باعث یہی ہے۔ جو لوگ اردو غزل پر یہ اعتراض
کرتے ہیں کہ اس میں شاعر صرف اپنے دل کی رام کہانی سناتا ہے اور عام ماحول
سے بیگانہ نظر آتا ہے یعنی بالفاظ دیگر غزل میں صرف داخلیت پائی جاتی ہے۔ وہ
اسی نکتہ سے عدم واقفیت کی بناء پر غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر غزل گو شعراء
کے استعاروں اور کنایوں کو صرف استعارہ اور کنایہ سمجھ کر تحقیق کی جائے
کہ در اصل شاعر کا مقصد کیا تھا تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ اس دور میں بھی
شعراء نے اپنے خارجی ماحول کی ترجمانی اپنے کلام میں ہمیشہ مدنظر رکھی ہے۔
ایسے مطالعہ کے لئے شاعر کے عہد کی تاریخ۔ اس کی زندگی کا روزنامچہ یا
کم از کم اہم واقعات کی تاریخیں ہمارے سامنے ہونے ضروری ہیں۔

اردو شعراء اور ناقدین نے عام طور پر شاعری کے لئے اور بالخصوص بعض اصناف
کے لئے درد و سوز و گداز کو جزو لاینفک قرار دیا ہے۔ اس ذہنیت کا سلسلہ بھی
اس عہد کے سیاسی ماحول سے ملتا ہے۔ اردو کی نشو و نما کا زمانہ در اصل مغلیہ حکومت
کے زوال کا دور ہے۔ ملک میں انتشار تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کی آئے دن کی
یورش نے کم از کم شمالی ہند کے باشندوں پر زندگی حرام کردی تھی۔ ادھر دکن میں
مرہٹوں کی بغاوت، ادھر سکھوں اور جاٹوں کی سرکشی، نظام حکومت کے
کمزور ہو جانے کے باعث اندر ہی اندر بگڑ رہی تھی۔ درباری امرا اور اعیان لشکر
خود غرض ہو گئے تھے اور اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنا رہے تھے۔ دربار
میں ایسی ریشہ دوانیاں تھیں کہ کسی رئیس کا پایہ مستحکم نہ تھا۔ جو آج ہفت ہزاری نظر
آیا۔ کل نانِ شبینہ کو محتاج تھا۔ جب درباروں کی یہ حالت تھی تو درباروں سے
وابستہ رہنے والے شعراء اور ارباب فن و اہل کمال کس طرح سکون کی زندگی بسر کر
سکتے تھے۔ ان کی قسمت میں در بدر کی ٹھوکریں، معاشی تنگ حالی، ذہنی پریشانی
اور ذاتی آلام و مصائب ہی لکھے تھے۔ اگر ان حالات میں کائنات کا ایک ایسا
تصور ان کے ذہن میں آیا جہاں انسان مجبور اور بے کس، حقیر اور کمزور رہا اور حوادث
اور اتفاقات کے رحم و کرم پر ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

قدرتی طور پر سوال ہوگا کہ اس ہند ایرانی تمدن میں جس کی پیداوار یہ اردو
زبان ہے۔ ایرانی عنصر کے مقابلہ میں ہندی عنصر کی کمی کا سبب کیا ہے۔ دکھنی دور میں
دیسی بھاشاؤں کے الفاظ اور ملکی تشبیہات کثرت سے ملتی ہیں معلوم ایسا ہوتا
ہے کہ بہت جلد ان زبانوں کا جو مقامی بولیوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھیں
سرمایہ ختم ہو گیا اور رہا سہا آریائی تمدن ایک زیادہ مہذب اور متمدن ایرانی
آریائی ثقافت کے سامنے نہ ٹھیر سکا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی ہمارے زمانہ میں
مغربی تمدن اور معاشرت کے سیلاب میں قدیم ہندملانی (INDO-MUSLIM)
خس و خاشاک کی طرح بہی چلی جا رہی ہے اور جو اثرات پہلے ایرانی تمدن اور فارسی زبان و ادب سے
ہوئے تھے وہ اب انگریزوں کی تہذیب، معاشرت اور انکی زبان و ادب سے رفتہ رفتہ ہماری زبان
کے مزاج میں دخل پا رہے ہیں۔

مصوّر

(افسانہ)

ظفر جاوید

آج شہنشاہ اعظم کی سترویں سالگرہ ہے دربار خاص نہایت آب و تاب سے آراستہ ہے۔ بوڑھے شہنشاہ کے تخت کے پیچھے اس کی مہ جبین کنیز فرزانہ موتیوں کو پنکھا لئے کھڑی ہے۔ تخت کے نیچے ملک کا خوبرو نوجوان مصور فرید ادب سے دست بستہ کھڑا ہے۔

"حاضرین دربار! آج میں آپ کو اپنے ملک کے سب سے مشہور مصور کا شاہکار دکھاتا ہوں"۔ شہنشاہ اعظم نے کہا۔

امرا ایستادہ ہو گئے۔ شہنشاہ نے پاس رکھے ہوئے طلائی چوکھٹے کی نقاب کشائی کی۔

"سبحان اللہ! ماشاء اللہ!!" حاضرین دربار کی زبان سے بیساختہ نکل گیا۔

"بیشک یہ ایک یگانہ روزگار شے ہے۔ فرزانہ میرا کھلونا ہے۔ بچوں اور بوڑھوں دونوں کو کھلونوں کی ضرورت ہوتی ہے ——— میرے اس کھلونے کی تصویر فرید نے چھ ماہ کی لگاتار محنت کے بعد تیار کی ہے۔ تصویر کو غور سے دیکھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے رخساروں پر فرید نے اپنے خون دل سے رنگ آمیزی کی ہے۔ ان سرخ جھلکیوں میں کیا کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے ——— اس تاج خاندانی کی قسم! میں فرید کو منہ مانگا انعام دوں گا۔ کہو فرید کیا انعام مانگتے ہو"، شہنشاہ اعظم نے ستائش، قدر دانی اور انتہائی خلوص کے جذبات میں سرشار ہو کر کہا۔

فرید ہچکچایا ——— فرزانہ کی نظروں نے ہمت دلائی لیکن اس کی پیشانی پر پسینہ کی بڑی بڑی بوندیں چمک رہی تھیں۔ ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی۔ آنکھیں کھلی ہونے پر بھی بند تھیں۔ کچھ جرأت دکھانا چاہتا تھا لیکن قاصر تھا ——— دربار میں عجیب سا سناٹا تھا ——— فرید اور فرزانہ کی بھر آنکھیں چار ہوئیں۔ فرزانہ کی نظروں میں فرید کو امید اور جوش کی جھلک نظر آئی ——— حاضرین دربار گوش بر آواز تھے ——— چاروں طرف ایک قسم کا مقدس سکوت طاری تھا ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فرید کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا ہے۔

کچھ دیر تک یہ کیفیت دیکھنے کے بعد خود شہنشاہ اعظم نے سکوت توڑا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے؟ فرید! میرے وعدے پر شبہ نہ کرو۔ ہمت کر کے تمنائے دلی صاف صاف بیان کردو۔ درحقیقت میں تم کو منہ مانگا انعام دوں گا"۔

"حضور! جان بخشی ہو تو عرض کروں"۔ ہمت سے کام لے کر فرید نے رکتے رکتے کہا ——— فرزانہ کی آنکھیں جوش مسرت سے چمکنے لگیں۔ حاضرین دربار متوجہ ہو گئے۔

"ہاں! ہاں! کہو۔ اس فضول تاخیر سے کیا فائدہ"۔ شہنشاہ اعظم نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر حضور! مجھ کو میری محنت کے صلے میں ——— میری بنائی ہوئی یہی تصویر عنایت کر دی جائے"۔

"ہائیں ——— !!! یہ کیا کہہ رہے ہو تم!" شہنشاہ اعظم نے تعجب و حیرت سے دریافت کیا۔

"جی ہاں حضور! بالکل صحیح عرض کر رہا ہوں"۔ فرید نے جواب دیا۔

"میری خوشی تو اسی میں تھی کہ تم فرزانہ کو مجھ سے مانگتے۔ چھ مہینے کی مسلسل صحبت میں تم دونوں ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے ہو۔ میں نے اکثر تم دونوں کی آنکھوں میں محبت کا نشہ دیکھا ہے۔ میں تو فرزانہ کو پھول اور تم کو بھونرا سمجھنے لگا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ بھونرا اپنا کام ———" شہنشاہ اعظم نے کہا۔

"لیکن حضور میں ایسا پھول لے کر کیا کروں ——— جو چند ہی روز میں اپنا حسن کھو بیٹھے۔ مجھ کو تو "حسن پائیدار" کی ضرورت ہے جس کی تکمیل رگوں میں پوست کی فرزانہ نہیں کر سکتی ہے! ——— !"

خدارا! میرے حضور۔ مجھکو یہ تصویر دے دیجئے۔ یہ ہمیشہ شگفتہ و حسین رہے گی ——— لائیے ——— لائیے" فرید بے چین ہو کر چیخنے لگا۔

"واہ فرید تیرا مرتبہ بہت بلند ہے۔ تو بیشک مصور ہے۔

ع "برہمن تجھ سا نہیں حسن کے بت خانہ میں"

رُباعیات

دل جھوم اٹھا جو ابر پارے جھومے
آنکھوں میں محبت کے ستارے جھومے
نظارہ بہ نظارہ ہے جام بہ جام
ہم گردن مینا کے سہارے جھومے

ضیا

جعفری

نانکنگ

جاپانیوں نے ۱۹۳۷ء میں نانکنگ کو تباہ کردیا تھا، لیکن یکم مئی سے وہ دوبارہ چین کا صدر مقام ہوگیا ہے۔ بہت سے سرکاری دفتر تو پہلے ہی آگئے تھے لیکن جنرلسیمو چیانگ کائی شیک اور انکے وزراء کی آمد کے بعد پوری چہل پہل شروع ہوگئی۔ جنرل مارشل نے بھی چنکنگ سے واپس آنے کے بعد جرمنی کے سابقہ سفارت خانے میں اپنا صدر دفتر کھول لیا۔ ۱۹۳۷ء میں اعلان جنگ کئے بغیر جاپان نے حملہ کیا اور مارچ ۱۹۴۴ء تک چین کے دس صوبوں پر قبضہ جما لیا۔ ۱۹۴۰ء میں نانکنگ کے مقام پر انہوں نے ' جمہوریت چین کی قومی حکومت ' قائم کی۔ جولائی ۱۹۴۱ء میں جرمنی اٹلی بلغاریہ رومانیہ سلوویکیہ ھسپانیہ اور ھنگری نے اس نام نہاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ گویا اسطرح اسکے تعلقات یورپی ممالک سے استوار ہوگئے۔ لیکن زمانے کی کروٹ بدلنے کے ساتھ نہ ان ملکوں کی آن بان باقی ہے اور نہ جاپان کا پچھلا اقتدار۔

نانکنگ کے چند بازاروں کا ایک دلکش منظر۔ وسط میں ڈاکٹر سن یات سن کا مجسمہ نصب ہے۔

۵ مئی کو ڈاکٹر سن یات سین کے مقبرے کی زیارت کے بعد جنرلسیمو اور میڈم چیانگ کائی شیک واپس جا رہے ہیں۔

✡

قومی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے کی یادگار منانے وقت نانکنگ کے عام باشندے اور سپاهی جمع ہوکر اصل رسم ادا کررہے ہیں۔

ہاتھی · کڈھا ·

جنوبی ہندوستان میں ریاست میسور بڑے جانوروں کے شکار کیلئے خاص جاذبیت رکھتی ہے شیروں اور جنگلی ہاتھیوں کی تلاش میں گھنے جنگلوں کی خاک چھاننے والے وہاں جاتے اور اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ وہ ہاتھیوں کو گھیر گھار کر لکڑی کے ایک جنگلے میں قید کردیتے ہیں جسے اپنی زبان میں «کڈھا» کہتے ہیں۔ یہ مستطیل شکل کا جنگل کی مضبوط لکڑیوں کا بنا ہوا جنگلہ ہوتا ہے جس میں کئی حصے ہوتے ہیں۔ اسکا دروازہ اتنا وسیع رکھا جاتا ہے کہ ہاتھی آسانی سے گذر سکیں۔ اسے بنانے بھی ایسے راستے پر ہیں جہاں سے ہاتھی عموماً گذرتے ہوں۔ ہاتھیوں کو دیکھتے ہی شکاری ڈھول بجاتے چیختے چلاتے اور خوب غل مچاتے ہیں۔ اور انہیں ہنکا کر کڈھے کے قریب لے آتے ہیں۔ جب ہاتھیوں کو کوئی راہ فرار نظر نہیں آتی تو وہ اس جنگلے میں چلے جاتے ہیں۔ پھر مہاوت سدھائے ہوئے ہاتھیوں کے ساتھ کڈھے میں جاتا اور ہاتھیوں کو ایک ایک کرکے الگ الگ حصوں میں داخل کردیتا ہے۔ کئی دن تک تنہا رہنے کے بعد ہاتھی اس ماحول سے مانوس ہو جاتے اور اپنے جنگلی بن کو چھوڑ دیتے ہیں۔

ایک تجربہ کار مہاوت جو سابو نامی فلمی اداکار کا چچا ہے کڈھے میں گھورے ہوئے ایک جنگلی ہاتھی کو رسی سے جکڑ رہا ہے۔
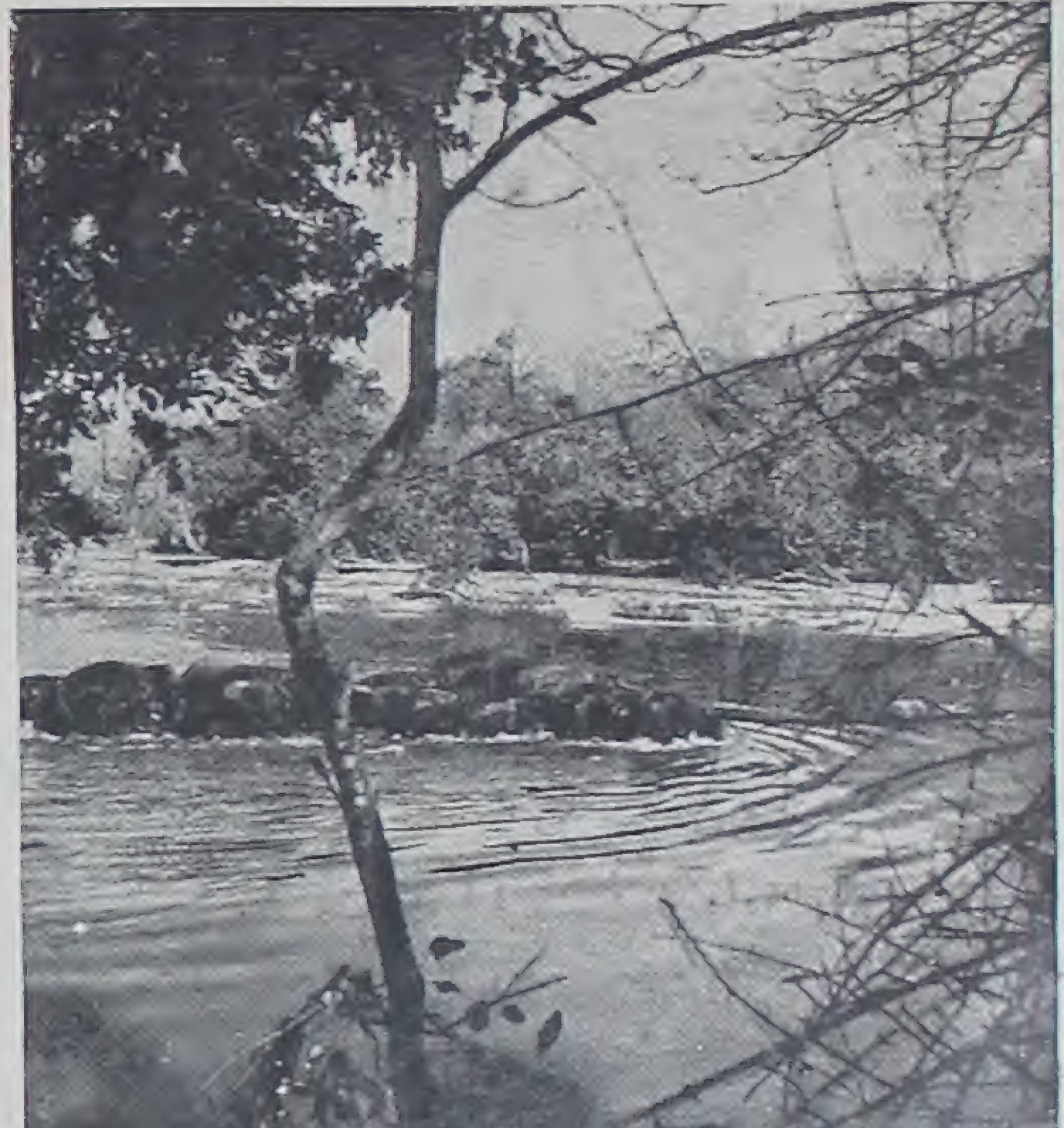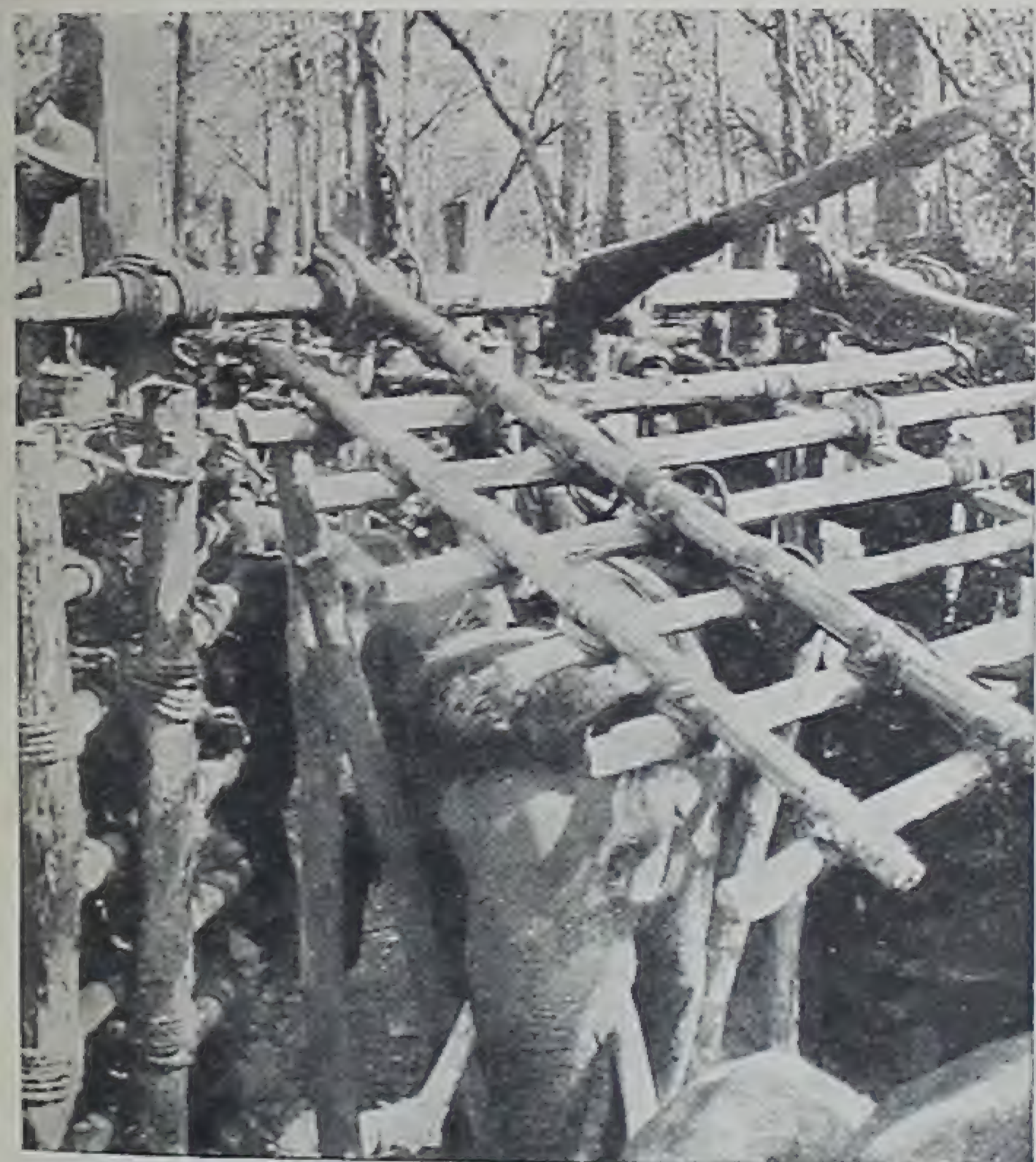
هندوستانی بت تراشی کے نمونے

(جنوب مشرقی ایشیا میں)

شاندار کمبودی آرٹ کا ایک اعلی نمونہ۔ مہارا یعنی سمندر کی ایک عجیب الخلقت هستی نے جس کا دھڑ ھاتھی سے مشابہہ ھے دو عورتوں کو اپنے جبڑوں میں دبا رکھا ھے۔

وشنو دیوتا کی ایک صحیح سالم مورت جو نویں صدی کی ھے انگکور کے قریب برآمد ھوئی۔ ھندوؤں کے عقیدے کے مطابق وشنو دیوتا نے نظام شمسی کو سنبھال رکھا ھے۔

کانسی کا بنا ھوا خمر آرٹ کا ایک اعلی نمونہ جو بارھویں صدی کا ھے۔ ناگ دیوتا جس پر زنگاری رنگ چڑھا ھوا ھے پھن مارنے کے انداز میں کھڑا ھے۔ ←

جامعه طهران

جامعہ طہران ایران کی واحد یونیورسٹی ہے۔ اسکا شمار دنیا کی بہترین درسگاہوں میں کیا جاتا ہے۔ دوسرے مضامین کے علاوہ اس میں طب، قانون اور عملی فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسا کہ اس صفحہ کی تصاویر سے ظاہر ہے جامعہ طہران کی سب عمارتیں نئی طرز پر بنی ہوئی ہیں۔ اس میں طلبا کے کھیلوں کے لئے کلب اور ایک ریستوران بھی ہے۔ انکی جسمانی ترقی کیلئے کھیل کے میدانوں کا خاص اہتمام کیا

اقامت گاہ کا خوبصورت باغیچہ۔

فنون کی درسگاہ کا ایک نظارہ۔

جاتا ہے۔ ہر کالج نے اپنی لائبریری الگ بنا رکھی ہے جس میں یورپ کی تقریباً ہرزبان کی کتابیں جمع ہیں۔ انکی مجموعی تعداد دس ہزار کے قریب ہے۔ ابتدائی آٹھ سال تک جامعہ کا نظم و نسق سرکاری حکام کے ہاتھوں میں رہا۔ اس کے بعد ایران کی پارلیمنٹ نے ایک قانون بنا کر اسے آزاد کر دیا اور اسکی ایک مجلس انتظامیہ بنادی۔ تاسیس جامعہ کی یادگار میں ہر سال سارے ایران میں ایک اچھا جشن منایا جاتا ہے۔
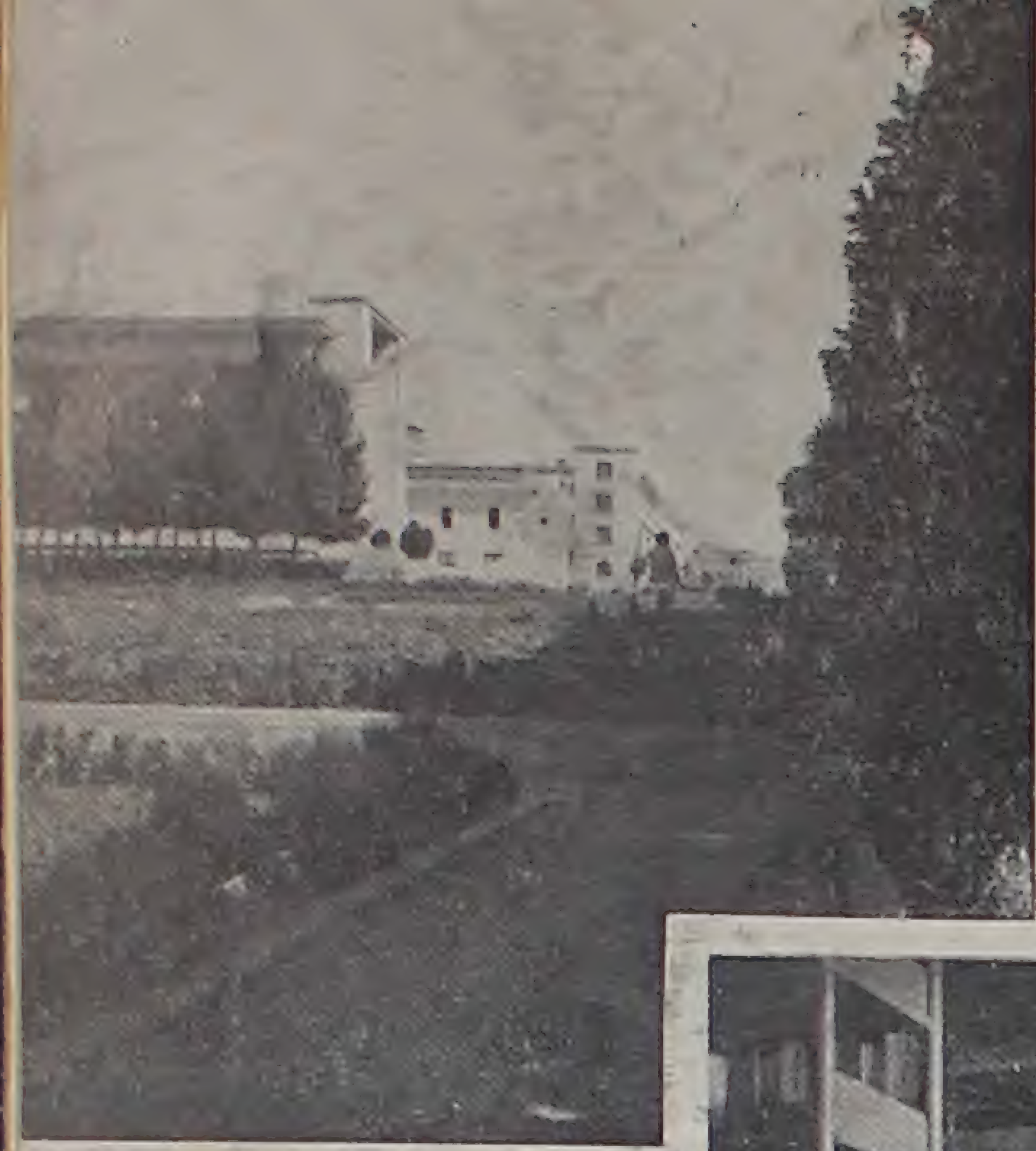
قانون کے کالج کے سامنے
دلکش منظر۔

—:o:—

طلبا کی کلب کا بڑا ہال
ریستوراں۔

جامعہ کا ٹکنیکل کالج۔

—:o:—

جامعہ کی لائبریری کا ایک حصہ ←

—:o:—

قانون کے کالج کا دروازہ
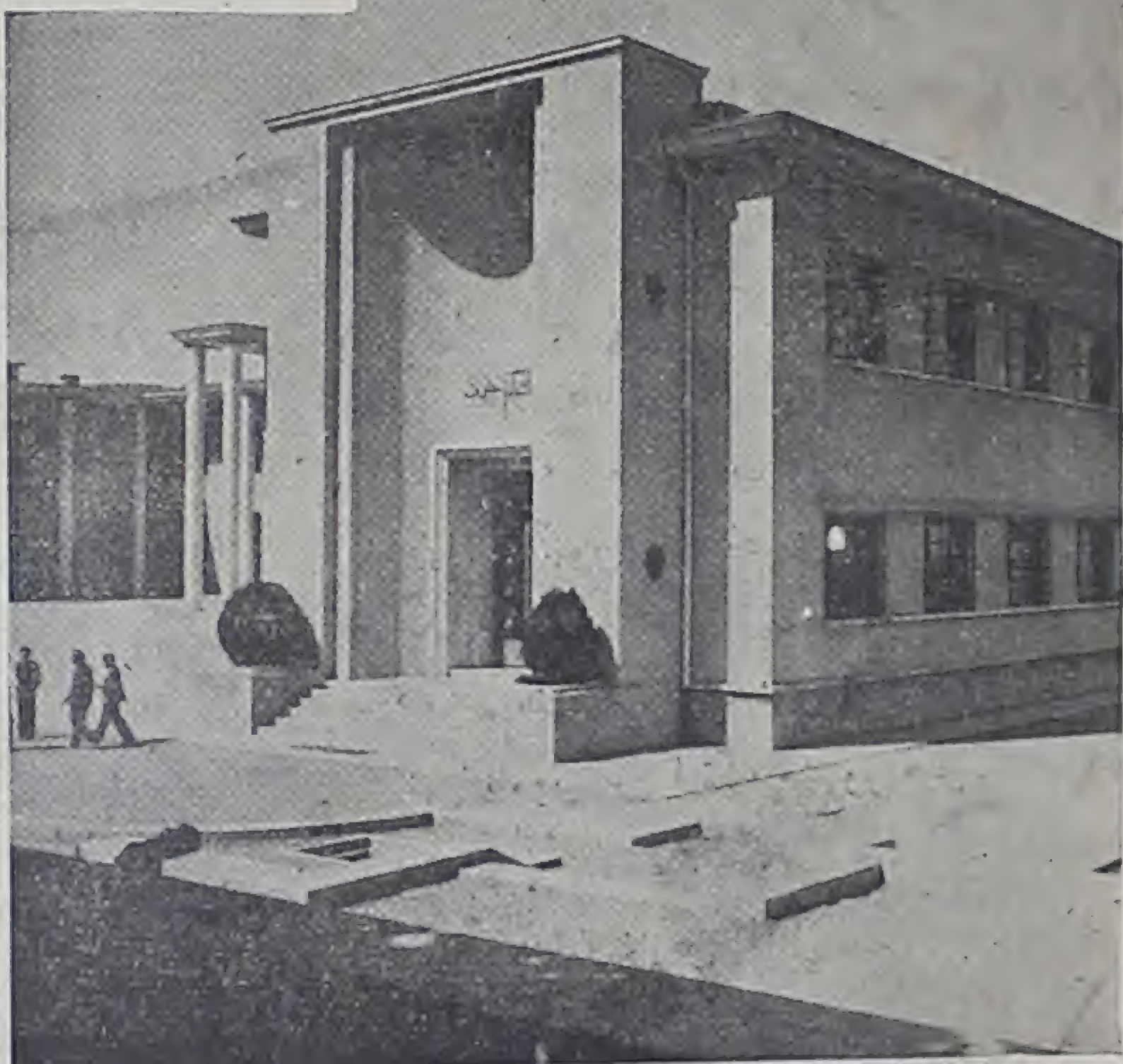
دربار صاحب' امرتسر' کا ایک دلکش نظارہ۔ یہ سکھوں کی ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔

امرتسر

"سکھوں کا مقدس شہر"

۱۵۷۷ میلادی میں اکبر بادشاہ نے ایک قطعۂ زمین گرو رام داس جی کو جو سکھوں کے روحانی پیشوا تھے عطا کیا اور اسکے ساتھ ایک بہت بڑا حوض بھی ملا دیا۔ گرو جی نے اسکا نام "امرتسر" یعنی "آب حیات کا حوض" رکھا۔ انہوں نے حوض کے بیچ میں ایک گردوارہ تعمیر کرایا اور اسکا نام "ہری مندر" رکھا۔ شہر اور عبادت گاہ انہی ناموں سے ابتک مشہور ہیں۔

دربار صاحب' امرتسر' کے صدر دروازہ کا ایک حصہ۔ پتھر پر اعلی نقاشی کا کام حد درجہ دیدہ زیب ہے۔

دُھواں

افسانہ

شمس عظیم آبادی

وہی کثیف دھواں۔ وہی بکدر فضاء وہی بے حس اداسی اس کا جی الجھنے لگا اس نے ایک بار کھڑکی سے باہر سر نکالا اور پھر زور سے سر گرا دیا۔ دُھواں دُھواں! کثیف دھواں! جہاں دیکھو دھواں اٹھ رہا ہے شہر بھی کوئلہ اور لوہے کا کارخانہ ہوگیا ہر وقت دھواں! جب دیکھو دھواں! ۔ اور سامنے کے مکانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلتے دیکھ کر اس کا جی ہوا کہ ہمارے شہر کی چمنیوں پر ایک دبیز بھاری پتھر رکھ دے تاکہ دھوئیں باہر نہ نکل سکیں اور اس گھر کے رہنے والے دھوئیں کی شدت سے گھٹ گھٹ کر مر جائیں ——

دھواں!!! آہ! اسے دھوئیں سے نفرت ہے وہ دھوئیں کی کثافت برداشت نہیں کر سکتا۔ یکایک اس کی نظر آتشدان پر پڑی جہاں دھیمی دھیمی آنچ سے کوئلہ دہک رہا تھا اور کوئلہ کا دھواں اس بڑے سوراخ سے ہوتا ہوا اوپر چمنی کے باہر جا رہا تھا۔ اس کے گھر سے بھی اس کے کمرہ سے بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہ جھنجلا گیا! دھواں! دھواں! دھواں! اس کے اپنے کمرے میں دھواں۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی پانی کی بوتل کو آتش دان میں کوٹ دیا۔ نہ آگ جلے گی نہ دھواں اٹھے گا۔ پانی تھوڑا تھا۔ آگ پوری نہ بجھ سکی۔ کوئلہ بھیگ گیا اور بھیگے ہوئے کوئلے کے ٹکڑوں نے انگاروں سے مل کر اور دھواں پیدا کر دیا اور پھر سارے کمرے میں دھواں پھیل گیا۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور اس نے جھنجلا کر اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا —— وہ کمرے سے باہر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر کمرے کے باہر بھی تو دھواں تھا۔ وہ دھوئیں سے بیزار تھا وہ ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں سے دھواں نہ اٹھتا ہو! ——

اس نے آتشدان پر ایک کاغذ ڈھانک دیا۔ دھواں بہت تیزی سے آتشدان کے بڑے سوراخ سے ہوتا ہوا اوپر چمنی سے باہر نکلنے لگا —— اس نے سر پھر اوپر اٹھا دیے۔ دھوئیں کی تہہ آسمان پر اور موٹی ہو گئی تھی۔ مختلف چمنیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے چھوٹے بڑے گول دائرے۔ اور اس کا جی ہوا کہ یہ دائرے پھانسی کے پھندے بن جائیں اور ان پھندوں میں وہ ان لوگوں کی گردنیں ڈال دے جن کے گھروں سے یہ دھواں اٹھ رہا تھا —— ہوا کے ایک جھونکے سے بہت سا دھواں اس کی ناک کو چھوتا ہوا اس کے کمرہ میں چھا گیا۔ اس نے جھڑک کر کھڑکی سے سر ہٹا لیا —— کثیف دھواں! پھر اسے اپنی کھڑکی کے نیچے دو سائے نظر آئے۔ اس نے اپنا پورا سر کھڑکی سے باہر کر دیا۔ دو مخلوط سائے۔ جنہیں دھوئیں نے گھیر لیا تھا اس نے زیادہ عیاں طور پر دیکھنے کی کوشش کی اور جوں جوں اس نے زیادہ دیکھنے کی کوشش کی اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ دھوئیں کی ایک بڑی کثرت منہ اور ناک سے گھونٹ رہا ہے۔ دو مخلوط سائے۔ دو پیوست نقوش۔ کثیف دھواں، اور اسے ایسا محسوس ہو جیسے اس کے تمام جسم سے دھواں اٹھ رہا ہے۔ اس نے زور سے سر گرا دیا۔ اس کا جسم دہک رہا تھا۔ آتشدان میں آگ بہت تیزی سے جل رہی تھی۔ دھواں بہت کم نکل رہا تھا —— اس کا بدن جل رہا تھا۔ انگارے کی طرح تپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ دھواں! کثیف دھواں! وہ چیخ اٹھا۔ دھواں!!!؟ ——

بیت رہی برسات

رین اندھری ساون کی رت
بادل گونجے بجلی "چمکے"
کیسے بتاؤں من کی بات
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
کوئل کی درد بھری صدائیں
کیسے بتاؤں من کی بات
بنا سجن یہ ساون جھولا
گیت سکھی میں کیسے گاؤں

چھائی گھٹا گھن گھور
دھک دھک ہو من مور
بیت رہی برسات
من مورا لہرا ئے
ہوک سی جیا چھید جائے
بیت رہی برسات
من مورا اٹھرا ئے
ہائے جیا کلپائے

کیسے بتاؤں من کی بات
رو رو بیتے یوں رین چین نہ پاؤں
ساجن اب تک گھر نہ آئے
کیسے بتاؤں من کی بات
رہتے تھے جب پاس پیا
دیکھ لیا یاں جو کچھ دیکھا
کیسے بتاؤں من کی بات
بھول گئے پردیس بسے
ساجن گیا سچ روٹھ گئے
کیسے بتاؤں من کی بات

بیت رہی برسات
ہائے جیا گھبرائے
رہ رہ وہ یاد ستائے
بیت رہی برسات
جگ میں سب کچھ اپنا تھا
کتنا سندر سپنا تھا
بیت رہی برسات
پریت روگ لگانا تھا
دو دن مجھ کو ہنسانا تھا
بیت رہی برسات

عائشہ پروین

ہندوستانی ثقافت وفنون پر مصر کے اثرات

دارا نے ۵۲۱ قبل مسیح میں یا اس کے لگ بھگ زمانے میں گندھارا فتح کیا تھا۔ کوہ بے ستون سے برآمد ہونے والی تختیوں پر اس کے مفتوحہ ممالک کی تفصیل درج تھی۔

ہندوستان کی طرف سے دارا کو ہر سال ۳۶۰ ٹیلنٹ سونا خراج کے طور پر دیا جاتا تھا ایک ٹیلنٹ کا وزن ۳۵ سیر ہوتا تھا۔ اس حساب سے خراج کی رقم بہت زیادہ تھی۔ ایسے حوالے بھی ملتے ہیں کہ بلوچستان ایک غریب ملک ہونے کے باعث دارا کو سب سے کم خراج دیتا تھا۔ یعنی ۱۷۰ ٹیلنٹ چاندی۔ لیکن یہ بات زیادہ تعجب خیز ہے کہ دریائے سندھ کے دو نام ہوتے تھے۔ فارسی زبان کے ایک مسودے میں (شاہجہاں نامہ مصنفہ معتمد خاں، صفحہ ۲۵۶ سطر ۲) دریائے سندھ کو دریائے نیلاب لکھا گیا ہے۔

کیا اس کے معنے یہ ہوئے کہ ان آریاؤں کو جو بعد میں آکر دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے پہلے مہاجرین کے ساتھ مل گئے تھے مصر کا دریائے نیل یاد تھا اور انہوں نے اس ملک کی یادگار میں جسے چھوڑ آئے تھے، سندھ کا یہ نام رکھ دیا؟

ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، فراعنہ مصر نے جب ہائکسوس قوم پر غلبہ حاصل کر لیا تو کسی بحث وتمحیص میں حصہ لینا ان کے لئے دشوار تھا۔ پھر بھی صلح کی گفت وشنید کر لینے کے بعد انہوں نے بیس لاکھ ہائکسوں کو ۱۵۹۰ قبل مسیح کے لگ بھگ اجازت دیدی کہ وہ بے خوف وخطر مصر چھوڑ کر چلے جائیں۔ یہ تو معلوم ہے کہ ہائکسوس یروشلم اور عرب کو پار کر گئے لیکن یہ معلوم نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہودیوں، شامیوں یا عربوں کے حوالاجات سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کس جگہ قیام پذیر ہوئی اور نہ قبائلی روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ بدوؤں کے ساتھ شیر وشکر ہو کر انہی میں مدغم ہو گئے۔ حکومت مصر کی قدرتی سرحد دریائے فرات کے کنارے تک قائم تھی۔ اسلئے ظاہر ہے کہ ہائکسوس کو اس حد کے اندر رہنے کی اجازت نہیں ملی ہوگی ورنہ ہر وقت ان کی طرف سے اندیشہ لگا رہتا۔ عین ممکن ہے کہ انہوں نے دریائے فرات کو عبور کیا اور بابل وسیمارا میں عارضی طور پر قیام کرنے کے بعد وہ آگے بڑھے اور درۂ بولان یا درۂ خیبر کی راہ دریائے سندھ کی وادی تک چلے آئے۔ جہاں گنڈ یوں کی حیثیت سے پہلے مہاجرین آئے تھے اور یہ لوگ انہی میں مل جل کر رہ گئے۔

غالباً اسی سب سے بڑے سبب کی بنا پر مصر کے فرعون رعمسیس نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اثرات کا دوسرا ثبوت اس اعتبار ملتا ہے کہ چھوٹے پیمانے کے ظروف میں جو مصر، نالندہ اور موہنجوداڑو سے برآمد کئے گئے، زبردست مشابہت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ ان میں سے بعض کی وضع قطع بھی یکساں ہے۔ ایک دلچسپ مشابہت اس نمونے میں پائی جاتی ہے جو "تاریخ مصر" مصنفہ بریسٹڈ کے صفحہ ۳ پر دیا گیا ہے۔ اس ہنڈیا پر کھدائی کا کام بہت بڑی حد تک اس نقاشی سے ملتا جلتا ہے جو پنجاب کے بنے ہوئے مٹی کے حقوں پر اب بھی عام ہے۔ مٹی کو پاؤں سے گوندھ کر گارا بنا لیا جاتا اور پھر اس، گارے کو چکلی پر رکھ کر نہ درستے گھمایا جاتا تھا۔ مصر میں قاعدہ تھا کہ برتن کی خاص وضع قطع ڈھالنے کے لئے انگلیوں کی مدد لی جاتی تھی اور یہی دستور ہندوستان میں رائج تھا۔

مصری لباس جن کے کنارے نیلے رنگ کے تھے فراعنہ کے مقبروں سے برآمد ہوئے ہیں۔ انکا کیمیاوی معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ انہیں نیل میں رنگا گیا تھا۔ اور سب جانتے ہیں کہ نیل وادی سندھ کے شہر بربریکون سے مصر بھیجا جاتا تھا۔ جن نمونوں کا معائنہ کیا گیا وہ بہت قدیم ہیں اور ان سے پتہ چلتا ہے کہ پرانے زمانے سے ان کی برآمدگی عام تھی۔ مصر کے کھیتوں میں بیلوں کے ذریعہ ہل چلایا جاتا تھا۔ ہل کی بناوٹ بھی وہی تھی جو ہندوستان کے دیہاتوں میں استعمال ہونے والے ہلوں سے مشابہہ تھی اسی طرح کٹائی وغیرہ کے اوزاروں میں بھی یکسانیت کا پتہ چلتا ہے۔

کے حسین

دوسرا دلچسپ سوال اگنی پوجا سے متعلق ہے۔ اس کی رسم کتنی پرانی ہے؟ اس کا طریقہ کہاں سے اختیار کیا گیا؟ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسم بہت ہی پرانے زمانے سے ایرانیوں میں رائج تھی۔ آگ کا احترام لوگوں کے دلوں میں اسوقت پیدا ہوا جب ایک بار موسم سرما میں باکو کے قریب خود بخود شعلے اٹھتے دکھائی دئے حالانکہ زمین کی سطح برف سے

ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ ایک ایسا مظہرِ قدرت تھا جسے اگلے وقتوں کے لوگ سمجھنے سے قاصر رہے۔ سر پرسی سائکس نے اپنی کتاب تاریخ ایران" جلد اول کے صفحہ ۱۱۰ پر اس حادثۂ طبعی کا حال لکھا ہے۔ ایران سے اگنی پوجا کی رسم بابل اور سیمارا میں اور وہاں سے ہندوستان میں منتقل ہوئی۔

اس مظہرِ قدرت کی توجیہہ اب آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ باکو تیل والی زمینوں کے قریب ہے اور جو شعلہ اس وقت نظر آیا وہ ضرور پیٹرول کے انجرات کے بھڑک جانے کا نتیجہ تھا۔ یہ بات اس لحاظ سے ہمارے لئے بہت دلچسپ ہے کہ اس سے ایک رسم کے نقل مکانی کی سمت کا پتہ چلتا ہے۔ کہ مشرقی اثرات کی بنا پر اس کی تقدیس و پرستش روما اور ایتھنیہ میں عام تھی۔ لیکن وہ عضوِ تناسل کی پوجا سے بالکل مختلف تھی (ہندوستان میں اس پوجا کو "لنگ پوجا" یا "شولنگ" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) پوجا کا یہ طریقہ مصر والوں کو بہت ہی پرانے زمانے میں معلوم تھا۔ اور قبط جو دریائے نیل کے اس موڑ پر واقع تھا، جو بحیرۂ احمر کے بالکل نزدیک ہے، اسی طریقۂ عبادت کے لئے مشہور تھا۔ مسودات سے پتہ چلتا ہے کہ باہمی تعلقات پیدا ہو جانے کے بعد اس رسم کو یونان والوں نے بھی اختیار کیا تھا۔ یہ عام عقیدہ تھا کہ اس کی پوجا کرنے والوں کو زرخیزی نصیب ہو جاتی تھی۔ چونکہ بحیرۂ احمر کی بندرگاہوں کے ذریعہ ہندوستان کے آریاؤں کے ساتھ تجارت اور بیوپار ہوتا تھا اسلئے سندھ کی وادی میں رہنے والے آریاؤں نے اسے اختیار کرلیا اور اب بھی اس پوجا پر کاربند ہیں۔ عضوِ تناسل کے دیوتا کو "چم" کہا جانے لگے۔ یونانی اسے "پین دیوتا" کہا کرتے تھے۔

اب ہمیں ثقافت کے ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے جس سے ہمیں اندازہ ہو سکیگا کہ قدیم زمانے کے لوگوں نے تہذیب و تمدن کا کتنا بلند درجہ حاصل کرلیا تھا مثلاً موسیقی کو لیجئے۔ اس میں شک نہیں کہ قبل تاریخ کے وہ لوگ جو غاروں میں رہتے تھے، ناچ گانے کے شائق تھے کیونکہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مسرت و شادمانی، رنج و غم اور امید و یاس کے جذبات ظاہر کرنے کا سب سے بڑا قدرتی طریقہ یہی ہو سکتا ہے۔ ہسپانیہ کے کھریا کے غاروں میں جو نقش و نگار ہیں وہ اسی چیز کو ظاہر کرتے ہیں یعنی یہ کہ غاروں کے رہنے والے شکاریوں کے گرد ناچ رہے ہیں۔ تاریخ سے پہلے کے ان لوگوں نے صرف ہڈی کے ٹکڑے ناچ کا ٹھمکا یا گیت کی تال ظاہر کرنے کیلئے استعمال کئے ہونگے۔ یہی ٹکڑے ترقی پاکر کھڑتال بن گئے جن کا استعمال آج تک رائج ہے۔ جہاں تک معلومات کا تعلق ہے مصریوں نے سب سے پہلے موسیقی کے ساز ایجاد کئے۔ اگرچہ مصری کاہنوں کیلئے بہت سی چیزیں ممنوع تھیں تاہم ناچ گانے کی انہیں بھی اجازت تھی۔ قدیم ترین فراعنۂ مصر کے مقبروں میں دیواروں کی پچیکاری دیکھنے سے اس امر کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس کے بہترین نمونے مسٹر گارڈنر ولکنسن نے اپنی کتاب "قدیم مصری" میں صفحہ ۹۸ تا ۲۳۴ پر دکھائے ہیں۔ موسیقی کے یہ چند ساز پہلے پہل مصریوں نے استعمال کئے تھے۔ کانسی یا پیتل کے بنے ہوئے مجیرے۔ آج بھی ہندوستان میں اسی وضع کے مجیرے استعمال ہوتے ہیں۔ کئی قسم کے کھڑتال جن کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ اور بربط۔ خصوصاً بربط کا وہ جوڑا جو رعمسیس کے مقبرے کی دیواروں پر بنا ہوا ہے، خوبصورتی اور فنی اعتبار سے بے مثل ہے۔

بربط یہودیوں نے اپنایا اور پھر اس کا رواج سارے یورپ میں ہوگیا درا صل اس زمانے کے پیانوں کو اسی کا نقشِ اول کہا جاسکتا ہے۔ دوسرا تاروالا ساز جو سے ملتا جلتا ہے اور غالباً اسی قسم کے سازوں میں وضع قطع بدل کر رباب، وینا اور ستار بن گئے۔ مصری زمانہ قدیم

موسمِ گل

موسمِ گل ہے عجب شور ہے میخواروں میں
جان سی پڑ گئی فطرت کے پرستاروں میں

کس غضب کی ہے کشش عشق کے دربازوں میں
خود بخود حسن کھنچا آتا ہے کہساروں میں

حوصلے بڑھ گئے پوشیدہ گنہگاروں میں
اب تو واعظ بھی نظر آتے ہیں میخواروں میں

اک فقط میں ہی نہیں حسن کے بیماروں میں
زخم ہی زخم نظر آتے ہیں گلزاروں میں

شہر ویراں ہوئے دیہات نے رونق لے لی
زندگی ناچتی پھرتی ہے چمن زاروں میں

سبزہ و گل کی روش پر نظر مستِ خرام
دلِ شاعر بھی ہے ان حاشیہ برداروں میں

کیا غضب ہے کہ غضبناک بنے رہتے ہوا
آگ لگ جائے دہکتے ہوئے انگاروں میں

کس طرح ناوکِ نازک کے نکالیں بھالے
چارہ گر خود ہی نظر آتے ہیں بیچاروں میں

آنکھ سے آنکھ ملی ٹوٹ پڑی برقِ نظر
دل کا شیرازہ کھلا، مل گیا سیاروں میں

سینہ خالی بھی نہیں، دل بھی نہیں، دل کی جگہ۔۔
اک وضعدار، مگر لاکھ وضعداروں میں

گردشِ نقشِ قدم منزلِ دل بن کے رہی
اک سفینہ کو قرار آگیا منجدھاروں میں

پھونکتا رہتا ہوں دل سوزِ محبت سے عمرؔ
خاک کو پاک کیا جاتا ہے انگاروں میں

عمران انصاری

سے بانسری بجاتے رہے ہیں۔ ان کے پاس بانسری ہوتی بھی تھی۔ نفیری کی ایک قسم جو آج بھی یورپ میں بادشاہوں کی تشریف آوری کے موقعوں پر بجائی جاتی ہے، قدیم مصریوں میں رائج تھی۔ یہ لوگ ایک چوکور وضع کا طنبورہ بجاتے تھے جو عرب میں پہنچ کر مدوّر ہو گیا اور اہلِ عرب اسے دف کہنے لگے۔ اس میں مجیرے جیسی چھوٹی چھوٹی پیتل کی کٹوریاں ہوتی تھیں۔ عرب سے وہ ہسپانیہ پہنچا جہاں اب بھی وہ بہت زیادہ مقبول ہے۔ ہندوستان میں اس کو فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ تاہم اس وقت کا شہرہ آفاق ڈھول افریقہ تک پھیلا اور ہندوستان میں پہنچ کر اپنا سکہ جما بیٹھا۔ مصریوں نے کسی قدر طویل قسم کا ڈھول بجانا شروع کیا جسے غالباً پکھاوج کا جدِّ امجد کہا جا سکتا ہے۔

گیتوں کی سنگت میں کسی تار والے ساز کا بجایا جانا ہمیشہ خوش مذاقی کا ثبوت دیتا ہے۔ نئے لوگوں کو تربیت دیتے وقت ہمیشہ اسے زیرِ مشق کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ توجہ اس امر پر مبذول رہتی تھی کہ صرف وہی گیت اور گانے سکھائے جائیں جو صحیح قسم کے ہوں۔ کوئی محفل اچھے مذاق کی حامل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ اعلیٰ موسیقی کا بھی انتظام نہ کیا گیا ہو۔ گویے گانے بجانے لوگوں کو خوش کرتے اور اس طرح اپنی روزی کمانے پھرتے تھے۔ اس وقت بھی ہندوستان میں ہم کو سادھوؤں کی قسم کے ایسے گائک نظر آتے ہیں جو تفریحِ طبع کے لئے دیہاتیوں کے مجمع کے سامنے اشلوک گاتے پھرتے ہیں۔

لیکن مغرب کو اس لحاظ سے مشرق پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے کہ وہاں موسیقی کی تانیں پوری احتیاط کے ساتھ دائرہ تحریر میں آ سکتی ہیں چنانچہ ماہرینِ موسیقی کے مختلف دلکش نغمے اب تک بجنسہٖ محفوظ ہیں لیکن ہندوستان میں ہر شاگرد مجبور رہا ہے کہ وہ صرف کانوں کا سہارا لیکر مختلف استادوں سے یہ فنِ لطیف سیکھے۔ اس نظام کے باعث ہندوستان بڑے گھاٹے میں رہا کیونکہ بہت سے اچھے نغمے اور پیاری دھنیں چند گھرانوں کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئیں اور ان سے عام غریب طالب علم محروم رہ گئے۔ مغرب کے دوش بدوش مشرق میں بھی اچھے کلاکار پیدا ہوئے ہیں مثلاً حضرت داؤد جو یہودیوں کے بادشاہ تھے۔ اسحاق موصلی، ابن جامی، دمشق میں دربارِ خلافت کا موسیقی اور ہسپانیہ میں الحاکم کے دربار کا ضرباب۔ غالباً اسی یا اس کے لگ بھگ زمانے میں سرزمینِ ہند کے دو فنکار گوپال نائک اور حضرت امیر خسرو گذرے ہیں جو خلجی خاندان کے عہدِ حکومت میں تھے۔ ان کے بعد تان سین اور بیجو باؤرے کا رنگ جما۔ لیکن ان کی فنی مہارتوں کا کونسا نمونہ ہے جو ہم تک باقی رہ گیا سوائے اسکے جو سینہ بسینہ محض کانوں کے اعتبار کے ساتھ ہم تک پہنچ سکا ہے اور جو بہت ہی قلیل ہے۔

("ڈان" کے شکریہ کے ساتھ)

سیّدہ اختر و اقبال

علامہ اقبال کی غزل پر

تجسس کے رنگیں نشاں اور بھی ہیں!
ترے منتظر کارواں اور بھی ہیں؟
مکاں اور بھی لامکاں اور بھی ہیں!
ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

تری جستجو کی نہیں انتہائیں؟
مگر پائے ذوقِ طلب کو بڑھائیں؛
اٹھو پردۂ آرزو کو اٹھائیں؟
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں؟
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

ہر اک ذرّہ دردِ تمنا سے مضطر؟
ہر اک گام تازہ بہ تازہ ہے محشر؟
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر؟
نگاہوں سے پوشیدہ لاکھوں ہیں منظر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر چاک ہے گل کا دامن تو کیا غم؟
خزاں ساز ہے تیرا گلشن تو کیا غم؟
اگر چھن گیا تیرا مامن تو کیا غم؟
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم؟
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

ہر اک سانس ہے ایک الہام تیرا؟
ستاروں سے آگے ہے پیغام تیرا؟
ہر آغاز مصروفِ انجام تیرا!
تو شاہیں ہے، پرواز ہے کام تیرا!
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

کبھی تو بھی دیکھ آپ اپنا تماشا؟
نہ کر اپنی محدود و بے کیف دنیا؟
ازل سے ابد تک ہے تیری تمنا؟
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا!
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

بہارِ سخن آئی ہے پھر چمن میں؟
یہی ذکر ہوتا ہے اہلِ سخن میں!
ہے اختر بھی نغمہ سرا اب وطن میں؟
گئے دن کہ اقبال تھا انجمن میں
حقیقت کے اب رازداں اور بھی ہیں

سیّدہ اختر

ٓ یہ ترمیم اضافی۔

علامہ اقبال کی فکری وحدت یا تضاد

(۱)

میرا مضمون "علامہ اقبال کے متضاد نظریئے" آجکل کے یکم اور ۱۵ فروری سنہ ۶۲ء کے نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اس کا جواب یکم اپریل کے آجکل میں ہندوستان کے مشہور ادیب ڈاکٹر تاثیر صاحب اور ۱۵ مئی و ۱۵ جون کے آجکل میں غلام محمد صاحب بٹ کی جانب سے شائع ہوچکا ہے۔ میں ان تمام حضرات کا دل سے ممنون ہوں جنہوں نے میرے شبہات کے ازالے کی کوشش کی۔ میں سچائی سے علامہ اقبالؒ کے کمال کا معترف ہوں اور اپنے آپ کو ایک طالب علم سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ اگر علامہ کی حیات میں مجھے اس طرف توجہ ہوئی ہوتی تو میں اپنے شکوک صرف ان کی ہی خدمت میں پیش کرتا۔ اس لئے مجھے بجا طور پر ان اصحاب سے شکایت ہونی چاہیئے جنہوں نے مجھے علامہ مرحوم کا مخالف یا معترض سمجھا۔ علامہ کی شخصیت نے ہماری عقلوں کے علاوہ ہمارے دلوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس لئے محل تعجب نہیں اگر جواب دینے والے حضرات کے دلی تاثرات بھی اس خالص علمی بحث میں شامل ہو جائیں۔ بہرحال الزامات کی صفائی اور اصل مضمون کے متعلق مجھے عرض کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب نے کم اور بٹ صاحب نے زیادہ یہ کوشش کی ہے کہ علامہ کی عبارتیں نقل فرمادیں جن کا تعلق موضوع سے ہونا ضروری نہیں۔ اس سے یہ فائدہ ضرور ہوسکتا ہے کہ ناظرین کی توجہ اصل بحث سے ہٹ جائے۔ بعض عبارتیں موضوع سے متعلق ہیں بھی تو ایک رخی ہیں یعنی ان کے خلاف علامہ کے دوسرے ارشادات وجود ہیں جن سے تضاد ثابت ہوتا ہے۔ ان کا نہ ذکر کیا گیا نہ تطابق کی کوشش کی گئی اور سوائے قادیانیت کے نہ کسی نظریئے کے متعلق یہ کہا گیا کہ علامہ نے اس قول سے رجوع فرمالیا تھا۔ بعض سوالات کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی۔

میں نے اپنے مضمون میں علامہ کا کوئی مسلک متعین نہیں کیا اور متضاد اقوال کی موجودگی میں ایسا کر بھی کیسے سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کا قصوروار ٹھیرایا گیا ہوں کہ میں نے "غالباً یہ فرض کرلیا ہے کہ اقبال کسی خاص گروہ یا مسلک کے پابند ہونگے" مقصد غالباً یہ ہے کہ جو شخص کسی خاص فرقے کا پابند نہ ہو اسے متضاد باتیں کہنے کی اجازت ہے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں کہ میکش نے لکھا ہے کہ اقبال کا یہ تضاد نامحمود ہے۔ حالانکہ میں نے اپنی خلش کو نامحمود عرض کیا تھا معلوم نہیں یہ گستاخی کی تعلیم ہے یا تنبیہ۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تسلیم فرمایا ہے کہ

"تضاد اگر ہے تو کارگاہ عالم میں ہے — انسانی زندگی کے عام مظاہر میں، خدا کی صفات میں ہے — قرآن میں ہے — میکش کے اقوال میں — اس لئے اقبال کے تضاد پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ تضاد حقیقت ہے اور علامہ اقبال ترجمانِ حقیقت تھے — ایک ہی چیز کا انکار اور اصرار بذاتِ خود ناروا نہیں"

ان بیانات سے میرے شبہات کا جواب مل جاتا ہے پھر بھی ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ازراہ معارف نوازی ہر عنوان کے متعلق راہ نمائی فرمائی ہے ڈاکٹر صاحب کا مضمون مرتب ہے، سنجیدہ ہے اور طنز سے پاک ہے۔

بٹ صاحب نے اپنی تمہید چند دعووں اور وحدۃ الوجود کی بحث میں مخلوط فرمادی ہے۔ بٹ صاحب کے ارشادات ہیں:-

"جذبات کسی مفکر کے ہوں یا عامی کے غیر مستقل و غیر مستقیم ہوتے ہیں"۔ "اقبال چونکہ شاعر بھی تھے اس لئے ان کے مطالعے میں بھی یہی اصول کارفرما ہونا چاہیئے"۔ "ہمیں اقبال کو سمجھنے کے لئے اقبال ہی سے استمداد و استنتاج کرنا چاہیئے"۔

بات وہی ہے جو ڈاکٹر تاثیر صاحب نے فرمائی ہے۔ انداز بیان ذرا مختلف ہے یعنی اقبال کے جذبات غیر مستقل و غیر مستقیم تھے اس لئے وہ کبھی کچھ فرماتے تھے اور کبھی کچھ۔ چونکہ وہ شاعر بھی تھے اس لئے یہ بات ان کے لئے اصولی طور پر جائز تھی۔ علاوہ ازیں اقبال کے سمجھنے کے لئے کسی منطقی اصول کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اقبال ہی سے امداد حاصل کرنی چاہیئے۔ اس کے ساتھ بٹ صاحب نے ایک دعوے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اقبال کا کلام سریع التاثیر اور عسیر الفہم ہے"۔ سوال یہ ہے کہ یہ تعریف اقبال کے کلام کی ہے یا سمجھنے والوں کی جن پر سمجھنے سے پہلے یا بغیر سمجھے ہوئے تاثیر ہوجاتی ہے۔

میکش قصوروار ہے کہ اس نے "وحدۃ الوجود کا تذکرہ چھیڑا جو بہت فرسودہ ہوچکا ہے" لیکن میکش معذور ہے اگر علامہ اقبال نے یہ فرسودہ تذکرہ نہ چھیڑا ہوتا اور میکش نے اس میں تضاد محسوس نہ کیا ہوتا تو یہ تذکرہ نہ چھیڑا جاتا۔ اس کے بعد بٹ صاحب خود بھی اس فرسودہ تذکرے کے چھیڑنے کا جواز اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:-

"جس کی (وحدۃ الوجود کی) چند در چند تاویلیں بھی ہوچکی ہیں ہمہ اوست ہمہ از اوست ہمہ با اوست جبر و قدر وحدۃ الوجود وحدۃ الشہود وغیرہ ایک ہی گھاٹ پانی پیتے ہیں۔ پھر اقبال کی توضیح و تشریح کیوں ناکام رہے۔

میکش اکبرآبادی

(آگے چل کر فرماتے ہیں) زرتشت کی ثنویت بھی درحقیقت
وحدۃ الوجود کی ایک توضیح تھی"

بٹ صاحب پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دعوے کو مدلل و مشرح فرمائیں کیونکہ اب تک تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہمہ اوست اور وحدۃ الوجود ایک ہی ہے اور ہمہ از اوست یا وحدۃ الشہود اس کے متضاد دوسرا نظریہ ہے جیساکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مکتوبات سے ظاہر ہے۔ ثنویت اور وحدت میں صریحی تضاد ہے۔ ہمہ بہ اوست میرے علم میں تو مہمل ہے البتہ اگر بٹ صاحب تشریح فرمائیں گے تو ممنون ہوں گا۔ اسی طرح جبر و قدر اور وحدۃ الوجود سے علاقہ سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ جبر و قدر کا تعلق انسان کے اختیار و عدم اختیار سے ہے نہ اس سے کہ وجود واحد ہے یا کثیر۔ بٹ صاحب ارشاد فرماتے ہیں :-

"اقبال کا فلسفہ خودی کا فلسفہ تھا" وہ حرکت و عمل کو زندگی
سمجھتے تھے اور حیات مطلق کو خدا، کیا یہ وحدۃ الوجود نہیں
کیا یہ ایسا تصوف نہیں جو عین قرآن ہو۔ اسی حرکت و عمل اور
اثبات خودی کی وجہ سے وہ شیطان کو بطور ایک اولوالعزم کردار
کے پیش کرتے ہیں"

یہ مسلّم ہے کہ اقبال کا فلسفہ خودی کا فلسفہ تھا مگر یہ محتاج تشریح و ثبوت ہے کہ یہی فلسفہ وحدۃ الوجود ہے یا عین قرآن ہے۔ علامہ اقبال حرکت و عمل کو زندگی سمجھتے تھے اور زندگی کو خدا یعنی حرکت و عمل کو خدا سمجھتے تھے اور حرکت و عمل ہی کی وجہ سے شیطان کو اولوالعزم سمجھتے تھے۔ بہرحال میرے شبہات کا اس منطق سے کوئی تعلق نہیں۔ شیطان کے متعلق میں نے صرف ایک شبہ پیش کیا تھا کہ علامہ خودی کو خدا کے سامنے نہ چھوڑنے کی تعلیم دیتے ہیں، افراق و جدائی کی تبلیغ فرماتے ہیں اور بالکل یہی تعلیم ابلیس کی زبان سے دیتے ہیں۔

(حوالے کے لئے ملاحظہ ہو آجکل ۱۵ فروری ۱۹۴۶ء)

اس صورت میں ابلیس کے اور علامہ کے فلسفے میں کیا فرق ہے۔ اس کا جواب ڈاکٹر تاثیر صاحب نے دینا ضروری نہ سمجھا اور بٹ صاحب نے صرف شیطان کا تذکرہ ہی کافی خیال فرمایا۔

بٹ صاحب کی رائے میں آریائی وحدۃ الوجود اور قرآنی وحدۃ الوجود بظاہر ایک اور درحقیقت دو متضاد نظریے ہیں۔ ایک کا ملجا و ماوا بے عملی اور نفی خودی دوسرا "سراپا عمل"۔ نفی خودی کی وجہ یہ قرار دی جا سکتی ہے کہ وحدۃ الوجود خواہ آریائی ہو یا قرآنی ایک وجود کے سوا سب کی نفی کرتا ہے اس لئے خدا سے آنکھیں لڑانے والی خودی کی بھی نفی ہو جاتی ہے جو غیر اللہ ہے علامہ بھی "دل ز غیر اللہ بپرداز اے جوان" فرماتے ہیں۔ البتہ عمل اور بے عملی کا تعلق اصل مسئلے سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ نہ بٹ صاحب نے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ میری رائے میں علامہ اقبال نے بھی ان شعروں میں یہی بات فرمائی ہے جیساکہ میں عرض کر چکا ہوں :-

آزاد ہو سالک تو ہیں یہ اسکے مقامات — خود گیری و خودداری و گلبانگ انا الحق
محکوم ہو سالک تو یہی اس کا ہمہ اوست — خود مردہ و خود مرقد و خود مرگ مفاجات

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں کہ "وہی شعر جس سے تضاد نکالا گیا ہے تضاد کے وہم کو دور کرتا ہے" بٹ صاحب نے خود سوچنے کی زحمت نہیں فرمائی۔ میں نے ان شعروں میں تضاد کب ظاہر کیا تھا۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ دو متضاد نظریوں کے علاوہ علامہ اقبال کے یہاں ایک تیسرا خیال بھی ملتا ہے اور وہ یہ کہ وحدۃ الوجود سے قوموں کی ترقی و تنزل کا کوئی تعلق نہیں جن عبارتوں سے تضاد ثابت ہوتا ہے ان کے متعلق بٹ صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ تاثیر صاحب نے اتنی جرأت فرمائی کہ معناً تسلیم تو کر لیا مگر فرمایا کہ "مجھے نثر و نظم کا یہ مقابلہ ناپسند ہے۔ ایک شعر بھی تو مخالفت میں نہیں نکلتا"۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ تاثیر صاحب کی پسند کا لحاظ نہ کر سکا۔ اگر نثر سے وحدۃ الوجود کی مخالفت نکلتی ہے تو نثر ہی سے موافقت ثابت ہوتی ہے۔ نظم کو نظر انداز فرما دیجیے ڈاکٹر تاثیر صاحب کو ملفوظات کا پیش کردہ یہ قول تسلیم ہے کہ "وحدۃ الوجود کا مسئلہ مذہبی مسئلہ نہیں۔ اس پر بحث اسلامیت کے لئے ضروری نہیں"۔ لیکن تضاد تسلیم نہیں فرماتے ہیں۔ "میں نے اقبال کے اقوال کو خلاصہ یکجا کر دیا ہے ان میں تضاد کا شائبہ تک نہیں۔ میکش صاحب نے وحدۃ الوجود کی فلسفیانہ صداقت اور وحدۃ الوجود کی مذموم تفسیر دو مختلف شقوں کو ایک سمجھ کر مغالطہ کھایا"۔

میں تاثیر صاحب کے اس شائستہ انداز تحریر کا ممنون ہوں مجھے واقعی مغالطہ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن بٹ صاحب کو مجھ سے شکایت ہے کہ میری طرف سے مغالطہ دیا جاتا ہے۔ اور مغالطہ دینے کے لئے علامہ اقبال کی عبارتیں حذف کر دی جاتی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس موقعہ پر جو میں نے تضاد ظاہر کیا تھا اسکا وحدۃ الوجود کی محمود اور مذموم تفسیر سے کوئی علاقہ معلوم نہیں ہوتا۔ پھر ملاحظہ فرمائیے کیا ان دو جملوں میں تضاد نہیں؟

"ہمہ اوست مذہبی مسئلہ نہیں"...... مذہب اسلام
کی رو سے خدا اور کائنات ...... ایک ہی کل کے مختلف
اجزا ہیں"

ڈاکٹر تاثیر کی یہ شکایت میرے سر آنکھوں پر کہ "میکش نے اس بحث میں اقبال کو وحدۃ الوجود کا منکر قرار دیتے ہوئے کسی شعر کا حوالہ نہیں دیا۔ میرے خیال میں از روئے استدلال نثر بہ نسبت نظم کے زیادہ واضح

ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اس بحث میں اختصار و ایجاز سے کام لیا ہے اور جو کچھ فرمایا ہے اس سے ان کا مخاطب واضح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ مگر بٹ صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ مجھے معاف فرمائیں اسے ہم وعظ تو کہہ سکتے ہیں مگر ایک طالب علم کے لئے اس میں کوئی مواد نہیں ہے اس کے علاوہ بٹ صاحب نے وحدۃ الوجود کی جو تعریف فرمائی ہے وہ نہ مستند ہے نہ صحیح۔ اسی طرح علامہ اقبال کا نظریۂ توحید بھی اقبال کے الفاظ میں اور انہی کے حوالے سے پیش کرنا چاہیئے تھا۔ دوسروں کے مذاہب و نظریات پیش کرتے وقت اہل علم اس کا ضرور لحاظ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں بٹ صاحب نے بہت سی غیر متعلق بحثیں پیدا کردی ہیں جن کے متعلق سردست کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ ایک نیا عنوان مجھے بٹ صاحب کے مضمون سے اور حاصل ہوا۔ امید کہ کوئی صاحب اس پر بھی روشنی ڈالیںگے۔ بٹ صاحب علامہ اقبال کے حوالے سے نقل فرماتے ہیں:۔

"اسلام کی مذہبی زندگی میں اس تجربہ کی کاملیت منصور حلاج کے مشہور الفاظ "اناالحق" کی صورت میں اپنے معراج کو پہونچی حلاج کے معاصرین اور متاخرین نے اس کی تفسیر وحدۃ الوجود کے رنگ میں کی لیکن ایم مینگنن کی مدونہ اور شائع کردہ "جزئیات حلاج" نے کوئی شک و شبہ نہیں چھوڑا کہ صوفی شہید کا مفہوم خدا کی لامحدودیت اور مطلقیت سے انکار کرنا نہیں تھا اس کے ... بے کی سچی ترجمانی سمندر میں قطرے کا مل جانا نہیں بلکہ ایک بے پایاں تر شخصیت میں انسانی خودی کے استقلال و واقعیت کا ایک غیر فانی جملے میں دلیرانہ تصدیق و احساس کا اظہار تھا۔"

اس عبارت کے ساتھ علامہ اقبالؒ کے اس مکتوب کی چند سطریں ملاحظہ ہوں جو رسالہ جوہر اقبال نمبر ۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔

"منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطبعاسین جس کا ذکر ابن ندیم کی فہرست میں ہے فرانس میں شائع ہوگیا ہے۔ مولف نے فرنچ زبان میں نہایت مفید حواشی اس پر لکھے ہیں آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ حسینؒ کے اصلی معتقدات پر اس رسالے سے بڑی روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے مسلمان منصور کو سزا دینے میں بالکل حق بجانب تھے۔ اس کے علاوہ ابن حزم نے کتاب الملل میں جو کچھ منصور کے متعلق لکھا ہے اس کی اس رسالے سے پوری تائید ہوتی ہے۔ لطف یہ کہ متقدمین صوفیہ قریباً سب کے سب منصور سے بیزار تھے معلوم نہیں متاخرین اس کے اس قدر دلدادہ کیوں ہوگئے!"

معلوم نہیں منصور کی یہ توصیف و تنقیص وحدۃ الوجود کی مذموم تفسیر کے اعتبار سے ہے یا محمود تفسیر کے اعتبار سے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک بار اس کی مذموم تفسیر کی جائے اور دوسری مرتبہ محمود۔

بٹ صاحب فرماتے ہیں:۔ "اقبال اور رومی کا تصوف انسان کو مجبور محض نہیں مانتا اور نفی خودی کی تلقین نہیں کرتا"۔ نفی خودی کے ثبوت میں علامہ اقبال کے جو شعر میں نے پیش کئے تھے اس کا جواب ڈاکٹر تاثیر صاحب علمائانہ بٹ صاحب نے لیکن مزید برآں بٹ صاحب نے یہ دعویٰ اور کر دیا کہ رومی کا تصوف بھی نفی خودی کی تلقین نہیں کرتا۔ معلوم نہیں رومی سے یہ سلسلہ ملانے کی کیا ضرورت پیش آئی۔ مغربی فلسفے سے اس کی سند بہ آسانی مل سکتی تھی۔ رومیؒ شدت سے نفی خودی کی تلقین کرتے ہیں اور یہی مسلک تمام اسلامی صوفیہ کا ہے۔ خواہ وہ بقول علامہ اقبال حرکی یعنی نقشبندی ہوں یا دوسرے حضرات۔ رومی کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

چیست توحید خدا افروختن — خویشتن را پیش واحد سوختن
گر ہمیخواہی کہ بفروزی چو روز — ہستی ہمچو شب خود را بسوز
ہستیت در ہست آن ہستی نواز — ہمچو مس در کیمیا اندر گداز
روئے در دیوار کن تنہا نشیں — وز وجود خویش ہم خلوت گزیں
عاشقاں را کار نبود با وجود — عاشقاں را ہست بے سرمایہ سود
ہیچکس را تا نہ گردد او فنا — نیست رہ در بارگاہ کبریا
آئینہ ہستی چہ باشد نیستی — نیستی بگزیں گر ابلہ نیستی

بٹ صاحب دیباچہ اسرار خودی کا بہت سا حصہ نقل کرنے کے باوجود یہ ثابت نہ فرما سکے کہ مسکین نے یہ اقتباس مغالطہ دینے کیلئے پیش کیا تھا اور استتاراً یہ سعی کی تھی کہ علامہ کو تصوف کا مخالف ثابت کرے اگر میں ایسا محسوس کرتا تو صراحت سے عرض کرتا۔ استتار کی کیا ضرورت تھی۔ بٹ صاحب اقبال کی عظمت پرانی اصطلاحات کی تبدیلی میں سمجھتے ہیں حالانکہ اصطلاح کی تبدیلی بجائے خود کچھ بھی اہم نہیں۔ پھر اصطلاح کی تبدیلی کا تضاد سے کوئی علاقہ نہیں۔ البتہ اگر کوئی شخص اپنی مصطلحات پر قابو یافتہ نہ ہو اور کبھی ایک لفظ کو اپنے مصطلحہ معنوں میں اور کبھی دوسروں کے مصطلحہ معنوں میں استعمال کرے اور کوئی قرینہ تبدیل معنی پر نہ ہو تو ضرور تضاد کی غیر حقیقی یا حقیقی رونمائی ہو سکتی ہے۔ بٹ صاحب کی رائے علامہ اقبال کے متعلق غالباً یہ تو نہ ہوگی؟

(باقی آئندہ)

جدید تیرنے کے تالابوں کی تعمیر

تیرنے کے تالاب ہر طبقے کے لوگوں کی زندگی کی دلچسپی اور تندرستی میں زبردست اضافہ کرتے ہیں۔

یہ خواہ عوام یا خواص کیلئے تعمیر کیا جائے مگر ایک شہر میں کم از کم ایک ایسا تالاب ضرور ہونا چاہیئے تاکہ بوڑھے اور جوان سب ہی اس تندرستی میں اضافہ کرنیوالی ورزش سے لطف اندوز ہوسکیں تیرنے کے تالابوں کی مکمل تعمیر اور ان سے متعلقہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے سیمنٹ کانکریٹ سے زیادہ کوئی دوسرا مسالہ موزوں نہیں ہے۔ یہ نہایت صاف اور محفوظ ہے اور اسکی دیکھبھال کی ضرورت نہیں پڑتی۔ دیکھنے میں جاذب نظر اور دل خوش کن ہے اور بالکفایت ہونے کے علاوہ دیرپا بھی ہے۔

کانکریٹ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مفید تعمیرات کیلئے دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا (۔ کوئنس وے نئی دہلی) کے فنی ادارے کی اعانت حاصل کی جاسکتی ہے۔

ڈاک خرچ وغیرہ کیلئے تین آنے کے ٹکٹ مندرجہ بالا پتہ پر ارسال کرکے "تیرنے کے تالابوں" کے متعلق کتابچہ منگوائیے۔

دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ

CM. 104 A—

خالہ جمالو

محمد المبین ثانی

سلہ (کسی پیز کے گر کر ٹوٹنے کی جھنکار کے
دار آواز)

شکیل:- دیکھ رہی ہیں خالہ جمالو آپ انکا غصہ۔

نوشابہ:- وہ کیا دیکھیں گی مہینوں سے تیل کے لئے چیخ رہی تھی روکھے بال لئے ہوئے پھر رہی ہوں آج دام دے تو یہ موا جگ اور گلاس آگیا آگ لگے اس کمبخت میں جانے اس کی کونسی ناک پڑ رہی تھی۔

خالہ جمالو:- اے تو اب بیٹی تم ہی چپ رہو۔

شکیل:- وہ یوں تھوڑی چپ ہوں گی جب تک میرا خون پانی ایک نہ کردیں گی۔ اسوقت تک نہ زبان تالو سے لگے گی نہ چین آئے گا۔ مزاج تو دیکھئے عرش معلیٰ پر ہیں گلاس مجھ پر پھینکا گیا ہے۔ خدا کی مار مجھ پر گرہستی کے خیال سے لے آیا تھا۔ (جگ اٹھا کر پھینک دیتا ہے اور وہ بھی چکنا چور ہو جاتا ہے)

خالہ جمالو:- لو چلو چھٹی ہوئی۔ نہ موا تیل آیا نہ جگ اور گلاس رہا۔

نوشابہ:- اے تیل آئے یا چولہے میں جائے میں بھی موئے جھونٹے لئے پھر ونگی بیر کیا ہے۔

شکیل:- جھونٹے لئے پھرو یا مگر اب میرے منہ نہ لگو میں نے کہہ دیا ہے۔

خالہ جمالو:- اچھا اب تم ہی غم کھاؤ بھیا۔

نوشابہ:- نہیں میں تو یہ پوچھتی ہوں کہ آخر انکا ارادہ کیا ہے۔

خالہ جمالو:- توبہ ہے بیٹا مرد کی بات کا جواب نہیں دیتے ہیں میری جان لو۔

شکیل:- جواب؟ جواب تو جب تک میری سات پشت کو وہ نہ سنا لیں گی اسوقت تک ان کو چین آہی نہیں سکتا مگر میں بھی اب چپ رہنے والا نہیں ہوں۔ کان کھول کر سن لو۔

خالہ جمالو:- بیٹا بری بات ہے غصہ حرام ہوتا ہے۔

نوشابہ:- نہیں خالہ آج انکو دل کی بھڑاس نکال لینے دیجئے۔

خالہ جمالو:- اچھا ہٹو تو سہی یہاں سے چلو تم ادھر باورچی خانہ میں۔

شکیل:- دل کی بھڑاس نکالوں تو بیگم صاحب تمہاری دنیا سیاہ ہو کر رہ جائے تم ہو کس ہوا میں۔

خالہ جمالو:- اچھا خیر بیٹا تم ہی مان جاؤ۔ چلو تم ادھر اپنے کمرے میں۔ میرا بھی کوئی حق ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔

شکیل:- مگر آپ دیکھ رہی ہیں ان کا تننا۔ اک پر مکھی ہی نہیں بیٹھنے دیتیں۔

نوشابہ:- اے میں کیا اور میرا تننا کیا کوئی ہوتی تننے والی تو پتہ بھی چل جاتا۔

خالہ جمالو:- آؤ بیٹا شکیل۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اپنے کمرہ میں چلو۔ ہٹو یہاں سے اور اب تم بھی چپ رہو نوشابہ۔ سمجھیں کہ نہیں۔ (خالہ جمالو شکیل کو لے کر جاتی ہیں کمرہ میں پہنچکر)

شکیل:- بدنام ہے میرا غصہ کہ صاحب بارود کے بنے ہوئے ہیں۔ آگ بگولہ ہیں۔ اور یہ ہیں وہ ہیں۔

خالہ جمالو:- (آہستہ سے) توبہ ہے بھیا۔ عورت کا ایسا غصہ بھی کس کام کا کہ مرد غم کھا جائے اور وہ نہ مانے۔ تم کو تو بھیا میں لے بھی آئی۔ مگر وہ میرے قابو میں نہ آئی۔

شکیل:- جی ہاں یہ ان لوگوں سے کہئے جو ان کو بے زبان اور مجھکو آتشبازی کا قلعہ اور توپ کا گولہ کہتے ہیں۔

خالہ جمالو:- منہ دیکھی نہیں کہتی ہوں بھیا۔ میں نے تو تم کو کبھی غصہ کرتے ہی نہیں دیکھا۔ غصہ کرتے تو اسی وقت آفت آجاتی۔

شکیل:- خالہ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ دن رات کی یہی کل کل ہے۔ گھر کی برکت اٹھی۔ ادھار نے گھیر رکھا ہے مگر یہ نحوست کسی طرح جاتی ہی نہیں میں بھی آخر آدمی ہوں کہاں تک غم کھاؤں۔

خالہ جمالو:- بھیا میرے لئے جیسے تم ویسی وہ۔ سب مجھے خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔ تم جیسی برداشت سے کام لیتے ہو دوسرا مرد ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ سچ سچ (آہستہ سے) اس کا مزاج ہے بہت چڑچڑا۔

شکیل:- اب بتلائیے بھلا اس میں غصہ کی کونسی بات تھی تیل کے لئے جیب میں دام پڑے تھے کہ راستہ میں نیلام ہوتا ہوا ملا۔ یہ جگ اور گلاس کا سٹ کسی طرح بھی ڈھائی تین روپیہ سے کم کی چیز نہیں تھی۔ میں نے ایک روپیہ کی بولی بولدی اور میرے نام چھوٹ گئی۔

خالہ جمالو:- بھلا بتاؤ مفت کا سمجھو۔ تیل تو موا مارے کا کیا ہے مگر یہ تو گت کی ایک چیز گھر میں آگئی تھی۔

شکیل:- گت کی چیزوں کا حال تو یہ ہے کہ ہر مہینے ایک چائے کا سٹ لاتا ہوں اور آٹھویں دن قسم کھانے کے لئے بھی کسی پیالی میں کنڈا دکھا دیجئے تو جو چور کی وہ میری سزا۔

خالہ جمالو:- اے تو میں دیکھتی ہی ہوں۔ موئے چائے کے برتن ٹھیکریوں کی شکل کے میں نے تو ہمیشہ دیکھے اور ہمیشہ نئے سٹ آتے ہوئے بھی دیکھے۔

شکیل:- خالہ کیا مجال جو وقت پر ایک چیز بھی گت کی اس گھر سے نکل آئے۔

خالہ جمالو:- بیٹا یہ باتیں ہیں ڈھنگ کی اور ڈھنگ ان میں نام کو نہیں ہے۔ گھرداری جسے کہتے ہیں وہ تو جانتی ہی نہیں۔

شکیل:- یہی بات اگر میں کہہ دوں تو ابھی لینے کے دینے پڑ جائیں پھر یہ دق سیکے جانے کی دھمکی۔

سلہ بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی

خالہ جمالو:- ہائے کمبخت - اور جو تمہارے منہ سے بھی کچھ نکل جائے - بھائی بندہ بشر ہے کسی وقت منہ سے نکل جائے کہ جاؤ اب کبھی صورت نہ دکھانا تو پھر کیا ہو -

شکیل:- ہو گیا - جو کچھ بھی ہو ان کی بلا سے - وہ تو خدا سے چاہتی ہیں کہ وہ میکے میں رہیں اور دنیا مجھ پر تھوکے -

(نوشابہ آواز دیتی ہے)

نوشابہ:- خالہ ــــ اے خالہ ــــ ذرا ادھر آؤ -

خالہ جمالو:- (آواز دے کر) آ رہی ہوں بیٹی (شکیل سے آہستہ سے) اچھا بیٹا اب اسوقت تم ہی چپ ہو رہو (جاتی ہیں)

نوشابہ:- ابھی تک وہ میرا دکھڑا آپ سے رو نہیں چکے -

خالہ جمالو:- کیا بتاؤں بیٹا میرے لئے تو جیسی تم ویسے وہ - مگر کاہے کو ایسے مردوئے ہوتے ہوں گے کہ گھر والوں کا دم ہی نکال لیں -

نوشابہ:- آخر کیا کہہ رہے تھے -

خالہ جمالو:- اے بہن ختم کرو - جو کچھ انھوں نے کہا میں نے جواب دے دیا - اب جو کچھ تم کہو وہ بھی سن لوں گی - مگر میں نے تو ایسا آگ کا بنا ہوا مزاج دیکھا ہی نہیں -

نوشابہ:- اے خالہ آپ نے دیکھا ہی کیا ہے - آپ کی وجہ سے تو اسوقت کچھ بولے ہی نہیں وہ تو کہئے کہ میں خود چپ ہو گئی نہیں تو میکے بھیجنے کے لئے ابھی ڈولی لا کے کھڑی کر دیتے -

خالہ جمالو:- ہائے میرے اللہ - اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ جب دیکھو میکے جانے کی دھمکی - جب دیکھو میکے جانے کی دھمکی -

نوشابہ:- کیا کہا میں دھمکی دیتی ہوں میکے جانے کی یا اٹھتے بیٹھتے مجھ ہی کو میکے کے طعنے ملتے ہیں -

خالہ جمالو:- اے بیٹا چپ بھی رہو کیا میرے اس بڑھے جونڈے میں سیاہی لگواؤ گی - اس نے تو جانے کیا کیا کہا - مگر میں تو کہتی ہوں کہ بیٹی اب جانے ہی دو -

نوشابہ:- نہیں بتلایئے تو آخر اور کیا کیا کہا - میں بھی سنوں -

خالہ جمالو:- نہ بی بی - بندی ان باتوں سے بہت دور بھاگتی ہے کہ ادھر کی اُدھر اور اُدھر کی ادھر کرتی پھرے - لگائی بجھائی کرنے پر آؤں تو اس نے تمہارے پھوہڑ پن، تمہاری بدمزاجی، تمہارے بے ڈھنگے پن کی جتنی باتیں کہی ہیں سب ہی کہہ دوں اور بیکار بات میں بات بڑھ جائے - میں تو چلئے کے سٹوں کا بھی ذکر کرنا نہیں چاہتی کون بیوی میاں کے قصہ میں اپنی گردن پھنسائے -

نوشابہ:- نہیں خالہ تو کیا میں ان سے کہنے جا رہی ہوں مگر مجھے بھی تو معلوم ہو جائے کہ میری طرف سے ان کے دل میں کیا کیا غبار ہیں -

خالہ جمالو:- آج کو لڑائی ہے میاں بیوی کی لڑائی ہی کیا - بات پیچھے لڑائی اور بات پیچھے میل - بعد میں گردن ماری جائے خالہ نگوڑی کی - تو بیوی مجھ سے کچھ نہ پوچھو - تم جانو تمہارا کام - مگر یہ تمہارا ہی دل گردہ ہے جو سب کچھ ٹھنڈے دل سے سنتی ہو -

نوشابہ:- (اطمینان سے) نہیں خالہ تمہاری قسم میں ان سے نہ کہوں گی - مگر مجھے بتائیے تو سہی آپ کو میری جان کی قسم -

خالہ جمالو:- یہ تم میں نوشابہ بڑی بری عادت ہے کہ ذرا سی بات میں جان کی قسم دے دی - اے کہہ کیا رہا تھا - یہی کہہ رہا تھا کہ ایسی منحوس ہیں کہ اس گھر کی برکت اڑا دی ہے - ڈھنگ ایسے ہیں کہ مہینے پیچھے نیا چائے کا سٹ لاتا ہوں اور چار دن میں پیالیوں کے کنڈے تک غائب ہو جاتے ہیں - میرا تو خیال ہے کہ اسے شبہ یہ ہے کہ نئے سٹ تم میکے بھجوا دیتی ہو اور گھر میں پرانے کے پرانے رہ جاتے ہیں -

نوشابہ:- خدا غارت کرے مجھے جو میں ایسی چھچھوری باتیں کروں اور نہ میرے میکے والے ایسے - اُن کا بس چلے تو وہ فوراً انکا گھر بھر دیں ابھی ابا جان نے میز کرسیاں ان کو منگا کر دی ہیں کہ اپنا دفتر باہر کے کمرے میں سجاؤ - بائیسکل ٹوٹ گئی تھی تو نئی بائیسکل لے کر دی اور صاحب الٹا اسکا یہ مل رہا ہے کہ میں اپنے یہاں کے برتن چرا چرا کر اپنا میکہ بھر رہی ہوں -

خالہ جمالو:- اے چپکے چپکے بولو - کیا سچ مچ میرے منہ میں کالک لگواؤ گی - کہ اچھی خالہ آئی تھیں جو آگ لگا کر چلی گئیں - میں نے ان سے بھی کہہ دیا ہے اور تم سے بھی کہتی ہوں کہ خدا کے لئے میری ٹانگ بیچ میں نہ کھینچو - کوئی سنے تو کہے کہ عجیب لتری موئی عورت ہے -

نوشابہ:- قسم کھا کے کہتی ہوں خالہ کہ میرے میکے والے ان کے اتنی سی چیز کے شرمندہ نہیں ہیں -

خالہ جمالو:- اے بہن نہ جانتی ہوں تو مجھ سے کہو کبھی وہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں آتا - ساس الگ داماد پر جان چھڑکتی ہیں اور سسر تو جیسے داماد کے نام پر بیٹھے ہی جاتے ہیں مگر وہ تو کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا -

نوشابہ:- اے بس یہ خاطر میں لاتے ہیں کہ میں چائے کے نئے سٹ ہر مہینے انکو بھجوایا کرتی ہوں اور یہ بیچارے ایسے چپ رہنے والے کہ چپ ہو رہتے ہیں -

(شکیل آواز دیتا ہے)

شکیل:- (بلند آواز سے) خالہ ذرا میری بات سن جایئے -

خالہ جالو:- آئی بیٹا نوشابہ سے، بیٹی میری لاج تیرے ہاتھ ہے کہیں تو اس سے سب باتیں لگا دے۔

نوشابہ:- آپ کی بھی کیا باتیں ہیں خالہ (خالہ جاتی ہیں)

شکیل:- اب تک وہی لگی لپٹی ہوگی۔ اب سمجھے کہ دو تین دن کے لئے گویا چھٹی ہوئی

خالہ جالو:- کیا بتاؤں بھیا- یہ عمر ہونے کو آئی مگر میں نے تو اس گھر کا سا کارخانہ کہیں دیکھا نہیں۔ اے کون سے سسرال والے داماد کے ساتھ سلوک نہیں کرتے مگر وہ سلوک گنواتے نہیں جاتے توبہ ہے اللہ توبہ ہے۔

شکیل:- سلوک؟ یعنی میرے ساتھ کوئی سلوک بھی کیا ہے ان کے میکے والوں نے۔

خالہ جالو:- اے ہے بھیا کیا مجھ کو گردن میں ہاتھ دے کر نکلواؤ گے اس گھر سے۔ لو اور سنو وہ سنے تو سمجھے کہ میں نے آکر یہاں لگائی بجھائی کی ہوگی۔ میں کچھ نہیں جانتی بھیا تم جانو اور تمہارا کام مگر شاباش ہے ایسی بیوی کو جو میاں سے ایسی بات کہے۔

شکیل:- بتایئے نا آخر کیا فرمایا انھوں نے اور کیا سلوک ہوا ہے ان کے میکے والوں کی طرف سے۔

خالہ جالو:- کچھ نہیں بھیا کچھ نہیں۔ میں تمہاری ان سے اور ان کی تم سے اگر جا کر لگاؤں تو مفت خدا میں بات کا بتنگڑ بنے گا اور بیچ میں ماری جاؤں گی میں۔

شکیل:- نہیں خالہ میں ان سے کہنے تھوڑی جا رہا ہوں۔ آپ بتایئے نا کہ یہ معمہ کیا ہے مجھے تو کوئی سلوک یاد نہیں پڑتا۔ آخر میں بھی تو سنوں کہ وہ کیا کیا نوازشیں اور پرورشیں ہیں آپ کو خدا کی قسم بتایئے۔

خالہ جالو:- اے میں کہتی ہوں تم ایک بات کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ مگر بھیا جب تم جانتے ہو تو پھر کیوں ہر چیز سر جھکا کر لے لیتے ہو۔ موئی دمڑی کی چیز اور سوا لاکھ کا احسان۔

شکیل:- خدا کے واسطے بتایئے کہ میں نے کونسا احسان لیا ہے۔ میں ان سے یا کسی سے کچھ نہ کہوں گا میں وعدہ کرتا ہوں مگر مجھ کمبخت کو معلوم تو ہو جائے۔

خالہ جالو:- اے کمبخت ہوں تمہارے دشمن۔ کیا اچھی زبان ہے۔ موئی دو ٹکے کی پیر گاڑی کیا دیدی کہ جیسے میرے بچے کو خرید لیا۔

شکیل:- بائیسکل کا ذکر ہے۔ اب دیکھئے یہ کم ظرفی اور اوچھا پن ہیں اسی لئے انکار کرتا تھا تو ان کے والد صاحب بھی برہم تھے اور خود بدولت بھی ناراض تھیں۔ قصہ یہ ہوا خالہ کہ وہ جوان کے بھائی صاحب ہیں نا لبس کی گانٹھ، ایک دن بائیسکل اٹھا کے لے گئے اور اس کو کسی موٹر سے ٹکرا کر چرخہ بنا لائے۔ میں چپ ہو رہا۔ خسر صاحب کو جو خبر ہوئی تو وہ نئی بائیسکل لے کر تشریف لائے۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کہ مجھکو ضرورت نہیں میں اسی کو ٹھیک کرا لوں گا۔ مگر وہ کسی طرح نہ مانے اور اس کو میرے سر مونڈھ گئے۔ اب آپ ہی بتائے کہ میں پھر کیا کرتا۔

خالہ جالو:- اے بیٹا سسرال والے دیتے ہی ہیں مگر احسان گنواتے نہیں ہیں۔

شکیل:- تو احسان کس نامعقول پر کیا۔

خالہ جالو:- اور ہاں یہ احسان بھی نہیں مگر وہاں تو سینکڑوں احسان ہیں۔ ایک ایک میز کرسی تک کا۔ مگر بھیا میں کچھ نہیں کہتی۔

شکیل:- میز کرسی۔ خدا کی قسم جی چاہتا ہے کہ اپنا سر پیٹ لوں اور یہ میز کرسیاں سب ان کے منہ پر مار آؤں۔

خالہ جالو:- چپکے چپکے بیٹا چپکے چپکے۔ کیوں میری جان عذاب میں ڈالو گے۔ میں تو خود ان جھگڑوں سے الگ رہتی ہوں۔ اپنے ایک کونے میں پڑی رہتی ہوں۔ نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔

شکیل:- خالہ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ میز کرسیاں میرے لئے عذاب بن کر رہ گئی ہیں۔ ان کا قصہ بھی سن لیجئے۔ خسر صاحب محترم و معظم اب میں کیا کہوں ان بزرگ کو۔

خالہ جالو:- ہاں بیٹا خسر بجائے باپ کے اور وہ تو ویسے بھی ماموں ہیں تیرے۔

شکیل:- اجی ایسے ماموں بہت ہوتے ہیں۔ مجھے تو شرم آتی ہے ان کا بھانجہ یا داماد کہلاتے ہوئے۔ تو خالہ ان حضرت نے کسی کا سامان قرق کرایا تھا۔ اس سامان کی تمام کارآمد چیزیں تو اپنے یہاں رکھ لیں اور جو کوڑا کرکٹ تھا وہ میرے سر پر ڈھیر کر گئے نتیجہ یہ ہوا کہ باہر کا کمرہ میرے بیٹھنے تک کے کام کا نہ چھوڑا۔ حال یہ ہے کہ کسی میز کا پایہ ندارد ہے تو کسی کرسی کے بید غائب۔ کسی کا ہتھہ نہیں ہے تو کسی میں سب کچھ ہے مگر سب الگ الگ۔ نہ جانے کیا آخر ہے۔

خالہ جالو:- اور اس موئے کباڑ خانے کا احسان اتنا بڑا۔ واہ واہ واہ۔

شکیل:- آج تک خدا کے فضل اور آپ کی دعا سے ایک پیسہ کا ان سسرال والوں سے شرمندہ نہیں ہوں۔ تو یہ بیگم صاحب آپ سے یہی کہہ دیتی تھیں کہ میرے گھر والوں نے بائیسکل کی خیرات دی اور ان میز کرسیوں سے مجھکو نوازا۔

خالہ جالو:- خیر ہوگا بیٹا۔ تمہارا دیکھنے والا خدا ہے کہ تم نے اپنی سسرال والوں کے ساتھ کیا کیا اور اس کا بدلہ تم کو کیا ملا۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں کہ تم خود اپنے سالے سالیوں کے ساتھ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سلوک کرتے رہتے ہو۔ یہ تو جو نہ جانتا ہو اسے بتاؤ۔

شکیل:- خدا گواہ ہے خالہ کہ آج تک یہ ذکر زبان پر نہیں لایا تھا مگر اب کہلوایا گیا ہے تو کہتا ہوں کہ خسر صاحب نے عاجز آکر میاں سلیم یعنی انہی بیگم صاحبہ کے بھائی صاحب کی تعلیم چھڑا دی تھی کہ میں اب خرچ نہیں برداشت کر سکتا۔

میں نے کہا کہ لاؤ میں اس کی تعلیم کا ذمہ لے لوں۔ آج تک کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور میں برابر کالج کی فیس، کتابوں کا خرچ، ماسٹر کی تنخواہ، سب اپنے ذمہ لئے ہوں مگر اس کا بدلہ یہ مل رہا ہے۔

خالہ جمالو:۔ بیٹا یہ تمہارا ہی جگرا ہے کہ اس تھوڑی سی پونجی میں ایسے ایسے ہاتھی باندھے ہوئے ہو اور پھر یہ باتیں بھی سنتے ہو۔

شکیل:۔ اور اسی پر کیا ہے ابھی بیگم صاحبہ کی بہن صاحبہ کی شادی میں تنخواہ کٹوا کر قرض لیا اور جوڑے کے ساتھ زیور تک دے کہ بھائی بیوی کا دل نہ میلا ہو مگر اس کا پھل یہ مل رہا ہے۔

خالہ جمالو:۔ ہاں ہاں بیٹا عالی حوصلہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہی تو میں نے اس سے بھی کہا کہ وہ بھلا بائیسکل اور ان میز کرسیوں کا احسان کیا لے گا۔ جو اس باپ کا بیٹا ہے جس نے آج تک کسی کے سامنے گردن نہیں جھکائی۔

(نوشابہ آواز دیتی ہے)

نوشابہ:۔ خالہ ذرا ادھر آئیے۔

خالہ جمالو:۔ آتی ہوں بیوی (شکیل سے آہستہ سے) اچھا بیٹا اب تم جاؤ اور چھوڑو اس ذکر کو (جاتی ہیں)

نوشابہ:۔ یہ سلیم کا کس بات پر ذکر چلا تھا خالہ۔

خالہ جمالو:۔ چلا ہوگا موا کسی بات پر ذکر، ایک سلیم کا کیا، تمہاری چھوٹی بہن تک کی شادی کا ذکر تھا مگر میں اب سب تم سے لگا کر قیامت برپا کراؤں اس گھر میں۔

نوشابہ:۔ نہیں خالہ بتائیے تو سہی کہ آخر بات کیا تھی میں بھی تو سنوں۔ انھوں نے اگر آپ سے کچھ کہا ہے تو میں بھی تو بتاؤں کہ بات ہے کیا۔

خالہ جمالو:۔ یہ تو بتاؤ کہ میں جو دو دن کے لئے آگئی ہوں تو کیا مجھے کالا منہ کرکے اس گھر نکلواؤگی؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟ میں تو تم سے بھی سنتی ہوں اور ان سے بھی مگر ایک کی بات دوسرے سے کہنا یہ کام شیطان کا۔ میں اچھے دل برے کرنے نہیں آئی ہوں۔

نوشابہ:۔ مگر میں تو خود سن رہی تھی کہ کچھ سلیم کی تعلیم کا ذکر تھا۔

خالہ جمالو:۔ اے جب تم سن ہی چکی ہو تو مجھ سے کیا پوچھتی ہو یہی کہہ رہا تھا کہ سلیم کی تعلیم کا خرچ الگ میرے سر ڈال دیا ہے اور ان کے گھر کی ایک ایک شادی اور بیاہ کی تقریب میں قرض لے لے کر بوٹی بوٹی بندھواتا جاتا ہوں۔ اور میں نے تو کہہ دیا کہ بیٹا اگر تم نے کوئی سلوک کیا ہے تو تم کو زبان سے کہنا تو نہیں چاہیئے۔

نوشابہ:۔ تو یہ بیچارے دلوا رہے ہیں سلیم کو تعلیم؟ کیوں نہیں۔ خالہ میں اب آپ سے کیا کہوں ابا جان کی عادت اور سیدھے پن کو کہ انھوں نے ایک دفعہ سلیم کی فیس اور کتابوں کے دام جوڑے تو ان بیچارے نے اسی خیال سے کہ یہ برا مان جائیں انکار نہیں کیا۔

خالہ جمالو:۔ اے ہے تو تم مجھ سے کیا کہہ رہی ہو۔ کیا مجھے پتہ نہیں کہ اللہ رکھے وہ خود جانے کتنے طالب علموں کو وظیفہ دے کر پڑھوا رہے ہیں وہ بھلا کسی کا احسان کیوں لینے لگے۔

نوشابہ:۔ سنئے تو سہی خالہ کہ انھوں نے جو حاتم کی گور پر لات ماری تھی اس کی بھی تو کوئی وجہ تھی۔ ابا جان نے کہیں ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ میں اس فکر میں ہوں کہ کوئی صورت نکل آئے تو تم کو سال دو سال کے لئے ولایت بھیجدوں۔ بس انھوں نے سوچا کہ بڑے میاں کو خوش کرنے کا اس سے اچھا موقع نہیں ہے۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا کہ دوسرے ہی مہینے سے چپ ہو کر بیٹھ رہے۔

خالہ جمالو:۔ اے ہے۔ تمہیں میری قسم؟ کیا پھر سلیم کی فیس ویس بھی نہیں دی۔

نوشابہ:۔ کیا باتیں ہیں خالہ آپکی بھی کیسی فیس اور کیسا کچھ۔ جب یہ سنا کہ ابا جان مقدمہ ہار گئے تو پھر سلیم کے کالج تک کا نام اس شخص نے نہیں لیا۔

خالہ جمالو:۔ بس حد کردی بیٹا۔ مگر خیر تمہاری بہن کو تو جہیز میں سونے کے زیوروں سے لاد دیا۔

نوشابہ:۔ اب خالہ مجھ سے کچھ کہلوائیے نہیں میمونہ کی شادی میں ایک موئی بنارسی ساڑھی پر رکھ کر انگریزی سونے کے بندے دیدئے تھے۔ یہ اسی کا طومار باندھا گیا ہے۔ مگر سلیم کی شادی میں ابا جان نے خود جوڑے کے ساتھ سونے کی گھڑی انکو اور جوڑے کے ساتھ کرن پھول مجھ کو دئے پھر دس روپے سہرہ بندھائی کے دئے وہ کسی گنتی ہی میں نہیں ہیں۔

خالہ جمالو:۔ اے تو بیٹا مجھے یہ سب کیا پتہ۔ مجھ سے اس نے کہا کہ میں نے یوں سالے کو تعلیم دلوائی اور یوں سالی کو جہیز دیا۔ میں سمجھی کہ سچ ہی کہتا ہے۔ اب تم نے مجھ کو سمجھا دیا۔ مگر وہ تو زمانہ بھر سے یہی کہتا ہوگا تم کس کس کو سمجھاتی اور بتاتی پھروگی۔ مگر خیر اب جانے بھی دو ان باتوں کو۔

نوشابہ:۔ خالہ باز تھوڑی آؤں گی۔ میں بھی اگر چھچھورے پن پر اتر آئی تو ایک ایک چیز گنواؤں گی۔ اس موئے باپ دادا کے مکان پر قرض لے کر بیٹھ رہے تھے۔ ابا جان کو جب خبر ہوئی انھوں نے پائی پائی ادا کی اور ان سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔

خالہ جمالو:۔ اوئی بیوی۔ آخر یہ مکان پر قرض لینے کی ضرورت کیا پڑ گئی تھی۔

نوشابہ:۔ وہی موا گھوڑوں کا شوق جس نے اس لاکھ کے گھر کو خاک کر رکھا ہے۔

خالہ جمالو:۔ تم تو ہو پھر لونڈیا۔ شادی بیاہ ہوگیا تو کیا ہوا مگر دنیا ابھی نہیں دیکھی ہے۔ یہ نہ گھوڑوں کا شوق ہے نہ کچھ۔ مجھے تو کچھ اور ہی دال میں کالا نظر آتا ہے۔ مگر خیر ہٹاؤ اس ذکر کو۔

نوشابہ:- (تسلی سے) خیر یہ تو میں ان کی غیبت میں بھی کہوں گی کہ کسی اور بات میں نہیں ہیں نہ کوئی ایسا ویسا شوق ہے البتہ یہ ہے کہ کمانے سے زیادہ ہمیشہ اڑایا اور گھر کی یہ حالت کر دی۔

خالہ جمالو:- بیٹا تم کرو ان مردوں کا اعتبار۔ میں نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ بھلا غضب خدا کا کہ مکان پر قرض لیا اور تم چپ رہیں۔

نوشابہ:- اے میری کیا مجال تھی جو میں بولتی۔ ابا جان تک بیچارے نے ایک لفظ نہیں کہا چپکے سے قرضہ چکا کر ان سے بس اتنا کہلوا دیا تھا کہ تم کو ضرورت تھی تو مجھ سے کہتے۔

خالہ جمالو:- واہ ری شرافت اور واہ رے دل۔ پہلے کوئی اتنا بڑا دل تو لائے۔

(شکیل آواز دیتا ہے)

شکیل:- خالہ ذرا ایک بات سن جائیے۔

خالہ جمالو:- (بلند آواز سے) آرہی ہوں۔ (نوشابہ سے چپکے سے) اچھا خیر اب تم ہی غم کھاؤ۔ (جاتی ہیں)

شکیل:- کچھ مکان اور قرض کے متعلق بات چیت تھی ابھی۔

خالہ جمالو:- اے بیٹا تم ان باتوں پر کان ہی نہ دھرو۔ ہوگی کچھ بات چیت۔ وہ مجھ سے جو کہہ رہی تھی میں اس کا ویسا ہی جواب دے رہی تھی۔

شکیل:- مگر میں تو ان کی اعلیٰ ظرفی دیکھ رہا ہوں۔ کوئی پوچھے کہ مکان پر قرض لیا تو کسی کا کیا اجارہ؟ اپنا مکان اپنی ضرورت قرض لیا۔ خوب کیا۔

خالہ جمالو:- وہی تو میں نے بھی کہا کہ آخر تم کون ہوتی ہو کہنے والی اس کے باپ دادا کی جائداد ہے وہ۔ ضرورت کے وقت کوئی کام لیتا ہے تو اس میں کسی کا کیا ساجھا۔

شکیل:- خالہ ضرورت بھی ایسی کہ جس کی بدولت آج پیٹ کو روٹی مل رہی ہے۔ نوکری کے لئے ضمانت داخل کرنے کی شرط تھی۔ آخر میں کہاں سے پانچ ہزار کی تیار رقم پاتا۔ میں نے مکان پر لے لی یہ رقم۔

خالہ جمالو:- خیر مکان پر تو تم نے لی تھی رقم۔ اچھا کیا تھا۔ مگر ان کے باپ سے کیوں ادا کروائی۔ ان کو تو بس اسی کا رونا ہے کہ کہاں تک میرے باپ پورا کئے جائیں۔

شکیل:- کس نامعقول نے ان کی رقم دبالی ہے خالہ۔ میں نے تو ان سے ذکر تک نہیں کیا تھا جب ان کو خود خبر ہوئی اور انھوں نے روپیہ دیا تو میں نے یہ سمجھ کے لیا کہ کسی اور کا نہ سہی ان ہی کا قرض سہی اگر میں ادا نہ کرتا جب کہتیں۔

خالہ جمالو:- تو یہ کہو کہ قرض لیا ہے۔ وہ تو کہتی ہے کہ ابا نے مکان چھڑا دیا اور اپنی گرہ سے رقم دی۔ خیر ہوگا یہی۔ دنیا اندھی نہیں بیٹا۔

شکیل:- دنیا تو اندھی نہیں ہے خالہ مگر یہ آنکھوں میں دھول جھونکنا کیا؟

خالہ جمالو:- تم بھی تو بیٹا نا سمجھی سے کام لیتے ہو۔ آخر جب انھوں نے سونے کی گھڑی دی اور سلیم کی سہرا بندھوائی کے دو سو روپے اور جوڑے دئے تو تم کیوں چپ ہو رہے؟

شکیل:- بس انہی باتوں پر جی چاہتا ہے کہ اپنا سر پیٹ لوں یا کپڑے پھاڑ کر کسی طرف کو نکل جاؤں۔ خالہ یہ بالکل جھوٹ بکتی ہیں میں نے خود ان دو سو میں پچاس اپنے پاس سے ملا کر سلیم کی دلہن کو منہ دکھائی میں دئے۔ اب آخر اور میں کیا کرتا۔

(نوشابہ آتی ہے)

نوشابہ:- دیکھئے خالہ اب میں کچھ کہوں گی تو ان کو لگے گا تبرا سلیم کی دلہن کو منہ دکھائی جو دی وہ بھی میرے یہاں رکھی نہیں گئی۔ مجھ کو ابا جان نے خود تین سو روپیہ بنک میں دیا۔

شکیل:- اجی وہ آپ کو ہزاروں دیدیں مجھ سے کیا؟ آپ ان کی بیٹی وہ آپکے باپ۔ مگر میں کسی کا شرمندہ نہیں ہوں۔ میں نے کس دن مکان کیلئے ان سے بھیک مانگی تھی؟

خالہ جمالو:- ہوگا بھی بیٹا۔

نوشابہ:- نہیں آپ نے نہیں بھیک تو انھوں نے مانگی تھی کہ اللہ کے نام پر میرے لڑکے کو تعلیم دلوا دو۔

خالہ جمالو:- اے ہے بیٹی اب تم ہی چپ رہو۔

شکیل:- میں بیچارا تعلیم کیا دلواتا جس کی پرورش سہرا بندھوائی کے دو سو روپیہ پر ہوتی ہے

خالہ جمالو:- جانے بھی دو بیٹیاں ان باتوں کو میرا دم الجھتا ہے ان باتوں سے۔

نوشابہ:- آپ کی پرورش وہ بیچارے کیا کریں گے آپ ہی ان کی لڑکیوں کے جہیز میں سونے کے زیور دے دے کر ان کی پرورش کر رہے ہیں۔

خالہ جمالو: بھئی اللہ بڑی ضدی ہو نوشابہ تم بھی اب چپ کیوں نہیں رہتیں۔

شکیل:- اجی میں زیور کیا دونگا میں خود آپ کے یہاں کی ٹوٹی پھوٹی میز کرسیوں کا محتاج رہتا ہوں۔

خالہ جمالو:- اچھا بیٹا تم مجھے تو ڈولی منگا دو پھر تم دونوں جانو اور تمہارا کام۔

نوشابہ:- میری بہنوں کی شادی تک نہیں ہو سکتی جب تک آپ جہیز نہ دیں۔ میرے بھائی پڑھ نہیں سکتے جب تک آپ تعلیم نہ دلوائیں اور ان کا خرچ نہ اٹھائیں۔

خالہ جمالو:- اچھا بیٹا نہ مانو تم۔ بڑے بوڑھوں کی بات تو مان لیا کرو۔

شکیل:- جی نہیں یہ حال تو میرا ہے کہ آپ کے یہاں کی بائیسکل تک کا محتاج ہوں۔

خالہ جمالو:- میرا لال بس ہوگیا۔ یہ موئی لین دین کی کونسی ایسی بات ہے میرا دماغ تو تم دونوں نے چکرا دیا۔

شکیل:- خالہ آپ نہیں جانتیں جس طرح آج انھوں نے آپ کے سامنے

مجھے بدنام کیا ہے اسی طرح یہ تمام دنیا میں ڈھنڈھورا پیٹتی رہتی ہیں۔

نوشابہ:۔ اور آپ نے تو جیسے مجھکو اور میرے گھر والوں کو خالہ کے سامنے کچھ کم ہی کہا ہے۔

خالہ جمالو:۔ اے تو کچھ کہا بھی ہو کسی نے۔ مجھ خالہ کمبخت کے سامنے یا آپ ہی آپ یہ باتیں ہو رہی ہیں۔ نہ تم میرے لئے غیر ہو بیٹیا نہ تم غیر ہو بیٹی۔ گودوں میں پال کر اتنا بڑا کیا ہے اور اب مجھ ہی سے غیریت آتی ہے۔

شکیل:۔ مگر ان کو آپ ہی سے سہی سچ بتایئے کہ یہ باتیں کہنا چاہئیں تھیں۔

خالہ جمالو:۔ کیسی باتیں اور کیا کچھ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

نوشابہ:۔ کہا کیسے نہیں میں نے کہا ہے مگر جیسا سنا ویسا کہا۔ میرے اور میرے ماں باپ کے لئے کہا جائیگا تو میں بھی ضرور کہوں گی۔

شکیل:۔ تو پھر میرے متعلق جھوٹ سچ لگایا جائیگا تو میں بھی چپ رہنے والا نہیں ہوں۔

نوشابہ:۔ یہ آخر خالہ کدھر چلیں۔

شکیل:۔ اور کچھ ان سے کہنے کو باقی رہ گیا ہو تو بلا لیجئے نا۔ میز کرسیوں کا احسان گنوا دیا۔ مکان کے قرض والی پرورش گنوا دی۔ سہرا بندھوائی کی رقم اور سونے کی گھڑی تک کا ذکر ہو چکا اب آخر رہ کیا گیا ہے۔

نوشابہ:۔ ہاں تو جب بات کہوائی جائے گی تو ضرور کہی جائے گی میرے بھائی کو آپ نے کونسی تعلیم دلوائی۔ میری بہن کو کون جہیز سے آپ نے لا دیا۔

شکیل:۔ یہ آخر ان باتوں کا ذکر کرنے کی خالہ کو کیا ضرورت تھی۔

نوشابہ:۔ اور میری باتیں لگانے کی آخر کیا ضرورت تھی۔

شکیل:۔ اتنی باتیں آخر پیدا کیونکر ہوتیں میں نے تو جب آپ کی طرف سے طعنے سنے اس وقت خود بھی کچھ کہا۔

نوشابہ:۔ آپ نے جب میرے میکے والوں کے ساتھ اپنے سلوک گنوائے تو میری زبان سے بھی کچھ نکلا۔

شکیل:۔ اور تو خیر کچھ نہیں مگر خالہ کے سامنے گڑے مردے اکھڑے خوب۔

نوشابہ:۔ یہ سب خالہ نے ایک ایک کی بیس بیس لگا کر آفت مچوائی۔

شکیل:۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ٹھیک ہے مگر ایک ایک کی بیس بیس لگانے کا آخر ان کو موقع ہی کیوں دیا گیا۔

نوشابہ:۔ موقع میں نے دیا کہ آپ نے؟ احسان میں گنوانے بیٹھی تھی کہ آپ؟

شکیل:۔ احسان میں نے گنوائے تھے گویا۔

نوشابہ:۔ اور نہیں تو کیا میں نے گنوائے تھے؟

شکیل:۔ بے شک آپ نے گنوائے تھے۔ میز کرسیوں کا ذکر آپ نے کیا۔ بائیسکل کا ذکر آپ نے کیا۔

نوشابہ:۔ یہ کیوں کیا اس پر یہ ذکر کیا کہ آپ جو کہتے ہیں کہ میں نے چائے کے

غزل

مسکراتے ہوئے تاروں نے تجھے یاد کیا
حسنِ فطرت کے نظاروں نے تجھے یاد کیا

ابر نے تیری جوانی کے ترانے گائے
جھومتے میکدہ زاروں نے تجھے یاد کیا

نقرئی قہقہے تیرے نہ کوئی بھول سکا
غنچے چٹکے تو بہاروں نے تجھے یاد کیا

یاسمیں کرنوں کی آنکھوں کو رہی تیری تلاش
رات بھر چاند ستاروں نے تجھے یاد کیا

آنکھوں آنکھوں میں جو چھپ چھپ کے ہوا کرتے تھے
ان محبت کے اشاروں نے تجھے یاد کیا

کسی صورت نہ بجھی آگ تری الفت کی
دل سے اٹھتے ہی شراروں نے تجھے یاد کیا

جن کے سینے میں ہیں تیرے نقشِ کفِ پا کے ہزار
ان تیری راہگزاروں نے تجھے یاد کیا

کوئی فارغ سا وفادار نہ پایا ہوگا
یاد کرنے کو ہزاروں نے تجھے یاد کیا

فارغ بخاری

سیٹ اپنے میکے بھجوا دیتی ہوں اور یہاں ٹوٹی ہوئی پیالیاں رہ جاتی ہیں۔

شکیل:۔ میں نے یہ کہا۔ اگر میں نے کہا ہو تو خدا مجھ کو غارت کر دے۔

نوشابہ:۔ کدھر گئیں خالہ میں ابھی بجھواتی ہوں میرا کیا سر پھر گیا تھا کہ میں بات کی بات پیدا کر دیتی۔

شکیل:۔ ہاں ہاں بلایئے نا خالہ کو (آواز دیتا ہے) شکور۔ او شکور۔ ذرا خالہ کو تو ادھر بھیجنا۔

نوشابہ:۔ میرے تو اسی بات سے آگ لگی کہ اب میں ایسی چھچھوری اور میرے گھر والے ایسے گئے گذرے ہوگئے۔

شکیل:۔ سارے شکور سنا نہیں تو نے ذرا خالہ کو بھیجنا۔

شکور:۔ (آکر) سرکار وہ تو ابھی تانگہ منگوا کر کہیں گئی ہیں۔

نوشابہ:۔ دیکھ لیا آپ نے؟

شکیل:۔ میں کیا دیکھوں تم ہی دیکھو۔

نوشابہ:۔ قبر میں پیر لٹک گئے مگر یہ لگائی بجھائی کی عادت نہیں گئی۔

شکیل:۔ اور نہ جائے گی عادت۔ خالہ کس کی ہیں آپ ہی کی نا۔

نوشابہ:۔ اور آپ کی تو جیسے خالہ ہیں نہیں۔ یہ اثر آپ کے خاندان کا ہے۔

شکیل:۔ میرے خاندان کی ہوتیں تو ٹھہرتی نا۔

نوشابہ:۔ (ہنستے ہوئے) نام بھی تو جمالو ہے۔

شکیل:۔ یہ تم نے سچ کہا بس میں چٹکی ڈال جمالو الگ کھڑی۔

نوشابہ:۔ نہیں بس میں چٹکی ڈال جمالو تانگہ چڑھی۔ (دونوں ہنستے ہیں)

ہانگ کانگ

کئی برس تک اسکولوں میں جغرافیہ کے نقشے بیکار پڑے رہے۔ ہانگ کانگ کے بندرگاہ سے سمندر میں جو متعدد نقطہ دار لکیریں کھنچی ہوئی تھیں ——— دو شنگھائی، ۵۰ میل ——— سنگاپور ۱۴۴۰ میل ——— ناگاساکی ۱۰۷۰ میل ——— ان کے کچھ معنی باقی نہیں رہے تھے۔ ان لکیروں پر میلوں کے یہ ہندسے بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے کہ جاپانیوں کے قبضہ میں آنے کے بعد سے ہانگ کانگ بالکل ویران تھا اور مشرق بعید میں اس کی پہلی سی مرکزی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔

لیکن یونین جیک کے جھنڈے کے نیچے ہانگ کانگ میں بڑی تیزی سے اور بڑے حیرت انگیز انداز میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ایک مرتبہ پھر ان نقطہ دار لکیروں میں سی پیدا ہو گئے ہیں۔ ہانگ کانگ کا ایک مستقبل ہے ——— جہاز اور ان کے بجتے ہوئے بھونپو ہانگ کانگ کے روشن مستقبل کا پیام سنا رہے ہیں جس میں اسے شاید وہی حیثیت حاصل ہو سکے جو مشرق بعید میں شنگھائی کو حاصل تھی۔ ایٹم کا نشانہ بنا ہوا ناگاساکی اب بالکل ختم ہو چکا ہے اور اصل میں ہانگ کانگ ہی اب طلوع ہوتا ہوا آفتاب ہے۔

یہ تبدیلی بے حد عجیب و غریب ہے۔ جو سڑکیں سنسان تھیں اب ان میں پھر رونق پیدا ہو گئی ہے۔ لوگ اب ہانگ کانگ کی گھما گھمی کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی تجارت اور تعمیر کے بے پایاں اور رنگین منصوبوں کے باوجود اس کی حیثیت کو کسی مثالی شہر کی سی نہیں، لیکن جیسا کہ ایک انگریز افسر نے کہا ہے ہانگ کانگ ایک ایسا شہر ہے جس کی زندگی مشرق بعید میں سب سے زیادہ معمول کے مطابق ہے۔

تباہی کے سال

پہلے ہانگ کانگ کو جاپانیوں نے لوٹا کھسوٹا اور پھر دو سال تک اتحادیوں نے اس پر یم باری کی ——— اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب بھی وہاں بعض ایسی مشکلیں باقی ہیں جنھیں حل کرنا ہے ——— مکانوں کی کمی، چور بازار، شہری زندگی کا انتشار اور اس کے لئے مستقبل کے آئین کا مسئلہ۔

اس شہر کو کئی سال تک جن تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا اس کا اندازہ اس کی برابر گھٹتی بڑھتی آبادی سے کیا جا سکتا ہے۔ اتحادیوں کے قبضہ کے وقت اس کی آبادی پندرہ لاکھ سے گھٹ کر تین لاکھ رہ گئی تھی۔ اور آج کل صرف یہاں کے چینی باشندوں ہی کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے اور لوگوں کی پیشین گوئی ہے کہ سال کے ختم ہوتے ہوتے اسکی آبادی لڑائی سے پہلے کی آبادی کے برابر ہو جائیگی۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سال کے ختم ہونے تک صرف ۲۰ فیصدی یورپین باشندوں کے رہنے کے لئے جگہ بنائی جا سکے گی۔ یہاں ۱۶۰،۰۰۰ چینی اب بھی ایسے ہیں جن کے رہنے کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ جاپانیوں کی تباہ کاریوں اور اتحادیوں کی بمباری سے ۱۹ ہزار سے زیادہ مکان تباہ و برباد ہو گئے اور بہت سے مکانوں کو پناہ ڈھونڈنے والے چینیوں نے لوٹ کھسوٹ لیا۔

اور اس طرح اتحادیوں کے انتظامی افسروں کے سامنے تعمیر کا ایک زبردست کام تھا۔ سب سے اہم مسئلہ خوراک کا تھا۔ تین لاکھ بھوکے چینیوں کی خوراک مہیا کرنے کے لئے چاول کی بہت بڑی تعداد باہر سے یہاں لائی گئی اور اسے راشن کر کے تقسیم کیا گیا۔ لیکن بے ایمان تاجروں اور رسد پہنچانے والوں نے چاولوں میں ریت ملا کر بھاری بھاری نفعے کمائے اور حکومت نے انھیں سخت سزائیں دیں۔ تعمیر کے ابتدائی کاموں میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں دو آدمیوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر اور اہم ہیں۔ یہ دونوں آدمی جنگ سے پہلے ہانگ کانگ میں ملازم تھے اور پچھلے اگست میں اتحادی عملہ کے ساتھ پھر ہانگ کانگ واپس آئے ہیں۔ ان دونوں کے نام تھے ڈیوڈ مکڈوگل اور والٹر تھامسن، اور ہانگ کانگ کے لوگ انھیں محبت میں "اسکاٹ لینڈ کی ٹیم" کہتے تھے۔

ان دونوں کو مقامی انتظام اور مقامی حالات کا جو تجربہ اور علم تھا اس کی مدد سے انھوں نے مقامی لوگوں سے وہ برادرانہ اتحاد قائم کر لیا، جو تعمیر کی دشوار ابتدائی منزلوں میں ضروری ہوتا ہے۔ ان دونوں نے انتظامی عملہ اور شہریوں کے درمیان ایک گہرا اور مضبوط ربط قائم کیا۔

پستہ قد، پھرتیلے، ۳۴ سال کے مکڈوگل ——— جو آج کل نو آبادی کے قائم مقام سکرٹری ہیں ——— پہلے ہانگ کانگ کی سول سروس میں تھے۔ ہانگ کانگ کے خاتمہ کے بعد جو لوگ یہاں سے بچ کر لندن پہنچے، مکڈوگل ان میں پہلے آدمی تھے۔ جب وہ لندن پہنچے ہیں تو جاپانی گولیاں اس وقت تک ان کی پیٹھ میں موجود تھیں۔ اور یہ گولیاں لندن کے اسپتال میں ان کی پیٹھ میں سے نکالی گئیں۔

ہنری بو

لیکن اتنے دن تک اس حالت میں رہ کر بھی ان کا زندہ بچ رہنا محض ایک عجیب و غریب اتفاق کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ان کی گردن اور کمر میں سخت زخم آئے تھے اور اس لئے وہ برابر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے الگ رہنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ ایک دن وہ ایک چینی کی دوکان میں چھپے ہوئے

تھے کہ اُن کی نظر گندھک کی گولیوں کی ایک شیشی پر پڑی۔ اس کے بعد سے اسپتال پہنچنے تک انھیں آٹھ دن لگے اور آٹھ دن تک وہ برابر دو گولیاں روز کھاتے رہے اور ان دو گولیوں نے انھیں کے لفظوں میں ۳۴ زخموں کو شیشے کی طرح صاف ستھرا کر دیا۔

اچھا ہو جانے کے بعد پچھلے اگست میں وہ وائس اڈمرل سر سِسل ہارکورٹ کے انتظامی عملہ کے ساتھ آزاد ہانگ کانگ واپس آئے جب مئی کے مہینہ میں ہانگ کانگ کا شہری انتظام سر مارک ینگ کے سپرد ہوا جو ہانگ کانگ کے خاتمہ کے وقت یہاں کے گورنر تھے تو یہاں کے حالات نے اچھی خاصی معمولی صورت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔

اس کے بعد سے بہت سے کارنامے ہوئے اور بڑے بڑے کارنامے ہوئے۔ ان میں سب سے بڑا یہ کہ مشرق بعید کے اس علاقہ میں برطانیہ کا وقار دوبارہ قائم ہو گیا ہے۔ برطانوی انتظام میں لوگوں کو ہانگ کانگ کے مستقبل کی طرف سے بڑا بھروسہ ہے۔

جب اتحادیوں نے ہانگ کانگ کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور چاولوں کی درآمد کر کے یہاں راشننگ کی پالیسی پر عمل شروع کیا تو ہانگ کانگ کی بکھری ہوئی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ اس نئے انتظام نے جنوبی چین کے بہت زیادہ لوگوں کو ہانگ کانگ کی طرف کھینچا جن کی تعمیری کاموں کے سلسلہ میں بے حد ضرورت تھی مئی کے مہینہ تک اس طرح کے چھ لاکھ آدمی ہانگ کانگ آ چکے تھے۔

ہانگ کانگ کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت مکانوں کا مسئلہ ہے یہاں تک کہ کسی نئے آنے والے آدمی کو دو کمروں کا مکان اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک وہ ایک بہت بڑی رقم — یعنی تقریباً تین سو پونڈ پیشگی ادا نہ کر دے ۱۹۳۹ء کے مقابلہ میں کرائے تین گنے ہو گئے ہیں حالانکہ سرکاری حکم کے مطابق کرایوں کی تعداد اتنی کر دی گئی ہے جتنی پرل ہاربر کی بمباری سے پہلے تھی۔ لیکن لڑائی کے بعد کے ہانگ کانگ کا سب سے بڑا پہلو وہاں کی ڈکیتیاں ہیں، جو دن دہاڑے ہوتی ہیں، اس لئے کہ جاپانیوں کے ہتھیار ڈال دینے اور لڑائی کے زمانہ کی بدنظمی کی وجہ سے ہتھیار لوگوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے۔ شمالی چین کی طرف جانے والی چینی فوجیں ایک طرح سے انگریزوں کی مہمان ہوتی ہیں۔ لیکن پچھلے نو مہینوں میں ان فوجوں کے سپاہی بہت سی نامناسب حرکتیں کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے نوکروں کو مارا پیٹا، لبوں کے کرائے ادا کرنے سے انکار کر دیا، سنیماؤں میں بغیر ٹکٹ جانے کی کوشش کی یہاں تک کہ کینٹن میں جب چینی سپاہیوں کو بغیر ٹکٹ اندر جانے سے روکا گیا تو انھوں نے ٹکٹ گھر کے بابو کو گولی سے مار دیا، اور چینی شہریوں سے زبردستی اپنی بات منوانی چاہی۔ ان سپاہیوں میں سے بہت سے برما کے محاذ سے لوٹتے ہوئے ہیں اور وہاں سے اپنی فوجی بہادری کی برتری کا احساس اپنے ساتھ لائے ہیں۔ انھوں نے برطانوی مہمان نوازی سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ہانگ کانگ کو اپنی ملکیت سمجھنے لگے۔ پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے وقتاً فوقتاً لوگوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے کی بھی کوششیں کیں اور اس طرح ملی جلی آبادی میں نفرتیں اور اختلاف پیدا کر دئے۔

درآمد میں اضافہ

ہانگ کانگ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی اس مختصر مدت کی سب سے حیرت انگیز بات اس سال کے پہلے تین مہینوں کی درآمد کی مقدار ہے ۱۹۳۹ء میں انھیں مہینوں میں درآمد کی چیزوں کی قیمت ۰۰۰،۵۴۸،۷ پاونڈ تھی۔ اس کے برخلاف ان تین مہینوں میں درآمد ۰۰۰،۸۷،۴۸،۸ پاونڈ تھی۔ برطانوی ملایا سے آنے والی چیزوں کی تعداد تقریباً چھ گنی ہو گئی ہے اور چین سے آنے والی چیزوں کی تقریباً دو گنی — ان مختلف آنے والی چیزوں میں، برطانوی موٹر کاریں جو ڈاکٹروں اور ضروری کام کرنے والوں کے لئے آتی تھیں، گھڑیاں اور فاؤنٹین پین (نوجوان چینی امیروں کے لئے) اور دس پاونڈنی جوڑے کے (NYLON) ان کی عورتوں کے لئے۔

اسی عرصہ کی باہر جانے والی چیزوں کی قیمت ۰۰۰،۲۴۴،۶،۵ پاونڈ تھی اور اس کے مقابلہ میں ۱۹۳۹ء میں ۰۰۰،۵۲۳،۲ پاونڈ۔

آج کل کی زندگی دسمبر ۱۹۴۱ء کی زندگی سے بہت مختلف ہے جو لوگ ہانگ کانگ چھوڑ کر چلے گئے تھے وہ اب اپنے گھروں کو واپس آئیں تو انھیں اپنی چیزیں اپنے گھروں کے بجائے چور بازار میں جا کر ملیں گی۔ لیکن نسلی امتیاز اور فرق اب انھیں گذرے ہوئے زمانہ کی ایک چیز معلوم ہوگی۔ فوجیوں کے ساتھ بھی اب ان کا برتاؤ زیادہ دوستانہ ہے۔ گو لوگوں کو کھانے کے لئے اب پیٹ بھر کر غذا ملتی ہے لیکن زندگی کی ضروری چیزیں کثرت سے نہیں ملتیں اور چاول کا راشن صرف اسی قدر ہے جتنا عام صحت کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

تمام ضروری چیزوں کی قیمتوں پر کنٹرول ہے۔ اور اب یہ توقع کی جاتی ہے کہ کپڑے کی قیمت پر (جو لڑائی سے پہلے کی قیمتوں سے دس گنی ہیں) اور دوسری ضروری چیزوں کی قیمتوں پر بھی کنٹرول ہو جائے گا۔ فوجی کینٹینوں اور امریکی جہازوں سے مال آ کر چور بازار میں پہنچتا رہتا ہے (اور آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے) اس زمانہ کی ایک بہت اچھی بات یہ ہے کہ حکومت نے افیم کھانے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اس سے پہلے افیم کے استعمال کی ترغیب خود

حکومت کی طرف سے ہوتی تھی، اس لئے کہ افیم کی فروخت اور افیون خانوں کے لائسنس کی اجارہ داری حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

حکومت کا انتظام سول افسروں کے ہاتھ میں آنے کے بعد سے اب یہ احساس شروع ہوگیا ہے کہ مکمل اصلاح کے طول طویل اور ناہموار سفر کو جلد ہی طے کیا جاسکے گا لیکن شاید اس کے لئے ضروری ہو کہ جس رعایا پر ابتک ٹیکس بہت کم لگائے جاتے تھے، اسے اب زیادہ ٹیکس دینے پڑیں۔

حکومت نے ہانگ کانگ کے آئینی مستقبل کے بارے میں یہاں کے لوگوں سے مشورے طلب کئے تھے لیکن لوگوں نے ملکی سیاست کے اس پہلو کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ شاید حالات کا پورا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلے کہ سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ موجودہ اکزیکٹیو اور آئین ساز کونسلیں گورنر کو اس کے کام میں مدد دیتی رہیں، ان کونسلوں کے غیر سرکاری ممبروں کے چناؤ میں عوام کی زیادہ آواز ہو، اور حکومت کا کام ایسے افسروں کے ہاتھ میں ہو جو ہانگ کانگ گورنمنٹ کے کام کو محض آسائش اور پنشن کا ذریعہ نہ سمجھتے ہوں۔

ہانگ کانگ کو چینیوں کے سپرد کر دینے کے علاوہ وہاں خواہ کسی طرح کی آئینی تبدیلیاں ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ اس کا مستقبل بے حد شاندار ہے۔ پھر بھی حاکموں اور تاجروں کو یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جنگ سے پہلے کے ہانگ کانگ کے دن اب پھر واپس نہیں آسکتے۔

رفتہ رفتہ ہانگ کانگ کو تجارتی مرکز کی حیثیت سے وہی جگہ حاصل ہوگی جو کبھی شانگھائی کو تھی۔ اس کی علامتیں کچھ کچھ ابھی سے نظر آنے لگی ہیں۔ بڑے بڑے چینی کاروبار اب شنگھائی سے اٹھ کر ہانگ کانگ آرہے ہیں بعض حلقوں میں یہ بات بھی یقین کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ ہانگ کانگ برطانوی تجارت کا مرکز بن جائے گا اور اکثر امریکی تاجر فلپائن میں اپنا ہیڈ کوارٹر بنائیں گے۔

جو لوگ برطانیہ کی نوآبادیات کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو مہینہ کی ہانگ کانگ کی ترقی ان کی نکتہ چینی کا بہترین جواب ہے۔ اس نو مہینے کے حالات نے نوآبادیوں میں برطانیہ کی لوٹ کھسوٹ کے افسانے کو بے بنیاد ثابت کردیا ہے اور دنیا پر یہ بات پوری طرح ظاہر ہوگئی ہے کہ برطانیہ کے ان ابتدائی حکمرانوں اور آبادکاروں کی دانش مندی اور ان کا وہ رسوخ اب بھی قائم ہے جس نے ویران، سنسان اور ڈاکوؤں اور لٹیروں سے بسے ہوئے چٹانوں کو ایک جدید قسم کا بندرگاہ بنایا تھا۔

اعلان

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی مقدار میں جمع ہوگئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں۔ (ادارہ)

گردش

عبادت بریلوی

شام کے ہنگام بہ ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو!
راہ پر چلتے ہوئے مدقوق انسانوں کے غول ——
قہقہوں کی دھند میں لپٹے ہوئے
آنسوؤں کے کارواں
پیہم رواں، پیہم دواں!
سامنے جن کے کوئی منزل نہیں!
ہوچکا اب ختم وقتِ شام بھی
رات آدھی آچکی،
نیلگوں آکاش کی پھیلی ہوئی آغوش میں
مسکرانے سے ستاروں کا نسوں پر دو جمال
تیرگی کی روح پر چھانے لگا؟
اس سماں میں رُک گیا یہ کارواں،
جذب ہوکر رہ گئے دیوار و در میں قہقہے،
آنسوؤں کا سیمگوں سیلاب دامن میں لئے!
رات رخصت ہوگئی،
صبح کی روشن کرن لینے لگی انگڑائیاں!
کارواں چلنے لگا،
قہقہے پھر جاگ اٹھے
آنسوؤں کا سیمگوں سیلاب دامن میں لئے!
شاہراہوں پر نظر آنے لگا
دور —— کوسوں دور تک
پھر ایک بحرِ بیکراں
جس کی دنیا میں کوئی ساحل نہیں!

رباعیات

یا آئینۂ جلوۂ جانانہ بنے
یا جلوۂ جانانہ کا دیوانہ بنے
فطرت نے صلاحیت عطا کر کے کہا
جو چیز بنے [illegible]

پیری آئی ہے نکتہ دانی لے کر
آئی نئے مزاجِ زندگانی لے کر
فطرت نے معاوضے کا رکھا ہے اصول
عزت دی ہے لیکن جوانی لے کر

(رعنا اکبر آبادی)

نئی کتابیں

معاشیات قومی — از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ
کتاب کا نفس مضمون نام سے ظاہر ہے۔ دنیا کی قوموں کے اکنامکس کے مدوجزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ نہایت شستہ زبان میں ڈاکٹر صاحب جیسے عالم کے قلم سے آج ہی طلب فرماکر ملاحظہ فرمائیں۔ سائز ۳۰×۲۰/۱۶ ۶۵۰ صفحات۔ جلد مضبوط کپڑے کی۔ گرد پوش خوبصورت قیمت آٹھ روپے۔

ہمارا قائد — از زیڈ۔ اے سلیری۔ مائی لیڈر جیسی مشہور معروف کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ قائد اعظم محمد علی جناح کو ہم اپنا قائد کیوں مانتے ہیں۔ یہ کتاب آپکو مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے مدوجزر سے واقف بنائے گی۔ کتاب ظاہری خوبیوں کے لحاظ سے بھی نظر فریب ہے۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

ماڈرن اردو ڈکشنری — مولفہ ابو النعیم عبد الحکیم نشتر۔ جالندھری اردو کے شائقینوں طالب علموں کیلئے
نشتر صاحب نے نہایت عرق ریزی سے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ سائز ۲۹×۲۲/۱۶ ۵۶۰ صفحات سہ کالمی۔ دیدہ زیب کتابت۔ مجلد۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

کمال اتاترک — غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی بہترین سوانحعمری۔ مرحوم کے گہرے دوست ادیب جلیل، استاد محمد توفیق پاشا کے جادو نگار قلم سے یہ مسلمہ حقیقت آفتاب عالمتاب کی طرح روشن ہے کہ مجاہد اعظم لبطل حریت کمال اتاترک عہد حاضر کے سب سے بڑے جرنیل اور سب سے بڑے ڈکٹیٹر تھے اسطرح یہ امر بھی جریدۂ عالم پر زرین حروف میں ثبت ہے کہ آجتک دنیا بھر میں جسقدر سوانحعمریاں غازی مغفور کی لکھی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی کمال اتاترک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چوتھا ایڈیشن چھپکر تیار ہے مجلد مع خوبصورت گرد پوش قریباً ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے

جدید اردو شاعری (نو ترمیم) — از پروفیسر عبد القادر سروری۔ سروری صاحب کا قلم تعارف کا محتاج نہیں۔ ملک کے تنقید نگاروں میں ان کا درجہ بلند ہے۔ اس میں انھوں نے جدید شاعری کے اسباب و محرکات اور اس کے بانیوں اور حامیوں کے کلام پر بہت خوبی سے تبصرہ کیا ہے۔ شعرائے حال کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید ہر ایک کے درجہ اور حیثیت کے مطابق ہے۔ حال کا تیسرا ایڈیشن بعد ترمیم و تصحیح شائع کیا گیا ہے جسکو آپ آج ہی طلب فرماکر ملاحظہ فرمائیے۔ سائز ۱۸×۲۲/۸۔ قیمت تین روپے،

کتاب منزل۔ کشمیری بازار لاہور

تھیکرز کا

بچّوں کا بک کلب

آؤ تصویر بنائیں، مقابلہ نمبر ا کے نتیجے

تھیکرز نے بچوں کے بک کلب کے ممبروں کیلئے "آؤ تصویر بنائیں" کا جو مقابلہ کیا تھا اس کے نتیجے کا اعلان مسرت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل بچوں کو انعام ملے:۔

پہلا گروپ۔ ۱۰-۱۴ سال

پہلا انعام پچیس روپے۔ دیونداس بوری۔ معرفت جناب چیرنداس بوری سیالکوٹ۔ دوسرا انعام پندرہ روپے۔ زیڈ۔ جے کپاڈیا ۵۔ پیڈ۔ کولابار بمبئی۔

تسلی کے انعامات دس دس روپے کے: (۱) اسمٰعیل محمد معرفت محمد جان محمد بیا نوالے ۶۵ پایدھونی بمبئی ۹ (۲) مس ایم یونس ۵۲۳ بلی ماران دہلی (۳) مس شکیلہ خاتون معرفت امین برادرس۔ ہینگ کی منڈی۔ آگرہ۔

دوسرا گروپ۔ دس سال سے کم

پہلا انعام پچیس روپے۔ علی گوہر یوسف دا احمد بلڈنگ۔ نیو ملوار ڈکرلا بمبئی۔ دوسرا انعام۔ پندرہ روپے مس بلقیس جہاں بیگم۔ بجّو موٹرس۔ کوئنس روڈ بمبئی

تھیکرز انعام جیتنے والوں کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ان بچوں کو چاہئے کہ وہ لکھیں کہ انعام نقد چاہئے یا کتابوں کی صورت میں۔ کچھ ڈرائنگ بہت اچھے تھے۔ جن لوگوں کو انعام نہیں ملا انھیں تھیکرز کا مشورہ یہ ہے کہ "پھر کوشش کرو"

تھیکرز کا بچوں کا بک کلب بڑی تیزی سے ہندوستان بھر میں ہر دل عزیز ہوتا جا رہا ہے اور ہر قوم کے بچے روز بروز اس کے ممبر ہوتے جا رہے ہیں۔

بچّوں کے بک کلب کے ممبروں کے لئے دوسرے مقابلے کا انتظار کیجئے۔ زیادہ اور بڑے انعامات آپکے منتظر ہیں

آپ ممبر ہیں یا نہیں؟ آج ہی ممبر ہو جایئے۔ سولہ سال سے کم عمر کا ہر بچہ ممبر ہو سکتا ہے۔

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے

بچّوں کا بک کلب، تھیکرز پبلشرز۔ بمبئی

کشمکش حیات

جے پرکاش نرائن

ہنگری میں اقتصادی صورت حالات اتنی خراب ہے کہ شاید اس سے زیادہ خراب کبھی نہ ہو سکے۔ "بوڈاپسٹ یورپ کے قحط کا مرکز بنا ہوا ہے اور ہر چیز نایاب ہے"۔ ان الفاظ میں برطانوی پارلیمان کے ایک رکن جان ہینر نے وہاں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور اگرچہ ان کے قول کے مطابق وہاں کے لوگ زندہ دل ہیں تاہم انھیں ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ (مترجم)

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ ہوا۔ ہنگری سب سے زیادہ خوفناک قسم کی جنگ کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ اس سرزمین کا ایک ایک قطعہ لڑائی کا میدان تھا۔ اس کا خوبصورت صدر مقام بوڈاپسٹ اکیاون دن کے محاصرے کے باعث تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

حتیٰ کہ آج بھی ملک بھر کی پیشانی پر ہولناک جنگ کے داغ نمایاں طور پر نظر آ رہے ہیں۔ منہدم شہروں، برباد شدہ پلوں، ناقابلِ گذر راستوں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ فولادی ٹینک جو لڑائی میں شکستہ اور چور ہو کر بیکار ہو چکے ہیں، ادھر اُدھر سڑکوں کے کنارے پڑے ہیں۔ ایک لڑاکا ہوائی جہاز کو جو بہت عرصے پہلے ایک بڑی عمارت کی بالائی منزل پر ٹوٹ کر گر پڑا تھا، حال ہی میں اٹھایا گیا ہے۔

بوڈاپسٹ کا نظارہ بڑا روح فرسا ہے۔ کبھی اسے دریائے ڈینیوب کی ملکہ کہا جاتا تھا۔ آج اس کا مشکل سے چوتھائی حصہ صحیح و سلامت ہے۔ برسٹل ہوٹل کے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جب میں نے نظر ڈالی اور ڈینیوب کے پار اس حصے کو دیکھا جو یورپ میں سب سے زیادہ خوش منظر سمجھا جاتا تھا تو میں حیران رہ گیا۔ شاہی محل بالکل ڈھانچہ بن چکا تھا۔ اس کا بڑا گنبد مڑے تڑے فولادی تیروں کا پنجرا معلوم ہوتا تھا۔ اور خوبصورت پل بھی بالکل ننگا ہو کر دریا کی تہ میں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ باقی سات پلوں کا بھی یہی حشر ہوا تھا۔

اب بوڈا اور پسٹ کے درمیان زندگی کے ہنگامے ایک نیم مستحکم پل کے قریب مرکوز ہیں جسے اسی سال جنوری میں مکمل کیا گیا ہے۔ لوہے کے پیپوں سے بنائے ہوئے دو عارضی پل جو خزاں اور بہار کے دنوں میں دریا کے اوپر سے آنے جانے کے کام آتے تھے، موسم سرما کی شدید برفباری سے چکنا چور ہو گئے۔ وہ شاداب پہاڑی جو دریا کے پار دلکش مناظر پیش کرتی تھی، ایک عریاں لاش کی طرح بالکل اُجاڑ اور سوگوار پڑی ہے۔ اس کے درخت ختم ہو گئے۔ جاڑے کے موسم میں ایندھن کی خاطر انھیں کاٹ ڈالا گیا۔ اور اس جزیرے کے درخت بھی جو دریا کے بیچوں بیچ جنت کی بہاریں دکھاتا تھا، اسی مقصد کے ماتحت غارت ہو گئے۔

اس کے باوجود صدر مقام میں زندگی اب بھی دھڑکتے ہوئے دل کی طرح مچلتی اور بل کھاتی نظر آتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنگری کے لوگ غم ماضی کو بھلا دینا چاہتے ہیں وہ مستقبل کی تعمیر نو کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ شہر کے میئر نے مجھے بتایا کہ شہر کے دوبارہ تعمیر ہونے میں دس سال لگیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ دس کی بجائے بیس سال لگ جائیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ پہلی سی شان پیدا نہیں ہو سکتی۔

بوڈا کے مقابلے میں پسٹ کم تباہ ہوا ہے۔ اس کے بازاروں میں بڑا حیرت انگیز تضاد نظر آتا ہے۔ آپس میں چہلیں کرتی کچھ ایسی عورتیں کھائی دیں گی جو یورپ میں سب سے زیادہ زرق برق لباس پہننے والیوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ اور دوسری طرف ایسی مزدورنیاں اور دیہاتنیں آنکھوں کے سامنے آتی ہیں جن کے میلے کچیلے لباس اور فاقے سے مرجھائے ہوئے چہرے دلوں میں سوز پیدا کر دیتے ہیں۔ جنگ سے قبل یورپ میں خرید و فروخت کا سب سے زیادہ مشہور مرکز ویسی اکا تھا۔ دوکانوں میں نہایت قیمتی تسری کپڑے اور پوستینیں بکتی تھیں جنکی قیمتیں اشرفیوں کی صورت میں وصول کی جاتی تھیں۔ اسی بازار کی ان دوکانوں میں اب چری ہوئی لکڑیاں اور کوئلوں کے انبار بکتے نظر آتے ہیں۔ بوڈاپسٹ میں آجکل ایندھن بھی بہت کمیاب ہے۔ اور پچھلے موسم سرما میں جو غیر معمولی طور پر زیادہ سرد رہا وہ بالکل ہوش اُڑا دینے والے نرخ پر فروخت ہوا۔

بوڈاپسٹ کبھی قہوہ خانوں اور ناچ گھروں کا شہر کہلاتا تھا۔ انکی تعداد کئی سو ہو گی۔ ہر ایک میں ذاتی بینڈ بجانے والے موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے مشہور اور مقبولِ عوام مقامات کا وجود گولوں کی زد میں آکر صفحۂ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ اِکا دُکا کوئی قہوہ خانہ باقی ہے جو عام طور پر کسی عارضی عمارت میں قائم کر لیا گیا ہے۔ کئی قسم کا کھانا اب بھی وہاں مل سکتا ہے۔ عام طور پر دو یا تین قسم کی شوربے والی خوراک میسر آ جاتی ہے۔ ایک وقت کے کھانے کے عوض اتنی رقم ادا کرنی پڑتی ہے کہ لڑائی سے پہلے اسے ایک زر کثیر سمجھا جا سکتا تھا۔ گذشتہ ماہ اکتوبر سے گوشت بالکل ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اسکی وجہ جانوروں کی کمیابی ہے۔ لڑائی کے دوران میں صرف ہنگری کے پچیس لاکھ مویشی مر گئے۔ اب تقریباً چار لاکھ باقی ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو افزائشِ نسل کے لئے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر اب یہ طعام خانے بالکل ویران معلوم ہوتے ہیں۔

لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ

بوڈاپسٹ کے لوگ کیونکر گزارہ کرتے ہیں۔ آٹھ لاکھ باشندوں میں سے زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ وہ قحط، بیماری اور سردی کا بڑی مشکل سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ اسوقت بوڈاپسٹ یورپ کے قحط کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اموات کے اعداد و شمار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً بچے کوئی پچاس فیصدی کے حساب سے ضائع ہو رہے ہیں۔ گذشتہ نومبر کے مہینے میں ۲۱۸۸ اموات ہوئیں جبکہ پیدائش کی تعداد ۸۲۲ سے نہ بڑھ سکی۔ تقریباً ہر شخص کی حالت یہ ہے کہ کمیٔ خوراک کے باعث آنکھیں دھنس گئی اور گلے پچک گئے ہیں۔ مجھے ملنے والے ہر شخص نے کہا کہ ہم پوری خوراک نہ ملنے کے باعث اسقدر کمزور ہو گئے ہیں کہ روزانہ چند گھنٹے بھی آسانی سے کام نہیں کر سکتے لیکن ہر شخص کے لئے کام کرنا لازمی ہے کیونکہ کام کئے بغیر روٹی بالکل نہیں مل سکتی۔ چنانچہ ان کا نعرہ یہی ہے۔ "کام نہیں تو خوراک نہیں"۔

حد یہ کہ گیہوں اسقدر کمیاب ہے کہ ہفتہ میں تین دن کمی کے لئے مخصوص ہیں۔ کارخانوں کے مزدور، حکومت کے وزیر، درسگاہوں کے معلم غرض سبھی قحطِ اناج سے پیدا ہونے والی مشکلات کا شکار ہو رہے ہیں۔ دیکھا جائے تو کارخانوں کے مزدوروں کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تمام نہیں تو تنخواہ کا کچھ حصہ انھیں خوراک کی صورت میں مل جاتا ہے جس کا انتظام کارخانے کے منتظمین کی طرف سے ہوتا ہے۔ بہت سے کارخانوں کے زیرِ اہتمام خوراک جمع کرنے کے گروہ بنائے جاتے ہیں جو دیہاتوں میں جاکر کھانے کی چیزیں تلاش کرلاتے ہیں۔ اسطرح جمع کی ہوئی مقدار جسمانی اور دماغی کام کرنے والوں میں اس طرح تقسیم کردی جاتی ہے کہ ہر ہفتے ان کو ۱۷۳۲۰ درجہ اور پھر خاندان کے ہر رکن کو ۵۶۰ مزید درجہ حرارتِ غریزی پیدا کرنیوالی خوراک مل جائے۔ مزدوری کی باقی رقم ان کو نقد دیدی جاتی ہے۔ حالانکہ نقدی کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے۔

اسوقت ہنگری میں تو تفیرِ زر کی کیفیت بھی ہوشربا حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ جب میں اکتوبر کے مہینے میں ہنگری گیا تو معلوم ہوا کہ پنگو کی قیمت جو کبھی بارہ آنہ کے قریب ہوتی تھی۔ اتنی گر گئی ہے کہ صرافہ میں ایسے دس ہزار نوٹوں کے عوض بمشکل پندرہ روپے مل سکتے ہیں۔ اب اتنی ہی رقم کے لئے تقریباً پچاس لاکھ پنگو دینے پڑتے ہیں۔ اس سال جنوری کے مہینے سے قیمتیں کوئی تیس گنی حد تک بڑھ گئی ہیں۔ مجھے انہی دنوں کا ایک عجیب واقعہ یاد ہے۔ جبکہ میں ایک ہوٹل میں کھانا کھا رہا تھا۔ کھانا ختم کرتے کرتے پوری خوراک پر دس آنے اس رقم کے مقابلے میں بڑھ گئے جو کھانا شروع ہونے کے وقت مقرر تھی۔

اسوقت ہنگری سے جو خطوط میرے پاس آتے ہیں وہ ٹکٹوں سے بری طرح لپے ہوئے ہیں۔ انھیں دیکھکر بھی یہ اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ وہاں تو تفیرِ زر کی کیفیت کسقدر بڑھی ہوئی ہے۔ مثلاً ایک خط کے چند ہی دن بعد جب دوسرا خط ڈالا جاتا ہے تو اس پر بہت سے فالتو ٹکٹ نظر آتے ہیں۔ اجرتوں کے مقابلے میں قیمتیں بھی بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ ہنگری میں ہر وزیرِ ریاست کی موجودہ تنخواہ کم و بیش ڈھائی تین روپے ماہانہ کے برابر ہے۔ صدر کو مشکل سے چالیس روپے سالانہ کے لگ بھگ کچھ رقم وصول ہوتی ہے۔

کچھ بھی ہو زرِ مبادلہ کی حیثیت سے ہنگری میں نوٹوں کی قیمت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ لڑائی سے پہلے دس روپے کے نوٹ کے مساوی جو نوٹ وہاں ملتے تھے، اب ان کو کاغذ کے چند ٹکڑوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اب اتنی رقم ایک معمولی اخبار خریدنے، بھری ہوئی گاڑیوں پر اور زیادہ لکڑ کرایہ ادا کرنے یا ایک بار ٹیلیفون کرنے کی اجرت دینے کے کام آ سکتی ہے۔ برائے نام چند چیزیں جو بازار میں بکنے آتی ہیں، اتنی گراں ہیں کہ ان کی قیمت ڈالر میں لگی جاتی ہے۔ شہر ہو یا دیہات بہت سی چیزیں بکنے کی بجائے ایک دوسرے سے بدل لی جاتی ہیں۔ مثلاً جوزہ کا ایک جوڑا دیا اور ٹوکری بھر کوئلے لئے یا ڈاکٹر کی فیس ادا کرنے کی بجائے اسے ایک درجن انڈے تھما دیئے۔

مجھے بوڈاپسٹ میں ایک نوجوان عورت سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ پورے خاندان میں سے وہی ایک رکن زندہ بچ رہی تھی اس نے بتایا کہ میں نے بوڈاپسٹ والے اپنے شکستہ مکان سے اٹھارہ عدد برق افشاں (ریڈیم ایش) نکال کر بطخ کی دس پونڈ چربی کے عوض بیچ دئے۔ وہ شہری ملازمت میں تھی اسکے جسم پر جو کپڑے نظر آ رہے تھے، بس وہی اسکی کل کائنات تھی۔ باقی سب سامان اشیائے خوراک کے عوض دیا جا چکا تھا۔

شہر کے رہنے والے بہت سے لوگوں کا لباس میلا کچیلا اور پھٹا پرانا ہوتا ہے۔ وہ بھی زیادہ تر ٹھنڈا موسم گرما کا۔ کیونکہ محاصرہ کے دنوں میں اور اس کے بعد والے زمانے میں بہت سے لوگوں کے لباس لوٹ لئے گئے تھے۔ بچے سب سے زیادہ مصیبت میں گرفتار رہتے۔ حال ہی میں گاڑی کے اندر ایسے بچوں کو دیکھا جو صدر مقام چھوڑ کر کسی دوسرے ضلعے میں اسلئے جا رہے تھے۔ کہ شاید وہاں کچھ زیادہ کھانے کو مل جائے۔ ان میں سے مشکل ہی سے ایک دو بچوں کے پاس اوورکوٹ موجود تھے، اور بہت سے ننگے پاؤں تھے۔

کچھ سردی کی بنا پر اور کچھ سلئے کہ عمارتیں سلامت نہیں تھیں، موسم سرما کے مہینوں میں تمام مدرسے بند کرنے پڑے تھے۔ ان میں سے بعض مارچ کے آخر میں کھل گئے۔ گذشتہ چند سال میں ہنگری میں تعلیمی نظام کو بھی سخت صدمہ پہنچا ہے۔ پچھلے سال تمام مدرسے لڑائی کی وجہ سے بند کر دئے گئے تھے خصوصاً اس لئے کہ تمام استادوں کو لام پر بھیجدیا گیا تھا۔ اس سے ایک سال پہلے وہ

ہتھیاروں کی بمباری کے باعث بند رہے۔ بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ ہنگری کے بچوں نے گذشتہ تین سال میں بمشکل چھ مہینے تعلیم حاصل کی۔

نئی پود کو لازمی طور پر بقائے حیات کے لئے زبردست کشمکش کرنی پڑ رہی ہے۔ یونیورسٹی کے طلباء کے لئے صورت حالات بالکل ناقابل برداشت ہے۔ عام دنوں میں بھی ہنگری کے طلباء عموماً غریب ہوتے تھے۔ پھر بھی چھ ہزار کے قریب طلباء بوڈاپسٹ کی یونیورسٹی میں واپس آ گئے ہیں اور تقریباً دو ہزار باقی دو تین یونیورسٹیوں میں ہیں۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح طلبا بھی زمین میں گڑھے کھود کر ان میں رہتے ہیں، کیونکہ ان کی رہائش کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر کے جوتوں کے تلے بالکل چھلنی ہو گئے ہیں مکھن چینی اور گوشت ایسی چیزیں ہیں جو اب بھول کر بھی ان کے خواب میں نظر نہیں آتیں۔ حد یہ ہے کہ کتابیں بھی ان کے لئے کمیاب ہیں۔

مجھے فنی کتابوں کی ایک لائبریری کی بابت بتایا گیا جسے ایک چھوٹے سے گاؤں میں چھپا دیا گیا تھا، کہ جب نازی فوج کے سپاہیوں کو اسکا پتہ لگ گیا تو انھوں نے کتابیں نکال کر دلدلی سڑکوں کو پاٹ دیا۔ اب جو کتابیں بچ رہی ہیں وہ پڑھنے کے لائق نہیں ہیں، اس لئے ان کو الگ کر دیا گیا ہے۔

خوراک اور لباس کی کمیابی پر مستزاد مکانات کی کمیابی ہے۔ جس کے باعث اس مصیبت زدہ ملک میں زندگی بسر کرنی دشوار ہو گئی ہے۔ بمباری سے تباہ شدہ شہروں اور قصبوں میں ہزاروں لوگ کھلیانوں اور ذخیرے کے گوداموں میں رہنے کے لئے مجبور ہیں لڑائی کے دوران میں ہنگری کے آدھے سے زیادہ گاؤں بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ بوڈاپسٹ کے ہزاروں مکانوں کی کھڑکیاں فنا ہو چکی ہیں اور انھیں بند رکھنے کے لئے نہ شیشے کے ٹکڑے ہیں نہ لکڑی کے تختے۔ میں نے شہر کے ایسے مکانوں کو جا کر دیکھا جن میں مزدور یا درمیانی درجہ کے بیوپاری رہتے تھے۔ ان میں سے ایک کی کھڑکی بھی سلامت نہیں تھی۔ ایسی صورت میں گذشتہ موسم سرما کی سردی کتنی تکلیف دہ رہی ہوگی، اسکا تصور ہی ہوش اڑا دیتا ہے۔

ان مصائب و آلام کے ہوتے ہوئے یہ معلوم کر کے تعجب نہیں ہوتا کہ وہ اسپتال جو بچ رہے ہیں، مریضوں سے بری طرح بھرے ہوئے ہیں۔ معدودے چند ڈاکٹر موجود ہیں اور ڈاکٹری سامان ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ملک بھر میں نہ تو بیہوشی سنگھانے یا انجکشن دینے کا سامان ہے اور نہ ایکس رے کی تصاویر کھینچنے کے لئے کوئی فلم۔ بہت سے باقیماندہ اسپتال بھی محض اسلئے بند ہو گئے کہ وہاں نہ دوائیاں تھیں نہ کپڑے کی پٹیاں اور نہ ایندھن۔ انھوں نے مریضوں کو قسمت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔

حمل و نقل کی دشواریاں بھی علیحدہ مصیبت بنی ہوئی ہیں ۱۹۳۸ء میں ہنگری کے سرکاری محکمہ ریل کے پاس باربرداری کے پانچ ہزار ۱۰ ہزار ڈبے موجود تھے۔ اب ان میں سے دو ہزار نو سو باقی ہیں۔ دو ہزار چار سو اسی انجنوں میں سے کل چار سو اسی رہ گئے ہیں۔ جرمن سپاہی تقریباً اسی ہزار موٹر گاڑیاں اور دریائے ڈینیوب کا سارا آبی بیڑا لے بھاگے۔

نتیجہ یہ کہ ریل کا سفر اب دشوار ہو گیا ہے۔ حال ہی میں حکومت امریکہ نے گفت و شنید کے بعد ایک کروڑ ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے تاکہ ہنگری اس رقم سے امریکی فوج کی گاڑیاں خریدے۔ اسطرح کافی مدد مل جائے گی۔

آزادی کے بعد نئی حکومت نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گذشتہ اگست کے مہینے میں تقریباً چالیس لاکھ ایکڑ زمین ساڑھے سات لاکھ کسانوں میں تقسیم کر دی لیکن نتیجہ کچھ نہ رہا۔ بدقسمتی سے اوزار، بیج اور باربرداری کی سہولتیں میسر نہ ہونے کے باعث اس امداد سے برآمد ہونے والے نتائج کسی عنوان اپنا ظہور نہ دکھا سکے۔

مختصر یہ ہے کہ ہنگری اسوقت عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ ہر چیز کمیاب ہے اور پھر بھی ہنگری کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہاری ہوئی لڑائی کا بھگتان بھگتی رہے۔ زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان حالات کے ہوتے ہوئے لوگوں میں خوش مزاقی کی لہر دوڑی ہوئی ہے اور حکومت حد درجہ آرزو مند ہے کہ بہت جلد اپنے ملک میں ایک خوشگوار نئی دنیا کی فضا قائم کر لے۔

(لندن کالنگ سے ماخوذ)

غزل

جلیل شیرکوٹی

بڑھ گئی حد سے کیوں خلش دل کی
آمد آمد ہے میرے قاتل کی؟

یہ ہی معراج ماتم و غم ہے
ڈبڈبا آئی آنکھ قاتل کی

تک رہے ہیں جدھر جدھر دیکھو!
اُف خدا خیر ہو مرے دل کی

کاش! منزل کی جستجو ہو مری
راہ تکتا ہوں تھک کے منزل کی

چوٹ دل پر ضرور کھائی ہے
چشم پرنم ہے آج قاتل کی

یہ ہی نا! ایک شے لطیف و گداز
ہوگی تعریف اور کیا دل کی؟

ان کے طعنوں کا کچھ اثر نہ ہوا
داد دے کوئی تنگئ دل کی

خود وہ کھنچتے ہوئے چلے آئے
وسعتیں دیکھ جذبِ کامل کی

نقد و نظر

مطبوعاتِ ادارۂ نشریاتِ اردو حیدرآباد دکن

اس سے قبل ادارۂ اشاعتِ اسلامیات کی بابت اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔ یہ ادارہ اسی ادارے کی تجارتی اور ادبی شاخ ہے۔ لہذا مقاصد اور حسنِ انتظام یکساں ہیں جس کے مکرر اظہار کی ضرورت نہیں۔ اسوقت اس ادارے کی تین کتابیں پیشِ نظر ہیں:۔

جنگِ مشرق و خاتمۂ جاپان

مصنفین مولوی محمد اسحٰق صاحب و محترمہ زبیدہ تبسم۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۱۰ صفحات مجلد قیمت دو روپے۔ یہ جاپان کے عروج و زوال کی ایک پُراز معلومات داستان ہے جسے نہ صرف سیاسی بلکہ تاریخی، جغرافیائی اور اقتصادی اعتبار سے بڑے سلیقے کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ اصولاً چین اور بحر الکاہل میں پھیلے ہوئے مشرقِ بعید کے تمام جزیروں کا حال بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ کیونکہ یہ جانے بغیر اصل موضوع کو پوری طرح سمجھ لینا مشکل ہے۔ کتاب ہر لحاظ سے تاریخ ہے۔ حتیٰ کہ آخری باب میں ایٹم بم کی ایجاد اور اسکی ساخت پر روشنی ڈالی ہے۔ تقریباً چودہ پندرہ صفحات میں مختصر طور پر جنگِ مشرق کا روزنامچہ پرل ہاربر کے حملے سے سپر اندازی تک لکھا ہے جو یادداشت کے لئے یقیناً مفید ہے۔ غرض یہ کہ اس کتاب کا مطالعہ کرکے ان تمام واقعات کو جو ابھی تازہ ہیں، حافظے کی لوح پر ہمیشہ کے لئے مرتسم کیا جاسکتا ہے۔

رموزِ اقبال

مصنف:۔ ڈاکٹر میر ولی الدین۔ ایم۔اے، پی۔ایچ ڈی ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۸۲ صفحات۔ مجلد۔ قیمت سوا دو روپے۔

اس کتاب کے پانچ باب ہیں جو فلسفۂ خودی، نظریۂ عقل و عشق، حدیثِ جبر و قدر، عہدِ حاضر کا انسان اور مسلمان کی زندگی سے متعلق ہیں۔

ہرچند ان موضوعات پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ لیکن قابل مصنف نے جو جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ فلسفہ کے صدر ہیں، بڑی گہری نگاہ ڈال کر ایسے نکتے پیدا کئے ہیں جو ان سے قبل قلم اٹھانے والوں کی نظرِ انتقاد سے پوشیدہ رہ گئے تھے۔ اور بس اسی اعتبار سے اس کتاب کو مفید اور قابلِ قدر کہا جاسکتا ہے۔ اقبال کی تعلیمات اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ چنانچہ اس کے ثبوت میں متعدد بار آیاتِ قرآنی سے ہم آہنگی پیدا کرکے دکھائی ہے۔ مشرق و مغرب کے دوسرے مفکرین کے اقوال بھی بطور حوالہ درج ہیں۔

روحِ حیات

مصنف:۔ جناب اختر قریشی۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۱۲ صفحات جلد معمولی۔ قیمت ایک روپیہ۔ یہ ایسے خطوط کا مجموعہ ہے جو مختلف حضرات کو لکھے گئے ہیں۔ مکتوبات نیاز کا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن نہ فکر و خیال کی اتنی گہرائی ہے نہ انداز بیان کی بے ساختگی کہیں کہیں طنز و مزاح کے لطیف پہلو کچھ مزا دے جاتے ہیں۔ ورنہ بحیثیتِ مجموعی ان میں کوئی ندرت نہیں ہے۔ اکثر جگہ زبان کی غلطیاں ہیں جو معمولی کوشش سے دور ہوسکتی تھیں۔ امید ہے کہ آئندہ اشاعت کے وقت ان کا لحاظ رکھا جائیگا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ خطوط اصلی ہیں حالانکہ درحقیقت بالارادہ لکھے گئے ہیں۔ اسی لئے تصنع اور بناوٹ کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

شفق

مصنف:۔ جناب شفیق جونپوری۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب عزیز ربانی سیکرٹری نظام ادب۔ جونپور۔

۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۲۸ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ یہ حضرت شفیق، جونپوری کا چوتھا مجموعہ کلام ہے۔ اس سے قبل صبح کعبہ، اخلاصِ مشرق، اور طوبیٰ شائع ہوچکے ہیں۔ موصوف نے قدیم طبقے کی ہمنوائی اس لئے نہیں کی کہ "وہ ابھی تک اپنی کہنگی و پامالی ہی پر قانع ہے۔ اس میں کسی تازگی کی گنجائش نہیں۔" نیا رنگ اسلئے اختیار نہیں کیا کہ "اعتماد کے قابل مستند ادیب شاعر نئے دور نے ایک بھی نہیں پیدا کیا۔" اس کے ساتھ ہی اس امر کا اعتراف ہے کہ "بعض کسی فرمائش یا مخصوص جذبات کے ماتحت ہیں تاکہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بھی کلام تہی دامن نہ ہو۔" وہ پہلے حسرت موہانی کے معتقد تھے، ۱۹۴۳ء سے علامہ اقبال کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ ان کے اظہار و بیان کے متضاد پہلوؤں کا لحاظ رکھنے کے بعد جب کلام پر نظر ڈالی جائے تو کہنگی اور پامالی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ بعض اشعار متقدمین کے کلام کا بالکل چربہ بلکہ ترجمہ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر ایسے شعروں کو جو زبان زدِ خلائق ہوچکے ہوں نئے الفاظ میں پیش کیا جائے تو اسے توارد بھی نہیں کہا جاسکتا۔

ف ح

سیرِ کشمیر

مصنف:۔ مولوی محمد عبد المجید صاحب بی اے گورکھپوری۔ ملنے کا پتہ:۔ جناب قاضی محمد مسعود علی، قاضی پورہ خورد۔ گورکھپور۔ ۲۰×۲۶/۸ کے ۱۳۲ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ اس کتاب کا مطالعہ تاریخی، جغرافیائی اور تفریحی اعتبار سے مفید ہوسکتا ہے۔ مصنف نے بذاتِ خود کشمیر کی سیر کرکے جملہ واقعات قلمبند کئے ہیں معمولی سے معمولی چیز بھی انکی نظر سے بچنے نہیں پائی۔ انہوں نے خوب سیر کی اور اسے پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ زبان شگفتہ اور اندازِ بیان دلپذیر ہے۔ کہیں کہیں اشعار کا استعمال زیادہ لطف پیدا کردیتا ہے۔ اسطرح یہ کتاب "رہنمائے کشمیر" ہونے کے علاوہ ادبی اعتبار سے بھی لائقِ تحسین ہے۔ مطالعہ کرتے وقت انسان اپنے آپ کو کشمیر کی پہاڑیوں اور وادیوں میں کھویا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس خطۂ جنت نظیر کی سیر کرنے والے عزمِ سفر سے قبل اسکا مطالعہ کرلیں تو انہیں بہت کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔

دنیا ہماری مصنف :- جناب پردیسی۔ ملنے کا پتہ :- راج محل پبلشرز جموں کشمیر، ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۰۴ صفحات - مجلد - قیمت ڈھائی روپے۔ یہ پردیسی صاحب کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے جن میں زندگی کے دردناک پہلوؤں کو بڑے دلگداز انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ ہر افسانہ روزمرہ زندگی کی ایک ایسی تصویر ہے جس میں صداقت اور واقعیت کی جھلک سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے دوسرے ترقی پسند افسانہ نگاروں کی طرح وہ مظلوموں کی حیات المیہ سے کھیلے نہیں ہیں بلکہ دکھے ہوئے دلوں کی ضربات کو خود محسوس کرنے کے بعد دوسروں کو محسوس کرایا ہے کہ وہ بھی ان کا مطالعہ اس طرح کریں اور سماج کے چہرے پر لگے ہوئے بدنما داغوں کو دھو ڈالنے کی کوشش کریں۔ انداز بیان میں بھی صحیح جذبات کی ترجمانی موجود ہے۔ البتہ افسانوں میں پلاٹ برائے نام ہے۔ اسمیں ندرت پیدا کرنیکی زیادہ کوشش نہیں کی۔ اس کے باوجود ہر افسانہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "میراحق" "کاریگر" "دنیا ہماری" اور "چتائیں" خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ "تمہارا" میں جنسی تجزیہ کیا گیا ہے۔ مگر عریانی سے پاک ہے۔

"نقد و نظر" کے سلسلے میں ہر کتاب کی دو جلدیں دفتر آجکل میں آنی ضروری ہیں ورنہ ان پر کسی قسم کا اظہار خیال نہیں کیا جائیگا۔ ـــــ ادارہ

سیدالانبیاء، خاتم النبیئن، محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم

کی

سیرت پر مشہور عالم کتاب

رحمۃ اللعالمین کامل تین جلد

(سیرت النبی الامی صلی اللہ علیہ و آلہ و بارک وسلم)

مصنفہ :- علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری

رحمۃ اللعالمین نے شائع ہوتے ہی سیرت رسول کے شیدائیوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرلی۔ اور اس کو جملہ حقوق مستند قرار دیکر پسند کیا گیا ہے۔ اب اسکی جگہ تینوں جلدیں تیار ہوگئی ہیں۔

یقیناً اس کتاب کو ملاحظہ فرما کر تڑپ جائیں گے۔ اتنی دلچسپ، اتنی مکمل اور اتنی اعلیٰ کتاب سیرۃ النبی صلعم پر آپ کو کہیں اور نہیں ملیگی۔ طرز بیان محبت اور عقیدت کے رنگ میں سلجھا ہوا۔ طریقۂ استدلال سنجیدہ۔ سیرۃ کے ساتھ ساتھ مختلف مذہبی امور پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے اسکی افادی حیثیت بہت بڑھ گئی ہے۔

کتابت روشن اور خوشخط — طباعت دیدہ زیب — کاغذ چکنا عمدہ دبیز — جلد پائدار ولایتی کپڑے کی

گرد پوش سہ رنگا خوبصورت

کامل تین حصہ مجلد ـــــ سترہ روپے

فہرست مفت طلب فرمائیے۔

ہم اسلامی و ادبی کتابیں۔ قرآن مجید اور ٹیکسٹ بکس شائع کرتے ہیں

ملنے کا پتہ :- شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ناشران کتب کشمیری بازار۔ لاہور

برطانیہ کی ٹریڈ یونینیں

ان کی ابتدا اور ارتقا

والٹر اسٹرین

(برطانیہ میں ٹریڈ یونینوں کی تحریک کا ارتقا آہستہ آہستہ لیکن باقاعدگی کے ساتھ ہوا۔ گو اس تحریک کے ابتدائی نشان سترھویں صدی کے وسط میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی حقیقی ابتدا اصل میں اٹھارویں صدی کے شروع سے ہوئی۔ وقتاً فوقتاً جو مختلف قانون نافذ ہوتے رہے انہوں نے اس تحریک کو قومی زندگی کے تار پود میں شامل کر لیا اور اس کے بعد سے برابر زندگی میں اس کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ اس مضمون کا مصنف ۱۹۲۸ء سے برابر برطانیہ کی ٹریڈ یونین کانگریس کا جنرل سکریٹری رہا ہے۔)

برطانیہ کے جن قومی اداروں میں اہلِ برطانیہ کے کردار کی صاف جھلک دکھائی دیتی ہے، ان میں ٹریڈ یونینوں کی بے حد نمایاں جگہ ہے۔ ان ٹریڈ یونینوں سے ان کے کردار اور سیرت کے خاص خاص پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے — مثلاً زندگی کے جمہوری طریقوں کے ساتھ اٹل لگاؤ، آزادی کا شدید احساس، ضبطِ نفس کی صلاحیت، اور اپنے معاملات کو پوری عملی سوجھ بوجھ اور مستعدی کے ساتھ کرنے کی حیرت انگیز قدرت۔

برطانیہ کے لوگوں میں امداد باہمی اور اشتراکِ عمل کا جو شدید جذبہ ہے، برطانوی ٹریڈ یونینوں کی تخلیق اس کے تحت میں ہوئی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ جذبہ مشینی پیداوار، کارخانوں کے نظام، اور اجرت کے معاہدوں کے زمانہ سے کافی پہلے سے کام کر رہا ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی گلڈز کو صحیح معنوں میں ٹریڈ یونینوں کی ابتدائی شکل نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ گلڈ جدید ٹریڈ یونینوں کے بعض خاص مقصدوں کو پورا کرتے تھے اور ایک ایسے زمانہ میں کرتے تھے جب اجتماعی لین دین کے موجودہ طریقوں پر عمل کرنا تو تقریباً ناممکن سا تھا۔ ازمنۂ وسطیٰ کے قانون اور گلڈوں کے بنائے ہوئے قاعدے اور ضابطے جہاں ایک طرف امیدواروں اور مزدور پیشہ کاریگروں کی ذمہ داریوں اور کام کی شرطوں کا تعین کرتے تھے وہاں دوسری طرف کارخانداروں، (جن کی حیثیت آجکل کے آجر کی سی تھی)، کی ذمہ داریوں کو بھی واضح کر دیتے تھے۔

اور حقیقت میں جب ٹریڈ یونینوں کا رواج شروع ہوا ہے تو گلڈوں کا نظام بھی باقی اور قائم تھا اور مزدوری اور کام کے متعلق حکومت نے جو قانون اور ضابطے بنا رکھے تھے انہیں بھی آجروں کا نیا طبقہ اور سرمایہ داروں کا وہ گروہ جسے صنعتی انقلاب نے پیدا کیا تھا، مٹا نہیں سکا تھا۔

موجودہ برطانوی ٹریڈ یونینوں سے ملتی جلتی ایک چیز جس میں کام کرنے والے متحد ہو کر سامنے آئے، اصل میں اٹھارویں صدی کے ابتدائی دنوں میں شروع ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پانی کی قوت کے استعمال سے، گاؤں اور چھوٹے چھوٹے شہروں کی گھریلو صنعتوں میں تبدیلی پیدا ہو چلی تھی۔ یہی زمانہ ہے کہ جب زمین کی مشترکہ ملکیت کے خلاف بعض قانون جاری ہوئے تھے اور زراعت پیشہ لوگوں کی ایک خاصی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں کارخانہ والے شہروں، کانوں والے علاقوں اور ان حصوں کی طرف آ رہی تھی جہاں لوہے کی صنعت بڑھ رہی تھی۔ صنعتی انقلاب نے کام کرنے والوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا کر دیا تھا جو بڑی بڑی مزدوریاں کماتا تھا، اور کام لینے والوں میں بھی ایک نیا سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ کام کرنے والوں (یا مزدوروں)، کے لئے اجرت اور مزدوری کے سرکاری قانون ایک قسم کے تحفظ کا کام دیتے تھے۔ لیکن کام لینے والوں (آجروں اور سرمایہ داروں) کے لئے یہ قانون ایک طرح کی رکاوٹ تھے۔ اور اسلئے انہوں نے ایسے قانونوں کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ اور ان دنوں بہت سی عارضی یونینیں قائم ہو گئیں، ان کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ وہ پارلیامنٹ پر زور ڈال کر مزدوروں کے قانون، نافذ کرا دیں۔

ادھر بعض نئے قانونوں کے نفاذ کی وجہ سے مزدوروں کے لئے یہ آسانی پیدا ہو گئی کہ وہ اپنے آپ کو منظم کر سکیں ۱۸۲۴ء کے قانون کی رو سے یہ طے ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کام دھندے کے حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے کسی جماعت یا تنظیم میں شریک ہو تو وہ کسی طرح کی سازش کا مجرم نہیں ٹھیرایا جا سکتا اور نہ اس پر کسی قسم کی قانونی سختی یا سزا کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس قانون کے بعد سے یونینوں کی تعداد تیزی سے بڑھنے لگی۔ لیکن ان یونینوں کی حیثیت محض کاریگروں اور دستکاروں کی مقامی انجمنوں کی سی تھی۔ انیسویں صدی کے وسط میں ان کو ایک قومی پیمانہ پر متحد کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ اور انجینیری، لکڑی کے کام، جہاز سازی کی صنعت، چھاپہ خانوں کپڑے اور جوتے کا کام کرنے والوں کے علاوہ دوسرے دستکاروں کی مستحکم اور عملی انداز میں چلنے والی یونینوں کے قیام نے اس تحریک کو نئی راہ دکھائی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ٹریڈ یونینوں سے تعلق رکھنے والے قانونوں میں اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان جو متعدد قانون جاری ہوئے انہوں نے واضح طور پر یہ بات صاف کر دی کہ ٹریڈ یونینوں کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ ان قانونوں سے یونینوں کو ایک طرح کا قانونی تحفظ مل گیا اور ان کی ایک آزاد اور

شخصی حیثیت تسلیم کرلی گئی - پارلیامنٹ کے ان قانونوں کی بنا پر یونینوں کو اس بات کا حق حاصل ہوگیا کہ وہ بغیر کسی قسم کی دخل اندازی کے اپنے متعین مقاصد پر چل سکیں - ۱۸۷۶ء کے بعد ۲۵ سال سے بھی زیادہ عرصہ تک ان کی قانونی حیثیت ان کے حقوق، ان کی ذمہ داریوں اور ان کی رعایتوں کے متعلق کسی قسم کی پوچھ گچھ نہیں کی گئی -

تقریباً ۲۵ سال کی مدت میں ٹریڈ یونینوں کی تحریک دستکاروں کی محدود جماعت سے بڑھ کر مزدوروں کی نسبتاً بہت بڑی جماعت میں پہنچ گئی - اور رفتہ رفتہ کانوں میں کام کرنے والوں، ریلوں کے ملازموں، اور ٹرانسپورٹ کے محکمہ والوں میں اس کا اثر بہت تیزی سے بڑھا - اور پھر ہر طرح کے مزدوروں، مثلاً بندرگاہوں، مینوسپل گیس ورکس، برتنوں کے کارخالوں، اور چھوٹے بڑے کارخانوں میں کم مزدوری پر کام کرنے والی عورتوں تک میں یہ تحریک پھیل گئی - ۱۸۸۹ء میں لنڈن کے بندرگاہ میں ایک بہت بڑی ہڑتال ہوئی - اور یہ ہڑتال بہت جلد دوسرے بندرگاہوں میں بھی پھیل گئی - اس ہڑتال میں ایک نئی بنی ہوئی یونین نے بندرگاہوں، گھاٹوں اور دریا کے کنارے کام کرنے والے مزدوروں کے لئے ۶ پنیں فی گھنٹہ کی مزدوری کا مطالبہ کیا - اس ہڑتال سے ٹریڈ یونین کی تحریک کو زبردست قوت ملی اور مقامی ٹریڈ کونسلوں کے قیام اور ٹریڈ یونین کانگریس ۱۸۶۸ء میں بنائی گئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ اس سے تعلق رکھنے والی مختلف یونینوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر اپنے معاملات پر بحث مباحثہ کر سکیں - لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کے ابتدائی مقصد میں اور بہت سے مقصد بھی شامل ہوتے گئے - حالانکہ اب بھی اس کی حیثیت ایک ایسی جماعت کی ہے جہاں معاملات پر سوچ بچار اور بحث تمحیص ہوتی ہے - کسی یونین پر اس کی رکنیت لازمی نہیں - جو یونین اس کی رکنیت قبول کرتی ہیں وہ اپنی خوشی سے اس کے قواعد کی پابندی کو بھی اپنے لئے لازم سمجھتی ہیں - لیکن اس رکنیت کے بعد ان کی اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت جوں کی توں رہتی ہے - اور وہ اپنے معاملات میں خود مختار ہوتی ہیں - کانگریس نے اپنے لئے بھی ایک مرکزی نظام وضع کیا ہے جس کی مدد سے وہ پوری تحریک کو چلا سکے، یونینوں کی عام بھلائی اور بہبودی کے سلسلہ میں اپنی کوشش جاری رکھ سکے، اور اپنا ایک عام پروگرام اور پالیسی بنا سکے - اس پروگرام اور پالیسی میں کانگریس، صنعت و حرفت اور سماجی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تبدیلیاں کرتی رہتی ہے -

تعداد اور دائرۂ عمل میں ان یونینوں نے کس حد تک ترقی کی ہے، اس کا اندازہ کانگریس کے کاغذات دیکھ کر کیا جا سکتا ہے - اس کا پہلا اجلاس ۱۸۶۸ء میں مانچسٹر میں ہو رہا تھا جس میں تھوڑی سی سوسائٹیوں کے ۳۴ نمائندے شریک ہوئے تھے - اس وقت ان سوسائٹیوں کے ممبروں کی تعداد ۱۲۰،۰۰۰ تھی - انیسویں صدی کے آخری دس سالوں میں ممبروں کی تعداد پندرہ لاکھ ہوگئی، اور پہلی جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ان ممبروں کی تعداد ۶۵ لاکھ تھی -

برطانوی ٹریڈ یونینوں کی تعداد برابر گھٹتی بڑھتی رہی ہے - لیکن بحران کے بدترین دنوں میں (بیسویں صدی میں) اس کی بنیادیں بے حد مضبوط رہی ہیں اور اس کے لاکھوں ممبروں میں پوری تنظیم رہی ہے - دونوں جنگوں کے درمیانی زمانہ میں، ۱۹۳۳-۳۴ء میں ممبروں کی تعداد ۶۵ لاکھ سے گھٹ کر ساڑھے تئیس لاکھ رہ گئی - لیکن جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی تو کانگریس میں ۲۰۶ یونینیں شامل تھیں اور ممبروں کی تعداد بڑھ کر ۴۵ لاکھ ہوگئی تھی - لڑائی کے زمانہ میں ممبروں کی تعداد میں ۲۰ لاکھ کا اضافہ ہوا - یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں جو یونینیں کانگریس کے ساتھ ملحق تھیں ان کے ممبروں کی تعداد ۶،۵۷۵،۶۵۴ تھی ــــ اور ان میں سے ۱۳،۰۰،۰۰۰ عورتیں تھیں -

اب برطانوی ٹریڈ یونین کانگریس کے ساتھ ۲۰۰ یونینیں ملحق ہیں -

پیتم

کیا رکھا ہے اس جیون میں تو ہی نہیں جب پاس؟
تیرے بنا اس دکھیا من کی کون بندھائے آس؟
نیر بہائیں نین

پیتم
کاٹے کٹے نہ رین

امنڈ گھمنڈ کے بادل برسیں جھوم رہی برسات
رہ رہ کر ڈستی ہے من کو ناگن کالی رات
ترپت ہوں دن رین

پیتم
کاٹے کٹے نہ رین

سلگ رہی ہے من میں اگنی آ کر اسے بجھا جا
نینن ہیں درشن کے پیاسے سندر مکھ دکھلا جا
ہردے ہے بیچین

پیتم
کاٹے کٹے نہ رین

کشور شمیم

ان کا آپس میں بھی الحاق ہوتا رہتا ہے اور اس طرح ان کی تعداد گھٹتی رہتی ہے۔ ان یونینوں میں ہر طرح کے کاروباری اور ملازم شامل ہیں۔ اب مزدوروں کی یونینوں کے علاوہ، تنخواہ دار ملازموں، ٹکنکل ماہروں، نگرانوں اور انتظامی افسروں کی اپنی اپنی یونینیں ہیں۔ اس کے علاوہ ہر پیشہ کے لوگوں نے یہ بات محسوس کی ہے کہ اپنے مشترک مفاد کی حفاظت اور اپنے مقاصد کی تبلیغ کیلئے منظم ہونا ضروری ہے۔ اور بہت سے پیشہ وروں کی یونینیں، ٹریڈ یونین کانگریس سے ملحق ہو گئی ہیں۔ پبلک مفاد کے کام کرنے والوں، تاجروں، اسپتالوں، بینکوں، انشورنس کے ملازموں، آرٹسٹوں اور تھیٹر کے کام کرنے والوں، اگوتوں، سائنٹفک کام کرنے والوں اور ڈاکٹروں کی بھی الگ الگ یونینیں ہیں۔ ان پیشوں کی منظم جماعتوں میں بھی اسی طرح الحاق ہوتا ہے جیسے چھاپہ خانوں، دھات کا کام اور لکڑی کا کام کرنے والوں کی یونینیں ہیں مثلاً انجنیرنگ اور جہاز سازی کے نقشہ نویسوں کی یونینیں، یونینوں کے اس گروہ کے ساتھ ملحق ہوں گی جس میں انجنیری، ڈھلائی اور گاڑیاں وغیرہ بنانے کے کام کرنے والوں کی یونینیں شامل ہیں۔ ٹریڈ یونین کانگریس سے ریلوے کلرکوں کی یونین کا الحاق ریلوے کے انجنیروں، فائرمینوں اور نگراں مستریوں کی یونینوں کے ساتھ ہوگا۔ یا جہازرانوں کی یونین، ریڈیو کے افسروں کی یونین، اور ہوائی جہاز چلانے والوں کی یونین۔ ٹریڈ یونین کانگریس کے اس گروہ میں شامل ہوں گی جس میں ٹرانسپورٹ کی دوسری یونینیں (ریلوے کے علاوہ) شامل ہیں۔ اور اسی طرح کانوں والے گروہ میں، کان کے کام کرنے والوں کی ڈسٹرکٹ یونین کے علاوہ، کوئلے کی کانوں کے افسروں ماتحتوں اور نگرانوں کی یونینیں بھی شامل ہوں گی، بالکل اسی طرح جیسے انجنیرنگ کے گروہ میں نگراں اسٹاف اور انجنیرنگ ٹکنکل آدمیوں کی یونینیں شامل ہیں اور لوہے اور دوسری دھاتوں کا کام کرنے والوں کی یونینیوں میں قیمتی دھاتوں کا کام کرنے والے کاریگروں کی یونین، عمارتوں کا ٹکنکل کام کرنے والوں، لکڑی کا کام کرنے والوں اور سجاوٹ کا کام کرنے والوں کی یونینیں شامل ہیں۔

ٹریڈ یونین کانگریس کا خیال ہے کہ عملی اور نظری دونوں حیثیتوں سے ہر وہ کام جس سے آج اور مزدور کا تعلق ہے، ٹریڈ یونین کے نقطۂ نظر سے منظم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں، ٹریڈ یونین کی تحریک انگلستان میں اب ان لوگوں میں بھی عام ہو رہی ہے، جو کسی دوسرے کے نوکر نہیں بلکہ خود اپنا کام کرتے ہیں۔ نظری حیثیت سے انہیں بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں کہ ہاتھ کا کام کرنے والوں کی یونینوں کا الحاق انتظامی کام کرنے والوں کی یونینوں سے کر دیا جائے اسلئے کہ ٹریڈ یونین کی تحریک کی بنیاد تو اصل میں انسانی فطرت کا یہ جذبہ ہے کہ وہ باہمی طور پر ملے جلے اور اسکے ساتھ ساتھ وہ قدرتی خواہش جو مشترک مقاصد اور مفاد کی ترقی کیلئے انسان کو متحد و متفق ہونے کی طرف مائل کرتی ہے۔ اس جذبہ اور خواہش نے برطانیہ کی زندگی کے طریقہ اور نظام پر نمایاں اثر ڈالا ہے۔

شاعر رومان حضرت اختر شیرانی کا مجموعۂ کلام

شراب شعر و سخن کے متوالوں کو مژدہ ہو کہ

شعرائے ہند کی صف اول کے جادو بیان شاعر رومان خیام الہند

حضرت اختر شیرانی

صبح بہار	تین روپے
اختر ستان	تین روپے
لالۂ طور	تین روپے
طیور آوارہ	تین روپے

جملہ کتب کا سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ عمدہ جلد بندی مضبوط گردپوش جاذب نظر ہے۔ آج ہی طلب فرمائیے۔

(فہرست کتب مفت طلب فرمائیے)

کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارہ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶ سے شائع کیا۔

سپاہی چیونٹے

سرولیم سلم نے جو برطانوی فوج میں چوتھے دستے کے کماندار تھے ایک بار فرمایا کہ جنوبی امریکہ کا ایک خاص چیونٹا اپنی ایک عادت کے مطابق جاپانی سپاہی سے مشابہت رکھتا ھے اور وہ یہ کہ راستہ چلتے وقت جب بھی اسے کوئی چیز پڑی ہوئی نظر آتی فوراً عاقبت اندیشی کے خیال سے اٹھا کر اپنے پاس محفوظ کرلی۔ لیکن ایک لحاظ سے ان دونوں میں بین فرق موجود ھے۔ اور وہ یہ کہ امریکی چیونٹا سر جھکا کر اپنی ہار کبھی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ لڑتے لڑتے خود فنا ھو جاتا یا اپنے دشمن کو فنا کردیتا ھے اس چیونٹے کا اصطلاحی نام ‹ ایسی شن › ھے۔ وہ حد درجہ عقلمند اور محنتی لیکن اسکے ساتھ ھی ساتھ چنگیزی عہد کے مغل بادشاھوں یا ھنوں کی طرح ظالم اور خونریز بھی ھوتا ھے۔ کھانے کی تلاش میں اس قسم کے بے شمار چیونٹے صفیں بنا کر چلتے ھیں۔

افریقہ کا ‹ دوری لینس › نامی چیونٹا جو سپاہی کی طرح لڑتا اور مرنے سے نہیں ڈرتا ھے۔

———o———

وہ راستے کی ہر چیز کو تہس نحس کردیتے ھیں۔ ایک اور قسم کا جنگجو چیونٹا ‹ دوری لینس › کہلاتا ھے جو افریقہ میں پایا جاتا ھے۔ یہ بھی عقلمندی جفاکشی اور دور اندیشی کے اعتبار سے امریکی چیونٹے سے کسی طرح کم نہیں ھوتا۔ یہ کوشش کرتا ھے کہ دشمن کی ملکہ کو مار ڈالے اور اسکی فوج میں ابتری پھیلا کر اسکے سپاھیوں کو اپنا غلام بنالے۔ ایسے موقعوں پر اسکی بہادری کے کارنامے ھاتھیوں کی جرات سے بھی بڑھ جاتے ھیں۔ ان دونوں قسموں کے چیونٹے حشرات الارض کی جانچ پڑتال کرنے والے ماہرین علم کیلئے ھمیشہ جاذب نظر رھے ھیں۔ ایچ ڈبلیو بیٹس پہلے شخص ھیں جنکی توجہ اول الذکر کی طرف مبذول ھوئی۔ وہ مسلسل دس سال تک وادئ امیزان میں اسکی عادات و اطوار کا جائزہ لیتے رھے اور اپنی تحقیق کے مطابق اس نتیجے پر پہنچے کہ سپہ گری کی صلاحیت اسمیں فطرتاً موجود ھے۔ اب حال ھی میں پروفیسر مارٹن وھیلر نے ان چیونٹوں کی ایک فوج دیکھی جو اپنے انڈوں اور نوزائیدہ بچوں کو اٹھائے مستعدی سے چلی جا رہی تھی۔ انہوں نے بھی اندازہ لگایا کہ وہ ایک منظم فوج کی طرح چل رہی ھے۔

جنوبی امریکہ کا ایک سپاہی چیونٹا جو سفاکی میں اپنی نظیر آپ ھے۔

امریکہ کے یہ سپاہی چیونٹے دیکھنے میں بہت خوبصورت معلوم ھوتے ھیں۔ یہ فوجیوں کی طرح قطار باندھ کر قاعدے کے مطابق اپنے دشمن پر حملہ کرتے ھیں۔

———:o:———

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	—	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں ـ ایک سو اسی صفحات ـ دو نقشے ـ کپڑے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) ـ

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) ـ

خاص رعایت «عربی - انگریزی جملے» نوے صفحات ـ گتے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ـ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ـ

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد ـ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) ـ

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ ـ دھلی

آجکل

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
ہندوستان
برما
عربستان
انڈو چائنہ

Ajkal

عبوری حکومت کے چند اراکین

(دائیں جانب سے) سید علی ظہیر' ممبر لیجسلیٹیو' پوسٹ اینڈ ایئر۔
پنڈت جواہر لال نہرو' ممبر امور خارجہ اور تعلقات دولت مشترکہ
(نائب صدرحکومت) مسٹر آصف علی' ممبر جنگی حمل و نقل اور ریلوے۔
سردار ولبھ بھائی پٹیل' ممبر امور داخلہ' اطلاعات و اشریات۔ ڈاکٹر
راجندر پرشاد' ممبر زراعت و خوراک۔ مسٹر جگ جیون رام' ممبر لیبر۔
مسٹر سرت چندر بوس' ممبر ورکس' مائنز اینڈ پاور۔

لڑکیوں کی شادی کا ایک اچھا تحفہ

رضیہ کا شاہی دستر خوان
کھانا پکانے کی بہترین کتاب
قیمت ۳ر
علاوہ محصول

رضیہ کی مشرقی مغربی کشیدہ کاری
کشیدہ کاری کا حسین مجموعہ
قیمت ۱ر علاوہ محصول

رضیہ کے خطوط
زنانہ خطوط طرز جدید
قیمت عہ

باپ کا خط بیٹی کے نام
باپ کی نصیحت
قیمت بارہ آنے

تازیانہ
دلچسپ ناول
قیمت عہ

فاطمہؓ کا لال
شہادت حسینؓ پر رونگٹے کھڑے کر دینے والی کتاب
قیمت — ۱۲ر

پتھر سے ہیرا
اخلاقی ناول
قیمت عہ

چھالے
نئے افسانوں کا مجموعہ
قیمت ۳ر

مذکورہ کتابوں کا سیٹ ہے۔ پورے سیٹ کی قیمت سترہ روپے چار آنے ہے۔ پورا سیٹ منگانے پر محصول ڈاک وغیرہ معاف

نیا کتاب گھر اردو بازار (ا ے، سی، دہلی)

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا

دوسرا ایڈیشن قیمت ۲ؔ

دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی و جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے قیمت ؏

ادبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کرکے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکا ہے

تیسرا ایڈیشن قیمت ؏

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں۔ آج ہی آرڈر دیجئے نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب

اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تشریح اور استدلال سے مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز و روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کر دے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے کامل ۱۷ حصے بلا جلد پچیس ۲۵ روپے مجلد اکتیس ۳۱ روپے

معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی یہ کتاب فریڈرش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ یہ جیسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف قیمت مجلد آٹھ روپے

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی

حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ

روس کے انقلاب کا پس منظر تاریخی، معاشی، اخلاقی، اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کرکے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے

> ہمارے ہاں اسلامی۔ ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سیپارے شائع ہوتے ہیں
>
> فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اوراق پارینہ

از شیر جنگ

ایک انقلابی تبدیلی دہ بی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور و کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنوں کیلئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے، محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت ؏

اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ہاروی

اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہند و اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کریگی تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد ؏

قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں۔ لیکن انسان کہلانے کا حق دار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی قیمت ایک روپیہ

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں کتب سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔

تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔

قیمت مجلد چھ ۶ روپے

ملنے کا پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب۔ کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۹ | یکم اکتوبر سنہ ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ

آغا محمد یعقوب دواشی

بی اے (علیگ) ایل ایل بی

نائب مدیر

فضل حق قریشی

دہلوی

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۲۶ دہلی

رفتار زمانہ

نائب صدر کی پہلی تقریر

ہندوستان کی عارضی حکومت کے نائب صدر آنریبل پنڈت جواہر لال نہرو کی اردو تقریر کا متن جو انہوں نے ۷ ستمبر ۱۹۴۶ء کو پونے نو بجے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی:-

ڈوستو اور ساتھیو! جے ہند!

چھ روز ہوئے کہ میں اور میرے رفیقوں نے حکومت ہند کے اعلیٰ عہدوں کو سنبھالا۔ اس قدیم ملک میں ایک نئی حکومت قائم ہوئی ہے جسے ہم عبوری یا عارضی حکومت کہتے ہیں۔ اور یہ ہندوستان کی کامل آزادی کی طرف پہلا قدم ہے۔ ہمیں دنیا کے تمام حصوں اور ہندوستان کے کونے کونے سے مبارک بادی اور خیرسگالی کے ہزاروں پیغامات موصول ہوئے ہیں۔ مگر پھر بھی ہم نے اس تاریخی واقعہ کو جشن کے طور پر منانے کے لئے نہیں کہا بلکہ ہم نے اپنے لوگوں کے جوش و خروش کو دبایا ہے۔ کیونکہ ہم ان کو اس بات کا احساس کرانا چاہتے تھے کہ ہمارا سفر ابھی جاری ہے۔ نیز منزل مقصود تک پہنچنا ابھی باقی ہے۔ ہمارے راستے میں بہت سی مشکلات اور رکاوٹیں حائل ہیں۔ اور ممکن ہے کہ ہمارے سفر کی آخری منزل اتنی قریب نہ ہو جتنی لوگوں نے سمجھ رکھی ہے۔ اس وقت کسی کمزوری کا اظہار اور بے فکر بیٹھنا ہمارے مقصد کے لئے مہلک ہوگا۔

حادثات کلکتہ کلکتہ کے ہولناک حادثہ اور بھائی بھائی میں فضول لڑائی جھگڑے کے باعث ہمارے دل غم سے پُر تھے۔ ہمارے پیش نظر جو آزادی ہے اور جس کی خاطر ہم نے پشت ہا پشت سے تکالیف اور مصیبتیں جھیلی ہیں وہ کسی ایک گروہ۔ جماعت یا کسی ایک مذہب کے پیروؤں کی آزادی نہیں بلکہ ہندوستان کے سارے باشندوں کی آزادی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ امداد باہمی کی ایک ایسی دولت مشترکہ قائم کی جائے جس میں مواقع کے لحاظ سے بنیادی تمام باتوں میں جو زندگی کو پُرمعنی بناتی اور اس کی قدر و قیمت بڑھاتی ہیں سب کو برابر حصہ ملے۔ اس لئے یہ کش مکش یہ خوف اور ایک دوسرے پر یہ بے اعتمادی آخر کیوں؟

خوش آیند پیغامات میں آپ کے سامنے مستقبل کی اعلیٰ پالیسی اور اپنے پروگرام کے متعلق کچھ زیادہ بیان نہیں کروں گا۔ اس کے لئے ابھی کچھ وقت درکار ہے۔ میری غرض یہ ہے کہ مہر و محبّت کے اس اظہار پر جو آپ نے اس قدر وسیع پیمانے پر کیا ہے آپ کا شکریہ ادا کروں۔ محبت اور تعاون کا یہ جذبہ ہمیشہ خوش آیند ہے۔ مگر اس کی ضرورت آنے والے کٹھن ایام میں بہت زیادہ ہوگی۔ ایک دوست نے مجھے یہ پیغام بھیجا ہے "حکومت کی کشتی کے پہلے ناخدا! خدا کرے آپ ہر طوفان کا کامیابی سے مقابلہ کریں۔ آپ کو یہ سفر مبارک ہو" یہ پیغام خوش کن ہے مگر ہمیں آئندہ بہت سے طوفانوں کا سامنا ہوگا۔ ہماری حکومت کی کشتی پرانی شکستہ اور سست رفتار ہے اور تیزی سے بدلنے والے زمانہ کے مناسب حال نہیں ہے۔ اسے توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ ایک نئی کشتی تعمیر کرنی ہوگی لیکن کشتی خواہ کتنی پرانی کیوں نہ ہو اور ناخدا خواہ کتنا ہی کمزور کیوں نہ ہو، اگر اس کی مدد کے لئے کروڑوں لوگ موجود ہوں تو ہم سمندر کے زبردست تھپیڑوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور بھروسے کے ساتھ مستقبل کے سامنے ڈٹ سکتے ہیں۔ یہ مستقبل وجود میں آرہا ہے اور ہندوستان —— ہمارا قدیم اور پیارا ملک —— مصیبتوں اور مشکلوں سے دوچار ہونے کے بعد اپنے آپ کو اپنے پاؤں پر کھڑا پاتا ہے۔ وہ اب پھر جوان سال ہے اس کی آنکھوں میں حوصلہ اور جرأت کی چمک پائی جاتی ہے۔ اسے اپنے آپ اور اپنے مقصد پر بھروسہ ہے۔ وہ ایک لمبے عرصہ تک تنگ دائرے میں محدود فکر و غم میں ڈوبا رہا۔ لیکن اب اس کی نظریں وسیع دنیا پر اٹھ رہی ہیں اور وہ دوستی کا ہاتھ دنیا کی

دوسری قوموں کی طرف بڑھا رہا ہے جو اگرچہ ابھی تک کشمکش اور جنگ کے خیالات سے پرے ہے۔

اشتراکِ عمل کی امیدیں

عارضی قومی حکومت اس بڑی اسکیم کا ایک حصہ ہے جس میں دستور ساز اسمبلی شامل ہے، جس کا اجلاس آزاد اور خود مختار ہندوستان کا آئین مرتب کرنے کے لئے جلد منعقد ہوگا۔ کامل آزادی کے قریبی حصول کی یہی امید ہے جس کی وجہ سے ہم اس حکومت میں شامل ہوئے ہیں اور ہم اپنے فرائض کو اس رنگ میں انجام دینے کا ارادہ رکھتے ہیں کہ نہ صرف اپنے ملکی معاملات میں بلکہ غیر ملکی تعلقات میں بھی یہ آزادی عملی طور پر بسرعت حاصل ہو جائے۔ بین الاقوامی کانفرنسوں میں ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے پورا پورا حصہ لیں گے۔ اس بارے میں ہماری پالیسی کسی دوسری قوم کا طفیلی ہونے کی حیثیت سے نہیں ہوگی بلکہ وہ ہماری اپنی پالیسی ہوگی۔ ہم دوسرے ملکوں سے گہرے اور براہ راست تعلقات قائم کرنے اور عالمگیر امن اور آزادی کے مقصد کے حصول میں ان سے اشتراکِ عمل کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو باہم مخالف گروہوں کی اقتداری سیاسیات سے دور رہیں۔ زمانہ ماضی میں یہی جذبہ عالمگیر جنگوں کا موجب ہوا ہے اور یہی جذبہ آئندہ بھی وسیع تر بربادی کا باعث بن سکتا ہے۔ ہم اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ امن اور آزادی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اور کسی ایک ملک کو آزادی دینے سے انکار لازمی طور پر دوسرے ملکوں کی آزادی کو خطرہ میں ڈال دے گا اور کشمکش اور جنگ کا موجب بن جائے گا۔ ہمیں نوآبادیوں اور دست نگر ملکوں اور باشندوں کی آزادی سے خاص طور پر دلچسپی ہے۔ اس طرح ہمیں اس بات سے بھی خاص دلچسپی ہے کہ تمام نسلوں کے لئے یکساں مواقع بہم پہنچانے کے اصول کو نظری اور عملی اعتبار سے تسلیم کر لیا جائے۔ ہمیں نسلی برتری کے نازی اصول سے جس پر خواہ کہیں بھی اور کسی صورت میں بھی عمل کیا جا رہا ہو شدید اختلاف ہے۔ ہم دوسروں پر اقتدار قائم کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہمیں دوسری قوموں پر کوئی امتیازی حیثیت حاصل ہونے کا دعویٰ ہے۔ لیکن ہمارا یہ مطالبہ ضرور ہے کہ ہمارے لوگ جہاں بھی وہ جائیں ان سے مساویانہ اور عزت مندانہ سلوک کیا جائے اور ہم ان کے خلاف کسی قسم کی تفریق کو گوارا نہیں کر سکتے۔

باہم رقابتوں، نفرت اور داخلی تنازعوں کے باوجود دنیا ناگزیر طور پر پہلے سے زیادہ اشتراکِ عمل کرنے اور ساری دنیا کی ایک دولت مشترکہ کے قیام کی طرف آ رہی ہے۔ یہی وہ واحد دنیا ہوگی جس کے لئے آزاد ہندوستان کوشش کرے گا۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں آزاد قومیں آزادانہ اشتراکِ عمل کریں گی اور کوئی جماعت یا گروہ کسی دوسری جماعت یا گروہ سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

انگلستان کے ساتھ دوستی

گذشتہ باہمی کشمکش کے باوجود ہمیں امید ہے کہ آزاد ہندوستان کے تعلقات انگلستان اور برطانوی دولت مشترکہ کے ممالک کے ساتھ دوستی اور تعاون کے ہوں گے۔ لیکن بہتر ہے کہ دولت مشترکہ کے ایک حصہ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے اسے یاد رکھا جائے۔ جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کو سرکاری حمایت حاصل ہے اور نسلی اعتبار سے ایک اقلیت کے جور و ستم کے خلاف ہمارے لوگ بہادرانہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ اگر نسلی برتری کے اس عقیدہ کو قبول کر لیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ وسیع پیمانہ پر تصادم اور عالمگیر تباہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

ہم ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے باشندوں کو مبارکباد دیتے ہیں جنہیں مقدر نے بین الاقوامی معاملات میں اہم حیثیت دے رکھی ہے۔ ہمیں بھروسہ ہے کہ اس بہت بڑی ذمہ داری کو امن اور انسانی آزادی کو ہر جگہ فروغ دینے کے لئے کام میں لایا جائے گا۔ موجودہ دنیا کی اس دوسری بڑی قوم یعنی سوویٹ یونین کو بھی ہم مبارکباد دیتے ہیں جس پر عالمگیر واقعات کی تشکیل کی عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایشیا میں وہ ہمارے پڑوسی ہیں۔ لازمی طور پر ہمیں کئی مشترکہ کام سنبھالنے ہوں گے اور ہمیں ایک دوسرے سے اکثر واسطہ پڑے گا۔

پڑوسی ملکوں سے اتحاد

ہم ایشیا کے رہنے والے ہیں اور دوسروں کی نسبت ایشیا کے لوگ ہم سے زیادہ نزدیک اور قریب ہیں۔ ہندوستان اس طرح واقع ہوا ہے کہ وہ مغربی، جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کا مرکز ہے۔ گذشتہ زمانے میں ہندوستان کی تہذیب ان تمام ملکوں تک پھیل گئی تھی اور ان ملکوں کا بھی ہندوستان سے کئی صورتوں میں واسطہ پڑتا تھا۔ ان تعلقات کی تجدید کی جا رہی ہے اور مستقبل میں ایک طرف ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا اور مغرب میں افغانستان، ایران اور دنیائے عرب کے درمیان اور بھی زیادہ اتحاد ہونا ناگزیر ہے۔ آزاد ملکوں کے اس گہرے اتحاد کو ترقی دینے کے لئے ہمیں اپنی کوششیں صرف کرنی چاہئیں۔ ہندوستان انڈونیشیا کے لوگوں کی جنگ آزادی کا گہری دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کر رہا ہے اور ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ہمارا پڑوسی چین کا بڑا ملک

جس کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے صدیوں سے ہمارا دوست ہے۔ یہ دوستی قائم رہے گی اور بڑھتی جائے گی۔ ہمیں قوی امید ہے کہ چین کی موجودہ مشکلات جلد ختم ہو جائیں گی اور ایک متحدہ اور جمہوری چین جنم لے گا جو دنیا کے امن اور ترقی میں بہت بڑا حصہ لے گا۔

داخلی پالیسی

میں نے اپنی داخلی پالیسی کے متعلق کچھ نہیں کہا اور نہ ہی اس مرحلہ پر میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ لازمی ہے کہ اس پالیسی کے تعین میں وہی اصول کام کریں گے جن پر ہم آج تک کاربند رہے ہیں۔ ہم ہندوستان کے بھلائے ہوئے عوام کی خبر گیری کریں گے اور انہیں آرام پہنچانے اور ان کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم چھوت چھات کی لعنت اور اونچ نیچ کی جبری تفریق کی مختلف شکلوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے اور خاص طور پر ان لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کریں گے جو اقتصادی یا دوسرے اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ آج کروڑوں آدمیوں کو خوراک، کپڑوں اور مکانوں کی ضرورت ہے اور بہتوں کی حالت فاقہ کشی تک پہنچنے والی ہے۔ اس فوری ضرورت کو پورا کرنا ایک اہم اور مشکل کام ہے اور امید ہے کہ دوسرے ملک غلہ بھیج کر ہماری مدد کریں گے۔ ایک ایسا ہی ضروری اور اہم کام نفاق کے اس جذبہ پر قابو پانا ہے جو آج ہندوستان میں بہت پھیلا ہوا ہے۔ باہمی جھگڑوں کی بنا پر ہم آزاد ہندوستان کو تعمیر نہیں کر سکیں گے جس کے خواب ہم اتنی مدت سے دیکھتے رہے ہیں۔ سیاسی تغیّرات خواہ کچھ ہی ہوں ہم سب کو اس ملک میں اکٹھا رہنا سہنا اور کام کرنا ہے۔ نفرت اور تشدد اس بنیادی حقیقت کو بدل نہیں سکتے اور نہ ہی یہ ان تبدیلیوں کو روک سکتے ہیں جو ہندوستان میں واقع ہو رہی ہیں۔

دعوتِ اشتراک

دستور ساز اسمبلی میں گروپ بندی اور سیکشنوں کے متعلق کافی گرما گرمی کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ ہم ان سیکشنوں میں بیٹھنے کے لئے بالکل تیار رہیں اور ہم نے اس پوزیشن کو قبول بھی کر لیا ہے جو گروپوں کی تشکیل کے مسئلہ پر غور کریں گے۔ میں اپنے رفیقوں اور خود اپنی جانب سے یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم دستور ساز اسمبلی کو زور آزمانے یا ایک فریق کے نقطۂ نظر کو دوسرے پر زبردستی ٹھونسنے کے لئے اکھاڑا نہیں سمجھتے۔ ایک مطمئن اور متحدہ ہندوستان کو تعمیر کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہم ایسے متحدہ اور متفقہ حل چاہتے ہیں جنہیں زیادہ سے زیادہ خیرسگالی حاصل ہو۔ ہم دستور ساز اسمبلی میں اس پختہ عزم کے ساتھ جائیں گے کہ تمام متنازعہ مسائل کے لئے اتفاق کی مشترکہ بنیاد تلاش کی جائے پس جو کچھ ہو چکا ہے اور جو سخت الفاظ استعمال کئے جا چکے ہیں ان کے باوجود ہم نے تعاون کا راستہ کھلا رکھا ہے اور ہم ان لوگوں کو بھی جو ہم سے اختلاف رکھتے ہیں دعوت دیتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہمسروں اور حصہ داروں کی حیثیت سے کسی قسم کی پابندیوں کے بغیر دستور ساز اسمبلی میں شریک ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ جب ہم ایک جگہ جمع ہو کر مشترکہ کاموں میں ہاتھ ڈالیں تو ہماری موجودہ مشکلات ختم ہو جائیں۔

ہندوستان کا کاروان جادہ پیما ہے اور پرانا نظام ختم ہو رہا ہے۔ کافی مدت تک ہم واقعات کا چپ چاپ مشاہدہ کرتے رہے اور دوسروں کے کھلونے بنے رہے اب مہل ہمارے ہاتھ آئی ہے اور ہم اپنی مرضی کے مطابق اپنا مستقبل بنائیں گے۔ آؤ ہم سب اس بڑے کام میں شریک ہوں اور ہندوستان کو جس پر ہمیں فخر ہے اور جس کا مرتبہ دنیا کی قوموں میں بہت بڑا ہے امن اور ترقی کے ذرائع میں امتیازی درجہ دے دیں۔ دروازہ کھلا ہے اور مقدر ہم سب کو اشارے سے بلا رہا ہے۔ یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ جیتا کون ہے اور ہارا کون ہے کیونکہ ہمیں ساتھیوں کی طرح آگے بڑھنا ہے اور یا تو ہم سب کامیاب ہوں گے یا سب کے سب اکٹھے ڈوبیں گے۔ لیکن ہمیں ناکامی ہرگز نہ ہوگی۔ ہمارا قدم کامیابی۔ آزادی۔ خود مختاری، اور ہندوستان کے چالیس کروڑ باشندوں کی بہبودی کی طرف اٹھ رہا ہے۔

"جے ہند" جواہر لال نہرو

گندم کے ذخیروں میں کمی

امریکہ کے محکمۂ زراعت کا بیان ہے کہ یکم جولائی کو امریکہ، کنیڈا، ارجنٹائن اور آسٹریلیا کے گندم کے ذخیروں میں قلت کا یہ عالم تھا کہ گذشتہ دس سال میں یہ کیفیت دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور یہ وہ ملک ہیں جہاں گندم سب سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ گذشتہ سال ذخیروں میں ۸۲۴،۰۰۰۰۰ بشل گندم تھا اور اس سال ۲۷،۳۰۰۰۰۰۰ بشل ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا دارومدار زیادہ تر سال رواں کی فصل پر ہوگا۔ یکم جولائی کو کنیڈا کے ذخیروں میں سب سے زیادہ کمی دیکھی گئی یعنی پچھلے سال اگر ۳۱۸۰۰۰۰۰ بشل گندم تھا تو اس سال ۹۰۰۰۰۰۰ بشل ہوا۔ اس طرح امریکہ میں اس سال ۱۰۱۰۰۰۰۰۰ بشل تھا لیکن پچھلے سال ۲۸۱۰۰۰۰۰ بشل تھا، اور ارجنٹائن میں پچھلے سال ۱۷۵۰۰۰۰۰ بشل تھا اور اس سال ۱۱۵۰۰۰۰۰ بشل ہے۔ آسٹریلیا میں البتہ گذشتہ سال کی نسبت اس سال کے ذخیرے بہت زیادہ تھے یعنی ۵۰۰۰۰۰۰۰ کی بجائے ۶۷۰۰۰۰۰۰ بشل تھے۔

تبرّکات

آغا شاعر قزلباش مرحوم

بدل دی انقلاب دہر نے تاثیر میخانہ
یہ آنکھیں رہ گئیں اتری ہوئی تصویر میخانہ

نشیلی انکھڑیوں کا واسطہ پلکیں جھکا لیجے
ادھر سے یہ ادھر سے آرہے ہیں پیر میخانہ

اثر اتنا تو ہو آنے لگے بوئے شراب اُس سے
کہ جس کاغذ پہ کوئی کھینچ دے تصویر میخانہ

بہت کچھ پارسا بنتا ہوں لیکن تار بارش میں
دکھائی دیتی ہے ہلتی ہوئی زنجیر میخانہ

گیا وہ دور شاعر اب نہ مے ہی اور نہ پیتے ہیں
زمانہ مانتا ہے ہم کو پھر بھی پیر میخانہ

اُنس، اپنے میں کہیں پایا نہ بے گانے میں تھا
کیا نشہ ہے؟ سارا عالم ایک پیمانے میں تھا

آہ - اتنی کاوشیں - یہ شور و شر یہ اضطراب؟
ایک چٹکی خاک کی - دو پر - یہ پروانے میں تھا

آپ ہی اس نے انا الحق کہدیا - الزام کیا؟
ہوش کس نے لے لیا تھا؟ ہوش دیوانے میں تھا؟

اللہ اللہ! خاک میں ملتے ہی یہ پائے ثمر
لو خدا کی شان پھل بھی پھول بھی دانے میں تھا

شیخ کو جو پارسا کہتا ہے اس کو کیا کہوں؟
میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ مے خانے میں تھا

شاعر نازک طبیعت ہوں مرا دل کٹ گیا
ساقیا لینا کہ شاید بال پیمانے میں تھا

اختر حسین رائے پوری

بحیثیت افسانہ نگار

(۲)

ظہور الحسن ڈار

اختر حسین رائے پوری کو اردو کے افسانوی ادب میں روشناس کرانے کا سہرا "آنچل" کے سر ہے۔ ان کا پہلا افسانہ "زبانِ بے زبانی" اسی پرچے میں شائع ہوا اور شدتِ احساس، خلوص اور منفرد طرزِ بیان کی ایسی مثال چھوڑ گیا جس کا سراغ اختر کے آرٹ کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔ جس زمانے میں اختر رائے پوری نے لکھنا شروع کیا، منشی پریم چند اس دیس کے افسانوی ادب کی چوٹی پر نظر آرہے تھے۔ قاعدہ ہے کہ کسی بڑی ادبی شخصیت کی موجودگی میں اچھے اچھے فن کاروں کو بھی اپنا چراغ جلانے میں بڑی جاں کاہی سے واسطہ پڑتا ہے، مگر اختر حسین نے جس قلیل مدت میں نہ صرف اس دیس کے ادبی حلقے بلکہ خود منشی پریم چند کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا، وہ بجائے خود ان کی عظمت کی بڑی دلیل ہے۔

اردو افسانے سے اختر کا تعلق محبت سے شروع ہوا اور نفرت کے عنوان پر گھوم آیا۔ ان کے افسانوں کے مجموعے کا نام بھی یہی ہے اور ان افسانوں کے پس منظر میں زندگی کے دو ہی اہم جذبے کارفرما ہیں۔ انسان کے دل کی تھرتھراتی ہوئی نازکی میں یہ جذبے حواس کے تاروں پر لرزتے رہتے ہیں۔ زندگی کے ہر حادثے میں ایک نہ ایک جذبے کا دخل ہوتا ہے، محبت یا نفرت، محبت نیلے آسمان کی طرح حسین اور نسیم بہار کی طرح معطر ہے، اس کی بیکنار وسعت میں زندگی کا سارا حسن اور رس موجود ہے۔ جب آدم کو شجرِ ممنوعہ چکھنے کے جرم میں جنت سے نکالا گیا، تو جذبۂ محبت نے ہی اس کے محزون و بیقرار دل کو تسکین بخشی، مگر ایک ایسا زمانہ آیا کہ آدم کی اولاد نے خود محبت کو بھی شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا، اور سماج کا جامہ اوڑھ کر اخلاق کے بھوت کی مدد سے اس کے گرد پہرا دینے لگی۔

یہ پہرا آج بھی قائم ہے، آدمی فطرت سے مجبور ہو کر اس شجرِ ممنوعہ کی طرف بڑھتا ہے، اور سماج کے کلہاڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہ قربانی بڑی دردناک ہے مگر اس کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ محبت جیسے حیات بخش جذبے کا تحفہ موت کیوں ہے اس کی ذمہ داری ہمارے ماحول پر ہے، اس ماحول میں ہندوستانی سماج کے قوانین کا سکہ چلتا ہے، ان بہیمانہ قوانین کا جو زندگی کے منفی پہلو کے نمائندہ ہیں۔ اور جن کی موجودگی میں حیات کا کوئی بھی صحت مند جذبہ پھل اور پھول نہیں سکتا، ہندوستانی سماج نے سب سے زیادہ ظلم جذبۂ محبت کے ساتھ کیا ہے، خاص طور پر عورت کی محبت پر۔ مرد تو خیر خدا کا خلیفہ ہے مگر عورت، کیا اس کے گناہ بھی معاف کر دیئے جاتے ہیں؟ اگر ایسا ہوتا تو آج اس دیس کے چکلے ویران نظر آتے، اندھیری گلیوں میں حوا کی بیٹیاں عصمت فروشی کرتی دکھائی نہ دیتیں، آتشک کے جراثیم آبائی ورثے میں تقسیم ہوتے دکھائی نہ دیتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، اس لئے کہ ہندوستانی سماج کی نظر میں محبت گناہ ہے، اور اس کی سزا جہنم کی جلن سے بھی زیادہ تلخ ہے۔

اختر نے "محبت" کے عنوان سے جتنے بھی افسانے لکھے ہیں، وہ محبت، نامرادی اور سزا کی ایسی ہی کشمکش کے عکاس ہیں۔ ان افسانوں میں ایک بیقرار روح کا کرب ہے، ایک مجروح دل کی فریاد ہے، ایک ناکام تمنا کا سوز ہے، جو ناظر کے دل میں گہرا غوطہ لگا کر آنسوؤں کے موتی چن لاتا ہے، ان افسانوں میں "زبانِ بے زبانی" "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" اور "منزلِ ناتمام" بڑے معرکے کی چیزیں ہیں، "زبان بے زبانی" کا ہیرو برگد کا ایک بوڑھا درخت ہے جو اس جہانِ بے ثبات سے چلتے چلاتے اپنی بے زبانی سے انسانی محبت کی داستان سناتا ہے، اور اپنے مشاہدے اور فکر کے میل سے ایک ایسی پرسوز کہانی مرتب کرتا ہے جو ناظر کے دل میں محبت کی طرف سے بدگمانی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ محبت کی پاکیزگی اور رعنائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہے، مگر اس کا مشاہدہ بتلاتا ہے، کہ محبت کا انجام بربادی کے سوا اور کچھ نہیں، وہ خود بھی اپنے سینے سے لپٹی ہوئی "اینلی امربیل" سے محبت کرتا ہے، اس کے بوسوں کی لذت میں مسرور رہنا چاہتا ہے، مگر اس کے دل میں یہ کھٹک موجود ہے کہ آخر کار یہ محبت میری زندگی کا رس چوس لے گی، اور یہی محبوبہ "امربیل" ایک دن میری خاتمے کا عنوان لکھے گی۔ اس کا مشاہدہ اس کھٹک کو اور بھی پختہ کر دیتا ہے۔ اپنی بے بہرہ آنکھوں سے وہ دو تین مرتبہ انجام محبت دیکھتا ہے اور اپنی قسمت کو سراہتا ہے کہ وہ انسان نہ ہوا ورنہ اس کی محبت کا بھی وہی حشر ہوتا جو اس عورت کا ہوا جس نے مرتے وقت کہا۔

"دیوتا! سب نے مجھے ٹھکرا دیا، انسان کے رحم و کرم سے میں محروم ہو چکی، میں نے بیوفائی کی، احسان فراموشی کی، کس امید پر، محبت نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی، محبت افریب، مکر، دھوکا، اس ظالم نے مجھے دین و دنیا کہیں کا نہ رکھا، مہذب دنیا اب مجھے عصمت فروش ہرجائی کے نام سے پکارتی ہے۔ دیوتا! کیا تم مجھے اپنے دامنِ عاطفت میں جگہ دو گے، جانتے ہو، اپنے کاندھوں پر کیسے گناہِ عظیم کا بار لئے آئی ہوں، ایک ایسے بچے کی ماں ہوں، جس کا باپ بننے پر کوئی مرد تیار نہیں، دیوتا! کیا تم میرے گناہوں سے درگذر کرو گے، ...... کیا عورتوں کو بھی دراصل خدا نے ہی پیدا کیا تھا اور اس بچے کو؟ — اس بچے کی پیدائش کا ذمہ دار کون ہے، خیر میں ہی سہی، مگر میرے گناہوں کا خمیازہ وہ کیوں اٹھائیگا۔ خدا رحیم و کریم ہے، — شاید مردوں کے لئے، لیکن عورتوں کا خدا کہاں ہے، خدا — جنت — روح — دنیا — عاقبت — سب مردوں کے لئے، آہ میرا بچہ — میرا بچہ، —"

اس عورت کا جو برگد کی آغوش میں اپنے نوزائیدہ بچے سمیت تڑپ تڑپ کر مر گئی، صرف یہ جرم تھا کہ اس نے محبت کرنا چاہی، محبت، مگر محبت کی بجائے اسے موت ملی۔ یہ موت مرد کی ناپاک ہوس رانی کا عطیہ تھی یا سماج کے رسم و رواج کا تحفہ،

بہر حال وہ عورت سوسائٹی کی قربان گاہ پر ذبح ہوگئی اور اس کے ساتھ وہ بے گناہ بھی جو اسی رات اس کے بطن سے پیدا ہوا تھا، ایک سچے آرٹسٹ کی طرح اس افسانے میں اختر رائے پوری نے اخلاقیات پر کوئی وعظ نہیں کیا، نہ ہی انہوں نے ہندوستانی سماج کے متوازی کوئی فلسفۂ حیات مرتب کیا ہے، وہ یہ نہیں بتلاتے کہ ان خرابیوں کو جو انسانیت کی جڑ کو گھن کی طرح کھا رہی ہیں کس طرح برباد کیا جا سکتا ہے، بلکہ وہ ان ہولناک خامیوں کی سچی تصویر پیش کرکے درمیان سے ہٹ جاتے ہیں۔ اب یہ ناظر کا کام ہے کہ وہ اپنا راستہ خود متعین کرے۔ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" بہت حد تک زبانِ بےزبانی کا ہی آخری حصہ ہے، رات کی تاریکی میں بجلی نے ایک برگد کے بوڑھے درخت کا دل چیر دیا ہے، اب وہ زمین پر گرا پڑا ہے، مگر عالم نزع میں اس کی بے زبانی زیادہ شدت اختیار کرگئی ہے۔ "زبانِ بےزبانی" میں اس نے ایک ایسی عورت کو دیکھا، جو سماج کی ساری پابندیاں توڑ کر اپنے محبوب سے جا ملی، مگر انجام کار اسے واپس آنا پڑا، مگر کہاں! اسی برگد کے بوڑھے ٹھونٹھ کے پاس جو اس مرد کے دل کی طرح بے حس تھا جس نے اسے محبت کے بدلے فریب دیا تھا یا گناہ کی وہ گٹھڑی جو اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں دفن تھی، لیکن "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" میں وہ ایک ایسی لڑکی کا ذکر کرتا ہے جس نے محبت کی آگ میں جلنا پسند کیا مگر سماج کی پابندیاں توڑ کر اپنے محبوب سے ملنے کی ہمت اس میں پیدا نہ ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے وصال کا نتیجہ موت ہوگا، یا ایک ہرجائی کی زندگی جو موت سے بھی بدتر ہوگی۔ برگد کے درخت کے نیچے کھڑی وہ سوچتی ہے کہ کیا میری آواز میں اتنی طاقت ہوگی کہ ماں باپ کی گریہ و زاری اور بھائی بہن کی منت سماجت کو بند کردے، اور عشق کی بلندیوں پر چڑھ کر یہ کہے کہ عورت اپنی روح کو پاگئی، اس کی خودی اپنے لئے ایک الگ خدا بنائے گی، وہ صرف رسم الفت کو مانے گی، وہ اپنی دنیا الگ بسائے گی، اس کے آئین الگ ہوں گے، کیا میں یہ سب کچھ کرسکوں گی، کیا یہ ممکن ہے؟ ——— "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کاش وہ ایسا کرسکتی، مگر وہ عورت ہے، بےبس، لاچار اور مجبور عورت اپنی موت کو آواز دیتے ہوئے اس کے حلق میں پھندا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے محبوب کو ان الفاظ میں الوداع کہتی ہے۔ "میں پھر اسی غلام گردش میں جاکر اپنے آپ کو پابہ زنجیر کرنا چاہتی ہوں، کل خاندان شادی کے بازار میں اس باندی کا نیلام کرے گا، بہت سے سوداگر میری خریداری کو آئیں گے، میرے والدین انہیں روپیوں کی تھیلیوں میں بند کرکے دنیا کے ترازو پر تولیں گے، اور جو سب سے بوجھل ہوگا، میں اسی کے سپرد کردی جاؤں گی۔ کیا تم بھی اس نیلام میں بولی لو گے، اگر آؤ تو سودے کے لئے تیار ہوکر آنا .... مجھے وہیں پہنچا دو جہاں سے محبت کا مقناطیس مجھے کھینچ لایا تھا، کہیں میں زندگی کے میلے میں کھو نہ جاؤں؟ ——— "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

کتنی حیرت ہے ان الفاظ میں کیسی جگر گدازی تھی، جیسے عورت کی روح عالم نزع میں ہو، کیا ہندوستانی سماج کے پاس مظلوم عورت کی اس حسرتناک فریاد کا بھی کوئی جواب ہے؟ شاید ہو اور شاید نہ بھی ہو، مگر برگد کے بوڑھے ٹھونٹھ کا بے حس دل بھی اس ہولناک مشاہدے کی تاب نہیں لا سکتا، وہ جذبۂ محبت کی خودکشی پر ان دیکھے آنسو بہاتا ہوا زبان بےزبانی سے پکار اٹھتا ہے۔ "مجھے لوگ خدا سمجھتے ہیں، اگر ان کی دلشکنی کا خیال نہ ہوتا تو میں ہزار زبانوں سے چیخ اٹھتا کہ اے وہ جو مجھ سے بڑا ہے، اگر تو میری چنگاریوں میں اتنی صلاحیت پیدا کردے کہ وہ مشعل راہ بن جائیں اور میں محبت کی پگڈنڈی اسے دکھا سکوں، تو تجھ پر ایمان لے آؤں گا؟"

اختر رائے پوری واحد ہندوستانی فنکار ہیں، جو اپنے آرٹ میں نغمہ و فریاد کو پوری طرح گھلانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے افسانے ایک عجیب قسم کی پرسوز موسیقی کی طرح ہیں جس کی دلکشی میں حزن و ملال کی لہریں کانپ رہی ہیں، جس کے زیر و بم میں مغنی کا اپنا دل دھڑک رہا ہے، وہ دل جو صرف خلوص آشنا ہے، جس نے پوری شدت سے محبت اور نفرت کی ہے۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں احساس کی ایسی شدت۔ خیالات کی ایسی گہماگہمی اور تاثرات کی ایسی گرمی پائی جاتی ہے جو صرف خلوص سے عبارت ہے، خلوص کی منزل بڑی کٹھن ہے، اس راہ میں انسان کی زندگی ایک ایسے نغمے کی لے بن کر رہ جاتی ہے جو لوٹتے ہوئے دل کی گہرائی سے ابھر کر عرش کو چھو لیتا ہے، وہ محبت کرنا چاہتا ہے، مگر سماج کے بہیمانہ قوانین کی موجودگی میں اس پاکیزہ جذبے کی گنجائش کہاں؟ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمانہ، سماج، قدرت سبھی طاقتیں انسان کی آزادی کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوگئی ہیں۔ وہ رونا چاہتا ہے مگر آنسو ساتھ نہیں دیتے۔ فریاد کرنا چاہتا ہے۔ مگر کس سے کہے، اور پھر الفاظ کی کم مائیگی بھی آڑے آتی ہے، منجمد ہونٹوں سے آہ کا نکلنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ کیا انسان ہمیشہ اس المیئے کا شکار رہے گا، کیا اس کی زندگی میں کبھی بہار نہ آئیگی، کیا وہ کبھی محبت کے چراغ سے زندگی کی تاریکی کو روشنی میں مبدل نہ کرسکے گا، زندگی، محبت کے بغیر یہ کیسی زندگی ہے، اندھیرے سے زیادہ بھیانک، سناٹے سے زیادہ خوفناک، اور سمندر سے زیادہ ویران ——— کاش سماج کے مسند نشین دیوتاؤں کی بے بہرہ آنکھوں میں بھی کبھی حقیقت کی روشنی جھلک اٹھے، اور یہ نہیں تو کم از کم منزل ناتمام کے مسافر کی طرح ہر انسان پکار اٹھے۔ "ہم نے تہیہ کرلیا ہے کہ اپنے شباب کو وقف کردیں گے اضمحلال، افسردگی اور بڑھاپے کو مٹانے کے لئے۔ نظام زندگی کو ہم ایسا روپ دینے کی سعی کریں گے، کہ اس میں صرف شباب نواز اور حسن پرور عناصر کے لئے جگہ رہے۔ کبھی ایسا نہ ہو کہ بیوہ کے آنسو سہاگ میں آگ لگا دیں، غریبوں کی آہ انسانیت کو مسل ڈالے، یہ نہ ہو کہ ذلت اور معصیت کا تسلط ہمیشہ کیلئے نیکی کا گلا گھونٹ دے۔" صرف کوئی ایسا کارنامہ ہی انسانیت کو برباد ہونے سے بچا سکتا ہے، مگر کون جانے ایسا کب ہو۔!"

"نفرت" کے عنوان سے اختر حسین رائے پوری نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں "مجھے جانے دو"، "موت"، "مرگھٹ"، اور "میرا گھر" بہت اہم ہیں، یہ افسانے ہندوستانی سماج کے ترجمان بھی ہیں اور نقاد بھی۔ کچھ عرصے سے ہندوستانی افسانہ نگار کسی کی زندگی کو بڑی توجہ سے کھنگال رہے ہیں۔ بہت سی کہانیاں سماج کے

اس بدنام طبقے کے متعلق لکھی گئی ہیں، مگر خیالات کے الجھاؤ اور مشاہدے کی کمی کی وجہ سے ادب میں ان کا درجہ بہت پست ہے۔ اردو ادب میں ایسی رنڈیوں کی کمی نہیں، جو نے ناظر کی طرح تماشبین اور حریص ہیں، مگر "مجھے جانے دو" کی ہیروئن اپنی قسم کی واحد کسبی ہے جس کے پاس انسان کے لئے نفرت کے سوا اور کوئی تحفہ نہیں اس کے الفاظ میں ایسا زہر ہے، جس کا تریاق نہیں مل سکتا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا غصہ ہے، جس کا کوئی اتار نہیں۔ اس کے دل میں ایسی نفرت ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں ـــ اور یہ سب کس کے لئے؟ انسان کے لئے ـــ سماج کے لئے ان کے لئے جو رات کے اندھیرے میں کشاں کشاں اس کے پاس آتے ہیں، اس کے خرابے کو آباد کرتے ہیں اور وہاں سے نکل کر نفرت سے کہتے ہیں "ان طیکیتی طوائفوں کو عصمت وعزت کا ذرا بھی پاس نہیں، انہیں شہر سے نکال دینا چاہیئے" ایسا کیوں۔ اس لئے کہ وہ عورت ہے؟ بے بس اور لاچار عورت جسے خود سماج نے ہی عصمت فروش ہرجائی بننے پر مجبور کیا ہے، اب اس کے جسم کو گھن لگ چکا ہے، کئی خوفناک بیماریاں اس کے جسم کو اندر ہی اندر گھلا رہی ہیں، اور وہ مرد کا ذکر کرتے ہوئے مجسم نفرت ہو کر کہتی ہے "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں، تم جیسے چاہنے والوں کی ہی عطیہ ہیں، مرد ـــ سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ"۔ مگر اب اسکے مزاج میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی ہے، مرد نے اسے جو کچھ دیا ہے، اسے وہ مع سود لوٹا رہی ہے، وہ ساری انسانیت کو آتشک کے جہنم میں جلانا چاہتی ہے، اپنے چاہنے والے پر رحم کھا کر وہ کہتی ہے، "میں تم سے انتقام نہیں لینا چاہتی، اگر کوئی اور ہوتا تو میں بصد شکر آتشک اور سوزاک کے چند جراثیم اس کی نذر کرتی، وہ کسی اور کو دیتا، اور یہ اس کے بچوں کو ورثے میں ملتے، غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی، تب شاید سماج کے ٹھیکیداروں کو ہوش آتا، کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے"ـــ

جب ناظر اس افسانے کو دیکھتا ہے تو اس کا دل عورت کے ہولناک ارادے پر کانپ اٹھتا ہے، کسبی کی زندگی کا تانا بانا بننے کا ذمہ دار کون ہے، عورت یا خود سماج؟ ـــ پھر ان کی طرف نفرت سے کیوں دیکھا جاتا ہے، کیوں نہیں ایسا ماحول پیدا کیا جاتا جس میں کسبیوں کا وجود ہی نہ ہو،؟۔

ایک بڑے فنکار کی طرح اختر رائے پوری کے افسانوں کے کردار بڑے جاندار ہیں، اردو ادب میں ایسے کرداروں کی کمی ہے جنہیں زندگئ دوام حاصل ہو سکے، مگر جب میں اختر رائے پوری کے افسانے دیکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے، کہ اردو ادب اس معاملے میں بالکل ہی کنگال نہیں، بلکہ اس کی جھولی میں ایسے ہیرے بھی ہیں جو ادب کی منڈی میں غیر ملکی جواہر ریزوں سے آنکھ ملا سکتے ہیں۔ "مجھے جانے دو" کی کسبی کی طرح "موت" کا ہیرو چراغ علی بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ وہ زندگی کے منفی پہلو کا نمائندہ ہے۔ ایک ہوس پرست، اور شقی القلب انسان، زندگی بھر جس کے دل میں روشنی کی ایک حقیر سی کرن بھی پیدا نہ ہو سکی۔ "موت" میں اس زندگی کے آخری لمحات کی تصویر کھینچی گئی ہے، مگر اس میں ایسے پراسرار رنگ استعمال کئے گئے ہیں، جن کا نظارہ دل میں عجب طرح کی بے کلی پیدا کرتا ہے، مرتے ہوئے اس سنگدل کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں، اس کا ایک ٹکڑا آپ بھی دیکھئے ـــ "روپیہ۔ صرف ایک چمکتا ہوا روپیہ۔ سامنے طاق پر رکھا ہوا ہے، روشن دان میں سے صرف ایک کرن مسکراتی اور جگمگاتی ہوئی گھس آئی ہے، اور اس روپے سے آنکھ ملا رہی ہے۔ روپیہ کسی شریر کانی آنکھ کی طرح دمک رہا ہے۔ بوڑھا اسے صاف دیکھ رہا ہے۔ اس کا دماغ مختل ہونے لگا ہے۔ اسے یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس روپے پر خدا کی مہر لگی ہوئی ہے، خدا چاندی کی کانوں کا مالک، امیروں کی امارت بڑھانے والا، غریبوں کے خون کی چاندی بنانے والا، چراغ علی کا خدا، کہاں ہے وہ ـــــ اگر وہ ہے تو یقیناً وہ اس وقت بھی ہوگا، جب اس نے اپنی بیوی کو مار ڈالا۔ وہ نیک عورت اس کے ظلم سہتے سہتے مر گئی۔ اس کی بہن اس کی آنکھوں کے سامنے عصمت فروشی کرنے لگی ـــ ایک عورت اس کی ناپاک ہوس رانی کا شکار ہو کر پاگل ہو گئی ـــ اور اسی عالم میں ایک رات سردی نے اس کی زندگی کی حرارت چوس لی ـــ اس وقت خالقِ ارض وسما خاموش رہا۔ وہ آج بھی خاموش ہے، مگر چراغ علی کا روز مکافات آ پہنچا، اب اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اسی پاگل عورت کا خوفناک چہرہ گھوم رہا ہے۔ وہی چہرا اس کے لئے خدا ہے، موت کا فرشتہ ہے، جہنم کا داروغہ ہے۔ وہ کیا کچھ ہے، یہ چراغ علی ہی جانتا ہے، وہ تو خیر اپنے انجام کو پہنچ گیا مگر بے شمار ایسے چراغ علی ابھی زندہ ہیں، اور نہ جانے کب تک انسانیت کے سینے پر ناسور بن کر زندہ رہیں گے"

"مرگھٹ" ہمارے دیس کی سیاسی زندگی کی ایک مکمل تصویر ہے۔ اختر کے چابکدست ہاتھ نے اس میں ایسے تمتماتے ہوئے رنگ لگائے ہیں کہ اس مختصر سے افسانے میں انقلابی تحریکوں کے دوران میں عوام کی ذہنی کشمکش کا ہر پہلو اجاگر ہو گیا ہے۔ سرکار کی گولی لکھو مستری کے بیٹے کو ٹھنڈا کر چکی مگر ابھی وہ خود ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ اب وہ ابھی لوہار، شمبھو اور چھوٹو کے دماغ میں گھوم رہی ہے۔ گھومتے گھومتے وہ سرکار کے داروغہ حوالدار کریم خاں کا روپ اختیار کر لیتی ہے، اور یہ لوگ جو لکھو مستری کے بیٹے کی ارتھی جلانے آئے تھے، اسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کہ کہیں وہ بھی سرکار کے مخالفوں میں شمار نہ ہونے لگیں۔ یہ کہانی ادنےٰ طبقے کے ذہنی اتار چڑھاؤ کی نفسیاتی تحلیل ہے اور عوام کے دل میں رینگتی ہوئی اس دہشت کو بے نقاب کرتی ہے جو حکومت کی طاقت کے تصور سے ان میں گھر کر چکی ہے۔

اختر رائے پوری کا یہ مطالعہ ان لوگوں کو ضرور شرمائے گا، جو انقلاب کے نعرے بلند کر کے گھر کی چار دیواری میں دبک کر بیٹھ رہتے ہیں۔ اور انتظار کرتے ہیں کہ کب ہنگامہ فرو ہو تو پھر احتیاط سے میدان میں نکلیں، کسبیوں کے ذکر خیر کی طرح اردو کے افسانوں میں مزدور اور انقلاب کا تذکرہ بھی بہت ہے مگر ان میں سے ایک بھی مطالعہ "مرگھٹ" کے پائے تک نہیں پہنچ سکا۔ اس افسانے میں اختر رائے پوری

نے جو فنی کمال دکھایا ہے، وہ ناظر کو افسانے کے مطالعے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ مجموعی طور پر اختر رائے پوری کے افسانے اپنے خالق کی انفرادیت کے کامیاب مظہر ہیں۔ انکے مطالعے سے ناظر کے دل میں تاثر کا جو تلاطم برپا ہوتا ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ان کی زبان میں جادو ہے، ایسا جادو جو ایک ہی جھلک میں پڑھنے والے کو ہمیشہ کے لئے مسخر کر لیتا ہے۔ انہوں نے جس کامیابی سے ہندی اور اردو کے میل سے اپنے لئے ایک اچھوتا اور دلفریب اسلوب بیان ڈھونڈھ نکالا ہے، وہ ہمارے سالے ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ منظر نگاری کو افسانے میں بڑا درجہ حاصل ہے، خاص طور پر ایسی حالت میں کہ فن کار منظر نگاری سے ماحول کی وضاحت کر رہا ہو۔ اختر رائے پوری کو اس میں بڑا کمال حاصل ہے۔ ان کے چھوٹے سے چھوٹے جملے میں بھی ایک جہانِ معنیٰ آباد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک منظر دیکھیے! "اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا، یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشا دیکھا کرتی ہے۔ شام کو جب آرتی شروع ہوتی ہے اور کمسن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں تو گھی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پراسرار ہو جاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ درشن کے لئے آتے، وہ ہاتھ باندھے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے، اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو زیادہ بیباکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے، جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے کھڑی رہتی تھیں" — ("مجھے جانے دو")

موت کا تصور خوفناک ہے، مگر اس کو الفاظ میں ڈھالنے کے لئے بڑی کاوش کی ضرورت ہے۔ کوئی تصور جتنا جاندار ہوتا ہے اس کے بیان میں اتنی مشکل پیش آتی ہے، مگر دیکھیے فن کار نے چند جملوں میں کیسی ہولناک تصویر کھینچی ہے، "مرگھٹ ندی کے کنارے تھا، چھوٹا سا میدان جس میں کبھی کچھ نہ اگتا تھا، اور اس کی مٹی سیاہ تھی، جمے ہوئے خون کی طرح سیاہ! ندی کے کنارے کے پیڑوں پر ہمیشہ پت جھڑ رہتی تھی اور ان کی شاخیں قحط زدہ انسانوں کی طرح بادلوں کا منہ تاکا کرتی تھیں، ان پر گِدوں اور کوؤں کے علاوہ کوئی پرند نہ بیٹھتا تھا۔ دور تک ہڈیوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے اور یہاں وہاں ایک آدھ کھوپری زندگی کے انجام پر باچھیں چیر کر ہنس پڑتی تھی۔ ندی کا دھارا ہولے ہولے بہتا چلا جاتا تھا۔ کبھی کوئی موج گھاٹ سے ٹکرا کر سر اٹھاتی، مرگھٹ کی اداسی دیکھتی اور پھر سر جھکا کر اپنی راہ لگ جاتی تھی"۔

اسی مرگھٹ میں لوگ ایک لاش کو جلانے آئے ہیں۔ آپ بھی دل کڑا کر کے اس جلتی ہوئی لاش کا نظارا دیکھیے — "چتا تیزی سے جلنے لگی، دو آدمی لمبے لمبے بانسوں سے لاش کو اِدھر اُدھر لوٹانے لگے، گوشت کے ادھ جلے ٹکڑے اڑ اڑ کر زمین پر گر پڑتے تھے اور شعلے کتوں کی طرح ہڈیوں کو جبڑے میں دبا کر چٹخارہ بھرتے اور دبے بھرّائے ہوؤں سے ہر طرف گھورتے تھے، اندھیرا ہو چلا تھا، بادلوں کے دو چار گلابی ٹکڑے اڑ رہے تھے، اور ایک دو تارے تیروں کی نوک کی طرح آسمان میں پیوست تھے، ہر طرف سناٹا تھا، ہڈیوں کی کڑکڑاہٹ کے سوا کوئی آواز نہ آتی تھی"۔ ("مرگھٹ")

منظر نگاری کے کچھ نمونے آپ نے دیکھ لئے، اب اس طنز نگاری کی چند مثالیں بھی سنئے جو اختر کے آرٹ کا خاص حصہ ہے، طنز نگاری ادب کی ایک مشکل صنف ہے۔ اس دیس کی تو بات ہی کیا دنیا کے بھی چند ہی فنکار اسے کامیابی سے اپنا سکے ہیں۔ اختر رائے پوری نے فن کے اس پہلو میں جو چابکدستی دکھائی ہے وہ تعریف و توصیف سے مستغنی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ٹکڑا دیکھیے۔ "وہ گھر جو ملک کا پڑپوتا تھا، صوبے کے بیٹے شہر کے چھوکرے، محلہ کا لڑکا — وہ بہت بڑا تھا، یہ نہ میرا گھر تھا نہ میرے باپ کا بلکہ ایک سیٹھ کا مکان تھا، اس میں بہت سے کمرے تھے، جس طرح مکڑی کے جالے میں بہت سے خانے ہوتے ہیں، بہت سے لوگ مکھیوں کی طرح ان خانوں میں رہتے تھے۔ ایک منزل دوسری منزل کے اوپر اس طرح چڑھتی چلی گئی تھی، جس طرح ایک آسمان دوسرے آسمان پر رکھا ہو، اور چوتھی منزل پر وہ سیٹھ عیسیٰ مسیح کی طرح رہا کرتا تھا"۔ ("میرا گھر")

رنڈیوں اور گھر بار والی عورتوں کی چشمک بڑی پرانی ہے، مگر فن کار نے اسے جس انداز میں بیان کیا ہے، وہ اردو میں طنز نگاری کے ایک صحت مند باب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ "ٹریم پر شریف زادیوں، اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے، ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ و استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں، یہ بدبخت نسوانیت کی کلنک، خدا انہیں غارت کرے، چند ٹکوں کے لئے، شراب کی ایک بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیا کے لئے یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں، — اور ہم! — پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں، جنہوں نے انہیں اونچی حویلیاں، ریشمی ساڑیاں اور دھیر بچے عطا کئے تھے"۔ ("مجھے جانے دو")

افسوس ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اختر کے آرٹ کی خوبیاں پوری طرح نہیں دکھائی جا سکتیں، بلکہ میں تو یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کو ان فنی بلندیوں کی ایک جھلک بھی نہ دکھلا سکا، جو اس فن کار کے آرٹ میں جا بجا نظر آتی اور اس کی انفرادیت کو چمکاتی ہی چلی جاتی ہیں، جدتِ طبع، رعنائی بیان، دردمندی، خلوص اور سوز یہ وہ جواہر پارے ہیں، جن سے اختر حسین رائے پوری کی ادبی زنبیل بھری پڑی ہے، اور وہ عمر عیار کی طرح ہمیں اپنی فنی سحر طرازیوں سے مسحور کرتے چلے جاتے ہیں۔ قدرت نے انہیں ایسا دردمند دل عطا کیا ہے جو بے حس چیزوں تک کی فریاد پر تڑپ اٹھتا ہے۔ جو شخص برگد کے بوڑھے ٹھونٹھ کے دل کی دھڑکن سن سکتا ہے، اس کے احساس کی رسائی کا کیا کہنا، جب ان کا قلم جذبات کو الفاظ کے جال میں گرفتار کرتا ہے تو ان کی تحریر میں ایسی پرسوز دلربائی پیدا ہو جاتی ہے جو صرف مجروح لَے کی آرزومندی میں پائی جاتی ہے۔ زندگی کے بیتے ہوئے لمحوں میں بہت کشش ہے۔ انسان تنہائی کے عالم میں آنکھیں بند کرتا ہے، تو ان دیکھے دریچوں سے نہ معلوم نظریں ماضی کے سہانے چمن زار کو دیکھتی ہیں۔ اس چمن میں پھول ہی پھول ہیں، کانٹے نہیں، حسین

یادوں کے معطر پھول۔ ان کی خوشبو سے ذہن مہک اٹھتا ہے، مگر دل میں درد پیدا ہوتا ہے، کیا جو کچھ گزر چکا وہ لوٹ کے نہ آئے گا۔ دیکھئے ایک بے زبان نے اس موقع پر فن کار سے سرگوشیوں میں کچھ کہا ہے اور اس نے ان تاثرات کو اپنے انداز میں لکھ دیا ہے، مگر کیسے دلربا، پرسوز اور حسرتناک انداز میں ــــ "کل تک میں گنگا جل میں نہلایا جاتا تھا، چندن اور سیندور سے سنوارا جاتا تھا، صبح کے وقت کنول کے ڈنٹھل سے بھی زیادہ نازک انگلیاں پھولوں کی چادر مجھے اڑھاتیں، اور سرِشام میرے اردگرد چراغ حسن محبت کی لو بھڑکائے ہوئے حصولِ آرزو کی دعائیں مانگتیں گویا عشق کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا اور منجمد ہو کر مورت بن گیا۔ میرے سینہ میں اس جھلسے ہوئے پیڑ اور مرجھائی ہوئی بیل کی کہانی دفن ہے، حالانکہ یہ مورت عورت کے دل سے زیادہ لچیلی اور مرد کے دل سے زیادہ نازک ہے، مگر اس کی زبان وعبارت کو سمجھنے کے لئے ہوشیاری کی نہیں بیہوشی کی، فہم کی نہیں جنون کی ضرورت ہے، جب ذہن ماضی کے خواب دیکھتے دیکھتے بڑبڑانے لگتی ہے، اور اس کی ڈوبی ہوئی آواز کی بازگشت جھرنوں کے ترنم اور چنار کے پتوں کی سرسراہٹ میں سنائی دیتی ہے، جب وقت گردشِ ایام کی داستان قلمِ شفق سے لکھنے کے لئے شب کی سیاہی گھولتا ہے، تو انسان اور لوہم کے سوا ہر ذی حیات اس کا ہم نوا اور ہم گوش ہو جاتا ہے............ دوپہر کو جب گڈریا مجھ پر سر رکھ کر بانسری کی تان چھیڑتا ہے اور اس کے دلفریب سروں کو سن کر دھوپ سے پریشان پرندے دم بخود رہ جاتے ہیں، کہ یہ نغمۂ حیات پہلے کب سنا تھا۔ یا جب کوئی دیہاتی برات میرے گرد و پیش ٹھہرتی ہے، اور کوئی معصوم دوشیزہ دوسرے تبصروں کے ساتھ مجھے بھی چولہے میں لگا دیتی اور بڑوں کے ڈر سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی جھجکتی آواز میں برہت کے گیت گاتی ہے یا جب گاؤں کی ننھی لڑکیاں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی مجھے آ آ کر چھوتی ہیں تو میں ان سے کچھ کہنے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہوں، مگر جیسے پھانسی کی رسی کا جھٹکا دم واپیں آخری چیخ کو زبان پر آنے کی اجازت نہ دے، جیسے اوہام کی پابندی کسی دلہن کی زبان سے بوقت ایجاب "نہیں" نہ نکلنے دے۔ یہاں دبے ہی میرے جسم لرزاں سے عالمِ نزع کی سی ایک ہچکی سی نکلتی اور سینہ میں رہ جاتی ہے، البتہ جب کوئی ٹوٹا ہوا ستارہ میرے قریب گر پڑتا ہے اور مجھ سے ہم سخن ہوتا ہے تو آسمان والوں کی داستان سنتے سنتے میں بھی فرطِ اضطرار سے اسے زمین والوں کی سیاہ کاری سنانے لگتا ہوں۔"

"یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

اوپر بیان کی گئی تمام خوبیوں کے علاوہ جو چیز اختر رائے پوری کو دنیا کے بہترین فن کاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ وہ ان کے خیالات کی پاکیزگی اور نکھار ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا مشاہدہ حقیقی ہے اور انسانیت کے متعلق ان کا تصور اپنے مشاہدے کی طرح واضح ہے۔ ان کے دل میں عہدِ حاضر کے ادیبوں کی طرح انسان کے لئے کچھ کھوکھلے نعرے اور بیکار جذبات نہیں، بلکہ گہری ہمدردی ہے، جو اس مظلوم کے زخمی دل پر محبت کے پھائے کا کام دیتی ہے۔ اس اندھی اور اندھیری دنیا میں آدم کی اولاد سے جو سلوک ہو رہا ہے، اختر رائے پوری کا آرٹ اس کے خلاف ایک صحت مند صدائے احتجاج ہے۔ وہ ایک سوال ہے اس دنیا سے، دنیا کے قانون سے، قانون کے بنانے والوں سے اور قانون بنانے والوں کے خالق سے، کہ ایسا کیوں ہے، انسان پر عرصۂ حیات کیوں تنگ ہے، اس کائنات میں وہ اس طرح زندگی بسر کرنے پر کیوں مجبور ہے، یہ گورکھ دھندا فن کار کو عجب شبہے میں مبتلا کر دیتا ہے اور کئی جگہ وہ اپنے آرٹ میں اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔ "یہ کائنات کتنی عجیب ہے اور کس قدر پراسرار۔ انسان اس طلسم کے دروازے پر کھڑا ہو کر قیامت تک دستک دیتا رہے گا اور قیامت کے دن جب یہ دروازہ ٹوٹے گا تو یہ نظر آئے گا کہ خون کا ایک دریا ہے جس کے بیچوں بیچ ہڈیوں کا محل بنا ہوا ہے، اور اس میں وہ معبود رہتا ہے، جس کی پرستش فریب خوردہ انسانیت ہمیشہ سے کرتی آئی ہے" (دل کا اندھیرا)

شاید کچھ لوگوں کو اس سے اختلاف ہو، مگر وہ اسی طبقے سے ہوں گے جن پر خالق ارض وسما کی رحمتوں کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، مگر وہ کروڑوں انسان جو ان رحمتوں سے محروم ہیں ان کا گناہ کیا ہے، کس جرم کی پاداش میں وہ ایسی گھناؤنی اور شرمناک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں، یہ سڑکوں اور گلیوں میں گھومتے ہوئے بھکاری، یہ چکلوں میں بیٹھی ہوئی ننگی طوائفیں، یہ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے فاقہ کش انسان، یہ سب کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے؟۔ اگر فن کار تباہ حال مخلوق کے خالق سے اس کا سبب دریافت کرتا ہے یا سماج سے اس سوال کا جواب چاہتا ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ــــ کیا دنیا ایسی نہیں، اگر ہے تو پھر کیوں کا سوال ہونٹوں پہ نہ آئے تو کیا ہو ــ کاش فن کار کی یہ صدا سماج کے ٹھیکیداروں کے کان تک پہنچ جائے اور وہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کے بے زبان بت کی طرح انسان کو چلتا پھرتا اور بولتا ہوا شہاب ثاقب ثابت کرنے کا منصوبہ باندھ لیں ــــ لیکن بقول مصنف کون جانے وہ مبارک ساعت کب آئے!

"محبت اور نفرت" کی اشاعت کے بعد اختر نے جو افسانے لکھے ہیں، ان کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اب ان کا آرٹ ملکی قیود کو توڑ کر بین الاقوامی ادب سے رشتہ جوڑ رہا ہے، عجب اتفاق ہے کہ اس دور کی ابتدا بھی اپنے دیس سے بہت دور پیرس کی رومان پرور زمین میں ہوئی جو ان دنوں ہٹلر کے طوفانی دستوں کے مقابلے میں بری طرح گھائل ہو رہا تھا، آرٹسٹ نے وہیں اپنا ہمیشہ زندہ رہنے والا افسانہ "دل کا اندھیرا" لکھا، اور رآندرے جیسے امٹ کردار کی تخلیق کی، جو اپنی دردمندی اور انسانیت کی بدولت سدا زندہ رہے گا، فرانس کا یہ حساس سپاہی اجتماعی انسان کی زبان سے بولتا ہے، اس کی آواز میں ساری انسانیت کی فریاد ہے، اس کی آنکھوں میں نیکی کی معصومیت اور دل میں سچے جذبوں کا نور ہے، افسانے کے آخر میں جب دکھیاری ماں بیٹے کی موت سے مشتعل ہو کر مریم کے بت کے منہ پر تھوکتی ہے، اور

وہ کلیسا کے تقدس کی مجرمہ کو اپنی پناہ میں لیتا ہے، تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ان جانی طاقت روندی ہوئی زندگی کی حفاظت کے لئے میدان میں آ گئی ہے، افسانہ کا وہ حصہ بے حد دردناک ہے جہاں آندرے اس ہولناک کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے کہ اپنے دوست کی موت کی خبر اس کی ماں اور بیوی کو کیوں کر سنائے، یہاں سے اس کا فرار ایک طرح سے اعتراف شکست ہے، مگر ناظر کے آنسو اس شکست پر بھی عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔

"تلاش گم شدہ" کا ہیرو نبو خاں بھی آندرے کی طرح جنگ کے دیوتا کے پاؤں چوم کر لوٹتا ہے، مگر وہ اپنی ایک ٹانگ بھی اس کی نذر کر آیا ہے، نبو خاں کے کردار میں آندرے جیسی دلکشی نہیں مگر اپنی نامرادی کے اعتبار سے وہ ضرور ہماری ہمدردی کا مستحق ہے، یہ افسانہ اختر کے آرٹ کا نادر نمونہ ہے، مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اب اس کے آرٹ کا ساتھ دینے کے لئے بھی کافی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے، راوی کا بیان ہے کہ موضع نام پور کے لنگڑے سپاہی نبو خاں کے سوکھے ہوئے گھٹنے سے از سر نو شجرِ زندگی پھوٹ رہا ہے"۔ کا مطلب خواہ کچھ ہی ہو، مگر اس کی ہمہ گیر ٹریجک ویلیو سے انکار نہیں کیا جا سکتا، نبو خاں کے کردار کے آئینے میں اس دیس کے سینکڑوں سپاہیوں کا عکس نظر آتا ہے جو اپنے کٹے پھٹے اعضا، اور مسخ چہرے ہلا ہلا کر زندگی کے انجام کا ماتم کر رہے ہیں، اردو زبان کی خوش قسمتی میں کلام نہیں، کہ جنگ کی ہولناکیوں کے خلاف جو نعرہ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں گونج اٹھا تھا، اس کی صحت مند آواز بھی اس میں شامل ہے۔

"دیوان خانہ" فنی لحاظ سے اردو ادب میں بڑا بلند درجہ رکھتا ہے، اس افسانے میں آرٹسٹ بظاہر ایک جذباتی لڑکی کے کردار کی تشکیل میں مصروف نظر آتا ہے، مگر اس افسانہ کا حقیقی موضوع — ایک آرٹسٹ ہے۔ یہاں آرٹسٹ کا کمال دیکھئے کہ وہ اصلی کردار کو بلا واسطہ پیش کرتا ہے، سارے افسانے میں ایک جگہ آرٹسٹ کا وجود نظر آتا ہے، وہ بھی دھندلا سا، مگر اس کے باوجود وہ ہر جگہ موجود ہے، ہر منظر میں گھوم رہا ہے، ہر احساس میں جھلک رہا ہے۔

معلوم نہیں کیوں مگر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ افسانہ آرٹسٹ کی آپ بیتی کا ایک دردناک حصہ ہے، بورژوا طبقے کی معاشرت کی ایسی گھناؤنی تصویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آرٹسٹ کی موت کا احساس بڑا پر معنی اشارہ ہے، اور اس حقیقت کا عکاس ہے کہ آرٹسٹ کی شخصیت کسی بھی ماحول کی تاریکی میں گم نہیں ہوتی، مرنے کے بعد بھی اس کی یاد سینکڑوں البموں سے عزیز رکھی جاتی ہے۔

"دل کا اندھیرا" کو چھوڑ کر "بیزاری" نئے دور کا بہترین افسانہ ہے، اس افسانے میں آرٹسٹ ہمیں دنیا سے بیزار نظر آتا ہے۔ خود غرضی، معاشی مجبوریوں اور قابلِ نفرت جنگ و خونریزی سے تنگ آ کر اب وہ ستاروں کی دنیا کے خواب دیکھ رہا ہے، مگر اس خواب کے رنگ بڑے پر اسرار ہیں، اس افسانہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں طنز کی تلخی مفقود ہے، اس تلخی کی جگہ بیزاری نے لی ہے جو افسانے کا اصلی موضوع ہے، ایک لحاظ سے یہ افسانہ موجودہ دور کی سیاست اور معاشرت کی مکمل تصویر ہے، مگر حیرت ہے کہ بڑی سے بڑی بات کو مختصر سے اشارے میں بڑی کامیابی کے ساتھ کہہ دیا گیا ہے، حوا کی بیٹی کے ساتھ دوسری ملاقات، وہ جاندار جن کی ایک آنکھ سے بجلی روشنی کی کرن جھانکتی ہے اور دوسری سے جوانی جذبہ جھلکتا ہے، شمال میں آسمان پر ابھرتا ہوا دم دار سرخ ستارہ — اور یہ آرزو کہ اس کی ضرب سے تمام چیزیں پاش پاش ہو جائیں —— ایک ذہین پڑھنے والے کے لئے ان میں بہت کچھ موجود ہے، مگر یاد رہے کہ اسے یہ گوارا نہیں کہ آرٹسٹ اب جمشید کے پیالے میں ہی ڈوب کر رہ جائے، بلکہ وہ اس انتظار میں ہے کہ آرٹسٹ اب اس کے لئے کوئی ایسی چیز لائے گا جو مجھے جانے دو کی کسبی کی طرح تلخ، "مرگھٹ" کے لکھو مستری کی طرح دبنگا اور "دل کا اندھیرا" کے آندرے کی طرح دردمند ہوگی، — "محبت اور نفرت" کے آرٹسٹ سے یہ توقع عبث نہیں۔ اس نے ہر نئے افسانے میں اپنے ذہنی اور فنی ارتقاء کا ثبوت دیا ہے، اس کے آرٹ میں زندگی کی جو خوشنما جوت جگمگا رہی ہے، کسی دن اسی روشنی سے بین الاقوامی ادب کے رنگ محل میں ہندوستان کا نام کندہ کیا جائے گا۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے، کہ جب میں اپنے دیس کے ادب پر نظر ڈالتا ہوں تو اس بے رنگ و بو چمن میں اختر حسین رائے پوری کا آرٹ ہی ایک ہرا بھرا پودا نظر آتا ہے، جس کی شاخوں میں سدا بہار پھول لہلہا رہے ہیں، ان پھولوں میں ایک فنکار کے خلوص کی سرخی جھلک رہی ہے، اور اس سرخی میں ایسی بہارِ بے خزاں ہے جو انہیں ہمیشہ معطر اور تر و تازہ رکھے گی۔

غزل

ضمیر اظہر

گلشن چہک اٹھے گل و لالہ سنور گئے جلوے ترے جمال کے ہر سو بکھر گئے

دیکھا ترے خیال میں جو سوئے آسماں ماہ و نجوم اور زیادہ نکھر گئے

وہ چاندنی، وہ صحن گلستاں وہ جشن دوست کچھ خواب تھے کہ راہ نظر سے گذر گئے

روشن تھی جن کے نور سے بزم طرب کبھی یارب وہ خوشگوار زمانے کدھر گئے

جنت بدوش جن کے کرم سے تھی زندگی کس سرزمیں میں جانے وہ شام و سحر گئے

اے مرگ چارہ ساز تری جستجو میں ہم ہر منزل جہاں سے سلامت گذر گئے

شمع حریم حسن نے جانے یہ کیا کیا چپ چاپ سب پتنگے جہاں سے گذر گئے

رویا شب فراق میں اس درد سے ندیم آنسو نجوم بن کے فلک پر بکھر گئے

منزل نے بار بار پکارا ہمیں ضمیر
ہم بے خبر خود اپنی ہی دھن میں گذر گئے

موت

احمد ندیم قاسمی

یہ بھی کوئی زندگی ہے! ہر وقت ڈر! خوف ہراس کوئی دیکھ نہ لے، کوئی پا نہ لے، اور جب ابدی رفاقت کا سوال سامنے آتا ہے تو کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی، صرف دو حل ہیں، ماحول سے فرار۔ زندگی سے فرار، پہلے فرار کا خیال آتے ہی خاندانی وقار، سماج، قانون، مذہب غرض بے شمار پرچھائیوں کی ایک گھٹا چاروں طرف سے سمٹنے لگتی ہے، اور ذہن کے ارد گرد ایک فولادی خول چن ڈالتی ہے، دوسرے فرار کے تصور میں سکون ہے، دبدبہ ہے، بقا ہے۔ کلثوم اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے عدم کی اندھیاریوں میں کوئی واضح خط تلاش کرتے ہیں، کچھ پلے نہیں پڑتا، مگر اس پابند زندگی سے فرار کا خیال ہی سکون بخش ثابت ہوتا ہے، اور ہم تجویزیں سوچتے ہیں، زندگی کے بحر ذخار کا ساحل کہاں ملے گا! زہر، سولی، آگ، چٹانوں سے پٹی ہوئی کھاڑی، دندناتا ہوا انجن چھچھاتا ہوا خنجر! ــ کلثوم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، میری آواز کھلی ہو کر بجنے لگتی ہے، ہم پھر ابتدا کو پلٹتے ہیں، مگر انتہا سے مفر نہیں، اور ہماری انتہا زندگی سے فرار ہے۔

کلثوم کا راستہ تکتے تکتے کواڑ کی تختیاں دھواں دھار بدلیوں میں تبدیل ہو گئیں، اور دیوار پر لٹکی ہوئی تصویریں اڑنے لگیں، اور روشندان میں چمکتا ہوا ستارہ کمرے میں گھس آنے کے لئے تڑپنے لگا، خود میرا وجود بہت سے حصوں میں بٹ کر پرواز پر تل گیا، ڈولنے لگا، ڈوبنے لگا، اور میں نے تنگ آ کر آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ذہن کو نئے نئے سیال خیالوں سے کھنگال کر صاف کر لیا۔

مگر میری اداس خیال آرائیوں کے اثرات مابعد ابھی تک میری آنکھوں میں نمی بن کر نیبر رہے تھے، اور میرے پپڑائے ہونٹوں پر ابھی تک ایک عجیب قسم کی تلخی کا احساس باقی تھا، کہ اچانک میرا کمرا ریشمی ملبوس کی سرسراہٹوں سے چہکنے لگا، اور عود حنا اور کافور کی ملی جلی خوشبو سے گھٹی گھٹی فضا مہکنے لگی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو میرے بوسیدہ صوفے کے قریب ایک عورت کھڑی تھی، وہ سر سے پاؤں تک سیاہ ریشم میں لپٹی ہوئی تھی، اور اس کے دراز فرغل کے کناروں سے رقاصاؤں کے گھنگھروؤں کی طرح کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پر اسرار بامعنی شکنوں کا حاشیہ سا بن دیا تھا۔ عورت کی سیاہ، موٹی، اور سوچتی ہوئی آنکھوں میں بلا کی گہرائیاں تھیں، اس کے ہونٹ نہایت سنجیدگی اور علو ہمتی سے بھنچے ہوئے تھے، لیکن ان بھرے بھرے گلابی خموں کے سکون میں ایک مستقل لرزش کا احساس ہوتا تھا، اسکا چہرہ سیپی کی طرح مرمریں اور بیضوی تھا، اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر جیسے ایک اٹل عزم کے زیر اثر مجھے گھورے جا رہی تھی۔

"کلثوم؟" میں نے خلا میں تیر چھوڑا۔

اس نے ایک ملکوتی وقار سے نفی میں سر ہلا دیا،

"بیٹھ جاؤ" ذہن کی تمام راہیں مسدود پاکر میں نے کچھ کہنے کی بجائے محض بے مطلب بول دینا مناسب سمجھا۔

وہ فرغل کو سمیٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ مگر اس کے بیٹھتے ہی کسی چیز کے چٹخنے کی آواز آئی، میں نے نادم ہو کر کہا "کوئی اسپرنگ ٹوٹا ہوگا، میرا صوفہ نیلام گھر سے آیا ہے"۔

اس نے اپنا سفید بازو باہر نکال کر سینے پر سے چادر کھسکائی، اس نے انسانی کھوپڑیوں کا ہار پہن رکھا تھا، اور ایک ہاتھ میں انسانی بازو کی ہڈی ایک عجیب خسروانہ تمکنت سے تھام رکھی تھی،

"تم کون ہو؟" میں اندھیرے میں ہاتھ پیر مارتے مارتے چور ہو چکا تھا۔

"میں موت ہوں" وہ بولی۔ اور اس کی آواز اڑتی ہوئی سنپولیوں کی طرح کمرے میں خمیدہ خطوط کی جالیاں کاڑھنے لگی "میں موت ہوں، اور میں تمہاری روز روز کی یاد سے تنگ آ کر تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم مجھے قبل از وقت ہی اتنی شدت اور اتنے تواتر سے کیوں یاد کرتے ہو؟"

"مجھے تم سے محبت ہے" میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا، "میں نے زندگی کے ہاتھوں بہت دکھ اٹھائے ہیں"۔

اس کے متوقع انداز نشست ونظر سے واضح تھا کہ وہ ان دکھوں کی تفصیل سننے کے لئے تیار ہے۔ میں نے کہا۔ "میرا بچپن کا زمانہ روتے بسورتے، پھٹے پرانے جھینجھڑے پہنتے، ٹوٹی ہوئی سلیٹوں اور چٹخی ہوئی تختیوں پر لکھتے اور ماں سے ایک پیسہ محض ایک پیسہ حاصل کرنے کی ضد میں گذرا، بچپن کی کچی پینڈی سے نکل کر جب میں عنفوان شباب کی چکا چوند میں آیا اور میری بصارت اور بصیرت نے نئی نئی دنیائیں اور ان دنیاؤں کے اپنی مرضی سے

ڈھالے ہوئے قوانین اور ان قوانین کی زد سے بچتے ہوئے بلند مقاموں اور ان کی زد میں آکر مٹنے والے خاک نشینوں کو دیکھا، تو میں نے بغاوت کی ٹھانی، تم جانتی ہوگی، کہ دنیا کے سب بڑے بڑے باغیوں نے اوّل اوّل اسی سن میں معاشرت، معیشت اور سیاست کے مقررہ ڈھرّوں پر تیوری چڑھائی، سو میری یہ بغاوت اختیاری عمل نہ تھا، مجھے محلوں کی بلند دیواروں اور مطلا چھتوں سے بے اختیار نفرت ہوگئی، میں ویران مسجدوں کے صحنوں اور سنسان سڑکوں کی پٹڑیوں پر سویا، ایک زمیندار کی آٹھ سو من گندم کے مقابلے میں میں نے اپنے چار منوں کا کھلیان پر ہی پڑے رہنا بہتر سمجھا، میں نے ریشم و دیبا کے ضرورت سے زیادہ ملبوسات سے جل کر کھدر کے کپڑے پہنے، اور گونجتے گرجتے بازاروں میں ایک ایسے انسان کی حیثیت سے ٹہلتا پھرا، جو اس دولت اور اس کی تمام ہنگامہ سامانیوں سے قطعی بے پرواہ ہے، لیکن میرے شعور کے کسی دور دراز گوشے میں آہستہ آہستہ احساس کمتری نے جڑ پکڑنی شروع کی اور میری زندگی جو پہلے ہی تلخ تھی، اب ایک مستقل تلخی بن کر رہ گئی۔"

"مجھے دیر ہو رہی ہے" موت نے کھوپڑیوں کے ہار کو کھڑکھڑاتے ہوئے پہلو بدلا، وہ مجھ سے شاید اتنی تفصیل کی متوقع نہ تھی "میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے، اور آجکل میں بہت مصروف رہتی ہوں"

"تمہیں کہاں جانا ہے؟"

"مجھے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پرواز کرنا پڑتی ہے۔" موت اسی سنجیدگی سے بولی، جس نے اس کے لبوں کے کناروں پر قوسی احاطہ سا بنا رکھا تھا۔ "مجھے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے جنگی محاذوں میں گھومنا تھا، مگر وہاں میں نے اپنے ان گنت کارندے چھوڑ رکھے ہیں، میں نے اپنے فرائض کی بجاآوری کے لئے تمہارے ہندوستان کے خطۂ بنگال کو چن رکھا ہے، جہاں تمہارا ٹیگور پیدا ہوا تھا، جہاں تمہارا نذرالاسلام زندہ ہے اور کہتے ہیں اسی سرزمین سے نغمہ نے جنم لیا، اور یہاں کی عورتوں کی آنکھوں اور بالوں کی مثال دنیا بھر میں نہیں ملتی، جہاں کے میدانوں میں خوشبوئیں اور جنگلوں میں وسعتیں اور پربتوں میں رعنائیاں ہیں، اگرچہ مجھے تمہارے ہندوستان سے گذشتہ دو تین صدیوں سے تعلق خاطر رہا ہے، لیکن کچھ عرصہ سے مجھے بنگال نے مسحور کر لیا ہے، وہیں سے اڑوس پڑوس کی بھی نگرانی کر دوں گی مجھے بہار کے خطہ پر بھی کچھ دیر منڈلانا ہے، اور چند لمحے آسام اور برما کے جنگلوں میں بھی مٹر گشت کرنا ہے"

"تم بہت آوارہ واقع ہوئی ہو" میں نے محبت بھری شکایت کی،

"موت کی آوارگی ہی اس کی زندگی ہے، موت بیکراں ہے اور بیکرانیاں سکون سے ناآشنا ہوتی ہیں، موت ایک وحدت ہے، اور یہ وحدت کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اور کائنات بیکراں ہے، اور بیکرانیاں تمہارے تصور کی محدود اڑانوں سے بالاتر ہیں، وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی، جیسے بے جانے بوجھے اس نے کوئی بہت بڑا راز فاش کر دیا ہے، پھر کہنی کو صوفے کے بازو پہ ٹیک کر بولی "تم اپنے احساس کمتری کا ذکر کر رہے تھے"

"لیکن تمہیں دیر ہو رہی ہے" میں نے دوبارہ محبت بھری شکایت کی۔

"میں تمہاری لذتوں کی محبوب ہوں، اس لئے تمہاری سرگزشت سنوں گی، مگر ٹیگور اور نذرالاسلام کے وطن میں ان جھونپڑیوں کا بھی خیال رکھو، جہاں ریڑھ کی ہڈی سے چپکے ہوئے پیٹ اور کانوں سے اوپر اٹھی ہوئی شانوں کی ہڈیاں کھینچ کھینچ کر چیخ چیخ کر میری دستگیری کی دہائی دے رہی ہیں، اجمال سے کام لو، اجمال گفتگو کا حسن ہے۔"

"تمہیں بھی حسن سے مس ہے؟" میں نے طنزاً پوچھا،

"موت حسن نہیں تو اور کیا ہے، موت ایک حسن مکمل کی ادا ہے، اس لئے حسین ہے"

"اور زندگی؟" ——— مگر اچانک میں سنبھل بیٹھا، موت کے چہرے پر سنجیدگی کا ہالا جیسے بھڑکتے اور چکراتے ہوئے شعلوں میں بدلنے والا ہے، میں نے فوراً موضوع بدلا "ہاں میں کہہ رہا تھا کہ میری زندگی جو پہلے ہی تلخ تھی، اب ایک مستقل تلخی بن کر رہ گئی، میرا احساس کمتری دراصل ذلتوں اور رسوائیوں کے ایک نئے اور دراز سلسلے کی بنیاد ثابت ہوا، اور جب میں نے محبت کی، وہ محبت جو شاعروں اور مصوروں کے شاہکاروں کے باعث میرے ذہن پر سنہری غبار بن کر چھائی رہتی تھی، جب میرے شعور میں جاگی - اور میں اپنے ماحول، اپنی سماج اور اپنی قوتوں سے بے پرواہ ہو کر اس محبت کے زیر اثر مارا مارا پھرنے لگا، تو اس احساس کمتری نے تصور کی وہ جنبش بھی مجھ سے چھین لی، جو مشاہدہ سے نہ سہی، مطالعہ کے دم سے میرے احساسات کی امانتیں تھیں، محبت کی تلخ کامیوں سے دل بجھا مگر پیٹ کی آگ بھڑک اٹھی، اور میں نے روٹی کمانے کی خاطر احساس کمتری کے عقب میں دیکھتے ہوئے

اس جذبۂ خودداری، اس غرورِ نفس، گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس ننھی سی چمکتی ہوئی شمع کو بھی فنا کر ڈالا جس نے مجھے کئی مرتبہ گرنے اور گر کر پڑے رہنے سے بچایا تھا، میں غلامی در غلامی کے بھنور میں گھر گیا، مگر پیٹ کی آگ تیز تر ہوتی گئی، ایک الاؤ سا بھڑک اٹھا، آتشِ دوزخ کا ایک مینار سا بلند ہوا، اور میں اس خود ساختہ جہنم میں جل بجھ کر بھسم ہو گیا، مگر ابھی تک میں اپنے جسم اپنی روح، اپنے مزاج کو ایک بھوبھل میں پڑا ہوا محسوس کرتا تھا، یہ بھوبھل نہ بھڑکتا تھا، نہ بجھ سکتا تھا، ایک چنگاری بجھتے بجھتے دوسری چنگاری کو روشن کر جاتی تھی، اور رواں دواں، رقصاں و جولاں چنگاریوں کی یہ لہراہٹ تھی۔ اٹوٹ تھی، کہ اچانک ——"

میں رک گیا، موت کی سوچتی ہوئی آنکھوں کو لانبی خمیدہ پلکوں بھرے پپوٹوں نے بہت حد تک ڈھانپ لیا تھا، پتلیوں کی صرف زیریں قوسیں نمایاں تھیں، جن سے میں نے شعاعوں کے تار چھوٹتے دیکھے، اور میں نے گھبرا کر پوچھا "تم کس سوچ میں ہو؟"

"میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے" اس کے پپوٹے اوپر اٹھ گئے" اور میرے نائب روحوں کے انبار سمیٹ سمیٹ کر تھک چکے ہیں"

"تمہیں نیند آ گئی تھی"

"موت کو نیند نہیں آتی، نیند ایک کمزوری ہے، مجھے نیند آ جائے تو کرّے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں، ستارے متصادم ہو جائیں، چاند زمین پر گر پڑے، اور زمین سورج کے سینے میں دھنس جائے، اور خلا میں واویلا مچ جائے، اور عناصر سر پیٹتے پھریں"

"تم خدا نہیں ہو"

"میں خدائی میں توازن رکھتی ہوں، میں ایک پھول کی رنگ و بو صرف اس لئے نچوڑتی ہوں کہ کونپل سے نئی کلی پھوٹے، میرے خدا کا حکم ہے، کہ دنیا پرانی نہ ہونے پائے، جدید و قدیم میں ایک توازن قائم رہے اور توازن حسن ہے، اور میں حسین ہوں، میں حسنِ مجسم کی ایک ادا ہوں"

"اور میں انسان ہوں" میں نے تنک کر کہا، "میں مسجودِ ملائک ہوں، میں خلیفۃ اللہ ہوں، میں اشرف المخلوقات ہوں، میں صناعِ مطلق کی اعلیٰ ترین صنعت ہوں"

"اور تم میرے محتاج ہو، اور تمہاری احتیاج ہی تمہیں آج یہاں کھینچ لائی ہے"

شرمندہ ہو کر میں نے سر جھکا لیا، موت نے دلاسہ دیتے ہوئے انداز میں کہا، "ہاں تو تم اپنے آپ کو ایک بھوبھل میں پڑا ہوا محسوس کر رہے تھے"

"ہاں" میں نے ٹوٹے ہوئے تار کو پکڑا "اس عالم میں کہ میرے چار طرف چنگاریوں کا قیامت خیز تیزی سے چکر کاٹتا ہوا ایک دائرہ تن گیا، میں نے گھبرا کر اس دائرے میں کوئی رخنہ ڈھونڈنا چاہا، کیونکہ اس دائرے میں مجھے تم نظر آئی تھیں، اور ان دنوں تم میری نیندوں کی بھکشنی تھیں، بالآخر یہ رخنہ مجھے مل گیا، اور میں نے باہر جا کر اپنی امنگوں کے ملبے میں سے کام کی چیزیں چننا شروع کیں، محبت کے کھنڈر مجھے ماضی کی باقیات میں سب سے بھلے معلوم ہوئے، اور میں نے محسوس کیا کہ میں ابھی جوان ہوں، یہ جذباتی مردنی در اصل میری دوں ہمتی کا نتیجہ تھی، ورنہ یہ راہ اتنی مختصر نہیں، اور نہ اتنی سنسان ہے کہ انسان بڑھتے ہی پلٹ آئے، میرے خیالات پر ایک سرشار کن نوعیت کا عالم چھا گیا، اور اسی عالم میں میں نے پڑوس میں کلثوم کو دیکھا، اور زندگی جو اب تک بالکل بے مقصد نظر آتی تھی، بڑے بڑے بلند مقاصد کا ایک ہجوم معلوم ہونے لگی، میرے سارے ماضی پر کلثوم کی مسکراہٹوں نے سنہری اور روپہلی کہرے چھڑک دئے، اور جب میں نے مستقبل کی سنسناتی ہوئی اندھیاریوں کو اس کے وجود کی کرنوں سے جگمگانا چاہا، تو معاً میرے سامنے، بالکل میری آنکھوں کے مقابل، میرے لمس کی حد میں، ایک بلند دیوار کھڑی ہو گئی، یہ دیوار خاندانی وقار، سماج، قانون اور مذہب کے خشت و سنگ سے اٹھائی گئی تھی، ہم دونوں نے اس دیوار سے ٹکرانے اور اس میں شگاف ڈال کر آگے نکل جانے کی کئی بار ٹھانی، مگر یہاں کے ریزے ریزے میں ٹکٹکی باندھے ہوئی آنکھ کی پتلی ہماری ہر حرکت پر ہمارے ساتھ گردش کرتی تھی، تھک ہار کر ہم نے اپنے وجودوں ہی سے نکل بھاگنا چاہا، کہ ہماری روحیں تو ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں، مگر تم تک رسائی کے تمام سامان ڈراؤنے اور گھناونے تھے، اور ہمارے احساسات میں محبت نے ایسی بالیدگی پیدا کر دی تھی، کہ ہم بھدی موت نہیں مرنا چاہتے تھے، ہمیں اپنے انجام میں بھی حسن کی تلاش تھی"

موت نے پہلو بدلا "موت سولی کا تختہ یا زہر کی پڑیا نہیں"

"یہی راز سمجھنے کے لئے میں نے تجھے پکارا" میں اب موت سے مسحور ہو چکا تھا "اور یہ راز میری سمجھ میں نہیں آئے گا، جب تک اے میری سیاہ پوش محبوب تو مجھے اپنے دامن میں پناہ نہیں دے لیتی، اسی لئے میں نے رات کی اندھی وسعتوں اور دن کی منہ پھاڑتی ہوئی بے کناریوں میں تجھے صدائیں دیں، میں نے تجھے ویران قلعوں کے شکستہ برجوں پر سے آواز دی، میں نے ٹوٹی ہوئی قبروں کے خوفناک شگافوں کے قریب جھک کر تجھے پکارا، میں طاعون زدہ بستیوں کی ہولناک خاموشیوں میں تیری

بارگاہ کی راہ ٹٹولتا پھرا، اور آج جب کہ میں زندگی اور موت دونوں سے مایوس ہو چکا تھا، تم خود ہی میرے پاس چلی آئیں۔"

"تم غلط ماحول اور غلط مقامات پر بھٹکتے پھرے" موت نے کہا اور پھر یوں بولی جیسے وہ سارے قصے کو ختم کر دینے پر تلی ہوئی ہے، "تم کیا چاہتے ہو؟" —— اس کے چہرے کی مرمریں پاکیزگی گلابی جھنجھلاہٹ میں بدل گئی تھی، اور وہ ایک کھوپڑی کو انگلی کے ناخن سے کھرچ رہی تھی، اور شغل کچھ اس انداز سے جاری تھا جیسے وہ ذہن میں اٹھتے ہوئے کسی طوفان کا رُخ موڑنے کی کوشش میں مصروف ہے، اور یہ کوشش کامیاب نہیں ثابت ہو رہی۔

"میں تمہیں چاہتا ہوں" میں نے بے اختیارانہ کہا۔ "میں تمہارے اس ریشمی فرغل کی نرم لہروں میں لپٹ کر ہمیشہ کے لئے زندگی سے بھاگ جانا چاہتا ہوں، کیونکہ زندگی وحشی ہے، خونخوار ہے، اس کے جبڑوں میں لہو ہے، اور پیپ ہے، اور کچے گوشت کی دھجیاں ہیں، تم رحمدل ہو، غریب پرور ہو، تمہارے لبوں کی محرابوں میں سکون ہے، اور سرور ہے اور نیندیں ہیں۔"

"تم ابھی کچھ مدت تک میرے آغوش کی جنت سے محروم رہوگے" موت نے بے پروائی سے کہا۔ "تم نے ابھی اس زندگی کا پورا مزا نہیں چکھا، تمہیں دربار خداوندی سے خیرات میں ملی تھی، تم نے ابھی تک میرے قرب کی اہلیتیں حاصل نہیں کیں، میں عموماً پختہ کاروں سے محبت کرتی ہوں"

"مگر تم تو بچوں اور نوجوانوں پر خاص طور سے مہربان ہو" میں نے ہندوستان کی شرح اموات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا،

"اس کا مطلب یہ ہے" اس نے ہاتھ میں تھامی ہوئی ہڈی سے ایک کھوپڑی کو یونہی شغلاً بجا کر کہا، "کہ تم نے پختگی کا مطلب نہیں سمجھا، میرا معیار بہت بلند اور بالکل الگ ہے، میں مستقبل کی بھی اندازہ شناس ہوں، اور کبھی کبھی مجھے کسی انسان میں مستقبل کی پختگی اس درجہ مسحور کر لیتی ہے، کہ میں اس کی ناپختگی سے بے پرواہ ہو کر اسے اپنے آغوش میں لے لیتی ہوں، مگر یہ وقت بحث کا نہیں، آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

اس نے وہی سوال اور میں نے وہی جواب دہرایا۔ "میں تمہیں چاہتا ہوں۔"

"انسانوں کی اکثریت مجھے چاہتی ہے۔" اس کی مرمریں گردن کا تناؤ اچانک ایک عجیب حسین مگر مہیب صورت اختیار کر گیا۔ "چاہت میں کوئی امتیاز ہونا چاہیئے، اور مجھے تمہاری چاہت کے خلوص پر اعتماد ہے، ابھی کچھ مدت تک زندگی سے گھل مل جانے کی کوشش کرو، جب میرا جی چاہا تو میں تمہارے بلاوے کا انتظار نہیں کروں گی، اور اب کہ میں اپنے بے شمار فرائض کو محض تمہاری چاہت کے خلوص سے متاثر ہو کر اپنے نائبوں کے حوالے کر آئی ہوں، تمہاری کوئی بھی خواہش پوری کرنا چاہتی ہوں، مرنے کے علاوہ تمہاری اور کیا خواہش ہے —— ایسی خواہش جو زندگی سے ورے کی دنیا سے متعلق ہو۔"

سوچنے کی ضرورت ہی نہ پڑی، ذہن کے گہرے پانیوں میں اچانک ایک بھنور سا پیدا ہوا، جیسے کوئی سیپی تہ سے اچھال دی گئی ہے، اور پانی کو چیرتی چکلاتی سطح کی طرف بڑھ رہی ہے۔ "میں اپنے مرحوم دوست مسعود کو ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے انتہائی جرأت سے کہا،

ہوا کے ایک طرار جھونکے کی سی آواز آئی، فضا گھٹنے لگی جیسے کمرے کی چاروں دیواریں سمٹی آ رہی ہوں، میں نے گھبرا کر صوفے کی طرف دیکھا، اب وہاں موت کی جگہ مسعود بیٹھا تھا، جس نے اپنی چند روزہ محبوبہ کے کھو جانے کے غم میں زہر فروش کے نام سرخ نشانات والے ڈبوں سے الگ الگ پڑیاں خریدی تھیں، اور ہر زہر کو یوں نگلتا چلا گیا تھا جیسے زندگی نے اسے کبھی کوئی خوشی نہیں دی، —— اس کے چہرے پر انتہا درجہ کی اداسی تھی، اور وہ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا، جیسے اسے میری حالت پر بہت رحم آ رہا ہو، اور وہ میرے بلاوے سے کچھ اتنا خوش نہیں، جیسے اسے ایک اٹل مجبوری یہاں کھینچ لائی ہے۔

"خوش آمدید مسعود" میں نے مسکرا کر کہا، اٹھ کر آگے بڑھا، تو صوفہ اتنا ہی پرے ہٹ گیا، اور جب میں حیران ہو کر پیچھے پلٹا تو صوفہ اپنے اصلی مقام پہ آگیا۔

"جیتے رہو میرے دوست۔" اس کی سنجیدگی آسیبی معلوم ہوتی تھی، "تمہارے چہرے سے میں نے تمہارا سوال پڑھ لیا ہے، میرے ساتھی، وجود "حقیقت" ہے، اور عدم، جذبات کا ایک ایسا فریب جس کا راز زندگی میں نہیں کھلتا، میں زندگی سے اکتا کر موت کی طرف بھاگا تھا، اب موت کے بعد کی حالت سے اکتا کر زندگی کی طرف آنا چاہتا ہوں، مگر بے بس ہوں، موت نے مجھے جو زندگی بخشی ہے، اس میں بقا ہے، مگر وہ نہیں جس کی خاطر میں زمان و مکان کی پابندیوں سے بھاگ نکلا، وہ چہرہ نہیں جو پھولوں سے ڈھکے ہوئے طلائی طشت سے مشابہ تھا، وہ آنکھیں نہیں جن کی ہر جھپکی میں وقت کی ایک صدی بیت جاتی تھی، وہ ہونٹ نہیں جن کے لمس سے مجھے محسوس ہوا کہ زندگی محض جمود نہیں، یہ ایک دہکتا ہوا سرور اور بھبکتا ہوا خمار ہے، کچھ بھی تو نہیں ملا مجھے۔"

"عجیب بات ہے!" میں اپنے تصوّر کے خیابانوں کو ایک دم نہیں جلانا چاہتا تھا۔ "مگر دیکھو، اس خیال کو بھلانے کے لئے اپنے ماحول کی حسین خصوصیتوں کا مطالعہ کرو۔" میں نے دنیاوی مشورہ دیا۔

"میں نے کوشش کی ہے" اس کی آواز زیر دبم سے بے نیاز تھی۔ "کہ اپنے ماحول میں ڈوب جاؤں"، مگر یہاں کی ہر چیز پر منجمد سنجیدگی کی جھلی منڈھی ہوئی ہے، فرشتے ہیں مگر انھیں ذکر و فکر سے فرصت نہیں، حوریں ہیں جو مسکراتی ہیں تو جیسے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پہ سورج کی شعاعیں پڑ رہی ہوں، باتیں کرتی ہیں تو جیسے اندھا کر دینے والی کہریں تیز ہوائیں سیٹیاں بجاتی ہوں، گاتی ہیں تو جیسے ہالہ پر سے ہولے ہولے گلیشیر سرک رہے ہوں، میں نے انھیں چھو کر بھی دیکھا ہے، میں نے زندگی میں وینس کے بت کے عکس کو بھی چھوا تھا، مگر اس عکس کے مس میں بھی گرمی تھی، شاید اس لئے کہ وہ انسانی جذبے کی تخلیق تھا، اور حور ـــــ وہ یخ بستہ پیکر جمال۔ محض ایک کھلونا ہے، اور کھلونوں سے صرف بچے ہی بہل سکتے ہیں۔ یہاں میں نے ان گنت بوڑھے بچے دیکھے، جو اپنی تمام پرہیزگاریوں اور شب زندہ داریوں کا اجر ایک حور کا دیدار مسلسل سمجھتے ہیں، اور خوش ہیں، اور مطمئن ہیں، اور میں بے قرار ہوں، میں عدم کے وسیع گلیتوں میں بھٹک بھٹک کر نڈھال ہو چکا ہوں، مگر مجھے کہیں کوئی نخلستان میسر نہیں آیا، یہاں جنتیں ہیں، جنگل نہیں، یہاں لالہ زار ہیں، ریگزار نہیں، یہاں روحیں ہیں انسان نہیں، اور مجھے روحوں سے کوئی لگاؤ نہیں، مجھے گوشت پوست کے انسان چاہئیں، اور یہاں شفاف پرچھائیوں کے سوا اور کچھ نہیں، کوئی نہیں ـــــ اور کوئی ہو بھی تو کیا، جب وہ نہیں، جس کے لئے میں نے زندگی سے جی بھر کر رس چوسنے کی بجائے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جانا افضل سمجھا! میں نے خدا سے دعائیں مانگی ہیں، کہ ایک نہایت معمولی وقفے ہی کے لئے سہی، وہ مجھے پھر سے زمین کی زندگی بخش دے، اور پھر ہمیشہ کے لئے نابود کر دے، مگر صرف ایک مرتبہ مجھے اپنے کرّے کے طوفانوں اور خاموشیوں اندھیروں اور اجالوں، فیروز مندیوں شکستوں، محبتوں اور نفرتوں میں رہنے بسنے دے، اور مجھے محض ایک ثانیے کے لئے اس چہرے کی ایک جھلکی دکھا دے جسے حوریں دیکھ پائیں تو خودکشی کر لیں۔"

"تمہارے مرنے کے فوراً بعد اس نے جیل کے داروغہ سے شادی کر لی تھی" میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرنا چاہا۔

مگر معاً مسعود کے جسم کا ٹھوس پن غائب ہونے لگا، اس حد تک کہ مجھے اس کے وجود کے اس پار صوفے کی پشت نظر آنے لگی، میں اسے چھونے کے لئے اٹھا تو کھوپڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی، اور مسعود کی جگہ مجھے صوفہ کے قریب موت کھڑی نظر آئی، اس کی سنجیدگی میں اطمینان کی دھاریاں سی جھلک رہی تھیں، اور اس کی انگلیوں کی پوروں سے تازہ تازہ خون رس رہا تھا۔

"یہ ـــــ یہ ـــــ" میں نے خون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک کھوپڑی سے دھوئیں کا سا ہلکا پھلکا رومال نکال کر انگلیوں کو پونچھا، اور بولی "وہیں برما کے جنگلوں میں چلی گئی تھی، جہاں توپ کے پہیئے تلے دبے ہوئے ایک سپاہی کی ضدی روح کو اس کی نسوں سے نوچ رہی تھی، کہ مجھے مسعود نے اپنے اٹھ آنے کی اطلاع دی"

"میں نے اسے صدمہ پہنچایا ہے، وہ اب کہاں ہے؟"

"وہ یہاں وہاں ہر جگہ ہے، وہ آج اور کل ہر پل میں ہے، وہ پھیل کر کائنات پر محیط ہو چکا ہے، ابلتے ہوئے پانی سے اٹھتی ہوئی بھاپ برتن سے تھوڑا سا بلند ہو کر کہاں غائب ہو جاتی ہے؟ وہ فنا نہیں ہوتی، وہ پھیل جاتی ہے، اور جب وہ پھیل جاتی ہے، تو تمہاری بصارت اور بصیرت اس کا احاطہ نہیں کر سکتی، میں نے بھی تمہارے سامنے سمٹے ہوئے عالم میں ایک وجود اختیار کر رکھا ہے، البتہ میری جسیں منتشر ہیں، ایک حس تم سے متوجہ ہے، مگر میری دوسری ان گنت حسیں زمین و آسمان کی پہنائیوں میں رواں دواں ہیں۔"

"کیا میں خدا کو بھی دیکھ سکتا ہوں؟" میرے حوصلے بڑھ گئے تھے،

"مسعود نے تمہیں کیا بتایا تھا؟" موت نے پوچھا،

"مسعود زندگی کا آرزومند تھا"

"ٹھیک ہے، اگر تم کوشش کرو، اسی خلوص سے کوشش کرو جس خلوص سے تم نے مجھے پکارا تھا، تو تم خدا کو بھی دیکھ لوگے، اور اس کے لئے تمہیں زندہ رہنا ہوگا، اگر تم زندگی میں اپنے مقصود کو حاصل نہ کر سکے، تو پھر میں تو تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی، میرا کام تو محض ماحول کا انتقال ہے۔"

"مسعود۔ قانون۔ سماج، مذہب، غرض ہر کوئی زندگی پکارتا ہے زندہ رہو، زندہ رہو، یہ کوئی نہیں بتاتا کہ کیسے زندہ رہوں، تم بھی کہتی ہو کہ زندہ رہوں، اور حالت یہ ہے کہ ـــــ دیکھو تمہاری پوروں سے ابھی تک خون بہ رہا ہے"

"بہنے دو" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "جوان خون ہے، یہ بیرے روکے نہیں رکے گا ـــــ بس اب میں جاتی ہوں۔"

"میرے سوالوں کا جواب؟"

"ہر سوال کا جواب سوال کے اندر غلطاں ہے"

"میری تشفی نہیں ہوئی"

"تو؟"

"اب میں کیا کروں؟"

"زندہ رہو"

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

فلسطین کے بدوی قبائل کی زندگی

مائل نقوی

یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت دلچسپ کہ دنیا کے جو مقامات کسی مقدس ہستی سے منسوب ہیں عام اس سے کہ وہ کسی مذہب و ملت کے ہوں ان کی قدیم تہذیب میں اسوقت تک بہت کم فرق واقع ہوا ہے۔ ہندوستان، چین، عرب، فلسطین وہ ملک ہیں جو یاوقات مختلف پیشوایان مذہب کے ملجاؤ مسکن رہ چکے ہیں۔ ان ممالک کی تہذیب اب بھی وہی ہے جو آج سے ہزارہا سال پہلے تھی۔ یہ ضرور ہے کہ تاریخی انقلابات وقتاً فوقتاً ان ملکوں کی تہذیب و تمدن پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں لیکن ان کی دسترس بہت ہی محدود حد تک ہوئی ہے۔

عہد حاضر میں فلسطین کی سرزمین سیاسی انقلابات اور خیالات کے اختلافات کا مرکز بنی ہوئی ہے اور عرصہ سے مختلف ملکوں کی تہذیب اس پر اپنا اثر بھی ڈال رہی ہے۔ لیکن جہاں تک باشندگان فلسطین کی معیشت اور معاشرت کا تعلق ہے ان چیزوں نے جدید اثرات قبول کرنے سے اپنی بے نیازی کا اظہار کیا ہے۔ جس طرح ہندوستان کا کوئی سیاح اس ملک کی اصلی زندگی اور صحیح حالات سے اسوقت تک آگاہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے گنجان آبادی کے شہروں کو چھوڑ کر دیہات تک رسائی حاصل نہ کرے۔ اس لئے کہ ہندوستان صحیح معنوں میں نام ہے انہیں دیہات کے مجموعے کا اور یہیں خالص ہندوستانی معاشرت اور تہذیب کے حقیقی خدوخال نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ارض بائبل کی سادہ اور دلاویز زندگی کے مناظر دیکھنا چاہتا ہے تو یہ چیز اسے وہاں کے محدود شہروں میں نہیں ملے گی بلکہ اس کے روح پرور نظارے اس کے لق و دق صحرا کی بدوی زندگی میں نظر آئیں گے جو زیادہ تر علاقہ ماوراء النہر میں واقع ہیں۔

ماوراء النہر رقبہ کے اعتبار سے کوئی بڑا ملک نہیں ہے۔ بلکہ ایک چھوٹا سا علاقہ ہے۔ اس کے ایک طرف وادی جرڈن بحیرۂ مردار اور وادی العرب واقع ہیں بقیہ تین طرف سے ریاستہائے وسطیٰ ایشیا، عراق اور عرب گھیرے ہوئے ہیں۔ جرڈان اور بحیرۂ مردار کے قریب کچھ ایسے چشمے ہیں جو تمام سال جاری رہتے ہیں۔ ملک بھر میں بس یہی خطہ زرخیز ہے۔ باقی تمام علاقہ ریگستانی ہے جس پر سفید چاک اور گلابی ریت پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں ریگ رواں کے ہمیشہ طوفان آتے رہتے ہیں۔ چقماق اور سنگ موسیٰ کے جابجا انبار لگے ہوئے ہیں۔ دریاؤں کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ بدوی لوگ پہاڑی کے دامنوں میں ان قدرتی نشیبوں اور مصنوعی کنوؤں سے پانی حاصل کرتے ہیں جہاں سردی کے موسم میں پانی جمع ہو جایا کرتا ہے۔ آب و ہوا کی کیفیت یہ ہے کہ موسم سرما میں کثرت سے بارش ہوتی ہے اور برف باری کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔ اس موسم کے ختم ہوتے ہی برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔ سرد و شیریں پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ سطح زمین پر سرسبزی و شادابی چھا جاتی ہے اور وادیاں سبزۂ و گل کی کثرت سے چمن زار بن جاتی ہیں۔ لیکن گرمی کا موسم آ کر اس کیفیت کو بالکل بدل دیتا ہے۔ خزاں بہار کے حسن کو لوٹ لیتی ہے اور پھر ہر طرف وہی بنجر ریگستان نظر آنے لگتا ہے۔ دن میں سخت گرمی پڑتی ہے اور راتوں کو شدید سردی۔ گلہ بان جو اس ریگستان میں اونٹوں کی نگرانی کی خدمات انجام دیتے ہیں موسم کی ان تبدیلیوں کے ہمیشہ شاکی ہی رہتے ہیں۔

یہاں کے اصلی باشندے جو بدو کہلاتے ہیں تین طبقوں پر منقسم ہیں۔ اوّل کاشتکار ہیں۔ یہ لوگ دیہات میں مستقل طور سے آباد ہیں اور کاشتکاری ان کا پیشہ ہے۔ دوسرے طبقہ میں نیم خانہ بدوش قبائل ہیں۔ یہ قبیلے خیموں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مویشیوں کے گلّے بھی رکھتے ہیں اور زمین کی کاشت بھی کرتے ہیں۔ تیسرا طبقہ اصلی بدّوؤں کا ہے جو تمام کے تمام خانہ بدوش ہیں۔ ان کے پاس مویشیوں کے بڑے بڑے گلّے ہوتے ہیں۔ کاشت وغیرہ سے انہیں مطلق سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے قبیلے اپنے بیشمار مویشیوں کے گلّے لئے ہوئے خانہ بدوشی کی حالت میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ ریگستان کا کوئی چپّہ ایسا نہیں جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں۔ بعض اوقات تو اپنے علاقے کی حدود سے گزر کر وسطِ عرب تک جا پہونچتے ہیں۔

یوں تو یہ تینوں طبقے بظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں، زبان، لباس، خوراک کسی بات میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ لیکن صحرا نورد بدو اپنے آپ کو بقیہ دونوں طبقوں سے افضل تصور کرتا ہے اور انہیں "فلّاحین" یعنی کاشتکار کے نام سے موسوم کرتا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہی صحرا نورد بدو اس ملک کی آبادی کا جزو اعظم اور صحرائی زندگی کی صحیح تصویر ہے۔

ایسے ریگستانی ملک میں جہاں منزلوں معمولی سے معمولی نہر یا چشمہ کا سراغ تک نہیں ملتا پانی کے ذخیروں اور ان کی نگہداشت کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کنوئیں نہایت بیش قیمت جائداد تصور کئے جاتے ہیں اور بجز اس قبیلہ کے جو ان پر قابض ہو کسی دوسرے کو ان کے استعمال کا حق نہیں ہوتا۔ جب کبھی کوئی غیر متعلق قبیلہ ان ذخیروں سے پانی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا یہ اقدام جنگ کا سبب بنجاتا ہے۔ عہد قدیم میں حریف قبائل کے درمیان بیشتر لڑائیاں اسی بنیاد پر اٹھ کھڑی ہوتی تھیں اور عرصۂ دراز تک ہولناک خونریزی ہوتی رہتی تھی۔

ان کنوؤں کا نظارہ اس وقت قابل دید ہوتا ہے جب ان کے گرد کوئی قبیلہ اپنے اونٹوں کو پانی پلانے میں مصروف ہوتا ہے۔ یہ نظارہ اپنے دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے آج سے ہزارہا سال قبل کے اس منظر کی ہوبہو تصویر پیش کرتا ہے جس کا ذکر بائبل میں جابجا آیا ہے۔ بوڑھے اور جوان باری باری سے اپنے اونٹوں کی قطاروں کو کنوئیں کے پاس لاتے ہیں اور انہیں پانی پلا کر واپس لیجاتے ہیں۔ کنوئیں کے گرد بعض اوقات ہزارہا ایسے اونٹ پانی کے منتظر کھڑے رہتے ہیں جو دور دراز کی مسافت طے کر کے یہاں تک پہونچتے ہیں اور پانچ پانچ چھ چھ روز کے پیاسے ہوتے ہیں۔ اونٹوں کو پانی پلانے کا طریقہ یہ ہے کہ دو بدو کنوئیں پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چمڑے کے ڈولوں میں پانی کھینچتے جاتے ہیں، عالم محویت میں گاتے جاتے ہیں اور ایک مخصوص لب ولہجہ کے ساتھ پانی پینے کے لئے اونٹوں کو بلاتے جاتے ہیں۔ اونٹوں کا مالک اپنی قطار کو لیکر آگے بڑھتا ہے۔ کنوئیں کے قریب قطار کھڑی ہو جاتی ہے۔ مالک ایک ایک یا دو دو اونٹ آگے بڑھاتا ہے اور انہیں پانی پلا کر واپس کرتا جاتا ہے۔

اونٹ اس ریگستان کی خاص دولت نہیں بلکہ نعمت ہے۔ ان کی پرورش و پرداخت میں بڑی توجہ صرف کی جاتی ہے اور یہ کام اس فن کے ماہر اور بیش قرار معاوضہ کے مزدوروں کے سپرد ہوتا ہے۔

اونٹ کے بعد اس ملک کی بڑی دولت بھیڑ ہے۔ ان کی بھی کثیر تعداد یہاں پائی جاتی ہے۔ ان کی دیکھ بھال لڑکیاں کرتی ہیں۔ پانی پلانے میں مقدم اونٹوں کو رکھا جاتا ہے۔ ان سے جو کچھ وقت بچ جاتا ہے اس میں بھیڑوں کا نمبر آتا ہے۔ بعض اوقات بیچاری لڑکیوں کو اپنی بھیڑوں کو پانی پلانے کے لئے بہت کم وقت ملتا ہے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ اونٹوں کے قافلے دور دراز کی منزلیں طے کر کے اور دنوں کی پیاسیں برداشت کئے ہوئے کنوؤں پر آتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر بھیڑوں کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔

کنوئیں کھودنے میں اونٹ کی امداد :- صحرانشیں بدو کے ہر شعبۂ زندگی میں اونٹ کی مدد ایک لازمی جز بنگئی ہے۔ کنواں کھودنے میں بھی وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ جب کبھی ایسا موقع آتا ہے تو آدمی نیچے اتر کر کنواں کھودتے ہیں اور ریت وغیرہ ڈول میں بھر دیتے ہیں۔ پھر جس طرح ہمارے ملک میں بیلوں سے چرس کھنچوایا جاتا ہے اس طرح وہاں اونٹ زیر تعمیر کنوئیں سے مٹی کھینچتا ہے۔

بیت شعر بدوی کا مسکن بھیڑ کے سیاہ بالوں کا خیمہ ہوتا ہے۔ وہ اسے خیمہ کبھی نہیں کہتا بلکہ "بیت شعر" (بالوں کا مکان) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس کا یہ مکان دنیا کے تمام مکانوں سے کہیں ہلکا، نرم اور لچکیلا ہوتا ہے۔ ان میں گرمی، دھوپ، سردی، آندھی، گرد وغیرہ غرضکہ موسم کے ہر ناگوار اثر سے حفاظت کا معقول لحاظ رکھا جاتا ہے۔ دن کے وقت جب گرمی تیز ہو جاتی ہے تو قناتیں ہٹا دی جاتی ہیں اور خیمہ ہوادار شامیانہ کا کام دیتا ہے۔ لیکن راتوں کو جب سردی کا زور ہوتا ہے

"آب و آتش"

التفاتِ نظر، مگر مبہم
کون ہو محرمِ حیاتِ الم
اشکِ غم ہی رواں نہ آنکھ ہی نم
آرزوئے سکوں نہ شکوۂ غم
غرقِ جام و سبو تمام الم
آرزوئے حیات تیری قلم
ایک دل مرکزِ ہزار الم
پھر کی اک نگاہ بھی تو نہیں
اور جاگے گا کیا نصیبِ حیات
کم نظر اہلِ بزم کیا جانیں؟

اک روئے فسوں ستم نہ کرم
غیر تو غیر، دوست بھی برہم!
آہ یہ دل کا گریۂ پیہم!
الاماں اے حسی کا یہ عالم
ظرف میکش حریفِ بادۂ غم
غم زیادہ ہے اور خوشی کم کم
اور کچھ۔ اور مشق تیرِ ستم
کس بھروسہ پہ ہو امیدِ کرم
زندگی زندگی سے خود برہم
شمع کس کس کے گھر گئی ماتم

زندگی کی جھلک ہے ان میں مجیبؔ
شعر کیا ہیں حدیثِ درد و الم

مجیب خیرآبادی

یا جب گرد باد کے طوفان آتے ہیں قناتیں لگا دی جاتی ہیں۔ شدید سردیوں کے موسم میں جبکہ برفانی ہوائیں بدن کو ٹھٹھرا دیتی ہیں اسوقت بھی ان خیموں کے اندر بغیر اس کے کہ آگ روشن کی جائے کافی گرمی رہتی ہے۔

بدوی خیموں کی وضع

بدو کا "بیت شعر" مستطیل شکل کا ہوتا ہے۔ چھت ملبند اور اطراف ڈھالو ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا خیمہ بھی اتنا کشادہ ہوتا ہے کہ اس کیلئے نو چوبوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ چوبوں کی تین قطاریں ہوتی ہیں۔ یہ خیمہ کے طول میں اس طرح نصب کی جاتی ہیں کہ اونچی قطار وسط میں ہوتی ہے اور اس سے چھوٹی دو قطاریں دونوں اطراف میں ان کو ڈوریوں کے ذریعہ قائم رکھا جاتا ہے۔ خیموں کی قناتیں بھی سیاہ اون کی ہوتی ہیں اور خیموں کے نصب کرنے میں یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھی جاتی ہے کہ ان کی پشت ہوا اور آندھیوں کے رخ پر رہے۔ خیموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک زنانہ حصہ ہوتا ہے۔ اسے "محرم" کہتے ہیں۔ اس حصہ میں خاندان کے اہل و عیال رہتے ہیں اور اسی حصہ میں خوابگاہ آبدار خانہ، باورچیخانہ اور اجناس اور خانگی ضروریات کا سامان رہتا ہے۔ دوسرا حصہ نسبتاً کشادہ ہوتا ہے۔ یہ مردانہ نشست اور مہمانوں کے قیام کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ جو پردہ خیمہ کو ان دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے اس کے حسن و آرائش پر بڑی توجہ صرف کیجاتی ہے۔ پردہ کی زمین عموماً سفید اون کی ہوتی ہے۔ اس پر بھورے، بادامی اور سیاہ اون سے بیل بوٹے نکالے جاتے ہیں۔ یہ سب کام حرم کی عورتیں کرتی ہیں۔ کمال یہ ہے کہ حد درجہ دیدہ زیب گلکاری جو ان پردوں پر کی جاتی ہے اس کیلئے ان صحرانشین عورتوں کے روبرو کوئی نمونہ نہیں ہوتا ساری کاریگری ان کے دماغی تخیل کا نتیجہ ہوتی ہے۔

خیموں کی وسعت

عام بدوی کا خیمہ طول میں آٹھ یا دس فیٹ اور عرض میں اس کا نصف ہوتا ہے۔ خیموں کا طول و عرض ان کے مالکوں کی حیثیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ غریب گلہ بانوں کے خیمے تو بہت مختصر ہوتے ہیں مگر شیوخ اور دولتمند سرداران قبائل کے خیمے سو سے ایک سو بیس فیٹ تک طولانی ہوتے ہیں۔ ایسے خیموں کو کئی کئی حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور چونکہ تقسیم کرنے والے پردہ کو "واسط" کہتے ہیں اس لئے واسط کی تعداد سے خیموں کو موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً چار واسط کا خیمہ۔ دس واسط کا خیمہ وغیرہ ان خیموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بعض مرتبہ تو بیس اونٹ تک ناکافی ہوتے ہیں۔

خیموں کی ساخت میں جو اون استعمال کیا جاتا ہے وہ زیادہ بدوی کی مملوکہ بھیڑوں کا ہی ہوتا ہے اور یہ بات قابل فخر سمجھی جاتی ہے۔ اون کا تنا، بننا، خیمہ تیار کرنا یہ سب کام عورتیں کرتی ہیں۔ خیموں کے نصب کرنے اور اکھاڑنے کی خدمت بھی عورتوں ہی کو انجام دینا پڑتی ہے۔

نیا خیمہ کب بنایا جاتا ہے

نیا خیمہ اس وقت تیار کیا جاتا ہے جبکہ خاندان کے کسی نوجوان لڑکے کی ازدواجی زندگی شروع ہوتی ہے اور وہ اپنے والدین کے گھر سے علیحدہ ہوکر اپنی شریک زندگی کے ساتھ عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

بدوی خیمے کبھی فرسودہ نہیں ہوتے

بدوی خیموں کے سلسلہ میں جو بات سب سے زیادہ تعجب خیز معلوم ہوگی وہ یہ ہے کہ مسلسل اور شدید موسمی تغیرات کو برداشت کرنے کے باوجود ان میں کہنگی کے آثار کبھی نمودار نہیں ہوتے۔ کیا ان پر برف و باراں کے طوفانوں اور صرصر و سموم کے خوفناک حملوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا؟ یا صحرائی بھیڑوں کے اون میں اینٹ، پتھر اور چونے سے زیادہ پائداری ہوتی ہے؟ مگر یہ بات تو کسی طرح ممکن نہیں ہوسکتی بلکہ اصل بات یہ ہے کہ خیموں کی ظاہری خوشنمائی اور ہمیشہ نئے رہنے کا راز بدوی خواتین کی ہنرمندی اور محنت پسندی میں مضمر ہے۔ بھیڑوں کا اون ہر گھر میں ہمیشہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ عورتیں اسے کاتتی اور پٹیاں بنتی رہتی ہیں اور سال گزر جاتے کے بعد پرانی پٹیوں کی جگہ انہیں لگا دیتی ہیں۔ اس طرح سال بسال نئی پٹیوں کے باعث خیمہ ہمیشہ تازہ ساخت معلوم ہوتا ہے اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان میں شکستگی و کہنگی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

عدیم النظیر مہمان نوازی

دنیا کی تہذیب و تمدن کے مرکزوں سے دور بسنے والا یہ صحرا نورد بدو اپنی بےمثل مہمان نوازی کی شہرت کا مالک ہے۔ اس کے تمام علاقہ میں سیاح ایک سرے سے دوسرے تک چلا جائے لیکن اسے کہیں کوئی مسافرخانہ یا ہوٹل نظر نہیں آئے گا۔ اجنبی شخص اس کمی کو تہذیب جدید سے بدو کی ناواقفیت پر مبنی کرے گا۔ مگر یہ اس کی سخت غلطی ہوگی۔ ملک بھر میں ہوٹل یا سرائے کا نہ ہونا بدو کی بےنظیر مہمان نوازی کا ثبوت ہے۔ اس کا خیمہ مسافر کے لئے سرائے، ہوٹل، آرام گاہ اور فرودگاہ کا قائم مقام بنتا ہے۔ یہی نہیں کہ ایک بدوی کے خیمہ میں داخل ہوجانے کے بعد مسافر کو آب و طعام ہی کی طرف سے اطمینان نصیب ہوجاتا ہو بلکہ اسے تمام خطرات سے کامل حفاظت حاصل ہوجاتی ہے۔

اس کے ہاں ہر اجنبی مسافر اپنے آپ کو ایسا پاتا ہے گویا کہ وہ برسوں سے بچھڑے ہوئے عزیزوں کے جھرمٹ میں آگیا ہے۔ قبیلہ کا شیخ میزبان اور باقی افراد مسافر کے خادم بنجاتے ہیں۔ اس کے لئے آرام و آسائش کے بہتر سے بہتر سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ مہمان کی ضیافت کے لئے شیخ اپنے گلوں میں سے بہترین جانور کا انتخاب کرتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گلے کے گلے مہمان کے سامنے سے گزارے جاتے ہیں اور وہ کوئی جانور پسند کرتا ہے۔ شیخ خود جانور کو ذبح کرتا ہے اور اس کی بانوئے محترم اپنے ہاتھ سے کھانا تیار کرتی ہے۔ مہمان کی خاطر قیمتی قالین کا فرش کیا جاتا ہے۔ قبیلہ کے معزز افراد دستر خوان پر مدعو کئے جاتے ہیں۔ مہمان کی تواضع اور احترام کا اس درجہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ شیخ اس کے ساتھ بیٹھکر کھانا نہیں کھاتا بلکہ دعوت کے دوران میں اس کے روبرو حاضر رہتا ہے اور مثل خادم کے ہر چیز اس کے سامنے خود پیش کرتا ہے۔

بدویوں کی شکل و صورت

بدویوں کا قد میانہ، بدن چھریرا، نقشہ بیضاوی اور آنکھیں بڑی اور چمکدار ہوتی ہیں۔ ہونٹ باریک، داڑھی چھدری اور ناک عقابی ہوتی ہے۔ مدتہائے دراز سے آفتاب کی سوزش میں رہنے کی وجہ سے رنگت سانولی ہوگئی ہے۔

عورتیں توانا اور تندرست ہوتی ہیں۔ سرو اندام ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی رفتار سے شاہانہ شان ظاہر ہوتی ہے۔ جوان لڑکوں اور لڑکیوں میں "گودنے" کا عام رواج ہے۔ بعض لڑکیوں کی ٹانگیں تو اس قدر گدی ہوتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ جھالردار موزے پہنے ہوئے ہیں۔ نوجوان لڑکے عموماً اپنے چہرہ پر چار نقطے گدواتے ہیں۔ ایک ناک پر، ایک ٹھوڑی پر، اور ایک ایک رخساروں پر۔ بعض منچلے جوان اپنے بازوؤں پر شیر، عقاب، تلوار وغیرہ کی شکلیں بھی بنوا لیتے ہیں۔

لباس

عام قاعدہ ہے کہ ہر ملک کے باشندوں کی پوشاک اس ملک کی آب و ہوا کی مناسبت سے ہوا کرتی ہے۔ یہی حال بدویوں کے لباس کا بھی ہے۔ ان کا ملک ریگستانی ہے جہاں ایک وقت میں آندھیوں کا زور اور گرد کی بھرمار رہتی ہے۔ اور دوسرے وقت میں سردی کی شدت اور برفباری کی کثرت ہوتی ہے۔ لہذا باشندگان ملک کے طرز لباس میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ہر شخص خواہ کسی طبقہ یا رتبہ کا ہو گھٹنوں تک نیچا سفید کرتہ پہنتا ہے جسے ان کی اصطلاح میں تاب کہتے ہیں۔ اس کے اوپر ایک سفید یا دھاریدار ریشمی یا سوتی چغہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ ضروری لباس بغیر آستین کی قبا ہے۔ یہ کوٹ، اوور کوٹ، برساتی اور کمبل کا کام دیتی ہے۔ قبا بھیڑ یا اونٹ کے اون سے تیار کی جاتی ہے اور اس کے لئے پسندیدہ رنگ سیاہ، بادامی، نارنجی اور سفید ہیں۔ اونی کپڑا جو اس غرض سے تیار کیا جاتا ہے اس کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ یہ کپڑا اونی ہونے کے باوجود اس قدر نفیس اور باریک ہوتا ہے کہ دوسری طرف کی چیز صاف نظر آتی ہے۔ پھر اس نفاست کے ساتھ مضبوط اور کارآمد بھی اتنا کہ جب احتیاط سے جسم کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے تو تیز سے تیز بارش اور شدید سے شدید برفباری کا مطلق اثر جسم تک نہیں پہونچتا۔ عام بدوی جنہیں سرد آب و ہوا میں رہنا پڑتا ہے وہ بھیڑوں کی پوستین استعمال کرتے ہیں۔

بدوی لوگ ٹوپی استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کے بجائے سر کی حفاظت ایک خاص وضع کے رومال سے کرتے ہیں۔ یہ رومال سر پر اس طرح ڈال لیا جاتا ہے کہ اس کے دو گوشے کانوں کے نیچے تک لٹکتے رہتے ہیں۔ اس کے اوپر اونی یا ریشمی "سربیچ" ہوتا ہے۔ اس ترکیب سے کان اور سر دھوپ اور سردی اور گرد سے محفوظ رہتے ہیں۔ پاؤں میں رنگین چمڑے کی چپل پہنتے ہیں۔ شیوخ اور وہ لوگ جنہیں گھوڑے کی سواری کا زیادہ کام رہتا ہے ایک خاص رنگ کا مراکشی چمڑے کا بوٹ استعمال کرتے ہیں۔

بدویوں کی ڈھیلی ڈھالی عبائیں اور ان کے کشادہ دامن ممکن ہے کہ اجنبی نگاہوں کو غیر ضروری معلوم ہوں لیکن وہ بہت مفید اور آرام دہ اور مقامی آب و ہوا کے بالکل مناسب ہیں۔ سفید رنگ کا سوتی لباس انہیں آفتاب کی تپش سے محفوظ رکھتا ہے اور سیاہ اونی پوشاک سرد راتوں میں جسم کی حفاظت کرتی ہے۔ گرمی میں قبا کے بند جب کھول دئے جاتے ہیں تو خوشگوار ہوا بدن کو فرحت پہونچاتی ہے لیکن باد سموم کے وقت یہی دامن اگر لپیٹ لئے جائیں تو اس کے مضر اثرات کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

عورتوں کی پوشاک مردوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس کی وضع ایسی ہوتی ہے جس میں شان اور خوبصورتی دونوں پائی جاتی ہیں۔ انکے لباس کا رنگ عموماً آسمانی ہوتا ہے۔ دامن میں ہلکے رنگ کی پلیٹیں پڑی ہیں۔ جہاں کلیاں اور جوڑ ملتے ہیں وہاں خوشرنگ ریشمین کام ہوتا ہے۔ کنواری لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں کی پوشش میں بھی فرق ہوتا ہے۔ لڑکیاں اپنا سر ایک ایک رومال سے ڈھکے رہتی ہیں جو سوتی یا خانہ ساز ریشمی کپڑے کا ہوتا ہے اور اس پر کلابتون کا کام کیا ہوتا ہے۔ شادی شدہ عورتیں معمولی کپڑے کا رومال سر اور پیشانی کے گرد باندھ لیتی ہیں۔

دلہنوں کا "سر بند" بہت خوبصورت زر کار اور بیش قیمت ہوتا ہے۔ زیورات کے ذیل میں چوڑیاں، گلوبند، انگشتری عام ہیں۔ بالوں کی زیبائش کے لئے موباف کے گرد سُبک گھونگھرو ٹانکے جاتے ہیں سردی اور بارش میں اگر کہیں جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو شالوں پر دراز عبائیں ڈالی جاتی ہیں۔ ان لوگوں میں ایک طریقہ نہایت ہی شریفانہ اور قابل تعریف یہ ہے کہ لباس اور وضع قطع میں مرد و عورت ایک دوسرے کی مشابہت سے سخت احتراز کرتے ہیں۔ ہر صنف کی طرز و وضع اس صنف کے ساتھ مخصوص ہے حتیٰ کہ تفریح طبع کے مشغلوں اور نقلوں وغیرہ میں بھی اس امر کی انتہائی احتیاط برتی جاتی ہے۔

اخلاق و عادات

بدویوں کے اخلاق و عادات نہایت سادہ اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ خیالات بلند، اور مستحکم اور طبیعت میں جلالت و جوش کا مادہ قدرتی ہوتا ہے۔ خود داری اور عزت نفس ہر بدو کا آبائی ورثہ ہے جسے وہ کسی قیمت پر بھی فروخت نہیں کر سکتا۔ آزادی کو وہ اپنا فطری حق سمجھتا ہے اور اس کے تحفظ کی خاطر ہر قربانی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کی دوستی اور دشمنی کھلی ہوتی ہے اور اس کا زبانی بیان ہزار دستاویزات پر بھاری ہوتا ہے۔

موت: بقیہ صفحہ ۱۸

اُٹھ کر اس نے ایک انگڑائی لی، اور کمان سا خم کھا کر دیر تک ایک دھندلی قوس کی طرح فضا میں معلق رہی، اور جب میری جمی ہوئی نظروں نے اس قوس میں سانپ کے سے بل ڈالنا اور اسے عجیب عجیب روپ دینا شروع کیا، تو میں نے تنگ آکر پوچھا "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"کوئی کہاں تک تمہارے استغراق کے انجام کا انتظار کرے"۔ مگر یہ موت کی آواز نہیں تھی، "جب میں یہاں آئی، تو تم پر یہی حالت طاری تھی، جب میری آنکھ لگی تو تم اسی عالم میں گم تھے، اور اب میری آنکھ کھلی ہے، تو تم اسی طرح خلا میں گھور رہے ہو"

"کلثوم" میں پکارا،

"ہمیں نیند آئی ہے، ہم چلتے ہیں" کلثوم انگڑائی کا خم توڑ کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی،

میں نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا، اور اسے اپنی طرف کھینچا، اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے ہار کی گھنگھریاں چھنکنے لگیں جیسے سب مل کر الاپ رہی ہوں ـــــ جئیں گے، ہم جئیں گے، ہم جئیں گے!"

دو قابل قدر تصانیف

سید الانبیاء۔ خاتم النبیین۔ محبوب خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور عالم سیرت مبارکہ

رحمتہ اللعالمین کامل تین جلد

مصنفہ: علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری

فاضل مصنف نے آقائے عربی کی سوانح حیات کو جس بالغ نظری سے مرتب کیا ہے اُسنے رحمتہ اللعالمین کے شائع ہوتے ہی غیر معمولی مقبولیت عنایت کر دی چنانچہ کتاب کو ملک کے ہر حصہ میں ہاتھوں ہاتھ قبول کیا گیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقفیت پیدا ہو جائیگی۔

طرز بیان محبت اور عقیدت سے منجھا ہوا ہے۔ سیرت کے ساتھ ہی بہت سے اہم مذہبی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے کتابت خوشخط کاغذ چکنا عمدہ طباعت دیدہ زیب کامل تین جلد مجلد

قیمت ۱۷ روپے

اردو زبان میں قرآن حکیم کی بے نظیر و لاثانی تفسیر

تفسیر حقانی اردو کامل

مصنفہ

فاضل اجل علامہ مولانا مولوی عبدالحق صاحب حقانی دہلوی

اُردو زبان میں آج تک ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس سے آپ عمر کے ہر حصہ میں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں زبان عام فہم اور سلیس با محاورہ اردو استعمال کی گئی ہے حوالہ کتب۔ ربط آیات، شان نزول اور دیگر متعلقات بھی درج کئے گئے ہیں، شائقان علم و دین کے مسلسل اصرار پر نواں ایڈیشن آٹھ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ جو اڑھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں قیمت کامل آٹھ حصے بلا جلد پچیس روپے مجلد اکیس روپے

ہم اسلامی، ادبی کتابیں اور قرآن مجید شائع کرتے ہیں فہرست مفت طلب فرمایئے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ناشران کتب، کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

جدید مکانات کی تعمیر

انسانی ضروریات زندگی میں کھانے اور کپڑے کے بعد سب سے زیادہ اہمیت گھر کو حاصل ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آجکل لوگ گھر نہ ملنے کی تکلیف سے دوچار ہیں اور اس کے رفع کرنے کے لئے فوری اعانت کے خواستگار ہیں اس حاجت کی شدت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ برسوں تک لڑائی لڑنے کے بعد ہندوستان کے بہادر فوجی جوان اپنے لاتعداد دیہاتوں میں واپس آ رہے ہیں قدرتی اور بجا طور پر انہیں اچھے معیار کے گھر اور گھریلو زندگی کی توقع ہوگی تاکہ وہ امن کا مفید اور تعمیری کام انجام دینے اور زندگی کی دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے آباد ہو سکیں۔

کانکریٹ صرف رئیسوں ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ اپنی ذاتی پائیداری۔ کفایت شعاری۔ صلاحیت۔ آگ سے بچاؤ اور صفائی کی صفات کے سبب ہر خاص و عام کے لئے مفید ہے۔

کانکریٹ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مفید تعمیرات کے لئے دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا، ۷ کوئنس وے نئی دہلی، کے فنی ادارے کی اعانت حاصل کی جا سکتی ہے۔

خواہ آپ کا گھر امیر کا عالیشان محل ہو یا غریب کی کُٹیا کانکریٹ کے ذریعے آسانی اور کفایت سے تعمیر ہو سکتا ہے۔

دی سیمنٹ مارکٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ

سی۔ ایم۔ سی۔ آئی تقسیم کنندگان سیمنٹ

سی۔ اے۔ آئی کی مفت خدمات

ہندوستان اور کنیڈا کے مابین تجارت

(یہ اعداد و شمار "انڈین ٹریڈ بلیٹن" سے اخذ کئے گئے ہیں تمام رقمیں امریکی ڈالروں کی صورت میں ہیں)

۱- کنیڈا سے باہر جانے والے مال میں ہندوستان کا حصہ:-

ملک	۱۹۳۹	۱۹۴۴	۱۹۴۵
ریاست ہائے متحدہ	۳۸،۰۳،۹۲،۰۰۰	۱،۳۰،۱۳،۲۲،۰۰۰	۱،۱۹،۶۹،۷۷،۰۰۰
برطانیہ	۳۲،۸۰،۹۹،۰۰۰	۱،۲۳،۵۰،۳،۰۰۰	۹۶،۳۲،۳۸،۰۰۰
برطانوی ہندوستان	۵۱،۶۶،۰۰۰	۱۷،۴۷،۹۴،۰۰۰	۳۰،۷۴،۶۱،۰۰۰
اپنے ملکوں کا میزان	۴۳،۸۰،۰۷،۰۰۰	۱،۶۲،۰۴،۵۱،۰۰۰	۱،۴۸،۰۶،۸۱،۴۸،۰۰۰
غیر ملکوں کا میزان	۴۹،۴۱،۱۹،۰۰۰	۱،۸۱،۹۵،۰۲،۰۰۰	۱،۷۳،۱۴،۸۲،۰۰۰
برآمد کا کل میزان	۹۲،۴۹،۲۶،۰۰۰	۳،۴۳،۹۹،۵۳،۰۰۰	۳،۲۱،۸۳،۳۰،۰۰۰

۲:- کنیڈا میں باہر سے آنے والے مال میں ہندستان کا حصہ:-

ملک	۱۹۳۹	۱۹۴۴	۱۹۴۵
ریاست ہائے متحدہ	۴۹،۰۶۸،۹۸،۰۰۰	۱،۴۴،۷۲،۲۶،۰۰۰	۱،۰۲۰،۲۴،۱۸،۰۰۰
برطانیہ	۱۱،۴۰،۰۷،۰۰۰	۱۱،۰۵،۹۹،۰۰۰	۱۴،۰۵،۱۷،۰۰۰
برطانوی ہندوستان	۹۸،۰۸،۰۰۰	۲،۷۸،۷۸،۰۰۰	۳،۰۵،۶۸،۰۰۰
اپنے ملکوں کا میزان	۱۸،۸۹،۰۰،۰۰۰	۲۲،۰۳،۳۴،۰۰۰	۲۷،۱۶،۶۸۱،۰۰۰
غیر ملکوں کا میزان	۵۶،۲۱،۱۵،۰۰۰	۱،۵۳،۸۵،۴۴،۰۰۰	۱،۳۱،۴۱،۰۷،۰۰۰
درآمد کا کل میزان	۷۵،۱۰،۱۵،۰۰۰	۱،۷۵،۸۸،۷۸،۰۰۰	۱،۵۸،۵۷،۷۵،۰۰۰

۳-(۱) کنیڈا کی بیرونی تجارت میں برطانوی ہندوستان کا حصہ:-

سال	کنیڈا کا درآمدی سامان برطانوی ہندوستان سے	کنیڈا کی مجموعی درآمد	مجموعی درآمد کا فیصدی
۱۹۳۰	۹۸،۰۸،۰۰۰	۷۵،۱۰،۵۶،۰۰۰	۱ر۳
۱۹۴۰	۱،۶۰،۴۲،۰۰۰	۱،۰۸،۱۹،۵۱،۰۰۰	۱ر۵
۱۹۴۱	۱،۷۸،۶۷،۰۰۰	۱،۴۴،۸۷،۹۲،۰۰۰	۱ر۲
۱۹۴۲	۲،۱۳،۴۶،۰۰۰	۱،۶۴،۴۲،۰۰۰	۱ر۳
۱۹۴۳	۱،۷۰،۹۰،۰۰۰	۱،۷۳،۵۰،۷۷،۰۰۰	۱ر۰
۱۹۴۴	۲،۷۸،۸۷،۰۰۰	۱،۷۵،۸۸،۹۸،۰۰۰	۱ر۶
۱۹۴۵	۳،۰۵،۶۸،۰۰۰	۱،۵۸،۵۷،۷۵،۰۰۰	۱ر۹

سال	کنیڈا کا گھریلو مال جو برطانوی ہندستان آیا	کنیڈا کے گھریلو مال کی مجموعی برآمد	اس مجموعی برآمد کا فیصدی
۱۹۳۹	۵۱،۶۶،۰۰۰	۹۲،۴۹،۲۶،۰۰۰	۰ر۶
۱۹۴۰	۱،۱۲،۴۲،۰۰۰	۱،۱۷،۸۹،۵۴،۰۰۰	۱ر۰
۱۹۴۱	۳،۸۰،۳۷،۰۰۰	۱،۶۲،۱۰،۰۳،۰۰۰	۲ر۳
۱۹۴۲	۱۶،۷۸،۸۴،۰۰۰	۲،۳۶،۳۷،۷۳،۰۰۰	۷ر۱
۱۹۴۳	۱۳،۴۵،۷۶،۰۰۰	۲،۹۷،۱۴،۷۵،۰۰۰	۴ر۵
۱۹۴۴	۱۷،۴۷،۹۴،۰۰۰	۳،۴۳،۹۹،۵۳،۰۰۰	۵ر۱
۱۹۴۵	۳۰،۷۴،۶۱،۰۰۰	۳،۲۱،۸۳،۳۰،۰۰۰	۹ر۶

۳-(ب) کنیڈا کی بیرونی تجارت میں برطانوی ہندستان کا حصہ:-

	۱۹۳۹	۱۹۴۰	۱۹۴۱	۱۹۴۲	۱۹۴۳	۱۹۴۴	۱۹۴۵
درآمد	پانچواں	پانچواں	چھٹا	تیسرا	چوتھا	تیسرا	تیسرا
برآمد	تیرھواں	آٹھواں	چوتھا	چوتھا	چوتھا	تیسرا	تیسرا
کل تجارت	نواں	چھٹا	پانچواں	چوتھا	چوتھا	تیسرا	تیسرا

آجکل ہندوستان کے طول و عرض میں بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس غیر معمولی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے۔ آجکل کے صفحات میں اشتہارات دے کر اپنی تجارت کو فروغ دے سکتے ہیں: منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۹۷ دہلی

رخصت کے بعد

اختر شیرانی

جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!
میں نے اک لمحہ خوشی کا نہ گزارا ہمدم!
چھن گیا میری امیدوں کا سہارا ہمدم!
چھپ گیا میرے شبستاں کا ستارا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

جب سے رخصت ہوئی وہ، رہتا ہوں دن رات اداس
دل میں ہیں شعلہ فشاں رنج و الم حسرت و یاس
کوئی تسکیں نہ تسلی، کوئی امید نہ آس
کر گئے ہجر میں سب مجھ سے کنارا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

میری آنکھوں میں مچلتی ہیں ادائیں کس کی؟
چٹکیاں لیتی ہیں سینے میں حیائیں کس کی؟
ہر گھڑی کان میں آتی ہیں صدائیں کس کی؟
ہر گھڑی کہتا ہوں یہ کس نے پکارا ہمدم؟
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

میری وحشت کو بڑھاتی ہے چمن کی صورت
دل کو تڑپاتی ہے شمشاد و سمن کی صورت
یاد آجاتی ہے اُس غنچہ دہن کی صورت
بھولتی ہی نہیں نظریں یہ نظارہ، ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا، ہمدم!

اس کے جانے سے فضاؤں میں طراوت نہ رہی
باغ کا رنگ اڑا، پھولوں میں نکہت نہ رہی
جلوہ زارِ مہ و انجم میں وہ طلعت نہ رہی
بجھ گیا اب کے مقدر کا ستارہ ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

کبھی وحشت لئے پھرتی ہے خیابانوں میں
کبھی تکمیل جنوں ہوتی ہے ویرانوں میں
اور کبھی روتا ہوں جا کر شجرستانوں میں
کہ چمن میں نہیں کوئی چمن آرا ہمدم!
جب سے رخصت ہوئی وہ انجمن آرا ہمدم!

ناگور

ناگور جنوبی ہند کا ایک اہم اور مشہور شہر ہے جو ہندو مسلم اتحاد کا ایک مثالی مرکز ہے۔ وہاں کی مسجد شاہ ابوالحامد سے منسوب ہے جو میرن صاحب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ مسجد انکے مزار پر تعمیر کی گئی ہے۔

سالانہ تہوار کے موقعہ پر میناروں پہ لگے ہوئے برچم ہوا میں لہرا رہے ہیں۔
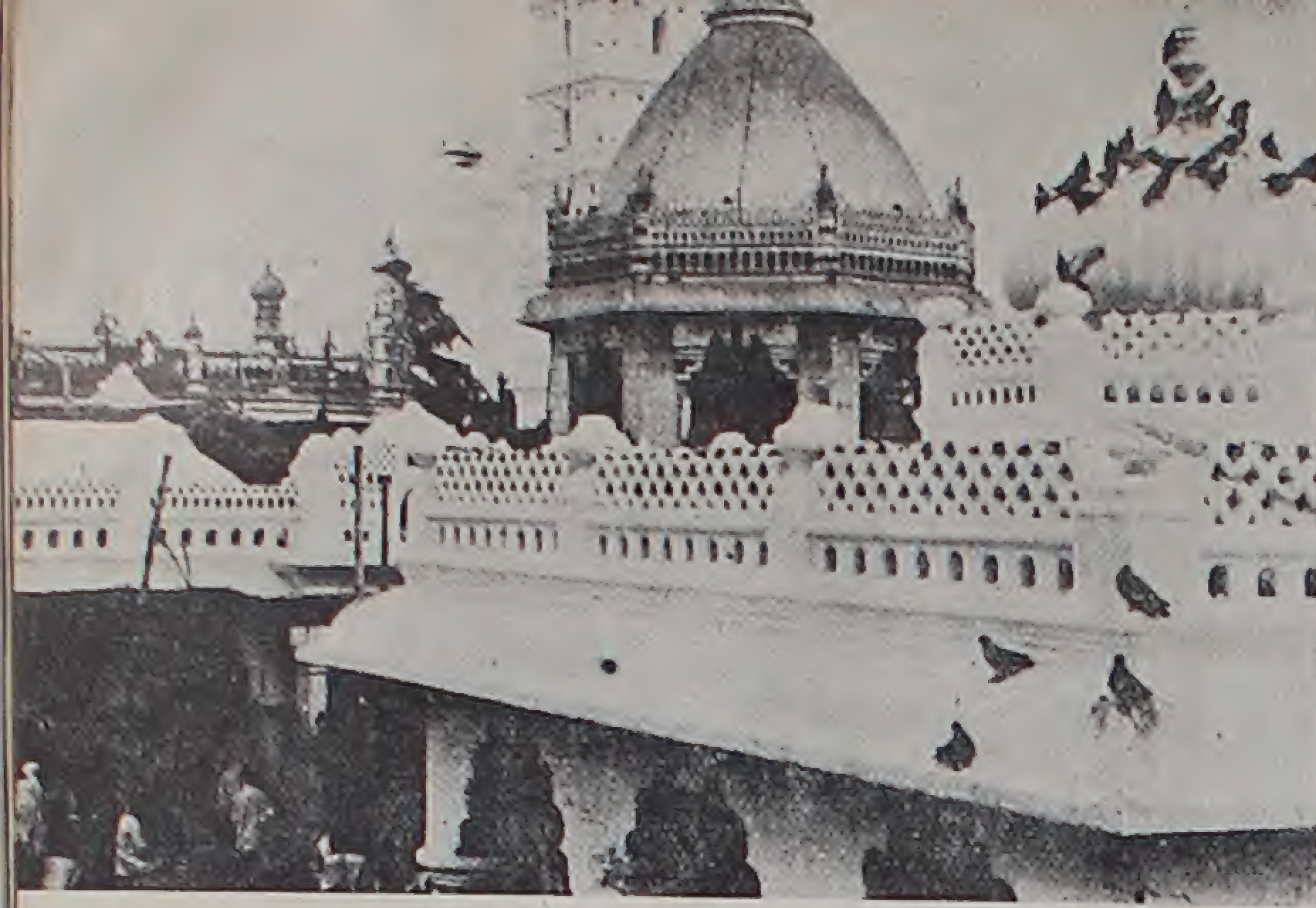
درگاہ شریف کا اندرونی احاطہ' چھتیں اور گنبد۔

مزار پر ہر سال ایک تہوار منایا جاتا ہے جس میں ہندو مسلمان امیر اور غریب افسر اور ماتحت ہر مذہب اور ہر مرتبے کے لوگ حصہ لیتے ہیں۔ پوری تفصیل جناب ایل۔ این۔ گبل کے مقالے میں ملاحظہ فرمائیں جو اسی شمارے کے صفحہ ۴۹ پر شریک اشاعت ہے۔
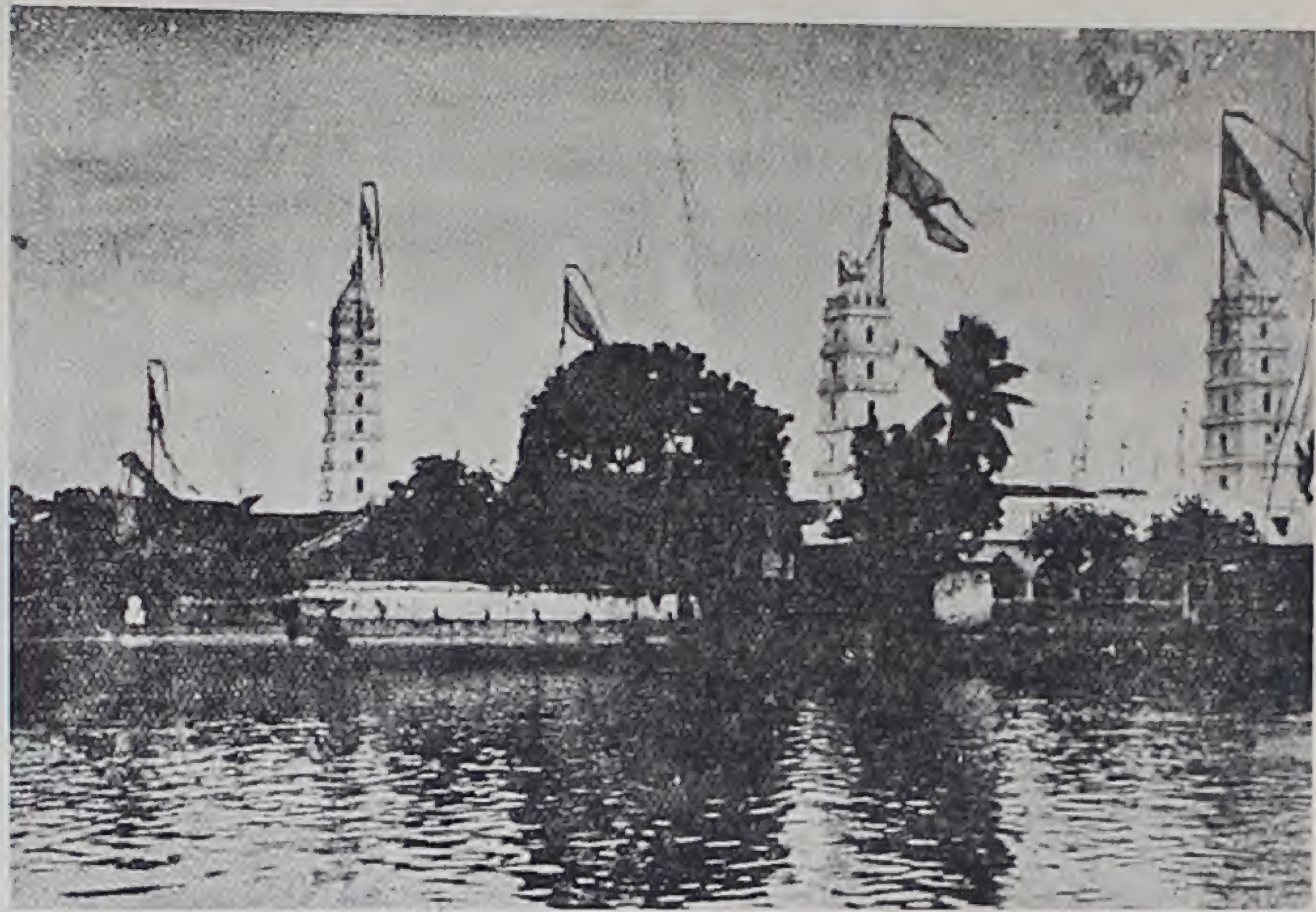
انبالہ امپلائمنٹ اکسچینج

۲۹ جولائی کو ہز ایکسیلنسی گورنر پنجاب نے انبالہ امپلائمنٹ اکسچینج کا معائنہ کیا۔ تصویر میں اسکے منیجر کپتان عبدالحکیم شیخ پٹیالہ کے ایک جرنلسٹ کا تعارف کراتے ہوئے گورنر صاحب سے باتیں کررہے ہیں۔ فوجی ملازمت سے الگ کئے ہوئے لوگوں کیلئے دوبارہ روزگار حاصل کرنے میں شیخ صاحب اپنی پر خلوص خدمات پیش کرتے ہیں۔

«شی انگ» کے مقابلے میں حصہ لینے کے لئے پہاڑ پر چڑھا جارہا ہے۔

طہران میں موسم سرما کے کھیل

ایرانیوں نے موسم سرما کے بہت سے کھیل سیکھ لئے ہیں۔ البرز پہاڑ کی لمبی ڈھلانیں اس مقصد کیلئے بہت مناسب ثابت ہوئی ہیں۔ جب میدان کی سڑی گرمی سے طبیعت اکتا جائے تو قدرتی طور پر پہاڑ کی فرحت بخش فضا میں چھٹیاں گذارنے کو جی چاہتا ہے۔ شروع میں روئی کے گالوں جیسی نرم برف پر بے ڈھنگے پن کے ساتھ لڑھک جانا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہوتا کھلاڑیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ انکے لئے تو یہ موقع ایک نعمت ہوتا ہے۔ تندرست اور توانا لوگ اونچائی اور نیچائی کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے خوب دوڑتے ہیں۔ بعض لوگ لمبی لمبی چھلانگیں مارتے ہیں۔ «شی انگ» کا کھیل جیسا کہ ان تصویروں سے ظاہر ہے ایران میں بھی بہت مقبول ہو گیا ہے۔ برف سے پٹے ہوئے پہاڑوں پر سینکڑوں ٹولیاں اس کھیل میں دلچسپی لیتی نظر آتی ہیں۔ یہ کھیل صرف انہی کے بس کا ہے جنکے جسم میں طاقت ہے اور جو توازن قائم رکھنے کے سلسلہ میں اپنے حواس پر قابو پاسکتے ہیں۔

«شی انگ» کا ایک مشہور کھلاڑی مسٹر «نقی امام» جو اس کھیل کے سلسلے میں میر میدان سمجھا جاتا ہے۔

بچوں کا سرکس

ان بچوں کے لئے سرکس کا ہر کھیل پر لطف
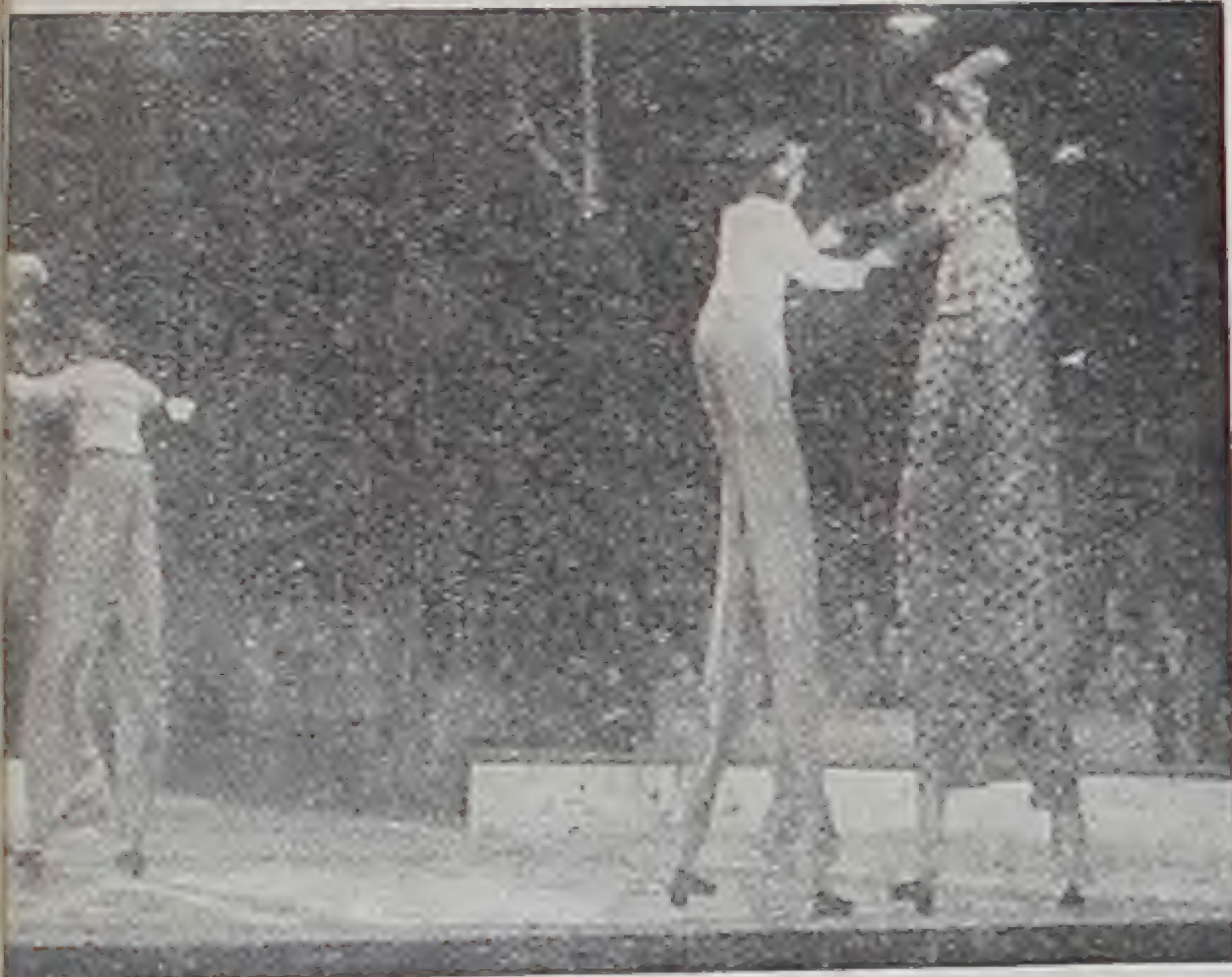
مصنوعی طور پر قد بڑھاکر کھیل کو
زیادہ دلچسپ بنایا جارہا ہے۔

جنگ کے باعث برطانیہ کے بعض کم
سن بچوں کو سرکس دیکھنے کا کبھی
موقع نہیں ملا تھا۔ پچھلے موسم سرما
میں جب بعد جنگ کا پہلا سرکس
گلاسگو میں کھلا تو بچوں کے ذوق
و شوق کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ
تصویریں اسی موقع پر لی گئی تھیں۔

دو ماہر قلا باز جھولے پر اپنے کرتب دکھا رہے ھیں۔

جنگ کے بعد دس میں سے یہی چھ ہاتھی بچے تھے۔
وہ اپنا کرتب دکھا رہے ھیں۔

مٹی بہہ جانے کے باعث اس درخت کی جڑیں دکھائی دینے لگی ہیں۔ اسطرح درخت کی نشو و نما پر برا اثر پڑتا ہے۔

قاعدے کے مطابق زراعت

کھار کے باعث زمین کا بنجر یا بیکار ہوجانا ہندوستان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ مشرق وسطی اور امریکہ میں بھی بہت سی زمینیں جو آج صحرا بنی ہوئی ہیں کسی زمانے میں دنیا کی زرخیز ترین زمینوں میں شمار ہوتی تھیں۔ زمین میں کھار پیدا ہو جانے کے دو سبب ہیں۔ جنگل کا چھدرا ہو جانا یا ضرورت سے زیادہ جانوروں کو چرائی کے لئے چھوڑ دینا۔ درختوں کو کاٹ کر چراگاہیں بنائی جاتی ہیں۔ لیکن جانوروں کے روندے جانے سے مٹی بولی ہوکر ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑ جاتی یا بارش کے پانی کے ریلے میں بہہ جاتی ہے۔ بعض دفعہ لا پرواہی کے ساتھ کاشتکاری

تین سال پہلے درخت اور جھاڑیاں لگاکر اس بند کو زیادہ مضبوط بنایا گیا تھا۔

یہ نصف میل لمبی منڈیر صرف ایک دن میں بنائی گئی ہے۔ زمین کی خرابی کواسطرح بھی روکا جا سکتا ہے۔

کرنے پر بھی یہی صورت پیدا ہوتی ہے۔ ان خرابیوں کا علاج یہ ہے کہ نئے درخت لگائیں اور بند لگاکر زرخیز مٹی کو بہہ جانے سے روکیں۔ تمام ہندوستان میں اس قسم کے تجربات عمل میں لائے جارہے ہیں۔ خصوصاً بیجاپور میں بڑی کامیابی حاصل ہو چکی ہے۔ وہاں یہ ثابت کر دکھایا گیا ہے کہ پچھلی لاپرواہیوں کے اثرات دور کرنے اور مزید نقصانات کی روک تھام کیلئے کیا کیا صورتیں اختیار کرنی چاہیئں۔ چنانچہ وہاں بہت سی بنجر زمینیں زرخیز بنادی گئی ہیں۔

بیجاپور بلگاؤں اور دھارواڑ ضلعوں کے « مدرسہ اصلاح اراضیات » کے افسر اعلی اپنے شاگردوں کو مرتبہ خاکے کی مدد سے پوری تفصیل کے ساتھ سمجھا رہے ہیں کہ کام کس طرح شروع کیا جائے۔

نقشہ بنانے والے اپنے کام میں محو ہیں۔ « مدرسۂ اصلاح اراضیات » میں یہ کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بیجاپور میں ایک پرانے محل کی چاردیواری اس قطعۂ زمین کے لئے ایک قدرتی بند ثابت ہوئی جس پر جوار کی یہ شاداب کھیتی لہلہا رہی ہے۔

محکمہ جات جنگلات و زراعت کے چند افسران اعلی مقامی کسانوں کے ساتھ کھیتوں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں مفید گفتگو کر رہے ہیں۔ (دائیں طرف) اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ بند لگانے اور کھیتوں میں نالیاں بنا دینے سے بارش کا پانی کس طرح رک جاتا ہے۔
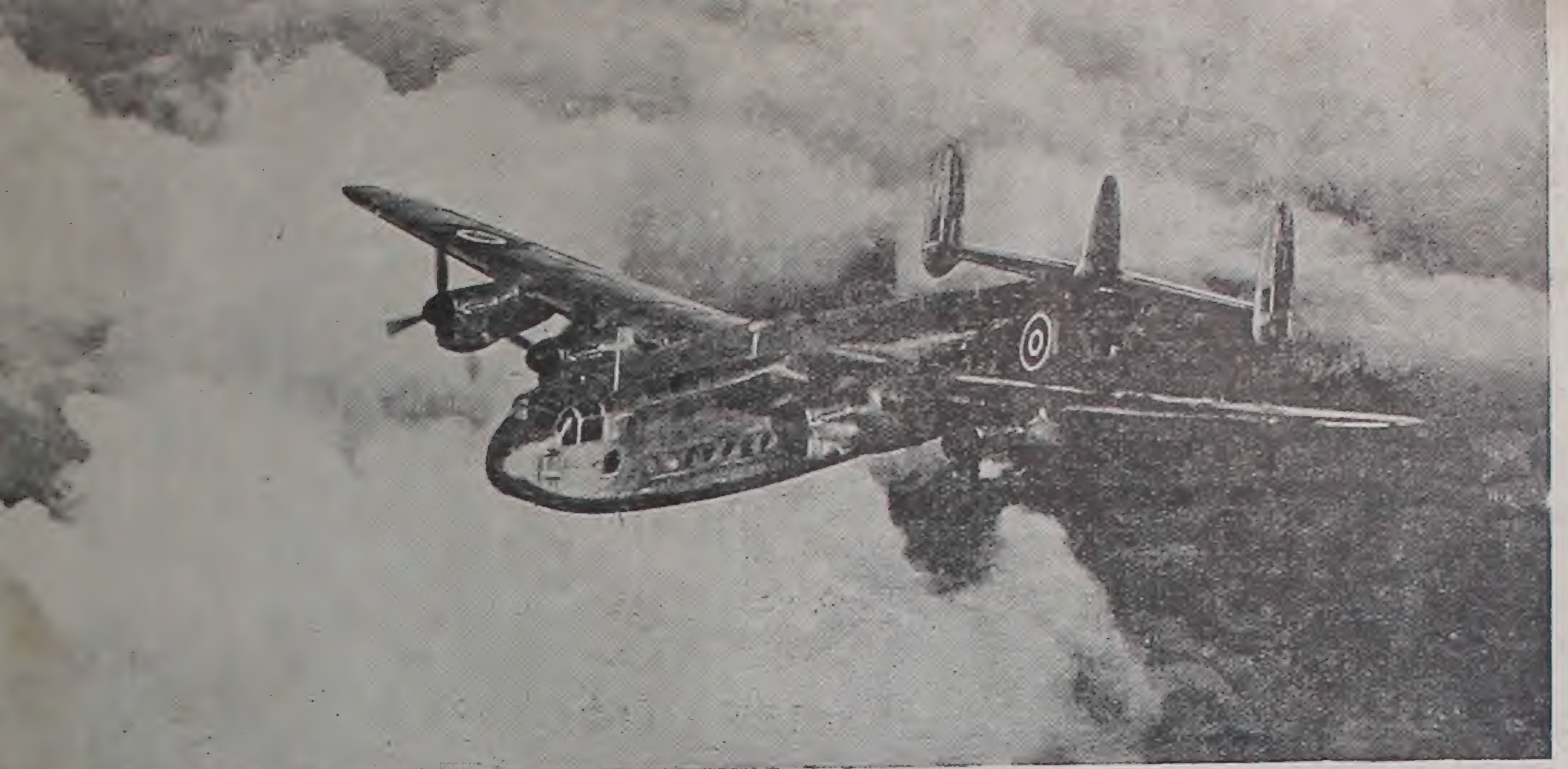
‹ابورو یورک› نامی ہوائی جہاز جو ‹ابورو لنکاسٹر› کے نمونے پر بنایا گیا ہے۔ اس وقت یہ سلطنت برطانیہ کے تمام راستوں پر چل رہا ہے۔

فضائی حمل و نقل مستقبل قریب میں

برطانیہ نے زمانۂ جنگ میں جو ہوائی جہاز بنائے تھے وہ اب شہری ضروریات پوری کرنے میں بڑی مدد دینگے۔ اس کے علاوہ نت نئے تجربات کے بعد جو نمونے تیار ہوئے ہیں وہ زیادہ باربرداری اور تیز رفتاری کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اب انکو پیش نظر رکھتے ہوئے مزید ترقیاں عمل میں آ رہی ہیں۔ کوشش کی جائیگی کہ ہر قسم کا آرام حاصل کرنے کے علاوہ مسافر ہر قسم کے موسمی اثرات سے بچے رہیں۔

ایک متوسط درجے کی لمبائی چوڑائی کے ہوائی جہاز ‹وکرز وائکنگ› کا آرام دہ اندرونی حصہ۔ اس میں ۲۱ سے ۲۷ تک مسافر آسکتے ہیں۔

درگاہ شریف نظام الدین اولیاء

حضرت نظام الدین علیہ الرحمتہ کا آستانہ شریف شہر دھلی سے تقریباً چار میل کے فاصلے پر واقع ھے جو ہر مذھب و ملت کے عقیدتمندوں کے لئے ایک مقدس زیارت گاہ ھے۔ حضرت ۶۳۷ھ میں تولد ہوئے اور ۷۲۵ھ میں آپ نے وفات پائی۔ زندگی ہی میں آپکے عقیدت مند ملک بھر میں موجود تھے اور اب سوا چھ سو سال گذرنے کے بعد تو انکا شمار بھی مشکل ھے۔ آپ کے مزار مبارک پر ہر سال ربیع الثانی کے

دھلی میں حضرت سلطان المشائخ سید نظام الدین اولیاء علیہ الرحمتہ کی آخری آرامگاہ۔

حضرت سلطان اولیاء کا ایک عقیدت مند پھولوں کی ٹوکری مزار مبارک پر چڑھانے کیلئے مجاور کی خدمت میں پیش کر رہا ھے۔

مہینے میں سترہ تاریخ کو ایک بڑا بھاری عرس ہوتا ھے' جس میں دور دور سے آ کر لوگ شریک ہوتے ھیں۔ عرس کے موقعہ پر فاتحہ شریف کے علاوہ سب سے زیادہ اھمیت قوالی کو حاصل ھے۔ جس کا اھتمام درگاہ کے موجودہ سجادہ نشین شمس العلما حضرت خواجہ حسن نظامی فرماتے ھیں۔ موصوف خود بھی ایک معزز اور مقدس ھستی ہونے کے علاوہ صاحب علم و فضل ھیں۔

مہتاب -- ایک فلمی ستارہ ۔

ایثار

مصنفہ
قسطنطین طرینوف

مترجمہ
بشیر حسن

ٹینک چلانے والا الیکسی جس سڑک پر جا رہا تھا وہ اب خشک ہو چکی تھی۔ گھاٹیوں کی گذشتہ سال کی خشک گھاس میں سے ہری ہری گھاس پھوٹ رہی تھی۔ الیکسی چڑھائی چڑھنے لگا۔ یہاں ابھی تک خندقوں کے نشانات اور ٹوٹی ہوئی موٹر گاڑیوں کے ڈھانچے دکھائی دے رہے تھے۔ اسکو اپنا گاؤں بھی نظر آ رہا تھا۔ اوپر پہنچکر الیکسی سانس لینے کے لئے ٹھہر گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یہ تو اسے پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ گاؤں تباہ ہو چکا ہے اور راستے میں بھی اس نے بہت سے گاؤں اور قصبے تباہی کی حالت میں دیکھے تھے۔ اسکا اپنا گاؤں بھی اسی تباہی کا شکار بن چکا تھا جہاں سوائے ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں کے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اس نے اپنی آستین سے آنسو پونچھے جو اس کے زخمی رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔ جسطرح دشمن نے اس کے چہرے کو مسخ کر دیا تھا ٹھیک اسی طرح گاؤں کی بھی حیثیت بگاڑ دی تھی۔ گاؤں کی مرمت ہو سکتی تھی۔ جلے اور ٹوٹے پھوٹے مکانات سب نئے سرے سے بنائے جا سکتے تھے لیکن اسکے چہرے کا جو حال ہونا تھا ہو گیا اسکی درستی ناممکن تھی۔

یہ ہسپتال سے سیدھا اپنے گھر جا رہا تھا۔ یہ اس کو یاد نہ تھا کہ ہسپتال کیونکر پہنچا تھا۔ اس کو صرف اتنا یاد تھا کہ دریا کو پار کرنے والا وہ پہلا آدمی تھا۔

دریا پار کرتے ہی یہ اپنی ٹینک لیکر جرمنوں کے لشکر پر ٹوٹ پڑا جو اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ پھر اس نے اپنی ٹینک میں ایک آنکھوں کو خیرہ کرنے والا شعلہ دیکھا بس اس کو صرف اتنا ہی یاد تھا۔ یہ اس لڑائی کے انجام کو نہ دیکھ سکا۔ البتہ ہسپتال میں اسے مزید حالات معلوم ہو گئے تھے۔ اسکا چہرہ جھلس کر گوشت دکھائی دینے لگا تھا۔ ہسپتال میں اس کے چہرے پر کچھ اس کی اپنی اور کچھ کسی اور کی کھال چڑھا دی گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ٹانکے لگائے گئے تھے۔ دھات کا گلا لگایا گیا تھا اور مصنوعی آنکھ چڑھائی گئی تھی۔ یہ سب ہونے کے بعد اسے آرڈر آف لینن اور سونے کا تمغہ ہسپتال میں ہی عطا کیا گیا تھا اسکا گلا میٹھا ہوا تھا اور آواز بالکل بدل گئی تھی۔ اس کے چہرے کی ہیئت بالکل دگرگوں ہو گئی تھی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا تو اپنی شکل خود نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کی طرف ڈھلان پر سے اترا۔ اور جب ذرا آگے بڑھا تو اس نے ایک مرد کو دیکھا جو اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے کسانوں کو نہایت انہماک سے کچھ لیکچر دے رہا تھا۔ جب الیکسی اس شخص کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ تو اسکا پرانا دوست کھرتیش تھا وہ کھرتیش اور اس کے مجمع کے پاس پہنچا۔ ان میں کر بعض نے مڑ کر اسے دیکھا اور دل ہی دل میں کڑھنے لگے۔ الیکسی نے خاموشی سے سلام کیا اور رخصت ہو گیا۔ جب وہ ایک اور مجمع کے پاس سے گذر رہا تھا تو اس نے نسیا کا نام سنا۔ اس نام کو سنتے ہی غیر ارادی طور پر وہ ٹھٹک گیا اور اسکا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ان لوگوں کی گفتگو سنتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نسیا کا نام "اجتماعی کھیت" کے صدر کی حیثیت سے لیا گیا اب وہ وہیں جم گیا۔ یہاں سے اسے اپنی جھونپڑی بھی نظر آ رہی تھی۔ انتہائے شوق کا یہ عالم تھا کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ وہ قدم اور آگے بڑھا اور اسے سرکنڈے کے درخت کے نیچے جس کی شاخ ٹوٹی ہوئی تھی اپنی صاف ستھری نئے چھپر والی جھونپڑی دکھائی دی۔ یہ وہی جھونپڑی تھی جسے سوتے جاگتے آرام میں اور لڑائی میں دیکھا کرتا تھا۔ وہی دروازہ تھا جس میں وہ ہمیشہ داخل ہوا کرتا تھا۔ الیکسی نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ ایک کونے میں ایک ہل اور ایک ہتھوڑا رکھا تھا پیچھے کے کمپاؤنڈ سے ایک بوڑھی عورت اس سے ملنے آئی۔ یہ اس کی ماں تھی، جسے وہ اس کی آنکھوں سے پہچان گیا۔ "سلام" الیکسی نے اپنی کرخت آواز میں کہا۔

"سلام" عورت نے جواب دیا اور پوچھا کہ "کیا تم نسیا سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"میں نسیا اور آپ دونوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ دراصل میں الیکسی کے پاس کر ایک خوشی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

لڑکے کا نام سنتے ہی ماں کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور آنسو بھر آئے "ارے میرے بچے! اب کہاں ہے وہ تم اس سے کہاں ملے تھے؟ ہسپتال میں یا کہیں اور؟"

"ہاں میں اس سے ہسپتال میں ملا تھا اور ہم دونوں دوش بدوش لڑائی میں بھی ساتھ تھے۔ اس کے بیوی بچے کس طرح ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے سب اچھی طرح ہیں۔" یہ کہہ کر بڑھی عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہائیں یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ اسکی حالت اتنی خطرناک نہیں ہے۔ صرف معمولی سا زخم آیا ہے اسے بہت جلد ہسپتال سے چھٹی ملنے والی ہے۔ یہ تو بتائیے اس کے بیوی بچے ہیں کہاں؟" ایلکسی نے پوچھا۔

نسیّا تو تمام دن کھیت پر رہتی ہے اور کبھی اور کاموں میں رہتی ہے۔ سب مل کر اسے کچھ بنا رہے ہیں اور کل یا پرسوں سب کھیت پر بیج ڈالنے جائیں گے۔ میرا پوتا ستانی اوپا بھی ہر وقت اپنی ماں کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ صرف چھوٹی بچی ننا سا گھر میں ہے تم اندر آؤ۔ کچھ دیر آرام ہی کر لو"۔ یہ کہہ کر ماں نے دروازہ کھول دیا وہ دروازہ جسے وہ بچپن سے جانتا تھا اور اندر بلا لیا۔ اندر کی مانوس خوشبو اس کے لئے مشام روح سے زیادہ معطر تھی۔ کھڑکی کے نیچے ایک چھوٹی سی بچی بنچ پر بیٹھی چیتھڑوں سے کھیل رہی تھی۔ گو یہ بچی دبلی اور لمبی تھی مگر آنکھیں ہو بہو ماں کی طرح تھیں۔ اس لئے یہ پہچان گیا ورنہ پہچاننا مشکل تھا۔ سب سے پہلے وہ لڑکی کے پاس پہنچا۔ لڑکی کونے میں دبک گئی اور خوفزدہ آنکھوں سے اسے گھور گھور کے دیکھنے لگی۔

"ننھی ڈرو مت" دادی نے اسے سمجھایا "یہ تو تمہارے چچا ہیں ابا کے پاس سے آئے ہیں" "اور کھلونے بھی تو لائے ہیں" ایلکسی نے کہا اور فوراً اپنا تھیلا کندھے پر سے اتارا اور اس میں سے کھلونے وغیرہ نکالے جو ہسپتال میں بچوں کے لئے ملے تھے۔ بچی کو دینے چاہے مگر بچی نے نہ لئے وہ کسی قدر خوفزدہ ہو رہی تھی۔

"اے بچی آخر اسقدر پریشانی کی کیا بات ہے" دادی بولی "دیکھ تو سہی تیرے باپ کو تیرا کتنا خیال ہے تو بھی تو ہر وقت باپ کو یاد کرتی رہتی ہے" اور پھر ایلکسی کی طرف دیکھکر اس نے کہا "بس بچھونے سے اٹھتے ہی یہ باپ کی تصویر لے کر بیٹھ جاتی ہے اور جب تک کہ باپ کی تصویر کو پیار نہ کر لے کبھی سوتی نہیں۔ زراعت کے دفاتر میں باپ کی تصویر دیکھکر تو بس پھولوں نہیں سماتی تھی"

ایلکسی نے فیتوں اور کاغذ کے پھولوں سے سجی ہوئی اپنی تصویر دیکھی۔

"کیا اب بھی میرا بیٹا ایسا ہی لگتا ہے جو تصویر اس کی دفتر میں ہے۔ وہ بالکل اصل کی مانند ہے"

"دفتر تو وہی پرانی جگہ پر ہے نا؟"

"نہیں۔ جرمنوں نے سکول اور کتب خانہ وغیرہ سب جلا کر خاک کر دیا۔ اب ہم لوگوں نے پھر بنانا شروع کیا ہے۔ نسیّا بیچاری بھی رات دن اسی میں لگی رہتی ہے۔"

ایلکسی جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"اتنے جلدی کیوں جاتے ہو"۔

"مجھے نسیّا سے بھی تو ملنا ضروری ہے اسے ایک پیغام بھی پہنچانا ہے۔"

بازار میں پہنچکر اس نے لوگوں سے پوچھا کہ صدر سے کہاں ملنا ہو سکتا ہے مگر یقین سے کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ صدر صاحبہ مل کہاں سکتی ہیں۔ تاہم اس نے ہمت نہ ہاری وہ برابر ڈھونڈھتا رہا۔ اچانک ایک احاطے میں چار دیواری کے پیچھے سے ایک عورت کے قہقہے کی آواز آئی جسے سنتے ہی وہ ٹھٹک گیا۔ یہی تو وہ ہنسی کی آواز تھی جو ہوائی جہاز کی گھگھناہٹ اور بموں کے پھٹنے کی آوازوں میں اس کے کانوں میں گونجا کرتی تھی۔ ایلکسی اس احاطے کو خوب پہچانتا تھا یہ اس کے دوست پیول کا احاطہ تھا۔ وہ مڑا اور جلدی سے دروازے میں گھس گیا اور دیکھا کہ سامنے وہ کھڑی تھی اور پیول بھی پاس کھڑا تھا جسکے چہرے پر وہی نوجوانی کی خوشباش مسکراہٹ تھی۔ اب آہستہ آہستہ اس نے انکی طرف بڑھنا شروع کیا۔ جونہی نسیّا نے اسے دیکھا اسکی ہنسی ہمدردی سے بدل گئی۔ وہی ہمدردی جو وہ غیروں کے چہرے پر دیکھ چکا تھا۔ نسیّا کی یہ ہمدردی اس کے دل پر بجلیاں گرا رہی تھی۔ وہ اپنی بیوی سے ملنے آگے بڑھا اس سے ملنے کے انتظار میں نسیّا کی کمانی دار بھوئیں تعجب سے اوپر کو چڑھ گئیں۔ یہ بات کرنی چاہتا تھا مگر زبان یاری نہ دیتی تھی۔

آپ ... ... ہی ..... نسیّا ہیں" اس نے پوچھا۔

"جی۔ کیا بات ہے؟"

کئی لمحوں تک وہ اس کے چہرے کو محو حیرت دیکھتی رہی۔ کیا خوفناک لمحات تھے وہ جن پر اسکی زندگی کے بننے اور بگڑنے کا دار و مدار تھا۔

"میں آپ کے پاس ایک خط اور خوشی کا پیغام لایا ہوں"۔

"کس کے پاس سے"

"ایلکسی کے پاس سے جو ہسپتال میں ہے"

ایلکسی کا نام سنتے ہی اس کی بیوی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ایلکسی نے جیب سے وہ خط نکالا جو اس نے سٹیشن پر لکھا تھا اور سراسیمہ ہو کر اپنی بیوی کو دیدیا۔ بیوی نے جلدی سے خط پڑھکر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اس نے اپنے آخری خط میں یہ لکھا تھا کہ وہ ہسپتال سے تھوڑی سی چھٹی لے کر گھر آئے گا" بیوی نے افسردگی سے کہا "لیکن اب اس نے لکھا ہے کہ وہ پھر محاذ پر جا رہا ہے آپ کون ہیں کیا آپ بھی اس کے ساتھ ہی ہسپتال میں تھے"

"ہاں ہم دونوں ساتھ تھے۔ ہم دونوں لڑائی میں ایک ہی ساتھ زخمی ہوئے تھے"

"تو آپ دونوں لڑائی کے ساتھی ہیں"

"جی ۔ میرا مطلب ہے کہ ہم دونوں ایک ہی ٹینکوں کے دستے میں تھے" ایکے
معمولی ساز خم آیا۔"

"اور آپ کے ؟"

" میں جل گیا تھا جیسا آپ دیکھ رہی ہیں مگر ہسپتال والوں نے مجھے
ٹھیک کر ہی دیا۔" اسی اثناء میں کچھ اجتماعی کسان لسیّا سے کسی مسئلے پر
گفتگو کرنے آئے ۔اس نے فوراً انھیں کچھ ضروری ہدایات دیکر رخصت کیا
اور پھر الکیسی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی "میرے خاوند کے ساتھی اب آپکا
کہاں کا ارادہ ہے ؟"

میں ..... اپنے ..... گھر ..... ڈون لبتی میں جاؤں گا۔ میں تو صرف
یہاں یہ خط اور خوشخبری دینے اترا تھا۔"

" میں آپ کی خاطر خواہ تواضع نہ کر سکی ۔اور نہ آپ کے ساتھ زیادہ
وقت گذار سکی ۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ موجودہ حالات دیکھتے ہوئے
مجھے ضرور معاف کر دینگے ۔ بہر حال ہمیں کچھ باتیں تو کرنی چاہئے ہیں ۔کیا
آپ ہمارے گھر چلکر کچھ دیر آرام نہ کریں گے ؟"

" آپکی مہمان نوازی کا شکریہ لیکن مجھے ابھی اسٹیشن پر جانا ہے
ورنہ میں شام کی گاڑی سے سوار نہ ہو سکوں گا۔"

" مگر آپ دوسری ٹرین سے بھی تو جا سکتے ہیں ۔اتنی دیر آرام کر لینے میں
کیا مضائقہ ہے ۔میں ابھی آپ کو اپنے ساتھ لے چلتی ہوں ۔گھر یہاں سے
قریب ہی ہے ۔"

" آپ کے گھر تو میں پہلے ہی ہو آیا ہوں ۔"

" یہ تو اور بھی اچھی بات ہے ۔تب تو میں دفتر بھی جا سکتی ہوں ۔ آپکو
میرے ساتھ پیدل چلنے میں تو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ راستے میں ہم باتیں
بھی کرلیں گے ۔"

لیکن راستے میں لسیّا کے ملنے والوں کی وجہ سے ان دونوں کو باتیں
کرنی مشکل ہو گئیں ۔ راستے میں بہت سے لوگ ایسے ملے جنھیں الکیسی عرصے
سے جانتا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا جس وجہ سے
دوران جنگ میں پہلی بار الکیسی کو یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے ہی وطن میں
غریب الوطن ہے ۔کبھی کبھی لسیّا کو بھی کن انکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا جس کا
چہرہ اب پہلے ہی جیسا بشاش اور منور معلوم ہوتا تھا ۔آنکھوں میں وہی چمک
تھی اور لبوں پر مستقل مزاجی کی مسکراہٹ تھی ۔ یہ دیکھکر الکیسی کے دل کا
بوجھ بہت کچھ ہلکا ہو گیا تھا ۔

دفتر میں اس نے اپنی رنگین تصویر دیکھی مگر اب تصویر میں اور اس میں
زمین اور آسمان کا فرق آ چکا تھا ۔تصویر میں جوانی تھی ، مسکراہٹ تھی ۔
رخساروں پر سرخی تھی اور گھونگر والے بال تھے اسکو یہ احساس ہو رہا تھا کہ گویا اسکی
تصویر زبان حال سے اس کی حالت پر خندہ زن ہے ۔

" آپ ایلائی آدشا (الکیسی) کے دوست اور لڑائی کے شریک ہیں" ۔
لسیّا نے سب سے تعارف کراتے ہوئے کہا ۔

سب نے اسے مصافحہ کرنے اور حالات پوچھنے کے لئے گھیر لیا ۔ان
میں سے اکثر کو یہ خوب جانتا تھا ۔

اسی اثناء میں اجتماعی کسانوں کی ایک جماعت نے بہت سے
معاملات طے کرنے کے لئے لسیّا کو چاروں طرف سے گھیر لیا ۔

الکیسی بغیر کسی سے ملے جلے خاموشی کے ساتھ وہاں سے چل پڑا اکسی
کو بھی اس کے جانے کا احساس نہ ہوا اس کی آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی اور دل
بیٹھا جا رہا تھا ۔

جب وہ کنوئیں کے پاس سے گذر رہا تھا تو ایک بچے نے اسے پکارا ۔
" سپاہی کیا تم ہی میرے باپ کے پاس سے آئے ہو؟" یہی اسکا چھ سالہ
لڑکا ستاشی ادیا تھا ۔اسکا چہرہ اب پہلے سے نحیف معلوم ہوتا تھا ۔
ہونٹوں پر پیاری پیاری دھاریاں پڑی ہوئی تھیں ۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
انھیں وہ جدائی کا وقت یاد ہے جب یہ اپنے باپ سے لپٹ گیا تھا آنسوؤں
سے چہرہ تر تھا اور رو رو کر کہہ رہا تھا " ابا ابا لڑائی سے جلدی آنا ۔"

یہ دونوں گھر کی طرف مڑے ۔راستے میں الکیسی نے پوچھا "تم نے یہ کیسے
جانا کہ میں تمہارے باپ کے پاس سے آیا ہوں ۔"

" اس لئے کہ دادی اماں کہہ رہی تھیں کہ کوئی خوفناک چہرے والا
آدمی ابا کے پاس سے آیا تھا ۔

" کیا میرا چہرہ خوفناک معلوم ہوتا ہے ؟"

" نہیں ۔ خوفناک تو صرف نازی ہیں ۔انھوں ہی نے تو تمہارے
ساتھ یہ سلوک کیا ہوگا ۔"

" ہاں نازیوں نے ۔"

" تم ابا سے ملے تھے ۔"

" وہاں ملا تھا ۔"

" اور تم نے ابا کا اعزازی تمغہ اور ستارہ بھی دیکھا تھا ۔"

" ہاں ۔"

" تمہارے پاس بھی تو اعزازی تمغہ ہوگا نا ؟ ابا کیا جلدی گھر آئینگے ؟"

" تم انھیں بہت یاد کرتے ہو ۔"

" بے شک ۔"

کیا تمہیں یاد ہے جب وہ لڑائی پر گئے تھے ۔"

" جناب آپ کیا سمجھتے ہیں! میں تو بہت رویا تھا۔ انھوں نے مجھے اُچھالا اور چکر دیئے مگر میں روتا ہی رہا کیونکہ مجھے جب تک یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ وہ اتنے بڑے بہادر بننے والے ہیں۔ اس کے علاوہ سب رو رہے تھے۔ صرف نتاشا تو روئی نہیں کیونکہ اُسے معلوم ہی نہیں کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ جب جرمن یہاں تک بھی آ گئے تب بھی وہ کچھ نہیں سمجھی۔"

گھر پہنچکر الیکسی نے ستائی اوپا کو باپ کے بھیجے ہوئے تمغے دیئے اور پھر یہ دونوں کھیت میں چلے گئے۔ آج سے دو سال قبل جب وہ ان کھیتوں سے رخصت ہو رہا تھا تو یہ اناج کا سنہری لہریں مارتا ہوا سمندر تھا جس کی بالیں اسے لمبے اور خطرناک سفر پر جاتے ہوئے جھک جھک کر سلام کر رہی تھیں۔ اب یہ کھیت تک فاصلہ طے کر کے پہنچا اور کھیت کی مالوس پگڈنڈیوں پر سے چلا۔ وہی بالیں پھر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ یہی ان کا ذکر تھا یہی ان کا آنا تھا دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے اور ایک دوسرے کا خیر مقدم کر رہے تھے۔ اس تمام وقت میں ستائی اوپا اس سے اپنے باپ کے کارناموں کے قصے سنتا رہا۔ اس نے بہت اختصار سے کام لیا لیکن جب اس نے لڑکے کے چہرے کو دیکھا تو اسکا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔ جب الیکسی قصہ ختم کر چکا تو لڑکے نے اپنے رخسار کو الیکسی کے کوٹ سے رگڑتے ہوئے کہا کہ "میں انتقام ضرور لوں گا۔"

الیکسی اب یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کی ٹانگیں اسے گھر سے دور لے جانے میں اسکا ساتھ دینگی! الیکسی نے اب ایک پھاوڑا اٹھایا اور اپنے باغیچے میں نئے پودے لگانے کے لئے گڑھے کھودنے شروع کئے۔ اس عرصے میں اس کی ماں اس سے ملنے کے لئے آئی۔ "بیٹا! میں تم کو دروازے میں سے دیکھ رہی تھی کیا بتاؤں مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے میرا ایلائی اوشا (الیکسی) کھڑا ہے۔ تمہاری مونچھ اور تمہارے کام کرنے کا طریقہ بالکل میرے بیٹے سے ملتا ہے۔ بیٹا کیا تمہارے بیوی بچے ہیں"؟

"ہاں اور میری ماں بھی ہے۔"

"کتنی خوش ہوگی وہ جب تم اس سے ملو گے۔ اب بیچاری تمہاری جدائی میں آنسو بہا رہی ہوگی۔"

"لیکن میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا میں چاہتا ہوں کہ بیچاری اپنی باقی زندگی آرام سے گذار دے۔"

"لیکن بھائی! جب دل صدمے سے بجھ جائے تو آرام کہاں۔"

"مگر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے تو بہرحال دل کا بجھنا بہتر ہے۔"

"ہاں...... ہوگا! رونا تو اس دن کا ہے جس دن میں نے اسے ایسے بُرے دن دیکھنے کے لئے جنا تھا"۔ بڑھی عورت نے آہ بھر کر کہا۔

"اس نے تو یہ دن اپنے ملک کی عزت بچانے اور ملک کو جرمنوں سے نجات دلانے کے لئے دیکھا ہے۔"

اس پر بڑھی عورت نے اپنے آنسو آستین سے پونچھتے ہوئے کہا "جانے دو اس قصے کو اور آؤ بیٹا کھانا کھاؤ۔"

"لیکن یہ تو بتائیے لسیا میکھے لوانا کہاں ہے؟"

"اکثر وہ شام کو گھر نہیں آتی اور کئی دفعہ بغیر کھانا کھائے ہی چلی جاتی ہے۔"

"میں ابھی آتا ہوں۔ ایک سیب کا درخت اپنی یادگار چھوڑنے کے لئے لگا دوں۔"

ماں چلی گئی اور الیکسی درخت کے لئے گڑھا کھود کر باغیچے میں کیاریاں کھودنے لگا جب شام ہونے آئی تو اس نے لسیا کو پتول کے ساتھ احاطے میں آتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ دونوں احاطے کے کونے میں بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس کے کانوں میں اس کی بیوی کے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ ان دونوں نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا تھا۔ باتیں کرنے کے بعد پتول چلا گیا اور لسیا گھر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ستائی اوپا بھاگتا ہوا اسے کھانے پر بلانے کے لئے آیا۔ جب یہ گھر پہنچا تو لسیا کو جلدی جلدی کھانا کھاتے دیکھا۔ اب اس کی بیوی نے اس سے الیکسی کی صحت اور موجودہ کیفیت کے متعلق تفصیل سے حالات پوچھنے شروع کئے۔

"لیکن آپ اسے اتنے کم خط کیوں لکھتی ہیں؟"

"مجھے فرصت کم ملتی ہے۔" اس نے ترش روئی سے جواب دیا۔

"لیکن آپ کو جتنے خط لکھنے چاہئیں اتنے نہیں لکھتیں۔"

"آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم لوگ آجکل کتنے عدیم الفرصت ہیں۔ بس ہوا کی طرح دن گذر جاتا ہے۔"

ان باتوں کے دوران میں کسی تکلیف دہ خیال سے الیکسی کی آواز بھرّا گئی جب اس نے کہا: "لیکن آپ کو احاطے میں ہتوڑے پر بیٹھ کر باتیں کرنے کا خوب وقت مل جاتا ہے!"

اس خیال کے ساتھ وہ اپنی معمول سے زیادہ بھرائی ہوئی آواز میں کہتا چلا گیا: "خیر! آپ کی مہمان نوازی کا شکریہ! اب میرے اسٹیشن جانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

"اتنی دیر سے اب جانے کی کیا ضرورت ہے؟" لسیا نے اب نرم لہجہ میں کہا "ذرا باہر کی طرف دیکھئے شام ہو گئی ہے آج رات ہمارے مہمان رہئے۔"

بیچارہ الیکسی گھر چھوڑنے کی تیاری کر رہا تھا مگر ستائی اوپانے آکر اسے

پکڑلیا اور رات کو ٹھہرنے اور اپنے باپ کے متعلق مزید حالات سنانے کے لئے مجبور کرنے لگا۔

"آپ نے دیکھا" نسیا نے کہا" اور میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اس کے بارے میں کچھ اور باتیں سنوں۔ آج تو ٹھہر ہی جایئے۔" اس نے نرمی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا جبکہ وہ دروازے میں سے گذر رہی تھی۔" میں آپ کو کسی طرح خدا حافظ کہنے کو تیار نہیں ہوں۔"

کچھ دیر بعد رات ہوگئی۔ الیکسی کی ماں نے اسکا بستر تیار کر رکھا تھا وہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا لیکن جونہی وہ بستر پر لیٹا، نسیا کی بستر پر جاتے وقت پیروں کی آواز آئی۔

اس نے آدھی رات تک سونے کی کوشش کی مگر اسے نیند نہ آئی وہ اپنے بستر سے اٹھکر سننے لگا۔ اس نے نسیا کے کروٹیں بدلنے کی آواز سنی کیونکہ وہ بھی اب تک جاگ رہی تھی۔ پھر اس نے نسیا کی سرد آہ کی آواز سنی۔ اسکے لئے بغیر کسی کے معلوم ہوئے چلے جانا ناممکن تھا وہ اپنے بچوں اور ماں کے سانس کی آوازوں کو بھی پہچان رہا تھا۔ ان کا کیا حشر ہوگا۔ بچوں کے خیال سے کوئی ٹیس نہیں نکتی تھی بلکہ وہ ایک درد تھا لامتناہی ایسا درد جو رات کی طوالت کے ساتھ طول کھینچ رہا تھا۔ آخرکار موسم بہار کی چھوٹی رات ختم ہوئی اور صبح کی مدھم روشنی نمودار ہونے لگی۔ اب بستر سے اٹھنے کا وقت ہوگیا تھا۔ پہلے ماں اس کے بعد نسیا اٹھی۔ الیکسی پردے کے پیچھے سے اٹھکر آیا اور سب کو صبح کا سلام کیا۔

"آپ اتنے سویرے سے کیوں اٹھ گئے ابھی کچھ دیر اور آرام کر لیتے۔" نسیا نے کہا۔

"انھیں آرام کی نیند کہاں آسکتی ہے پرایا گھر نئی جگہ" ماں نے سرد آہ بھر کر ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"ہم تم کو اسٹیشن تک پہنچا دینگے۔" نسیا نے کہا۔

"اب سٹیشن تک آپ کہاں جائیں گی۔" الیکسی نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

"آپ تو بارہ میل کا فاصلہ طے کر کے ہم سے ملنے آئے۔" نسیا نے کہا "اور اس کے علاوہ مجھے سٹیشن پر کچھ کام بھی ہے۔ پیول رات کو یہاں آیا تھا۔" اس نے ماں کی طرف مڑ کر کہا۔" اور کہتا تھا کہ اسکو ضلع کے صدر مقام جانا اشد ضروری ہے۔" پھر اس نے الیکسی کی طرف مخاطب ہو کر کہا" اب کچھ ناشتہ کرلو۔ تھوڑی دیر میں پیول گھوڑا لے کر آنے ہی والا ہے۔"

اب الیکسی اور نسیا میز پر بیٹھ کر جلدی جلدی بغیر بات کئے کھانے لگے۔ الیکسی کی ماں گھر کے کاموں اور اس کے ناشتہ دان میں کھانا بھرنے میں مصروف ہوگئی۔ اب ستائی اوپا بھی اٹھ گیا تھا۔

"اچھا ستائی اوپا خدا حافظ" الیکسی نے کہا" مجھے بھول نہ جانا۔ شاید پھر ملیں۔"

"آپ جا کیوں رہے ہیں" ستائی اوپا نے آزردہ ہو کر کہا۔

"تم آخر یہ کیوں سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ یہیں رہیں گے" نسیا نے ہنسکر کہا۔

"ہاں" ستائی اوپا نے ضد سے کہا" کم از کم ابا کی واپسی تک تو یہیں رہیں گے۔"

"اپنے ابا کی واپسی تک تم خوب بڑے ہو جاؤ" الیکسی نے کہا۔

"اور باپ کی طرح ایک ہیرو بھی ہو" دادی نے بات کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے یہاں آنے اور اچھی خبریں سنانے کی میں بہت شکر گزار ہوں" نسیا نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

اب ان آنکھوں میں پہلا سا وہ رحم یا غیریت نہیں تھی بلکہ افسردگی آمیز یگانگت تھی۔

پھر خوشی اور روح فرسا رنج کے ملے جلے جذبات سے الیکسی کا سر چکرانے لگا۔ وہ سوتی ہوئی لڑکی کے پاس گیا۔ اس کے ننھے سے چہرے کو جھک کر بہت دیر تک پیار کرتا رہا پھر رونا ضبط کرتے ہوئے ستائی اوپا کی طرف مڑ کر بولا" ستائی اوپا خدا حافظ" یہ الفاظ اس نے بڑی مشکل سے ادا کئے اور جس طرح وہ دو سال پہلے کیا کرتا تھا بچے کو ہوا میں اچھالا اور چکر دینے لگا۔

اس کی یہ حرکت دیکھ کر نسیا پہچان گئی اور چلا اٹھی" ایلائی اوشا"

اپنی بیوی کی زبان سے اپنا نام سن کر الیکسی نے ستائی اوپا کو زور سے پکڑ لیا جیسے کوئی گرتا ہوا کسی کا سہارا لیتا ہو اور گردن ڈال کر کھڑا ہوگیا۔ نسیا دوڑ کر اس کے پاس آئی اور تمغوں سمیت قمیص پھاڑ کر اپنے چہرے کو اس کے ننگے سینے پر رکھ کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"تم ہی ایلائی اوشا ہو! میری جان و دل کے مالک! میرے سب سے زیادہ پیارے تم ہی ہو!" نسیا نے آہ بھر کر کہا اور الیکسی کے چہرے پر ہاتھوں پر اور سینے پر لگاتار پیار کیا۔

ستائی اوپا بھی رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر الیکسی کی ماں گھبرائی ہوئی دوڑ کر آئی اور خوفزدہ ہو کر دروازے میں ٹھٹک گئی پھر یہ منظر دیکھ کر اس نے بھی ایک چیخ ماری اور الیکسی کے قریب زمین پر گر پڑی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"میرے چاند! میرے لاڈلے! تو نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائی ہیں"

"خدا کا شکر ہے اب مشکلیں ختم ہوئیں" نسیا نے آہستہ سے کہا

"کیوں جی تم نے ہمیں بتایا کیوں نہیں کہ تم ہی الیکسی تھے اور پھر ہمیں چھوڑ کر

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

اور اُس نے
لائف بوائے کی
عادت سیکھی ہے!

وہ اِس وقت بہت کچھ سیکھ رہا ہے لیکن زندگی میں لائف بوائے صابن کے روزانہ استعمال کی عادت سے زیادہ کوئی چیز کام نہیں آئے گی۔ اُس کی ماں خوش ہے، اور اُسے فخر ہے کہ اس نے گرد و غبار کے اس خطرہ کے متعلق سبق دیا ہے جو ہر جگہ غیر محتاط آدمیوں پر حملہ کرنے کیلئے تیار ہے۔

LIFEBUOY
SOAP

لائف بوائے ایک اچھا صابن ہی نہیں بلکہ
ایک اچھی عادت ہے۔

L.7.L.80 UD

LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

چانکیہ کا نظریۂ سیاسی

عبدالحمید نظامی

چوتھی صدی قبل مسیح کے آخری سال پراچین ہندوستان کی تاریخ میں ایک ہنگامہ خیز اہمیت رکھتے ہیں۔ سکندر اعظم اپنی فتوحات کے نشہ میں چور مصر ایشیائے کوچک فارس اور افغانستان کو لتاڑتا ہوا پنجاب کے کھلے میدانوں تک آنکلا مگر ہندوستان کے جری بہادروں نے ستلج کے اس پار جانے کا موقع نہ دیا۔ دوسرے لفظوں میں صرف ہندوستان ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں سکندر جیسے آزمودہ کار فاتح کو مقابلے کی ٹکر کا سامنا کرنا پڑا اور اپنے دانت کھٹے ہوتے دیکھ کر ستلج کے اس کنارے سے ہی واپس لوٹ جانا پڑا۔ اس کے چلے جانے کے بعد جتقدر یونانی قوت ہندوستان کے مختلف حصوں پر غالب رہ گئی تھی اس کو چندرگپت موریہ نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور ایک مضبوط سلطنت کی بنیاد رکھ کر ہندوستان کی سیاسی طاقت کو منظم کیا۔

چندرگپت کا عہد حکومت ایک سنہری زمانہ ہے۔ اس لئے نہیں کہ تاریخ کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہ اس زمانے میں ہندوستان کی ایک زبردست سیاسی شخصیت چانکیہ کا پتہ چلتا ہے چندرگپت کی ساری عظمت و شوکت اسی سیاستداں کی مرہون منت ہے۔ یہ چندرگپت کا منتری یعنی وزیر اعظم تھا محض اسی کی رہنمائی اور سیاسی افکار نے اس زمانہ کو زریں عہد کہلانے کی ناموری بخشی۔

چانکیہ یا کوٹلیا وشنوگپت (تینوں نام سے مشہور ہے) کی پیدائش اور موت کی تاریخ کا تعین ذرا مشکل ہے صرف روایات سے پتہ چلتا ہے اس نے اپنا مشہور عالم سیاست نامہ ارتھ شاستر ۳۰۰ - ۳۲۱ قبل مسیح کے درمیانی عرصہ میں مرتب کیا ہے۔

ارتھ شاستر چانکیہ کی وہ بلند پایہ سیاسی تصنیف ہے جس نے مصنف کو بقائے دوام بخشی۔ اور یہی کتاب آگے چل کر چندرگپت کا دستور حکومت بنی۔ اس کی ترتیب و تدوین میں (بقول مصنف) پراچین شاستروں سے مدد لی گئی ہے گویا یہ آریہ ورت کے قدیم فلسفی سیاست دانوں کے افکار و نظریات کا بہترین خلاصہ ہے۔ اور اس کی اہمیت اس لحاظ سے اور بڑھ جاتی ہے جب پراچین ہندوستان کے فلسفۂ سیاست کے علاوہ چندرگپت کے عہد حکومت کا پورا پورا تاریخی خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ گویا یہ ایک تاریخی ماخذ بھی ہے۔

اپنی اس تصنیف میں چانکیہ بڑی شان سے جلوہ گر ہے اور اس کے سیاسی عقائد کا پورا پتہ چلتا ہے۔ پراچین عہد کے سیاست دانوں کے برعکس چانکیہ کا رجحان نظریاتی کم اور عملی زیادہ ہے۔ نیز وہ افلاطون کی طرح صرف تصورات کے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے نہیں مارتا بلکہ بڑی سادگی کے ساتھ حکومت کی مشینری چلانے کے لئے قابل عمل اور موٹے موٹے اصول وضع کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا یہ دستور حکومت دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کے اس قدیم سیاستداں نے دو ہزار برس پہلے برطانوی فلسفی تھامس ہابس (Thomas Hobbes) کے نظریہ "زبردست مچھلی" (Lagic of fish) کی پیش بینی "متسیا نیاؤ" (بڑی مچھلی کا انصاف) کے نظریہ سے کی ہے۔ گویا مغربی فلسفی کسی طرح سے ضرور چانکیہ کے نظریہ سے متاثر ہے۔

متسیا نیاؤ کا یہ مطلب ہے کہ جس طرح سمندر میں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں اسی طرح غیر منظم حکومت میں طاقت اور انصاف کا استعمال ناجائز طور پر ہوتا ہے۔ ہر طاقتور کمزور کے حقوق کو ہڑپ کر جاتا ہے اور اپنی آسودگی اور خوشحالی کی بنیاد کمزور کی ہڈیوں پر استوار کرتا ہے۔

اس نظریہ کی چانکیہ اس طرح تشریح کرتا ہے:- "پراچین آریہ ورت میں کوئی اچھا راجہ نہ ہونے کے باعث ملک میں بدعملی پھیل گئی اور جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اسی طرح زبردست کمزور پر ہاتھ صاف کرنے لگا۔ جب حد سے زیادہ ظلم و ستم بڑھ گیا تو لوگوں نے منو کو اپنا راجہ منتخب کر لیا۔ راجہ کے خرچ اخراجات کے لئے زمین کی پیداوار یعنی غلہ کا چھٹا حصہ اور تجارت کے منافع کا دسواں حصہ مقرر کیا تاکہ راجہ اس معاوضہ پر ملک میں امن بحال رکھنے اور رعایا کو دشمن کے حملوں سے بچانے کا ذمہ لے سکے۔ اور رعایا کی ان بداعمالیوں کا بھی جواب دہ ہوگا جو واجبی لگان اور عدل و انصاف کے اصول ٹوٹ جانے سے پیدا ہو جایا کرتی ہیں۔

چانکیہ کا دستور سیاسی مکر و فریب اور ہر غیر روادارانہ پالیسی سے بالکل پاک ہے۔ اس نے اس کی بنیاد زندگی کی اعلیٰ اخلاقی قدروں پر رکھی ہے۔ جب وہ کسی راجہ کو ایک کامیاب حکمراں بننے کے لئے گر سکھاتا ہے تو ان ہدایات کو سامنے پیش کرتا ہے:-

"راجہ کے لئے لازمی ہے کہ وہ عورت ذات کی عزت کرے اور کسی قسم کی دست درازی نہ کرے ہمیشہ راست باز رہے۔ برے طور و طریق سے سختی سے پرہیز کرے نظام حکومت کے فن کو سمجھنے کے لئے شہزادوں کی تربیت ضروری ہے۔ راجہ کو ہرگز حریص بن کر زر اور زمین نہ کھینچنی چاہئے۔ مقتولوں کے بیوی بچوں کو لونڈی غلام مت بنائے۔ مفتوحہ علاقوں کو

نوٹ:- اس مضمون کی ترتیب میں ڈاکٹر ہارون شروانی کی انگریزی کتاب (Muslim political thought and administration) سے مدد لی ہے۔

حدودِ سلطنت میں ملحق کرنے کی پالیسی ترک کرے۔ بلکہ شکست خوردہ کو یا مقتول راجہ کے کسی لائق وارث کو جیتا ہوا ملک واپس کر دے۔"

وہ ہر فرمانروا میں ان تین شکتیوں کا ہونا نہایت ضروری سمجھتا ہے:۔ پہلی شکتی منتر شکتی (صاحب الرائے ہونا) دوسری پربھو شکتی (شاہانہ وقار وطاقت) تیسری اُتساہ شکتی (ذاتی جرأت وطاقت) ہے۔ یہ تینوں شکتیاں علم۔ فوج۔ خزانہ اور راجہ کی ذاتی طاقت کا مظہر ہیں۔ اس ضمن میں چانکیہ قدیم فلسفیوں کے نظریوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ پربھو شکتی کی نسبت اُتساہ شکتی پر راجہ کو زیادہ بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

چانکیہ (جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے) کا نظریہ سیاسی ایک عملی سیاستداں کا نظریہ ہے۔ اس کا مقابلہ اگر میکیاولی اور افلاطون کی فلسفی بوطیقی سے کیا جائے تو اس کو ان پر فوقیت حاصل ہوگی کیونکہ اس کے اصول اور نظریات بالکل سامنے اور عمل میں بالکل آسانی سے لائے جا سکتے ہیں ان میں مغربی سیاست دانوں کا محض مادی اور تعصب انگیز رجحان نہیں پایا جاتا۔

چانکیہ بھی توسیع مملکت کا قائل ہے مگر یہ استعماریت کسی ذاتی نفع کے لئے نہیں ہے عدل وانصاف کو قائم رکھنے کے لئے ہے۔ وہ اس کی ترغیب یوں دیتا ہے:۔

"اپنے زورِ بازو سے فتح پاکر یا کسی غاصب سے چھین کر یا ورثہ سے حاصل کر کے سلطنت کی داغ بیل ڈالی جا سکتی ہے۔ ایک فاتح راجہ کو مفتوح راجہ کے نیک اوصاف کو نظرانداز نہ کرنا چاہیئے۔ اہل علم۔ محتاج اور بہادر انسان کی حمایت کرنا راجہ کا پہلا فرض ہے۔ بے یار و مددگار اور مصیبت زدہ کو اس کی مصیبتوں سے نجات دلانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ مفتوحہ لوگوں میں ہر دل عزیز بننے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے رسم و رواج کا پورا احترام کیا جائے۔ اگر ان عوام کے دیوی دیوتاؤں سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کیا جائے تو رعایا کا دل راجہ کی مٹھی میں آجائے گا۔"

چانکیہ کے نزدیک "سزا" کا ہونا بہت ضروری ہے۔ راجہ کو صرف نیک دل ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ انصاف کا توازن پورا رکھنا اس کا پہلا فرض ہے۔ سزا جرائم کو ختم کرتی ہے اور سیاسی اور سماجی نظام کو برقرار رکھنے کی ضامن ہوتی ہے بشرطیکہ مبنی بر عدل ہو۔ بلا وجہ اور حد سے زیادہ سزا دینا ظلم کہلاتا ہے مگر بہت زیادہ نرمی کا سلوک بھی حکومت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ وہی راجہ احترام کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا جس نے جرم کی حیثیت کے مطابق سزا دی ہو۔ جرائم سے چشم پوشی عدل کا خون ہوگا اور مت سیانیا وکا راج قائم ہو جائے گا۔

چانکیہ نے اس نظریۂ سزا وجزا کو راج نیتی میں بہت اہمیت دی ہے اس نظریہ کی اہمیت اس وقت اور واضح ہو جاتی ہے کہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغربی سیاستدانوں نے بھی یورپ کے لئے اصلاحی پروگرام بنایا تو "سزا و جزا" کو ایک بہترین آلہ تصور کیا۔

چانکیہ کا ارتھ شاستر واقعی ایک ایسا دستور سیاسی ہے جس میں ایک آئینی ریاست (Constitutional State) قائم کرنے کے لئے بلند پایہ اصول مل سکتے ہیں۔

غزل

سیّد ضامن علی

دمِ آخر سلاسل سے نہ ٹانکے زخمِ تن کوئی
نہ بہلائے سونگھا کر بوئے زلفِ پرشکن کوئی

اسیروں سے کہے کیوں حال خوش باش چمن کوئی
کلیجہ منہ کو آتا ہے نہ لے نامِ وطن کوئی

ہجوم یاس و حرماں ہیں نشانِ دل نہیں ملتا
نہ ہوگی بے چراغ ایسی جہاں میں انجمن کوئی

یہاں کیونکر کریں لطف جراحت تیغ و زخم تن
دہاں بے زباں کوئی زبان بے دہن کوئی

مزاج عشق سے شوریدگی جاتی رہی شاید
سرِ وادیٔ وحشت پھر نہ آیا کوہکن کوئی

ٹھکانا ہے نہ دنیا میں عدم میں اور نہ محشر میں
خدائی میں نہ ہوگا مجھ سا آوارہ وطن کوئی

نمایاں یوں نہ ہر تصویر ہوتی بزمِ امکاں میں
پسِ پردہ ہی لیکن ہے شمعِ انجمن کوئی

جمال حق وہ کیا دیکھیں گے جو خود کور باطن ہیں
مری آنکھوں سے دیکھے شوخیٔ رنگ چمن کوئی

ہمیں ضامن جو ہستی و عدم دونوں میں رہنا ہے
بتاؤ تو سہی کس کو کہے اپنا وطن — کوئی

(مرسلہ مجیب خیرآبادی)

لنکا

مول چند گگرنا

لنکا کے جزیرہ کا رقبہ ۲۵،۳۳۲ مربع میل ہے۔ اور یہ قریب قریب ہالینڈ اور بلجیم کے مجموعی رقبہ کے برابر ہے۔ یہاں کی آبادی ۶۰۰۰۰۰۰ ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے اصل میں یہ مغربی گھاٹ کا ایک حصہ ہے جسے ایک آبنائے نے گھاٹ سے علیحدہ کر دیا ہے۔ یہ آبنائے ۲۲ میل چوڑی ہے۔ اور اس میں بہت سے نیچے جزیرے اور ریتیلے حصے ہیں اور اس لئے ۲۲ میل چوڑی اس آبنائے میں جہاز رانی کے قابل صرف ایک راستہ ہے

آب و ہوا، زراعت اور صنعت

لنکا خط استوا سے قریب ہے اور اس جزیرے بڑی حد تک اس کی آب و ہوا پر اثر ڈالا ہے۔ یہاں بارش بہت ہوتی ہے اور گو آب و ہوا گرم ہے لیکن بہت سخت نہیں اور اس لئے زراعت کے لئے بہت موزوں ہے۔

لنکا اپنے مسالوں اور ناریلوں کے لئے مشہور ہے اور یہ دونوں چیزیں لنکا سے دوسرے ملکوں کو جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یورپ کے لوگ یہاں قہوہ کی کاشت بڑی تجارتی پیمانہ پر کیا کرتے تھے لیکن اب قہوہ کی جگہ چائے نے لے لی ہے۔ اور اس چائے کا شمار دنیا کی بہت اچھی چائے میں ہوتا ہے۔ ربر کی کاشت بھی اب رفتہ رفتہ بڑھ رہی ہے اور تجارتی نقطۂ نظر سے اس کا مستقبل بہت روشن ہے۔

آبادی

لنکا کی آبادی میں مختلف عناصر کا میل ہے اور یہاں کے موجودہ سنگھالی باشندے مختلف نسلوں کے میل جول سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہاں کے اصل باشندے ویدا نسل کے لوگ تھے لیکن مختلف زمانوں میں دراوڑ قوموں اور آرین نسلوں کے لوگ کثرت سے یہاں آتے رہے اور ان آنے والوں کا خون سنگھالی لوگوں میں شامل ہوتا رہا۔ ہندوستان سے لنکا میں آکر بسنے کا سلسلہ ہر زمانہ میں جاری رہا ہے یہاں تک کہ یہ اب تک جاری ہے۔ لیکن اس کا سب سے زیادہ زور اس وقت ہوا جب یورپ کے آبادکاروں نے یہاں قہوہ، چائے اور ربر کی کاشت کا سلسلہ شروع کیا اور اس طرح لوگوں کے لئے کام کا ایک نیا میدان پیدا ہو گیا اور اب تو لنکا میں بہت سے ہندوستانی مستقل طور پر آباد ہو گئے ہیں، لیکن یہ لوگ سنگھالیوں میں گھلے ملے نہیں۔ یہاں تک کہ گو ہندوستانیوں کی تعداد لنکا کی پوری آبادی کے تقریباً ۱/۴ کے برابر ہے لیکن باہر سے آنے والوں اور لنکا کے مقامی باشندوں میں مفاد کی کشمکش اور اختلاف اب بھی موجود ہے۔ اور لنکا میں ہندوستانیوں کی آبادی کا مسئلہ دونوں ملکوں کی حکومتوں کے لئے ایک بڑا اہم مسئلہ بنا ہوا ہے۔

پھر عرب، پرتگال، ہالینڈ اور برطانیہ سے بھی ہمیشہ لنکا کے تجارتی اور سیاسی تعلقات رہے ہیں اور ان ملکوں کے باشندوں نے یہاں کی آبادی کے مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا ہے۔

بدھ مت

تہذیب اور کلچر کے معاملہ میں لنکا پر ہندوستان کا بڑا احسان ہے۔ ۲۴۹ء قبل مسیح میں، موریا خاندان کے بادشاہ اشوک نے بدھ مت کی تبلیغ کے لئے اپنے بیٹے مہندر کو لنکا بھیجا تھا۔ بادشاہ وقت پوجاتسا نے اس کا خیر مقدم کیا اور بدھ مذہب اختیار کر لیا۔ اس وقت سے برابر بدھ مت لنکا میں پھیلتا رہا ہے۔ پچھلے دو ہزار برسوں میں متعدد خانقاہیں اور بدھ مت سے تعلق رکھنے والی بہت سی عمارتیں اور یادگاریں لنکا میں بنیں۔ ان یادگاروں میں انورادھاپور میں تھوپارا کی عمارت سب سے پرانی ہے۔ اس عمارت میں بدھ کی ہنسلی کی ہڈی دفن ہے۔

لنکا کے شہر

کولمبو کا بندرگاہ دنیا کے بہت اچھے بندرگاہوں میں سے ہے اور دنیا کے بڑے بڑے شہروں سے یہاں جہاز آتے جاتے ہیں۔ کولمبو کا شہر لنکا کا سب سے خوبصورت شہر ہے اور ترتیب کی باقاعدگی، خوبصورتی اور صفائی کے لئے مشہور ہے۔ دوسرا مشہور شہر کینڈی ہے۔ اور گرم آب و ہوا کے شہروں میں اسے نفاست کا ایک مکمل نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ شہر خوش منظر پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے اور اس خوشنما منظر کا عکس ایک شفاف بلوریں جھیل میں پڑتا ہے۔

عرب اور لنکا

ہندوستان کے علاوہ عرب سے بھی لنکا کے تجارتی تعلقات کئی صدیوں سے قائم ہیں۔ اسلام کے عروج سے کئی صدیوں پہلے سے عرب بحر ہند میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اور ہندوستان، لنکا اور انڈونیشی مجموعہ الجزائر کے ساحلوں پر ان کے تجارتی اڈے تھے۔ یہاں تک کہ وہ چین کے ساحلوں تک پہنچ گئے۔ عربوں کے لئے لنکا میں تجارتی کشش اس کے بحری موتیوں، قیمتی پتھروں اور [illegible]وں کی وجہ سے بھی۔ اسلام کے سیاسی عروج اور اس کی ترقی نے عرب اور لنکا کے تجارتی تعلقات کو اور بھی بڑھایا۔ مختلف ناموں سے عربی کی کتابوں میں لنکا کا جو ذکر ملتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ عربوں اور لنکا والوں کے درمیان گہرے تجارتی تعلقات تھے۔ تیسری صدی ہجری کے ایک مصنف نے اپنی کتاب "کتاب المسالک والممالک" میں اسے "سراندیپ" کے نام سے یاد کیا ہے۔ یہ کتاب جغرافیہ کی سب سے پرانی کتاب ہے۔ القزوینی اور ابن بطوطہ نے سراندیپ سے وہ علاقہ مراد لیا ہے، جہاں کوہ آدم ہے۔ پورے جزیرے کا نام ان لوگوں نے سیلان رکھا ہے۔ کوہ آدم ۷۳۵۲ فٹ اونچا ہے اور طبری کے خیال کے مطابق یہی وہ جگہ ہے جہاں جنت سے نکلنے کے بعد آدمؑ اترے تھے۔ اس کی چوٹی پر ایک بڑی سی گول چٹان ہے۔ بدھوں کا عقیدہ ہے کہ اس چٹان پر بدھ کے قدم کا نشان ہے۔ ہندو اسے وشنو کے پیر کا نشان سمجھتے ہیں اور مسلمان حضرت آدمؑ کے پیر کا۔ اور اس لئے یہ جگہ سب کے لئے زیارت گاہ بن گئی ہے۔ الف لیلہ کی کہانیوں میں بھی سراندیپ کا لفظ بار بار آیا ہے۔ عربی کی مشہور کتاب

عجائب الہند" میں اس کا ذکر "سہلان" نام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ بات بھی بڑے تعجب کی ہے کہ ابن رستہ کو لنکا کا یونانی نام "بت ربانی" معلوم تھا۔ یونان کے لوگ لنکا کو اسی نام سے جانتے تھے۔

سولہویں صدی کے شروع میں جب پرتگالی بحر ہند میں آئے تو عربوں کی لاثانی قوت اور تجارت کا خاتمہ ہو گیا۔ پرتگالیوں کی ابتدائی نو آبادیاں لنکا کے ساحلوں پر ۱۵۰۵ء میں قائم ہوئی تھیں۔ ۱۶۵۸ء میں ہالینڈ والوں نے پرتگالیوں کو یہاں سے نکال باہر کیا اور فرانس کی انقلابی لڑائیوں کے زمانہ میں ۱۷۹۶ء میں انگریزوں نے انہیں یہاں سے نکال دیا۔ اس وقت سے یہ جزیرہ انگریزوں ہی کے قبضہ میں ہے۔

عربوں کا لنکا سے جو طویل تعلق رہا ہے اس کی وجہ سے یہاں عربوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی ہے۔ ان عربوں کی اولاد کو پرتگالی شروع میں "مور" کہتے تھے۔ اور ۱۹۱۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۲۶۶،۲۴۵ تھی۔ لنکا کے یہ عرب باشندے یا تو چھوٹی چھوٹی تجارتیں کرتے ہیں، یا قلیوں، مچھیروں اور ملاحوں کے پیشے کرتے ہیں۔ وہ تامل بولتے ہیں، جس میں عربی کے لفظ ملے جلے ہیں۔ ان پر ۱۹۰۶ء کے قانون کا نفاذ ہے، جس میں اسلامی قانون (شریعت) کے کچھ حصے شامل ہیں۔

حکومت ۱۹۲۰ء سے برابر لنکا رفتہ رفتہ خود مختاری کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ لنکا کا موجودہ آئین (جس کا اعلان پچھلے جاڑوں میں کیا گیا تھا) لنکا کے سیاست دانوں کے مشورے سے تیار ہوا ہے اور اس سے لنکا والوں کو اپنے اندرونی معاملات میں مکمل خود مختاری حاصل ہے اس آئین کے مطابق یہاں ایک پارلیامنٹ بھی شامل ہے، جس میں ایک دار الامرا ہے اور ایک دار العوام۔ وزیروں کی مجلس حکومت کا کام چلانے اور اس پر ضبط رکھنے کی ذمہ دار ہے اور مجموعی حیثیت سے یہ پارلیامنٹ کے سامنے جوابدہ ہے۔ گورنر، بادشاہ کی نیابت کرتا ہے۔ بجاؤ اور بیرونی معاملات کے سلسلہ میں احکام صادر کرنے کا حق صرف حکومت برطانیہ کو ہے۔ آئین میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مذہب، رنگ اور نسل کی وجہ سے کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

لکھنے والوں سے رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔
قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں ——— ادارہ

ایثار ——— بقیہ صفحہ ۳۹

بھی جا رہے تھے۔ بڑے آئے تھے جانے والے۔

"کیا بتاؤں میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی پہچانے" الیکسی نے بمشکل نہایت آہستہ سے کہا۔

"میں بھی تو کہوں کہ بچوں کو سوائے باپ کے کون اس طرح پیار کر سکتا ہے" نسیا نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"بچے بغیر میرے بھی بڑے ہو سکتے ہیں۔ تم ابھی جوان ہو خوبصورت ہو۔ تم آخر اپنی زندگی مجھ جیسے کریہہ منظر کردہ انسان کے ساتھ کیوں خراب کرو"

یہ سن کر نسیا فوراً اس سے الگ ہٹ کر کھڑی ہو گئی اور کچھ دیر بعد اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر الفاظ پر زور دے کر آہستہ آہستہ کہنے لگی "آپ نے جو رائے میرے متعلق قائم کی ہے اس کے لئے میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ تو آپ مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں؟ آپ سمجھتے تھے کہ میں صرف آپ کو اسوقت تک چاہتی تھی جب تک آپ خوبصورت تھے۔ وہ اوپر تصویر دیکھئے۔ اسکی خوبصورتی ہی میرے لئے سب کچھ ہے"۔

ہر شخص اس تصویر کے حسن کی تعریف کرتا ہے حالانکہ میرے نزدیک دنیا میں کوئی تصویر ایسی نہیں ہو سکتی جو تصویر والے (الیکسی) کے حسن کو پورا پورا دکھا سکے" نسیا نے مسکراتے ہوئے اور الیکسی سے لپٹتے ہوئے کہا" میں بھی کیسی باولی ہوں تمہاری قمیص پھاڑ دی" نسیا نے ہنس کر کہا "ابھی سی دیتی ہوں"

میرے بچے! ماں نے محبت بھرے لہجے میں کہا "کمبختوں نے تیرا کیا حال بنایا ہے! کل جب میں اس کی پیٹھ دیکھ رہی تھی تو اپنے دل ہی میں کہہ رہی تھی کہ یہ تو ہو بہو میرا الیکسی ہے اس کے بات کرنے کے طریقے سے بھی میرا خیال الیکسی کی طرف جاتا تھا مگر مجھ عقل کی ماری کو دیکھو کہ میں نے......

اور کل جب ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے" نسیا نے کہا" ساری رات اسی خیال میں آنکھوں میں کٹ گئی" اب اس کی آواز خوشی اور محبت سے کانپنے لگی "ابا! ابا!" ستائی اوپاباٹ کاٹ کر بولا "تم نے کتنی ٹینکوں کے پرخچے اڑائے"۔ اب سورج پہاڑی سے اونچا ہو چکا تھا دروازے پر کسی نے دستک دی اور نسیا کو کام پر بلا کر لے گیا:

اعلان دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں ——— (ادارہ)

اقبال کی فکری وحدت یا تضاد

(۲)

مادہ اور روح

ڈاکٹر تاثیر صاحب نے ابتدا میں لفظی بحث فرمائی ہے۔ اسکی وضاحت غیر ضروری سمجھتے ہوئے میں تسلیم کرتا ہوں کہ اقبال مادّے کو روح کی ایک شکل قرار دیتے ہیں لیکن علامہ اقبال کا یہ مسلک بہرحال مسلم ہے کہ روح اور مادہ دو چیزیں نہیں "تن وجان را دو تا گفتن کلام است" اور اس مادّی دنیا کو روحانی دنیا کی خاطر نہیں چھوڑنا چاہیئے لیکن اسی کے ساتھ وہ "جسم را از بہر جاں باید گداخت" بھی فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب جسم را از بہر جاں باید گداخت کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "اس دنیا میں روح کا اظہار اسی جسم کے ذریعے سے ہوتا ہے اس لئے جسم کو قتل کرنے کا اقبال مخالف ہے مگر وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اس مادّے کی غیر مستقل حیثیت سے آگاہ رہیں —— باقی رہا روح کی خاطر جسم کو گداخت کرنا سو یہ بھی کوئی انوکھا ویدانتی ڈھکوسلا نہیں۔ روزہ نماز ورزش قاعدے یہ سب جسم کو تکلیف دیتے ہیں اور ہم سب ان میں سے کسی ایک کو ضرور اچھا سمجھتے ہیں۔ اس میں کیسی تصوف یا تضاد یا ویدانت کی کونسی بات ہے!" معلوم نہیں ڈاکٹر تاثیر نے "پاک را از خاک می باید شناخت" کی شرح کیوں نہ فرمائی۔ بٹ صاحب نے جسم گداختن کی شرح کرنے کے بجائے جاں گداختن کی شرح کرنی شروع کر دی اور ثبوت میں علامہ کا شعر بھی پیش فرما دیا۔

فرماتے ہیں جسم را از بہر جاں باید گداخت .... میں جاں گداختن کی تشریح حضرت علامہ اسی نظم میں آگے چل کر یوں فرماتے ہیں ؎

چیست جاں دادن بحق پرداختن ٭ کوہ را باسوز جاں بگداختن

اس کے متعلق میں تو مغالطہ کھانا بھی عرض نہیں کر سکتا کیونکہ یہ بات بالکل سامنے کی تھی۔ معلوم نہیں بٹ صاحب نے کیوں توجہ نہ فرمائی۔ البتہ ایک شعر علامہ کا نفی خودی کے ثبوت میں بٹ صاحب نے اور عطا فرما دیا اسکا شکریہ۔

بٹ صاحب کے خیال میں میری پیش کردہ مثالوں سے مادّے کے تیاگ کا پہلو نہیں نکلتا۔ ان کی رائے میں علامہ کے ارشاد

"مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھئے"

کا مقصد اجتماعی ایثار پر زور دینا ہے اور بقول تاثیر صاحب تکلیف تو ہر جد وجہد میں اٹھانا پڑتی ہے جسم گداختن سے مراد مادّے کی نفی ہرگز مقصود نہیں (حالانکہ سوال صرف مادّے کی نفی کا نہیں بلکہ ثنویت کا بھی ہے) یہی تصوف کا قصہ جو ڈاکٹر اقبال نے بیان کیا ہے اس وجہ سے غیر متعلق ہے کہ میکش نے بھی اسکا تذکرہ کیا ہے اور چونکہ مادیت سے گزرنے کی تلقین علامہ نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں کی ہے اس لئے اس سے بٹ صاحب کے خیال میں مادہ روح کا قضیہ پیدا کرنا جائز نہیں۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔

ترکِ عالم

ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں، "اقبال رہبانیت کا مخالف ہے۔ درست۔ اقبال دنیا کو چھوڑ کر دشت میں خلوت گزینی کے خلاف ہے، درست۔ لیکن اسکا مطلب یہ کس طرح ہوا کہ اقبال بدن پروری کا قائل ہے یا یہ کہ اقبال سمندر کے کنارے یا پہاڑ کے دامن میں یا اپنے گھر میں کسی وقت اکیلا بیٹھ کر سوچنے کے خلاف ہے۔" اس کے بعد خود ہی فرماتے ہیں "اقبال دشت و کوہسار و لب دریا سے خلوت طلب ہے۔ وہ خودی کی طلب میں انجمن آرائی کرتا ہے انسانوں کا خیر خواہ ہے، لیکن کم آمیز ہے۔ وہ کہتا ہے جسطرح رسولِ پاک غارِ حرا میں خود آگاہ ہوئے تم بھی خود آگاہ ہو۔"

بظاہر علامہ اقبال کے اقوال کی طرح تاثیر صاحب کے بھی یہ اقوال متضاد ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اسے تلفیقِ اضداد یا جمع اضداد سمجھا جائے۔ یہ میں نے بھی عرض نہیں کیا تھا کہ اقبال بدن پروری کا قائل ہے یا سمندر کے کنارے یا اپنے گھر میں کسی وقت اکیلا ہونا حرام شرعی سمجھتا ہے۔ شکستِ عالم سے مراد دنیا کو توڑنا پھوڑنا، چنگیز یا ہٹلر ہی لے سکتے ہیں۔ یہ آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ شکستِ عالم سے مراد ہے ماسوی اللہ سے منہ موڑ لینا۔ یہی مراد ان صوفیہ کی بھی ہے جو ترکِ خودی کے ملزم ہیں۔ فوائد الفواد کے حوالے سے جو معنی آپ نے ترکِ دنیا کے بتائے ہیں وہ غالباً علامہ اقبال کی مراد کے خلاف ہیں کیونکہ انھوں نے اپنے مکتوب میں شاہین میں اسلامی فقر کے جو خصوصیات گنائے ہیں اس میں خلوت پسندی کے علاوہ بے تعلقی بھی ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا۔ خلوت پسندی سے ممکن ہے علامہ کی مراد یہی ہو کہ کسی وقت جنگل یا پہاڑوں میں تنہا ہو جاتا ہو لیکن آشیانہ نہ بنانے سے یہ مراد نہیں ہو سکتی کہ آشیانہ بنائے مگر آشیانے سے دل نہ لگائے جیسا کہ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے فوائد الفواد سے تائید فرمائی ہے۔

اقبال فرماتے ہیں :-

"فقر کا فر خلوتِ دشت و دراست"

لیکن بٹ صاحب خلوت دشت کو رہبانیت نہیں سمجھتے بلکہ ان کے خیال میں خلوتِ دشت کا مفہوم یہ ہے کہ "تجرد اور خلوت جس میں ترک کا شائبہ ہو وہ تجرد اور خلوت ہی کیا جس میں ترک کا

میکش اکبرآبادی

شائبہ نہ ہو ترک تعلقات ہی کا نام تجرد اور خلوت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بظاہر خلوت اختیار کرے لیکن دل سے تعلقات دنیا کو ترک نہ کرے۔

عشق شور انگیز بے پروائے شہر ❊ شعلہ او میرد از غوغائے شہر
خلوتے جوید بہ دشت و کوہسار ❊ یا لب دریائے ناپیدا کنار

خلوتے کی یا کو تنکیری قرار دیکر بٹ صاحب مستقل خلوت کے خلاف گواہی حاصل فرما رہے ہیں لہذا ان کے خیال کے بموجب عشق شور انگیز کا شعلہ غوغائے شہر سے صرف تھوڑے روز بجھتا ہے یا یہ کہ عشق کا شعلہ شہر میں رہنے سے تسخیر ہو جاتا ہے جیسا کہ انھوں نے فرمایا کہ شکستِ عالم سے مراد تسخیرِ عالم ہے کیونکہ یہ اصطلاح ہے اور لا مناقشتہ فی الاصطلاح

حقیقتِ عالم

ڈاکٹر تاثیر صاحب کے نزدیک "یہ دنیا خواب بھی نہیں اور حقیقتِ اصلی بھی نہیں"

ڈاکٹر صاحب کے اس نظریے کے بموجب اگر علامہ اقبال نے دنیا کو حقیقت کہا تو غلط کہا اور اگر نقشِ باطل کہا تو غلط کہا

بٹ صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کے نزدیک دنیا کو حقیقت یا جلوۂ حقیقت سمجھنا غلط ہے لیکن فریب خوردہ این نقشِ باطل ست ہنوز کے یہ معنی نہیں کہ دنیا حقیقت نہیں۔ بیں نقشِ باطل کے یہی معنی سمجھا تھا۔ بٹ صاحب نے اس شعر کے علاوہ علامہ کے کسی اور کلام سے یہ معنی اخذ کئے ہونگے۔ نتیجہ ایک ہی ہے لیکن بٹ صاحب نے اس سے بھی انکار نہ فرمایا کہ علامہ کے ذیل کے اشعار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علامہ عالم کو حقیقت سمجھتے ہیں ؎

تو چشم بستی و گفتی کہ ایں جہاں خواب است
کشائے چشم کہ ایں خواب خواب بیداری ست

اور نیز جلوۂ حقیقت بھی سمجھتے ہیں ؎

صبح و ستارہ و شفق و ماہ و آفتاب ❊ بے پردہ جلوہ ہا بہ نگاہے تواں خرید

یہ مسلم ہے کہ علامہ کا پیغام عالمگیر ہے اور عالمگیر ہونا چاہئے اسلئے

یہ عذر کہ یہ نظم قرطبہ میں لکھی گئی تھی یا اہلِ یورپ کی مادہ پرستی اسکا ہیچ ہے عذر نہیں بلکہ علامہ کی کسرِ شان اور ان کے کلام پر الزام ہے۔

یہ باتیں بحث کے قابل نہ تھیں کہ مہ و ستارہ اور گرداب تشبیہ ہے یا نہیں گذارش تو یہ ہے کہ جو شاعر فرار کے خلاف اور تسخیرِ عالم کا مدعی ہے حیات جاوداں اندر ستیز است کہتا ہے وہ صوفی شعرا اور ایرانی تصوف کی طرح مہ و ستارہ کے گرداب سے سفینہ سنبھال کر کیوں لے جانا چاہتا ہے۔

بٹ صاحب فرماتے ہیں کہ علامہ کا ارشاد ہے ؎

غلام ہمت بیدار آں سوار انم ❊ ستارہ را بسناں سفتہ در گرہ بستند

یہ حضرات علامہ کا کلام میری معروضات کے خلاف سمجھکر پیش کرتے ہیں حالانکہ میری گذارش علامہ ہی کا ارشاد ہوتا ہے۔ اس طرح تضاد خود تسلیم کر لیا جاتا ہے مجھے اس سے انکار نہیں کہ علامہ ستارے کو بسناں سفتہ در گرہ بستن کے مداح نہیں لیکن وہ مہ و ستارہ سے بچکر نکل جانے کی تلقین بھی کرتے ہیں ؎

دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

یہ آپ کو اختیار ہے کہ اسے تضاد بیانی نہ سمجھیں وحدتِ فکر خیال فرمائیں۔ اسی طرح دل بکس ندہد کے معنی بٹ صاحب دلیر شدن بتاتے ہیں جو خلافِ محل اور بے موقع ہونے کے علاوہ بٹ صاحب کے لئے مفید نہیں کیونکہ مطلب پہلے مصرع سے پورا ہو جاتا ہے کہ وہ شخص جو دل بکسے نباختہ با دو جہاں نہ ساختہ" پر فخر کرتا ہے ایسوں کا غلام ہے جو عاشق سرہ ہیں: "غلام زندہ دلانم کہ عاشق سرہ اند" بقول علامہ مرحوم ؎

دلے تا ویل شاں در حیرت انداخت ❊ خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

نظرِ باطن

تمام عنوانات پر بٹ صاحب نے ڈاکٹر تاثیر صاحب سے استفادہ کیا ہے۔ بعض مرتبہ بالکل نقل پر اکتفا فرماتے ہیں لیکن کہیں یہاں زمانہ ضروری نہیں سمجھتے کہ ڈاکٹر تاثیر صاحب نے جو جواب

غزل

قمر جلالوی

اب مجھے گلشن سے کیا جب زیرِ دام آ ہی گیا
ایک نشیمن تھا سو وہ بجلی کے کام آ ہی گیا

سُن مآلِ سوزِ الفت جب یہ نام آ ہی گیا
شمع آخر جل بجھی پروانہ کام آ ہی گیا

کوششِ منزل سے تو اچھی رہی دیوانگی
چلتے پھرتے ان کے ملنے کا مقام آ ہی گیا

دیر تک بابِ حرم پر رُک کے اک مجبورِ عشق
سوئے بت خانہ خدا کا لے کے نام آ ہی گیا

حسن کو بھی عشق کی ضد رکھنی پڑتی ہے کبھی
طور پر موسیٰ سے ملنے کا پیام آ ہی گیا

کر دیا مشہور پردے میں تجھے زحمت نہ دی
آج کو ہوتا ہمارا تیرے کام آ ہی گیا

رات بھر مانگی دعا ان کے نہ جانے کی قمر
صبح کا تارا مگر لے کر پیام آ ہی گیا

دیا ہے وہ صحیح ہے۔

ڈاکٹر تاثیر صاحب اور بٹ صاحب دونوں کے خیال میں اقبال کا مسلک نظرِ ظاہر اور نظرِ باطن کو جمع کرنا اور ان میں اعتدال پیدا کرنا ہے۔ بٹ صاحب علامہ کے ارشاد میں لفظ صرف پر زور دیکر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے یہ خیال نہ فرمایا کہ "جز بہ قلب خویش تنہا نیست مجو" میں بھی جز کا لفظ رکھا ہوا ہے۔

افلاطون

ڈاکٹر تاثیر صاحب نے صرف الضاً پر اکتفا فرمائی ہے۔ بٹ صاحب نے پہلے تو الضاً ہی فرمایا ہے اور اس کے بعد فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ "علامہ افلاطون کی مخالفت میں حق بہ جانب ہیں" پھر فلسفہ عجم کے متعلق علامہ کے قول سے ثابت فرمایا ہے کہ اس کے بعد علامہ کے خیالات میں بہت سا انقلاب آگیا تھا اور خود حضرت علامہ کو اس کتاب کی کمزوری کا پورا احساس تھا" میری گذارش بھی یہی تھی کہ ان انقلابات کی تصریح علامہ کو کرنی چاہیے تھی جسطرح "قادیانیت" کے متعلق فرمائی تھی اور اگر نہیں فرمائی تو اب علامہ کے تربیت یافتہ اصحاب کو کرنی چاہیے۔ بشرطیکہ ڈاکٹر تاثیر صاحب اور بٹ صاحب ایسی سنائی باتیں کہکر ناقابل اعتنا نہ سمجھیں۔ فلسفہ عجم کی سند مجروح کرنے کے باوجود بٹ صاحب فرماتے ہیں "مولانا رومیؒ کے متعلق خود علامہ کے خیالات جو انھوں نے اس کتاب میں ظاہر فرمائے ہیں کافی حد تک روشن ہیں اس لئے مذعومہ تناقض کو دور کرنے کی مزید کوشش فضول ہوگی غیر محسوس اور غیر شہود کی بحث بھی عبث کیونکہ ظاہر و باطن اور غیب و شہادت کے قرآنی الفاظ کے ہوتے ساتھ کیوں اس جھگڑے میں پڑیں۔"

غالباً روئے سخن علامہ اقبال کی جانب ہے جنھوں نے "آں جہان افسوں نامحسوس خورد" فرمایا ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ بحث عبث ہے اور تضاد دور کرنے کی کوشش فضول ہے۔

حالانکہ علامہ صریحاً فرما چکے ہیں "شاعرش وا بوسد از ذوقِ حیات ــــ اور ــــ دایۂ مستی زجانِ تو برد ؟"

لیکن ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ بٹ صاحب کے بقول علامہ جسمانی موت کو انتقال سمجھتے ہیں اور خودی کی فنا کو حقیقی موت اسلئے انھوں نے جہاں موت کی مخالفت کی ہے وہاں خودی کی فنا کی مخالفت ہے اور جہاں موت کی موافقت کی ہے وہاں ان کی مراد جسمانی موت ہے۔ تناقض کی یہ صورت صحیح ہو سکتی ہے اگر یہ ثابت کر دیا جائے کہ افلاطون کی مراد موت سے جسمانی موت نہ تھی۔ "سر زندگی در مردن ست" سے افلاطون کا مقصد بھی بقول علامہ اقبال یہ ہو سکتا ہے کہ "مرگ ازواحی و ہر جانے دگر" اس کے علاوہ عالم اسباب کو افسانہ افلاطون نے بھی کہا اور علامہ نے بھی نقش باطل فرمایا۔ منکر ہنگامہ موجود افلاطون بھی تھا

اور علامہ بھی فرماتے ہیں۔ ع

"جو تجھے حاضر و موجود سے بے زار کرے"

بٹ صاحب نے آخر میں علامہ کا ایک اور نظریہ پیش کر دیا جس کا محل سمجھ میں نہ آیا فرماتے ہیں :-

"اقبال فرماتے ہیں ہمیں شخصی ابدیت اپنے حق کے طور پر نہیں مل سکتی۔ لیکن ہم ذاتی جد و جہد سے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔"

یہاں بٹ صاحب کو ہم ان کا دعویٰ یاد دلاتے ہیں کہ اقبال کا تصوف قرآنی تصوف ہے اور اقبال قرآن کی روشنی میں مکمل نظامِ حیات پیش کرتا ہے۔ کیونکہ کفار کے لئے خالدین کی نص صریح قرآن میں موجود ہے۔

تقلید

ڈاکٹر تاثیر صاحب اس عنوان پر زیادہ بحث غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں علامہ اقبال تقلید اور اجتہاد دونوں کے لئے مناسب مقام اور محل تجویز فرماتے ہیں۔ اس لئے "اگر تقلید بودے شیوۂ خوب ــــ اور ــــ ہست ہم تقلید از اسمائے عشق" میں تضاد نہیں ہے۔ بٹ صاحب کی رائے میں علامہ تقلید جامد کے خلاف تھے نہ تقلید صالح کے نیز یہ کہ عوام میں اجتہاد کی صلاحیت نہیں ہوتی۔" معلوم نہیں بٹ صاحب کے حضرت بایزیدؒ عوام میں سے تھے یا خواص میں اور اگر تقلید اسمائے عشق میں سے ہے تو عشق صالح و جامد کی تعریف کیا ہوگی۔ بٹ صاحب اگر تقلید صالح و جامد کی تعریف فرماتے تو سمجھنے میں زیادہ سہولت ہوتی کہ خربزہ نہ کھانا تقلید صالح ہے، یا تقلید جامد۔ بٹ صاحب نے اس موقع پر یہ دعویٰ فرمایا ہے کہ تصوف میں تقلید ہے مگر مجدد الف ثانی کے تصوف میں تقلید نہیں" معلوم نہیں اس جملے سے بٹ صاحب کی کیا مراد ہے۔ اسکا مطلب یا تو یہ ہو سکتا ہے کہ مجدد صاحب نے تصوف میں اپنے اشیاخ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقلید نہ کی یا یہ کہ مجدد صاحب کے سلسلے کے مریدین مجدد صاحب کی تقلید نہیں کرتے؟ بٹ صاحب کے اس دعوے کا بحث سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ علامہ اقبال کا میں نے کوئی قول ایسا بیان نہیں کیا نہ مجدد صاحب کا اس عنوان میں کہیں تذکرہ ہے۔ معلوم نہیں بٹ صاحب کو یہ مغالطہ کیسے لگا ذکر نقشبندیت کا آیا ہے نہ کہ مجدد صاحب کا۔

مشائخ نقشبندیہ اور مرزا بیدل

اس عنوان پر تضاد کی بحث غالباً ناقابلِ تاویل تھی، کیونکہ تاثیر صاحب نے تو یہ عذر فرما دیا کہ اسوقت اقبال کے فرمودات (؟) سے بحث ہے منقولہ روایات سے نہیں اور بٹ صاحب نے یہ فرمایا کہ ان اعتراضات کا جواب مندرجہ بالا عنوان کے جواب میں گزر چکا ہے اور

دراصل یہ بحث دراز کار بھی ہے "مرزا بیدل" کا عنوان بٹ صاحب نے شارح نعتیہ ہندیہ کے عنوان میں شامل کر دیا اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ اصولی طور پر ہمیں فلسفۂ عجم سے سوچے سمجھے بغیر استناد نہیں کرنا چاہیئے " حالانکہ بٹ صاحب خوب جانتے ہیں کہ مرزا بیدل کے عنوان پر میں نے فلسفۂ عجم سے کوئی استناد نہیں کیا۔ یہ مغالطہ دینا ہے یا مغالطہ کھانا بٹ صاحب ہی تشریح فرما سکتے ہیں۔

قادیانیت ڈاکٹر تاثیر صاحب نے بجا ارشاد فرمایا کہ وہ اسکا جواب تمہید میں دے چکے ہیں لیکن بٹ صاحب نے علامہ اقبال کی وہ عبارت پیش نہ کی جس میں انھوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے اور جسے ڈاکٹر تاثیر صاحب پیش کر چکے ہیں تب مجھے اپنی اس کوتاہی کا اعتراف ہے کہ قادیانیت کا عنوان مرتب کرتے وقت علامہ مرحوم کی یہ عبارت میری نظر سے نہ گزری تھی ۔۔۔ ڈاکٹر تاثیر صاحب فرماتے ہیں: " ایک طرح سے اقبال کا یہ جواب کشمکش کے تمام مضمون کا جواب ہے " ۔۔۔ یہ مجھے بھی تسلیم ہے واقعہ یہی ہے جو علامہ نے فرمایا کہ

" اگر تم یہ کہتے ہو کہ میرا موجودہ رویہ پہلے رویہ کے نقیض ہے تو جواب ہے ایک سوچنے والے زندہ انسان کے خیالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، نہیں بدلتا تو پتھر نہیں بدلتا "

کاش دوسرے حضرات بھی یہ تسلیم فرما لیتے کہ علامہ ایک سوچنے والے زندہ انسان تھے ان میں تبدیلیاں ہوتی رہتی تھیں۔

علامہ ابن تیمیہ اس موقع پر ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اپنا معمولی سا عذر پیش نہ فرمایا اس لئے بٹ صاحب نے وہی عذر پیش کر دیا فرماتے ہیں: " اس ضمن میں مقالہ نگار علامہ کی کوئی تحریر پیش نہ کر سکے محض سنی سنائی باتوں پر استدلال قائم کر لیا بایں ہمہ کوئی مفید نتیجہ اخذ نہ ہوا " معلوم نہیں مفید نتیجے سے بٹ صاحب کی کیا مراد ہے بات صرف اتنی تھی کہ " علامہ نے ابن جوزی کی تلبیس ابلیس پر اظہار ناپسندیدگی کیا " بلکہ اپنے ممدوح ابن تیمیہ کے خلاف رائے دی کہ وہ بھی حقیقت سے واقف نہ تھے اور یہی تضاد بیان ہے جسکو بٹ صاحب نے باوجود ارشاد کے وحدت الوجود کی بحث میں بیان نہیں فرمایا۔

علم و حکمت معلوم نہیں ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اپنا نظریہ بیان کیا ہے یا علامہ اقبال رح کا کہ " فقط علم بھی کام کا نہیں اور عشق بھی کافی نہیں " بٹ صاحب نے مولانا روم رح کے شعر کو علامہ اقبال کا شعر قرار دے کر جواب کی بنیاد رکھی ہے اس کے بعد علامہ کے دو شعر پیش کئے ہیں جو ہم مفہوم ہیں۔ ان کے متضاد جو جملہ تھا اور جس سے تضاد ثابت ہوتا تھا وہ قصداً ذکر نہ کیا یعنی " علم کی راہ چلنے والا بھی آخر پہونچ ہی جاتا ہے بلکہ محفوظ طریق سے "۔ اس جملے کے متضاد یہ شعر بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے

علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
شیخ مکتب کے طریقوں میں کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

متضاد اقوال کو نقل نہ کر کے رفع تضاد کرنا اور انصاف چاہنا کہاں کا انصاف ہے معلوم نہیں ان عبارتوں اور اشعار سے ڈاکٹر تاثیر صاحب کس طرح اپنا نظریہ ثابت فرمائیں گے۔

خودی ڈاکٹر تاثیر صاحب نے اس عنوان میں سے صرف ایک پہلو کو لے کر اور باقی میرے سوالات کو نظر انداز کر کے فرمایا ہے کہ " اگر آپ وحدت وجود کو مانتے ہیں تو پھر خودی کی اس ہمہ گیری سے تضاد کا شائبہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ اگر خالق و مخلوق میں وحدت ہے تو پھر اس حقیقت معرکہ یعنی خودی کی مختلف اللون حقیقت سے کیوں انکار ہے۔ البتہ آپ اگر وحدت وجود کے قائل نہیں تو پھر خودی کیا اور کبھی ایکا نگتوں پر اعتراض کیا جا سکتا ہے " گذارش یہ ہے کہ میرے وحدت وجود کو ماننے نہ ماننے سے بحث نہیں۔ سمجھنا یہ چاہتا ہوں کہ خودی کے متعلق علامہ کا کیا مسلک ہے۔ کیونکہ وہ کہیں خودی کو عین خدا کہیں غیر خدا کہیں محض اعتباری کہیں خدا کا عمل اور ایک مستقل شئے قرار دیتے ہیں کہیں خودی کے ترک کا حکم دیتے ہیں، کہیں اسے خدا کے مقابلے میں بھی نہیں چھوڑتے۔ کہیں خدا کے کو اسب سے منہ پھیر لیتے ہیں کہیں ابلیس کے مسلک کے موافق اور کہیں خدا اور رسول کے سچے پرستار نظر آتے ہیں۔ اس مشکل کو نہ تاثیر صاحب نے حل فرمایا نہ بٹ صاحب نے۔ اسے تضاد بیانی نہ سمجھئے جو چاہے کہئے تب لیجئے اگر آپ سمجھے ہوئے ہیں تو دوسروں کی دستگیری فرمایئے ورنہ اپنا وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ علامہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ انکی غلط حمایت کی جائے۔ میرا اصل مقصد اپنے اشتباہات رفع کرنا تھا نہ بحث و مباحثہ، نہ میں نے علامہ کے اصل نظریات کے متعلق فی الحال کچھ عرض کیا تھا۔ مذکورہ بالا گزارش سے پروفیسر تاثیر اور مولانا بٹ صاحب نے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ اپنے طالب علم کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے مزید بحث فضول ہوگی۔ بٹ صاحب کو اختیار ہے کہ وہ سعی اور اتمام من اللہ کی دعا فرماتے جائیں۔ میں ایسے قیمتی وقت ضائع کرنے کی دعا پر آمین نہیں کہہ سکتا۔

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے (ادارہ)

ناگور

نیگاپٹم کے شمال میں ناگور جنوبی ہند کا ایک اہم اور مشہور شہر ہے۔ باشندوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے جو صدہا سال سے وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ پر امن طریقے پر آباد ہیں۔ ناگور سوت کی کتائی اور چٹائیوں کی بنائی کے لئے مشہور ہے۔ کئی لحاظ سے وہاں کی جامع مسجد قابل ذکر ہے۔ تعمیر کے اعتبار سے وہ ایک نمونۂ حسن ہے۔ نیز اس کی شاندار مناریں اپنی ظاہری شوکت و جلال کے ساتھ حد درجہ جاذب نظر ہیں۔ بندرگاہ ہونے کے لحاظ سے بھی اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا ایک مثالی مرکز ہے اور موجودہ سیاسی چپقلشوں کے باوجود یہاں کے ہندو مسلمان شیر و شکر ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مئی کے مہینے میں یہاں ایک سالانہ تہوار "کندوری" ہوتا ہے جس میں نہ صرف یہاں کے بلکہ ہندوستان کے دوسرے حصوں کے ہندو مسلمان اور دوسری ذات کے لوگ بلا امتیاز مذہب و ملت شرکت کرتے ہیں۔

ناگور کی مسجد شاہ ابو الحامد سے منسوب ہے جو میرن صاحب کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ وہ ان کے مزار پر تعمیر کی گئی ہے۔ ایک مسلمان زائر کی حیثیت سے ہندوستان کے طول و عرض میں سفر کرتے رہنے کے بعد وہ آج سے چار سو سال پہلے وہاں مقیم ہوئے اور آخر وقت تک آباد رہے۔ تمام مذہبوں اور فرقوں کے لوگ ان کی مقناطیسی شخصیت انکے پاکیزہ خیالات اور ان کے افعال حسنہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی تعظیم کرتے رہے ہیں۔ لوگ انھیں مافوق الفطرت ہستی سمجھتے تھے کیونکہ عام عقیدہ ہے کہ وہ پرانے امراض چٹکی بجاتے میں دور کر دیتے تھے۔ انتقال کے بعد بھی عقیدتمند انکے مزار پر حصول فیض کے لئے آتے رہے اور یہ سلسلہ ابتک قائم ہے۔ چنانچہ عام ہندو مسلمان ہی نہیں، ہر قسم کے بیمار اور روگی بھی تندرستی کی تلاش میں وہاں آتے ہیں۔

جو شخص بھی ایک بار ان کے آستانے پر پہنچ جاتا ہے ان کی روحانیت کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ بعض انھیں ہندو سمجھتے ہیں اور بعض مسلمان۔

ایک ہندو راجہ نے اس مسجد کی توسیع کرائی اور اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ کیونکہ وہ ایک ناقابل علاج مرض میں مبتلا تھا لیکن اس مسجد اور مقبرے کی زیارت کے بعد فوراً اچھا ہو گیا۔ اس نے اس بزرگ ہستی کی خاطر بڑی رقم صرف کی لیکن اس طرح اپنے آپ کو اور انھیں غیر فانی بنا دیا۔ "گندوری"، کا سالانہ تہوار مسلمانوں کے مہینے جمادی الاول کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔ نیا چاند دیکھتے ہی میلا لگتا ہے اور اس کا سلسلہ چودھویں رات تک رہتا ہے۔ سب سے اہم رسم یہ ہے کہ اس کی بڑی میناروں پر بہت شان و شوکت کے ساتھ پرچم لہرائے جاتے ہیں پھر سجی سجائی گاڑیوں پر پرچموں کا ایک شاندار جلوس نکلتا ہے۔ موسیقی کی تانوں کے ساتھ ساتھ سچ مچ کی معلوم ہوتی ہوئی کشتیوں جہازوں، اور روشنی کے میناروں کا ایک سیلاب عظیم اس طرح دکھایا جاتا ہے جس سے سمندر کی خطرناک زندگی کا اندازہ ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ پیر صاحب کی پرخلوص اور بروقت دعاؤں نے ان مصائب و آلام کا استیصال کر دیا تھا۔ اسی لئے ملاح اور جہازراں ان کے بڑے معتقد ہیں اور اس یاد کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لئے یہ تہوار مناتے ہیں۔ شام تک جلوس مسجد کے دروازے تک پہنچ جاتا ہے جہاں ہندو مسلمان امیر و غریب، افسر اور ماتحت غرض ہر مذہب اور ہر مرتبے کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اسی وقت میناروں پر پرچم لہرانے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان پرچموں کو چھو لینے سے نہ صرف بیمار تندرست ہو جاتے ہیں بلکہ بانجھ عورتوں کی گود ہنستے کھیلتے بچوں سے بھر جاتی ہے۔

یہاں کی سجادہ نشینی ورثے میں نصیب ہوتی ہے۔ سجادہ نشین چاندرات کو سر شام ہی ایک مینار پر چڑھتا اور افق پر طلوع ہونے والے چاند کو دیکھتا ہے۔ اس کے نظر آتے ہی وہ ایک نعرہ لگاتا ہے۔ فوراً پرچموں کی تہیں کھل جاتی ہیں، باجے بجنے لگتے ہیں۔ نفیری کی آواز اور ڈھول کی گونج فوراً آگاہ کرتی ہے کہ تہوار شروع ہو گیا ہے۔ بجلی کی تیز روشنیاں ساری مسجد اور مقبرے کے سقف و بام کو بقعۂ نور بنا دیتی ہیں۔ جلوس میں خوشبودار صندل سے بنی ہوئی لئی بھی رتھوں پر رکھی ہوتی ہے۔ اس سے دوسرے روز صبح کے وقت مقبرے کے در و دیوار کو لیپ دیا جاتا ہے۔ پیر صاحب کا ایک مرید مقبرے کے ایک گوشے میں معتکف ہو کر بہتر گھنٹے کا روزہ رکھتا ہے۔ اس دوران میں وہ کسی سے بولتا بھی نہیں۔ یہ وقت گذرنے کے بعد وہ دلئے سے روزہ کھولنے کے لئے ساحل سمندر تک جاتا ہے۔ دلیا اتنی مقدار میں ہوتا ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے تمام مجمع میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ لوگ اسے من و سلویٰ سمجھ کر کھا جاتے ہیں۔ تہوار ختم ہونے پر میناروں پر سے پرچم اتار لئے جاتے ہیں۔

وہاں کے ہندو مسلمانوں میں جو اخلاص، اخوت اور یکجہتی موجود ہے، اس کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ مستقبل میں کبھی نہ کبھی وہ ملک کی ان دو بڑی جماعتوں میں اتحاد قائم کرنے کی صورت پیدا کر دیگی اور دنیا دیکھے گی کہ اختلاف مذہب و ملت کے باوجود وہ کسطرح بھائی بھائی ہو کر پر امن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دراں حالیکہ وہ الگ الگ اپنے مذہب کے بھی پابند رہیں گے۔

ایل، این گپل

"لکس
ٹائیلیٹ صابن ہی میرے
حُسن وجمال کا آسان طریقہ ہے"
مایا بینرجی کہتی
ہے

میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا بھرپور
جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے
اپنی جلد پر بلا ئیمیت لگائی ہوں۔

اس کے بعد میں صاف و
ستھرے اور ٹھنڈے پانی
سے دھو ڈالتی ہوں۔

آخرش باہستگی اپنا
چہرہ نرم تولئے
سے خشک کرتی ہوں

LUX
TOILET SOAP

فلمی اسٹارز اپنے کامل جلد کی قدر اس لئے نہیں کرتی کہ وہ اس کے دلکش خوبصورتی کا ایک جز ہے۔ بلکہ وہ اس کے زندگی کی ایک انمول پونجی بھی ہے ÷ اسی لئے ہندوستانی رہنما فلمی اسٹارس لکس ٹائیلیٹ صابن سے اپنے قیمتی حُسن کی حفاظت کرتی ہیں ÷ آپ خود اپنے مکان میں اس آسان طریقہ کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کا ۳۰ دن کے لئے تجربہ حاصل کیجئے۔ آپ اسکے صاف کرنیوالے و ترغیب دینے والے انجام سے خوش ہونگے÷

☆ فلمی اسٹارس کا
حُسن بخش صابن ☆

LTS. 237-83 UD

LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

پُل

سعیدہ بشیر

نہ جانے کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے نیند کب آگئی تھی کہ دروازہ کھلتے ہی ایکدم سے چونک پڑی ---- اور دروازہ کمبخت کھلا بھی تو کس قدر زور و شور کے ساتھ ---- کھولنے والی جو شدّو ایسی آفت کی پڑیا تھی۔ کھٹ پٹ ---- کھٹ پٹ ---- کھٹ . . پٹ ---- اور پھر میرے اوپر دھڑ سے کاغذ کا ایک بھاری پلندہ گر پڑا ---- میں جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے لحاف کے ذرا اور اندر گھستے ہوئے کہا۔

"تمہارا کوٹ اور کیا" وہ بڑے احسان بھرے انداز میں بولی۔ اُس کے مارے میری ساری شاپنگ دھری رہ گئی"۔

"اوہ تم میرا کوٹ لے آئیں شدّو" ---- میں لحاف وحاف ایکطرف پھینک اچھل کر زمین پر آ رہی "کتنی اچھی ہو تم شدّو" ---- میں نے جلدی جلدی بنڈل کو کھولتے ہوئے کہا۔

"زیور لی تھی۔ تم کو وہ پوچھ رہی تھی" ---- شدّو بیگم دھیرے سے بڑبڑائیں۔ لیکن میں نے جیسے سنا ہی نہیں ---- "مگر شدّو تم میرا کوٹ آج ہی کیسے لے آئیں۔ تم تو کہہ رہی تھیں کہ ...."

"لیکن لاتی کیسے نہیں" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ "تمہارا حکم جو تھا اور اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک ایسا شخص آنے والا ہے جسے تم کو نئے نئے رنگ کے کوٹوں میں دیکھنے کا شوق خبط کی حد تک تجاوز کر گیا ہے" ---- اور پھر وہ مسکرا پڑی۔

"اچھا تو یہ بات ہے" ---- میں نے کچھ سوچتے ہوئے دھیرے سے کہا ---- "لیکن یہ شخص ہے کون" ---- میں نے جان بوجھ کر انجان بن کر پوچھا ---- اور پھر میں نے آئینہ میں دیکھا کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ غیر ارادی طور پر ہی پھیل گئی ہے ----

"اب بننے سے فائدہ ہی کیا۔ صاف کہدو نا کہ نام سننے کا شوق ہے ابھی وہی تمہارے عماد بھائی اور کون ---- یا بالفاظ دیگر وہی جو تمہارے دل میں .... "

میں نے کہا "ہشت"، اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

مگر مجھے ایسے لگا جیسے میں آسمان کی عظیم ترین وسعتوں میں اُڑتے اُڑتے ایکدم سے زمین پر آگری ہوں مجھے نہیں معلوم تھا۔ بلکہ میں سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ کچھ دنوں سے میرے دل کو ایک عجیب سی خلش، ایک بالکل بے معنی سے اضطراب نے کیوں گھیر رکھا تھا۔ اور جب میں اپنے خوش آئند خوابوں اور ان کی مسرتوں کی شدت میں گم ہونے لگتی تو سر سے پیر تک خوف و خطر کی ایک ہلکی سی لہر کیوں دوڑ جایا کرتی۔ جیسے کسی غیر مرئی گر لوہے کے ایسے ہاتھوں نے مجھے بڑی زور سے جھنجوڑ ڈالا ہو اور میرے لاشعور کی گہرائیوں سے کوئی چیخ رہا ہو ---- بے وقوف خوابوں پر جی رہی ہے۔ یہ سب تو خواب ہی ہے محض خواب ---- آہ جس کی تعبیر کچھ بھی نہیں۔ کبھی میں سوچنے لگتی کہ کہیں یہ سب کسی آنے والے خطرے کا پیش خیمہ تو نہیں۔ لیکن پھر جلدی ہی میں اپنے آپکو وہمی اور شکّی ٹھیرا کر ان باتوں کو بھولنے کی کوشش میں لگ جاتی۔ اسوقت بھی میں نے اپنے آپ کو شدّو کی کھلکھلاہٹوں میں کھو دینا چاہا اور جلدی سے کوٹ پہن کر اپنے آپ کو آئینہ میں ہر پہلو سے دیکھنے لگی۔ گویا اس کی سلائی وغیرہ کا جائزہ لے رہی ہوں۔ جب تک میں اپنے پریشان خیالات کی دنیا میں کھوئی رہی شدّو نہ جانے کیا کیا بک گئی۔ مگر اب جو غور کیا تو وہ کہہ رہی تھی ---- "یہ تمہیں ہو کیا گیا ہے نرجی۔ جیسے تم کو کسی نے ہپنوٹائز کر دیا ہو ----" اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں اندھیرے کی دھندلائیوں میں کھوتے کھوتے یکلخت اجالے کی جگمگاہٹوں میں آپڑی ہوں۔

"ارے تم ایکدم سے اتنی کھوئی کھوئی سی کیوں دکھائی دینے لگتی ہو؟" ---- شدّو نے میرے اور آئینہ کے درمیان آکر کہا۔ شاید اس لئے کہ اسطرح میں اپنی تمام تر توجہ اس کی طرف مبذول کر دوں گی۔ میں زبردستی ہنس دی۔ ممکن ہے ایسے وقتوں میں کبھی آپ کو بھی یوں ہی ہنس دینا پڑا ہو۔ بس یونہی۔ زبردستی۔ بے موقع، بے معنی سی ہنسی! پھر میں نے کہا "اچھا ہٹو تو۔ دیکھوں کوٹ ٹھیک سلا بھی ہے یا نہیں"۔ میرے لہجے میں کچھ اکتاہٹ سی تھی جب ہی تو شدّو جل کر الگ بیٹھ رہی۔ کہنے لگی۔ "نہ جانے جیسے جیسے بھائی عماد کے آنے کے دن قریب آتے جاتے ہیں تم کچھ سہمی سہمی کیوں لگنے لگی ہو۔ بالکل جیسے ایک ننھا سا بچہ اپنے کھلونوں سے کھیلتے کھیلتے ایکدم سے رو پڑے"۔

میرے اللہ یہ شدّو میرا دل ٹٹولنے کی کوشش میں کیوں لگی رہتی ہے۔ مجھے اپنی کمزوریوں کا اظہار منظور نہ تھا۔ شدّو میری عزیز ترین سہیلی کے علاوہ خالہ زاد بہن بھی تھی۔

"بڑی ہر وقت کھنچی رہتی ہو دنیا میں تمہیں مجھ سے زیادہ کسی پر اعتماد نہیں ہے۔ کبھی بھی اپنے دل کی کوئی بات بتائی ہے مجھے۔ نرجس مجھے تمہارے جھوٹ پر بڑا غصہ آتا ہے" ---- شدّو میری مسہری پر بیٹھی بیٹھی نہ جانے کیا کیا بڑبڑائے جا رہی تھی لیکن اس کی اس بات نے کہ "جیسے جیسے بھائی عماد کے آنے کے دن نزدیک آتے جاتے ہیں نہ جانے تم سہمی سہمی سی کیوں لگنے لگی ہو"۔

میرے سمند خیال پر تازیانے کا کام کیا تھا ---- میرے خدا کہیں

کچھ ہونے والا تو نہیں ــــ عین اسی وقت دروازہ کا پردہ ہٹا اور بھائی جان غیر معمولی آہستگی کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ کہنے لگے "نرجی ادھر آؤ۔ میرے ساتھ ٹہلنے چلتی ہو؟"

"کس طرف جائیں گے ٹہلنے آپ؟" میں نے پوچھا۔

"پل پر" وہ بولے۔ میں ان کے ساتھ ہولی۔ شندو بھی میرے ساتھ چل پڑی۔ لیکن پتہ نہیں کیوں بھائی جان نے اسے ساتھ چلنے سے منع کر دیا۔ میں نے بھائی جان کو آج سے زیادہ سنجیدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ویسے میں ان کا اتنا زیادہ ادب کرتی تھی کہ زیادہ کچھ پوچھنے کی ہمت ہی نہ پڑی۔ میرا ان کے سوا اور ان کا میرے سوا اس دنیا میں اصل معنوں میں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ اپنے خیالات میں مست اور میں اپنے میں آہستہ آہستہ گہرے دھندلکے میں کھو گئے۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ بھائی جان کو یہ پل آخر کیوں اسقدر مرغوب ہے۔ میں نے اکثر راتوں کو اپنی سہیلیوں کے یہاں جاتے وقت یا اور کسی تفریح کی جگہ سے لوٹتے وقت انھیں پل کی سرخ آہنی دیوار کے سہارے کھڑا ہوا پایا تھا۔ وہ واقعی میرے لئے ایک معمہ بن کر رہ گئے تھے ــــ وہی پل آ گیا اور اسی سرخ رنگ کی آہنی دیوار پر اپنی اسی مخصوص جگہ بھائی جان رُک گئے ــــ دریائے گنگا کی وسیع اور سوئی ہوئی سطح پر چاندنی کا ہلکا ہلکا سا غبار چھایا ہوا تھا ــــ فضا پر غضب کی خاموشی مسلط تھی ــــ چاروں طرف جیسے پرستانی خواب ساطاری تھا ــــ بھائی جان نے اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی اجلی چاندنی اور اس کے نیچے سوئی ہوئی پانی کی ساکت لہروں پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ دوڑائی اور پھر بلا کسی تمہید کے کہنے لگے: "نرجی، میری اور اس کی پہلی ملاقات یہیں پر ہوئی تھی۔ اس کی ایک انگوٹھی یہاں پر گر پڑی تھی۔ ۔ وہ اسے ڈھونڈھ رہی تھی۔ پریشان تھی اور اس کی سہیلیاں آگے نکل گئی تھیں۔ اتفاق سے وہ مجھے مل گئی ۔ ۔ اسی سرخ آہنی دیوار کے پاس چاند کی ٹھنڈی ٹھنڈی شبنمی کرنوں میں جگمگاتی ہوئی ایک ننھی سی انگوٹھی۔ ! وہ اسے پاکر فرط انبساط سے کھل پڑی اور مجھے تشکر بھری نظروں سے دیکھتی ہوئی تیز قدموں سے اپنی سہیلیوں میں جا ملی۔ اور میں اسے دیکھتا رہا ــــ دیکھتا ہی رہا جب تک میری آنکھوں میں اسے دیکھنے کی تاب رہی۔ اس کے بعد وہ جب کبھی آتی میری آنکھیں فرط مسرت سے جگمگا اٹھتیں۔ وہ کہتی مجھے تمہاری آنکھوں کی سطحوں پر دو ستارے ابھرتے نظر آتے ہیں۔ تمہاری آنکھیں کس قدر روشن اور چمکیلی ہیں۔ اور میں سوچتا کہ میری آنکھوں میں شاید اس کی اپنی خوبصورت اور چمکیلی آنکھوں کا پرتو آ گیا ہے۔ بالکل جیسے آسمان پر قریب قریب دمکتے ہوئے دو ستاروں کا دریا کے پانی میں جھلملاتا ہوا عکس!"

بھائی جان ذرا رک گئے۔ اپنے اوور کوٹ کا کالر سیدھا کیا پھر دریا کی پاک لہروں سے مس ہو کر آتی ہوئی برفیلی ہواؤں کو اپنی گرمیلی سانس میں جلد جلد جذب کرتے ہوئے بولے ــــ "ایک دن وہ دیر تک نہ آئی۔ میں انتظار کرتے کرتے چل کر سینما چلا گیا۔ واپسی میں یہاں ایک پتھر سے دبا ہوا اس کا پرچہ ملا۔ لکھا تھا ــــ "میں اب آپ سے ملنے نہیں آؤں گی۔ اسلئے کہ میری شادی ہو رہی ہے۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ آزاد ہوتے ہوئے بھی ایک قفس کے اندر بند پرندہ کی مانند ــــ اور سماج کا قانون بنانے والے آپ لوگ ہیں ــــ مرد! اس لئے جو کچھ ہو رہا ہے اس کے لئے میں مجبور ہوں۔ میری وہی انگوٹھی جو آپ نے ڈھونڈھ کر دی تھی اور آپ کو بہت پسند تھی بطور یادگار حاضر ہے۔" اسے پڑھ کر مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے اٹھا کر مجھے سرخ سرخ انگاروں پر رکھ دیا ہے۔ جی چاہا کہ اس انگوٹھی کو اسی وقت دریا میں پھینک دوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ میں جو کچھ اسوقت کر رہا ہوں یہ غصہ کے فوری جذبہ کے تحت ہے بعد میں مجھے یقیناً افسوس ہوگا وہ انگوٹھی میں نے جیب میں ڈال لی کئی دن بیت گئے لیکن اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ نرجی شاید تمہیں یہ بات معلوم نہیں کہ سچائی خواہ کتنی بھی تلخ ہو، کتنی ہی ذلیل اور بے حیا کیوں نہ ہو مجھے عزیز ہے اور بے حد عزیز۔ اور اسی بنا پر میں اپنی اس کمزوری کو جھوٹ کی بد صورت آڑ میں چھپانا نہیں چاہتا کہ مجھے اس سے والہانہ محبت ہو چکی تھی۔ اور جہاں تک میں نے سوچا اور سمجھا ہے اسے بھی مجھ سے عشق تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ رہتی کہاں ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہی نہ تھا اور نہ میں نے پوچھا۔ مجھے تو بس اس کی ہی ذات سے سروکار تھا۔ عزت اور جاہ و حشمت پر فنا ہو جانے والے پروانوں کی طرح مجھے ان لوازمات سے لگاؤ رکھنا گوارا نہ تھا ــــ خیر تو ایک تاریک شب جبکہ میں دریا کی اندھیری سطح پر تاروں کی مدھم روشنی جذب ہوتے دیکھتے دیکھتے اونگھ رہا تھا کہ کسی نے مجھے بڑے زور سے جھنجھوڑ ڈالا "عفت پر اچانک ہیضے کا شدید حملہ ہوا۔ اب وہ مر چکی ہے اور اس نے مجھ سے تم تک اس کا آخری سلام پہونچا دینے کو کہا تھا۔" ــــ نرجی ذرا سوچو تو ــــ یہ خبر اور اسی جگہ جہاں ہم نے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنوں کو بہت قریب سے سنا تھا۔ اسی جگہ عین اسی جگہ جہاں اسوقت ہم اور تم کھڑے ہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ مجنوں کی طرح صحرا کی خاک چھانتا پھروں گا لیکن دیکھ لو کہ اب تک جی رہا ہوں۔ کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ تم کو بھی عماد سے اور عماد کو تم سے بے پناہ محبت ہے۔ انسان کو زمانہ

کبھی ایک حال پر نہیں رہنے دیتا ——— نرجی اب تمہیں اسی دل میں کسی اور کو جگہ دینی ہو گی"۔ بھائی جان پھر ذرا رُکے لیکن میں حیران تھی کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں۔ اور میرا دل سینے کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر میری ساری ہستی کو دہلائے دے رہا تھا۔ بالکل جیسے سمندر کی بے پناہ لہریں پتھروں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر رہ جاتی ہیں۔ لیکن کاش کہ میرے سینے کی دیواریں بھی ان پتھر کی چٹانوں کی طرح مضبوط ہوتیں۔ میں پریشان و ڈراونے خیالات کی رو میں بہتی جا رہی تھی کہ بھائی جان کہیں دور دیکھتے ہوئے پھر بولنے لگے "نرجی اسی پل پر اسی جگہ میں نے اپنی عزیز ترین ہستی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو دینے کی خبر سنی اور اب تم بھی اسی جگہ اور تقریباً اسی وقت سنو کہ تمہارا محبوب تم سے بچھڑ چکا ہے۔ تھوڑے دنوں کے لئے نہیں بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے۔ وہ یہاں آتے وقت ہوائی جہاز سے گر کر ختم ہو چکا ہے" ——— "بھائی جان" ———

شاید میں اپنی روح کی تمام تر قوتوں کے ساتھ صرف اتنا چیخ سکی اور پھر کچھ نہ بولی ——— بولتی کیسے بول ہی نہ سکی ———!

مسز عبد القادر مصنف "لاشوں کا شہر"

کی تازہ تصانیف

"وادیٔ قاف" (عہ) اور "راہبہ" (عہ)

مسز عبد القادر اس دور کی ممتاز اور صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "لاشوں کا شہر" اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے باعث غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ "وادیٔ قاف" اور "راہبہ" آپ کے افسانوں کے تازہ مجموعے ہیں۔ جن میں فن۔ زبان اور بیان کی خوبیاں جابجا جاگزیں ہیں تفننِ طبع۔ مناظرِ فطرت کی صحیح ترجمانی اور مشاہدات و تجربات کے عنصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

دیگر تصانیف

"صدائے جرس" (عہ) اور "لاشوں کا شہر" (عہ)

جو پُراسرار و ہیبت ناک افسانوں پر مشتمل ہیں۔ نیز جذبات کی عکاسی اور زندگی کے بعض حقائق کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔

ناشر

اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ۔ لاہور

اختر شیرانی کے شاہکار

ہندوستان کے مشہور و معروف رومانوی شاعر حضرت اختر شیرانی کا بے نظیر کلام چار حصوں میں شائع ہو گیا ہے جب دنیا سوتی ہے شاعر سوچتا ہے جب مزدور محنت کرتا ہے سرمایہ دار دبیہ کی جھنکار سے غریب کی عصمت لوٹنے پر فخر کرتا ہے کسان خون پسینہ ایک کر کے دنیا کی قوت لایموت کا انتظام کرتا ہے تو شاعر ان شاہدات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ مندرجہ ذیل تصنیفات انہی جذبات کی منہ بولتی تصویریں ہیں ایک ایک شعر کیف و سرور کا چھلکتا پیمانہ ہے

صبح بہار تین روپے — لالہ طور تین روپے — اخترستان تین روپے — طیور آوارہ تین روپے آٹھ آنے

عمدہ کاغذ — مضبوط جلد — دیدہ زیب گرد پوشش

جدید اُردو شاعری } مصنفہ پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ادب اردو میں ایک لاجواب تصنیف کا اضافہ اردو شاعری کے نئے دور پر سیر حاصل تبصرہ فاضل مصنف ہندوستان کے تنقید نگاروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اس تصنیف میں جدید شاعری کے اسباب و علل اور محرکات اور اس کے بانیوں کے کلام و جذبات کا تذکرہ وسیع النظری سے کیا گیا ہے۔ شاعری کے نشیب و فراز کا مطالعہ کر کے اُردو کے عروج کے متمنی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ جدید شاعری کے دلدادہ اور نئے رجحانات کے حامیوں کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف جو غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے تیسری دفعہ طبع ہوئی ہے قیمت تین روپے آٹھ آنے

ماڈرن اُردو ڈکشنری } مرتبہ صاحبزادہ عبد الحکیم خاں نشتر۔ جالندھری اس لغت میں ہر حرف کے تحت تمام مروجہ الفاظ درج کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں یہ کتاب انتہائی طور پر مستند اور مفید ہے عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بالعموم اور غریب طلبہ کیلئے بالخصوص یہ لغت ایک نعمت غیر مترقبہ ہے

ضخامت ۵۵۲ صفحات مجلد تین روپے آٹھ آنے

ہمارا قائد } قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن اُن کی قومی خدمات کے بعض پوشیدہ پہلو انگریزی کتاب نامی لیڈر کے فاضل مصنف زیڈ اے سلہری نے نہایت خوبی سے واگزار کئے ہیں۔ ہمارا قائد اسی کتاب کا اُردو ترجمہ ہے جس کو جہاں گرد صاحب نے نہایت قابلیت سے مزین کیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل تصنیف ہے قیمت مجلد عہ

کمال اتاترک } مسلمانانِ ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں، جس کی وجہ سے کمال اتاترک کی موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے خیال ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی شاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اس وقت پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے قیمت مجلد ہے

بہترین اخلاقی افسانے

نیلوفر۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ عہ

قسمت۔ دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے عہ

صبر و ضبط۔ معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ عہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

مانچسٹر یونیورسٹی میں طالبعلموں کی زندگی

مانچسٹر یونیورسٹی شہر کے مرکزی حصہ سے کسی قدر دور بنی ہوئی ہے۔ اور یہاں تک پہنچنے کے لئے طالب علموں کو ایک ٹوٹی پھوٹی اور اونچی نیچی سڑک سے یہ لمبا راستہ طے کرنا پڑتا ہے۔ یہ ناہموار اور ناخوشگوار راستہ طے کرنے کے بعد جب آدمی وہاں پہنچتا ہے تو اسے جو عمارتیں دکھائی دیتی ہیں انھیں خوبصورت کسی طرح بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یونیورسٹی کی عمارتوں میں داخل ہونے کا راستہ میلا کچیلا اور مایوس کن ہے۔ دوسری یونیورسٹیوں کی طرح، یہاں ایسا کچھ بھی نہیں جس سے دل میں سرور اور آنکھوں میں نور پیدا ہو۔ لیکن جونہی جانے والا اندر داخل ہوتا ہے، یہ ساری فضا بدل جاتی ہے — اس لئے نہیں کہ فضا میں کوئی حسن پیدا ہو جاتا ہے، بلکہ اس لئے کہ یہاں آکر زندگی میں ایک تیزی پیدا ہو جاتی ہے، اور زندگی کی اس رو میں شان و شوکت بھی ہے اور زندگی کے سارے آثار بھی۔

یونیورسٹی کا اجتماعی مرکز وہاں کا زبردست رستوران ہے، جسے صرف 'کاف' کہتے ہیں۔ یہ کاف دن کے ہر حصہ میں، صبح سے شام تک طالب علم لڑکوں، لڑکیوں سے بھرا رہتا ہے — کام کرتے ہوئے باتوں میں وقت گذارتے ہوئے، چاء اور قہوہ کی پیالیاں پیتے ہوئے اور کاف کے لمبے چوڑے اور روشن ہال کو گھما گھمی اور شور و غل سے بھرتے ہوئے کھانے کے وقت، یہ گھما گھمی اپنی معراج کو پہنچ جاتی ہے۔ ہال کی سیکڑوں میزوں سے کاؤنٹر تک آدمیوں کی ایک مسلسل زنجیر سانپ کی طرح لہراتی دکھائی دیتی ہے۔ ایک گھنٹہ تک یہ بھیڑ برابر بڑھتی رہتی ہے۔ اور اس کے بعد دیکھتے دیکھتے ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے — سوائے چند میزوں کے، کہیں کوئی لڑکا اور لڑکی آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور کہیں کوئی یکہ و تنہا طالبعلم دانتوں میں پنسل دبائے کتاب پر اپنا غصہ اتار رہا ہے۔

طالب علموں کی زندگی میں 'کاف' ایک ادارہ ہے اور ان کی زندگی کا ایک اہم مرکز۔ طالب علموں کو سوچنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا کتنا حصہ اس اہم مرکز کے لئے وقف کریں۔ اس لئے کہ کاف میں گپ بازی کا سامان بھی بے پایاں ہے، ہر طرح کے مذاق کے لئے اپنا ساتھی تلاش کرنے کے امکانات بھی بے حد ہیں — اور پھر وقت کے ضائع کرنے کے بھی۔ اور اس لئے فیصلہ کرتے وقت بڑی احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔

تاہم خوش وقتی کے وہ چند گھنٹے جو کاف میں گذرتے ہیں یونیورسٹی کی تعلیم کا اتنا ہی اہم حصہ ہیں جتنی کتابیں۔ حالانکہ عام طور پر یونیورسٹی کو کسی خاص قسم کی ٹکنیکل تعلیم کا مرکز سمجھنے کا جذبہ عام ہے اس لئے کہ شمالی علاقے کے ان طالب علموں کے احساس پر معاشی افکار کا بوجھ چھایا ہوا ہے۔ اور ان کا خاص مقصد صرف یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی خاص منتخبہ پیشہ یا کام کا اہل بنالیں۔

یونیورسٹی غیر اقامتی ہے اور مانچسٹر میں یا اس کے مضافات میں ایسا شاید کچھ بھی نہیں جو نظر یا احساسات کے لئے کسی تفریح یا تسکین کا سامان بن سکے۔ یہاں کے ناچ گھر، تصویر خانے اور تھیئٹر اچھے ہیں لیکن مصروف طالب علم کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ اتنے پیسے کہ وہ انکی سرپرستی کر سکے۔ یہاں ایک شاندار پبلک لائبریری بھی ہے جس میں بے حد خوش اخلاق عملہ کام کرتا ہے — یہاں طالب علم کو سکون اور خاموشی مل جاتی ہے، وہ ریلوں، لبوں، راستوں اور 'کاف' کی بھیڑ بھاڑ اور گھٹی ہوئی فضا سے بچکر لائبریری کی کھلی ہوئی فضا میں پناہ لے سکتا ہے اور یہ امن اور سکون اسے بغیر کچھ خرچ کئے حاصل ہو جاتا ہے۔

مانچسٹر کے طالب علم زندگی کی ان کمیوں سے بلند و بالا رہ کر جس طرح رہتے سہتے ہیں۔ دیکھنے والا اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

'کاف' کے علاوہ، مانچسٹر یونیورسٹی میں دو یونینیں یا یونیورسٹی کلب بھی ہیں — ایک مردوں کے لئے اور دوسرا عورتوں کے لئے۔ ان یونینوں کو (دوسری یونیورسٹیوں کے برخلاف) خود طالب علم ہی چلاتے ہیں۔ یونینوں کے چلانے کے لئے جن عہدداروں کا انتخاب کیا جاتا ہے انھیں انتظام کا بہت اچھا تجربہ ہو جاتا ہے اور اس تجربہ میں وہ بڑی ہوشیاری اور سمجھداری سے کام لیتے ہیں۔

مانچسٹر کی یونیورسٹی میں سیاسی اور بین الاقوامی، دونوں احساس موجود ہیں۔ یونیورسٹی انٹر یونیورسٹی کمیٹیوں کے لئے، یورپ کی دوسری یونیورسٹیوں میں جانے کے لئے اور دوسری یونیورسٹیوں سے آنے والے نمائندوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے، اپنے نمائندے چنتی ہے۔ اس کے باوجود کہ مانچسٹر کے طالب علموں کو ایک ایسی فضا میں رہنا پڑتا ہے جہاں نظر کے لئے سکون و تفریح کا کوئی سامان موجود نہیں، اور باوجود اس کے کہ اپنے گھروں پر رہنے کی وجہ سے انکی سوسائٹی بالکل محدود ہے۔ وہ حیرت انگیز حد تک بیدار ہیں۔

ایل اے جی اسٹرونگ

اگر مجھے یونیورسٹی کے طالب علموں کے سامنے بولنے کو کہا جائے تو باوجودیکہ آکسفورڈ میری 'مادر علمی' ہے، مجھے مانچسٹر کی یونین کے سامنے بول کر زیادہ خوشی ہوگی۔

مانچسٹر میں آکسفورڈ جیسی خوش مذاقی اور لطافت ہوگی، اور نہ وہاں کی تقریروں کی سی تیزی اور ذکاوت، لیکن اس کے بجائے وہاں ایک اور چیز ملے گی ـــ بحث کے موضوع کی تہ تک پہنچنے کی سچی کوشش، خواہ سچائی کی اس جستجو میں کہیں ایک بھدا پن اور کرختگی ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ کئی برس کی مدت میں جس نے جتنی تقریریں سنی ہیں، ان میں سب سے اچھی تقریر مانچسٹر یونین کی ایک ۱۹ برس کی لڑکی کی تھی۔

مانچسٹر کے دیہاتوں میں مجھے جابجا طالب علمی کی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور اس زندگی میں جو تازگی، شگفتگی اور جوانمردی مجھے دکھائی دیتی ہے اسے بے اختیار سراہنے کو جی چاہتا ہے ـــ اس لئے اور بھی کہ یہ خوبیاں طالب علموں نے ایک ناسازگار فضا میں رہ کر پیدا کی ہیں۔ ان کی ایک چیز اور ہے جس کے لئے میرے دل سے تحسین نکلتی ہے ـــ اور وہ یہ کہ انھیں ایسے معاملات سے بھی وہی پرجوش اور سچی دلچسپی ہے جن کا براہ راست ان سے کوئی تعلق نہیں۔

ایک موقعہ پر یونیورسٹی کے طالب علموں نے رائے کی بہت بڑی اکثریت کے ساتھ یہ بات طے کی کہ ان کے راشن میں کمی کر کے کھانے کا سامان جرمنی کے طالب علموں کو بھیجا جائے۔ اس تجویز میں یہ ترمیم پیش کی گئی کہ غذا بھیجنے کے معاملہ میں اتحادی ملکوں کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ ترمیم ۱۲۹ : ۷ رایوں سے رد کر دی گئی۔ میں رایوں کی اس تعداد کے متعلق کسی طرح کی رائے نہیں دینا چاہتا، میں تو صرف ایک واقعہ کا اظہار کر رہا ہوں۔ یہ تجویز کسی نسبتاً پرانی یونیورسٹی کے خوش حال طالب علموں نے نہیں پاس کی تھی، بلکہ ایک بڑے صنعتی شہر کے غریب اور مصیبت زدہ طالبعلموں نے۔ (لندن کالنگ سے ماخوذ)

غزل ـــ عرشی بھوپالی

نگاہِ شوق سے کب تک مقابلہ کرتے
وہ التفات نہ کرتے تو اور کیا کرتے

غرورِ حسن کو مانوسِ التجا کرتے
وہ ہم نہیں ہیں جو خودداریاں فنا کرتے

یہ رسمِ ترکِ محبت تھی ہم ادا کرتے
ترے بغیر مگر زندگی کو کیا کرتے

کہاں کے حضرتِ ناصح، نہ مانتا میں کبھی
مرے خلاف جو وہ بھی یہ فیصلہ کرتے

شکستِ ربط کی فرما رہے تھے وہ تردید
ہم اعتراف نہ کرتے تو اور کیا کرتے

ہمیں تو اپنی تباہی کی داد بھی نہ ملی
تری نوازشِ بیجا کا کیا گلا کرتے

نگاہِ لطف کی تسکین کا شکریہ لیکن
متاعِ درد کو کس دل سے ہم جدا کرتے

یہ پوچھ حسن کو الزام دینے والوں سے
جو وہ ستم بھی نہ کرتا تو آپ کیا کرتے

کسی کی یاد نے تڑپا دیا پھر آ کے ہمیں
ہوئی تھی دیر نہ کچھ دل سے مشورہ کرتے

ستم شعار ازل سے ہے حسن کی فطرت
جو میں وفا نہ بھی کرتا تو وہ جفا کرتے

جیون

جیون کی سُندر بگیا میں
آشاؤں کے پھول کھلے ہیں ٭ پیارے پیارے، رنگ برنگے
پھولوں میں کانٹے بھی لگے ہیں ٭ نراشا کے تیز نکیلے
جیون کی بہتی ندیا میں
لہروں بیچ چلی ہے نیّا ٭ آشا کے چپو کے سہارے
نراشا کا تیز جھکولا ٭ کہتا جائے "دور کنارے"
جیون کی میٹھی سندریا میں

سُندر اور سُنہرے سپنے ٭ آشا بن کر من للچائیں
نراشا کی پرا تا ہوتے ٭ بھیانک بھیانک روپ دکھائیں
مورکھ آشا نراشا میں کھو کر ٭ جیون کو کہتا ہے بگیا
سُندر بگیا بہتی ندیا
بہتی ندیا۔ میٹھی سندریا
جیون کا کچھ بھید نہ پائے ٭ کال کا پنچھی اُڑتا جائے
بگیا۔ ندیا۔ سندریا۔ سب پر ٭ اپنا گہرا رنگ جمائے
مورکھ آشا نراشا میں کھو کر
جیون کا کچھ بھید نہ پائے

نقش صحرائی

نقد و نظر

اقبال اس کی شاعری اور پیغام

مصنف :- جناب شیخ اکبر علی ایڈوکیٹ۔
ملنے کا پتہ :- کمال پبلشرز ۲ مال روڈ لاہور
۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۴۴ صفحات۔ مجلد قیمت ساڑھے چار روپے۔ مصنف نے علامہ مرحوم کی زندگی ہی میں ان کی شاعری پر چند مقالات بزبان انگریزی قلمبند کئے اور ایک ادبی مجلس میں سنائے، جو بہت پسند کئے گئے اور چند اضافوں کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو گئے۔ پھر اسی مجموعے کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ کتاب اردو میں لکھی جس میں اقبال کے اردو اور فارسی کلام کے سب مجموعے زیر بحث لائے گئے ہیں۔ کتاب پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تنقید کا زاویہ بالکل جدا لیکن نہایت مفید ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے پہلوؤں سے کلام اقبال کو جانچا ہے جہاں اتنک نقاد صاحبان کی نگاہ ذرا مشکل سے پہنچی ہے اور یہ شاید اسلئے کہ انہیں اقبال سے زبردست عقیدت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کا مطالعہ بڑا پُرخلوص رہا ہے۔ ان میں سخن فہمی کی صلاحیت بھی مطالعۂ اقبال ہی سے شروع ہوئی تھی۔ کتاب بارہ ابواب پر منقسم ہے لیکن ضمنی عنوانات کا شمار کیا جائے تو وہ سینکڑوں ہیں۔ پہلے باب میں حیاتِ اقبال پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے چند ہمعصر شعرا کے کلام سے موازنہ بھی کیا ہے۔ غرض یہ کہ ہر باب ایک مستقل کتاب ہے اور ان کا مجموعہ اپنی نظیر آپ۔ پیغاماتِ اقبال کو پوری طرح سمجھنے کے لئے یہ کتاب حد درجہ مفید ہے۔ اس کا دیباچہ سر عبدالقادر نے تحریر فرمایا ہے۔
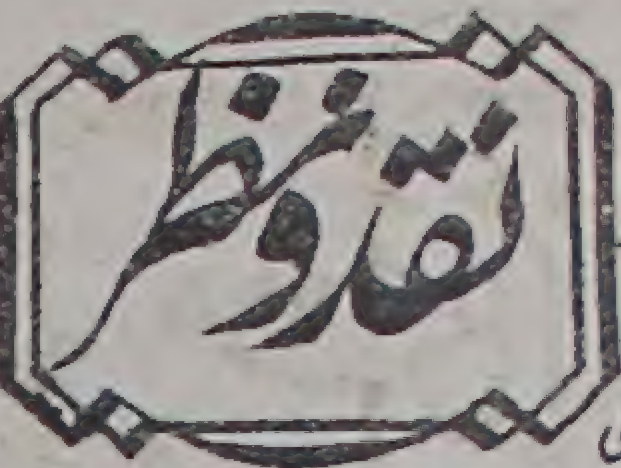
نشری نقاریر

مصنف :- مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب :- ناشر
ادارۂ نشریاتِ اردو۔ حیدرآباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۵۴ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ چودہ آنے۔ یہ ان پندرہ سائنسی مضامین کا مجموعہ ہے جو مصنف کبھی کبھی حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کرتے رہے ہیں۔ زیادہ موضوعات فلکیات سے متعلق ہیں۔ چونکہ موصوف جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل رہ چکے ہیں اسلئے ہر مضمون کو استادانہ رنگ میں پیش کرتے ہوئے انداز بیان اتنا سہل اختیار کیا گیا ہے کہ معمولی استعداد کے لوگ بھی پوری طرح سمجھ سکتے ہیں۔ تاہم طلبا کے لئے یہ کتاب حد درجہ مفید ہے۔ "کلیانی تجربے"۔ "بچپن کے بعد"۔ "دکن کی سرزمین" اور "حیدرآبادی نوجوان" اصل موضوعات سے الگ ہیں لیکن ان کی افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ ان میں بھی سائنسی رنگ اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ بعض علمی اصلاحات کی وضاحت حاشیہ پر یا آخر میں کر دی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔

تنقیدات

مصنف :- جناب ابوالسلام نعیم صدیقی۔ شائع کردہ :-
مکتبہ نشاۃ الثانیہ۔ چنچل گوڑہ۔ حیدرآباد دکن۔ ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۴۴ صفحات۔ مجلد قیمت عہ۔ قدامت پرستی سے الگ ہٹ کر بالکل ترقی پسند انداز میں چند اسلامی موضوعات پر گہری نظر ڈال کر مفید خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جن کا مطالعہ خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو بری طرح جھنجھوڑ کر بیدار کر سکتا ہے۔ اس زمانے میں کفر و الحاد کا جو عام رنگ پھیل چلا ہے یہ اسکے خلاف ایک زبردست آواز ہے۔ اس میں بعض اعتراضات کا معقول جواب بھی دیا گیا ہے جو کبھی کبھی اسلامی تعلیمات پر کئے جاتے ہیں۔ انداز بیان نہایت مؤثر اور دلاویز ہے۔ عام مسلمانوں کے علاوہ معترضین کے لئے بھی اسکا مطالعہ ضروری ہے۔

تذکرۃ الذاکرین

مولف :- مجدد مشرقیات آغا اشہر لکھنوی۔
ملنے کا پتہ :- صدیق بکڈپو۔ امین آباد پارک لکھنؤ۔
۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۲۶ صفحات۔ بلا جلد قیمت ایک روپیہ۔ واقعات کربلا اور شہادتِ حسین کے موضوعات پر تحریر یا تقریر کے ذریعہ اظہارِ خیال کرنے والوں کے حالات کتابی صورت میں جمع کئے گئے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک ایسا موضوع ہے کہ اس سے قبل کسی نے اسپر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ اسلئے ظاہر ہے کہ آغا صاحب کو کس قدر سعی و کاوش سے کام لینا پڑا ہوگا۔ ان صفحات میں خطابت و وعظ کے فرق اور خطیب و واعظ کی ذمہ داریوں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ کوفے کے بعد ذکر حسین کی ابتدا ہندوستان میں کب ہوئی اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ اس کا مرکز کب اور کس طرح قرار پایا۔ لکھنؤ میں شیعہ اور سنی حضرات میں جو جھگڑے ہوتے رہے ہیں ان کے ابتدائی اسباب بیان کئے ہیں۔ چونکہ واقعاتِ کربلا و شہادتِ حسین بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں کے لئے موضوعِ ذکر و فکر رہے ہیں اس لئے اس کتاب کا مطالعہ شیعہ و سنی دونوں کے لئے مفید ہو سکتا ہے خصوصاً اسلئے کہ آغا صاحب نے تعصبات سے الگ ہٹ کر اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں اور یوں بھی طرز بیان کی خوبیاں ہر شخص کو دعوت مطالعہ دیتی ہیں۔

انتخاب اور رائے دہی

مصنف :- جناب محمد نور اللہ :- ملنے کا پتہ :- مہتمم مجلہ طیلسانین۔ دفتر مجلس ناکش۔ باغِ عام حیدرآباد دکن۔
۲۰×۳۰/۱۶ کے ۹۲ صفحات۔ بلا جلد قیمت ایک روپیہ۔ انتخابات کی نوعیت ضرورت اور اہمیت پر بحث کرتے ہوئے رائے دہندگان کی صلاحیت، فرائض اور تنظیم پر روشنی ڈالی ہے۔ انتخاب کا قانونی طریقہ شروع سے آخر تک ان مرحلوں سمیت بیان کیا ہے جو اس دوران میں گذرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو غلط اور ناجائز طریقے اختیار کئے جاتے ہیں، ان کو بھی موضوع بنایا ہے۔ غرض ہر لحاظ سے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ زیادہ تر حیدرآباد کے شہری اور ریاستی انتخابات کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن اس سے عام موضوع کی افادیت پر کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا اور اسی لئے اسکا مطالعہ ان تمام حضرات کیلئے مفید ہو سکتا ہے جو اپنے شہری حقوق کا لحاظ رکھتے ہوئے انتخاب میں حصہ لینا چاہتے ہیں خواہ وہ کسی ریاست میں ہوں یا برٹش ہندوستان میں۔

ف۔ ح

ترکی کی مشکلات

گذشتہ ۱۰ مئی کو صدر ترکی عصمت انونو کے ایما پر "ری پبلکن پیپلز پارٹی" کا غیر معمولی جلسہ طلب کیا گیا۔ یہی وہ سرکاری پارٹی ہے جو بائیس سال سے ترکی پر راج کر رہی ہے اس موقعہ پر صدر انونو نے پارٹی کے پروگرام میں یا یوں کہئے کہ حکومت کی پالیسی میں بعض تبدیلیوں کا اعلان کیا۔ فوری سیاسی نقطۂ نگاہ سے ان میں سب سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ شہری اور ملکی دونوں انتخابات آئندہ سال کی بجائے اگلے چند مہینوں میں ہو جائیں۔ اول الذکر اسی مہینے شروع ہوں اور موخر الذکر ۱۹۴۷ء کی کسی غیر معینہ تاریخ کی بجائے ستمبر ۱۹۴۶ء میں ہوں۔ انہوں نے بالواسطہ اور کلی حق رائے دہندگی کا بھی اعلان کیا تاکہ رائے دینے والے اور نمائندے کے مابین مضبوط رشتہ استوار ہو سکے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ پارٹی کے دوامی رہنما کا عہدہ نہیں چاہتے بلکہ اس مدت کو چار سال کے لئے محدود کر دینا چاہتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے قول کے مطابق آئین انجمن میں ایسی ترمیم کی جائے گی کہ تاجروں اور پیشہ وروں کی انجمنیں بنانے میں آسانی ہو جائے۔ مختصراً یہ کہ انہوں نے آمریت کا شکنجہ ڈھیلا کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس رویہ کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو ترکی پر بیرونی دباؤ کا خطرہ۔ اس کے مقابلے کے لئے ضروری ہے کہ حکومت کی بنیادیں زیادہ مستحکم کی جائیں۔ دوسرے یہ کہ ترکی کے اندر جو اعتراضات کی بھرمار اور بے چینی بڑھتی جاتی ہے، اس کا سدباب کیا جائے۔ اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ حکومت اصلاح کے میدان میں پہلا قدم اٹھائے، اور نکتہ چینیوں سے بازی لے جائے۔ غرض یہ کہ بیرونی اور اندرونی حکمتِ عملی کی خاطر حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح قبول عام حاصل کرے۔

غالباً بیرونی دباؤ سے حکومت زیادہ متفکر ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں سات سال سے ترکی اس دباؤ کا سامنا کر رہا ہے۔ صرف دوران جنگ ہی میں نہیں بلکہ اعلانِ صلح کے بعد سے بھی ترکی لام بندی کی حالت میں رہتا آیا ہے اور نتیجہ یہ کہ اس کا ملک کی اقتصادی اور مالی حالت پر بہت برا اثر ہو رہا ہے۔ مجھے دونوں کے مقابلے میں خصوصاً اب لام بندی کا بار ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ غیر جانبدار رہتے ہوئے ترکی کو درِ دانیال اور بحر یونان کی حفاظت کرنی ضروری تھی کیونکہ ان پر جرمنی کے حملے کا ڈر برابر لگا رہتا تھا۔ اگرچہ حفاظتی کارروائی کے سلسلے میں ترکی زیر بار رہا لیکن اس کا صلہ یوں ملا کہ وہ اپنا مال کسی قدر زیادہ دام پر فروخت کر سکا۔ جرمن خریداروں اور برطانیہ کی انجمن خرید و فروخت کے نمائندوں نے عالمگیر معیار سے سو فی صدی زیادہ پر جنسوں کا مقابلہ کیا۔ امریکہ نے ادھار پٹہ کا جو انتظام کیا تھا، ترکی نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ لیکن آج آمد و خرچ کا نقشہ بدل چکا ہے۔ آمدنی کے ذرائع تو مسدود ہو گئے لیکن اخراجات میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ روس کے دباؤ کی وجہ سے جو کبھی تو دردانیال کے انتظام میں تبدیلی کا مطالبہ کرتا ہے، کبھی حکومت کے غیر جمہوری ڈھانچے پر حرف زنی کرتا ہے اور کبھی ترکی کی مشرقی سرحد میں تبدیلی پر زور دیتا ہے، حکومت ترکی نے محسوس کیا کہ مجبوراً اپنی فوجی تیاری میں کوئی تخفیف نہ کرے۔ عارضی طور پر اگر جمود و تعطل کی فضا پیدا ہوئی بھی تو ماسکو سے نشر ہونے والے پریشان کن ریڈیائی اعلانات نے اس کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ کبھی آذربائیجان میں پھیلنے والے انتشار نے اور کبھی مشرقی اناطولیہ اور ایران میں کردوں کی شورشوں نے سر اٹھا کر ترکی کی گھبراہٹ میں اضافہ کر دیا۔

یہ ماننا پڑے گا کہ یہ پریشانی بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ ابھی جنگ ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ماسکو اور انقرہ کے مابین کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ مشرقی اناطولیہ میں جرمن جاسوسوں اور غیر ملکی پناہ گزینوں کا جم غفیر تھا جن سے روس کو خطرہ محسوس ہوا اور اسی لئے ایک قسم کی نفرت اور برہمی پھیلتی چلی گئی۔ نوبت یہ این جا رسید کہ مارچ ۱۹۴۵ء میں اسی کشیدگی کی بنا پر روس نے ترکی سے صاف صاف کہہ دیا کہ ان حالات میں ترکی اور روس کے مابین دوستی کے معاہدے کی تجدید نہیں ہو سکے گی۔ اس اعلان کے فوراً ہی بعد مسٹر مولوٹوف نے ترکی کے سفیر متعینہ ماسکو کو لکھ بھیجا کہ ان شرائط پر دونوں ملکوں میں نیا معاہدہ عمل میں آ سکتا ہے۔ ان میں سے اہم شرائط یہ ہیں:- (۱) مونٹرو والی قرارداد میں ترمیم کر دی جائے۔ (۲) درۂ دانیال میں روس کو فوجی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ (۳) مشرقی ترکی کے تین اضلاع، قارس، اردہان، اور آرطوین واپس کر دئے جائیں۔ قدرتی امر تھا کہ حکومتِ ترکی نے ان شرائط کو ناقابل قدر سمجھا اور اسلئے دوستی کا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔ اسکے بعد ساری دنیا کے آرمینی عیسائیوں کو ماسکو اکساتا رہا کہ وہ ترکی آرمینیہ کو

پی ایل آہوجہ

آرمینی جمہوریت سے ملا دینے کا مطالبہ کریں کیونکہ وہ سوویت یونین کا ایک حصہ ہے۔ ادھر جارجیا کے پروفیسر کہنے لگے کہ ان کی جمہوریت کو توسیع کا حق حاصل ہے۔ اس شور و غوغا کا نیزان حملوں کا جو ماسکو ریڈیو کے ذریعہ ترکی کے ارباب حل و عقد اور ان کے اداروں پر ہو رہے تھے اس کے سوا کچھ مطلب نہیں تھا کہ روس اپنے تیل کے علاقے کے جنوب اور مشرق کے ملکوں میں ایسی حکومتیں بنانی چاہتا ہے جو اس کے اغراض کا تحفظ کر سکیں۔

اس دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لئے ترکی کو مستقل طور پر دس لاکھ سپاہیوں کی فوج کو ہتھیار بند رکھنا پڑا۔ ان پر جو سالانہ خرچ آتا ہے، وہ ایک ارب روپے سے زیادہ یعنی قومی بجٹ کا نصف حصہ ہوتا ہے۔ اخراجات کا یہ بار ملک کو تباہ کر رہا ہے کیونکہ اب نہ تو زمانۂ جنگ کی تجارت باقی ہے اور نہ ادھار پٹے کی رعایت۔ لڑائی سے پہلے ترکی کا مال وسطِ یورپ خصوصاً جرمنی میں خوب بکتا تھا۔ اب وہ بازار غارت ہو چکا ہے۔ رہ گئے دنیا کے دوسرے ملک وہ ترکی کا مال ان قیمتوں پر خریدنے سے رہے، جن کا عادی ترک تاجر ہو چکا تھا لہذا ترکی میں معاشی ابتری بے حد پھیلی ہوئی ہے۔ ملک کو حمل و نقل کے لئے گاڑیوں اور دوسری کلوں کی سخت ضرورت ہے لیکن ان کی درآمد کے لئے غیر ملکی تبادلہ محدود ہے، دوسری طرف اس کے منہ مانگے دام پر کوئی بھی ملک ترکی کا مال خریدنے کو تیار نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اتنی بڑی فوج برقرار رکھنے کی وجہ سے ملک میں مزدوروں کی کمی ہو گئی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ معاوضے میں اضافہ اور ٹیکس کی زیادتی ہو گئی۔ آمد و رفت کے ذرائع محدود ہونے کی وجہ سے کرایہ وغیرہ بھی زیادہ لیا جاتا ہے۔ لیکن باہر کا مال نہ آنے کی وجہ سے جنگی بالکل وصول نہیں ہوتی۔ اسلئے برآمدی مال کی قیمتیں کم نہیں ہو سکتیں۔

غرض ہزارہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اس اقتصادی بدحالی کا قدرتی اثر ملک کی اندرونی سیاسی حالت پر بھی پڑ رہا ہے۔ چنانچہ عوام میں بے اطمینانی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے خیال گذرتا ہے کہ روس کا منشا بھی یہی ہے کہ ترکی پر مستقل لام بندی کا بار ڈال کر اسے اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے تباہ کر دے۔

انہی اسباب کی بنا پر صدر انونو چاہتے ہیں کہ اندرونی معاملات کو سدھار لیں اور سرکاری یا غیر سرکاری اعتراضات کو دبا کر آگے بڑھ جائیں۔ ان کے موجودہ اقدامات کی غرض و غایت یہی ہے۔ مخالفت کو دو قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے، ایک کا تعلق براہِ راست "پیپلز پارٹی" سے ہے۔ مخالف جماعت کا نام "ڈیموکریٹک پارٹی" ہے۔ اس کی قیادت ایم جلال بیار کے ہاتھ میں ہے جو پہلے ترکی میں قومی اقتصادیات کے وزیر تھے۔ اس جماعت کا لائحۂ عمل حکومت کے طریقۂ کار سے کسی قدر مختلف ہے۔ اسکے اراکین زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنکو پچھلے سال پیپلز پارٹی سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کی پشت پناہی چند مشہور آزاد خیال اور بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں ترقی کے راستوں سے روک دیا گیا تھا۔ لیکن ابتک انہوں نے مضبوط قدم اٹھاتے ہوئے اپنے رجحان طبع کا کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ اس نے تو کوئی ایسا کارنمایاں بھی پیش نہیں کیا جو اس سے قبل دائرۂ وجود میں آنے والی مخالف جماعت نے کر دکھایا تھا جس کی قیادت مسٹر فتح اوخیار نے کی تھی اور جسے ۱۹۳۰ء میں کچل کر رکھ دیا گیا۔ شاید موجودہ مخالف جماعت نے کسی مضبوط بنیاد پر اپنا نظام قائم کیا ہو۔ انتخابات کے دوران

غزل

ادیب سہارنپوری

شیخِ حرم نئے ہوں حرم بھی نئے نئے ۔۔۔ تبخانے چاہتے ہیں صنم بھی نئے نئے
کن منزلوں کی تاک میں ہے کاروانِ زیست ۔۔۔ راہیں نئی ہیں نقشِ قدم بھی نئے نئے
اک مستقل جنوں ہے امنگوں کے ساتھ ساتھ ۔۔۔ خوشیاں نئی نئی ہیں تو غم بھی نئے نئے
فطرت کا اقتضاء ہے بہر حال بندگی ۔۔۔ تم خود تراش لو گے صنم بھی نئے نئے
تابِ مقابلہ بھی خدا نا خدا کو دے ۔۔۔ طوفاں بھی پرخروش ہیں یم بھی نئے نئے
صبحِ وصالِ یار کا قصہ بھی تو یہ تو ۔۔۔ نقش و نگارِ شامِ الم بھی نئے نئے
"زردار حاتموں" کو کوئی پوچھتا نہیں ۔۔۔ کاسے نئے ہیں دستِ کرم بھی نئے نئے
ان کی عنایتوں کے فسانے نہ پوچھئے ۔۔۔ غم بھی نئے نئے ہیں ستم بھی نئے نئے
قیدِ غمِ نیاز سے ممکن نہیں نجات ۔۔۔ ہے انجمن نئی تو صنم بھی نئے نئے

کیا غم جو اجنبی ہے ذرا گفتگوئے شوق
تم بھی نئے نئے سے ہو ہم بھی نئے نئے

بھی اس امر کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس کی اہمیت کس قدر ہے۔ چونکہ انتخابات کی تاریخیں بڑھادی گئی تھیں اسلئے اس نے شرکت سے انکار کردیا اور کہا کہ وہی تاریخیں مقرر کی جائیں جو پہلے طے کی جاچکی تھیں۔

ایک اور مخالف جماعت بھی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ ہواؤں کا رخ دیکھتے ہوئے ترکی کی رفتار عمل کو بدل دے گی۔ لیکن چونکہ روس سے اس کی سازباز تھی اس لئے حکومت نے اسکو پنپنے نہ دیا۔ پریس کو بہت کچھ آزادی دینے کے وعدوں کے باوجود اخبارات پر پہرا احتساب لگی ہوتی ہے اور ان کے ہر فعل کو روکا جاتا ہے۔ مثلاً ۴، دسمبر کو نام نہاد محبان وطن نے ان کے دفتروں اور چھاپہ خانوں میں آگ لگادی اور یہ سب کچھ دانستہ طور پر ہوا کیونکہ اگر پولیس کو ہدایات دی جاتیں تو اس کی روک تھام آسانی سے ممکن تھی۔ اس کے بعد اخبار "تان" کے مدیر مسٹر اتمار کو اور اس کی بیوی کو جمہوریوں کی حامی ہے گرفتار کرکے کچھ عرصے کے لئے معطل کردیا۔ اس سلسلے میں کوئی پیشی نہیں ہوئی۔ بلکہ انہیں اس جرم میں کہ انہوں نے حکومت کے وقار کا مضحکہ اڑایا ہے ایک سال کی سزا دیدی گئی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومت سیاسی اعتبار سے وہ مرتبہ دوبارہ حاصل کرسکتی ہے یا نہیں جسے وہ کھوچکی ہے۔ بہت کچھ انحصار ان غیر ترکی النسل باشندوں پر ہے۔ مثلاً آرمینی، کرد، یہودی اور دوسرے لوگ — جنکے خلاف پچھلے چند سالوں پر کافی تفریق و امتیاز کا سلوک روا رکھا گیا، خصوصاً ان پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔

جہاں تک اقتصادی حالت کا تعلق ہے وہ اپنی حیثیت استوار کرنے اور ہردلعزیز بننے کے لئے کئی کام کرسکتی ہے۔ سب سے پہلی چیز لام شکنی ہے۔ زمانۂ جنگ کے بہت سے تجربات حاصل کرلینے کے بعد یہ محض بے وقوفی ہے کہ ایک مختصر سی حکومت ایک بے پناہ قوت والی فوج اپنی سرحد پر خواہ مخواہ ڈالے رکھے۔ اگر بفرض محال روس کی جانب سے حملہ بھی ہو تو ترکی مدافعت کے ان روایتی طریقوں کو عمل میں لاسکتی ہے جن سے اس طوفان کا سدباب ہوسکتا ہے۔ ترکی ایک پہاڑی ملک ہے اسلئے بڑے پیمانے پر وہ فضائی حملے کی روک کے لئے کوئی اہم مرکز قائم نہیں کرسکتا البتہ اسے اپنے چھاپہ مار سپاہیوں کو گڑھوں اور پہاڑی کھوؤں میں چھپا کر رکھنا پڑے گا تاکہ دشمن کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے سیلاب کو فوراً روکا جاسکے۔ اس کام کے لئے موجودہ فوج کا صرف تہائی حصہ کافی رہ سکتا ہے۔ لہذا اگر لام شکنی سے ملک کی مدافعت کسی طرح بھی کمزور نہیں پڑسکتی تو خرچ کم ہوجانے سے قوم کی اقتصادی حالت ضرور سدھر سکتی ہے۔

اس کے علاوہ اور طریقے بھی عمل میں لانے ہیں تاکہ ترکی کی بین الاقوامی تجارت ایک بار پھر فروغ پاسکے۔ مثلاً اس وقت تجارت کے سلسلے میں جو مصنوعی رکاوٹیں لگا رکھی ہیں فوراً ترک کردی جائیں۔

مضبوط بنیادوں پر ایک ایسا ملک جو بیک وقت اندرونی اختراعات کی بھرمار کو اور غیر ملکی دباؤ کے اثرات کو جھیل سکے ایک دن میں تعمیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایسا ہونا ناممکنات میں سے نہیں ہے بشرطیکہ صدر انونو مخالف جماعت سے زیادہ مفاہمت کے ساتھ بازی کھیل سکیں جس میں سیاسی خصوصیات کے ساتھ ساتھ نسلی امتیازات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہو۔ پچھلے چند سالوں میں انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی قوم کو عروج دینے میں کمال اتاترک کی حکمت عملی بہت بلند پایہ تھی۔ ان کی رہنمائی میں ترکی دنیا بھر میں مقبول ہوگیا۔ اس کی کامیابی پر پاس پڑوس کے لوگ آتشِ رشک سے جلنے لگے۔ اگر جنگی اعتبار سے ملک کے محل وقوع کا لحاظ رکھتے ہوئے یا پرانی وضع سے جنگی طریقوں کو عمل میں لاتے ہوئے یا اس کی اقتصادی ابتری کے پہلو پر غور کرکے اس طریقۂ کار کو اختیار کرلیا جاتا جب اس کی بابت کہا گیا تھا کہ "وہ یورپ میں بستر مرگ پر لیٹے ہوئے بیمار کی حیثیت رکھتا ہے" تو ظاہر ہے کہ ترکی کے لئے اس سے بڑا کوئی سانحۂ عظیم نہ ہوتا۔ بیمار اب بھی خطرے میں ہے۔ لیکن اس کی صحتیابی کی امیدیں ہنوز قائم ہیں۔

موجودہ نظام کے مطابق ایک ترکی تاجر کے لئے جس نے مال درآمد کرنے کے لائسنس حاصل کرلیا ہو یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ لائسنس جاری ہونے پر چار ماہ کے اندر اندر مال جہازوں پر لد جائے ورنہ لائسنس منسوخ ہوجائے گا۔ لیکن اسوقت جبکہ ساری دنیا میں جہازوں کی کمی ہے اور ان کی صحیح روانگی کا کبھی یقین نہیں کیا جاسکتا، ایسی شرط ناقابل عمل ہے۔ تجارتی مال کی مانگ اس کی فراہمی کے مقابلے میں ابھی بہت بڑھی ہوئی ہے اور غیر ملکی تاجر مصنوعی رکاوٹوں کو توڑ دینے کی کوشش کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں جبکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا مال کسی قسم کی دشواری کے بغیر دوسرے ملکوں کی منڈیوں میں جاتے ہی فوراً بک جائے گا۔ اس تمام نظام کا احتیاط سے جائزہ لینا اور ان پابندیوں کو ہٹا دینا ضروری ہے جو تجارتی ترقیوں میں حائل ہوں۔

تجارتی ترقیوں کے سلسلے میں ایک اور اہم پہلو پر غور کرنا بھی ضروری ہے اور وہ ہے ترکی پونڈ کی شرح مبادلہ۔ اس وقت ایک اسٹرلنگ پونڈ کے عوض ۵۲۲ پونڈ دینے پڑتے ہیں اور یہ شرح تقریباً

معین ہے۔ اگر مال برطانیہ بھیجا جائے تو اس پر چالیس فیصدی پریمیم بھی منظور کر دیا جاتا ہے۔ اگر اصل قدر و قیمت میں اضافہ ہو جانے کے باوجود ترکی پونڈ کی قیمت بجنسہ رہے تو ظاہر ہے کہ ترکی سے باہر جانے والے مال کے دام گر جائیں گے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر چیزیں اندرونِ ملک میں صرف ہوں تو خریدار پر مزید بار پڑے گا لیکن اگر باہر بھیجنے کی صورت پیدا کر لی جائے تو زیادہ مقدار میں باہر کی چیزیں آ سکتی ہیں اور اس طرح خریدار کو زیادہ فائدہ رہ سکتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ قانون بھی اصولِ تجارت کے خلاف ہے جس کی رو سے ترکی میں قائم ہونے والی غیر ملکی کمپنیوں کے لئے اپنا منافع باہر بھیجنا ممنوع قرار دیدیا ہے۔ اپنے ملک کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے حکومتِ ترکی کو غیر ملکی سرمائے کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ ایسا سرمایہ آسانی سے اسوقت تک میسر نہیں آ سکتا جبکہ منافع کے ایک مخصوص حصے کو باہر بھیجنے کی اجازت نہ مل جائے۔

حکومت ترکی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ غیر ملکی زائرین کو اپنے ہاں آنے کی سہولت دے۔ ترکی زائرین کے لئے ایک نہایت مناسب ملک ہے کیونکہ وہاں قدرت کی حسن کاریاں چپہ چپہ پر موجود ہیں۔ اس کی تاریخی حیثیت بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر تفریح کے اعتبار سے بھی اس کا شمار اعلیٰ ملکوں میں ہو سکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ موجودہ لڑائی کے بدنما داغوں سے اس کا دامن بچا رہا ہے۔ اب تک اس کی اس اہم تجارت کو ترقی دینے کے لئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی ہے لیکن صنعتی اعتبار سے اہمیت حاصل کر لینا اس کے لئے یقینی ہے۔ ("فورن ریویو" سے ماخوذ)

مشہور و معروف حلوہ سوہن کی واحد قدیمی شاہی دکان

حلوہ سوہن کی ہر قسم۔ حبشی پستئی۔ جوزی، بادامی، پپڑی۔ پپڑی گری۔ گھی پپڑی زعفرانی وغیرہ ہمارے ہاں تیار ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ تمام ہندوستانی مٹھائیاں بھی ملتی ہیں۔

نوٹ:۔ آرڈر آنے پر مال بذریعہ وی۔پی بھی بھیجا جاتا ہے۔

شیخ عبدالخالق شاہی حلوہ سوہن والے چاندنی چوک دہلی

سیرت کی کتابیں

خاتم النبیین۔ ولادت، رضاعت، ہجرت و معجزات کے مستند حالات

حسین ابن علی۔ واقعہ کربلا کے نفسیاتی اور اخلاقی پہلو کی تاریخ مجلد

الصدیق۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے سوانح حیات

سیرۃ الفاروق۔ حضرت عمر بن الخطاب کے حالات زندگی

ذوالنورین۔ حضرت عثمان غنی کی سوانح عمری ۱۰ر

اسد اللہ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے سوانح حیات

سیف اللہ۔ خالد بن ولید کی جنگی خدمات کی تاریخ

تذکرۃ الاولیا۔ تمام اولیاء اللہ کے مفصل حالات زندگی

سوانح عمری غوث الاعظم۔ شیخ عبدالقادر صاحب جیلانی کی سیرت ۱۲ر

قصص الانبیا۔ حضرت آدم سے لیکر حضور اکرم تک انبیاء کے حالات

موازنہ صلیب و ہلال۔ مسلمانوں کے تمدنی اور معاشرتی شعبوں کی مستند تاریخ

دوست درزیاں۔ ہر فیشن کے کپڑوں کی کاٹ کا بہترین رہنما مجلد

ہوم ڈاکٹر یا گھر کا حکیم۔ سر سے لیکر پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا علاج

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ناشران کتب۔ کشمیری بازار لاہور

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱۔ غزل .... حضرت جگر مرادآبادی ......
۲۔ اُردو زبان کے مورخ نصیر الدین ہاشمی (مع تصویر) .. محترمہ ربیعہ سلطانہ بابو پوری
۳۔ صدر الدین عینی۔ ایک تاجیک ادیب .. جناب ل احمد اکبرآبادی ...
۴۔ لسان اُردو .... ڈاکٹر مولوی عبدالحق .....
۵۔ افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات ... جناب احمد علی کہزاد ....
۶۔ موٹے آکا (خاکہ) .... جناب اشرف صبوحی ....
۷۔ "ہجوم تجلی سے معمور ہو کر" جگر کی شاعری کا روشن ترین پہلو ...... جناب اکبر فاروقی مرادآبادی ....
۸۔ چینی دیو مالا .... فضل حق قریشی دہلوی .....
۹۔ زندگی کا ناچ (افسانہ) ..... جناب خالد حسن قادری ....
۱۰۔ جنوب مشرقی ایشیا اور ہندوستان ... جناب جی آر وینکٹا رامن ....
۱۱۔ خرات .... حضرت نہال سیوہاروی ..
۱۲۔ میرے من کی آشا جاگ (گیت) ... جناب بالمکند عرش ملسیانی

دنیا کی سب سے بڑی دوربین

بمقام کیلیفورنیا ماؤنٹ بالوسر کی رصدگاہ میں دوسو انچ قطر کے شیشے والی دوربین بنائی جارہی ہے۔ یہ کام ۱۹۳۵ء میں شروع ہوا تھا۔ دوربین کا شیشہ ۱۹۳۶ء میں ہی منگا لیا گیا تھا لیکن اسے ہموار کرانے میں پورا ایک سال لگ گیا۔ اس دوران میں اس کا تقریباً ڈیڑھ سو من وزنی فالتو حصہ کھرچ کر یا رگڑ کر پھینک دیا گیا۔ اب شیشے کا وزن ۴۲۰۰ من اور تمام پرزوں سمیت کل دوربین کا وزن ۱۴۰۰۰ من ہے۔ تاہم معمولی قوت برقی سے اس کو حرکت دی جاسکتی ہے۔ اس صفحے کی تصاویر میں اس کے مختلف حصے دکھائے گئے ہیں۔ مثلاً (سامنے) دوربین کے خول کا ایک خاص زاویے سے نظارہ (نیچے دائیں طرف) دو سو انچ کی دوربین کا کاغذ پر بنا ہوا خاکہ۔ تیار ہو جانے پر دوربین اسطرح نصب کی جائیگی۔ (نیچے بائیں طرف) گھوڑے کے نعل کی وضع کا ۴۶ فٹ طویل حصہ جس کا سہارا لیتے ہوئے دوربین ادھر ادھر گھوم سکا کریگی۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	-	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں ـ ایک سو اسی صفحات ـ دو نقشے ـ کپڑے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) ـ

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) ـ

خاص رعایت «عربی - انگریزی جملے» نوے صفحات ـ گتے کی جلد ـ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ ـ کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ـ

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد ـ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) ـ

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ ـ پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ ـ دہلی

آجکل

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
نیپال
ہندوستان
عربستان
مصر
برما
انڈو چائنا

AJKAL

اردو زبان کے مشہور مورخ جناب نصیرالدین ہاشمی۔ انکے حالات زندگی اور ادبی خدمات کی تفصیل اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۸ سے ملاحظہ کیجئے۔

AJKAL No. 10 Vol. V. 15th October 1946

آپ بیمار ہیں

دُنیا میں کامیابی کا راز دو لفظوں میں یہ ہی کہ محنت کیجیے اور خوب محنت کیجیے محنت کرو دولت پیدا ہوگی اور دولت سے عیش و آرام۔ مگر اس کیلئے تندرستی کی ضرورت ہے اگر یہ نہیں اور آپ بیمار ہیں تو محنت، دولت آرام صرف خواب و خیال، ساری عمر تکلیف و مُصیبت میں گزارنا ہوگی، کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

بیماری خدا دشمن کو بھی نہ دے، پیسہ کا خرچ، روزگار بند، مُصیبت پر مُصیبت علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہ رہا ہے، مگر فائدہ نہیں مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ یہ مرض کیوں بڑھ رہا ہے فائدہ کیوں نہیں ہوتا اس کا جواب یہ ہے۔ کہ مرض کی تشخیص نہ ہو سکی، دُوا خالص اور عمدہ نہیں ملی، بڑی گلی دواؤں سے ناتجربہ کار طبیب سے فائدہ کی کیا اُمید ہو سکتی ہے

اگر آپ کے دوستوں میں سے کوئی صاحب کسی پیچیدہ اور پرانے مرض میں گرفتار ہیں تو اُن کے حالات ناظم شعبہ تشخیص مجلس الطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی کو فوراً لکھ کر روانہ کیجیے!

یہاں مرض کے حالات تجربہ کار کہنہ مشق طبیبوں کی مجلس میں پیش ہوتے ہیں اس مجلس کے صدر دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سینیر ہاؤس فزیشن وائس پرنسپل جامعہ طبیہ، و ایڈیٹر رسالہ "مسیح الملک" ہیں

مجلس الطبا میں مرض کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے، بحث ہوتی ہے، ہر طبیب اپنے اپنے تجربہ کی بنا پر رائے ظاہر کرتا ہے، اور بالآخر متفقہ رائے سے مرض کی صحیح تشخیص عمل میں آتی ہے دوا تجویز ہوتی ہے مریض کو اطلاع دیجاتی ہے اور اس طرح روزانہ صدہا پیچیدہ مسلے حل ہوتے ہیں تشخیص و تجویز کا یہ طریقہ اس قدر صحیح اور بہتر ثابت ہوا ہے، کہ اب صرف ملک کے ہر گوشے کے مریض، بلکہ بہت سے طبابت پیشہ اصحاب ڈاکٹر، حکیم اور وید بھی اپنے زیر علاج مریضوں کے پیچیدہ امراض کی بابت مجلس الطبا، کا مشورہ طلب کرتے ہیں اس طرح ہزاروں مایوس مریض اس مجلس کی صحیح تشخیص کی بدولت نئی زندگی حاصل کر چکے ہیں اگر آپ کسی پیچیدہ یا پرانے مرض میں گرفتار ہیں اور آپ کا وقت خراب ہو چکا ہے اور دولت برباد ہو چکی ہے، تو ایک بار ہمیں حالات لکھ کر یا اجملی شفاخانہ باڑہ ہندو راؤ میں تشریف لا کر مشورہ کیجیے، جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ یا لفافہ آنا ضروری ہے، رسالہ مسیح الملک بطور نمونہ طلب فرمائیے، اوقات مشورہ صبح ۱۰ سے ۱۲ بجے تک، شام ۵ سے ۸ بجے شب تک

عہد حاضر کا مایہ ناز طبی شاہکار

مسیح الملک کا علاج

رعایتی قیمت پر

جو ماہنامہ مسیح الملک کی جانب سے اپریل سنہ ۱۹۴۶ء میں خاص نمبر کی صورت میں نہایت شاندار طریقہ پر شائع کیا گیا ہے، اس میں سر سے پاؤں تک کے وہ تمام پیچیدہ اور پرانے امراض نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جن کے علاج میں اکثر مریضوں اور معالجوں کو ناکامی ہوتی رہتی ہے، اور ساتھ ہی ہر ایک مرض کے ذیل میں اجمل اعظم مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے خاص خاص طبی رموز و نکات طریقہ علاج اور وہ بیش قیمت مجربات پیش کئے گئے ہیں جن کی تلاش میں دنیا بے چین ہے۔ ضخامت دو سو صفحات سے زائد کتابت طباعت نہایت نفیس اور قیمت ان سب خوبیوں کے باوجود صرف دو روپیہ۔ خاص رعایت، لیکن جو لوگ تین روپیہ سالانہ چندہ بھیجکر ماہنامہ مسیح الملک کے مستقل خریدار بنیں گے اُن سے دو روپیہ کے بجائے اس کی قیمت صرف ایک روپیہ لی جائے گی، اور اس طرح وہ پانچ کے بجائے چار روپے میں حاصل کر سکیں گے۔ لہٰذا آپ بھی آج ہی مبلغ چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجیے، ایک سال تک مسیح الملک بھی پڑھیے اور بیش قیمت مجربات کا ذخیرہ بھی رعایت کے ساتھ حاصل کیجیے، منی آرڈر بھیجنے والوں کے لیے محصول ڈاک معاف، بطور نمونہ مفت طلب کیجیے

دفتر رسالہ مسیح الملک پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی

مینیجر مجلس الطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی

مرد برائے صحتِ جلد ریکسونا استعمال کرتے ہیں

THE NEW Rexona MEDICATED SOAP

Rexona MEDICATED SOAP CONTAINING CADYL

اب جھاگ سے لبریز خوشبو سے معطّر

ایسی رائے جلدی قائم نہ کیجیے کہ رکسونا صرف مستورات ہی کی خوبصورتی کیلئے ہے. یہ ٹائیلیٹ صابن ہر اس فردو بشر کیلئے نہایت مفید ہے جو کہ صحتِ جلد کا خواہشمند ہے. یہ ایک نہایت عمدہ قسم کا صابن ہے جو کہ جسم کو قوت تروتازگی اور راحت بخشتا ہے اس کے استعمال کا لطف خاصکر مرد ہی اٹھاتے ہیں

سب سے بڑا فائدہ اس عمدہ سبز اور زود جھاگ پیدا کرنیوالے صابن کا یہ ہے کہ اس میں حفظانِ صحت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مضر جراثیم کو نیست و نابود کر دینے والی. بدن کو فرحت دینے والی کیڈائل نام دوائی آمیزش کی گئی ہے جسے رکسونا کی بہت جلدی اور بہت پیدا ہونیوالی جھاگ جلد کے ہر مسام تک بہم پہنچاتی ہے اور خاصکر ان اجزا میں جہاں عام طور پر جلد کو ضرب پہنچانیوالی مہلک بیماریاں یعنی کھجلی وغیرہ اور بدزیب داغ پیدا ہونے لگجاتے ہیں اسطرح سے آپکا سارا بدن گندی بیماریوں سے بڑا صاف ستھرا اور ٹھنڈا رہتا ہے

آپ اس سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر آسانی اور بہت جلدی رکسونا کے باقاعدہ استعمال سے جلد کی صحت درست کی جا سکتی ہے اور اُسے ہر طرح سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے. اس لئے ایسے سبز اور زود جھاگ دینے والے ادویات سے مرکب صابن کو آج ہی سے فوراً عمل میں لائیں اور اس کے استعمال کو جاری رکھیں۔

نوٹ:۔ یہ ایک نقطہ خاص قابلِ ذکر ہے کہ جلد کی صحت پر ہی خوبصورتی کا انحصار ہے اور ہر مرد کو اپنے بدن کی جلد کو عمدہ اور محفوظ رکھنے کا اُتنا ہی فخر حاصل ہے جو کہ ایک عورت کو۔

رکسونا بچے کیلئے:۔ یہی رکسونا جو کہ باپ استعمال کرے بچہ بھی کرے. اس کی جھاگ بدن کے مضر جراثیم سے محفوظ رکھتی ہے. اپنے بچوں کو غسل کراتے وقت رکسونا کو استعمال فرمائیں تاکہ وہ بچے کے نازک جلد کو ٹھنڈک پہونچائے اور اسے ہر طرح کی کھجلی و خارش و سوزش سے بچائے رکھے۔

★ کیڈائل رکسونا میں ایک خاص قسم کی جراثیم کش. آرام دہ تقویت دہ تیلوں کا مرکب ہے جو کہ جلد کی صحت کو برقرار رکھنے میں اپنا خاص اثر رکھتا ہے۔ کیڈائل کے جلد کو ٹھنڈا اور مہلک بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے فوائد کو بڑے بڑے ماہرانِ سائنس نے تسلیم فرمایا ہے اور اس کے ہر روز کے استعمال کو ترجیح دی ہے۔

رکسونا مرہم کا استعمال کیجئے:۔ دردوں. سوزش۔ پھوڑے. داد. ناسور. مہاسے. چنبلے. جلن اور دوسری تمام جلدی امراض کیلئے. گو مال کی کمی ہے مگر پھر بھی کوئی ڈبیہ بہت سے تاجروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

Rexona OINTMENT

RP. 28-23 UD

REXONA PROPRIETARY LIMITED

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ نمبر ۱۰ | ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔اے

نائب مدیر
فضل حق قریشی
دہلوی

ادارۂ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

رفتار زمانہ

ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے ملک

ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر متعینہ اسکندریہ کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۴۵ء میں مصر نے ۸،۷۴،۸۰،۶۵۲ پونڈ کا مال ہندوستان بھیجا۔ اس کا ۹۷ فیصدی حصہ صرف خام کپاس کے ضمن میں ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان سے مصر جانے والے مال کی مجموعی قیمت ۲۹،۳۰،۱۵۳ پونڈ تھی۔ ۱۹۴۴ء کے مقابلے میں یہ رقم بقدر ۵ لاکھ پونڈ کم ہے۔ اس رقم میں سے ۹،۳۹،۸۵۹ ۱۶ پونڈ کا سن کا سامان، ۹۶،۸۶۹ ۱ پونڈ کا تمباکو اور سگار، ۷،۶۶،۴۷۰ ۱ پونڈ کی روئی اور سوتی کپڑے کے تھان اور سوت، اور ۸،۳۴،۹۵ پونڈ کی چائے بھیجی گئی۔ اسی سال ۲،۲۳،۲۳،۲۸۲ پونڈ کا مال ہندوستان سے سوڈان بھیجا گیا۔ یہ ملک کی کل درآمد کا ۲۸.۱ فیصدی تھا۔ اس میں سب سے زیادہ مقدار سوتی کپڑے کی تھی یعنی ۶۰۰۷ ٹن کپڑا جس کی مالیت ۲۲،۷۲،۲۸۰ پونڈ تھی، بھیجا گیا تھا۔ اس کے بدلے میں سوڈان سے صاف کی ہوئی ۱۱،۴۲۵ ٹن روئی جس کی مالیت ۲۲،۳۲،۰۰۳ پونڈ تھی ہندوستان آئی۔ ۱۹۴۶ء کے شروع میں سوڈان جانے والے مال میں بے قیاس اضافہ ہوا۔ یوں سمجھنا چاہئے کہ ان ملکوں میں جن کا مال سوڈان پہنچا، ہندوستان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی۔ چنانچہ ابتدائی تین ماہ میں ۷،۵۱،۱۱۵ پونڈ کا مال بھیجا گیا جو وہاں کی کل درآمد کا ۳۵ فیصدی حصہ تھا۔ سوڈان میں ہندوستانی کپڑے کی بہت زیادہ کھپت ہے۔ کپڑے، دیا سلائی اور ٹاٹ کی بوریوں کے ضمن میں اس ملک کی کل ضروریات ہندوستان سے پوری ہوتی ہیں، روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی بھی وہاں بڑی مانگ ہے مثلاً کینوس کے جوتے خاص طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۴۶ء کے ابتدائی تین ماہ میں سوڈان سے ۴۰،۴۴،۲۳،۷ پونڈ کا مال ہندوستان آیا جو وہاں کی کل برآمدی تجارت کا ۳۲.۶ فیصدی حصہ ہے۔ ۱۹۴۵ء میں ۳۵،۰۷،۴۰،۲۰ فلسطینی پونڈ کا مال ہندوستان سے فلسطین گیا۔ اس میں سے نصف حصہ صرف مونگ پھلی کا تھا۔ اس سال فلسطین سے ہندوستان آنے والے مال کی قیمت ۹،۶۳،۶۰۸ فلسطینی پونڈ ہوئی، اسی سال میں ہیرے کے نگوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی سال ہندوستان ۶۲،۸۱،۰۰۰ شامی پونڈ کا مال شام اور لبنان گیا۔ ۱۹۴۴ء میں کل رقم ۵۷،۵۵،۰۰۰ شامی پونڈ تھی۔ اس مال میں سب سے زیادہ مقدار سن سے زیادہ تیار کی ہوئی چیزوں کی تھی۔

ہندوستان اور کنیڈا

ہندوستان کے ٹریڈ کمشنر متعینہ کنیڈا کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اپریل کے بالمقابل مئی ۱۹۴۶ء کے دوران میں وہاں سے ہندوستان آنے والے مال میں بہت اضافہ ہوا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ اپریل میں ۶۹،۰۳،۰۰۰ روپے کا مال آیا تھا اور مئی میں ۳۵،۱۲،۴۴،۰۰۰ روپے کا۔ اضافہ کی سب سے بڑی وجہ گیہوں کی درآمد ہے۔ اس رقم میں سے ۱۵۱،۸۲،۸۰۷ روپے کا صرف گیہوں آیا۔ اس کے برعکس ہندوستان سے ۷،۳۰،۸۰،۰۰۰ روپے کا مال گیا جبکہ اپریل کی رقم ۵۹،۰۶،۱۰۰۰ روپے تھی۔ یہاں سے جانے والے مال میں سب سے زیادہ مقدار سن کے کپڑے، اخروٹ، چائے اور دباغت شدہ چمڑے کی تھی۔ اگر جنوری سے مئی ۱۹۴۶ء تک کا حساب لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ مبلغ ۴۲،۴۲،۹۲،۰۰۰ روپے زیادہ کا مال کنیڈا سے ہندوستان آیا۔ ٹریڈ کمشنر کی رپورٹ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مئی ۱۹۴۶ء میں اخبار کے کاغذ کی تیاری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی رہی اور پارچہ بافی کے کارخانوں میں بھی کچی روئی کا خرچ ترقی پذیر رہا۔

ہندوستان اور ارجنٹائن

حال ہی میں ہندوستان اور ارجنٹائن کے مابین ایک تجارتی معاہدہ عمل میں آیا ہے۔ اس کی رو سے حکومت ارجنٹائن نے اس اناج کی برآمد کا اجازت نامہ

فوراً دے دیا ہے جو ہندوستان نے ارجنٹائن سے خریدا تھا۔ اس اناج میں ایک لاکھ چالیس ہزار ٹن مکئی اور پچیس ہزار ٹن گیہوں شامل ہے اس کے عوض ہندوستان نے اس سال کے آخر تک تیس ہزار ٹن سن دینے کا ذمہ لیا ہے ۱۹۴۷ء کے ابتدائی چھ مہینوں میں بھی تیس ہزار ٹن سن دیا جائے گا۔ ہندوستان نے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ اس ملک سے ربڑ کے ٹائر اور ٹڈے مارنے کی دوائیں خریدنے میں ارجنٹائن کی مدد کرے گا۔ معاہدے میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ اناج پہنچانے کے سلسلے میں ارجنٹائن اپنے بحری جہاز پیش کرسکے گا جن کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اسی لئے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تینوں جہاز نو نوٹن مکئی لے کر وہاں سے چل پڑے ہیں اور عنقریب ساحل ہند پر لنگر انداز ہونے والے ہیں۔ یہ بھی طے پایا ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے کو آئندہ سامان خریدنے میں ہر قسم کی سہولت دیں گے۔ حکومت ہند کی طرف سے دیوان چمن لال نے معاہدے پر دستخط کئے اور ارجنٹائن کی طرف سے ارجنٹائن سنٹرل بنک کے صدر سینور میگوئل میراندا نے دستخط کئے ہیں۔ عنقریب دونوں ملکوں میں سفارتی تعلقات بھی پیدا ہوجائیں گے اور دونوں کے سفیر ایک دوسرے ملک میں رہنے لگیں گے۔

ہندوستان اور روس

مسٹر وی کے کرشنا مینن نے جن کو عبوری حکومت کے نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے نجی قاصد کی حیثیت سے پیرس بھیجا تھا، روس کے وزیر خارجہ موسیو مولوٹوف سے ملاقات کی اور ہندوستان کے موجودہ مسائل کا ذکر کیا۔ انھوں نے اس امر پر زور دیتے ہوئے کہ دونوں ملکوں کے مابین سفارتی تعلقات عمدہ پیمانے پر استوار رہنے چاہئیں، یہ معلوم کرنا چاہا کہ فی الحال روس سے کس قدر اناج کا ہندوستان بھیجا جانا ممکن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ موسیو مولوٹوف نے بڑی توجہ کے ساتھ گفتگو میں حصہ لیا اور تسلیم کیا کہ آئندہ دونوں ملکوں میں ایک دوسرے کے سفیروں کا رہنا ضروری ہے۔ لیکن خوراک کے معاملہ میں انھوں نے بالکل صاف جواب دیدیا۔ انھوں نے بتایا کہ خود روس میں اشیائے خوراک کی اس درجہ کمی ہے کہ فی الحال اناج کا باہر بھیجا جانا کسی عنوان ممکن نہیں ہوسکتا تاہم انھوں نے ہندوستان کے نازک مسئلہ خوراک کے سلسلے میں اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ میں بہت جلد روس پہنچنے پر اس مسئلہ کو اٹھاؤں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ ہندوستان کے لئے کس حد تک اناج بھیجا جانا ممکن ہوسکتا ہے۔ اگر جواب انکار کی صورت میں ہو تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا حقیقی سبب مجبوری ہے۔

انگلیوں کے نشانات

لندن کا "اسکاٹ لینڈ یارڈ" نامی محکمۂ پولیس اپنی کامیاب سراغرسانی کے سلسلے میں عالمگیر شہرت حاصل کرچکا ہے۔ اس کے تحقیق و تفتیش کے طریقے نرالے لیکن بڑے نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ اب اس نے جرائم کے خلاف جدوجہد کرنے کے سلسلے میں ایک نیا قدم اٹھایا ہے۔ وہاں سے ریڈیو کے ذریعہ انگلیوں کے نشانات دور دراز علاقوں تک پہنچائے جایا کریں گے تاکہ انکو مدنظر رکھتے ہوئے مجرموں کی تلاش بلا تاخیر شروع کردی جایا کرے۔ حال ہی میں اس قسم کے کئی تجربات عمل میں لائے گئے۔ لاسلکی کے ذریعہ انگلیوں کے نشانات کی نقلیں امریکہ اور آسٹریلیا بھیجی گئیں جن میں سرمو فرق پیدا نہ ہوسکا۔ قوی امید ہے کہ ایک سال کے اندر اندر دنیا بھر کے پولیس محکمے اس طریقہ کار پر عمل کرنے لگیں گے۔ انگلیوں کے نشانات کے سلسلے میں ایک نیا تجربہ یہ بھی کیا گیا کہ مقتول کے جسم کی کھال سے ان نشانات کی تصویریں لی گئیں جن سے قاتلوں کا پتہ لگانا آسان ہوگیا۔

برطانیہ اور دوسری جنگ عظیم

ادارۂ اقوام متحدہ نے ایک خاص سب کمیٹی بنائی تھی جس کا کام اس جنگ کے سلسلے میں مختلف قسم کے اخراجات و نقصانات کے اعداد و شمار جمع کرنا تھا۔ حال ہی میں اس کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ صرف برطانیہ کو اکیس ارب پونڈ نقد خرچ کرنے پڑے۔ برطانیہ کے تیس فیصدی مکان بالکل مسمار ہوگئے۔ ان کے علاوہ اور عمارتوں کو بھی نقصان پہونچا ہے۔ جنگ سے پہلے بحری جہازوں کا مجموعی وزن جو کچھ بھی تھا، اب وہ آدھا رہ گیا ہے۔ سمندر پار ملکوں میں لگائے ہوئے سرمایہ کی آمدنی بھی نصف رہ گئی ہے۔ کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۴۶ء کے وسط تک ساٹھ لاکھ فوجی مختلف ملازمتوں سے الگ کئے جاچکے ہیں۔ اب باقی ماندہ کی تعداد تقریباً وہی ہے جو ۱۹۳۹ء کے شروع میں تھی البتہ اب یورپ میں برطانیہ کی تجارت کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۸ء کے مقابلے میں وہاں برطانوی مال کی کھپت بہت زیادہ ہوگئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کے خسارہ کو بہت جلد پورا کرلیا جائے گا۔

قراقرم کے دامن میں

کشمیر اور سنکیانگ کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ کوہ قراقرم کے دامن میں آٹھ نو سو مربع میل کا علاقہ اتنا سخت، دشوار گزار اور پیچیدہ ہے کہ آج تک کسی شخص کو اس طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی تاہم اب چند منچلے نوجوانوں نے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ چنانچہ سائنسدانوں اور نقشہ نویسوں کی ایک جماعت اس علاقے میں بھیجنے کے لئے لندن میں

ضروری خاکے مرتب کئے جا رہے ہیں۔ اس مہم کے قائد کپتان فرینک مینندیز ہوں گے جو حال ہی میں برطانیہ کے شاہی خبر رساں دستے سے الگ ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے محکمۂ سروے نے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی منظوری دیدی ہے۔ دو نقشہ نویسوں کے علاوہ ایک ماہر طبقات الارض بھی ان کے ساتھ ہوگا۔ یہ لوگ تقریباً بارہ مہینے اس علاقہ میں بسر کرینگے لڑائی سے پہلے بھی اس کام کو شروع کرنے کا ارادہ کیا گیا تھا لیکن چند دشواریوں کے باعث وہ پورا نہ ہو سکا۔ کپتان موصوف فوج میں ۱۲ سال رہ چکے ہیں۔ اس مدت میں سے دو سال ہندوستان میں بھی بسر کئے ہیں۔ اس لئے خاص طور پر انھیں اس ملک سے دلچسپی ہے۔ انھوں نے سولستان میں بھی کوہ نوردی کی ہے لیکن ان کا خیال ہے کہ اس مہم کے سامنے وہ تجربات معمولی کہے جائیں گے۔ کیونکہ اس علاقے میں وہ دشواریاں لاحق ہیں جن سے وہاں دوچار ہونا نہیں پڑا تھا۔ وہ تقریباً ایک ماہ بعد لندن سے روانہ ہوکر ہندوستان پہنچیں گے اور جلدی ہی اپنا کام شروع کردیں گے۔

مسئلۂ خوراک و زراعت

زراعتی تحقیقات کی شاہی مجلس کے سولھویں اجلاس میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو عبوری حکومت کے محکمۂ خوراک و زراعت کے رکن ہیں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ دونوں وقت کا پیٹ بھر کھانا ہر ہندوستانی کو مل جانا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں قدرتی ذرائع کی کمی نہیں ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ منظم سائنسی ترقی پر ہر ملک کی نجات کا دارومدار ہے۔ لوگوں کو چاہئے کہ اپنی زیادہ توجہ زراعت اور پرورش مولیشیان کی طرف مبذول کریں اچھے اوزاروں اور آبپاشی کے طریقوں کی چھان بین کرتے ہوئے ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ مالی اعتبار سے ہمارے کسانوں کے لئے بار خاطر نہ ہوں۔ ہمارے ملک کی زمینیں پیاسی ہیں اور ان کی تشنگی بجھانے کے لئے ضروری ہے کہ نہروں، کنوؤں اور حوضوں کا ایک جال سستے داموں بچھا دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ زراعت و خوراک کے مسائل کو دوسری تمام صنعتوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی جائے۔ اس ملک میں کاشتکاری کا پورا انحصار بیلوں پر ہے۔ اس لئے ہماری توجہ گئو رکھشا کی طرف بھی مبذول ہونی چاہئے۔ گائے اور اس کے بچے نہ صرف دودھ مکھن کے سلسلے میں مفید رہیں گے بلکہ بیلوں کے لئے بھی ان کا وجود ضروری ہے۔ سائنس کو انفرادی طور پر کوئی خاص ترقی نصیب نہیں ہو سکتی، اس لئے ملک بھر کے اعلیٰ دماغ لوگوں کو چاہئے کہ سر جوڑ کر اجتماعی حیثیت سے ان مسائل پر غور کریں تو باہمی تبادلۂ خیالات کے ذریعہ اپنے وطن کو فائدہ پہنچایا جا سکے۔ اناجوں کے علاوہ گنے کی کاشت کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر ہم زیادہ سے زیادہ توجہ اس طرف مبذول کریں تو وہ لاکھوں روپے کی رقم جو اب تک باہر جاتی رہی ہے، اپنے ہی وطن میں رہ سکتی ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب نے زراعتی تحقیقات کی شاہی مجلس کو یقین دلایا کہ اس کی ترقی اور فلاح و بہبود کے سلسلے میں انکا پر خلوص دست تعاون ہمیشہ دراز رہے گا۔

برما میں نئی حکومت

۲۶ ستمبر کی شام اہل برما کے لئے بہت مبارک اور بھاگوان تھی کیونکہ ان کے ملک میں قومی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ برما کے گورنر سر ہیوبرٹ رانس نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا کہ برما کی تمام بڑی سیاسی جماعتیں متفق ہو گئی ہیں اور اب ان سب کے نمائندے عبوری حکومت میں لئے جا رہے ہیں۔ اراکین کی کل تعداد گیارہ ہے جن میں سے چھ اینٹی فیسسٹ لیگ کے ہیں۔ اس لیگ کے صدر میجر جنرل اونگ سان عبوری حکومت کے نائب صدر ہونے کے علاوہ امور خارجہ اور دفاع کے محکموں کے رکن ہیں۔ دوسری پارٹی کے قائد یو سا ہیں۔ وہ تعلیم اور قومی تعمیر کے محکموں کے رکن مقرر کئے گئے ہیں۔ برما کی یہ نئی حکومت بالکل ہندوستان کی نئی حکومت کی طرح کام کرے گی اور اسے اتنے ہی اختیارات حاصل ہوں گے۔ وہاں کے لوگوں کو بھی دفاع اور امور خارجہ کے عہدے سنبھالنے کا فخر زندگی میں پہلی بار حاصل ہو رہا ہے۔ گورنر برما نے تمام باشندگان ملک سے پر خلوص اتحاد عمل کی درخواست کی ہے تاکہ ملک میں نئی روح پھونکنے اور اسے ترقی کے راستے پر چلانے میں آسانی ہو۔ انھوں نے اس امر پر بھی زور دیا ہے کہ نئی مجلس انتظامیہ کے جملہ اراکین پر پورا اعتماد کرتے ہوئے اس کے ساتھ تعاون کیا جائے تاکہ انھیں نت نئے خاکے اور منصوبے تیار کرنے میں کسی قسم کی دشواری لاحق نہ ہو۔ برما ہندوستان کے پڑوس میں واقع ہے۔ ہندوستان کے ساتھ ہی ساتھ برما میں بھی عبوری حکومت کا قائم ہو جانا دونوں ملکوں کے لئے ایک شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ قدیم ترین زمانے سے دونوں ملکوں کے مابین ثقافتی تعلقات قائم ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ یہ تعلقات زیادہ استوار ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ برما کی نئی حکومت نے ہندوستان کی قومی حکومت کو ایک لاکھ ٹن چاول کی پیش کش بھیجی ہے اور اس کے عوض روزمرہ کی ضروریات کا ایسا سامان مانگا ہے جو ہندوستان آسانی سے برما بھیج سکے۔ یہ اطلاع آئندہ کی امیدیں قائم کرنے کے سلسلے میں بہت ہی خوشگوار ہے۔

غزل

جگر مُرادآبادی

توہینِ عشق دیکھ! نہ ہو اے جگر! نہ ہو
ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو
یہ اور بات ہے تمہیں ابتک خبر نہ ہو

جس دل میں ہے لگی ہوئی اب ہر طرف سے آگ
ظالم یہ دیکھ لے کہیں تیرا ہی گھر نہ ہو

لازم خودی کا ہوش بھی ہے بیخودی کیساتھ
کس کی اُسے خبر، جسے اپنی خبر نہ ہو

دریائے حسن و کارِ غمِ عشق، ناصحا
یہ کیا کہا؟ "ترا سرِ دامن بھی تر نہ ہو"

پیشِ نگاہِ شوق ہے اک حسنِ بے پناہ
ڈرتا ہوں میں کہ یہ بھی فریبِ نظر نہ ہو

وہ بدگمانیاں ہیں، نہ وہ سرگرانیاں
اتنی بھی دل کی دل کو، الٰہی خبر نہ ہو

یا طالبِ دُعا تھا میں ایک ایک سے جگر
یا خود یہ چاہتا ہوں دُعا میں اثر نہ ہو

اُردو زبان کے مؤرّخ نصیرالدین ہاشمی

شہرت سے دور، صلے سے بے نیاز، ستائش سے بے پروا، اپنی دھن میں مگن، اردو زبان کی خدمت کرنیوالے لوگ ذرا مشکل ہی سے ملیں گے — ایک جذبہ ہے، ایک لگن ہے، کہ جس کے ماتحت بس وہ کام کئے جاتے ہیں، ایسے لوگ ہوتے ہیں، مگر کم، جو باوجود کثرت افکار اور دیگر مشاغل کے بھی اردو کی خدمت کئے جاتے ہیں۔ مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی اس پایہ کی ہستی ہیں جو بیس سال سے مسلسل اردو زبان کی سچی اور خاموش خدمت کر رہے ہیں۔

دنیا جانتی ہے کہ زبان اردو نے خود بخود اتنی وسعت اختیار کرلی ہے۔ اس کی ترقی کے لئے جو کوششیں کی جارہی ہیں، اور اب تک کی گئی ہیں وہ اس زبان کی روز افزوں ترقی کو دیکھتے ہوئے بہت ہی محدود ہیں، لیکن شائد قدرت ایسے ہی لوگوں کو پیدا کرکے لیتی ہے، جو خود نہیں جانتے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں، مگر ایک شوق ہے کہ خود بخود اسطرف مجبور ہوجاتے ہیں، ایک ذوق ہے جو انہیں اسطرف کھینچ لے جاتا ہے۔ ہاشمی صاحب کے سارے کارناموں میں یہی جذبہ کارفرما ہے، جسے آگے چل کریں ذرا تفصیل سے بیان کروںگی ہاشمی صاحب ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

"مجھے تو سرے سے یہ کہنا ہے کہ میں نے ابتک اردو زبان پر کوئی احسان ہی نہیں کیا ہے، جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ اپنا شوق ہے، کوئی اپنا شوق پورا کرے تو بھلا آپ ہی فرمائیں احسان کیسے ہوگا —؟"

یہ عجز نہیں، یہ خاکساری نہیں، حقیقت ہے، مگر جس کو ہاشمی صاحب اپنے "شوق" سے تعبیر کرتے ہیں، وہ کم و بیش "عشق" کی حدوں تک پہنچا ہوا ہے اگر آپ انکی ساری علمی جدوجہد کا جائزہ لیں تو صرف ایک ہی فیصلہ پر پہنچیں گے کہ ہاشمی صاحب کو اردو زبان سے محبت ہے، اور تصانیف کا یہ سارا مجموعہ اسی محبت کا اظہار ہے۔ زبان اردو کی خدمت کرنا انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا ہے، اردو کے مصنفین میں بلاشبہ وہ حضرات ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، جنہوں نے اردو کی خدمت بے لاگ اور ذاتی منفعت سے دور رہ کر کی ہے، بلکہ یہ ایک طرۂ امتیاز ہے کہ معاش کے لئے تو غیر علمی مشغلہ ہے، لیکن فرصت کے اوقات میں اپنے علمی مشاغل کو جاری رکھتے ہیں۔ اردو زبان کی خدمت کرنے ہی میں اپنے دماغ کا سکون اور دل کی راحت تلاش کرتے ہیں۔ یہ ایثار ہے، یہ قربانی ہے، ان فرصت کے لمحات کی جب انسان دن بھر کی محنت کے بعد فرصت پاتا ہے، تو تفریح و راحت کے وہ دیگر لوازم تلاش کر لیتا ہے جن کو آرام کہتے ہیں، مگر ہاشمی صاحب کی علمی سرگرمیاں وقتی چیز نہیں ان کی تصانیف نرے جذبات ہی نہیں، بلکہ ٹھوس علمی حقیقتیں ہیں، جو برسوں کی دیدہ ریزی جاں فشانی و جانکاہی کا نتیجہ ہیں، ان کا علمی سرمایہ تفریحی نہیں، بلکہ مدتوں کی کھوج اور سر کھپانے کا نتیجہ ہے۔

خوشا! وہ لوگ جن کی تفریح علمی محنت ہے، جنکا شوق ادبی کاوش ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہاشمی صاحب جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ علمی خدمت کرنے میں کافی حصہ لیتا رہا ہے، اور اس خاندان نے کثیر تصانیف و تالیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاشمی صاحب نے بھی علمی خدمت کا شوق اپنے آباواجداد سے ورثہ میں پایا ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس عزیز امانت کی ذمہ داری انھوں نے کہاں تک محسوس کی ہے وہ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے، بارہ سال کے ہوئے یعنی ابھی ہوش و خرد نے آنکھیں بھی نہ کھولی تھیں کہ شفقت پدری سے محروم ہوگئے، ظاہر ہے کہ یہی زمانہ بچوں کو راہ راست پر لگانے کا ہوتا ہے، یہی وہ زمانہ ہوتا ہے کہ بچے کو جس سانچے میں چاہو، ڈھال لو، بری صحبت میں بٹھاؤ تو "پسر نوح بابداں بنشست — خاندان نبوتش گم شد" کا مصداق بن جائے۔ اچھی راہ لگاؤ تو ماں باپ کا نام روشن کرے، باپ ایک ایسا رہبر ہوتا ہے جو بیک وقت محبت بھی کرتا ہے، اور محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے، لیکن یہاں صرف ماں کو یہ کام انجام دینا تھا، اور یہ صرف ماں کی اچھی تربیت کا نتیجہ ہے کہ ہاشمی صاحب علم کی شاہراہ پر گامزن ہوسکے۔

ہاشمی صاحب کی صحت تمام زمانۂ طالب علمی خراب رہی، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سارا بچپن دائم المریض رہے، اور باوجود اس کے کہ ان کو صحیح رہبری کے لئے اچھے ذرائع میسر نہ تھے، پھر بھی ان کے فطری ذوق نے ان کی رہبری کی- اور مطالعہ کے شوق نے ان کو اس علمی ماحول میں پہنچا دیا، جس نے کبھی ان کو اپنے شوق سے غافل نہیں ہونے دیا- بلکہ جوں جوں سمجھ آتی گئی، حصول مدعا کے لئے آتش شوق تیز تر ہوتی گئی۔ مدرسۂ دارالعلوم میں انکی ماں نے

ربیعہ سلطانہ

انھیں شریک کیا، صحت نے جواب دیدیا، اور باقاعدہ پڑھائی کی کوئی صورت نہ بن آئی، لیکن شوق دامنگیر تھا، بالآخر انھوں نے اپنے مطالعہ کو اتنی وسعت دی کہ آج وہ چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں، غرض یہ شوق ہی تھا، یہ ذوق ہی تھا جس میں دریا سی روانی تھی، یہی ان کا ناخدا تھا، جو رکاوٹوں کے بھنور سے ان کو نکال لیتا تھا، ہاشمی صاحب کو علم ہے کہ یہ انکی والدہ محترمہ کی تربیت کا نتیجہ ہے، اور اس تشکر کا اظہار وہ اس ہمدردی کے پیرائے میں کرتے ہیں جو نسوانی دنیا سے ان کو ہے۔

ہاشمی صاحب کا وطن حیدرآباد دکن ہے۔ سرزمین دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں قدر دانانِ علم وفن کی بہتات رہی ہے، اور وہاں ہمیشہ ایسے حضرات عالم وجود میں آتے رہے، جنھوں نے زبان اردو کی خدمت اپنا حاصل زندگی بنالیا، ہاشمی صاحب نے جب ہوش سنبھالا اپنے کو ایسے ہی ماحول میں پایا۔

یہ تو ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ انسان اپنے کو ماحول سے جدا نہیں کرسکتا، اور جس گرد وپیش میں اس کی نشوونما ہوئی ہو، جس تمدن میں اس نے آنکھیں کھولی ہوں، اس سے بالکل علیحدہ کوئی چیز پیش کرے، وہ اپنے زمانہ کے رجحانات سے الگ ہوکر کچھ نہیں کرسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی تخلیقی قوتیں جدت وندرت وتازگی کی علم بردار ہوسکتی ہیں، لیکن ان میں ضرور انھیں فضاؤں کے نقوش ہوں گے جن میں وہ سانس لیتا ہے۔ اسی خاک کے اثرات ہوں گے جس سے وہ پیدا ہوا ہے، انھیں خیالات کی پرواز ہوگی، جن میں وہ پروان چڑھا ہے۔ ہم کو ہاشمی صاحب کے صحیح ماحول کا اندازہ خود موصوف کی تصنیف "تذکرہ دارالعلوم" سے ہوتا ہے، جہاں ان کی تعلیمی جدوجہد کی ابتدا ہوتی ہے، حالانکہ وہاں کی زندگی بہت مختصر رہی، یہ بات بھی اس ضمن میں خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ انھوں نے جس زمانہ میں اردو کی دلچسپی لینا شروع کی مولانا شبلی کی علمیت اور ان کی تصنیفات کا سارے ہندوستان میں ڈنکا بج رہا تھا۔

ہاشمی صاحب مولانا شبلی سے بہت زیادہ اثر پذیر معلوم ہوتے ہیں اور ان کا یہ اندازہ اور ان کی یہ تخصیص مضامین جو انکی تصانیف سے عیاں ہے، وہ مولانا شبلی کے تتبع کو ظاہر کرتا ہے، شبلی ایک عجیب وغریب حیثیت کے مالک ہیں، اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، اگر ہاشمی صاحب ان سے متاثر ہوئے ہیں، ان کو بچپن سے تاریخ، سوانح اور سفرناموں سے دلچسپی رہی ہے، اور علامہ شبلی کی کتابیں ضرور ان کے طبعی رجحانات کے لئے باعث تسکین ثابت ہوئی ہونگی۔ اس زبردست شخصیت سے کسب فیض کے علاوہ ان کو حضرت امجد اور مولوی وحیدالدین سلیم مرحوم جیسے یگانہ روزگار حضرات کی صحبت کا بھی شرف حاصل رہا۔ ادھر تحقیق وتنقید کا شوق ادھر ان باذوق استادوں کی علمی صحبتوں کی جلا نے سونے پر سہاگے کا کام کیا، اور اس لئے ہاشمی صاحب کے لئے ایک مخصوص راہ نکل آئی، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی بیشتر تصانیف تاریخ ادب اردو سے متعلق ہیں، مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب نے "مقالات ہاشمی" کے پیش لفظ میں ہاشمی صاحب کے متعلق جو رائے دی ہے اس کے چند فقروں کا اعادہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔

"میرے دوست سید نصیرالدین ہاشمی صاحب ان لوگوں میں ہیں، جو سارے دن دفتر کا کام کرنے پر بھی نچلے نہیں بیٹھتے .... انھوں نے صرف ایک ہی مضمون لولیا ہے، اور اسی دائرہ میں اپنی کوششوں کو صرف کررہے ہیں ایسے ہی لوگ کچھ کرجاتے ہیں، اور ایسے ہی لوگوں کے کارنامے کچھ رہ جاتے ہیں۔ بھلا دنیا میں وہ لوگ کیا کرسکتے ہیں، جو دائیں بائیں ہر طرف ہاتھ چلائیں، اور اس لوٹ میں بے جوڑ اور انمل جو مال ہاتھ لگے اس کو کباڑی کی دکان کی طرح اوپر تلے جمائیں اور پبلک میں پیش کرکے ادیب ہونے کے دعویٰ دار ہوں"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب سستے اور سطحی ادیب نہیں ہیں، ان کے تحقیقی وتنقیدی خیالات سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اور وہ ہر چیز کی گہرائی تک پہنچ جانے کی کوشش کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی معلومات سطحی نہیں ہوتیں، وہ جو رائے دیتے ہیں، اس میں وزن ہوتا ہے اور وہ بے لاگ ہوتی ہیں، کسی بات کے متعلق تا وقتیکہ تحقیق کے سارے ذرائع ان کو میسر نہ آجائیں، اور جب تک کہ اس کے متعلق ان کو کامل عبور نہ ہوجائے، وہ مشکل ہی سے قلم اٹھاتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان بہت سادہ وسلیس اور عام فہم ہے۔ اور یہ اسلوب ان کے موضوع کے لحاظ سے بہت مناسب ہے، یہ ضروری ہے کہ اسلوب بیان کا انتخاب موضوع کے لحاظ سے کیا جائے کیونکہ اسلوب اور طرز نگارش ہی پر موضوع کے رنگ کے نکھار کا دارومدار ہوتا ہے، ان کی تحریر میں سنجیدگی اور متانت ہے اور وہ اپنی رائے کے اظہار میں بہت محتاط ہیں، وہ دوراز کار باتیں نہیں لکھتے۔ صرف انھیں باتوں کا اظہار کرتے ہیں جو مفید مطلب ہوتی ہیں۔ یہ انتخاب خود ہی ایک امر دشوار گزار ہے، لیکن ہاشمی صاحب کو اس میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے، ان کی تصانیف میں ہم کو یہ خوشگوار اختصار ہر جگہ نظر آتا ہے، ان کا ضبط اور ان کا فیصلہ ہر جگہ حیرت انگیز کرشمے دکھاتا ہے۔

آپ کی تنقید کے متعلق ڈاکٹر حفیظ سید صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ یہ ہیں:-

"ہاشمی صاحب کو ادبی حس اور غیر جانبدارانہ فیصلہ کرنے کا ملکہ حاصل ہے، یہ وہ صفات ہیں جو موجودہ زمانے کے اردو زبان کے ادیبوں میں عموماً نا پید ہیں، آپ کی تنقید میں رائے بے لاگ اور نڈر ہوتی ہے، بایں ہمہ اسکا مقصد عیب جوئی نہیں ہوتا۔ آپ کے طرزِ بیان میں ادبی شان اور روانی ہوتی ہے اور دلچسپ اور اچھوتے پیرائے میں اپنے مطلب کو ادا کرتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ دلائل کو حقائق کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔" (لیڈر ۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء)

جس طرح موسیقی قوت سامعہ کے لئے لذت آگیں ہوتی ہے، ادب اسی طرح ذہن کے لئے باعثِ انبساط ہوتا ہے، یہ وہ لطف ہے، جسکے اثرات دماغ کو فلاح کی منزلوں پر پہنچاتے ہیں، خیالات میں بلندی پیدا کرتے ہیں، اور انسان کی وجدانی قوتوں کو بیدار کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں، درحقیقت اردو ادب کی جو خدمت ہاشمی صاحب نے ابتک انجام دی ہے، تاریخی و تنقیدی لحاظ سے جو ذخیرہ پیش کیا ہے، وہ اردو ادب میں خاص درجہ رکھتا ہے۔ مورخانہ ذہنیت رکھنے کی وجہ سے ان میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے، کہ خرافات کے انبار سے وہ جواہرات نکال لیں، جو ادب کا گرانمایہ سرمایہ ہیں، یہی وہ سرمایہ ہے جو پچھلوں کی کاوشوں کا حق ادا کرتا ہے۔ ہمارے لئے باعثِ فخر اور اگلوں کے لئے مشعلِ راہ ہے، جس طرح حسن کی کوئی جامع تعریف نہیں کی جا سکتی، ادب کی بھی تعریف کرنا امر محال ہے لیکن حقیقی ادب میں ایک استقلال ہوتا ہے کہ اس سے جب مستفیض ہوا جائے، مسرت بخشتا ہے گویا ایک دائمی مسرت کا حامل ہوتا ہے یعنی ادب کے ان گہرہائے آبدار کی چمک دمک کبھی کم نہیں ہوتی، ان کی تنقید کی نمایاں خوبیاں، اہمیت کا احساس، جرأت، خلوص، صفائی اور بے باکی ہیں، ایسے زمانے میں جب ادب نئی کروٹ لے رہا ہے، اور زبان میں نئے خیالات و رجحانات تیزی سے داخل ہو رہے ہیں، ان کے کارنامے بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، بیش بہا معلومات کا وہ گنجینہ جو انھوں نے منظرِ عام پر پیش کیا ہے، ان میں سے تاریخی اور تنقیدی لحاظ سے سات کتابیں اہمیت رکھتی ہیں۔

"دکن میں اردو" آپ کی وہ کتاب ہے جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی اور جسکی اشاعت کے بعد نظام گورنمنٹ نے سر راس مسعود کی ایماء سے آپ کو یورپ بھیجا، جہاں آپ نے انگلستان اور فرانس کے کتب خانوں کی چھان بین کی اور "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے لئے بیش قیمت مواد فراہم کیا۔ "دکن میں اردو" یہ زبان کی تاریخ ہے، اور اپنی ادبی و تنقیدی خصوصیات کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہے، بلکہ حقیقتاً موضوع کے لحاظ سے اپنی نوع کی پہلی تصنیف ہے، جیسا کہ ڈاکٹر زور صاحب نے فرمایا ہے کہ "دکن میں اردو" کتاب آفریں ثابت ہوئی، اور اس کے بعد ہی لوگوں کو خیال پیدا ہوا، اور "پنجاب میں اردو" اور "مغل اور اردو" جیسی کتابیں تصنیف ہوئیں، اس کتاب کو دیکھکر ہاشمی صاحب کے سلاست ذوق اور بصیرت ادبی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ریسرچ کرنے والوں کے علاوہ یہ کتاب اربابِ ذوق و نظر کے لئے بھی باعثِ تسکین ہے، باوجود اختصار کے جو ہاشمی صاحب نے ملحوظ رکھا ہے، مورخانہ شان میں کمی نہیں ہونے پائی ہے۔ ادبی حیثیت بھی بلند ہے، بدیں وجہ اس کتاب نے اردو ادب میں ایک مستقل درجہ حاصل کر لیا ہے۔ "یورپ میں دکھنی مخطوطات" ایک لحاظ سے آپ کا شاہکار ہے۔ اس میں انگلستان اور فرانس کے کتب خانوں میں قدیم اردو کی جو کتابیں موجود ہیں، ان کے متعلق تفصیلی وضاحت ہے اور نمونۂ کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ مخطوطات اردو زبان کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہے۔ آجکل ہر قسم کے تذکرے وجود میں آ رہے ہیں لیکن بہت سے ایسے ہوتے ہیں، جنکی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن یہ تذکرہ اپنی اہمیت و زندگی کا خود ضامن ہے۔ میرے نزدیک تو ہاشمی صاحب کی یہی ایک تصنیف انکی شہرت اور ان کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس کتاب کو اہل ذوق و نظر نے حسین نظر سے دیکھا ہے، اسکا اندازہ ان آراء سے ہو سکتا ہے، جو مقتدر حضرات نے ان کی اس تصنیف پر ظاہر کی ہیں۔ ان میں سے بعض اصحاب یہ ہیں:- (۱) ڈاکٹر بیلی (۲) ڈاکٹر اسٹوری (۳) پروفیسر کرن کورڈ (۴) علامہ اقبال (۵) سر تیج بہادر سپرو (۶) سر عبدالقادر (۷) سر ظفر اللہ خاں (۸) علامہ سید سلیمان ندوی (۹) پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۰) مرحوم جسٹس سید سلیمان۔

علاوہ ان کتب کے ہاشمی صاحب نے حیدرآباد کی نسوانی دنیا کی علمی جدوجہد کا بھی جائزہ لیا ہے، غالباً یہ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے خواتین کے لٹریچر کی چھان بین کی ہے، اور اہلِ قلم خواتین کے تذکرے مرتب فرمائے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کئی تصانیف ہیں، میں نے کہیں گذشتہ صفحات میں اسکا اظہار کیا ہے کہ ہاشمی صاحب کو طبقہ نسواں سے خاص ہمدردی ہے۔ ہندوستان کے ادیبوں میں دو ہی چار ادیب ایسے نکلیں گے جنہوں نے طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبودی کی طرف عملی قدم اٹھایا ہو۔ اس سلسلے میں علامہ راشد الخیری مرحوم کا نام سرِ فہرست آتا ہے، جنہوں نے طبقہ

نسواں ہی کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی، مگر وہ گذشتہ دور کے ادیب تھے، نئے دور کے ادیبوں میں ہاشمی صاحب کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ آپ کی متعدد تصانیف طبقہ نسواں سے متعلق ہیں ۔

ہندوستان پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جس سے نسوانی دنیا کو انتہائی پستی و جہالت میں مبتلا کر رکھا تھا، نہ کسی کو ان کی اصلاح کی طرف توجہ تھی، اور نہ خود ان میں یارا تھا کہ کوئی نئی کروٹ لیں، لیکن زمانے نے خود ہی محسوس کیا کہ اس صنف کی ترقی کے بغیر قوم کی نکبت دور ہوتی نظر نہیں آتی، آخرش ایسا دور آیا کہ آفتاب علم کی روشنی ان تک بھی پہنچنے لگی، یوں تو اِکا دُکا ہمیشہ ہی ایسی خواتین ملیں گی، جنہوں نے علم پر توجہ کی۔ مگر گذشتہ نصف صدی کے اندر عورتوں نے علمی مشاغل میں کامل حصہ لینا شروع کیا۔ اس سے قبل ان کا کہاں شمار تھا؟ اگر کوئی جوہر قابل ہوتا بھی، تو گمنامی اور بے توجہی کی نظر ہو جاتا اور جس طرح جنگل میں پھول کھلتا ہے، اور اپنی مقررہ زندگی کے بعد مرجھا جاتا ہے، بالکل یہی کیفیت ان خواتین کی تھی اور کوئی نام بھی نہیں جانتا۔

ہاشمی صاحب نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا ہے اور انہوں نے کم از کم خواتین دکن کے ان علمی کارناموں کو ہمارے سامنے کر دیا ہے، جن سے ہم کبھی واقف نہ ہو سکتے۔ اگر ہاشمی صاحب اس طرف توجہ نہ کرتے، ان کی تصنیف "خواتینِ دکن کی اردو خدمات" اہل قلم خواتین کا پہلا تذکرہ ہے۔ جو اردو زبان میں شائع ہوا اور نقش اول ہی باوجود مختصر ہونے کے ایک کامیاب تذکرہ ہے۔ اہلِ علم حضرات کا تذکرہ لکھ دینا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا اہلِ قلم خواتین کے حالات اور کلام نثر و نظم کا مہیا کرنا، جن پابندیوں اور پردوں میں خواتین گذشتہ دور میں رہی ہیں، اسکا علم کسی کو نہیں، ایسی صورت میں، ان کے حالات کا فراہم کرنا اور ان کے مشاغل کا پتہ لگانا، کوہ کندن سے کم نہیں، لیکن ہاشمی صاحب کی ہمت نے انہیں اس معاملہ میں بھی کامیاب کیا اور انہوں نے تیرہویں صدی تک کی خواتین کے حالات ڈھونڈھ نکالے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور کی بھی اہل قلم خواتین کے حالات وغیرہ فراہم کئے ہیں۔

اس تذکرے سے تمام و کمال ہمارے سامنے خواتین کی مستعدی جوش و انہماک کا اندازہ ہوتا ہے، جو وہ اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں کر رہی ہیں۔ علاوہ بریں درجہ بدرجہ اور عہد بہ عہد جو ترقی طبقہ نسواں نے کی ہے اسکا صحیح تصور بھی سامنے آجاتا ہے، حالات کے ساتھ ساتھ نظم و نثر کے نمونے بھی دیئے گئے ہیں جس سے کتاب کی ادبیت میں اضافے کے علاوہ کسی شاعرہ یا ناثرہ کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں بھی کافی مدد ملتی ہے۔

ایک مختصر مگر جامع تصنیف ہاشمی صاحب کی "حیدرآباد کی نسوانی دنیا" ہے، جس کے پیش لفظ میں محترمہ صغرا بیگم ہمایوں مرزا صاحبہ تحریر فرماتی ہیں کہ:-

"..... عورتوں کی ترقی اور بھلائی کے لئے آپ کا قلم روانی سے چلتا ہے، ہمیشہ آپ کو فکر ہے کہ عورتیں ترقی کریں، ان کا خیال ہے کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہونگی، مرد ترقی نہیں کر سکتے۔"

"حیدرآباد کی نسوانی دنیا" مجموعہ ہے آپ کے چند مضامین کا، جو عورتوں کے بارے میں لکھے گئے ہیں، یہ سب حیدرآباد کی طرز معاشرت، اور کم ہمت طبقے کے عام حالات کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ پیشے، لباس وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کی ترقی یافتہ خواتین، صنعت و حرفت، علم و ادب وغیرہ کی کیونکر امداد کر رہی ہیں۔

آپ کے مضامین کا دوسرا مجموعہ "خیابانِ نسواں" ہے یہ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں یہ مضامین بھی عورتوں سے متعلق ہیں۔ یہ مجموعہ مضامین تحقیقی و تنقیدی اعتبار سے معلومات کا ایک گنجینہ ہے۔ ہر مضمون ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، اور ہماری معاشرت کے کسی نہ کسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان مفید اور کارآمد مضامین کو دیکھنے سے ہاشمی صاحب کے خلوص و دوراندیشی کا پتہ چلتا ہے۔ بقول جہاں بانو نقوی صاحبہ "قسم قسم کے مضامین کا یہ ادبی معاشرتی و اصلاحی مجموعہ آپ اپنا جواب ہے۔"

طبقہ نسواں کی خوش قسمتی ہے کہ ہاشمی صاحب جیسے علم دوست اور باکمال مصنف کی ہمدردیاں اسے حاصل ہیں، اور اس سلسلے میں ہاشمی صاحب جس کاوش اور دلچسپی کا ثبوت دیتے ہیں، طبقۂ نسواں کو ان کا مشکور ہونا چاہیئے۔

مجھے افسوس ہے کہ ان اوراق میں ان سب کتابوں پر تفصیلی تبصرہ کرنے کی گنجائش نہیں کہ ایک دفتر درکار ہے، لیکن ان سب کتابوں کو دیکھنے کے بعد آپ کو یہ بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہاشمی صاحب نے کسقدر کاوش اور محنت کی ہے اور اگر انہیں "جنوبی ہند کی اردو زبان کا مورخ" کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔

ریویو کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں ورنہ آیندہ کسی قسم کی رائے قلمبند نہیں کیجائیگی۔

(ادارہ)

آسان اردو

مرزا غالب کا شعر ہے سہ

آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا غالب کی مشکل پسندی مشہور ہے اور جب اس کی شکایت بہت بڑھ چلی تو انھوں نے یہ عذر کیا۔ یہ عذر تو ——— ایک لطیفہ ہے لیکن عام شکایت کا اثر یہ ہوا کہ وہ بیچ بیچ آسان کہنے لگے اور آسان بھی ایسا کہ اسکا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے۔ آج مجھے بھی آسان لکھنے کی التجا کرنی پڑی ہے خدا کرے اس کا نتیجہ بھی حسب مراد نکلے۔

یہ واقعہ ہمارے لئے بہت سبق آموز ہے۔ اسکا ذکر میں نے اس لئے کیا کہ اردو کے اس نئے دور میں پھر ویسے ہی آثار پیدا ہو چلے ہیں۔ ہماری زبان پر ایک اور وقت بھی ایسا ہی آیا تھا۔ اس بدعت کا آغاز لکھنؤ میں ہوا۔ جدت پسندی کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے مشکل اور ثقیل فارسی، عربی کے لفظ اپنے کلام میں داخل کرنے شروع کر دیئے تھے جو عام فہم تو کیا خاص فہم بھی نہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو کے بہت سے ٹھیٹ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیئے گئے۔ یہ معیار شرافت و ثقاہت سمجھا جاتا تھا۔ تحریر ہی میں نہیں بات چیت میں بھی یہی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لئے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانے میں یہاں کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب علم میر مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا۔ مزاج پوچھا تو فرمایا "صدر پر انصباب نوازل ہے۔" آپ سمجھے کیا کہا؟ غزل جس کی زبان سہل، فصیح اور عام فہم ہوتی ہے وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی، فارسی کے لفظ ٹھونسنے شروع کر دیئے جو کسی طرح ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ میں مثالیں پیش کر کے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ اسکا اثر اب بھی کچھ نہ کچھ باقی ہے۔

بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا ایک غریب آدمی حکیم عبدالعزیز صاحب لکھنوی کے مطب میں آیا۔ اس کے گھٹنے میں درد تھا۔ حکیم صاحب نے معائنے کے بعد فرمایا "حلتیت کا ضماد کرو۔" وہ بے چارہ ہکا بکا ہو کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ اب حکیم صاحب نے ذرا ڈانٹ کر کہا "حلتیت کا ضماد کرو۔" وہ خاک نہ سمجھا اور اسی طرح سہمے ہوئے انھیں دیکھتا رہا۔ اس پر حکیم صاحب نے مولوی عبدالحلیم شرر سے جو ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے فرمایا کہ یہ کیسا جاہل گنوار ہے کہ بات نہیں سمجھتا۔ خیر وہ تو ایک گنوار تھا لیکن آپ معاف فرمائیں اگر میں اس تقریر کے سننے والوں سے یہ پوچھوں کہ آپ میں سے کتنے ہیں جو اسکا مطلب سمجھے؟ اگر حکیم صاحب معمولی زبان میں یہ کہہ دیتے کہ بھئی ہینگ کا لیپ کرو۔ تو کیا ان کی شان میں بٹہ لگ جاتا اور ان کی حکمت و حذاقت میں فرق آ جاتا؟ مگر نہیں وہ طب کے علمی الفاظ و اصطلاحات کو عام بول چال میں بیان کرنا اپنے فن کی توہین اور اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اگر عام بول چال میں یہ باتیں آ گئیں تو علمی شان کہاں رہی۔ یہی حال مولویوں کا ہے۔ وہ اپنی تقریر، وعظ یا بیان میں موٹے موٹے عربی، فارسی کے لفظ اور جملے کے جملے مزے لے لے کر بلا تکلف کہتے چلے جاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ سننے والوں میں بہت سے ایسے ہیں جو نہیں سمجھتے، لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ گو نہ سمجھتے ہوں مگر دل میں سب قائل ہیں کہ یہ بڑا مولوی اور بہت بڑا عالم ہے۔ مرعوب کرنے کا یہ بہت اچھا گر ہے۔

سر سید احمد خاں نے جہاں اور بہت سی بدعتوں کو توڑا، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے۔ سر سید کی سادہ نویسی مشہور ہے، مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں اپنے خیالات ایسی زبان میں ادا کرنا چاہتا ہوں جسے گھر کی ماما اور سائیس بھی سمجھ لے۔ اور انھوں نے یہ کر دکھایا۔ سنجیدہ اور علمی مضامین بھی انھوں نے بڑی ستھری اور آسان زبان میں لکھے ہیں اور بعض بعض سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال نے وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے جو بڑے بڑے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدرآباد میں مقیم تھے، میں ایک روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں (اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے) میں نے پوچھا مولینا کس فکر میں ہیں۔ فرمایا الہام و وحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سر سید نے بھی اسپر لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے مسئلہ کو پانی کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کروں۔

ہم کیوں لکھتے ہیں؟ اسی لئے نا کہ ہمارے خیالات دوسروں تک پہنچیں اور لوگ ان سے مستفید ہوں۔ تو جتنی زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ ہماری تحریر کو پڑھیں گے اسی نسبت سے اسکا فائدہ بھی زیادہ ہوگا اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ تحریر آسان زبان میں ہو، اور ایسے پیرائے میں لکھی گئی ہو کہ لوگ

عبدالحق

اسے شوق سے پڑھ سکیں۔ اگر مشکل زبان میں ہوتی تو اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور اسے مقبولیت حاصل نہ ہو گی۔ اگر آپ دنیا کے ایسے ادیبوں کی فہرست بنائیں جنھیں قبول عام حاصل ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دنیا میں یہ عزت انھیں کو ملی ہے جنھوں نے اپنے خیالات آسان اور شگفتہ زبان میں ادا کئے ہیں۔

ہم آسان کیوں نہیں لکھتے؟ — اور مشکل کیوں لکھتے ہیں؟

آسان اس لئے نہیں لکھتے کہ آسان لکھنا آسان نہیں، بہت مشکل ہے۔ اول تو یہ لکھنے والے کو زبان پر پوری قدرت ہو۔ دوسرے جس خیال کو وہ ادا کرنا چاہتا ہے وہ ہمارے ذہن میں اس قدر صاف اور روشن ہو اور اسکا ہر پہلو اسقدر جچا ہوا ہو کہ جب ہم لکھنے بیٹھیں تو صفحۂ کاغذ پر موتی کی طرح ڈھلکتا ہوا نظر آئے۔ جب خیال خود ہمارے ذہن میں سلجھا ہوا نہیں ہوتا تو بیان بھی مبہم اور تاریک ہوتا ہے اور اس وقت مشکل الفاظ اور پیچیدہ طرز بیان کی آڑ لینی پڑتی ہے۔ اس میں لفظ کے صحیح استعمال کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر ادیب کو یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ کونسا لفظ کب اور کہاں استعمال کیا جائے۔ لفظ میں بڑی قوت ہے۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ بعض اوقات اچھے اچھے ادیبوں کو لکھتے وقت صحیح لفظ نہ ملنے پر بڑی الجھن ہوتی ہے۔ ایک لفظ آتا ہے وہ اسے رد کر دیتا ہے، دوسرا آتا ہے اُسے بھی ہٹا دیتا ہے، تیسرا آتا ہے وہ بھی پسند نہیں آتا۔ آخر اسی رد و بدل میں جب اسے صحیح لفظ مل جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے گھٹاؤں سے چاند نکل آیا۔ جو اس گر سے واقف نہیں اور صحیح لفظ کی قوت کو نہیں جانتے وہ اپنا مطلب اینچ اینچ اور ایر پھیر سے کئی کئی جملوں میں ادا کرتے ہیں۔ پھر بھی اس میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو صحیح لفظ صحیح مقام پر اپنی جادو بیانی سے پیدا کر دیتا ہے۔

ایک یہ بات بھی دماغوں میں سمائی ہوئی ہے کہ بڑے اور پُر شکوہ لفظوں میں زیادہ قوت ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خاص خاص موقعوں پر ان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن عام طور پر یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شان و شوکت اور عظمت دکھانے کے لئے پُر شکوہ اور بڑے لفظوں کی ضرورت پڑتی ہے یا کبھی کبھی رعب ڈالنے اور مشیخت جتانے کے لئے بھی۔ لیکن اثر اور دل نشینی کے لئے آسان اور چھوٹے لفظ ہی کام آتے ہیں بلکہ بعض اوقات آسان اور چھوٹے لفظوں میں ایٹم بم کی سی قوت ہوتی ہے۔

ایک بار مولنا حالی کے پاس ایک ایسی تحریر آئی جس میں بہت سے مشکل اور دقیق لفظ تھے اور عبارت بھی پیچیدہ تھی۔ فرمانے لگے۔ کہ لوگ جیسے بولتے ہیں ویسے کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا کہ بولنے میں زبان کے سوا آدمی چشم و ابرو، ہاتھ کے اشارے اور چہرے کے تیور سے بھی کام لیتا ہے۔ لکھنے میں یہ میسّر نہیں۔ اس لئے دقیق الفاظ اور پیچیدہ عبارت سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر زبان پر قدرت ہو اور لفظ کا صحیح استعمال معلوم ہو تو وہ گفتگو سے زیادہ تحریر میں حسن پیدا کر سکتا ہے۔

مشکل پسندی کا ایک دور لکھنؤ کا تھا جسکا میں اشارۃً ذکر کر چکا ہوں۔ دوسرا دور اس وقت آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" افق صحافت پر نمودار ہوا اور اس کے بعد انھوں نے "البلاغ" جاری فرمایا۔ حضرت نے صحافت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بدل کیا دیا بگاڑ دیا۔ قیمت یا چندے کے لئے "بدل اشتراک"، اڈیٹر کے لئے "مدیر مسئول" اور اسی قسم کی ناہموار اور غیر ضروری ترکیبیں رائج فرمائیں۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے اسم شریف کو بھی عربی لباس پہنا دیا۔ یعنی "سید محی الدین المکنیٰ بہ ابی الکلام الدہلوی"۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ اردو ہے یا اردو دشمنی۔ اسے زیادہ سے زیادہ اردو نما عربی یا عربی نما اردو کہہ سکتے ہیں۔ نقالی یا تقلید انسان کی فطرت میں ہے۔ بعض اخبار والے اور دوسرے لکھنے والے اس رنگ کو لے اڑے اور عجیب و غریب (اور واہی تباہی) الفاظ اور ترکیبیں لکھنی شروع کر دیں۔ ان کے ایک مقلد اخبار کے اڈیٹر نے اپنا ایک مقالہ اس طرح شروع کیا۔ "بعد از انقضائے دہور و مرور ایام و شہور"۔ اس قسم کی تحریروں کو پڑھ کر بہت افسوس ہوتا تھا۔ لیکن یہ ردیہ بہت زیادہ دیر تک نہ رہا۔ یہ چیز چلنے والی نہ تھی نہ چلی اور خدا کا شکر ہے کہ نہ چلی۔

اب حال میں مشکل پسندی کے تیسرے دور کا آغاز حیدر آباد میں ہوا ہے۔ یہ اثر غالباً کچھ تو یہاں کی دفتری زبان کا ہے اور کچھ جامعۂ عثمانیہ کی تعلیم کا۔ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کا قابل فخر کارنامہ ہے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو کتابیں یہاں کی تعلیم کے لئے ترجمہ کی گئیں اور جو علمی اصطلاحات اس غرض کے لئے وضع ہوئیں انھوں نے انداز تحریر کو مشکل کر دیا ہے۔ تحریر تو تحریر بعض اوقات یہاں کے تعلیم یافتہ اصطلاحوں میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔ اسکا اثر یہاں کے اخباروں پر بھی پڑا ہے۔ مجھ سے اکثر اصحاب نے شکایت کی کہ جامعہ کے ترجمے سمجھ میں نہیں آتے۔ سر تیج بہادر سپرو نے بھی اپنے خطبۂ تقسیم اسناد میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اوروں کی شکایت تو ایک طرف خود متعلم اور معلّم بھی اکثر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ بعض اوقات مترجم صاحب بھی نہیں سمجھتے کہ

انھوں نے کیا لکھا ہے۔ ترجمہ بہت ضروری اور کام کی چیز ہے، بشرطیکہ اچھا ہو۔ ہر زبان کے محاورے، جملوں کی ساخت اور بیان کے پیرا ئے الگ ہوتے ہیں۔ ترجمے کا کمال یہ ہے کہ مصنف کے مفہوم کو اپنی زبان اور محاورے میں اس طرح ڈھال کر ادا کیا جائے کہ گنجلک پیدا نہ ہو، اصل خیال کی قوت میں فرق نہ آئے اور یہ معلوم ہو کہ کتاب ہماری ہی زبان میں لکھی گئی تھی۔ یہ بات ان ترجموں میں مفقود ہے اچھے ترجمے ادب کا جز بن جاتے ہیں اور انھیں اصل تصنیف کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بُرے ترجمے زبان و ادب، پڑھنے والوں کے دماغ اور ان کے طرزِ تحریر پر بہت مضر اثر ڈالتے ہیں۔

علم و فن کے لئے اصطلاح ضروری ہے لیکن اصطلاحوں کی بھرمار ضروری نہیں۔ اصطلاح کے لئے ضروری نہیں کہ ادق اور مغلق ہو۔ اب زمانہ عام تعلیم کا ہے اس لئے اصطلاحیں ایسی بنانی پڑیں گی جو قریب الفہم ہوں۔ دارالترجمہ کی اصطلاحیں نظر ثانی کی محتاج ہیں بعض بلاشبہ بہت اچھی ہیں اور وہ مقبول بھی ہوئیں لیکن اس کے ساتھ ہی بہت سی ایسی ہیں جو نہ زبان پر چڑھتی ہیں نہ سمجھ میں آتی ہیں اور نہ استعمال کی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بجز چند مستثنیات کے علم و فن کی جو کتابیں یہاں لکھی گئی ہیں ان میں اصطلاحات غیر مانوس اور مشکل الفاظ کی کثرت اور عبارت اکھڑی اکھڑی اور پیچیدہ ہے اور بُرے ترجمے کی ساری شان موجود ہے۔ عام پڑھنے والوں کے لئے سلیس زبان میں وہی لکھ سکتے ہیں جو اپنے فن کے پورے ماہر اور زبان پر کافی قدرت رکھتے ہیں۔

آپ کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو کہ اردو پر جو سب سے بڑی آفت آئی اور جس کا خمیازہ ہم اب تک بھگت رہے ہیں وہ اسی مشکل پسندی کی وجہ سے آئی۔

بہار اس سے پہلے احاطۂ بنگال میں شامل تھا مظفرپور میں سنٹرل کالج کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے احاطۂ بنگال کے لفٹنٹ گورنر مسٹر جی۔ بی کیمبل کو مدعو کیا گیا۔ ۷ نومبر ۱۸۷۱ء کو انھوں نے مظفرپور پہنچکر سنگِ بنیاد رکھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر نیلین نے انگریزی میں، سید امداد علی نے اردو میں تقریر کی۔ آپ جانتے ہیں کہ ایسے موقعوں پر جو تقریریں کی جاتی اور سپاسنامے پیش کئے جاتے ہیں ان میں پُرشکوہ عربی، فارسی لفظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ سید صاحب کی تقریر سنکر لفٹنٹ گورنر نے کہا کہ "میں مشکل سے یہ فرق کر سکا کہ ان کی تقریر اردو زبان میں تھی یا فارسی میں"۔ اس ضمن میں یہ بھی کہا کہ اردو دیسی زبان نہیں اور تعلیم عامہ میں اسے رواج نہیں دیا جا سکتا۔ واپس جانے کے چند ہی روز بعد اس نے ایک عجیب و غریب سرکاری یادداشت شائع کی جس میں اردو کے خلاف بہت زہر اُگلا ہے۔ اس میں وہ لکھتا ہے کہ "پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھکر تعجب ہوا کہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں اور مدرسوں میں بھی اسکی تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار میں جو زبان میں نے سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی۔ ایسی مصنوعی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ جو زبان ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں۔ اس زبان کے لئے "اردو" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو نہایت غیر موزوں ہے.... کتابوں میں اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے لیکن درحقیقت یہ اردو زبان اہلِ دربار اور دہلی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا مدارس میں اس زبان کی تعلیم کو روکنے کی کوشش کروں گا"۔

" ڈائرکٹر تعلیمات، انسپکٹران مدارس کو ہدایت کی جاتی ہے کہ

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

میرے من کی آشا جاگ

من کا مُنور تھل جائے گا۔ من کا کنول بھی کھل جائے گا
من کی منڈیر پہ بول رہا ہے کلپن رُوپی کاگ
میرے من کی آشا جاگ

ندرا سکا سُکھ موت کا سکھ ہے، ندرا میں تو دُکھ ہی دُکھ ہے
رین نہیں اب ہوا سویرا، اُٹھ ندرا کو تیاگ
میرے من کی آشا جاگ

قسمت کے مٹے بھی جاگے۔ ندرا کے بیٹھے بھی جاگے
تو جاگے تو پھر کیا کہنا۔ جاگ اٹھیں گے بھاگ
میرے من کی آشا جاگ

من میں ایسی لے بس جائے۔ ناگن بن کر جو ڈس جائے
لے کا زہر چڑھے نس نس کر، چھیڑ دے دیپک راگ
میرے من کی آشا جاگ

عرش ملسیانی

افغانستان و ہند کی مابین ثقافتی تعلقات

(یہ تقریر بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے بانی سر ولیم جونز کی پندرھویں سالگرہ کے موقع پر کلکتہ کے ایک جلسہ میں کیگئی تھی)

احمد علی کہزاد

دوسرے ممالک کی طرح افغانستان کے مورخین بھی اپنے وطن کی تاریخ کی صحیح چھان بین کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اسلئے کہ ان کے ملک کے جغرافیائی، تاریخی، سیاسی اور ادبی حالات سب پر واضح ہوجائیں، وہ اپنے وطن کے قدیم مسودات کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہیں۔ انہی مسودات کی روشنی میں ہم پڑوسی ملکوں کے ساتھ اپنے ثقافتی تعلقات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

تقریبًا دو صدیوں سے ویدوں کے اشلوک اور اوستا کی نظمیں دنیا بھر کے ارباب علم کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔ بلاشبہ ان میں تاریخ افغانستان کے بہت سے ابواب شامل ہیں۔ ان ماخذوں سے نہ صرف ملک کے جغرافیائی حالات کا پتہ چلتا ہے بلکہ قدیم باشندوں کی زبان، ادب، گیتوں، کہاوتوں، صنمیاتی کہانیوں، فلسفے اور مذہب پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اگر ایک مسودے میں کوئی بات رہ گئی ہو تو دوسرا اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کے مسودات کے جوڑ توڑ سے قیمتی معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔

فراعنہ نے مصری مندروں کے سنگین ستونوں پر ہیرو غلیفی خط میں اپنی تاریخیں کندہ کرائی تھیں۔ سمیری، کلدانی، بابلی اور آشوری گلی تختیوں پر لکھتے تھے۔ ہند یورپی یا زیادہ مناسب الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ ان کی ایک شاخ نے جو "آریہ" کے نام سے موسوم ہوئی اور جو دریائے آمو اور سندھ کے درمیانی علاقے میں آباد تھی سینہ بسینہ ایسے گیت ہم تک پہنچائے ہیں جن کے اقتباسات سے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مختلف اقوام کے ارباب علم نے اپنے ذاتی تصورات کی بنا پر آریاؤں کے حسب و نسب کی چھان بین کرتے ہوئے اس قوم کے وطن مالوف کو مختلف مقامات سے منسوب کیا ہے۔ لیکن ان ادبی اور مذہبی یادگاروں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو آریاؤں نے چھوڑی ہیں یعنی وید اور اوستا ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ان کی ابتدا اس علاقے سے ہوئی جو آج "فرغانہ" کہلاتا ہے۔ روسی ارباب علم کے انکشافات سے بھی اس امر کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ "کبھ" (کابل) "کردمو" (قرم) "گوماتی" (گومل) "راسا" (کنار) "سوینی" (سوات) "سرسوتی" (اوستا کا ہراوتی یا موجودہ ارغنداب) "سندھو" (سندھ) اور پنجاب کے دوسرے دریاؤں کا ذکر ویدوں میں موجود ہے۔ یہ فہرست گنگا پر ختم ہوجاتی ہے جس کا ذکر صرف ایک بار کیا گیا ہے۔ دریاؤں کے علاوہ بعض مقامات کا بھی ذکر آیا ہے مثلاً "بلہیک" (بلخ)، "گندھار"، (وادی کابل)، اور کوہ مجاوت (درہ منجان)، لہذا کسی چون و چرا کے بغیر یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ ویدوں کے زمانہ کے آریہ وادی سندھ تک آنے اور وہاں سے ادھر ادھر پھیلنے سے پہلے ہندوکش کے دونوں جانب رہتے تھے۔

آریاؤں کا دوسرا ماخذ اوستا در اصل ویدوں کا تکملہ ہے۔ اسکے اندراجات کم منتشر، زیادہ مسلسل، واضح اور مکمل ہیں۔ وینڈیداد کی پہلی فرگرد کے سولہ خوبصورت علاقوں کا حال پڑھ کر ایک واضح جغرافیائی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ علاقے یہ ہیں :-

(۱) ایریانم ویجو (فرغانہ)
(۲) سگدھا (سوگدیانہ)
(۳) مُورو (مرغیانہ یا مرغاب)
(۴) بکھدی (بلخ یا باختر۔)
(۵) نسایا (مُورو اور بکھدی کے مابین، مائی مانہ کا علاقہ)
(۶) ہراوا (قدیم آریا، صوبہ ہرات میں دریائے ہری کا حصہ)
(۷) وئی کراتہ (دریائے کابل)
(۸) اُروا (روہ کا علاقہ قندھار اور سندھ کے درمیان)
(۹) کھنیتا (ہرکینیا)
(۱۰) ہراوتی (عرب مصنفین کے مطابق رونیج)
(۱۱) ہیتمانت (دریائے ہلمند)
(۱۲) راگھا (راہ، بدخشاں میں)
(۱۳) کاخرا (غزنی کا علاقہ)
(۱۴) ورینا (وزیرستان کا اگلا حصہ)
(۱۵) ہپت ہندو (ویدوں کے مطابق سپت سندھو یعنی پنجاب)
(۱۶) رانہا ؟

ان میں سے بعض علاقوں کو اچھے الفاظ میں خراج تحسین ملتا تھا۔ مثلاً ہراوتی کو خوبصورت، ہیتمانت کو روشن اور منور۔ نیز "بکھدھم کری رم اریدھو درفشم" یعنی خوبصورت بکھدی جسے بڑا عروج حاصل ہے۔

ان علاقوں کے علاوہ بھی اوستا میں افغانستان کے بہت سے پہاڑوں اور دریاؤں کا ذکر ہے۔ مثلاً :۔

"اپائرسینا" یعنی "عقاب سے اوپر" گویا عقاب کی پرواز سے بھی اونچا۔ یہ بنداہش کا اپارسن ہے جہاں سے دریائے ہری دریائے ہلمند، دریائے مرغاب اور دریائے بلخ نکلتے ہیں۔ زدسپرام کا بیان ہے کہ یہ پہاڑ سیستان سے سنستان تک یعنی سیستان سے چین تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسے ہندوکش کا ایک سلسلہ کہا جا سکتا ہے۔

"پورانا" بردان کے پہاڑ جس کا ایک درّہ اب بھی اسی نام سے موسوم ہے (کاپیکا کا شمالی حصہ آجکل کے جبل السراج سے اوپر)

"سپیتیا گاؤ اگیری" "کوہ سفید" موجودہ زمانے کا اسپین گھار پکھتیکھا علاقے ہیں (جنوبی صوبہ) پشتو زبان میں اسپین گھار کے معنی "کوہ سفید" ہیں۔

"استائرا" کو اصل مسودے میں شاعرانہ طور پر "استائرا اتار وسارا" کے نام سے درج کیا ہے۔ استائرا کی چوٹی ستاروں کو چھوتی ہے۔ جیمز درمسٹیٹر نے اس پہاڑ کو گھوربند گروپ میں شامل کیا ہے لیکن سر اوریل اسٹین نے اسے تیرہ کے ساتھ ملایا ہے (افغانستان کے مشرق میں) "ہرائیتا باریز" اوستا کا پہلا اونچا پہاڑ۔ گنیگر نے اسے پامیر گروپ میں شامل کیا ہے۔

"زیدیدھاز" اجیمز درمسٹیٹر اسے ہرائیتا باریز کے بالکل ساتھ تصور کرتے ہیں۔

"سیامکا" بنداہش کا سیاک اومند یعنی دریائے ہری کے شمال میں اس عہد کا کوہ سیاہ۔ اس نام کے معنی یعنی کالا پہاڑ اوستا کے مسودے سے بالکل ملتے ہیں۔ درمسٹیٹر اسے دریائے ہری کے شمال میں ایک دیوار کی حیثیت دیتے ہیں۔

"وافرائینت" بنداہش کا وافرا ومند (برفپوش پہاڑ) کوہ سفید۔

دوسرے درجے کے دریاؤں میں سے جن کا ذکر اوستا میں کیا گیا ہے مندرجہ ذیل قابل لحاظ ہیں :۔ ہادستر ا، ہواسپا، فرادتھا، ہوارے نانو ہاتیتی۔ سر اوریل اسٹین نے کش کے ساتھ ملایا ہے، اراجو سیا کا کھو اسپا، دریائے فراہ اور ہارت۔ یہ سب کے سب دریائے ہلمند کی شاخیں ہیں۔

چنانچہ ویدوں میں اور اوستا میں الگ الگ یا مجموعی طور پر جو جغرافیائی معلومات درج ہیں، وہ سارے افغانستان سے متعلق ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وید اور اوستا کے زمانے کے آریہ اس ملک سے اچھی طرح واقف تھے، اور اس لئے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ وہ ملک جو دریائے سندھ اور دریائے ہامون کے مابین واقع تھا، آریاؤں کا وطن تھا اور وہ ہندوکش کے آریہ کہلاتے تھے۔

اب ہمیں اراتوستھنیز، استرابو اور بطلیموس کے بیانات کی روشنی میں اصل موضوع کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ اراتوستھنیز پہلا یونانی مصنف ہے جس نے ہمارے ملک کے جغرافیائی حالات تیسری صدی قبل مسیح کے نصف اوّل میں قلمبند کئے۔ بدقسمتی سے اس کا وہ کارنامہ تلف ہو گیا تاہم استرابو نے اس کے چند حصوں کو اپنے ہاں نقل کیا ہے۔ ان دونوں نے ویدوں اور اوستا کے اس ملک کو جو اب افغانستان کہلاتا ہے "آریانہ" لکھا ہے۔ استرابو نے آریانہ کا حدود اربعہ حسب ذیل لکھا ہے :۔ مشرق میں دریائے سندھ تک۔ جنوب میں بحر اعظم یعنی بحر ہند تک۔ شمال میں اس سلسلۂ کوہ تک جو شمالی ہندوستان سے بحیرۂ خزر تک ہے۔ مغرب میں اس حد تک جو بحیرۂ خزر کے جنوب مشرقی ساحل کو خلیج فارس سے ملاتی اور پارتھیا، کرمان اور مکران کو فارس اور میڈیا سے جدا کرتی ہے۔ بلخ یا باختر کی بابت استرابو نے مختصر طور پر صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ آریانہ کا موتی ہے۔

یونانی النسل مصری جغرافیہ دان بطلیموس نے دوسری صدی عیسوی میں آریانہ کا جغرافیائی مطالعہ کرتے ہوئے اس کے صوبے گنوائے ہیں۔ ہم مسٹر ایچ ڈبلیو بیلو کی تحریر کے مطابق انھیں یہاں نقل کرتے ہیں۔ مرغیانہ (وادیٔ مرغاب) بکتریانہ (باختر اور بدخشاں) آریی (وادیٔ ہری رود صوبۂ ہرات میں) پاروپامیسس (ہزارہ جات۔ کابل کا علاقہ سندھ، نورستان اور درستان تک ان سمیت) درنگیانہ (سیستان) اراکوسیا (قندھار اور غزنی، سلسلۂ کوہ سلیمان دریائے سندھ تک) گدروسیا (کیچ اور مکران یا بلوچستان)

پس وید اور اوستا کے مسودات اور اراتوستھنیز، استرابو اور بطلیموس کے بیانات کے مطابق افغانستان ویدی اور اوستائی آریاؤں کا گہوارہ تھا یہی وجہ ہے کہ ان قدیمی کلاسیکی مصنفین نے جن کا ذکر اوپر آیا ہے اس سرزمین کو آریانہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

زمانہ وسطیٰ کے عرب مصنفین نے اس ملک کو خراسان لکھا ہے اور اسکی حدبندی اسی طریقے سے کی ہے۔ افغانستان اس کا نیا نام ہے۔

اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ پروفیسر ایچ ایچ ولسن جو بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک قابل رکن تھے تقریباً ایک سو پانچ سال پہلے ہمارے ملک کی بابت ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام "آریانہ اینٹیکا" ہے۔ انھوں نے اس سرزمین کے جغرافیائی

حالات لکھنے اور اس کے قدیم نام "آریانہ" پر روشنی ڈالنے کے سلسلے میں تقریباً سو صفحات مخصوص کئے ہیں۔ قدیم مسودات کی مدد سے انہوں نے ہمارے ملک کے صوبے، شہر اور قبیلے بیان کئے اور گنوائے ہیں۔ میں اس وقت ان کے اس کارنمایاں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کیونکہ وہ ہماری تحقیقات کی ٹھوس بنیاد ہے اور اس سے بھی تاریخ کے قدیم ترین زمانے سے افغانستان کے جغرافیائی اور تاریخی وجود کا پتہ چلتا ہے۔

ویدی اور اوستائی مسودات کی غیر معمولی مشابہت نیز زبان و فلسفے، صنمیات و مذہب اور تہذیب و تمدن کے دوسرے موضوعات کی مماثلت ثابت کرتی ہے کہ وید اور اوستا کے ماننے والے آریانہ کے باشندے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے ویدی تہذیب، بہت سی ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد شمال مغربی ہندوستان تک پھیلی اور اوستائی مت کو تو آجکل بھی ایران میں فروغ حاصل ہے۔

ویدی قبیلوں کے ناموں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کچھ افغانستان کے پہاڑوں میں رہ گئے اور کچھ نقل مکان کر کے پنجاب جا پہنچے۔ کیونکہ موضوع زیادہ وسیع ہے، اس لئے ہم صرف دو قبیلوں کا ذکر کریں گے۔

۱- پشت یا پخت۔ پشتان یا پختان (الصورت واحد پشتون یا پختون) ہیرودوطس نے ان کا ذکر "پیکٹائسں" کے نام سے کیا ہے اور ان کے طور طریق کو پختیا یا پکتیکا لکھا ہے۔ یہ لفظ اب بھی "پختینہ" کے نام سے رائج ہے۔ نیز یہ قبیلہ آجکل بھی افغانستان کی آبادی کا اہم حصہ ہے۔

۲- بھارتھ۔ ہم آگے چل کر معلوم کریں گے کہ یہ قبیلہ کس طرح ہندوکش کے شمال سے ہندوستان چلا گیا۔ پنجاب کے وسیع میدانوں کو چراگاہوں میں تبدیل کر لینے کے بعد وہ "بھارتھ ورش" یعنی "بھارتھوں کی چراگاہیں" کہلانے لگا۔ چنانچہ ہندوستان کا پہلا تاریخی اور قومی نام "بھارت ورش" ہی ہے۔

وہ ویدی قبیلے جو ہندوکش کی جنوبی ڈھلانوں سے ہجرت کر کے سندھ سے پرے تک پہنچے اس سرزمین پر جو اس دریا اور دریائے گنگا کے مابین واقع تھی، ایک ہی کوشش میں اپنا قبضہ نہ جما سکے۔ انھیں دریائے سندھ کے کنارے ہی روک دیا گیا کیونکہ انہی میں نیز ان میں اور ہندوستان کے اصلی باشندوں کے درمیان کچھ کشمکش اور لڑائی جھگڑے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ انھوں نے قبضہ جمایا اور اس حصہ ملک میں جو ستلج اور یمنا (جمنا) کے مابین ہے، سکونت اختیار کر لی اور اس بستی کا نام کرکشیتر یعنی "کرو کا ملک" رکھا۔ اپنے پھیلاؤ کے دوسرے دور میں وہ جمنا اور گنگا کے درمیان جا پہنچے اور اس علاقے کا نام "مادھیہ دیس" یعنی "درمیانی زمین" رکھا۔ بھارت میں چند اہم قبیلے بھی شامل تھے۔ ہندوکش کی ڈھلانوں سے اترتے وقت وہ وادی سندھ میں دو راستوں سے پہنچے یعنی کبھ، کرموا اور گومانی کی وادیاں طے کرنے یا ارغنداب کی وادی عبور کرنے کے بعد۔ "مہابھارت" اس بھارت ورش کی صنمیاتی رزمیہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ وید اور اوستا کے بعد یہ تیسرا خاص ماخذ ہے جس کے مطالعے سے ہم ان چند قبیلوں کی ہجرت کے اہم حالات معلوم کر سکتے ہیں جو افغانستان سے ہندوستان آئے۔ مالا یا ملادا ہندوستان کے قدیم باشندوں میں شامل ہیں۔ ایل ڈی لاویلی پاؤسن کو ان میں اور مادا، مدادا، مدرا اور مدرا کا میں جو بھدرا اور رچالا کے پڑوسی تھے، گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ اسی مصنف کے خیال کے مطابق ان اور بہت سے دوسرے قبیلوں کو باھیک کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ سنسکرت ماخذوں میں اکثر یہ نام باھلیک لکھا گیا ہے۔ بلخ سنسکرت ادب میں باھلیک ہے۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلوی مسودات میں اسے بہل یا باخلی لکھا گیا ہے۔ اس امر کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے کہ کس طرح آریائی قبیلے باختر سے ہندوکش کو عبور کر کے آئے اور پنجاب میں مقیم ہو گئے۔ جے پرزائیلوسکی اس بات کو ان الفاظ

پرواز

پرواز جعفری

کبھی کبھی مجھے آتی ہے اک پرانی یاد — کہ میں نے غور سے دیکھی ہے قوم کی اُفتاد
یہ شور و غل یہ کشاکش یہ انقلابِ چمن — کہ دامِ فکر میں پابند ہے غمِ صیاد
اک آہ نیم شبی ہے فسانۂ سحری — سنا سکا نہ کوئی قصۂ غمِ فرہاد
متاعِ زیست نہیں کچھ بجز خس و خاشاک — میں نذر کرتا ہوں سرمایۂ دلِ برباد
مری نگاہ بھی دامِ خیال میں پھنس کر — تلاش کرتی ہے اک اور عالمِ ایجاد
بدل رہا ہے زمانہ بدل رہی ہے نظر — نئے نظام کی رکھی گئی نئی بنیاد
یہ اور بات ہے آوارگی نہیں جاتی — جنوں کی منزل آخر بھی ہو گئی آباد

رموزِ دہر کو پرواز ہم سمجھتے ہیں
ازل سے اہلِ خرد کی نگاہ میں ہے کشاد

میں بیان کرتا ہے کہ "پنجاب کے باطیک اور باختر سے آنے والے دراصل ایک ہیں"
سنسکرت زبان مخصوصاً اپنی پہلی ادبی صورت میں یعنی ویدی سنسکرت ہندوکش کے دونوں جانب بولی جاتی تھی۔ ویدوں کے اشلوک (ان میں سے رگ وید سب سے زیادہ پرانا ہے) کابیکا اور پنجاب کے مابین گائے جاتے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوسکتا ہے کہ سنسکرت ادب کی داغ بیل افغانستان میں پڑی اور اسے فروغ پنجاب میں حاصل ہوا۔ پانینی نام کے ماہر صرف و نحو نے جو چوتھی صدی قبل مسیح میں اٹک کے گرد و نواح میں رہتا تھا زبان کو نکھارا اور اس وقت سے وہ ہمس کر دایا سنسکرت کہلانے لگی۔

بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے لائق وفائق بانی سر ولیم جونز کا ایک سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے لسانی مطالعے کیلئے زباندانی کے مقابلے پر پہلے پہل توجہ دی۔ انہی نے سب سے پہلے سنسکرت اور ژندمیں مماثلت پائی۔ یہ مماثلت' زباندانی کے نقطۂ نظر سے ایک واضح ثبوت ہے کہ وہ لوگ جو یہ دو قدیم محاورے بولتے تھے ایک ہی فرقے کی حیثیت سے مل کر رہتے ہوں گے۔ ویدا اور اولیستا کی زبانیں اس درجہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں کہ ایک زبان کے جملے کے جملے آسانی سے دوسری زبان میں تبدیل ہوسکتے ہیں۔ ہندوکش کی ان دو بڑی زبانوں سے بہت سی بولیاں نکلیں جن کو ماہرین لسانیات ہندوستانی اور ایرانی خاندان کی بولیاں کہتے ہیں۔

ناروے کے ایک عالم کا خیال ہے کہ بہت سی ہند یورپی بولیاں سلسلۂ ہندوکش کی وادیوں میں اب تک برقرار ہیں اور ان کے مطالعے کے لئے افغانستان بہترین جگہ ہے۔ ہم افغانیوں کا بھی خیال ہے کہ ماہرین لسانیات کا مطالعہ ہمارے ملک کی ادبیات اور قدیم تاریخ کے سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم اور قابل اعتماد ذریعہ اور ماخذ ہے۔ ان مطالعوں سے افغانستان کے توسیعی پہلو پر روشنی پڑتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ کس طرح مختلف بولیاں ہجرت کے ذریعہ ہمارے پڑوسیوں تک پھیلتی چلی گئیں۔

چنانچہ سنسکرت زبان ویدی قبیلوں کے ساتھ افغانستان کے پہاڑوں سے گئی اور ہندوستان میں پھیل گئی جہاں اس سے نکل کر بہت سی ہندوستانی بولیاں ترقی پاگئیں۔ پھر اشوک کے زمانہ میں جب بدھ مت کو فروغ ہوا تو یہ زبان دوبارہ ہمارے ملک میں آگئی اور کشان حکومت کے عہد میں یہ افغانستان اور ہندوستان کی مذہبی زبان بن گئی۔

ہم مذکورہ بالا سطور میں ثابت کرچکے ہیں کہ ویدا اور اولیستا کے جغرافیائی بیانات افغانستان کے مقامات سے بالکل منطبق ہوتے ہیں۔ تاریخی واقعات جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ کسی قدر خیالی شکل و صورت اختیار کرتے چلے گئے' اب بھی اتنے حالات فراہم کرسکتے ہیں کہ ہم ان بنیادوں پر اپنے ملک کی تاریخ کا پہلا باب مرتب کرلیں۔

شروع کے تمام آریائی ماخذوں میں وہ ویدہوں' اولیستا ہو یا مہابھارت شہزادوں اور بادشاہوں کی شجاعت کے قصے شامل ہیں۔ اولیستا میں خاندانوں کا شجرہ درج ہے۔ پرادت کوی اور اسپال ایسے بادشاہ ہیں جنھوں نے وندیدا (یعنی کلاسیکی مصنفین کے آریانہ کے دوسرے فرگرد کے کل سولہ خوبصورت علاقوں پر حکومت کی تھی۔ ان خاندانوں کا ذکر شاہنامہ میں بھی آیا ہے۔ ان کا مرکزی مقام بلخ تھا لیکن بلخ کے علاوہ کابل' زابل' سمنگان' قندھار' ہرات اور سیستان وغیرہ تک ان کا عمل دخل قائم تھا۔

ویدی آریاؤں نے شمال مغربی ہندوستان میں اچھی طرح تسلط حاصل کرلینے کے بعد سب سے پہلے برہمو سماج کی بنیا درکھی اور پھر بدھی فرقے کو فروغ دیا۔ تاریخ ہند کے پہلے خاندان کے مشہور موریا بادشاہ یعنی اشوک اعظم نے اپنی سلطنت کو ہندوکش کی جنوبی ڈھلانوں تک پھیلا چکنے کے بعد نہ صرف آس پاس کے بلکہ دور دراز کے ملکوں میں بدھی پرچارکی سبھائیں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مجھانتیک' دھرم اکھیت اور مہارا کھیت ایلچیوں کے اس گروہ میں شامل تھے جو افغانستان اور مغرب کے دوسرے ملکوں میں بھیجا گیا۔ اس طرح تیسری صدی قبل مسیح کے نصف اول میں بدھ مت مشرقی آریانہ یعنی گندھارا میں اپنی جھلک دکھانے لگا تمام وادی کابل "نئی مگدھ" یعنی بدھ مت کی نئی سرزمین موعودہ بن گئی۔ اے فوچہ کی تحقیقات کے مطابق پتہ چلتا ہے کہ بدھ مت نگارا ہارا یعنی موجودہ ننگرہار یا جلال آباد سے لنپکا (لغمان) تک پھیل گیا اور وہاں سے تگاؤ اور نجراؤ اور پھر کابل وکپیسا تک جا پہنچا۔ غور بند' قندکستان اور بامیان کی وادیوں کی راہ اس مذہب کی رسائی ہندوکش کے شمال میں بائیک اور پھر باختر اور توخارستان تک ہوئی (اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب بِرْد رفتہ رفتہ نصف مشرقی حصہ ملک میں بدھ مت کے لئے جگہ خالی کرتا گیا) اولیستا کے ایک نسخے سے جو سمر قند میں دستیاب ہوا' معلوم ہوتا ہے کہ آگ کا ایک سنگھاسن جسے وہرن کہتے تھے اور جو وشتاسپ کے بیٹے سپیندات نے "باخ یالک" میں بنوایا تھا' بودھی سنگھرم میں تبدیل ہوگیا۔ اس کا نام "نواویہارا" رکھا گیا جسے عربی اور فارسی مصنفین نے "نوبہار" کے نام سے پیش کیا ہے۔ یہ صورت حالات ساتویں صدی

(باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

موٹے آغا

(خاکہ)

اشرف صبوحی

غدر کے بعد پٹاباز کی ہستی تو مانی ہوئی ہستی تھی۔ مرزا ولی اللہ بیگ ابھی مرے ہیں جن کو دعویٰ تھا کہ سو جوان ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور وار کریں، میں سب کی چوٹیں بچاتا اور اپنی چوٹ کرتا نکل جاؤں گا۔ مگر پچھلے رستموں میں ایک آغا مصطفےٰ بیگ کا دم باقی رہ گیا تھا جنہیں لوگ عام طور پر موٹے آغا کہا کرتے تھے۔

چاوڑی بازار میں شاہ بولا کے بڑ سے قاضی کے حوض کی طرف جوڑی والوں کے محلے کے برابر حافظ داؤد کا کمرہ ہے اس کمرے کے نیچے اب تک ایک دوکان رفوگری کی ہے۔ اس زمانے میں یہاں مرزا یارنجان ایک کشمیری ناٹا سا قد۔ ہاتھ پاؤں بھرے بھرے۔ ڈنڑ پھیلائے بیٹھے رفو کیا کرتے تھے۔ آغا مصطفےٰ بیگ اپنے آخری دنوں میں اسی کمرے پر رہتے تھے۔ اور اس لئے عصر کے بعد عموماً مرزا یارنجان کی دوکان کے آگے مونڈھے پر ان کی بیٹھک تھی۔ ایسے ڈیل ڈول اور کلے جبڑے کے آدمی اب دیکھنے میں نہیں آتے۔ مغل بچوں کا پورا نمونہ تھے۔ بڑھاپے میں چہرے سے خون ٹپکتا تھا۔ آواز ایسی کراری کہ بولتے تو یہ معلوم ہوتا شیر گرج رہا ہے۔ جسم کی کھال تو البتہ لٹک گئی تھی لیکن ڈنڑوں کی مچھلیاں اب بھی ایسی ٹھوس تھیں کہ کیا مجال جو چٹکی تو لی جا سکے۔

کہتے ہیں کہ شاہی میں ان کے والد اپنے وقت کے بڑے بانکے تھے۔ انھوں نے بھی قلعہ میں پرورش پائی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد جس وقت تک ابوظفر سراج الدین کا چراغ ٹمٹماتا رہا قلعہ ہی میں رہے۔ غدر ہوا تو زخمی ہو کر قید ہوئے۔ چھوٹے تو دوجانے جا پہنچے۔ ادھیڑ عمر میں دلی آئے اور جب تک جئے اکھنگ جئے۔

آغا کی نسبت سنا ہے کہ بانک میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ بانک خنجر بازی کا نام ہے۔ کبھی سچ مچ کی چھریوں سے اس کی مشق ہوتی تھی پھر لکڑی کی چھریاں ہو گئیں۔ اس میں بہت سے داؤں بھی ہوتے ہیں مثلاً ہٹ کوڑا، بغلگیر، حلقوم، گولا لاٹھی، بازو بند وغیرہ۔ جس طرح بنوٹ کی چوٹیں کاری سمجھی جاتی ہیں اسی طرح اس کے داؤں۔ لڑائیوں میں اس کا استعمال کب ہوتا تھا۔ صحیح نہیں معلوم۔ داستانوں میں عیاروں کی خنجر بازی سنی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جنگ مغلوبہ میں جب تلوار چلانے کی جگہ نہ رہتی ہوگی تو خنجر اور کٹار سے کام لیا جاتا ہوگا۔ بہرحال یہ بھی ایک سپاہیانہ فن تھا اور اس کے جاننے والوں میں آغا بھی تھے۔

آغا کی شہزوری اور دلیری کی عام طور پر شہرت ایک اتفاقیہ واقعہ سے ہوئی۔ ان دنوں شاہ بولا کے بڑ کا چرا با سانڈوں کا اکھاڑا تھا۔ تیسرے چوتھے روز ضرور ایک آدھ کشتی ہو جاتی۔ بسیلا نیوں کے ٹھٹھ لگ جاتے۔ اس میں کبھی کبھی بھاگ دوڑ میں لوگوں کے چوٹیں لگ جاتیں مگر یہ بھی ایک سیر تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آغا یارنجان کی دوکان کے آگے مونڈھے پر آ کر بیٹھے ہی تھے کہ شاہ بولا کے بڑ کی طرف سے ایک شور اٹھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بڑی جوڑ چھوٹی ہے۔ اتنے میں سانڈ ٹکراتے ہوئے قاضی کے حوض کی طرف چلے۔ لوگ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگ رہے تھے۔ یارنجان نے آغا سے کہا اوپر آ جایئے سانڈوں کا رخ اسی طرف ہے۔ آغا نے ہنس کر جواب دیا مرزا ڈرو نہیں۔ جانوروں سے کیا بچا لگتا۔ آ رہے ہیں تو آنے دو۔

سانڈوں کو اپنے زور دکھانے سے کام تھا۔ کوئی روندن میں آ جائے یا کسی کا خوانچہ الٹ جائے۔ ان کی بلا سے۔ اتنے میں سانڈوں نے دوکان کے آگے آ کر سینگ جوڑ لئے۔ اب پھر یارنجان نے کہا: "آغا دوکان کے اوپر کیوں نہیں آ جاتے؟" آغا پھر ہنسے اور کہنے لگے: "مرزا یہاں بھی ایک سانڈ بیٹھا ہے آنے تو دو"۔ یارنجان کچھ اور کہنا ہی چاہتے تھے کہ سانڈ آڑے ہو کر لڑنے لگے۔ سڑک پر تازہ تازہ چھڑکاؤ ہوا تھا۔ دوکان کی طرف جس سانڈ کی پشت تھی اس کا پاؤں رپٹا اور دوسرا اسے رگیدتا ہوا چلا۔ آغا کے مونڈھے کے قریب پٹڑی کے نیچے اس نے گھٹنے ٹیک دئے۔

آغا:۔ بس بھئی بس۔ اب اس نے گھٹنے ٹیک دئے تم بھی ہٹ جاؤ۔

لوگ ہنسنے لگے کہ آغا جانوروں سے بھی ایسی باتیں کرتے ہیں جیسے آدمیوں سے۔ بھلا سانڈ ان کی سنیں گے۔ دو چار نے آغا سے اصرار بھی کیا کہ اتنی جیداری اچھی نہیں اپنا مونڈھا ہٹا لیجئے۔ مگر آغا قطب تھے۔ قطب از جا نمی جنبد کے مصداق، انھوں نے جب دیکھا کہ گرے ہوئے کو دوسرا مارے جاتا ہے تو تیوری چڑھا کر بولے: "نہیں مانتا اب کیا میں اٹھوں"۔

اتنے میں پچھڑا ہوا سانڈ پٹڑی کے برابر لمبا لمبا لیٹ گیا تھا۔ اور دوسرے نے اس کی چھاتی پر گھٹنے ٹیک دئے تھے۔ آغا نے اٹھتے ہی پہلے تو جھنجھلاتے ہوئے سانڈ کی کوک پر ایک لات رسید کی۔ لات کو وہ پی گیا۔ بلکہ جھنجھلا کر اس نے آغا پر حملہ کرنا چاہا تو آغا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے دونوں سینگ پکڑ لئے اور ایک رو میں اس کو سڑک کے بیچ میں لے گئے۔ سانڈ نے جھرجھری لے کر سینگ چھڑانے چاہے۔

سانڈ کا جھرجھری لینا تھا کہ آکا نے گاؤمکھ کا داؤں کیا۔ سانڈ اڑا ڑا
کر کے زمین پر آپڑا۔ تماشائیوں پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ سانڈ کے گرتے ہی
شور مچ گیا کہ واہ آکا واہ کیا بات ہے۔ سچ مچ کا گاؤمکھ آج ہی دیکھا ہے۔
سانڈ گر پڑا تو آکا نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور بولے ”اسی بُرتے
پر آکا کا مونڈھا اُٹھوا رہا تھا۔ جا اب سیدھا چلا جا ورنہ بے چھری
حلال کر دوں گا“۔ سانڈ کوئی ایک منٹ تو چپ پڑا رہا پھر اٹھ کر ایسا بھاگا
کہ پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اس وقت بھی دہلی کمشنر اور کمشنر وغیرہ کے بنگلوں پر بعض پرانی
دیگ کی کھرچنیں نابوں میں لگ کر جایا کرتی تھیں۔ وہ جب حکام سے
ملتے آزادی کے ساتھ اور اپنے کو لئے دیئے۔ حکام بھی ان کی ویسی ہی عزت
کرتے۔ برابر کی ملاقاتیں ہوتیں۔ مل کر بیٹھتے تو کام کی باتوں کے علاوہ شہر میں
جو اچنبے کی بات ہوتی اس کے متعلق رائے زنیاں کی جاتیں۔ مسلمانوں میں
ڈپٹی ہادی حسین خاں، شہزادہ سلیمان شاہ، اور ہندوؤں میں لالہ بالا پرشاد
نہر والے خصوصیت کے ساتھ اس بات کا خیال رکھتے کہ دلی والوں پر کوئی
حرف نہ آئے۔

اچھا آکا مصطفیٰ بیگ کی سانڈ سے کشتی کے بعد جو ڈپٹی ہادی حسین خاں کی ڈپٹی کمشنر
بہادر سے ملاقات ہوئی تو کہیں اس واقعہ کا بھی ذکر آگیا۔ صاحب نے پوچھا
یہ آکا کون شخص ہے۔ ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں؟ ڈپٹی صاحب نے کہا ایک
با امن شہری ہیں۔ لکڑی اور خاص کر بانک کے فن کا جاننے والا اب ان کے
سوا شاید دلی میں دوسرا نہیں۔ رہا ان کے دیکھنے کا سوال۔ شام کو بلا ناغہ
چاوڑی بازار میں حافظ داؤد کے کمرے کے نیچے ان کی نشست ہوتی ہے۔
جب جی چاہے ادھر نکل جائیے اور دیکھ آئیے۔

صاحب بہادر: وہ ہمارے بنگلہ پر نہیں آئیں گے؟

ڈپٹی صاحب: ان آکاؤں سے آپ واقف نہیں۔ بے بلائے
یہ بادشاہوں کے دربار میں تو گئے نہیں۔ اور گئے بھی تو پہلے یہ فیصلہ کر لیا کہ کہاں
بٹھائے جائیں گے۔ کس طرح ان سے گفتگو کی جائے گی۔

صاحب بہادر: لیکن وہ زمانہ اور تھا۔ ان پرانے دستوروں
کے ہم پابند نہیں۔

ڈپٹی صاحب: آپ پابند نہیں وہ تو پابند ہیں۔

غرضیکہ اسی طرح کی ردوبدل کے بعد صاحب بہادر نے وعدہ کر لیا
کہ ہم کرسی دیں گے اور عزت کے ساتھ ملیں گے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا کہ
میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ انھیں لا کر آپ سے ملا دوں۔
آکا کی نشست اکرام اللہ خاں کے ہاں رہتی تھی۔ چنانچہ ہادی حسین خاں نے
ان کے ذریعہ سے آکا کو ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ پر چلنے کے لئے مجبور کیا اور صاحب
کو چٹھی لکھی کہ میں نے بڑی کوشش کے بعد آکا کو جناب کی ملاقات کے لئے
رضامند کر لیا ہے۔ آپ جو دن اور وقت مقرر کریں انھیں لے کر حاضر ہوں۔
امید ہے کہ آپ اُن کی واجب تعظیم فرمائیں گے۔ صاحب نے ہادی حسین خاں
کی چٹھی کا فوراً جواب دیا۔ ملاقات کا دن اور وقت مقرر کر کے وعدہ کیا کہ
ملاقات چونکہ نجی ہے اس لئے دوستانہ ہوگی۔

چنانچہ جب ڈپٹی صاحب آکا کو لے کر صاحب کے بنگلہ پر پہونچے
اور اطلاع ہوئی تو وہ بلا تامل باہر نکل آئے۔ ڈپٹی صاحب منحنی سے آدمی
تھے اور ان کے مقابلہ میں آکا کے ڈیل ڈول اور چہرے پر نظر پڑی کہ ایک
شیر ہے۔ ڈاڑھی چڑھی ہوئی جسم کا رنگ ململ کے باریک انگرکھے میں سے
پھوٹا پڑ رہا تھا۔ حیران رہ گئے۔ آگے بڑھے پہلے ڈپٹی صاحب سے ہاتھ
ملایا پھر آکا سے۔ معلوم ہوا کہ فولاد کے پنجے میں ہاتھ ڈال دیا۔ صورت دیکھنے لگے۔

صاحب: (آکا سے) آپ اچھے ہیں؟

آکا: اچھا تو خدا کا نام ہے۔ زندہ ہوں۔

صاحب: (ڈپٹی صاحب کی طرف دیکھ کر) کیا مطلب؟

ڈپٹی صاحب: آکا صاحب کا مطلب یہ ہے کہ آپ جیسے حاکم جس
شہر میں ہوں وہاں بُرائی کا کیا کام۔ خدا کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کرنے
کے لئے ہم زندہ ہیں۔

صاحب: (آکا سے) مجھے آپ کی ملاقات کا بہت شوق تھا۔

آکا: آپ کی مہربانی۔

صاحب: آپ کے متعلق ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ پٹا بازی کا
ہنر خوب جانتے ہیں۔

آکا: پٹا بازی کیسی میں سمجھا نہیں؟

صاحب: محرم میں تعزیوں کے سامنے لکڑیوں سے جو کھیل کھیلتے
ہیں کیا آپ وہ نہیں جانتے؟

آکا: صاحب۔ خدا خدا کیجئے ایک ستر برس کے بوڑھے کو کھیل
سے کیا نسبت۔

صاحب: ہم نے تو بوڑھے بوڑھوں کو اچھلتے کودتے دیکھا ہے۔
اور ہمارے ڈپٹی صاحب کہتے تھے کہ آپ اُن کے استاد ہیں۔

آکا: ہاں انھوں نے دو چار گھائیاں مجھ سے سیکھی ہیں۔

صاحب: گھائیاں کیا؟

آکا: لکڑی کے فن کے داؤں پاچوٹیں۔

صاحب: تو کیا اس میں بھی اچھلتے کودتے ہیں۔

آکا:۔ آجکل کود تو بٹا بازی یا ہنوتی میں ہوتی ہے۔ بانک اور بنوٹ کو ان لوزنہ حرکتوں سے کیا تعلق؟

صاحب:۔ بانک اور بنوٹ میں کیا ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے۔

آکا:۔ ہلانے پڑتے ہیں لیکن صرف ضرورت کے وقت۔ بنوٹ کے تو نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کی کوئی اوٹ نہیں۔ اس کے داؤں سے دشمن بچ نہیں سکتا۔ بانک والا بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے بھی اپنا داؤں کر جاتا ہے۔ جس طرح بنوٹ کے لئے کسی ہتھیار کا ہونا لازمی نہیں اس کا جاننے والا رومال کی گرہ سے بندوق کی گولی کا کام لے سکتا ہے۔ اسی طرح بانک کے اگر کسی کو دو چار داؤں بھی رواں ہیں تو مقابل کے سارے ہتھیار بیکار ہیں۔

صاحب:۔ لیکن یہ فن اگلے زمانہ میں شاید کچھ بکار آمد ہو۔ آج کل بندوق اور ریوالور کے مقابلہ میں اسے سیکھنا وقت ضائع کرنا ہے۔

آکا:۔ بندوق اور طمنچہ کے سامنے واقعی بانک اور بنوٹ کی کاریگری کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر ایسے بھی تو بہت سے موقعے آدمی کو پیش آجاتے ہیں جہاں یہ چیزیں نہیں ہوتیں، فقط ہاتھ پاؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

صاحب:۔ ولایت میں بوکسنگ اور فینسنگ ہم لوگ بھی اسی مطلب کے لئے سیکھتے تھے لیکن ریوالور کے مقابلہ میں اب یہ چیزیں صرف کھیل سمجھی جاتی ہیں۔

آکا:۔ بوکسنگ اور فنسنگ کیا ہوتا ہے؟

صاحب:۔ گھونسے بازی اور شمشیر زنی۔

آکا:۔ میں نے یہ کھیل نہیں دیکھے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ ہمارے ہاں کی کشتی اور لکڑی کے فن کے مقابلہ میں ان کی کیا حیثیت ہے۔

صاحب:۔ میں نے بھی ولایت میں ان دونوں میں اچھا کمال پیدا کیا تھا۔

آکا:۔ بہت مبارک۔ لیکن کبھی ان کے دکھانے کا کوئی موقع بھی ملا۔

صاحب:۔ کیا مطلب؟

آکا:۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب سے آپ نے یہ فنون سیکھے ہیں آپ کو کبھی دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ جب تک ایسی صورت پیش نہیں آتی کسی فن کی حقیقت نہیں کھلا کرتی۔

صاحب:۔ مجھے تو کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا مگر ہمارے ملک میں ایسے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں۔

آکا:۔ وہ لوگ گھونسے کے مقابلہ میں گھونسے اور تلوار کے مقابلہ میں تلوار ہی چلاتے ہوں گے۔

صاحب:۔ قطعی۔

آکا:۔ اگر کسی کو گھونسہ بازی نہ آتی ہو یا تلوار اس کے پاس نہ ہو اور دشمنوں میں گھر جائے۔

صاحب:۔ تو اس کی موت ہے۔ دشمن اس پر غلبہ پالیں گے۔

آکا:۔ لیکن ہمارا فن ہتھیاروں کے بغیر بھی اپنے جاننے والے کی جان بچا سکتا ہے۔

صاحب:۔ کیا آپ کو تلوار کے مقابلہ میں تلوار اور گھونسے کے جواب میں گھونسے کی ضرورت نہیں۔

آکا:۔ بالکل نہیں۔ بلکہ ایک دفعہ تو بندوق اور طمنچہ کی زد سے بھی بچ سکتے ہیں۔

صاحب:۔ میں نہیں سمجھ سکتا۔

آکا:۔ سانڈ کے مقابلہ میں میرے پاس کیا ہتھیار تھا؟

صاحب:۔ مگر سانڈ تو جانور ہے۔

آکا:۔ آپ کا مکا باز ایسے موقعے پر کیا کرتا۔ سانڈ کی جھپٹ سے کیونکر بچتا؟ گھونسے تو اس پر کارگر نہ ہوتے۔

صاحب:۔ (کچھ سوچ کر) اچھا آپ ہمارے کسی گھونسے باز کے مقابلہ میں کیا کریں گے؟

آکا:۔ کوئی گھونسے باز سامنے ہوں تو بتاؤں۔ ایک گھونسہ کے بعد شاید اس کا ہاتھ مدتوں گھونسا نہ بنا سکے۔

صاحب:۔ ہم آپ کی اس شیخی کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اپنے طریق پر اگر گھونسا ماروں تو آپ کیا کریں گے؟

آکا:۔ (ہنس کر) مگر میں آپ کو گھونسا مارنے کی صلاح نہیں دونگا۔ آپ حاکم وقت ہیں اور میں ایک گوشہ نشین امن پسند۔

صاحب:۔ کچھ مضائقہ نہیں۔

ڈپٹی صاحب:۔ کوئی دوسرا انگریز اسوقت دلی میں ایسا نہیں جو گھونسا بازی جانتا ہو۔

صاحب:۔ (گھنٹے کی طرف دیکھ کر) قلعہ میں ایک میجر ہمارا دوست ہے گھونسہ بازی کا پورا مشاق۔ وہ شاید ابھی آجائے۔

اتنے میں بیرے نے آکر میجر کا کارڈ دیا۔ صاحب نے اسے اندر بلالیا۔ دو چار باتوں کے بعد صاحب نے میجر سے کچھ انگریزی میں کہا۔ اس نے آکا کی طرف بغور دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ تم بڈھا آدمی ہم سے گھونسہ بازی کرنا مانگتا ہے؟

آکا:۔ بازی وازی ہم کچھ نہیں جانتے۔

میجر:۔ پھر؟
آکا:۔ تم گھونسا چلاؤ ہم دیکھیں وہ کیا چیز ہے۔
میجر:۔ تم کیا کرے گا۔ اگر مر گیا؟
آکا:۔ خون معاف لیکن اگر تمہارا ہاتھ ٹوٹ گیا۔
میجر:۔ (قہقہہ لگا کر) کچھ پروا نہیں۔

آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو ضرب شدید سے احتیاط رکھی جائے۔ چنانچہ میجر صاحب نے کوٹ اتار دیا۔ قمیض کی آستینیں چڑھالیں اور آکا کی طرف اشارہ کیا کہ آیئے میدان میں۔

آکا:۔ آپ گھونسہ بازی شروع کیجئے۔
میجر:۔ (ہنس کر) بیٹھے بیٹھے لڑے گا؟
آکا:۔ لڑنا کیسا تمہارے صاحب کو ایک ذرا سا چٹکلا دکھانا ہے۔

میجر نے صاحب ڈپٹی کمشنر کی طرف دیکھا۔ انھوں نے سید ہادی حسین سے کچھ کہا۔ سید صاحب نے گردن ہلادی۔ صاحب نے میجر کو اشارہ کردیا۔ وہ پینترا بدلتا گھونسے ہلاتا آکا پر چلا۔ آکا دیکھتے رہے۔ جب میجر صاحب آکا کے قریب پہنچے اور گھونسا ان کے منہ پر مارنا چاہا تو یکایک معلوم ہوا جیسے کسی درخت کا گدّا اُلٹا۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی جناب میجر زمین پر چت پڑے ہوئے دکھائی دئے اور آکا صاحب پہلے کی طرح بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے تھے۔ صاحب اور ڈپٹی صاحب اٹھ کر میجر کے قریب گئے۔ پوچھا کیا ہوا؟ کہنے لگا ہمیں کچھ نہیں معلوم ہم نے گھونسا مارنا چاہا بڈھے نے ہاتھ مروڑ کر ہمیں گرادیا۔

صاحب: (آکا سے) ہم تو کچھ دیکھ نہیں سکے۔
آکا:۔ آپ کہاں چلے گئے تھے۔
صاحب:۔ ہم نے سمجھا تھا کہ آپ کے فن کا میجر صاحب کے فن سے دو چار منٹ مقابلہ ہوگا اس لئے پوری توجہ نہیں کی۔
آکا:۔ ہمارے فن میں مقابل سے کھلاڑیاں کرنا کیا معنی؟ میجر صاحب نے گھونسا مارا ہم نے کیلی کر کے انھیں پچھاڑ دیا۔ البتہ اتنی رعایت کی کہ ان کا ہاتھ سلامت رہا۔ اگر ایسے موقعے پر واقعی کوئی دشمن ہوتا تو کہنی اتر جاتی یا بازو ٹوٹ جاتا۔
صاحب:۔ کیلی کیا؟
آکا:۔ ہتھیار چھیننے کا ایک داؤں ہے۔ مارنے والے کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیتے ہیں۔
صاحب:۔ مگر آپ نے تو بجلی کی سی پھرتی کی۔
آکا:۔ ہمارے فن میں پھرتی ہی سے سارے داؤں ہوتے ہیں۔

میجر صاحب نے دو چار منٹ تو اپنے ہاتھ کو پہنچے سے لے کر شانے تک سہلایا۔ اس کے بعد آگا کے قریب آکر آکا کو پہلے تو بڑے غور سے دیکھا۔ ان کی تیوری پر بل نہ کپڑوں پر شکن۔ نہ ان کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ پھر بڑے تپاک اور نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ آکا سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ کیا آپ طمنچہ اور بندوق کی گولی کا مقابلہ بھی کر سکیں گے۔

آکا:۔ بندوق مارنے والا اگر سامنے ہے تو ایک دفعہ شاید اس کی گولی بھی بچا جائیں گے۔
صاحب:۔ ناممکن ہے۔
آکا:۔ آپ نے گھونسے بازی کا تماشا تو دیکھ ہی لیا۔ اب ان سے کہئے کہ طمنچہ چلائیں۔ خدا نے چاہا تو چلنے سے پہلے طمنچہ زمین پر پڑا ہوگا۔

صاحب نے میجر کی طرف دیکھ کر اس سے انگریزی میں کہا کہ لگتے ہاتھوں اس بڈھے کا یہ کمال بھی دیکھ لینا چاہئے۔ لیکن ریوالور میں کارتوس نہ ہو تاکہ اسے نقصان نہ پہنچے۔ اور صاحب نے اپنا ریوالور لاکر میجر کو دیا۔

آکا اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ میجر نے ریوالور ہاتھ میں لیا اور دو چار قدم پیچھے ہٹ کر ریوالور تانا۔ ریوالور بندوق کی طرح نشانہ باندھ کر نہیں مارا جاتا بلکہ اس کی نال اونچی کر کے آہستہ آہستہ سیدھا کر کے مقابل پر جھونکتے ہیں۔ چنانچہ میجر نے ریوالور ابھی سیدھا بھی نہیں کیا تھا اور اس کی گھوڑی دبانی چاہتے ہی تھے کہ آکا ایک دفعہ ہی اپنی جگہ سے اڑے۔ ریوالور کی نال سیدھی ہونے نہیں پائی تھی۔ ہاتھ نیچے آہی رہا تھا کہ آکا کے ہاتھ کی گدی اسکی کلائی پر اس زور سے پڑی کہ ریوالور چھوٹ کر دور جا پڑا اور میجر صاحب ہاتھ پکڑ کر رہ گئے۔ آکا پھر بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔

صاحب:۔ یہ آپ نے کیا کیا؟
آکا:۔ (مسکرا کر) اسے ہت کٹی کہتے ہیں۔ میرے پاس لکڑی ہوتی تو یہی داؤں لکڑی سے کرتا۔ لکڑی نہیں تھی۔ میں نے لکڑی کا کام اپنے ہاتھ کی گدی سے لیا۔

صاحب ڈپٹی کمشنر بہت متعجب ہوئے۔ سید ہادی حسین خاں سے آکا کی تعریف کی اور فرمایا کہ اگر یہ ہم سے کبھی کبھی ملتے رہیں تو اچھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد آکا رخصت ہو کر گھر آگئے اور اس روز سے مرزا رفوگر کی دوکان پر بیٹھنا بھی کم کر دیا۔ اب ایسے لوگ کہاں۔ قلعہ کی جو رہی سہی یادگاریں تھیں وہ بھی اٹھ گئیں۔

وسط ایشیا کے چند فنکار

صدرالدین عینی — ایک تاجیک ادیب

۳

ل احمد اکبرآبادی

صدرالدین عینی نسلاً تاجیک ہے اور تعلیم و تعلّم کے اعتبار سے ازبک۔ اس لئے کہ سن شعور سے اس کا سارا وقت بخارا وغیرہ میں گذرا وہیں اس نے درجہ علم و فضل حاصل کیا اور وہیں اس کا شعروادب پروان چڑھا۔ امیر بخارا کے زمانے تک یہ علاقے الگ تھے بھی نہیں لیکن جب ازبکستان اور تاجکستان وغیرہ کی جداگانہ جمہوریتیں قائم ہوئیں تو عینی نے اپنا مستقر تاجکستان میں بنالیا۔ بایں ہمہ وہ جتنا تاجیک ہے اتنا ہی ازبک ہے۔ دونوں ملک اور قومیں عینی کو "اپنا" کہتے اور سمجھتے ہیں

وسطِ ایشیا، جو انقلاب سے پہلے تک روسی ترکستان کہا جاتا تھا انقلاب کے بعد کازاک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور ازبک سوویٹ جمہوریتوں میں تقسیم ہوا، اور جب ازبکستان میں سوویٹ طاقت قائم ہوئی تو اس وقت صدرالدین عینی مسلّمہ شہرت کا مالک تھا۔ صدرالدین نے بچپن میں گاؤں کے ایک مکتب میں پڑھا جہاں بچے عموماً "تہفت یک" اور دوسری قرآنی سورتیں حفظ کر لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد صدرالدین بخارا چلا آیا تعلیم جاری رکھی۔ پھر ایک مسجد کی کوئی خدمت اس کے سپرد ہو گئی۔ اس زمانے میں اس نے بخارا کے ایک مقتدر ملّا صاحب سے اعلیٰ نصاب کا درس لیا۔ وسط ایشیا میں تعلیم کا یہی ایک طریقہ تھا۔ الغرض صدرالدین نے امیر بخارا کی حکمرانی میں رائج نصاب پورا کر کے فضیلت کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے پرانے شعروادب کا مطالعہ کر کے اور سعدی و حافظ اور جامی و نوائی سے کسب فیض کیا۔ عینی تخلص اختیار کیا اور شعر کی مملکت میں ایک معزز مقام حاصل کر لیا۔

صدرالدین عینی تھوڑے ہی عرصے میں ایک نہایت قابل انشاء پرداز اور "محرر" کی حیثیت سے مشہور و مقبول ہو گیا۔ اور سمجھا جانے لگا کہ قصیدہ گوئی اور درخواست لکھنے میں عینی ایک فردِ کامل ہے۔ اب وہ تمام لوگ جنہیں امیر یا قاضی القضاۃ کے یہاں درخواستیں گزارنا ہوتیں۔ عینی کو تلاش کرتے ہوئے پہنچتے تھے۔ اس طرح سماجی طور پر بھی صدرالدین عینی ایک مقتدر شخصیت بن گیا تھا۔

عینی نے جو ماحول پایا اور جس فضا کے اندر اس کی تعلیم و تربیت ہوئی وہ ازمنہ وسطےٰ کی تاریکیوں اور گمراہیوں کا ماحول تھا۔ اور صدرالدین کی فطرت عالی اس ماحول سے مطابقت نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ وہ اپنے ماحول سے گھبرا گیا اور اس کی تصنیفات میں بغاوت کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے اپنی تحریروں میں حقیقت پر سے پردے ہٹائے اور لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کے کچھ انسانی حقوق ہیں، امیر کی حکومت پر عوام کی طرف سے کچھ فرض عائد ہوتے ہیں، عوام کی بےکسی نشائے قدرت نہیں ہو سکتی اور امیر کی مطلق العنانی ارادۂ خداوندی نہیں ہے۔

اونچے سماجی طبقے میں پہلے تو عینی کے نعرۂ حق و انصاف سے گھبراہٹ پیدا ہوئی، پھر خفگی اور بیزاری کا اظہار ہوا، اور پھر اس کی خفگی کا عملی ثبوت دیا جانے لگا۔ عینی نے کسی بات کی پرواہ نہ کی اور اپنا فرض منصبی ادا کرتا رہا۔ اور جب مخالفوں کی طرف سے تعزیر و تشدد ہونے لگا تو ردِ عمل میں عینی تلخ سے تلخ تر ہوتا گیا۔ ادھر سے دشمنی اور سزا کا اعلان تھا تو اس طرف سے تنقید و مخالفت سخت سے سخت تر ہوئی تھی۔

بڑے لوگ صدرالدین سے خفا تھے کہ اس نے آداب و مروت کی تمام قدیمی روایتوں کو پامال کیا ہے! بخارا کی پوری تاریخ میں اس بغاوت و غداری کی مثال نہیں ہے۔ اس نے امیر اور امرائے دربار کی مخالفت اور حقارت کی؟ اس نے بزرگوں کی کے رسم و رواج کو توڑا؟ اس نے صدیوں کے پرانے عقیدوں کی مخالفت کی؟ رائج الوقت رسوم سے روگردانی کی؟ ان سب باتوں کا جرمانہ عینی نے بالکل اسی طرح ادا کیا جس طرح تاریخ میں حق کے ساتھی اور صداقت کے پرستار ادا کرتے چلے آئے ہیں۔ عینی استحکام و استقلال کا پہاڑ ثابت ہوا۔ اور وسط ایشیا کی "جدید بخارا" تحریک کا سرخیل قرار پایا۔

صدرالدین بخارا سے تاشقند چلا گیا تو امیر نے اس کے بھائی کو قتل کرا دیا۔ عینی کو اپنے بھائی سے غیر معمولی محبت تھی، اس لئے اس واقع نے اس کو پاگل بنا دیا۔ عینی کے غم کی حد اور غصّے کی انتہا نہ تھی۔ بھائی کے غم میں اس نے ایک نظم لکھی جس کے اندر قلب و جگر کا خون صرف کیا ہے۔ یہ نظم قومی جنگ میں بصورت ترجمہ شائع ہوئی تھی۔

"اب میں حسن و عشق کے گیت نہ گاؤں گا۔ گلستانی نغمہ موقوف!
اور حسین خوابوں کا ترانہ ختم! آج سے میری آواز میں انقلاب کے
نعرے بند ہونگے اور نفرت کے شعلے بھڑکیں گے! میں انقلاب
اور نفرت کا نغمہ الاپونگا............"

اس موقع پر عینی کے تین شعر جو انگریزی ترجمے کی صورت میں

نہیں بلکہ اخبار "قومی جنگ" کو اصل فارسی میں دستیاب ہوئے، یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

در آتش ستم جگرم شد کباب سرخ — از خون مستبد قدحے دہ شراب سرخ
بر انقلاب روئے مرا سرخ مے کند — از انقلاب سرخ دمد آفتاب سرخ
عینی بیک غزل نتواں شرح حال کرد — باید بہ انقلاب نوشتن کتاب سرخ

عینی حکام متعلقہ کو اطلاع کئے بغیر قزلتاب چلا گیا اور وہاں ایک روئی کے مِل میں مزدوری کرنے لگا۔ یہ بھی ایک نئی بات تھی کہ اونچی سماج کا آدمی کارخانوں میں مزدوری کرے۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ اتنا پڑھا لکھا آدمی مزدوری کرنے نکل کیسے سکتا ہے۔ بخارا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہ تھی کہ ایک جوان شاعر و ادیب اور عالم و فاضل ادنے قسم کا مزدور بنا ہو۔ اشرف بخارا اس بنا پر بھی اس کے زیادہ مخالف ہوگئے۔

امیر بخارا نے سنا تو صدرالدین کو بخارا بلا لینا چاہا اور اسلئے اس نے ایک معزز اور دولتمند مسجد کی نگرانکاری صدرالدین کو پیش کی۔ اس دور میں مسجدیں بھی دولتمند و مفلس اور معزز اور غیر معزز ہوتی تھیں۔ لیکن ایک مستبد حکمراں کا ایک خود سر باغی کو کوئی منصب اور مرتبہ عطا کرنا طرفہ تر بات تھی اور اس طرفگی سے عینی خود بے خبر نہ ہوگا عینی نے مسجد کی نگرانکاری قبول کرلی۔ اور امیر علیم خاں والی بخارا کو اتنی مہلت ضرور تھی کہ صدرالدین کو سر بازار گردن مروا دیتا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اور یہ راز کھلا بھی نہیں کہ امیر نے صدرالدین کو صرف زنداں میں ڈال دینے پر کیوں اکتفا کیا۔ قید خانے کی جان لیوا تکلیفوں کو برداشت کرکے عینی نے ثابت کردیا کہ اسے مرنے سے انکار ہی نہیں بلکہ جینے پر اصرار بھی ہے۔

اس کو تاریخ کا حسن اتفاق کہا جانے لگا کہ انہیں دنوں انقلاب نمودار ہوگیا، اور ازبک عوام سرخ فوجوں کی معیت میں زنداں کا پھاٹک توڑ دیا اور جبر و استبداد کے مظلوم زندانی آزاد ہوا میں سانس لے سکے۔

عینی کے ساتھ "جدید" تحریک کے حامیوں کی اچھی خاصی جماعت تھی لیکن حکومت کے جبر و استبداد کے سامنے اس میں سے کچھ لوگ اعتدال پسند کر رہ گئے۔ مگر عینی ایک سچا ہیرو ثابت ہوا، اس نے اپنے علم و فضل اور شعر و ادب کو عوام کی خدمت کے لئے وقف کردیا اور اس طرح قومی کلچر کا رہنمائے اعظم قرار پایا۔

وسط ایشیا میں اسوقت تک شعر کی مقبولیت عام تھی اور آجکل کے مفہوم میں نثری ادب بالکل نہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ جدید زمانے کے تقاضوں کے مطابق صرف شعری ادب سے نثری ادب کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔ بلند پایہ شعری ادب کلچری بروز کیلئے راستہ ضرور ہموار کردیتا ہے، اور بالعموم یہی دیکھا گیا ہے کہ نثری ادب خاص کر واقعیت نگارانہ اصول پر ناول نویسی اسی وقت رونما ہوسکی ہے جب کسی قوم نے سماجی اور کلچری ترقی کی کچھ منزلیں طے کرلی ہیں۔ چنانچہ ایشیا کے دوسرے ملکوں میں بھی جیسے ترکی، ایران اور ہندوستان میں نئے خیالات کی آبیاری بیسویں صدی کے شروع سے ہوئی جب وہاں قومی تحریکات نے جنم لے لیا اور ان قوموں میں آزادی اور ترقی کے خیالات نے جڑ پکڑ لی۔ آزادی کے پرچار کے ساتھ جمہوری خیالات پھیلے تو نثری ادب کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ بڑھنے لگا۔

عینی کی ہستی وسط ایشیا میں ایسے تاریخی موقع پر رونما ہوئی کہ وہ نثری ادب کا اور جدید اصول پر ناول نویسی کا باوا آدم ثابت ہوا۔ عینی پہلا شخص ہے جس نے مسجع و مقفٰے عبارت ترک کرکے سادہ و سلیس زبان اختیار کی۔ اس نے "گل و بلبل" کا پیرایہ اور لفظی جمالیات کو ترک کرکے بول چال کی زبان میں تصنیف و تالیف شروع کی۔

عینی کے پہلے ناول کا نام اودینہ (یا ایک غریب تاجیک کی واردات) ہے۔ یہ وسط ایشیا کی پہلی تصنیف تھی جو واقعیت نگاری کی اصول پر لکھی گئی۔ اس ناول کا ہیرو ایک نوعمر دہقانی ہے اور اس کی زندگی کی زبانی دکھ درد کی داستان ہے۔ اس افسانے کی جائے وقوع نہ محلات ہیں اور نہ باغات بلکہ دہقان کی جھونپڑی ہے۔ کہیں مزدوروں کی "لبں" کا منظر ہے، کہیں ریلوے تعمیر کی عارضی آبادی کا۔ ایک گھٹیا قسم کے چائے خانے میں واقعات رونما ہوتے ہیں یا زنداں کے تاریک تہ خانے ہیں۔

اس ناول کی بنا وہی خیالات و محسوسات ہیں جو انقلاب کے وقت پڑھے لکھوں کے طبقے میں عام طور سے رائج تھے۔ اس ناول میں عینی کو اس وقت کے سماج کی ناانصافیوں اور ناروائیوں کا گہرا احساس ہے مگر اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔ تاریکی ہی تاریکی ہے۔ چنانچہ افسانے کا ہیرو اودینہ زندگی کی اس جد و جہد میں شکست کھاتا اور رفتہ رفتہ ہو جاتا ہے۔

لیکن اس تصنیف کے بعد عینی کا منصب شعر و ادب جس خاص وجہ سے اپنے راستے پر قائم رہ کر پختہ ہوگیا وہ چیز عینی کی عوامی مفاد سے وابستگی اور وفاداری تھی۔ اس کا جذبہ وطن پرستی سچا اور حقیقی تھا۔ اسے قومی کلچر اور اس کی روایات سے محبت تھی۔ چنانچہ

عینی کا شاعرانہ جوہر اور ادبی قابلیت قوی تر ہوتا گیا اور عینی نے تھوڑے ہی دنوں میں نئے ناولوں کا ایک سلسلہ تصنیف کر لیا۔ "دوخندہ"، "غلام"، "سودخوار کی موت"، اور "ماضی کے اندر سے" وغیرہ متعدد ناول تصنیف کئے اس کی ان کتابوں سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ جس عہد کی زندگی بیان کرتا ہے اس پر اس کی گرفت گہری اور گیرائی حیرتناک ہے۔

ان ناولوں میں بہت سی نئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو اس کے پہلے ناول آدینہ میں نہ تھیں۔ اب عینی نے نئی باتیں دیکھ لی تھیں اور وہ خود بھی عوام کی نئی زندگی میں شامل تھا۔ "دوخندہ" میں "آدینہ" کی طرح نہ تو جذباتی وانعطافی باتیں ہیں اور نہ ویسا تعطل اور یاسیت ہے۔

اس ناول کا ہیرو بھی ایک دہقان لڑکا ہی ہے جو ایک افلاس زدہ گاؤں میں رہتا ہے۔ یہ لڑکا ایک آزاد، منصفانہ اور نئی زندگی کی آرزو رکھتا ہے۔ لیکن اس کا مقدر وہی نہیں ہے جو آدینہ کا تھا۔ دوخندہ عوامی جنگ کا سپاہی بنجاتا ہے، اور دوسرے انقلابیوں کی طرح وہ بھی زندان کے تہ خانوں میں ٹھونس دیا جاتا ہے۔ لیکن انقلاب فتحمند ہوتا ہے، امیر بخارا فرار ہو جاتا اور دوسرے رفیقوں کے ساتھ دوخندہ بھی زنداں سے آزاد نکلتا ہے۔ وہ ۱۹۲۳ء تک سرخ فوج کا سپاہی بن کر انقلاب دشمن لیجاشی ڈاکوؤں سے جنگ کرتا رہتا ہے۔ اور جب سوویٹ حکومت قائم ہو جاتی ہے تو قومی تعمیر کا مزدور و معمار بنجاتا ہے۔

لفظ دوخندہ یا دُوخندہ ازبک زبان میں تحقیر اور دانگھڑ کا مفہوم رکھتا ہے۔ یہ دوخندہ اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان مناظر کی زیارت کو جاتا ہے جہاں ان کی محبت نے جنم لیا تھا۔ گویا وہ اپنے عالم بے کسی کے خوابوں کو زندہ یا تازہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جب دونوں اپنے وطن مالوف میں پہنچتے ہیں تو کوئی چیز پہچانی نہیں جاتی۔ گاؤں بدلا ہوا ہے، علاقہ بدل گیا ہے، سارے منظر بدلے ہوئے ہیں! وہ خود بھی تو بدل گئے تھے! وہ ڈھونڈھتے ہیں مگر پہاڑی کھاڑی کے کنارے وہ گاؤں نظر نہیں آتا۔ اس موقع پر عینی لکھتا ہے۔

"ان کی حیرانی ہر ہر قدم پر بڑھتی جاتی تھی۔ پہاڑی چشمے جو پہلے بیکار اور بے راہ بہتے تھے، اب سب ایک بڑی ندی بنکر بہتے ہیں اور بند باندھ کر اس میں سے نہریں نکالی گئی ہیں۔ چپہ چپہ زمین کاشت سے آباد ہے۔ ہر کھیت کو پانی کی بہم رسانی یکساں ہے۔ سب سے زیادہ حیرانی اس بات پر تھی کہ انہوں نے وہاں روئی کی کاشت دیکھی۔ پہلے کپاس کبھی نہ بوئی گئی تھی۔ دوخندہ اپنی بیوی سے کہتا ہے:۔

"میں نہ کہتا تھا، دیکھا تم نے گلنار؟ ہمارا درہ نہاں یہاں تھا۔ بتاؤ پہلے سارے تاجکستان میں ایسا شاداب علاقہ کہیں تھا؟ دیکھتی ہو ہماری جمہوریت نے تھوڑے دن کے اندر کیا سے کیا کر دکھایا؟ ابھی تو بہت کچھ ہونا ہے!"

گلنار شوہر کا ہاتھ پکڑے دل میں خوش ہے اور اپنے پرانے درہ نہاں کی جگہ ایک صاف ستھرا گاؤں، ایک نیا درہ نہاں دیکھتی ہے اور مسرور ہوتی ہے۔

اسی ناول کے ایک باب میں عینی نے حرص اور بخل کی دوں فطرتی کی نقاشی کی اور دکھایا ہے کہ انسان لالچ میں پڑ کر اور ظلم وسفاکی کا عادی ہو کر کتنا ذلیل اور بے غیرت ہو سکتا ہے۔ بخارا کا قاضی جس کے جبر و ظلم سے ساری آبادی نالاں تھی گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر اس کے گھر کی تلاشی لی جاتی ہے اس موقع پر قاضی کے کردار کو عینی نے چند جملوں میں پیش کیا ہے۔

"قاضی القضاۃ کو جیل سے نکال کر اس کے باپ دادا کے مکان پر لایا گیا۔ عام لوگوں میں ہیجانی حالت پیدا ہو گئی، اور سمجھا گیا کہ قاضی القضاۃ پر اسی کے گھر میں مقدمہ چلایا جائے گا جہاں بیٹھ کر اس نے سینکڑوں مجبور و معذور اور ہزاروں بیگناہوں کو موت کی سزا دی تھی۔ راستہ اگرچہ سپاہیوں نے روک رکھا تھا لیکن اس تماشے کو دیکھنے کو محض شوقین دھینگا مشتی کر کے اندر پہنچ ہی گئے۔ لیکن۔ اندر تو کوئی عدالت بیٹھی نہ تھی، نہ کسی مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ البتہ چند سوویٹ حکام قاضی کے مال اسباب کا جائزہ طیار کرنے آئے تھے۔ حاکم اعلیٰ نے کنجیوں کا ایک بھاری گچھا قاضی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"کوٹھوں اور صندوقوں کے قفل کھول کر وہ تمام مال اسباب دکھاؤ جو تم پچاس برس سے اکٹھا کرتے رہے ہو!"

اس حکم کی تعمیل سے پہلے قاضی نے اس حاکم سے گڑگڑا کر ایک سگرٹ مانگا اور اپنی حرکات سکنات سے لوگوں کی توجہ جذب کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگا۔

"برادرم، آپ دیکھ رہے ہیں، میں سگرٹ پیتا ہوں، اب تو آپ کو میرے "جدید" ہونے پر شک نہیں؟ مہربانی کر کے لوگوں کو بتا دیجئے کہ میں جدید ہوں، پھر خدا کی عنایت نازل ہو۔ خدا نے چاہا تو مجھے سزا ہلکی دی جائے گی، میں سگرٹ پیتا ہوں۔"

"اطمینان رکھو، میں اعلان کر دوں گا کہ تم سگرٹ پیتے ہو۔"

اب کام شروع ہونا چاہئے۔" حاکم نے اسے جواب دیا۔

قاضی نے اپنے توشہ خانہ کا قفل کھولا اور اس حاکم کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ دہلیز کے قریب ہی ایک جوڑی جوتا رکھا ہوا ہے۔ اسپر اس نے حاکم کو مخاطب کرکے :-

"برادرم، خدا تم پر زیادہ سے زیادہ بخشش کرے، یہ جوتا تو مجھے رکھ لینے دو، جو پہنے ہوں وہ بالکل پھٹ چکا ہے۔ چلتا ہوں تو میری جوتیاں مجھ سے آگے دوڑنا چاہتی ہیں۔"

اس حاکم نے منظوری دیدی تو قاضی کو اتنی خوشی ہوئی جیسے کسی بھکاری کو سونے کا ڈلا ملجائے۔ یہ جوتے اس نے پہن لئے اور پرانے لپیٹ کر بغل میں دبا لئے۔ اور پھر ہاتھ اٹھاکر اس حاکم کو درازیٔ عمر و دولت کی دعائیں دیں۔

توشہ خانہ سونے چاندی کی اینٹوں سے بھرا تھا اور بہت سا سونے کا برادہ بھی تھا۔ حاکم نے ہر چیز کی فہرست بنائی، اور صندوقوں کو مقفل کرکے اپنی مہریں لگادیں اور چابیاں ایک دوسرے حاکم کے سپرد کردیں۔

پھر دوسرا کمرہ کھولا گیا۔ اس میں بیش قیمت قالین اور نمدے الوان اور دھتے بھرے پڑے تھے۔ ایک بڑا صندوق جس میں آہنی بند لگے تھے ان اشرفیوں سے بھرا ہوا تھا جو انقلاب سے کچھ ہی دن پہلے بخارا میں ضرب ہوئی تھیں۔ تماشائیوں میں سے ایک شخص نے کہا۔

محنت کش تاجیکوں کا خون پسینہ پچاس برس تک اس صورت میں جمع ہوتا رہا ہے۔"

تیسری کوٹھری میں آہنی بند لگے صندوق اوپر تلے چنے ہوئے تھے۔ ایک میں طلائی کٹورے نکلے جن میں ہیرے اور عقیق جڑے تھے اور بخارا کے بہترین مرصع سازوں کی دستکاری تھی۔ اس صندوق پر ایک لیبل لگا تھا "شاہنشاہ زار اور جناب عالی کی ملاقات پر نذر کے لئے" ایک دوسرے ٹرنک میں زنانہ زیورات تھے جن پر "شاہنشاہ زار کے خاندان کے لئے" ایک بکس پر لکھا تھا "موسم بہار میں قصر یالٹا کے لئے"۔ دوسرے صندوقوں میں قیمتی لباس، مخمل و ریشم کے تھان بھرے تھے۔ حصار اور کرشی کا ریشم، بخارا کی مخمل اور دوسرے ملکوں کے ساختہ زربفت و کمخواب کے تھان۔ غرض ہزاروں سے اوپر چیزیں برآمد ہوئیں۔

ایک ٹرنک کھولا گیا تو اس میں سے ایک بندھی ہوئی سفید مخمل کی دستار نکلی۔ اسے دیکھکر قاضی بے چین ہوگیا اور حاکم سے گڑگڑا کر کہنے لگا

"پردیسی بلم" ـــــ اقبال معروف

برکھا کیسے من کو رجھائے ٭ جیون "اُن" بن کیوں کل پائے

نیناں نیر بہائے ٭ بلم مورے آج بدیس لبھائے

چاند گگن کے مکھ نہ دکھاتو ٭ کالی بدری میں چھپ جاتو

من مورا بھر آئے ٭ بلم مورے آج بدیس لبھائے

جانے کیسے بیتیں رتیاں ٭ یاد آدیں گی "اُن" کی بتیاں

کیوں بادل گھر آئے ٭ بلم مورے آج بدیس لبھائے

پون چلے کلیاں مسکائیں ٭ بھونرے گھو میں پنچھی گائیں

کویل کوک ستائے ٭ بلم مورے آج بدیس لبھائے

پریت کی نرمل ریت نبھانا ٭ برہن کو ساجن نہ بھلانا

جیون روٹھ نہ جائے ٭ بلم مورے آج بدیس لبھائے

تڑپت رہوں بن نیر مچھلیا ٭ جیون ہے یا کوئی پہیلیا

یاد توری تڑپائے ٭ بلم مورے آج بدیس لبھائے

مور بلم جب لوٹ آؤ گے ٭ نینن میں جب مسکاؤ گے

پھر جیون کل پائے ٭ بلم مورے آج بدیس لبھائے

برادرم! ایک عنایت اور کیجئے، یہ پگڑی مجھے بخشدیجئے۔ جو پہنے ہوں دیکھ لیجئے پھٹ چکی ہے۔"

حاکم نے اجازت دیدی تو قاضی کو اتنی خوشی ہوئی کہ اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ پرانی پگڑی اتار کر کمر سے لپیٹ لی اور نئی کو سر پر رکھا۔ اسکی خوشی کی حد نہ پوچھئے۔ لوگ سمجھے کہ وہ ناچ رہا ہے۔

حاکم نے فہرست مکمل کرکے اپنے محرر کو دی کہ اس کی کئی نقلیں کرلے۔ محرر فہرست کی طوالت پر حیرت زدہ ہوکر بولا۔

"گلیاب کا ایک کنجوس اور اتنا بڑا ذخیرہ!"

تماشائیوں میں سے ایک آدمی کہنے لگا :-

"گلیاب سے اس کا کیا تعلق؟ میں گلیاب کا باشندہ ہوں مگر یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی دن بھی پیٹ بھر کھانا کھایا ہو؟"

یہ کہنے والا یادگار تھا جسے بخارا والے دوخندہ کہکر پکارتے تھے۔ عینی اب ضعیف ہوگیا ہے لیکن آج بھی پورے وسط ایشیائی کلچر یا زندگی کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ اس کا دوسرا کام مبتدیوں کی تربیت اور اصلاح۔

نائب صدر کی پہلی تقریر

ہندوستان کی عارضی حکومت بن جانے کے بعد اسکے نائب صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے ۷ ستمبر کو ہونے نو بجے آل انڈیا ریڈیو نئی دھلی سے ہندوستانی میں تقریر نشر کی جس میں آپنے عارضی حکومت کی تاریخی اہمیت جتانے کے بعد حادثات کلکتہ پر اظہار افسوس کیا۔ آپ نے یہ امید۔ ظاہر کی کہ عارضی حکومت کو چلانے کیلئے اشتراک عمل سے کام لیا جائیگا اور پڑوسی ملکوں کے ساتھ اس اتحاد کو استوار رکھنے کی کوشش کی جائیگی جو صدیوں سے ہمارے ملک کے ساتھ قائم ہے۔

پیرس میں امن کانفرنس

یہ تصویر ان ہندوستانی نمائندوں کی ہے جنھوں نے پیرس کی امن کانفرنس میں حصہ لیا (کرسیوں پر بائیں طرف سے) سرراگھون پلائی' سرجوزف بھور' سرسیموئل رنگاناتھن (لیڈر) ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ اور سرنوروجی وادیا (کھڑے ہوئے بائیں طرف سے) مسٹر بی ایل بھنڈاری' کیپٹن آر ہورگس دیباٹ' مسٹر کے سی رائے' مسٹر ایم۔آر۔آہوجہ' مسٹر اے وی پائی' میجر جنرل جنرل ڈی اسٹورٹ' مسٹر آر۔ایس مانی' اور مسٹر ایچ ٹریویلیان۔

سیام کے لئے قرضہ

حال ہی میں حکومت ہند نے حکومت سیام کو پانچ کروڑ روپے قرض دینے منظور کئے ہیں۔ اس تصویر میں حکومت ہند کے محکمۂ مالیات کے پرنسپل سکریٹری معاہدہ پر دستخط کر رہے ہیں۔ سیامی خزانے کے افسر اعلی (نائی هلی لامین) اپنی حکومت کی طرف سے دستخط کر رہے ہیں۔

جین مندر
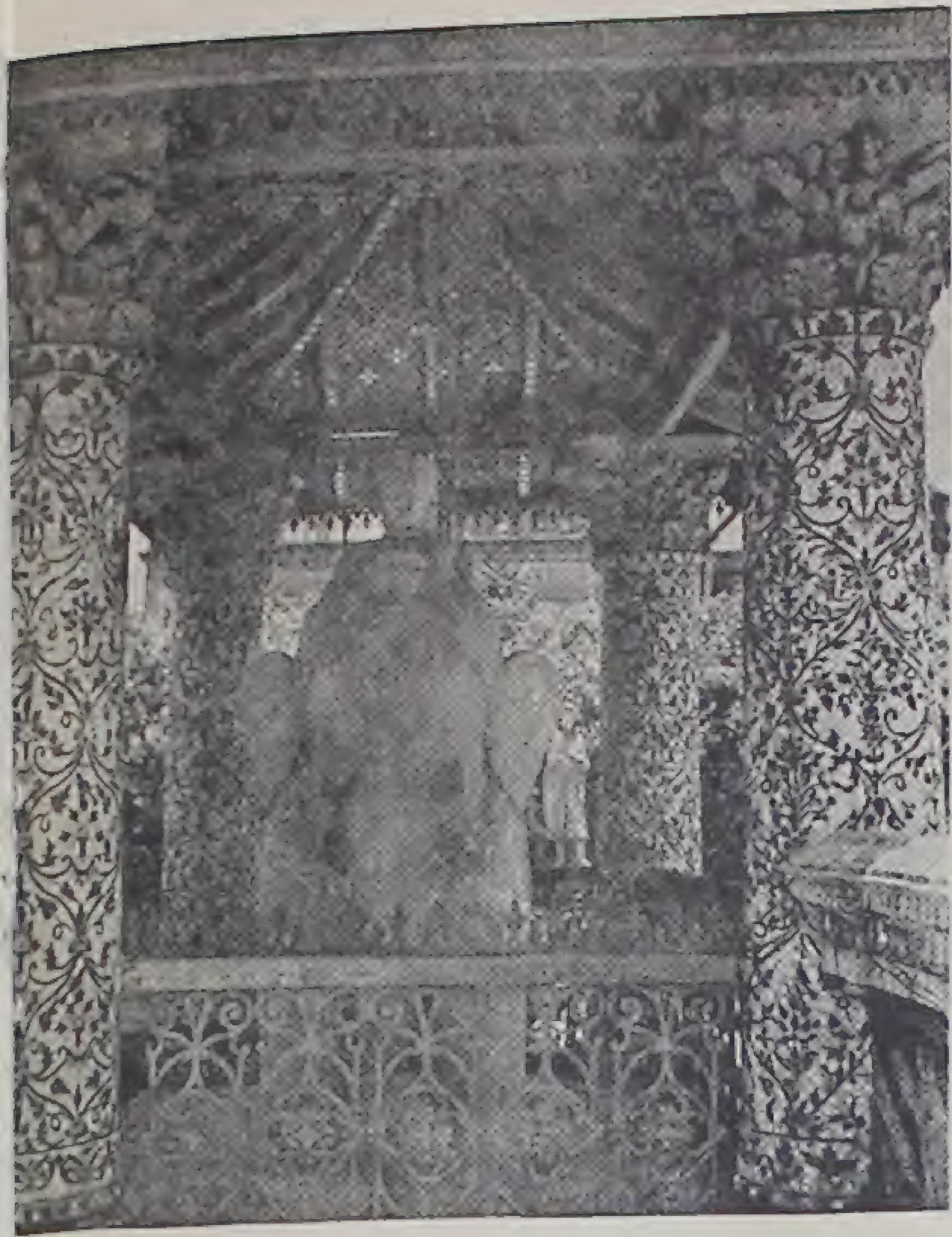
کلکتے کے جین مندر کی سمادھی میں جانے کا شاندار صدر دروازہ۔ اندرونی حصہ میں ایک جین منی بارس ناتھ کا بت رکھا ہے۔

ایک شہ نشین کے ستون کا قریبی نظارہ۔ خوبصورت نقش و نگار کس درجہ دبدبہ زیب ہیں۔
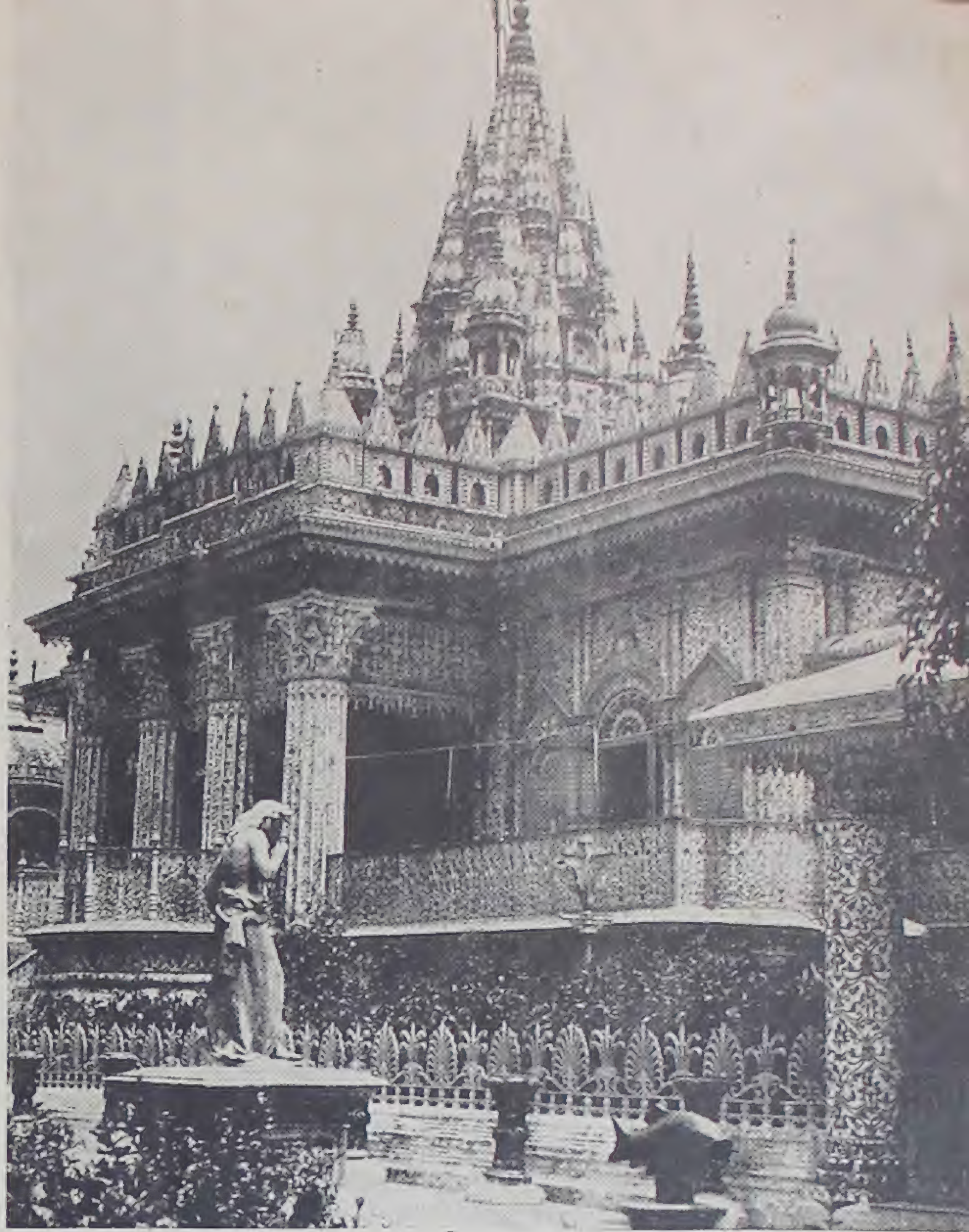
مندر کے باغیچے میں رکھی ہوئی ایک مورت۔ اوپر کی شاندار چھتری دیکھنے کے قابل ہے۔

ہندوستان میں جینیوں کا فرقہ تعداد میں کم سہی لیکن بڑا مالدار ہے۔ انکے مندر ہندوستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔ لیکن کلکتہ کا جین مندر اتنا عمدہ اور قابل دید ہے کہ کوئی سیاح اسے دیکھے بغیر شہر سے واپس نہیں جاتا۔ اس میں ہر قسم کا سامان تعمیر استعمال ہوا ہے۔ برف کے مانند سفید سنگ مرمر ہے اور دھات کے چمکتے ہوئے پترے بھی۔ چینی مٹی کے رنگین ٹائل ہیں اور صاف شیشے کے مربع و مستطیل ٹکڑے بھی۔ انسانی صنعتوں کے ساتھ ملحقہ باغیچوں کا قدرتی ماحول سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ نیز دیواروں کے نقش و نگار فواروں کی بہار اور مورتیوں کا سنگھار سیاحوں کے دل الگ موہ لیتا ہے۔ یہ مندر ۱۸۶۷ء میں تعمیر ہوا تھا۔

برطانیہ اور چرم سازی

س موضوع سے متعلق ایک مفصل مضمون اسی شمارے کے صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ کیجئے' جس مبں بتایا گیا ھے کہ اس صنعت نے دوران جنگ مبں کتنی نرقی کی ھے اور اب اسی نرقی کے باعث برطانیہ کے کارخانوں میں بنی ہوئی چمڑے کی چیزیں دنیا کے ہر حصے میں مقبول ہو رہی ہیں۔
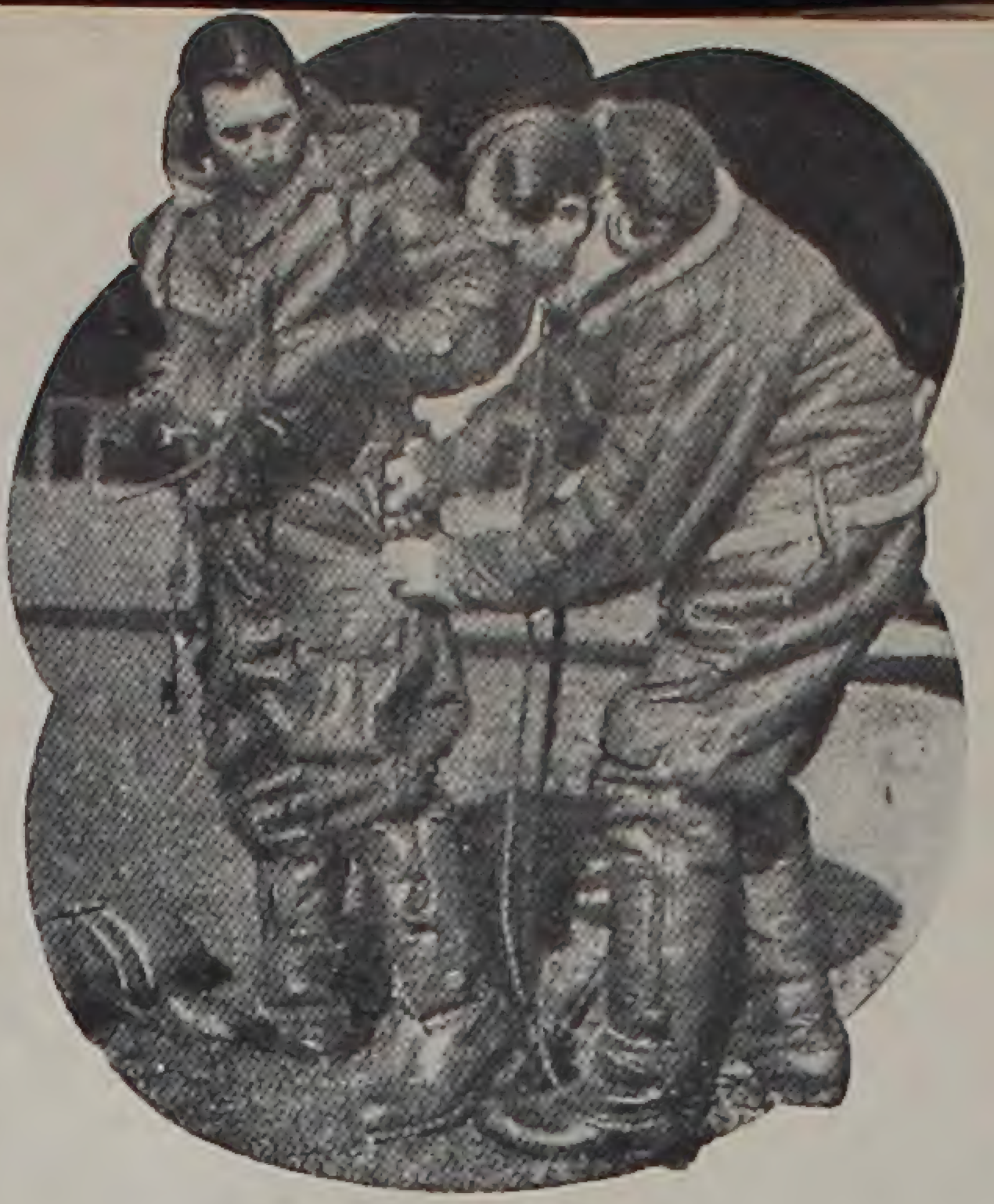
فوجی ہوا بازوں کا چرمی لباس جو صحیح معنوں میں انکو سر سے پاؤں تک ڈھک دیتا ہے۔

برطانیہ کے کارخانوں مبں بنی ہوئی چمڑے کی چیزوں کے چند نمونے۔
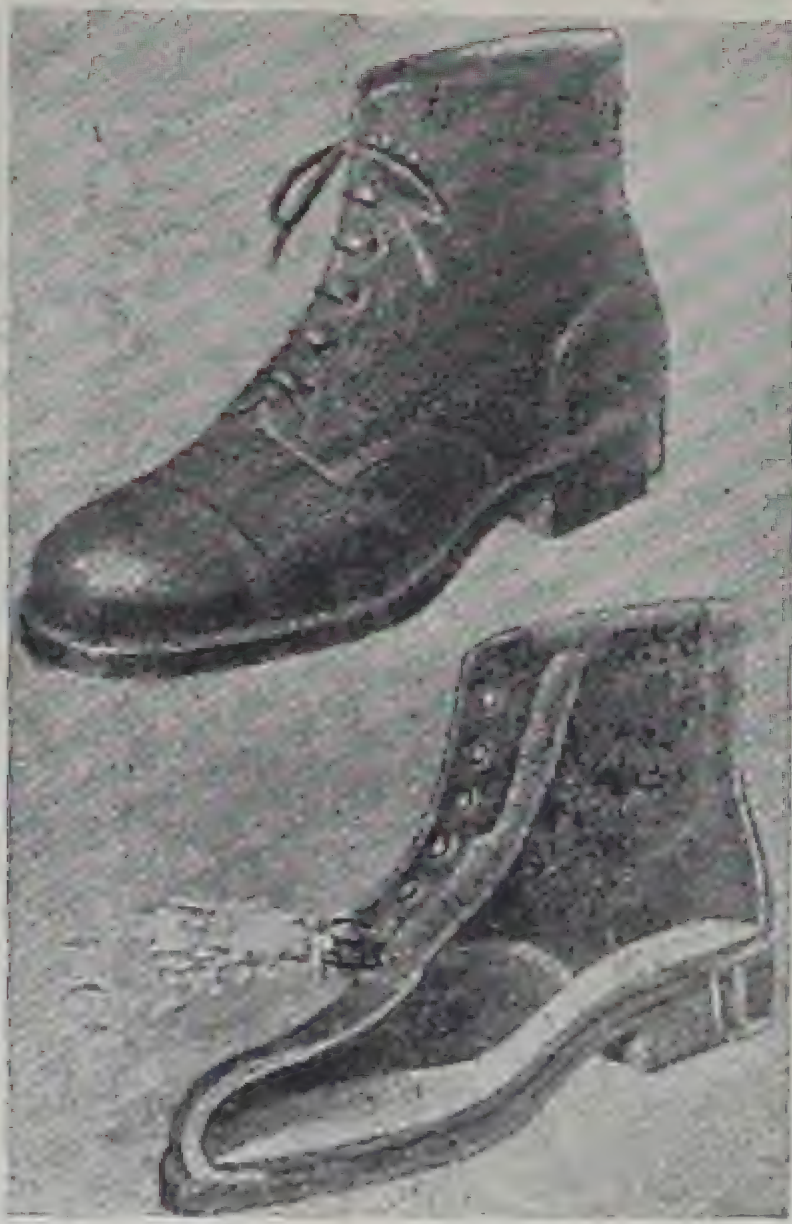
ٹخنوں سے اوپر تک کا فوجی جوتا جو برطانیہ میں پچیس سال کی تحقیقات کے بعد پہلے پہل ۱۹۱۴ء میں استعمال ہوا تھا۔

شاہی فضائی بیڑے مبں استعمال ہونے والا جوتا جسکے بالائی حصے کو ہواباز جب چاہے آسانی سے الگ کر سکتا ہے۔

کچھ اور نمونے جو خاص طور پر سمندر پار کی منڈیوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔

دنیا کا آٹھواں عجوبہ

چین میں بدھ تہذیب کے یوں تو بہت سے آثار موجود ہیں لیکن ین کانگ کے غار اپنی قدامت اور شان کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ غار بدھ راہب ‹ تان یاؤ › کے ایما پر بادشاہ ‹ون چینگ› کے عہد میں پتھر کی چٹانیں کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ ان سب میں قدیم چینی اور گپت عہد کی ہندوستانی نقاشی کے طرز ملے جلے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سنگ تراشی کے فن کے توازن، حسن کے تناسب اور روحانی جذبات کے اظہار کی بہترین مثالیں ہیں۔ (اوپر) ایک غار کی دیوار پر بدھ کی ایک ہزار مورتیں برابر بنی ہوئی ہیں۔ (دائیں طرف) سب سے بڑے غار میں داخل ہونے کا دروازہ (دوسرا صفحہ۔ اوپر) غار کا درمیانی حصہ۔ اسمیں پہنچنے کیلئے مندر کی بہت سی عمارتوں سے گذرنا پڑتا ہے (نیچے) گوتم بدھ کا ستر فٹ اونچا بت۔ یہ بھی چٹان کاٹ کر بنایا گیا ہے۔
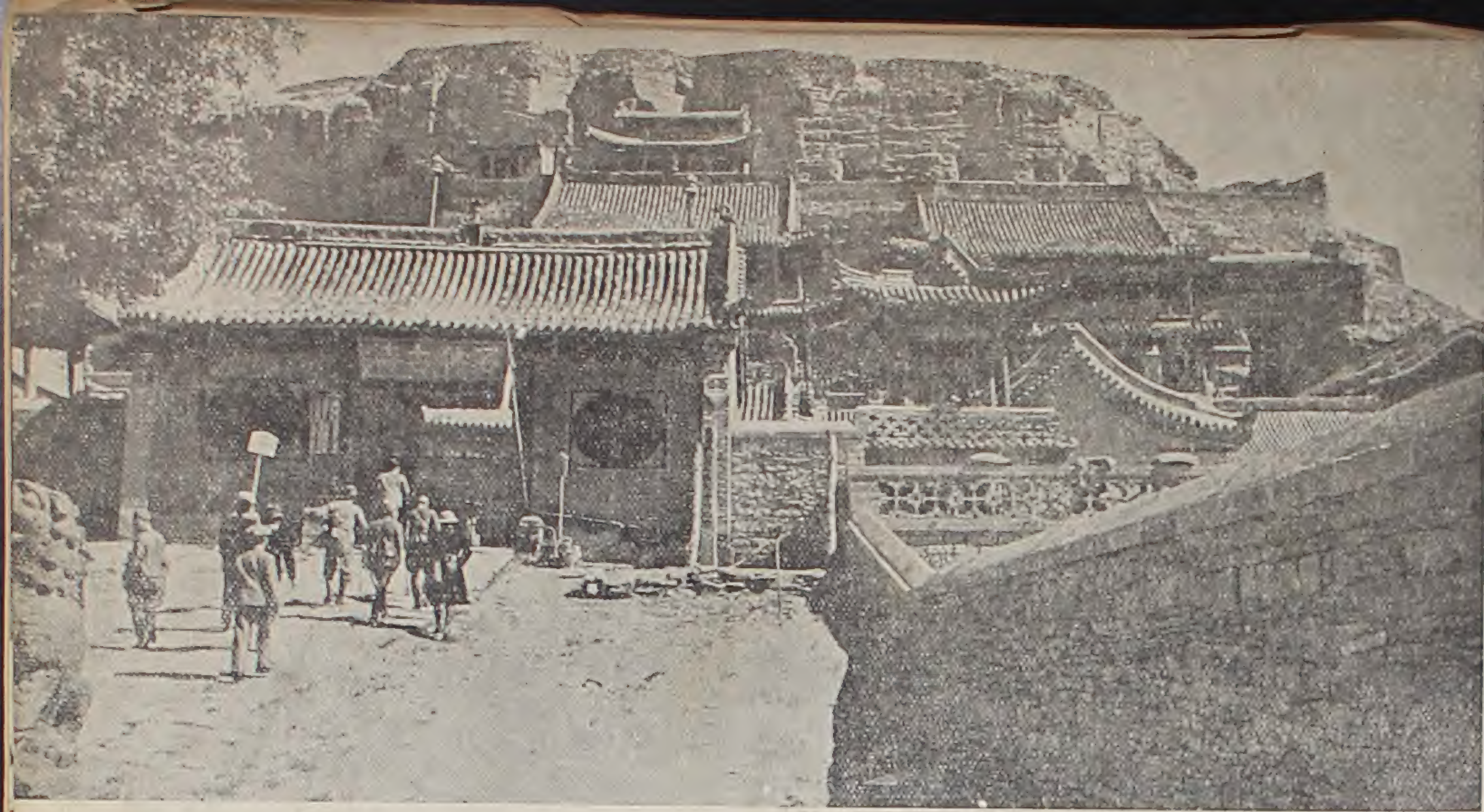
روسی بچوں کے لئے تربیت گاہ

س سال ہوئے گرجستان کے خوبصورت قصبے « کو تایس » میں
ں کی ایک تربیت‌گاہ قائم کی گئی تھی۔ وہاں تقریباً دوہزار
ں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اس وقت زیادہ بچے یتیم ہیں یا پھر
ہیں جو لڑائی کے باعث اپنے والدین سے جدا ہوگئے ہیں۔
ہر وقت خوش و خرم رکھنے اور اچھی تربیت دینے کیلئے ہر
ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

تربیت گاہ کی دو ہنس مکھ بچیاں جن کے والدین
لڑائی میں مارے گئے۔

نصاب تعلیم' میں نقاشی موسیقی اور رقص بھی شامل ہیں۔
دیکھئے کس شوق سے تصویر بنائی جارہی ہیں۔

دیہات کی کھلی ہوا میں بچے مل کر ٹہلنے جارہے ہیں۔

سینے پرونے اور کاڑھنے کے کاموں میں بھی لڑکیاں بڑی دلچسپی
سے حصہ لیتی ہیں۔

→

ایرانین ٹوبیکو موناپلی

«ایرانین ٹوبیکو مونا پلی» کی سرکاری عمارت کا صدر دروازہ۔

سترھویں صدی کے شروع میں تمباکو پہلے پہل
ہندوستان اور پرتگال سے ایران پہنچا۔ پھر اسکی کاشت
وہیں ہونے لگی۔ حتی کہ ۱۹۳۸ء میں ۲۵۲۰۳ ایکڑ
زمین سے ۳۲۷۱۷۳۶۰۳ پونڈ تمباکو پیدا ہوا۔ تمباکو
کی ساری تجارت پر حکومت کا قبضہ ہے۔ کوئی کاشتکا
اپنی فصل کی پیداوار اپنی مرضی سے نہیں بیچ سکتا
ہوایہ کہ ۱۸۹۱ء میں ایک انگریز میجر ٹالبوٹ نے پندر
ہزار پونڈ سالانہ اور آمدنی کے چوتھائی حصے کے عوض
تمام ایران میں تمباکو کی چیزیں بیچنے کی اجازت
مانگی۔ لیکن جب ملک والوں نے اس تجویز کی مخالفت
کی تو حکومت نے معاہدہ نہیں کیا اور ساتھ ہی فیصلہ کیا
کہ سرکاری طور پر تمباکو کی اجارہ داری قائم کرلی جائے۔

سگرٹ بنانے کی مشینیں۔ کمرہ خوب روشن ہے
اور گرد و غبار سے پاک ہے۔

پھر بھی دیر ہوتی رہی یہانتک کہ ۱۹۲۹ء میں قانون نافذ
ہوا اور ایرانین ٹوبیکو موناپلی بنالی گئی۔ اس کا صدر
دفتر طہران میں ہے اور شاخیں ان تمام حصوں میں پھیلی
ہوئی ہیں۔ جہاں تمباکو کی کاشت بکثرت ہوتی ہے۔
اسکا انتظام وزیر مالیات کے سپرد ہے ۱۸۴۳ء کے بجٹ
سے ظاہر ہے کہ حکومت کو اس تجارت میں ۲۶۷۲۳۵۹۴۰
ریال کا فائدہ ہوتا تھا۔

موناپلی کے دفتر کا اندرونی نظارہ۔ ←

With Best
Wishes
Mridula.

مری دولہ ۔ ایک فلمی ستارہ ۔

چینی دیومالا

فضل حق قریشی

روزِ ازل سے انسان کی زندگی اتنی مختصر رہی ہے کہ وہ اس محدود عرصۂ حیات میں اپنے گرد وپیش کی چیزوں کی اصلیت و نوعیت اور ان کے اسباب و علل پر خود غور وخوض اور اپنے پیش روؤں کے نتائج افکار سے استفادہ کرتے رہنے کے باوجود کسی اٹل اور انتقاعی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ یہ دنیا کیا ہے؟ کب بنی؟ کب آباد ہوئی؟ انسان کا وجود کس طرح عمل میں آیا؟ زمین وآسمان، مہر وماہ ستارے اور کہکشاں، برق و رعد اور باد وباراں، دریا، پہاڑ اور میدان، پھل پھول اور سبزہ زار، چرند پرند اور حیوان، یہ سب کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ ان اسرار ہائے سربستہ کی عقدہ کشائی بظاہر اس کے لئے ناممکن تھی۔ تاہم اس انانیت کے باعث جو فطرتاً اس کی طبیعت میں موجود ہے، اس نے اپنی لاعلمی یا کج فہمی کے سلسلے میں اعترافِ عجز کرنیکی بجائے خیالی اور فرضی تشریح و توجیہہ سے کام لیا اور اس شدومد کے ساتھ کہ بہت سی بے بنیاد باتیں بھی ٹھوس حقیقت کے روپ میں جلوہ دکھانے لگیں۔

یہ تسلیم کرنے کے بعد کہ چونکہ موجوداتِ عالم میں سے کسی کو تخلیق یا فنا کرنا یا ان پر کسی طرح سے قابو پانا انسان کے بس میں نہیں ہے، اسلئے لازمی طور پر یہ سب کرشمے اعلیٰ ہستیوں سے ممکن ہوئے ہونگے، جنکو اپنی دماغی کاوشوں سے کام لیکر خود اس نے تخلیق کیا اور انہیں اپنے سے زیادہ مرتبہ دیتے ہوئے ہر فرد کو ایک علیحدہ مظہرِ قدرت سے منسوب کر دیا۔ انہی دیوتاؤں اور دیویوں سے متعلق موضوع کا نام "دیومالا" ہے۔ یہ کسی ملک یا قوم سے مخصوص نہیں بلکہ ہر ملک میں ہر قوم نے اپنے اپنے ماحول کے مطابق، اس کی تشکیل کی اور ارتقا کی منزلیں طے کرا کے اسے پوری طرح عروج دیا۔

مختلف ملکوں کی دیومالائی کہانیوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یہ معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے کہ تضاد واختلاف کے ساتھ ساتھ بہت سی باتوں میں زبردست یکسانیت و مماثلت پائی جاتی ہے۔ اسے خیالات کا توارد کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی کہ اس قدیم ترین زمانے میں جب ذہن انسانی اسرارِ سربستہ کی من مانی توجیہہ کر رہا تھا ایک دوسرے سے سینکڑوں ہزاروں میل دور رہنے والی قوموں کے مابین کسی نہ کسی طرح ثقافتی تعلقات قائم تھے

یہ باتیں اس قدیم دور کے انسان کے لئے جبکہ غور وفکر کی راہیں اس کے لئے محدود تھیں اور مذہبی عقائد نے توہمات کے درجے سے آگے اپنا قدم نہیں بڑھایا تھا، نہ صرف دلچسپ بلکہ عمرانی زندگی کے نظم ونسق کے واسطے ضروری بھی تھیں لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی جبکہ سائنسی نظریات نے خوب فروغ پا کر حقائق کائنات کو بڑی حد تک صحیح رنگ میں پیش کر دیا ہے، قدیم مفروضات کو انہی راسخ عقیدوں کے ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس ضمن میں انسان ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹنے کی کوشش نہیں کرتا۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ حد درجہ ترقی پسند ہونے کے باوجود انسان ایمان وعقیدے کے لحاظ سے ہمیشہ قدامت پرست رہتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ علم الاصنام کو اس کی فرضی اور خیالی بنیادوں کے باعث دنیا کبھی ترک یا نظرانداز نہیں کر سکتی کیونکہ اس کے مطالعہ سے اجتماعی طور پر قوموں کی معاشرت وسیاست اور جذبات واحساسات کی نوعیت اور عام رجحانِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔

دوسرے ملکوں کی طرح اہلِ چین نے بھی تخلیق عالم سے لیکر خود اپنی پیدائش تک کی باتیں بے شمار من گھڑت قصوں کی صورت میں پیش کی ہیں۔ لیکن چونکہ اس ملک میں ایک کی بجائے تین مذاہب نے بیک وقت اپنا اپنا سکہ چلایا ہے اور دیومالائی کہانیاں ہمیشہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں اس لئے یہاں کے علم الاصنام کا مطالعہ کرتے وقت بڑی پیچیدگیوں کا سامنا ہوتا ہے بلکہ کبھی کبھی ربط وتسلسل ٹوٹ جانے کے باعث ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور مجبوراً ایک نئے سرے کو تھام کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔

عموماً چین کے اساتذہ اپنے شاگردوں کو صنمیات کا پہلا سبق اس طرح شروع کراتے ہیں:۔

"ابتدا میں صرف "عدم" کا دور دورہ تھا۔ ایک طویل زمانہ اسی صورت میں گذرتا چلا گیا۔ پھر وہ عدم ترقی کر کے "وجود" میں بدل گیا۔ اس "وجود" میں "وحدت" تھی۔ پھر ایک طویل زمانہ گذرتا چلا گیا یہانتک کہ وہ وحدتِ وجود دو حصوں میں منقسم ہو کر تذکیر و تانیث (یانگ اور ین) کی ہیئت میں جلوہ گر ہوئی۔ ان دونوں نے ملکر عملی قدم اٹھایا اور پہلی ذی حیات ہستی رونما ہوئی جسکا نام "پی آن کو" تھا"

چینی زبان میں پی آن کے معنے "انڈے کا چھلکا" اور کو کے معنے "ٹھوس" ہیں۔ چنانچہ ایک اور روایت یہ بھی ہے کہ پی آن کو ایک کائناتی انڈے میں سے پیدا ہوا تھا۔

پی آن کو کی تصویر ایک پستہ قد انسان کے روپ میں بنائی جاتی ہے۔ اس کا جسم ریچھ کی کھال، پتوں یا پتوں کے لباس سے ڈھکا ہوتا ہے۔ اس کے سر پر دو سینگ ہوتے ہیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ہتھوڑا اور بائیں میں چھینی ہوتی ہے۔ یہی دو ابتدائی اوزار ہیں جن کی مدد سے اس نے اپنا کارِ عظیم شروع کیا اور اٹھارہ ہزار سال تک اس میں منہمک رہا۔ اس اثنا میں اس نے چاند سورج، تارے اور زمین و آسمان بنا ڈالے۔ اسکا قد اس دوران میں چھ فٹ روزانہ کے حساب سے برابر بڑھتا رہا۔ اپنا کام ختم کر لینے کے بعد وہ مر گیا تاکہ اس کی اختراعات زندہ رہیں۔

اس کی لاش عرصے تک بے گور و کفن پڑی رہی۔ پھر اس کے سر سے پہاڑ، سانس سے ہوا اور بادل، آواز سے کڑک اور گرج، ہاتھ پاؤں سے زمین کے چاروں کھونٹ، خون سے دریا اور سمندر، گوشت سے مٹی، ڈاڑھی سے ستاروں کے جھرمٹ، کھال اور بالوں سے درخت، جھاڑیاں اور پودے، دانتوں ہڈیوں اور نلیوں کے گودے سے دھاتیں، چٹانیں اور قیمتی پتھر، پسینے سے بارش اور شبنم اور آخر میں ان کیڑوں سے جو اس کے سڑے ہوئے جسم پر رینگنے لگے تھے، حضرت انسان کی تخلیق ہوئی جسے اس غلیظ و ناپاک ابتدا کے باوجود اشرف المخلوقات کہا گیا۔

پی آن کو اور اس کی ان کاوشوں کا حال تاؤ مت کے عقیدے کے مطابق ہے کنفوشیس مت اور بدھ مت کی رو سے بیانات میں کسی قدر اختلاف ہے لیکن کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پی آن کو نے زمین و آسمان کو تو اپنی اپنی جگہ قائم کر دیا لیکن چاند اور سورج میں نظم و نسق پیدا کرنا بھول گیا۔ اس لئے یہ دونوں روشن اجسام ایک سمندر کی تہ میں جا پڑے اور اس طرح ساری دنیا میں شدید تاریکی پھیل گئی۔

ایسی صورت میں عالم سفلی کے ایک شہنشاہ نے ایک افسر اعلیٰ —"وقت"— کو حکم دیا کہ ان دونوں کو سر دربار پیش کیا جائے مگر ان دونوں نے صاف انکار کر دیا، اور بدستور سمندر میں پڑے رہے۔ آخرکار "وقت" نے شہنشاہ کی اجازت سے پی آن کو کی روح کو بلایا اور سب حال سنا کر اس سے مدد مانگی۔ پی آن کو کی روح نے بائیں ہتھیلی پر سورج اور دائیں ہتھیلی پر چاند کے نشانات بنائے اور سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کو پھیلایا اور سات بار ایک منتر پڑھا۔ اس کے اثر سے چاند اور سورج باہر نکل کر اسکی مٹھیوں میں آ گئے اور پھر آسمان پر چمکنے لگے۔ تاہم "وقت" سے انتقام لینے کی خاطر انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں بیک وقت کبھی نہیں چمکیں گے۔ اس طرح وقت کے دو حصوں رات اور دن میں ہمیشہ کیلئے جدائی ہو گئی۔

سورج دیوتا کو ایک دائرے کے اندر بیٹھے ہوئے پہاڑی کوے کی صورت میں دکھایا جاتا ہے اور چاند دیوی ایسے خرگوش سے مشابہ بنائی جاتی ہے جو اپنی پچھلی دو ٹانگوں کے ذریعہ چاولوں کو روند رہا ہو۔ ان دونوں کی پوجا سرکاری اور نجی طور پر سارے ملک میں ہوتی ہے۔ سال کے آٹھویں مہینے میں جب فصل تیار ہوتی ہے، چودھویں کے چاند کی پرستش شروع ہوتی ہے۔ اس روز چاند سے مشابہ گیہوں اور چاول کی ٹکیاں بازاروں میں بکتی ہیں اور انہیں مقدس اور بھاگوان سمجھتے ہوئے ہر شخص خرید کر کھاتا ہے۔

ستاروں میں سے قطبی ستارے کی دیوی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے کیونکہ چینیوں کے خیال کے مطابق آسمان کے تمام ستارے قطبی ستارے کے گرد گھومتے ہیں۔ اس دیوی کا نام طؤ مو ہے۔ یہ تصویر میں بودھی "راج پہنے، کنول کے تخت پر جو ایک آسمانی گاڑی کے اوپر رکھا ہوتا ہے، بیٹھی دکھائی جاتی ہے۔ اس کی تین آنکھیں اور اٹھارہ بازو ہوتے ہیں۔ اس کے ہر ہاتھ میں ایک قیمتی یا مفید چیز

غزل

اقبال فاروقی

وہ جلوۂ بے حجاب چمکا، وہ ان کے رخ سے نقاب سرکی
وہ شام غم کا نظام بدلا، جھلک وہ ظاہر ہوئی سحر کی
ہزار پست و بلند آئے، ہزار دشت و چمن سے گزرا!
ازل سے ابتک رواں دواں ہوں نہیں کوئی حد مری سفر کی
نہ آسماں کی طلب ہے مجھکو، نہ کچھ زمیں سے ہی واسطہ ہے
کسی کے جلوؤں میں محو ہوں میں، خبر نہیں کچھ ادھر ادھر کی
الٰہی، یہ ذوقِ عشق مجھکو کہاں یہ لایا ہے بیخودی میں!
اثر کو ہے آرزو دعا کی، دعا کو ہے جستجو اثر کی
روش روش پر سنور رہا ہوں، قدم قدم پہ بکھر رہا ہوں
خودی سے گویا گزر رہا ہوں، تلاش ہے ان کی رہگزر کی
کیا ہے اقبالؔ آج میں نے خوشی سے نذرِ جمال دل کو
جواں کے قدموں پہ لا کے رکھدی ہے کمائی ہے عمر بھر کی

ہوتی ہے تیر کمان برچھی، تلوار، پرچم، اژدہے کا سر، پگوڈا، سورج اور چاند کی ٹکیاں وغیرہ۔ اسے زندگی اور موت کے نوشتوں پر اقتدار حاصل ہے۔ لوگ اپنی عمریں بڑھانے کے لئے اس کی پرستش کرتے ہیں۔ اس کے پجاری ہر مہینے کی تیسری اور ستائیسویں تاریخ کو گوشت کھانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ اس کے دو بیٹے ہیں جو شمالی اور جنوبی "بشل" کہلاتے ہیں اول الذکر سفید لباس پہنتا، موت پر حکومت کرتا ہے۔ آخر الذکر سرخ لباس پہنتا اور زندگی پر حکومت کرتا ہے۔

قطبی ستارے کے علاوہ اور بہت سے ستاروں کے بھی دیوتا اور دیویاں ہیں جن کی تعداد کم و بیش ڈیڑھ سو ہے۔ ان کی شکلیں عجیب و غریب بنائی جاتی ہیں ان میں سے اہم کا تعلق منگنی بیاہ، طوفان باد و باراں، جنگ اور وبائی بیماریوں سے ہے۔ ان میں سے بعض کی حکومت فرشتوں یا شیطانوں پر ہوتی ہے۔ لوگ انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ستارۂ صبح کی پوجا ایک خاص مقررہ وقت پر نہ کرے تو اس سال کے دوران میں اس کے باپ یا اس کی ماں کی موت یقینی سمجھی جاتی ہے۔

ستاروں کے ضمن میں ایک کہانی اکوتیلا اور ویگا کی سب سے زیادہ دلچسپ ہے۔ اکوتیلا چرواہا تھا اور ویگا جلاہے کی لڑکی۔ یہ لڑکی رات دن چرخہ کاتنے میں اسقدر مصروف رہتی تھی کہ اس کا باپ اس غیر ضروری انہماک سے تنگ آگیا اور آخر اس عادت میں تبدیلی پیدا کرنے کی خاطر اس نے بیٹی کی شادی اپنے ایک پڑوسی سے کر دی جو آسمان کے نقرئی دریا (کہکشاں) کے دوسرے ساحل پر مویشی چرایا کرتا تھا۔ شادی ہوتے ہی لڑکی کے طور طریق حد سے زیادہ بگڑ گئے۔ اس نے چرخے اور تکلے کو بالائے طاق رکھا اور دن رات کھیل کود اور خوش گپیوں میں مشغول رہنے لگی۔ سورج دیوتا کو یہ بات ناگوار گذری اور اس نے محب و محبوب میں جدائی کا فیصلہ کیا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ وہ دریا کے ایک ایک ساحل پر الگ الگ رہا کریں اور صرف ساتویں مہینے کی ساتویں شب کو ایک دوسرے سے ملا کریں۔ دریائے فلک کو عبور کرنے کے سلسلے میں اس نے کئی لاکھ راج ہنسوں کو حکم دیا کہ وہ وقت مقررہ پر پانی کی سطح پر لگاتار اڑ کر ایک پل کی صورت اختیار کر لیا کریں تاکہ دونوں عاشق و معشوق اسے طے کر کے آپس میں مل لیا کریں۔ لیکن ساتویں مہینے میں دریا بالکل لبریز ہوتا ہے اور تھوڑی بہت بارش بھی اس میں طوفان پیدا کر دیتی ہے جس کے باعث راج ہنسوں کا پل نہیں بن سکتا اور اس سال ان دونوں کے لئے وصل کی رات بھی شب فراق ہی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اہل چین ساتویں مہینے کے شروع ہی سے دعائیں مانگتے، چڑھاوے چڑھاتے اور قربانیاں پیش کرتے ہیں کہ ساتویں تاریخ کو مطلع صاف رہے اور بارش نہ ہو۔ اس رسم میں عورتیں خصوصاً نوجوان لڑکیاں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیتی ہیں۔ عقیدہ یہ ہے کہ اس سے ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار حالت میں بسر ہوتی ہے۔

یہ کہانی بجنسہٖ جاپانی دیومالا میں بھی شامل ہے۔

چند روایات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ بعض دیوتا ایسے بھی ہیں جو اپنی ابتدائی زندگی میں انسان تھے اور اسی دنیا میں رہتے تھے۔ کسی معجزے یا حادثے کے ماتحت یا کسی کی دعاؤں کے زیر اثر ان کی ہیئت تبدیل ہو گئی اور انہوں نے غیر فانی بنکر آسمان پر رہنا شروع کر دیا تاہم دنیا والوں سے ان کا اچھا یا برا تعلق ضرور رہا۔ وہ اہل زمین پر نظر عنایت رکھتے یا بصورت دیگر انہیں ستاتے اور ان سے جنگ آزمائی کرتے رہے۔

اس ضمن میں ہوا کا دیوتا فینگ پو ہے۔ سفید ڈاڑھی مونچھ والا یہ بوڑھا آدمی زرد لبادہ پہنتا، اور نیلی اور سرخ ٹوپی اوڑھتا ہے۔ اسکی عادت ہے کہ ایک بہت بڑا تھیلا تان کر چلتی ہوا کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور اس کی سمت بدل دیتا ہے۔ یہ دیوتا برج اسد کے ماتحت ہے کیونکہ جب چاند اس منزل سے باہر نکلتا ہے تو تیز ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ ابتدا میں فینگ پو ارضی حکومت کے سب سے بڑے باغی اور سرکش سردار جیہہ یو کا حامی تھا لیکن جب ہوانگ تی نے اسے شکست دیدی تو فینگ پو اپنی ہیئت بدل کر دیو بن گیا۔ اس نے آسمان پر پہنچ کر جنوبی علاقوں کی ہوا کو تیزی سے جنبش دی اور دنیا میں ایک طوفان باد برپا کر دیا۔ تب شہنشاہ یاؤ نے تین سو سپاہی کے لشکر کے ساتھ شین آئی کو بھیجا کہ کسی طرح اس مصیبت کو ختم کرے اور ساتھ ہی جیہہ یو کے رشتہ داروں کو جنہوں نے شورش مچا رکھی تھی، خاموش کر کے امن اور شانتی کی ترغیب دے۔ شین آئی نے اپنے سپاہیوں سے کہا کہ ایک بڑی چادر کھلے میدان میں اس طرح تان دو کہ نیچے کے سرے پتھروں کے ساتھ بندھے رہیں۔ اس ترکیب سے ہوا کا رخ بدلا اور وہ اس پر سوار ہو کر ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ وہاں سے اس نے دیکھا کہ دیو ایک چٹان پر کھڑا بہت زور سے سانس لے رہا ہے اور اسی لئے ہوا میں تموجات پیدا ہو رہے ہیں۔ شین آئی نے فوراً تیر مارا جو دیو کے گھٹنے میں لگا اور اس نے مجبور ہو کر اپنا سانس روک لیا جس کے ساتھ ہی موسم کی کیفیت بدل گئی۔

ہوئی لو یعنی آگ کا دیوتا عوام میں زیادہ مقبول ہے۔ شروع میں یہ زبردست جادوگر تھا۔ یہ شہنشاہ یاؤ کے باپ شہنشاہ تی کو

(۲۴۳۶ تا ۲۳۶۶ ق۔م) کے عہدِ حکومت میں رہتا تھا۔ اس کے پاس پی فانگ نامی عجیب وغریب پرندہ کے علاوہ ایک سو کے قریب آگ پھیلانے والے دوسرے پرندے موجود تھے۔ جب وہ انہیں دڑبے سے نکال کر ہوا میں اڑاتا تو ساری دنیا میں آگ سی برسنے لگتی۔ ہوانگ تی نے چو جنگ کو حکم دیا کہ ہوئی لو سے لڑے اور کسی طرح اس پر قبضہ پالے۔ چو جنگ کے پاس خالص سونے کا ایک بڑا بازو بند تھا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے بازو بند کو گھما کر اس طرح پھینکا کہ ہوئی لو کی گردن اس میں پھنس گئی اور وہ بے بس ہو گیا۔ آخر ہار مان کر اس نے اپنی ہیئت تبدیل کی اور ارضی قیام کو ترک کر کے آسمانوں پر رہنے لگا۔

آگ کے دیوتا کے ساتھ ہی باورچی خانے کے دیوتا کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ تساؤ چن دراصل تاؤ مت کی تخلیق ہے اور چین کے ہر گھرانے میں ہر ماہ میں دو بار پہلی اور پندرہویں تاریخ کو اس کی پوجا ہوتی ہے۔ اس کا سنگھاسن باورچی خانے ہی کے کسی طاق میں بنایا جاتا ہے۔ اس کے محل کی سب سے بڑی آرائش یہ ہے کہ اسے ہمیشہ دھوئیں سے کالا رکھا جائے۔ عوام کا عقیدہ ہے کہ اگر اس دیوتا کی نظر عنایت ہو تو انسان بغیر کھائے پیئے بہت دن تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اسے خوش رکھنے کے لئے مورتی پر شہد کا چڑھاوا چڑھایا جاتا ہے۔

رحم وکرم کی دیوی کنوان ین کہلاتی ہے، اور اسے بدھ مت کے ماننے والے چینی وہی رتبہ دیتے ہیں جو عیسائیوں میں حضرت مریم کو حاصل ہے۔ اسے کنوان ین اسلئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کی آہ وفریاد سن لیتی اور ان پر نظر عنایت رکھتے ہوئے ان کی مراد پوری کر دیتی ہے۔ یہ مفہوم ان دو لفظوں میں مضمر ہے۔ وہ بے اولادوں کو اولاد، بیماروں کو شفا، مفلسو کو روزگار اور مصیبت زدگان کو نجات دیتی ہے۔ ایک لحاظ سے اس کا مرتبہ گوتم بدھ سے بھی زیادہ ہے چنانچہ اس کو ماننے والے کہتے ہیں کہ باٹھ لاکھ بار بدھ کا نام لینا اور کنوان ین کا نام صرف ایک بار لینا برابر ہے۔ اس دیوی کو نسوانی حسن وجمال کا اعلیٰ ترین نمونہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ ایک نوجوان لڑکی کے لئے سب سے بڑا افتخار یہ ہے کہ اسے کنوان ین کے پاؤں کی خاک سے تشبیہ دیدی جائے۔

چینی دیومالا میں اور بھی بہت سی کہانیاں شامل ہیں لیکن ان کو صنمیاتی سے زیادہ روایتی حیثیت حاصل ہے۔ نیز طوالت کا خوف بھی دامن گیر ہے۔ اس لئے ان کو پھر کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی رکھا جاتا ہے۔

آسان اُردو:

بقیہ صفحہ ۱۴

وہ دیکھیں کہ ہمارے مدارس میں کوئی کتاب اس زبان کی نہ پڑھائی جائے۔ ہائی کورٹ کو بھی توجہ دلائی کہ وہ اس زبان کے لفظ استعمال نہ کریں۔

میں اس موقع پر اس جاہلانہ اور تعصب آمیز تحریر کی تنقید کی ضرورت نہیں سمجھتا لیکن یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس وقت سے جو اردو کی مخالفت شروع ہوئی تو آج تک اس سے پیچھا نہیں چھوٹا۔ یہ یادداشت ہمارے لئے بہت سبق آموز ہے اگر ہمیں اپنی زبان عزیز ہے تو ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی تحریروں اور کتابوں میں خاص کر ان تحریروں اور کتابوں میں جو عام لوگوں کے لئے شائع کی جاتی ہیں غیر ضروری مشکل اور مغلق الفاظ اور ترکیبوں سے پرہیز کریں اور جہاں تک ہو سکے سادہ اور آسان زبان لکھیں اس سے ایک تو علم کی عام اشاعت ہوگی، دوسرے ہماری زبان کی اشاعت اور مقبولیت دور دور تک ہو جائے گی۔ جس کا کلام جس قدر سادہ الفاظ میں ہوگا اسی قدر وہ زیادہ انسانوں تک پہنچے گا۔

من کہ گویم کہ این مکن آں مکن
مصلحت بیں وکار آساں کن

("نوا" سے شکریہ کے ساتھ)

افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات

بقیہ صفحہ ۱۸

عیسوی کے نصف اول تک جاری رہی۔ چینی سیاح ہوانگ سانگ کی سیاحت کے وقت تک بلخ "راجگڈھ" یعنی "شاہی شہر" کے نام سے موسوم تھا اور "نوا دیہارا" کو پورا عروج حاصل تھا۔ چنانچہ اس مذہبی ادارے کے مشہور پروہت پراجن کار نے چینی معلم نوانین کا سواگت کیا تھا بدھ مت کا پرچار بڑی تیزی کے ساتھ آدھے ملک میں ہونے لگا اور اس کا اثر بلخ سے ہوتا ہوا قندھار اٹک چلا گیا۔ قدرتی طور پر اس کے ساتھ ساتھ سنسکرت زبان افغانستان میں واپس آگئی چنانچہ اس مسودے سے جو ۱۹۳۱ء میں پروفیسر ہیکین نے بامیان سے دستیاب کیا اور جس کا کچھ حصہ ۱۹۳۲ء کے "جرنل ایشیاٹک" میں سلوین لیوی نے شائع کیا افغانستان میں سنسکرت کے وجود کا پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اس ملک کے پروہتوں اور مصنفوں نے نویں صدی کے شروع تک اسے مختلف قسم کے رسم الخط میں لکھا۔ (باقی آئندہ)

مضمون نگار حضرات مضمون خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھ کر بھیجیں

”ہجومِ تجلّی سے معمور ہو کر“ (۱)

جگر کی شاعری کا روشن ترین پہلو

جناب جگر مرادآبادی عصرِ حاضر کے اُن مایۂ ناز شعراء میں سے ہیں جن کا نامِ نامی محتاجِ تعارف نہیں۔ موجودہ غزل گوئی میں حضرت جگر ایک طرزِ خاص کے مالک ہیں۔ زبان اُردو کی تاریخ اور اس کی نشو ونما پر ایک غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان اپنی موجودہ ترقی اور ہمہ گیر پسندیدگی کے لئے ہمارے شعراء ہی کی ممنونِ احسان ہے۔ مختلف شعراء نے مختلف اصنافِ شاعری کو اپنے ”اشہبِ قلم“ کی جولان گاہ بنایا اور مختلف عنوان کے تحت خامہ فرسائی کی۔

اردو شاعری میں غزل ہی سب سے زیادہ مقبولِ عام صنف ہے جس کا اصولی حیثیت سے تمام تر دار و مدار حسن و عشق کی سچی داستان اور فراق و وصال کی اصلی واردات پر ہے لیکن ہمارے شعراء نے غزل کو صرف یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں فلسفۂ تصوف اور اخلاقی مضامین کو بھی نمایاں جگہ دی اور غالبؔ مرحوم کی طرح یہ کہہ کر کہ ؎

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے ؟ !
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے !

کائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ دورِ حاضر کا یہ مایۂ ناز شاعر (جگر) بھی ”فکر فرماتے وقت“[1] ”ذرّے ذرّے میں سما جانا“ چاہتا ہے بالکل اسی طرح جیسے ایک صوفی عزلت نشین مراقبے کے ذریعے اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر کسی ”بحرِ ناپیدا کنار“ سے ہم آغوش ہونا چاہتا ہوا ور اسی میں اپنی نجات دیکھتا ہو ؎

ترے جلووں میں گم ہو کر خودی سے بے خبر ہو کر
تمنّا ہے کہ رہ جاؤں میں سر تا پا نظر ہو کر

اردو شاعری میں تصوف کی ابتدا خواجہ میر دردؔ سے ہوئی اور واقعہ یہ ہے کہ دورِ متقدمین میں دردؔ سے بہتر تصوف میں کسی نے خامہ فرسائی نہیں کی۔ دردؔ کو تصوف ورثہ میں ملا تھا۔ اور اسی لئے ان کے کلام میں عشقِ حقیقی جلوہ گر ہے، وہ کائنات کے ذرّے ذرّے میں ”حسنِ حقیقی“ کی جھلک دیکھتے ہیں ؎

بے گانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

خواجہ میر دردؔ اُردو کے ارکانِ ثلاثہ میں سے ہیں، ان کی زبان اُس دور کی زبان ہے جو اُردو کی پرورش یا بچپن کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کا طرزِ بیان نہایت سلیس اور شیریں ہے۔ اور سوز و گداز و چستی بندش میں بھی خواجہ صاحب اپنے معاصرین میں سے کسی سے پیچھے نہیں رہے ؎

شیخ کعبہ ہو کے پہونچا ہم کنشتِ دل میں ہو
دردؔ منزل ایک تھی ٹک راہ ہی کا پھیر تھا

کرتی ہے بوئے گل تو مرے ساتھ اختلاط ! پر آہ ! میں تو موجِ نسیم وزیدہ ہوں !

موجودہ شعراء میں جہاں تک تصوف کا تعلق ہے، جگرؔ کا کلام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ جگر کے یہاں تصوف تغزل سے کہیں زیادہ نمایاں اور بلند ہے اور بعض اشعار میں تو تصوف اور تغزل اس لطافت کے ساتھ ایک دوسرے سے توام نظر آتے ہیں کہ ذوقِ سلیم بغیر وجد کئے نہیں رہ سکتا۔ جگر نے بھی خواجہ میر دردؔ کی طرح ہر ”بیگانے“ میں کسی ”جانے پہچانے ہوئے“ کی جھلک دیکھی ہے ؎

تری صورت کا مظہر ہیں تر اہر یہ نورِ نگیں تجھی کو دیکھتے ہیں تیری محفل دیکھنے والے
محبت اصلِ حقیقت محبت اصلِ مجاز وہ کم نظر تھے جو بیگانۂ مجاز رہے
اک حسن کا دریا ہے اک نور کا طوفاں ہے ! اس پیکرِ خاکی میں یہ کون خراماں ہے ؟ !

آخری شعر میں استفہام کتنا لطیف ہے اور ”تجاہل“ کس قدر دلچسپ ! اس سلسلہ میں یہ کہنا بھی بعید از واقعہ نہیں کہ دردؔ کی طرح جگر نے بھی تصوف ورثہ میں پایا ہے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رح (مصنف عوارف المعارف) سے ملتا ہے اور وہ ایک نہایت برگزیدہ ہستی حضرت شاہ سید عبدالغنی منگلوری سے بیعت بھی ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ؎

یہ شانِ عبودیت ہے میری خود ذات مری صفت ہے میری
خاکِ درِ دولتِ غنی ہوں پابندِ شریعتِ نبی ہوں

جو حضرات جگر کی ظاہری رندی و سرمستی کے شاہد ہیں وہ ممکن ہے اس کو مبالغے پر محمول فرمائیں لیکن سچ یہ ہے کہ محض صوری مشاہدہ کسی شخص کی نیکی یا بدی کے متعلق کسی یقینی نتیجے کا حامل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہ ”ایک ساقیٔ بے نام“[2] کا یہ ”رندِ لم یزل“ شاعر جس کی نگاہ میں اس عالمِ رنگ و بو کی

---

[1] شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرّے ذرّے میں سما جاتا ہوں میں

[2] میں ہوں رندِ لم یزل اک ساقیٔ بے نام کا
شش جہت میرے لئے ٹوٹا سا اک پیمانہ ہے
(جگر)

اکبر فاروقی مرادآبادی

وقعت ایک "ٹوٹے ہوئے پیمانے" سے زیادہ نہیں، اپنی رندی و سرمستی کے متعلق کیا کہتا ہے؟ سنئے ؎

جانتا ہوں کہ ہوں دراصل میں ننگِ اسلاف   کچھ نہ اندیشۂ آغاز نہ فکر انجام
میری آشفتہ مزاجی میں نہیں کوئی کلام   وہی میخانہ و ساقی وہی شیشہ وہی جام

مجھ کو اپنی روشِ خاص سے انکار نہیں
میرے مشرب میں ریاکاری و پندار نہیں

باہمہ رندی و سرمستی و عشرت طلبی   ہوں در احمد مرسلؐ کا غلام نسبی
مرحبا سید مکی مدنی العربیؐ   دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

کیوں نہ پھر رحمتِ باری کا طلبگار رہوں میں
ہاں مجھے فخر ہے اس پر کہ گنہگار ہوں میں

کیا یہ ممکن نہیں کہ جگر کی یہ روش خاص "بے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" کی مصداق ہو؟ بہر حال اشعار ذیل سے تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے ؎

رند جو مجھکو سمجھتے ہیں انہیں ہوش نہیں   میکدہ ساز ہوں میں میکدہ بر دوش نہیں
پاؤں اٹھ سکتے نہیں منزلِ جاناں کے خلاف   اور اگر ہوش کی پوچھو تو مجھے ہوش نہیں
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف!   میں انتہائے شوق میں گھبرا کے پی گیا
پیتا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال؟!   در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا
سرمستئ ازل مجھے جب یاد آ گئی   دنیائے اعتبار کو ٹھکرا کے پی گیا

جگر کا عقیدہ ہے کہ اس عالم میں ہر شخص اپنا ایک خاص فن لے کر آیا ہے اور اس کا ہر فعل تقدیر الٰہی کا تابع ہے لیکن جگر کو میر درد کے اس مقولے سے اختلاف ہے کہ ؎

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے   جس لئے آئے تھے ہم سو کر چلے

جگر کے نزدیک ؎

مستِ جامِ شراب ہونا تھا   بے خودِ اضطراب ہونا تھا
تیری آنکھوں کا کچھ قصور نہیں   ہاں مجھی کو خراب ہونا تھا

وہ رحمت باری سے کبھی مایوس نہیں ہوتا، اس کے کانوں میں "لاتقنطو" کا مژدۂ جاں بخش ہر وقت گونجتا رہتا ہے۔ جب کبھی وہ اپنے گناہوں پر نظر ڈالتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے کہ ؎

تو بہ بخشش عصیاں سے شرمسار نہ کر   گناہ گار کو یارب گناہ گار نہ کر

عفو کیسا جلوہ رحمت بھی نکلے گا یہیں
ذوق عصیاں چاہیے عرفان عصیاں چاہیے

سر محشر ہم ایسے عاصیوں کا اور کیا ہوگا؟   در جنت نہ وا ہوگا در رحمت تو وا ہوگا
یہ نسبت عشق کی بے رنگ لائے رہ نہیں سکتی   جو محبوب خدا کا ہے وہ محبوب خدا ہوگا

نفس مضمون کا جہاں تک تعلق ہے جگر نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے بلکہ وہ انھیں اصول کا اعادہ کرتا ہے جن کی تعلیم خواجہ حافظ شیرازیؒ اور مولانا جامیؒ جیسی مقتدر ہستیوں نے دی۔ فارسی شعرا میں حافظؒ نے جو رتبہ پایا وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن حافظؒ خود مقر ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ ان کی "من گھڑت" نہیں بلکہ ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استادِ ازل گفت ہماں میگویم

اسی پیر طریقت کی پیروی کرتے ہوئے جگر بھی کہتا ہے ؎

سنائے تھے لب نے کسی نے جو نغمے   لب جگر سے مکرر سنائے جاتے ہیں
مری طلب بھی اسی کے کرم کا صدقہ ہے   قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

تصوف کیا ہے؟ یہ ایک دقیق سوال ہے۔ تاہم، تصوف کا ماخذ اوّلاً "عشق حقیقی" کے ذریعہ صفائی قلب حاصل کرنا اور دوئم "حسن حقیقی" کی تلاش میں اپنی ذات کو اس درجہ فنا کرنا کہ من و تو کا امتیاز باقی نہ رہے جیسا کہ امام الشعرا حضرت امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

جگر کی بھی یہی تمنا ہے ؎

یہاں تک جذب کر لوں کاش تیرے حسن کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں نکل جاؤں جدھر ہو کر

صوفیہ کرام کے نزدیک تخلیق عالم کی بنیاد ہی "عشق حقیقی" پر ہے۔ خلاق عالم کو چونکہ اپنے حسن کا مظاہرہ مقصود تھا اس لئے مختلف شکل و صورت میں اس کے شاہد پیدا کئے ؎

حدیثِ حسن و مشتاقی درون پردہ پنہاں بود
برآمد شوق از خلوت نہاد ایں راز بر صحرا
زخط و خال مشکینش تمنا شکلے نمود اوّل
قلم برداشت ہر ذرہ ورق برگشت ہر انشا (نظیری)

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ جب "حسن حقیقی" نے آئینۂ وحدت میں اپنی صورت دیکھی! ادر چاہا کہ اس کے دیکھنے والے پیدا ہوں (جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے کُنْتُ کَنْزًا مَخْفِیًا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِاُعْرَفَ) چنانچہ "عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود" کا مصداق ہو کر یہ عالمِ خاکی وجود میں آیا ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں   (غالب) ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

جگر کہتا ہے ؎

اگر شامل نہ در پردہ کسی کی آرزو ہوتی   تو پھر اے زندگی ظالم نہ میں ہوتا نہ تو ہوتی

بہرحال جب لفظ "کن" سے "فیکون" کا ظہور ہوا تو خلقت اس نور مجرد سے اس درجہ مسحور ہوئی کہ "اَلَستُ بِرَبِّکُم" کے جواب میں سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کچھ نہ بن پڑا ؎

عشق کو بے نقاب ہونا تھا　　آپ اپنا جواب ہونا تھا (جگر)

عشق کیا ہے؟ اس کا جواب مختلف شعراء نے مختلف پیرایہ میں دیا ہے، جگر کے خیال میں ؎

شوق بے پایاں و جوشِ بے حساب　　عشق کیا ہے اک مسلسل اضطراب
عشق کیا ہے؟ پرتوِ حسنِ تمام　　شوق کیا ہے حسن کا عکس شباب
زندگی کیا ہے؟ نمودِ عاشقی　　عشق کیا ہے؟ حسن کا آغاز ہے

لیکن سچ تو یہ ہے کہ "عشق" کی جامع تعریف کرنے سے زبان قاصر ہے ؎

لفظ و معنی میں نہیں جلوۂ صورت نہیں　　عشق اک چیز ہے جو حرف و حکایت میں نہیں

حقیقی عشق کی تعریف اس طرح بھی کی جاتی ہے کہ "العشق نارٌ تحرق ماسواء المحبوب" یعنی عشق وہ آگ ہے جو سوائے محبوب کے ہر شے کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ شاید اسی لئے جگر نے کہا ہے ؎

ترے سوا تری محفل سے کیا غرض مجھکو　　خروشِ نغمہ رہے یا سکوتِ ساز رہے

ایک اور شعر سنئے ؎

اسے حال و قال سے واسطہ نہ غرض مقام و قیام سے
جسے کوئی نسبت خاص ہو ترے حسن برق خرام سے

راہ عشق کی دشواریوں سے کچھ وہی لوگ واقف ہیں جنہوں نے کبھی اس وادیٔ پرخار میں مجنوں وار قدم رکھا ہے۔ ہر کس و ناکس اس راہ میں قدم رکھنے کی جرأت بھی نہیں رکھتا کیونکہ ؎

شرط اوّل قدم این ست کہ مجنوں باشی

اور بقول داغ ؎ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔

لیکن دو چار مقام تو چند قدم چلنے کے بعد آتے ہیں، یہاں تو راہرو آغاز راہ سے ہی متحیر ہو جاتا ہے ؎

شروعِ راہ محبت ارے معاذاللہ　　یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

اس راہ پر تو وہی قدم رکھ سکتا ہے جو جستجوئے یار میں محو و سرشار ہو کر اس وادی کو سیرگاہ سمجھے ؎

سیرگاہ عشق میں کانٹے ہی کانٹے ہوں تو ہوں
دیکھنے والی نظر گلشن بداماں چاہیئے

کیوں؟ اس لئے کہ کوئے یار تک پہونچنا مقصود ہے! اور رانہنائے شوق ہی جستجوئے یار میں رہنمائی کر سکتا ہے! آیئے دیکھیں کہ جگر... مست و سرشار جگر اس وادی میں کس طرح گامزن ہوتا ہے ؎

جام در دست و صراحی در بغل　　باچہ ساز و باچہ ساماں می روم
عشق دشوارست و شد قم رہنما　　راہ پرخارست و آساں می روم
در بلائے عشق خود را کردہ گم　　در ہوائے شوق رقصاں می روم
مستی عشق است و یا در وئے دست　　ہم بکفر و ہم بہ ایماں می روم

رہرو عشق کی دھج ہی نرالی ہے۔ وہ زندگی سے سیر اور محبوب حقیقی کا تقرب حاصل کرنے کے شوق میں مست و سرشار ہی نہیں بلکہ تیغ و کفن باندھے ہوئے چلا جاتا ہے ؎

آں منم سیر زجاں گشتہ کہ با تیغ و کفن　　تا در خانۂ جلّاد غزلخواں رفتم

جگر کا بھی یہی حال ہے۔ کہتا ہے ؎

واہ رے شوق شہادت کوئے قاتل کیطرف　　گنگناتا رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں
تا کجا یہ پردہ داری ہائے عشق و لاف حسن　　ہاں سنبھل جائیں دو عالم ہوش میں آتا ہوں میں

راہ عشق کی مشکلات ایک حقیقی عاشق کی ہمت اور "عزم راسخ" پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتیں۔ وہ نہ تو اپنی ناتوانی کا شکوہ کرتا ہے اور نہ اپنی دشواریوں کا رونا روتا ہے بلکہ ان بے پایاں مشکلات سے تنگ آکر آہ کرنا بھی غیرت سے بعید سمجھتا ہے ؎

مرا عشق صادق مرا عزم راسخ　　مجھے شکوۂ ناتوانی نہیں ہے

وہ جانتا ہے کہ "لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا" ؎

مجھکو خدائے عشق نے جو بھی دیا بجا دیا　　اتنی ہی تاب ضبط دی جتنا ہی غم سوا دیا

جگر اگر کبھی بھولے سے بھی نالہ کرتا ہے تو اس میں ایک معجز نما صبر و شکیبائی مضمر ہوتی ہے وہ عشاق کو نالہ کرنے کا طریقہ اس طرح سکھاتا ہے ؎

نالہ یوں کیجے بہ اندازِ شکیبائی ہو　　جیسے بیساختہ ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہو

وہ اپنے درد کی کسک کو شاید مخفی کی چھیڑ اور اپنی آبلہ پائی کی کھٹک کو حسن ستور کی اٹکھیلیاں تصور کرتا ہے۔ اس کو اپنے درد اور درد بھرے دل پر ناز ہے ؎

خوشا وہ درد محبت نہ ہے وہ دل کہ جسے　　ذرا سکون ہوا گدگدا دیا تو نے
خوشا وہ جان جسے دیگئی امانت عشق　　نہ ہے وہ دل جسے اپنا بنا کے لوٹ لیا
سلام اسپہ کہ جس نے اٹھا کی پردۂ دل　　مجھی میں رہ کے مجھی میں سما کے لوٹ لیا
جس دل میں تری یاد ہو تو صد نشیں ہو　　وہ دل بھی حسیں اسکی محبت بھی حسیں ہے

جگر کے نزدیک صبر و شکیبائی کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا گویا عظمت عشق کو کم کرنا ہے ؎

عشق کی عظمت نہ ہرگز جیتے جی کم کیجئے　　جاں دیدیجے مگر آنکھیں نہ پرنم کیجئے
توہین عشق دیکھ نہ ہو اے جگر نہ ہو　　ہو جائے دل کا خون مگر آنکھ تر نہ ہو

یہی وجہ ہے کہ اس کو اپنے ضبط پر فخر ہے۔ رنج و الم کی انتہا اسکی آنکھیں پرنم کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوئی کہتا ہے ؎

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی　　وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

(باقی دارد)

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی و جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت عمر

ادب نسواں

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے۔ یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

تیسرا ایڈیشن قیمت عہ

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آرڈر دیجئے نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تشریحاً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے کامل ۱۷ حصے بلا جلد پچیس روپے مجلد اکیس۲ روپے۔

معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب فریڈرک لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف قیمت مجلد آٹھ روپے

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیے آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

> ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل بیچسورے اور سپارے شائع ہوتے ہیں۔
> فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

اوراق پارینہ

از شیر جنگ ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادباء کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت عہ

اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ہاروی اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔

قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے عہ

قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔ قیمت ایک روپیہ۔

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔ تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔

قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

زندگی کا ناچ

خالد حسن قادری

ہماری زندگی کا بیشتر حصہ حماقت میں ہی گذر جاتا ہے۔ عقلمندی کے تو صرف وہ لمحات ہوتے ہیں جب ہم آرام کرسی پر لیٹ کر سگار کے دھوئیں کے دائرے اڑاتے ہوئے سوچتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا حماقتیں کی ہیں۔

ایسے لمحات میں ہر آدمی سب سے پہلے اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق سوچتا ہے۔ شادی شدہ یہ سوچتا ہے کہ اس نے اپنی نصف بہتر کے انتخاب میں شدید حماقت کی یا دوسروں نے زبردستی اس کے سر مڑھ کر اس پر سخت ظلم کیا۔ لیکن اب عقلمندی اسی میں ہے کہ اس ظلم کو سہہ لیا جائے اور اس حماقت کو نبھا دیا جائے۔

غیر شادی شدہ جب شام کو پارک میں، پارٹی میں، سینما میں پہلو بہ پہلو چلنے والے جوڑوں کو دیکھتا ہے تو اس کے کنوارے دل میں خیالات کی عجیب عجیب لہریں اٹھتی ہیں۔ جب اس کی نظر اپنی خالی آغوش پر پڑتی ہے تو اسے خیال آتا ہے کہ مسرت کی رعنائیاں دو دھڑکتے ہوئے دلوں کے مل جانے میں ہی ہیں۔ اور یہ تو شاید اسے کبھی خیال بھی نہ ہوتا ہو کہ یہ بات حقیقت سے اتنی ہی دور ہے جتنا وہ خود کسی کی گداز بانہوں اور زلف کی عنبر آگیں خوشبو سے۔ یہ پہلو بہ پہلو چلنے والے جسم ہمیں جس قدر قریب نظر آتے ہیں ان کی روحیں ایک دوسرے سے اسی قدر دور ہوتی ہیں۔

ایسے موقعہ پر مجھے ہمیشہ اپنے دو ہمسفروں کی گفتگو یاد آ جاتی ہے۔

دسمبر کی تعطیل میں میں پنجاب جا رہا تھا۔ میں اوپر کی برتھ پر لیٹا ہوا اونگھ رہا تھا۔ نیچے مقابل کی سیٹ پر دو مسافر بیٹھے ہوئے تھے۔ درجہ میں اور کوئی نہ تھا۔ ان میں سے ایک کوئی فوجی افسر تھا۔ اونچی پیشانی اور بل کھائی مونچھوں سے حاکمانہ دبدبہ ٹپکتا تھا۔ دوسرا غالباً پروفیسر ہوگا۔ وہ کچھ پہلے سے گفتگو کر رہے تھے وہ تو میں سن نہ سکا۔ ان میں سے ایک نے اپنا سگار سلگا کر مجھ سے پوچھا، "اس وقت کیا بجا ہوگا؟"

"دس۔"

"یہی وقت ہوگا جب وہ ہمارے لئے کافی بنایا کرتی تھی۔" پروفیسر نے شیشوں میں سے تاریکی کو گھورتے ہوئے کہا۔ اور ایک دبی ہوئی گہری سانس لی۔

"ہاں ٹھیک دس بجے ہی وہ کافی تیار کرتی تھی۔" فوجی نے سر ہلا کر پھر گھڑی کو دیکھا۔ اس کی آواز میں اب بھی ایک رعب تھا۔

"میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے بغیر ہماری زندگی میں ایسا خلا پیدا ہو جائیگا۔" پروفیسر نے کسی قدر پرسوز لہجہ میں کہا۔

"مجھے جب یہ خیال آتا ہے رمزی" پروفیسر نے فوجی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ پینتالیس سال کس قدر جلد گذر گئے تو اس قدر حیرت ہوتی ہے کہ جس کی کچھ حد نہیں۔"

"ہماری عمر بھی ایسی تیزی سے جاری ہے جیسے یہ طوفان"، رمزی نے مونچھوں کو ذرا بل دیتے ہوئے کہا، "جب ہم درجہ میں دیکھتے ہیں تو معلوم نہیں ہوتا کہ گاڑی چل رہی ہے یا کھڑی ہے بالکل ایسے ہی ہمیں احساس نہیں ہوتا کہ ہماری عمر اس قدر تیز رفتاری سے بھاگ رہی ہے۔"

"تمہیں شاید خیال ہو کہ میں گذشتہ سال ٹرانکور میں تھا۔" پروفیسر نے فوجی کے فلسفہ پر غور نہ کرتے ہوئے کہا، "اور عید کے موقعہ پر تم نے بضد ہو کر مجھے وہاں سے بلایا تھا۔"

"ہاں وہ اسی نے اس قدر اصرار کیا تھا اور مجھے کئی مرتبہ تار بھی دلوائے۔"

"اچھا ــــ" پروفیسر نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "مگر ہم سب کس قدر خوش تھے اس رات۔ برفباری رک چکی تھی۔ عید کی رات کو ہلکی ہلکی برف چنبیلی کے برف کی طرح کس قدر سہانی معلوم ہوتی ہے۔ وہ صوفہ پر بیٹھی ہوئی ننھے اسلم کے لئے موزہ بن رہی تھی۔ بارہ بجے کے قریب اس نے کافی بنائی۔ تم تو کافی کی ایک ہی پیالی پی کر اونگھ گئے۔ ہم دیر تک موت کے پراسرار فلسفہ پر بحث کرتے رہے۔ اسی زمانہ میں میں نے ایک کتاب بھی لکھنی شروع کی تھی ......"

"ہاں ہاں۔" رمزی سنجیدگی سے مسکرایا، "وہ اکثر تمہاری خرافات کا ذکر کرتی تھی۔"

"...... مگر" پروفیسر نے اس کے مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا "تمہاری بیوی کے انتقال کے بعد تو اب دنیا میرے نزدیک ایک مہمل و بے معنی لفظ ہو گیا ہے۔"

"ہاں وہ بہت ہی اچھی تھی۔" رمزی نے برتھ پر ذرا اوپر کھسکتے ہوئے کہا، "واقعی مجھے اب احساس ہوتا ہے وہ بہت ہی نیک تھی۔ صبح میرے اٹھنے سے پہلے اٹھ جاتی اور خود چائے بنا کر دیتی۔ میری ہر بات کا بہت ہی خیال رکھتی تھی۔ اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں۔"

"وہ کس میں نہیں ہوتیں۔" پروفیسر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں اس وقت کے علاوہ جب وہ تم سے فلسفہ کے مہمل موضوع پر بحث کرنے لگتی ویسے وہ بے حد ہی فرماں بردار اور اچھی تھی۔"

"تم کبھی اس کو نہیں سمجھ سکے۔" پروفیسر نے مدھم آواز میں کہا اور تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کے گوشوں کو دباتے ہوئے اپنی اداس نظریں جن میں کسی نامعلوم گناہ کی پاداش جھلک رہی تھی رمزی کے چہرہ پر جمادیں۔ کمپارٹمنٹ میں چند لمحوں تک خاموشی چھائی رہی۔ رمزی نے اپنا کمبل اوپر کھینچ لیا اور

پروفیسر کی طرف کچھ متوحش نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"وہ تمہاری بیوی تھی۔" پروفیسر نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا، "مگر تم آج تک اس کو نہ سمجھ سکے۔"

ایک لمحہ کے لئے پھر سکوت چھا گیا۔ رمزی برابر عجیب انداز سے پروفیسر کو تکے جا رہا تھا۔

"رمزی" پروفیسر نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ بہت عرصہ سے کہنے کی فکر میں تھا مگر نہ معلوم کیوں نہ کہہ سکا۔ مگر اب میں اس کو قبر میں نہیں لے جا سکتا۔"

"ہاں ہاں تم اس کو کہہ ڈالو۔" رمزی نے نہ معلوم کیوں کمبل میں کلبلاتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"تمہیں شاید میرے اور اس کے تعلقات کا علم نہیں ......"

رمزی ایک دم کہنیوں کے بل اٹھ بیٹھا۔ مینے درجہ کی ہلکی روشنی میں دیکھا کہ رمزی کا مرجھایا ہوا فوجی چہرہ تمتما گیا۔

"کیا کہا — تعلقات" اس کی آواز میں درشتی تھی۔ "یہ مذاق کا موقعہ نہیں ہے راحی۔"

"ذرا ہوش سے کام لو۔" پروفیسر راحی نے موقعہ کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

"تم فوجی آدمی اردو کیا جانو۔ تعلقات کو کسی اور معنی میں نہ لو۔" تھوڑے سکوت کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "میں اس بات کو پینتالیس سال تک اپنے سینہ سے لگائے رہا لیکن میں سمجھتا ہوں اب تم سے کہنے کا وقت آ گیا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" رمزی اپنی برتھ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کیا میری بیوی نے مجھے دھوکہ دیا — ہوں یہی مطلب ہے تمہارا نا۔"

"شرم کرو رمزی خدا کے لئے ذرا شرم کرو۔" راحی نے اپنے اداس لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

رمزی اپنی پشت سیٹ سے لگائے ہوئے کچھ بڑبڑایا۔

"وہ تو بہت ہی فرشتہ خصلت تھی۔ بالکل حور تھی۔ یہ تو ہم اور تم ہیں رمزی! جو گناہوں کی تاریکیوں میں گم ہیں۔ حوا کی بیٹیاں تو واقعی مریم صفت ہوتی ہیں۔"

"ہوں"۔ رمزی نے طنز سے کہا۔

"اس زمانہ میں یہاں ایک رقاصہ رہتی تھی — ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں — یاد ہے تمہیں — کیا نام تھا اس کا ......"

"رخسانہ"۔ رمزی کی آواز میں ایک غیر معمولی لچک پیدا ہو گئی۔ اس نے سگار کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑ دیا۔ اور اس پر نظریں جما دیں گویا وہ اس دھویں میں رخسانہ کے لہراتے ہوئے گیسو دیکھ رہا ہے۔

"تم نے اپنی بیوی کو دھوکہ دیا۔ عورتوں کو اس قسم کی باتوں کا احساس بہت جلد ہو جاتا ہے۔ اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ لیکن کبھی ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نہیں کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چمپئی رنگ میں ہلکی زردی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اس کی باتوں میں پہلی سی شگفتگی نہ رہی تھی۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں کھوئی رہتی۔ میں نے ایک دن پوچھا بھی کہ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ لیکن اس نے صرف اتنا کہہ کر ٹال دیا کہ میں ابھی تک بالکل اچھی نہیں ہوئی ہوں۔ اسلم اسی زمانہ میں ہوا تھا۔ اس لئے اس کی صحت اور گری گری رہتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ صرف یہی بیماری نہیں۔ بلکہ تمہارے رویہ سے بھی اس کو شدید روحانی اذیت تھی۔

اس بات کو پینتالیس سال ہو گئے۔ عید کی رات کو حسب معمول میں آٹھ بجے آیا وہ ہلکے پیازی رنگ کے سوٹ میں اچھی معلوم ہو رہی تھی —"

کیپٹن رمزی نے اسے گھور کر دیکھا۔ مگر راحی کمپارٹمنٹ کی کانپتی ہوئی روشنی کو دیکھتے ہوئے برابر کہے جا رہا تھا۔

"وہ اسلم کا سوئٹر بن رہی تھی۔ عید کا دن تھا۔ مگر کمرے پر ایک مغموم ماحول طاری تھا۔ میں اسے اخبار سناتا رہا وہ سنتی رہی اور تمہارا انتظار کرتی رہی۔ گھنٹے نے دس بجائے پھر گیارہ بجائے مگر تمہارا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں اخبار سناتے سناتے تھک گیا۔ اور وہ بنتے بنتے تھک گئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم اس وقت کہاں ہو گے۔ اس نے سوئٹر اپنی گود میں رکھ لیا اور صوفہ کی پشت سے تکیہ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے دیکھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے ہلکے سے ڈھلک کر سوئٹر میں جذب ہو گئے۔

اب میں اس سے زیادہ برداشت نہ کر سکا۔ میں نے اخبار رکھ دیا اور تمہیں ڈھونڈنے کے ارادہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی دروازہ تک ہی پہنچا تھا کہ وہ بھی ایک دم کھڑی ہو گئی۔ اور جلدی سے قریب آ کر میرے دونوں شانوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

"تم جا رہے ہو" اس نے مدھم آواز میں کہا۔ نہ معلوم کیوں اس کا عضو عضو کپکپا رہا تھا، "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"رمزی کو دیکھنے۔"

"خدا کے لئے راحی تم تو نہ جاؤ۔ کم سے کم تم تو میرے پاس رہو۔" یہ کہتے کہتے اس کا سر میرے سینہ سے لگ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نہ معلوم کیوں تھرتھرا رہا تھا آج تک کوئی عورت مجھ سے اتنی قریب نہ ہوئی تھی۔ اس کی گرم گرم سانسیں، اس کی گداز بانہوں کا لوچ، میری ہیجانی کیفیت ہر طرف مجھے فضا میں نرم روئی کے گالے اڑتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا، تسلی دی، بڑی مشکل سے وہ اپنی حالت پر قابو پا گئی۔ ہم دونوں پھر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں تم داخل ہوئے۔ تمہارا چہرہ سرخ

ہو رہا تھا۔ آنکھیں محبت کے خمار سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ تم ہماری حالت کا اندازہ نہ کر سکے۔ اس رات سے میری حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔ جب بھی مجھے اس کی گداز باہیں، اس کی زلفیں، اس کی تیز تیز سانسیں، اس کے سینہ کا تموّج، اس کی ڈوبتی ہوئی آنکھیں یاد آتیں تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ہزاروں چمکتے ہوئے ستارے آسمان سے ٹوٹ پڑے۔ مجھے پھر ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ سب چیزیں ایک بار پھر مجسم ہو کر میرے سینہ سے لگ گئیں۔ میرے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے رہ رہ کر خیال آتا کہ مجھے ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ لیکن رمزی مجھ سے اس کا معصوم چہرہ، اداس آنکھیں، خشک و غمگین لب، زرد رنگت نہ دیکھی جاتی تھی۔ تم خود سوچو ایسی معصوم عورت کے لئے تمہارا یہ رویہ کس قدر نازیبا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا بے اختیارانہ کیا۔ اور میں وہ کرنے پر بالکل مجبور سا تھا۔ لیکن پھر بھی میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا۔ اپنے دل کو سکون پہنچانے کی صرف یہ ترکیب سمجھ میں آتی تھی۔ کہ تمہیں کسی صورت سے رخسانہ سے چھین لوں تاکہ پھر ایک بار تمہارے گھر کی بے کیف فضا میں زندگی جھلکنے لگے۔ میں جانتا تھا کہ رخسانہ یوں قابو میں نہ آئے گی۔ اتفاق سے میرے پاس بنک میں کچھ روپے تھے۔ میں نے رخسانہ کو ایک خط لکھا کہ اگر وہ کسی دوسرے شہر میں چلی جائے اور پھر تم سے کوئی تعلق نہ رکھے تو میں اتنی رقم دینے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے خیال تھا کہ شاید وہ اتنی رقم پر تیار نہ ہو مگر خوش قسمتی سے وہ مان گئی۔"

"اوفوہ ——" رمزی ایک دم اٹھ بیٹھا۔ کچھ تعجب اور کچھ غصّہ سے کہنے لگا، "تو یہ تمہاری ہی حرکت تھی تمہاری ہی وجہ سے اس نے وہ آخری خط لکھا تھا کہ میں تمہیں چھوڑنے پر مجبور رہوں۔ میرا جسم تم سے دور رہے مگر میرا دل اور روح تمہارے پاس ہی رہے گی۔"

"ہاں وہ میں ہی تھا۔" پروفیسر راجی کسی قدر سکوت سے بولا۔ "مگر سنو مجھے کچھ اور بھی کہنا ہے۔ ان روپوں سے میں سکون و آرام خریدنا چاہتا تھا۔ میں نے ذہنی خلفشار سے نجات حاصل کرنی چاہی تھی، مگر دماغی انتشار بڑھتا ہی چلا گیا۔ میں ہر چند عید کی اس رات کو بھولنا چاہتا تھا مگر وہ رات میرے تصورات پر کچھ اس طرح چھائی تھی کہ میں بھلائے پر بھی نہ بھول سکا۔ میں نے اپنے کام میں اور زیادہ مصروف رہنا شروع کر دیا کہ شاید اس طرح میں یہ سب بھول سکوں۔ مگر اس کی سانسیں میرے دل میں پھانسیں بن کر رہ گئیں۔ میں نے اس عرصہ میں اس سے بہت دور رہنے کی کوشش کی۔ مگر میں جس قدر دور رہتا وہ اسی قدر قریب محسوس ہوتی۔ آخر عید کی رات پھر آئی۔ ہم سب پھر اسی کمرہ میں پھر جمع ہوئے۔ شام کی دعوت سے تھک کر تم برابر والے کمرہ میں سو رہے تھے۔ وہ میرے مقابل کے صوفہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میری آنکھیں اس کے زرد چہرہ پر تھیں۔ باوجود کوشش کے میں گذشتہ عید کی رات نہ بھول سکا۔ ایک بار پھر اس کی مرمریں باہیں، گداز سینہ اور تیز تنفس بالکل اپنے قریب محسوس ہونے لگا۔ عنبریں گیسو، نازک انگلیاں پھر مجھے چھوتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ میں نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے زرد چہرہ پر زندگی ناچ رہی تھی۔ ہماری نظریں ایک لمحہ کے لئے ملیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک جواب تھا۔ جواب بے سوال —— ایک پیغام تھا، میرے تمام خواب، تمام تصورات تحلیل ہو کر اس کی آنکھوں میں تیر رہے تھے۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکا۔ بے اختیارانہ اس کے قدموں میں گر پڑا۔ میرا سر دیر تک اس کی گود میں رکھا رہا۔ میں نہ معلوم کس عالم میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اس کے نرم ہاتھ کی حرکت اپنے سر پر محسوس ہوئی۔ اس نے کئی مرتبہ میرے سر پر ہاتھ پھیرا —— اور —— اور شاید اس کے لبوں کی نازک جنبش بھی محسوس ہوئی۔ اس نے میرا سر دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے کہا، "راجی، عزیز راجی، نادان نہ بنو۔ تم سب کچھ جانتے ہو۔ کیا تم اپنے دوست کو جو محض تمہارے اعتماد پر برابر والے کمرے میں آرام کر رہا ہے دھوکہ دینا پسند کرو گے ——"

میں ایک دم چونک گیا۔ گھبرا کر تمہارے کمرے کی طرف دیکھا اور اپنے صوفہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے جلدی سے ایک رسالہ اٹھا کر مجھے دیا۔ میں سمجھ گیا اور اسے کھول کر بظاہر اسے سنانے لگا مگر ندامت و شرمندگی کی کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ سانس حلق میں گھٹی جاتی تھی اور آواز نہ نکلتی تھی۔ گھبراہٹ اور انفعال کی ملی جلی حالت ایسی تھی کہ اس کے سامنے نظر نہ اٹھتی تھی۔ اس خیال سے کہ ابھی ابھی کیا ہو چکا ہے۔ اس کے چہرہ کی طرف نگاہیں نہ اٹھتی تھیں۔ بلکہ میں اس کے قرب سے بھی اب تو گھبرا رہا تھا۔ اتنے میں تم کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا جیسے صرف تمہارا ہی منتظر تھا۔ تم میرے قریب ہی بیٹھ گئے۔ اور شام کی دعوت کی باتیں کرنے لگے۔ وہ کافی بنانے چلی گئی۔ جب وہ کافی بنا کر لائی تو میں نے ڈرتے ڈرتے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا وہ نیچی نگاہیں کئے پیالی میں کافی ڈال رہی تھی۔ زندگی کا ناچ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے چہرہ کی زردی میں مردنی کی سی کیفیت آگئی تھی۔ انتہائی غم سے اس کے ہونٹ خمیدہ ہو گئے تھے۔"

"مگر رمزی، اس رات سے میری حالت بالکل بدل گئی۔ میں نے سمجھ لیا کہ میری تمام محبت کا جواب اس کے پاس کچھ نہیں۔ بلکہ جب کبھی مجھے اپنی حرکت اور اس کی وہ باتیں یاد آجاتیں تو میں سر سے پاؤں تک پسینہ میں ڈوب جاتا۔

نہ معلوم کتنے سال گذر گئے۔ کتنی عیدیں آئیں اور چلی گئیں۔ ننھے اسلم کی شادی بھی ہو گئی۔ ہم تینوں بوڑھے بھی ہو گئے۔ تم بھی اپنی وہ آزادانہ زندگی چھوڑ کر گھر پر ہی رہنے لگے۔ وہ چلی گئی اور آئندہ عید تک شاید ہم تم بھی چلے جائیں۔ لیکن رمزی اس کا خیال ترک کرنا، اس کی محبت چھوڑنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں اس سے برابر محبت کرتا رہا۔ ہاں تم مجھے چاہے کچھ بھی سمجھو، کچھ بھی خیال کرو، لیکن میں اس سے برابر محبت کرتا رہا ہوں۔ لیکن اس رات سے ہماری محبت

نے ایک دوسری شکل اختیار کرلی۔ تمام جسمانی خواہشات، نفسانی آرزوئیں غائب ہونے لگیں۔ مجھے اپنی روح میں بلندی اور خیالات میں پاکیزگی محسوس ہونے لگی۔ مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے ہم دونوں کسی روحانی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ میری محبت دنیاوی تعلقات سے بلند تھی۔ ہمارے جسم ضرور تھے مگر ہماری روحیں ایک دوسرے سے بہت قریب تھیں۔ تم یقین نہ کرو۔ لیکن محبت صرف جسموں کے ملنے سے نہیں ہوتی بلکہ اکثر اس سے کم ہوجاتی ہے جس محبت کو جسم کی ضرورت ہو وہ محبت نہیں ہوس ہے۔ ہماری محبت ہر قسم کے خیالات سے پاک تھی۔ وہ پاک محبت جو دنیاوی رشتوں اور تعلقات کی محتاج نہیں ہوتی۔ ہماری محبت ایسی ہی پاک اور سچی محبت تھی۔ مجھے اپنی روح میں پاکیزگی اور جذبات میں صداقت محسوس ہونے لگی۔ تم ضرور ایسی محبت پر ہنسو گے اور ممکن ہے تمہیں یقین بھی نہ آئے ـــــ مگر خیر ـــــ ہمارے تعلقات روز بروز پاک اور صاف ہوتے گئے۔ جب ہم بقول تمہارے مہمل فلسفہ پر گفتگو کرتے۔ اگر اس وقت تم یہ جان لیتے کہ ہماری روحیں اور دل ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں تو واقعی تمہیں بیحد جلن ہوتی ـــــ اب وہ بہشت کی وادیوں میں ہماری منتظر ہوگی اور کون جانتا ہے۔ کہ آئندہ عید تک ہم تم بھی اس سے جا ملیں۔ میں اس بات کو بیتالیس سال تک چھپائے رہا۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ سانس کے آخری جھٹکوں میں بھی یہ خیال اٹکا رہے کہ میں نے تمہارے پیچھے یہ جرم کیا۔ اس لئے اس وقت تم سے کہہ کر اپنی روح کو سکون دینا چاہا ہے ـــــ

میرے رمزی!

"کیا تم مجھے معاف نہ کروگے" راجی نے کچھ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رمزی سیٹ سے پشت لگائے غور سے یہ گفتگو سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کبھی چمک اٹھتیں اور کبھی مدھم پڑ جاتیں۔

"بہشت" رمزی نے کچھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس اتنی سی بات تھی۔ یہ بات تو وہ برسوں ہوئے مجھ سے کہہ چکی تھی"

راجی یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"اس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے۔ یہی بات اس نے مجھے چالیس برس ہوئے کہی تھی۔ ۔اور سنو، میں اب تمہیں بتاتا ہوں کہ میں نے ایسی حور صفت عورت کو چھوڑ کر کیوں ایک معمولی رقاصہ کا پیچھا کیا ـــــ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اور صرف تم اس کی تمناؤں کے تنہا سہارے تھے"

پروفیسر کی آنکھیں پھیل گئیں۔ منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اور اس نے اپنے دوست پر نظریں جما دیں۔

ساغرِ سرشار ـــ سرشار کسمنڈوی

تجلی آزمائی ہو رہی ہے ؛ کہ تکمیل خدائی ہو رہی ہے
ادھر جلوہ نمائی ہو رہی ہے ؛ ادھر دل کی صفائی ہو رہی ہے
کوئی گریاں کوئی محوِ ترنم ؛ مزے کی کبریائی ہو رہی ہے
حجاباتِ دو عالم اٹھ رہے ہیں ؛ یہ کس کی رونمائی ہو رہی ہے
جہاں سے لوٹنا ممکن نہ ہوگا ؛ اب اس در پر رسائی ہو رہی ہے
جھکے پڑتے ہیں تارے آسماں کے ؛ شب غم سے جدائی ہو رہی ہے
ہنسے دیتے ہیں دامان و گریباں ؛ جنوں کی پیشوائی ہو رہی ہے
سمجھتا ہوں پیامِ دورِ وحشت ؛ مخل بے درت پائی ہو رہی ہے
خدا حافظ مری تابِ نظر کا ؛ حجابوں میں صفائی ہو رہی ہے
معاذ اللہ، عنوانِ محبت ؛ ابھی سے جگ ہنسائی ہو رہی ہے
یہ کس کے دم قدم سے میکدے میں ؛ حدیثِ پارسائی ہو رہی ہے
جھکی نظریں، لبوں پر مسکراہٹ ؛ یہ میری ہمنوائی ہو رہی ہے

قیامت اپنی خیریت کی خاطر
شریکِ دلربائی ہو رہی ہے

سیرت کی کتابیں

خاتم النبیین :- ولادت، رضاعت، ہجرت و معجزات کے مستند حالات عا
حسین ابن علی :- واقعہ کربلا کے نفسیاتی اور اخلاقی پہلو کی تاریخ مجلد ۲ر
الصدیق :- خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے سوانح حیات عہ
سیرۃ الفاروق :- حضرت عمر بن الخطاب کے حالات زندگی عمر
ذوالنورین :- حضرت عثمان غنی کی سوانح عمری ۱ر
اسد اللہ :- حضرت علی کرم اللہ وجہ کے سوانح حیات عار
سیف اللہ :- خالد بن ولید کی جنگی خدمات کی تاریخ عمر
تذکرۃ الاولیا :- تمام اولیا اللہ کے مفصل حالاتِ زندگی عہ
سوانحعمری غوث الاعظم :- شیخ عبد القادر صاحب جیلانی کی سیرت ۱۲ر
قصص الانبیا :- حضرت آدم سے لیکر حضور اکرم تک انبیاء کے حالات ۲ر
موازنہ صلیب و ہلال :- مسلمانوں کے تمدنی اور معاشرتی شعبوں کی مستند تاریخ ۸ر
دوست و رزیاں :- ہر فیشن کے کپڑوں کی کاٹ کا بہترین رہنما مجلد ۸ر
ہوم ڈاکٹر یا گھر کا حکیم :- سر سے لیکر پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا علاج للعہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کشمیری بازار لاہور

ہندوستان میں تعلیم

مغلوں کے زمانے میں

ہندوستان کے مغل بادشاہ نہ صرف اپنی مملکت کی وسعت، سلطنت کے عمدہ انتظام اپنی شاندار عمارتوں اور اپنے دربار کی شان و شوکت کے لئے مشہور ہیں۔ بلکہ ان کی علم دوستی، علم و فن کی سرپرستی اور ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا بھی بہت چرچا ہے۔

ان بادشاہوں اور ان کے امیروں نے ملک کے ہر حصے میں مدرسے اور مکتب قائم کر دئے تھے۔ جہاں رعایا کے ہر طبقے کے لوگ مختلف علوم و فنون کو حاصل کر سکتے تھے۔ ان مدرسوں میں بعض ابتدائی تعلیم کے لئے تھے اور بعض اعلیٰ تعلیم کے لئے۔ ان مدرسوں کے ساتھ بڑی بڑی جائدادیں وقف تھیں جن کی آمدنی سے ان کے تمام اخراجات ادا ہوتے تھے۔

مغل بادشاہوں نے تعلیم پھیلانے کے لئے یہ طریقہ بھی اختیار کر رکھا تھا کہ مدرسے جاری کرنے کے علاوہ ملک میں جہاں جہاں، عالم و فاضل لوگ رہتے تھے۔ اُن کی گزران کے لئے شاہی خزانے سے بڑے بڑے وظیفے مقرر کردئے تھے تاکہ وہ لوگ ہر معاش کے فکر سے آزاد ہو کر بغیر کسی معاوضہ کے اپنے تعلیمی کام میں مشغول رہ سکیں۔ اس شاہی سرپرستی میں ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی۔ دونوں قوموں کے لوگ یکساں طور پر فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ اس طریق سے تعلیم مفت اور عام ہوگئی تھی اور ہر شوقین اور ذہین طالب علم اپنی ذاتی محنت سے علم کی دولت حاصل کرسکتا تھا اور لیاقت پیدا کرکے دنیا میں ترقی کے زینے پر چڑھ سکتا تھا۔

مغل بادشاہوں نے تعلیم کی اشاعت میں جو قابلِ تعریف کوشش کی، اس کے کئی اسباب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ خود اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مہذب انسان تھے۔ وہ علم کی شیرینی سے واقف تھے اور دوسروں کو بھی اس سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ علم ایک نور ہے جس سے انسان کا دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی رعایا بھی اس نور کو حاصل کرے اور جہالت کی تاریکی سے نجات پائے۔

تعلیمی معاملات پر انتہائی توجہ دینے کا دوسرا بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ علم کے پھیلانے کو ایک نیک کام سمجھتے تھے اور چونکہ اس میں مذہبی اور دینی تعلیم بھی شامل تھی اس لئے وہ تعلیم کی اشاعت کو کارِ ثواب جانتے تھے اور عالموں کی خدمت اور سرپرستی کو اپنے لئے باعثِ برکت اور دین و دنیا کی بھلائی کا موجب سمجھتے تھے۔

مغلیہ خاندان کا بانی بابر بادشاہ بہت سے علوم سے آشنا تھا اور شعروسخن کا بہت شستہ مذاق رکھتا تھا۔ اسکی مادری زبان ترکی تھی۔ مگر ترکی کے علاوہ وہ فارسی میں بھی عمدہ شعر کہہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ جو تزک بابری کے نام سے مشہور ہیں۔ بابر کے یہ خود نوشتہ حالات نہ صرف تاریخی لحاظ سے اہم ہیں بلکہ طرز بیان کی سادگی، بے ساختہ پن اور دل نشینی کے سبب سے بھی بہت دلچسپ ہیں۔ بابر نے ہندوستان میں صرف چار سال حکومت کی۔ لیکن یہ چار سال کا عرصہ لڑائیوں اور سلطنت کے مضبوط بنانے میں گزر گیا۔ اس لئے وہ تعلیمی کاموں کی طرف خاص توجہ نہ دے سکا۔

بابر کا بیٹا ہمایوں بادشاہ بھی علم و فضل کا بہت شائق تھا۔ اسے علم النجوم اور جغرافیہ کے ساتھ خاص دلچسپی تھی۔ اسے کتابوں کے مطالعہ کا اسقدر شوق تھا کہ وہ سفر میں بھی اپنی دل پسند اور چیدہ چیدہ کتابیں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ جب اس نے افغان بادشاہوں کو شکست دے کر ہندوستان پر دوبارہ قبضہ کیا تو دہلی کے پرانے قلعے میں شیر منڈل کی عمارت کو، جسے شیر شاہ سوری اپنے عیش و عشرت کے لئے استعمال کرتا تھا کتبخانہ بنا دیا۔ یہ وہی عمارت تھی جس کے زینے سے پھسل کر اس نے وفات پائی۔ آئین اکبری کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں کا مقبرہ بھی، جو اس کے جانشین اکبر بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوا۔ ایک مدت تک بطور مدرسہ کے استعمال ہوتا رہا جس میں اس زمانے کے بڑے بڑے فاضل استاد درس دیتے تھے۔ مقبرے کی چھت درسگاہ کا کام دیتی تھی اور مقبرے کے پہلو میں جو کمرے تھے وہاں طالب علم رہتے تھے۔

نہ صرف مغلیہ خاندان کے بادشاہ اور شاہزادے اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ تھے بلکہ شاہی خاندان کی عورتیں بھی زیورِ علم سے آراستہ تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادیوں کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب انتظام تھا۔ بابر بادشاہ کی بیٹی گلبدن بیگم نے بھی اپنے عہد کے حالات کو ایک کتاب کی صورت میں لکھا ہے جسکا نام ہمایوں نامہ ہے۔ اس کتاب میں وہ تمام واقعات درج ہیں جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے یا معتبر ذریعوں سے سُنے۔

اس کتاب کا طرزِ بیان بھی اپنی سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے بڑا دلآویز ہے۔

ہمایوں کے بعد اکبر کا زمانہ آیا۔ اگرچہ اپنے باپ کی پریشان حالی کی وجہ سے اکبر کی تعلیم ادھوری رہ گئی اور اسے کسی علم و فن میں پوری مہارت حاصل نہ ہو سکی، مگر وہ فطری طور پر ایک بڑا بیدار مغز اور فراخدل حکمران تھا۔ اس کے عہد میں طریقِ تعلیم میں بہت سی

عنایت اللہ

اصلاحیں کی گئیں اور تعلیم کی بڑی اشاعت ہوئی۔ اکبر نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی تعلیم کے لئے یکساں کوشش کی اور اس غرض سے بہت سے مدرسے جاری کئے اور بے شمار عالموں فاضلوں کی شاہانہ انداز سے سرپرستی کی۔ چنانچہ اسکا وزیر ابوالفضل اپنی کتاب "آئینِ اکبری" میں لکھتا ہے کہ مدرسے تو سبھی مہذب ملکوں میں پائے جاتے ہیں مگر ہندوستان کا ملک اپنی اعلیٰ درسگاہوں کے سبب سے خاص طور پر ممتاز ہے۔

بچوں کو ابتدا میں فارسی تحریر کے سیکھنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ ہندوستان کی دیسی زبانیں بائیں سے دائیں طرف کو لکھی جاتی تھیں۔ اور ہندو بچوں کے لئے خاص طور پر، فارسی حروف کی شناخت اور ان کا تلفظ اور کتابت سخت مشکل تھی۔ اکبر نے نوشت و خواند میں تدریج کے اصول کو جاری کیا یعنی ہدایت کی کہ بچوں کو لکھائی کی درجہ بدرجہ تعلیم دی جائے سب سے پہلے ان کو الگ الگ حرفوں کی پہچان، اور ان کے لکھنے کی مشق کروائی جائے۔ اس ابتدائی مشق پر چند روز سے زیادہ صرف نہ کئے جائیں۔ پھر بچے حرفوں کو آپس میں ملائیں اور الفاظ اور چھوٹے چھوٹے جملے بنانا سیکھیں۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ اس طریق سے سالوں کا کام مہینوں بلکہ دنوں میں طے ہونے لگا اور مکتبوں نے خوب فروغ پایا۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مسلمان طلبا دینیات اور دینیات کے علاوہ علم اخلاق، ریاضی، ہندسہ، ہیئت، اقتصادیات، سیاسیات، فلسفہ اور طبیعیات وغیرہ پڑھتے تھے۔ ہندو طالب علم ادب کے علاوہ اپنے عقائد اور مذاق کے مطابق ویاکرن، ویدانت اور پتانجلی کا مطالعہ کرتے تھے۔

اکبر نے اپنے پایہ تخت فتحپور سیکری میں ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کرایا۔ شاہی سرپرستی کی بدولت بہت سے عالم و فاضل تعلیم و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے ذی علم بھی تھے جو آسودہ حال تھے اور حکومت کی امداد سے بے نیاز۔ انہوں نے محض خدمتِ علم کے خیال سے اپنی زندگیوں کو شوقین طلبا کی تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

اکبر کی علم دوستی اور قدردانی کا شہرہ سنکر بہت سے ایرانی عالم ہندوستان میں آئے مثلاً شاہ فتح اللہ شیرازی اور چلپی بیگ وغیرہ۔

تعلیم کی اشاعت کا شوق صرف بادشاہ تک محدود نہ تھا۔ بلکہ سلطنت کے امیر اور وزیر بھی اس نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ابوالفضل نے فتحپور سیکری میں ایک مدرسہ جاری کیا جو شاہی محلات کے قریب تھا۔ اکبر بادشاہ کی دایہ ماہم اناغہ نے دہلی کے پرانے قلعے کے پاس ایک مدرسہ خیرالمنازل کے نام سے بنوایا۔ اس مدرسہ کا دروازہ اور اس کے چند کمروں کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔

اکبرِ اعظم کے بعد اس کے بیٹے جہانگیر بادشاہ کا زمانہ آیا۔ جہانگیر کی تعلیم و تربیت بڑے اہتمام کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور اس نے اپنے وقت کے چیدہ فاضل استادوں سے تعلیم پائی تھی۔ وہ شعر و سخن کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتا تھا اور فنون لطیفہ، خصوصاً مصوری کا زبردست نقاد تھا۔ اس نے بھی اپنے نامور پردادا بابر بادشاہ کی طرح اپنے . . . . حالات زندگی خود لکھے ہیں جو تزکِ جہانگیری کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے عہد میں بھی علماء کی سرپرستی اور علم کی اشاعت بدستور جاری رہی۔ جہانگیر نے یہ قانون بنایا کہ ملک میں جہاں کہیں کوئی مالدار رئیس یا سوداگر مر جائے اور اسکا کوئی وارث اور جانشین نہ ہو تو، اسکی جائداد پر سرکاری قبضہ ہو اور وہ مدرسوں خانقاہوں پر خرچ کی جائے۔ چنانچہ اس کی تخت نشینی کے بعد تمام پرانے مدرسے جو ویران پڑے تھے، استادوں اور طالب علموں سے بھر گئے۔ جہانگیر کتابوں کا بے حد دلدادہ تھا۔ جب وہ گجرات گیا تو کتابوں کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لیتا گیا اور گجرات پہنچکر وہاں کے علماء کو بہت سی مفید اور مستند تصنیفات مثلاً تفسیرِ حسینی اور روضۃ الاحباب تحفہ کے طور پر دیں اور ہر ایک کتاب کی پشت پر اپنے دستِ خاص سے اپنے گجرات پہنچنے اور ہدیہ دینے کی تاریخیں درج کیں۔

جہانگیر کے بعد شاہجہاں کا زمانہ آیا۔ اگرچہ اسے شاندار عمارات تیار کرانے کا بڑا شوق تھا۔ مگر وہ اشاعتِ تعلیم کی طرف سے غافل نہ تھا۔ واقعہ نویسوں کو حکم تھا کہ ملک کے دوسرے حالات کے علاوہ مدرسوں کے بارے میں بھی اطلاع دیتے رہیں۔ جب اسے اطلاع ملتی کہ کوئی نیا مدرسہ قائم ہوا ہے یا کسی پرانے مدرسے کو امداد کی ضرورت ہے تو وہ اس کے لئے فوراً شاہی خزانے سے وظیفہ مقرر کر دیتا۔ اس طرح سے قدیم مدرسے کامیابی کے ساتھ چلتے رہے اور بعض نئے مکتب بھی جاری ہوئے۔ جب امیر اور شاہزادے کسی علمی مرکز سے گذرتے تو درسگاہوں کا معائنہ کرتے اور اپنی جیب خاص سے انھیں عطیے دیتے۔

شاہجہاں نے جب دہلی کی جامع مسجد تعمیر کرائی تو اس کے ساتھ رفاہِ عام کے لئے چند دوسری عمارات بھی تیار کرائیں۔ مسجد کے شمالی رُخ پر شفا خانہ قائم کیا۔ جہاں غریبوں اور مسکینوں کے مفت علاج کے لئے پورا انتظام تھا۔ مسجد کے جنوب کی طرف شاہی مدرسہ جاری کیا جسکا نام دارالبقاء تھا۔ یہ مدرسہ سن ستاون کے ہنگامے سے پہلے ہی ویران ہو چکا تھا۔

آگرہ کی جامع مسجد شاہ جہاں کی بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم کی یادگار ہے۔ اس شاہزادی نے اس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ مسجد کے

چاروں طرف دکانیں تھیں۔ جن کی آمدنی مسجد اور مدرسہ کے لئے وقف تھی۔ اس آمدنی سے یہ مدرسہ مدت تک چلتا رہا۔

شاہ جہاں کے بعد شہنشاہ اورنگ زیب کا زمانہ آیا۔ وہ بھی علوم و فنون کا بڑا سرپرست تھا۔ اس نے بھی مدرسوں کی امداد بدستور جاری رکھی اور تمام صوبجات کے تعلیمی اداروں کے وظیفے قائم رکھے تاکہ وہاں کے استاد اور طلبائے فکری کے ساتھ اپنے تعلیمی کام میں مشغول رہ سکیں۔ اس کے عہد میں علمی مرکز تو بیسیوں تھے۔ مگر سیالکوٹ اور لکھنؤ نے خاص طور پر شہرت حاصل کی۔ سیالکوٹ کو ملا عبدالحکیم اور ان کے فرزند مولوی عبداللہ کے علم و فضل نے چمکایا اور لکھنؤ کو فرنگی محل کے عالموں نے چار چاند لگائے۔ ملا نظام الدین اسی خاندان سے تھے۔ انھوں نے ایک جامع درسی نصاب جاری کیا جو ان کے نام پر درسِ نظامیہ کہلاتا ہے۔ یہی درس کسی قدر ردّ و بدل کے ساتھ ہندوستان کے اکثر اسلامی، دینی، مدرسوں میں آج تک مروج ہے۔

مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان کی دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ ہندو پہلے تو اس زبان سے ناآشنا رہے مگر آخر کار زمانے کی ضرورتوں سے اس کی تحصیل پر متوجہ ہوئے اور رفتہ رفتہ اس میں ایسا کمال حاصل کیا کہ زباندانی میں خود اہلِ زبان کا مقابلہ کرنے لگے اور فارسی زبان کے تمام ادبی اور علمی شعبوں پر حاوی ہو گئے۔ ہندوؤں میں فارسی زبان کے بہتر سے بہتر ادیب، شاعر اور مصنف پیدا ہوئے۔ چنانچہ فنِ تاریخ میں لُبُّ التواریخ، تاریخ دلکشا، تاریخ کشمیر، فتوحاتِ عالمگیری، تاریخ فرمانروایانِ ہنود وغیرہ بیسیوں کتابیں ہندو اہلِ قلم کی یادگار ہیں۔ اسی طرح تذکروں میں تذکرۃ الامراء، حدیقۂ ہندی، امیر نامہ، گلِ رعنا، اور سفینۂ خوشگو بھی ہندو مصنفوں کے علمی ذوق کا عمدہ نمونہ ہیں۔ خود فنِ لغت میں گردھاری لال نے گنج لغات، پنڈت گنگا بشن نے شیر و شکر، سیالکوٹی مل وارستہ نے مصطلحات الشعراء اور ٹیک چند بہار نے بہارِ عجم جیسی مستند کتابیں لکھ کر اپنے کمالِ فن کا ثبوت دیا۔ فارسی زبان کے جس قدر ہندو شاعر گزرے ہیں وہ بھی حدِ شمار سے باہر ہیں۔ خاص کر کالستھوں اور کشمیری پنڈتوں نے فارسی دانی میں ایسا امتیاز حاصل کیا کہ فارسی زبان اور ادب کا اعلیٰ مذاق ان کی خاندانی روایات میں شامل ہو گیا۔ ایک مدتِ دراز کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں آج تک بہت سے ایسے ہندو خاندان موجود ہیں جن کے ہاں فارسی زبان کے قلمی نسخے محفوظ ہیں اور وہ فارسی ادبیات کے ساتھ بڑا شغف رکھتے ہیں:

خط و کتابت کرتے وقت خریداری چٹ نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

"رقیب سے!"

"وہ کوئی زہرہ جبیں، حور شمائل ہوگی۔ ۔ ۔ ؟
"نہیں، ایسا تو نہیں!
بلکہ وہ حسن کے معیار پہ آتی بھی نہیں!!"
"پھر وہ شیریں لب و شائستۂ محفل ہوگی؟"
"نہیں، ایسا تو نہیں!
وہ کسی مرکزِ گفتار پہ آتی بھی نہیں
خیر، وہ گاؤں کی دوشیزۂ کمسن ہوگی؟
"نہیں، ایسا تو نہیں!
شاید اب اُس کی جوانی بھی ڈھلی جاتی ہے!!"
"پھر تو وہ زہر میں ڈوبی ہوئی ناگن ہوگی؟"
"نہیں، ایسا تو نہیں!
"اب تو صندل کی نشانی بھی ڈھلی جاتی ہے!!"
"آپ کی جنتِ تخئیل کی دیوی ہوگی؟"
"نہیں، ایسا تو نہیں!
میرے آدرش کی فردوس کوئی خواب نہیں!!
"آپ ہی جانیں، مجھے کیا، وہ کوئی بھی ہوگی؟"
"نہیں، ایسا تو نہیں!
تم سمجھتے ہو، بتلانے کی مگر تاب نہیں!!"

سلام (مچھلی شہری)

صلہ:- بقیہ صفحہ ۵۷ پر

آہا! بے چاری بوا" اس نے نرمی سے کہا، "آخر تم کو اتنا دکھ اٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ یہ روپے واپس اٹھالو۔ اپنے اوپر اپنے بچوں کے اوپر خرچ کرنا۔ بابا کو ان کی ضرورت نہیں ہے خدا نے ان کو بہت دیا ہے اور نہ مجھ کو ہی ضرورت ہے ہمارے یہاں بھی خدا کا شکر ہے"

"بیٹی خدا تمہاری عمر دراز کرے۔ لیکن بی بی میں اس کو کیسے رکھ سکتی ہوں۔ یہ تو میرا مال ہے ہی نہیں"

"نہیں یہ تمہارا ہی ہے۔ اچھا اگر تم نہیں لیتی ہو تو میں نے لے لئے اور اب یہ میری طرف سے لے لو" عذرا نے نرمی سے کہا، "اور اب تم آگئی ہو تو تم کو جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ ہی چلنا۔

جدید اسپتالوں کی تعمیر

طبی امداد اور مریضوں کی دیکھ بھال کا خیال تمام تعمیری منصوبوں کی صفِ اوّل میں ہونا چاہیئے اور خاص طور پر دیہاتوں اور چھوٹے قصبوں میں جہاں طبی امداد قطعی مفقود ہے اِس کی انتہائی ضرورت ہے۔

اسپتالوں اور دواخانوں میں چند بنیادی ضروریات قابلِ اطمینان ہونی چاہئیں مثلاً حفظانِ صحت سکون اور آگ وغیرہ سے بچاؤ۔ آہن بستہ سیمنٹ کانکریٹ جو فی زمانہ تعمیرات کا بہترین مسالہ ہے تمام ضروریات مہیا کرتا ہے اور چونکہ اس کی بنی ہوئی عمارت مستقل اور دیکھ بھال کے اخراجات سے مبرّا ہوتی ہے اِس لئے تعمیر کن اور آرکیٹیکٹ صریحی طور پر اِسی کو پسند کرتے ہیں۔

کانکریٹ کے ذریعے زیادہ سے زیادہ مفید تعمیرات کیلئے دی کانکریٹ ایسوسی ایشن آف انڈیا (۰، کوئنس وے نئی دہلی)، کے فنی ادارے کی اعانت حاصل کی جاسکتی ہے۔

دی سیمنٹ مارکیٹنگ کمپنی آف انڈیا لمیٹڈ

CM 106 B

جنوبی مشرقی ایشیا اور ہندوستان

جی۔ آر۔ وینکٹارامن

ہندوستان اور جنوبی ایشیا کے لوگوں کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں، ان کے عادات و اطوار اور ان کے رسم و رواج میں جو نمایاں شباہت ہے اُسے دیکھکر ایک سرسری نظر سے دیکھنے والا بھی اس قریبی تعلق کو محسوس کرسکتا ہے جو بالکل ابتدائی زمانہ سے ہندوستان اور جنوبی مشرقی ایشیا کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں رہا ہے اپنے تاریخی ارتقا میں دونوں ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہے ہیں۔ اور ان کے بعض ضروری پہلوؤں کو دیکھکر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کے بعض مسائل بھی ایک سے ہیں اور ان کا حل بھی ایک سا ہو سکتا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا کا پورا علاقہ (شاید برما کو چھوڑکر) پندرھویں صدی عیسوی کے وسط تک سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے اثر میں تھا پہلی صدی عیسوی کی بعض چینی تحریروں میں چمپا، کمبوڈیا اور انام کی ہندو سلطنتوں کے وجود کا تذکرہ ہے اور جدید تحقیقوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہندوستانی فکر اور چینیوں کے زندگی کے فلسفہ نے جنوبی مشرقی ایشیا کے باشندوں کی موجودہ زندگی کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا کے معاملہ میں ہندوستان کی جو مرکزی جگہ ہے اسے پرتگالی رہنما الفانسو البوکرک کے زمانہ میں بھی تسلیم کیا جاتا تھا۔ البوکرک کا یہ خیال صحیح تھا کہ ایسٹ انڈیز کو ہندوستان سے فتح کیا جاسکتا ہے اور یہیں سے اسکا انتظام بھی کیا جاسکتا ہے۔ پرتگالیوں کا جو سیاسی اقتدار ایسٹ انڈیز میں بڑھا اسکی بنیاد ہندوستان ہی میں تھی۔ ہندوستان میں مضبوط بحری اڈے بناکر الفانسو کا خیال تھا کہ وہ مشرق میں پرتگالی حکومت قائم کرسکیگا ہالینڈ والوں کا ہیڈ کوارٹر جاوا میں تھا لیکن انھوں نے بھی لنکا میں ایک مضبوط بحری اڈا بنایا تھا اور یہیں سے وہ اپنے سامراجی منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کے بچاؤ کے کام کی بنیاد اکثر ہندوستان اور لنکا میں کام کرنے والی قوتوں پر رہی ہے اور اس لئے ہندوستان کی قسمت اور اس کے حالات کا اثر گو بالواسطہ ہی سہی، لیکن یقینی طور پر جنوب مشرق پر ضرور پڑتا ہے۔

جنوبی مشرقی ایشیا باقی ہر علاقہ سے زیادہ سامراجی قوتوں کی باہمی رقابتوں کا اکھاڑا ہے۔ اور اس چیز کا تعلق براہ راست معاشی مسئلے سے ہے۔ اس علاقہ میں ٹن، ربر، تیل اور صنعت و حرفت کی ضرورت کا کچا مال کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ مغرب میں جب صنعت و حرفت کا دور شروع ہوا اور لوگوں کو اس سلسلہ میں کچے مال کی ضرورت پڑی تو مختلف سامراجی قوتوں کی نظر اس پُرامن علاقہ پر پڑنے لگی۔ یہ سامراجی رقابت اس علاقہ کے لئے ایک بڑی نعمت بھی ثابت ہوئی۔ اور جنوبی مشرقی ایشیا نے دنیا کی معاشیات میں ایک نمایاں حصہ لینا شروع کردیا۔ اس کی قدرتی اور معدنی پیداواروں کی کھوج کی جانے لگی اور اسکا اثر یہ ہوا کہ لوگوں کی زندگی کے معیار میں ترقی ہوئی اور ان میں زیادہ خوشحالی پیدا ہو گئی۔ مغرب کی آمد اور اس کے اقتدار نے یہاں بھی وہی معاشی اثر ڈالے جو ہندوستان پر پڑے تھے۔ اور اس لئے ہندوستان، جنوبی مشرقی ایشیا اور چین کے مسئلے ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ مشرقی ایشیا کو وسیع تر بنانے کا خیال محض خواب و خیال نہیں معاشی مسائل ان سب علاقوں کو ایک دوسرے سے قریب لاتے ہیں اور ایک کا اثر برابر دوسرے پر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔

ہندوستان کی طرح یہاں کے معاشی نظام کے بھی دو حصے ہیں — ایک کا تعلق مقامی زراعتی معاشیات سے ہے اور دوسرے کا نو آبادیوں کی معاشیات سے۔ زراعتی معاشیات میں مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پیداوار کے پرانے اور فرسودہ طریقوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے دوسرے حصہ میں غیر ملکی قوتوں کا ہاتھ ہے، جو ایسی چیزوں کی پیداوار کو ترقی دینے کی کوشش کرتی ہیں، جو صنعتی حیثیت سے مفید ہیں — مثلاً کپاس اور گنا۔ ان پیداواروں سے جو زبردست آمدنی ہوتی ہے اس سے سب واقف ہیں۔ لیکن یہ آمدنی چونکہ غیر ملکی لوگوں کے ہاتھوں میں جاتی ہے اس لئے قومی معاشی نظام پر اسکا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور اسے اپنی خوشحالی کے لئے دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے۔

جنگ کی ضرورتوں نے مشرق کی ان پیداواروں کی قیمت اور بھی زیادہ بڑھادی۔ لیکن جوں جوں لڑائی کے زمانہ میں یہ ملک جاپان کے ہاتھوں میں جاتے رہے، یورپ اور امریکہ کے کارخانہ داروں نے جنوبی مشرقی ایشیا میں پیدا ہونے والی چیزوں کے لئے دوسرے بدل تلاش کرنے کی کوشش شروع کردی۔ اور اس لئے آسانی سے یہ پیشین گوئی کی جاسکتی ہے کہ آنے والے زمانہ میں یورپ اور امریکہ اس کثرت سے یہ کچا مال نہیں خریدینگے جتنا وہ لڑائی سے پہلے خریدتے تھے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جنوبی مشرقی ایشیا کو ایک بہت

سخت معاشی بدحالی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن ہندوستان اور چین کی صنعتی ترقی مشرق کی اس زبردست معاشی تباہ حالی کو روک سکتی ہے اس بات سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان ملکوں کی خوشحالی کس طرح ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہے، اور ایشیائیوں میں تعاون کی کمی اور بے توجہی کس طرح دنیا کے آباد ترین علاقوں کے معاشی توازن کو خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

ہندوستان نے بھی، چین کی طرح جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں کی قسمت اور حالات کی تشکیل میں بڑا حصہ لیا ہے اور مستقبل میں وہ اور بھی بڑا حصہ لے گا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ہندوستان نے کبھی تجارتی لوٹ کھسوٹ یا نفع خوری کے خیال سے ان ملکوں کی طرف قدم نہیں بڑھایا۔ وہ وہاں تاریخی روایتوں کے مطابق خون اور آنسوؤں کا بیش خیمہ بن کر نہیں گیا۔ ہندوستانی تو وہاں ہمیشہ پُرامن کلچرل مشن لے کر گئے اور مشرق کی بڑی قوموں کو ایک ایسے رشتہ میں جوڑنے کی کوشش کی جو مادیت کے رشتہ سے بالکل مختلف تھا۔ یہ قدیمی ملک ہمیشہ سے اپنے سیاح، اپنے سفیر اور اپنے مفکر ایک دوسرے کو بھیجتے رہے اور اس طرح ایک دوسرے سے قریب آتے رہے۔ انھوں نے اپنے ہمسایوں کا کلچر اور قدیم ہندوستان کی فکری بلندیوں کا مفہوم سمجھنے کی کوششیں کیں۔ ان دو ملکوں کے سیاح اور مسافر صرف علم کی کھوج اور نیکی کی تلاش کو اپنے راستہ کا چراغ سمجھ کر اپنے سفر کرتے رہے۔ اس لئے ان دونوں میں قدرتی طور پر کچھ تمدنی اور روحانی اشتراک ہے، اور ان کی تہذیب میں ایک مسلسل ربط و تعلق۔ ان کے عمل کے پیچھے ایک ہی سے آدرش کام کر رہے ہیں۔ لیکن زندگی کے آدرشوں میں یہ یکسانی آخر کس طرح ممکن ہوئی؟ یہ کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔

موریا شہنشاہ اشوک نے مشرقی ملکوں میں بدھ مت پھیلانے کے لئے اپنے سفیر بھیجے۔ بدھ مت کی اس تعلیم نے مشرق کے ملکوں میں انسانیت کا ایک جذبہ پیدا کر دیا اور یہ سارے ملک ایک دوسرے سے بہت قریب آ گئے۔ اس جگہ چین پر بدھ مت کے اثر کا تھوڑا سا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

ہندوستان اور چین کے درمیان عالموں کی آمد و رفت ایک عام چیز بن گئی تھی۔ اور مختلف طرح کے مذہبی اختلافات اور شبہات عالموں اور سیاحوں کی زبانی طے ہوتے تھے۔ ان سیاحوں میں سب سے بڑا ہیون سانگ تھا اس کی ذات میں ہندوستانی اور چینی، دونوں کلچروں کی خوبیاں ایک جگہ جمع تھیں۔ اس نے ہندوستان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے چینی عالم اچھی طرح واقف ہیں۔ شانتی کے فلسفہ اور لڑائیوں میں اسلحوں کے استعمال کی ناپسندیدگی نے ان دونوں بڑے ملکوں کے رشتہ کو اور بھی زیادہ مضبوط کر دیا۔

مشرق میں ہندوستانی کلچر کا پھیلنا انسانی تاریخ کا ایک عظیم الشان باب ہے۔ پہلی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کے شہروں اور خاندانوں کے ناموں کو برما، سیام ہند چینی، ملایا اور لنکا میں اپنایا گیا اور برہمن مذہب اور بدھ مت کے آدرش اور ادارے پورے جنوبی مشرقی ایشیا کی زندگی میں رچ بس گئے اور اس کی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا۔ فلپائن میں قدیم زمانہ کے جو کتبے اور نشانات برآمد ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان تعلیمات کا یہاں کے لوگوں پر کتنا زبردست اثر تھا۔ آرٹ، ادب اور فلسفہ میں چین اور ہندوستان کے اثرات نے مل کر جنوبی مشرقی ایشیا کے شمالی ملکوں کے کلچر کی تخلیق کی۔ روحانی، فکری اور فنی تخلیقات میں ان ملکوں نے ہندوستان سے جو مستقل اور ہمیشہ قائم رہنے والے اثرات قبول کئے ہیں وہ جنوبی مشرقی ایشیا کی تہذیب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ جنوبی مشرقی ایشیا کے ان ملکوں کی زبانوں میں ابھی ہندوستانی خط و خال موجود ہیں۔ بناوٹ اور لفظوں کے مادوں میں اکثر جگہ ان زبانوں میں ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت کے اثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً جاوی زبان میں خدا کے لئے لفظ "دیوتا" استعمال ہوتا ہے اور یہ لفظ سنسکرت کے لفظ دیوتا سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ علم الانسان، علم اللسان اور اثریات کی جدید تحقیقوں نے اب یہ بات بالکل مستحکم کر دی ہے کہ ہندوستان نے مشرق کے لوگوں کے

غزل

مظفر الدین ظفر

ہم بھی کبھی اسیر تھے گیسوئے اعتبار میں
اب وہ لطافتیں کہاں جلوۂ نوبہار میں

حاصل زندگی عشق یعنی متاع دو جہاں
بکھرے ہوئے ہیں لختِ دل دامن تار تار میں

دنیا پیام فصل گل ڈوب چکی ہے نبضِ دل
کیسے بنائیں آشیاں رکھا ہی کیا بہار میں

قصۂ غم سکا ہو بُرا وہ بھی نہ تاب لا سکے
تلوے سے کچھ جھلک اٹھے نرگس شرمسار میں

اپنا بھی آشیاں کبھی صحنِ چمن میں تھا مگر
عرصہ ہوا اجڑ گیا ایسی ہی اک بہار میں

ہستی کو میری اے ظفر سمجھیں گے اہل عرش کیا
دل ہوں مگر بشکل غم سینۂ روزگار میں!

کلچرل اداروں کی تشکیل اور تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

آثارِ قدیمہ کی حیثیت غیر منضبط تاریخ کی سی ہے۔ اور جنوبی مشرقی ایشیا کے ملکوں میں قدیم زمانہ کے جو آثار، عمارتیں اور کتبے ملے ہیں اُن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ صرف سیاست اور معاشیات ہی میں نہیں بلکہ فن، کلچر اور مذہب میں بھی جنوبی مشرقی ایشیا کے ممالک نے ہندوستان سے بہت گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ ان قدیم یادگاروں میں سب سے اہم جاوا میں بورو بدور کے مقام پر بنے ہوئے جاپانی بدھ مندر ہیں۔ ملایا میں کیدار کی چوٹی پر شیو کا ایک خوبصورت مندر جو پتھر کے مضبوط اور سڈول ٹکڑوں سے بنایا گیا ہے حال ہی میں برآمد ہوا ہے۔ ڈاکٹر ویلز کو جو ان کھدائیوں کے مہتمم تھے۔ ایک مٹی کا گھڑا ملا ہے جس پر نویں صدی عیسوی کے جنوبی ہندوستان کی زبان کے کتبے کھدے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کانسے کی ایک صندوقچی بھی ملی ہے جو بناوٹ میں بالکل جنوبی ہندوستان کے نمونے کی ہے۔ ان چیزوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چولا خاندان کے بادشاہ راجندر نے اس زمانہ میں ہندوستانی مذہب کے عقیدے یہاں پھیلائے۔ ان ملکوں میں اینٹوں کے بنے ہوئے بہت سے مندر بھی ہیں جن میں ہندو مذہب کی مورتیں رکھی ہوئی ہیں۔ بعض محققوں کا خیال ہے کہ ان علاقوں میں ہندوستانی کلچر ملایا کے راستہ سے پہنچا۔

سیام میں ہندوستانی آرٹ کے اثرات زیادہ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں بنگ کاک کے قریب پانک توک کے مقام پر کھدائی میں جو چھوٹی چھوٹی مورتیاں نکلی ہیں وہ ہندوستان کے امراوتی اسکول سے بہت مشابہ ہیں۔ ان مورتوں کے سیام میں برآمد ہونے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کی آمد و رفت سیام میں دوسری صدی عیسوی میں شروع ہوچکی تھی۔ سیام سے بورنیو تک اور سماترا سے چمپا تک اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں کہ ان علاقوں میں عرصہ تک سنسکرت زبان بولی جاتی رہی ہے۔ اس علاقہ میں سنگ تراشی کے جو نمونے ملتے ہیں وہ گپتا آرٹ سے مشابہ ہیں۔ اسی علاقہ میں وشنو کی، چار ہاتھوں کی ایک چھ فٹ اونچی مورت بھی ملی تھی۔ اب یہ مورت بنگ کاک کے نیشنل میوزیم میں رکھی ہے۔

سماترا کو دیکھکر نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں خاصے عرصہ تک ہندو آباد رہے ہیں بلکہ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ ہند چینی کلچرل علاقہ، کا ایک خاص حصہ رہا ہے۔ پالو خاندان، چولا حکومت اور تامل اور کرالا کے علاقوں کا اثر یہاں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔ مُلک کے لوگوں میں اب تک دراوڑی نام ملتے ہیں۔ جاوا میں راجہ راجندر کے جو کتبے ملے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بالکل ابتدائی زمانہ سے جنوبی ہند کے لوگوں کی آمد و رفت یہاں تھی۔

دعوتِ حُسن و عشق

آ شبابِ شعر کا گزرا زمانہ بنکے آ ٭ آ بہارِ حسن کا رنگیں فسانہ بنکے آ
آ دیارِ عشق کا دلکش ترانہ بنکے آ ٭ آ بہارِ نماز یکتا و یگانہ بنکے آ
آ تمنا کی حیات جاودانہ بنکے آ
آ مرے حق میں مسیحائے زمانہ بنکے آ

آ مریضِ عشق و الفت کا مسیحا بنکے آ ٭ آ مرے دردِ محبت کا مداوا بنکے آ
آ خدا کے واسطے جانِ تمنا بنکے آ ٭ آ ذرا راہِ لطف تسکین سراپا بنکے آ
آ نشانِ الفت و لطف و مدارا بنکے آ
آ جہانِ راحتِ پنہان و پیدا بنکے آ

آ مری بیتابیٔ رفتہ کا ساماں بنکے آ ٭ آ مرے ظلمت کدے میں مہرِ تاباں بنکے آ
آ مرے تاریک گھر میں ماہِ کنعاں بنکے آ ٭ آ چراغِ ظلمتِ شامِ غریباں بنکے آ
آ مرے اُجڑے چمن میں پھر بہاراں بنکے آ
آ مری محفل میں تا صبح چراغاں بنکے آ

آ کہ اک مدت سے سُونا ہی جہانِ حُسن و عشق ٭ آ کہ عرصے سے ہے ویران بوستانِ حُسن و عشق
آ کہ دہرائیں باہم داستانِ حُسن و عشق ٭ آ کہ پھر بنجائیں دونوں روح و جانِ حسن و عشق
ساکت و جامد ہے کب تک محبت کا جہاں
آ بنادیں اس جہاں کو پھر مسرت کا جہاں

آ کہ یوں کبتک رہیں رنجور ہم مہجور ہم ٭ آ بنادیں آج حسن و عشق کا دستور ہم
آ کہ دنیا کو بنادیں پھر سراپا نور ہم ٭ آ کہ پھر روشن کریں ملکر چراغِ طور ہم
آ کہ بھردیں انجم و شمس و قمر کو روشنی
آ کہ پھر بخشیں جہانِ تیرہ تر کو روشنی

مشرق کے ہمسایہ ملکوں کے ساتھ ہندوستان کا تعلق کلچر اور اخلاق کا تعلق رہا ہے۔ جنوبی مشرقی ایشیا کی اب اپنی الگ حیثیت ہے۔ لیکن اس کے جسم اور روح کی تشکیل ہندوستان اور چین نے کی ہے۔ ایسی چیز ہے جس سے آنے والے زمانہ میں ان دونوں ملکوں کے درمیان دوستی کے رشتہ کی تحریک پیدا ہوگی اور یہ رشتہ دونوں کی بھلائی اور خوشحالی کا باعث بنے گا اور ہندوستان جنوبی مشرقی ایشیا کی اس دوستی کے رشتہ کا مرکز ہوگا۔

ان ملکوں کے باہمی رشتہ سے ان کا ناگزیر معاشی تعلق اور نکھرے گا۔ چین، ہندوستان اور جنوبی مشرقی ایشیا کے لوگ جیسے ایک ہی گھرانے کے لوگ ہیں اور یہ ایک گھرانے کے لوگ آنے والے زمانہ میں ایک دوسرے سے اور قریب ہوتے رہیں گے ٭

(نیو انڈیا سے ماخوذ)

دو قابلِ قدر تصانیف

سید الانبیا ۔ خاتم النبیین محبوبِ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہورِ عالم سیرتِ مبارکہ

رحمۃ للعالمین کامل تین جلد

مصنفہ :۔ علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصور پوری

فاضل مصنف نے آقا عربی کی سوانح حیات کو جس بالغ نظری سے مرتب کیا ہے اسنے رحمۃ للعالمین کے شائع ہوتے ہی غیر معمولی مقبولیت عنایت کردی ۔ چنانچہ کتاب کو ملک کے ہر حصہ میں ہاتھوں ہاتھ قبول کیا گیا ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقفیت پیدا ہو جائے گی۔

طرزِ بیان محبت اور عقیدت سے منجھا ہوا ہے ۔ سیرت کے ساتھ ہی بہت سے اہم مذہبی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ کتابت خوشخط ، کاغذ چکنا عمدہ ، طباعت دیدہ زیب ۔ کامل تین جلد مجلد قیمت ۱۷ روپے

اردو زبان میں قرآن حکیم کی بے نظیر و لاثانی تفسیر

تفسیر حقانی اردو کامل

مصنفہ فاضلِ اجل علامہ مولانا مولوی عبد الحق صاحب حقانی دہلوی

اردو زبان میں آج تک ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی ۔ اس سے آپ عمر کے ہر حصہ میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں زبان عام فہم اور سلیس بامحاورہ اردو استعمال کی گئی ہے حوالۂ کتب ، ربط آیات ، شانِ نزول اور دیگر متعلقات بھی درج کئے گئے ہیں ۔

شائقانِ علم و دین کے مسلسل اصرار پر نواں ایڈیشن آٹھ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے جو اڑھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں ۔

قیمت کامل آٹھ حصے بلا جلد پچیس روپے ، مجلد اکتیس روپے ۔

ہم اسلامی ادبی کتابیں اور قرآن مجید شائع کرتے ہیں فہرست مفت طلب فرمائیے

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

منتخب کتابیں

امیرِ پاکستان : مصنفہ عارف ٹباوی :۔ ناخدائے ملتِ اسلامیہ قبلہ جناح کی بلند و برتر شخصیت اور سنہ ۱۹۰۵ء سے کانگریس کا رویہ مسلمانوں کیطرف ۔ قیمت دو روپے

حالات قائدِ اعظم : مسیحِ ملک و ملت قائدِ اعظم مدظلہ کی سوانح ادبی رنگ میں (ستمبر)

انجم کدہ :۔ دورِ حاضرہ کے اساتذہ اور مشاہیر شعرا کا ۱۹۴۵ء کا بہترین کلام نظم و غزل معہ فوٹو اور حالات ۔ قیمت عہ

میر صاحب :۔ عادل رشید کا شاہکار جس میں نظم و ادب پر بہترین انداز میں طنز کیا گیا ہے ۔ قیمت ۱۲

فتح بیت المقدس : مصنفہ صادق حسین صدیقی : جس میں مساوات اور بہادری کے انمول نمونے دکھائے گئے ہیں ۔ قیمت عہ

بیل بوٹے : مصنفہ مظفر حسین شمیم ۔ پُر از معلومات مضامین کا دلکش مرقع رنگین افسانوں کا مجموعہ ۔ قیمت عمہ

جھلکیاں : مصنفہ رہبر بٹالوی :۔ اس مجموعہ میں افسانوں کے ذریعہ زندگی کی وہ تصویریں دکھائی گئی ہیں جو محبت بھرے دلوں کے لئے پیام کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ قیمت عہ

دل کے آنسو :۔ مصنفہ رئیس احمد جعفری :۔ آئینہ ہے ان ٹھوس حقیقتوں کا جن سے ہمیں روزانہ سابقہ پڑتا ہے ۔ قیمت عہ

منجدھار : مصنفہ نادم سیتاپوری :۔ ان افسانوں میں ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی کے خاکے پیش کئے گئے ہیں ۔ قیمت عہ

ان سُنی : مصنفہ نادم سیتاپوری :۔ طوائف جب محبت کرتی ہے تو سماج اور سوسائٹی چیخ اٹھتی ہے ۔ نہ جانے کیوں !! قیمت عمر

گھروندے : مصنفہ عرش تیموری :۔ بہترین مکالموں ، لطیف طنز اور کردار نگاری کا حامل ڈراموں کا مجموعہ ۔ قیمت ۔ عہ

جویائے حق : مصنفہ شررؔ مرحوم : حضرت سلمان فارسی اور حضور اکرم صلعم کے حالات نہایت دلکش انداز میں بیان کئے گئے ہیں قیمت فی جلد عہ اور ہر مکمل حصہ سات روپے آٹھ آنہ

غیب داں دلہن :۔ مصنفہ شررؔ مرحوم :۔ بُری سوسائٹی کے نتائج ۔ بیوی کی حیرت انگیز غیب دانی ، ریاکار ، دوستوں کی چالیں ۔ ایک شریف خاندان کا تباہی سے بچنا ۔ قیمت عہ

فہرست کتب مفت طلب کریں

مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳

صلہ

افسانہ

بڑھی نصیبن اپنے کوارٹر سے نکلی دروازے پر پہنچ کر اس نے کوٹھی پر حسرت بھری نظر ڈالی۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے ۱۵ سال گزارے تھے۔ عذرا سے چھوٹ جانے کی اس کو بہت تکلیف تھی۔ عذرا کی وہ آیا تھی۔ اسی کے ہاتھوں وہ پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی اور اب جب کہ وہ پندرہ برس کی ہوگئی تھی تو اس کو الگ کر دیا گیا۔

خاں صاحب، عذرا کے سخت دل والد نے سب سے پہلے اس کو محسوس کیا کہ جوان لڑکی کے لئے آیا کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس لئے انہوں نے نصیبن کو نکال دیا۔ نصیبن نے گھر والوں کی خوشامد کی کہ کچھ مہینے اس کو اور رہ لینے دیں۔ اس کے بعد وہ خود چلی جائے گی۔ اس کی لڑکی گلشن بہت سخت بیمار ہے۔ اس کو دوا، پھلوں اور طاقت پہنچانے والی غذاؤں کی سخت ضرورت ہے۔ کریم اس کا جوان لڑکا دو مہینے سے گھر پر بیکار بیٹھا ہے۔ عذرا کی ماں اور خود عذرا نے اس کی پندرہ سالہ خدمات، لڑکے کی بیکاری اور لڑکی کی بیماری کا خیال کرتے ہوئے خاں صاحب سے التجا کی کہ اس کو نکالا نہ جائے۔ لیکن خاں صاحب نے یہ کہہ کر کہ "ہمارا گھر کوئی خیرات خانہ نہیں ہے" ان کی درخواست سختی سے ٹھکرا دی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ہم نوکروں کو کام کے لئے رکھتے ہیں۔ اس لئے نہیں رکھتے کہ ان کی لڑکی بیمار ہے یا ان کا لڑکا بیکار بیٹھا ہے۔ اور اس طرح ہم ان کے خاندان بھر کی پرورش کریں۔ ہم کو نصیبن کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے اس کو یہاں سے چلا ہی جانا چاہیئے۔"

نصیبن سے رخصت ہوتے وقت عذرا خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی اور اس نے کہا، "بوا کبھی کبھی ہم کو دیکھنے ضرور آیا کرنا۔" "بھلا بی بی میں تم کو کہیں بھول سکتی ہوں۔" نصیبن نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ لاکھ روکنے پر بھی اس کی سسکیاں نکل ہی گئیں اور وہ عذرا کو چپٹا کر رونے لگی۔

ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ نصیبن اپنی کوٹھری میں داخل ہوئی۔ گلشن ایک پھٹی دری اوڑھے ہوئے کھرے پلنگ پر پڑی تھی۔ کریم اس کی پٹی سے لگا بیٹھا تھا۔ ماں کو جواب مل جانے کی خبر سنتے ہی جیسے اس پر بجلی گر پڑی۔ لیکن اس نے دل کڑا کر کے کہا، "خیر اماں اللہ مالک ہے۔ لیکن گلشن کی حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ اس کے لئے دوا چاہیئے۔"

"تو پھر مجھ کو کہیں اور نوکری کرنا پڑے گی۔" نصیبن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

کریم بولا، "اماں، اب تمہاری یہ عمر نہیں ہے کہ تم نوکری کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرو۔ تم کو تو اب بالکل آرام کرنا چاہیئے ——— میں نے جب سے یہ سنا ہے کہ خاں صاحب نے تمہاری ۱۵ سال کی تابعداری کا خیال نہیں کیا اور تم کو جواب دے دیا، میرے تو تن بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔ دیکھتی ہو اس موذی کو۔ ان کو یہ بھی ترس نہ آیا کہ گلشن بیمار ہے اور اس کی حالت دن بدن گرتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اے اللہ تو ہی ہمارا فیصلہ کرنے والا ہے۔"

"تم بھی کیا باتیں لے بیٹھے، چپکے رہو۔" نصیبن نے اس کو روک دیا۔

"میں ہرگز چپکے نہیں رہ سکتا۔" کریم نے تیزی اور غصے سے کہا، "ان کی ناانصافی نہیں دیکھتیں اور میں جو کہتا ہوں تو خفا ہوتی ہو۔ ان سب امیروں کی سزا یہ ہے کہ ان کی دولت چھین لی جائے۔"

اس کی آنکھیں کسی آئندہ کامیابی کے خیال سے چمکنے لگیں لیکن نصیبن نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

دوسرے دن صبح سویرے جب نصیبن جاگی تو کریم اس طرف بیٹھ گئے، زمین پر بیٹھا کچھ گن رہا تھا۔ اس کو روپوں کی جھنکار اور نوٹوں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ اس نے حیرت سے پوچھا "یہ تم کہاں سے لے آئے؟"

کریم اس کے اس اچانک سوال سے کچھ چونک سا پڑا۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، "اماں، کل جو ہم نے تم سے کہا تھا وہی کر لائے۔ ہمارے لئے اس میں کوئی عار شرم نہیں ہے۔ پچھلی رات جب تم سو رہی تھیں تو ہم نے خاں صاحب کے یہاں نقب لگائی اور اپنے لئے کچھ سہارا پیدا کر لیا۔"

نصیبن یہ سنکر ہکا بکا رہ گئی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا، "تم، تم نے صاحب کے یہاں چوری کی۔ ان کے یہاں چوری کی جن کا نمک پورے پندرہ برس تک ہم نے کھایا۔ یا اللہ میرے کان کیا سن رہے ہیں۔"

"ہاں" کریم نے تیزی سے جواب دیا، "میں نے ان کے یہاں چوری کی جن کی تابعداری تم نے ۱۵ برس کی اور اب جب کہ تم بڈھی ہو گئیں تو انہوں نے تم کو نکال باہر کر دیا۔ انہوں نے اس کی بھی پروا نہ کی کہ تمہاری بیمار لڑکی مرے گی یا جیئے گی۔ ان کو اس کا بھی خیال نہ گزرا کہ تمہارا کنبہ فاقہ کرے گا۔"

حبیب انصاری

نصیبن رونے لگی اور غصے میں بولی، "کریم تجھ پر اللہ کی سنوار،

"آخر تجھ سے ایسا بڑا کام ہوا کیسے؟ جا جس کے روپے ہیں اس کو ابھی واپس کر آ۔" "یہ نہیں ہو سکتا اماں!" کریم نے سختی سے کہا، "ذرا سمجھ سے کام لو۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ان روپوں کے چوری جانے کا خاں صاحب کو رنج ہوا ہوگا۔ یہ ۲۰۰ روپے ان کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر ان میں ذرا سی بھی بھل منساہت ہوتی تو وہ یہ دو سو روپے تم کو گھر سے نکالتے وقت دے دیتے۔ یا پھر تمہارا کچھ گزارا مقرر کر دیتے۔ اماں! اب جب روپے آ گئے ہیں تو یہ فضول باتیں نہ کرو۔ ہم ان کو گلشن کی دوا میں خرچ کریں گے اور جب تک میں روزی سے لگوں یہ ہمارے کھانے پینے میں کام آئیں گے۔" کریم یہ کہہ کر، کھانے پینے کی چیزیں اور گلشن کی دوا لینے کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

گھنٹہ بھر کے بعد جب وہ سب چیزیں لے کر گھر لوٹا تو اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر نصیبن کو پکارا۔ "اماں، اماں ایک بہت بری خبر سننے میں آئی ہے۔ خاں صاحب کے وہاں کسی اور نے بھی چوری کی ہے۔ میں جب واپس آیا تو دروازہ بند کرنا بھول گیا۔ موقع پا کر کوئی اندر گھس آیا اور جھاڑ و پھیر دی۔ معلوم ہوا ہے بہت سے ہیرے جواہرات چوری گئے ہیں۔"

"ہائے میرے اللہ" نصیبن گھبرا کر چلا اٹھی، "کیا تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھ کو کیسے پتہ چلا؟"

"یہ نکڑ پر جو کلو رہتا ہے اس نے مجھ سے کہا۔ اس کو میں نے رازدار بنایا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں تم کو لے کر کہیں باہر چلا جاؤں اس لئے کہ پولیس ہمارا پیچھا کرے گی اور اس کو سب سے پہلے تم پر شبہ ہوگا۔"

پولیس کا نام سنتے ہی نصیبن چراغ پا ہو گئی اور حلق پھاڑ کر پکاری "بڑی آئی وہاں سے پولیس پیچھا کرنے والی میرا اس میں کیا دوش ہے۔"

کریم نے اس کو سمجھانا شروع کیا "اماں تم تو ذری ذری باتوں میں بگڑ اٹھتی ہو۔ دوش تو اس میں تمہارا ذرا سا بھی نہیں لیکن یہ دو چوریاں تمہارے وہاں سے آنے کے بعد میں ہوتی ہیں اور خاں صاحب یہ سمجھیں گے کہ اس میں ضرور تمہارا ہاتھ ہے۔ تم اپنی بے گناہی ثابت کر سکتی ہو لیکن اس صورت میں میں دھرا جاؤں گا۔ اور پھر ہیرے جواہرات کی بھی میرے متھے جائے گی اور میں کم سے کم ۱۰ سال کے لئے سوالاکھ کی کوٹھی کی ہوا کھاؤں گا۔" اس نے بے بسی سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"ہائے میرے مقدر۔" نصیبن دوہتڑ پیٹنے لگی۔ "کریم میرے بیٹے میں تجھکو بچاؤں گی اور سارا الزام اپنے سر اوڑھ لونگی۔ تو ابھی جوان ہے۔ تجھ کو ابھی بہت دن جینا ہے۔ اگر تیرے دشمنوں کو جیل ہو گئی تو تیری جان پر بن جائے گی۔"

"اگر ہم ایک مرتبہ بھی اس مشکل میں پڑ گئے تو اس سے نکلنا آسان نہ ہوگا۔ ساری بات میرے ہی اوپر آئے گی۔ جواہرات کی چوری بھی ہم ہی پر لگے گی۔ ہم نے تو یہ سوچا ہے کہ لکھنؤ چھوڑ دیں اور کان پور جا کر کسی مل میں مزدوری کریں۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ تم وہاں سے چوری سے پہلے آ گئیں ورنہ پھر تو تمہارے ہی اوپر الزام آتا اور ہم بھی پکڑے جاتے۔ چلو تم سامان باندھو میں اکہ بلاتا ہوں۔"

نصیبن غم اور تکلیف کے مارے سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے اپنے دل میں سوچا کہ کریم نے یہ بہت اچھا کیا کہ لکھنؤ چھوڑ کر کان پور چل دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ ہم وہاں بالکل محفوظ رہیں گے۔ اور وہ جلدی جلدی سامان باندھنے لگی۔

کان پور آ کر کریم نے ایک کوٹھری کرائے پر لے لی اور نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ ان لوگوں کے دل سے اب پولیس کا کھٹکا نکل چکا تھا۔ اس لئے کہ لکھنؤ سے آئے ہوئے ان کو تین سوا تین مہینے گزر چکے تھے اور کسی نے خبر بھی نہیں لی کہ نصیبن اور نصیبن کے لڑکے ہیں کہاں؟ مرتے ہیں یا جیتے ہیں؟ لیکن نصیبن کے دل سے ابھی تک چوری کا خیال نہیں نکلا تھا۔ کھانا اس کو زہر معلوم ہوتا تھا اس لئے کہ وہ یہ جانتی تھی کہ اس کے پرانے آقا کے چرائے ہوئے روپوں سے خریدا گیا ہے جن کا نمک اس نے ۱۵ برس کھایا تھا اس کو رہ رہ کر یہ خیال ستایا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

آخرکار وہ ۲۰۰ روپے ختم ہو گئے۔ گلشن بھی اب اچھی ہو چلی تھی۔ اور کریم کو بھی روپے روز کی مزدوری کسی مل میں مل گئی تھی۔ لیکن نصیبن ان سب باتوں سے بھی مطمئن نہیں تھی۔ اس کی کوٹھری کے سامنے والی سڑک بن رہی تھی۔ بجری کوٹنے والی عورتوں میں وہ بھی شامل ہو گئی۔ ۵ آنے روز اس کو مل جاتے تھے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ یہ مزدوری کے پیسے وہ خرچ نہیں کرے گی۔ جوڑ جوڑ کر رکھے گی اور خاں صاحب کے دو سو روپے ان کو کسی نہ کسی طرح واپس کر دے گی۔ جب اس نے اپنا منصوبہ کریم سے بیان کیا تو اس نے نرم لہجے میں سختی سے مخالفت کی "اماں تم اس کنجوس مکھی چوس کے لئے اپنی جان پر کھیل کر روپے جمع کرنا چاہتی ہو جس نے تم پر ذرا سا بھی ترس نہ کھایا۔ یہ ۲۰۰ روپے اس کی نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں اور اس کے لئے میں تم کو بجری نہیں کوٹنے نہ دوں گا۔"

"یہ نہیں ہوگا۔ میں مرنے سے پہلے ان کا قرضہ ضرور چکاؤں گی۔"

نصیبن نے بہت ہی نرمی سے جواب دیا۔

نصیبن نے اپنا ہی کہنا کیا۔ وہ سڑک کی مزدورنوں میں شامل ہی رہی۔ ایک ایک پائی جوڑ کر رکھتی تھی۔ بعض وقت اس کو پیسے پیسے کے لئے کریم کا منہ دیکھنا پڑتا تھا لیکن اس نے یہ سب کچھ گوارا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے پاس ایک روپے کے پیسے جمع ہو گئے اور وہ ان پیسوں کو گنگا دین بنئے سے ایک روپے کے نوٹ کے بدلے میں بدل لائی۔

۵ سال گزر گئے۔ نصیبن کی حالت پہلے سے بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی وہ سن سے زیادہ بڑھی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی پیٹھ جھک گئی تھی اور ایک چھوٹا سا کوبڑ بھی نکل آیا تھا۔ لیکن وہ کسی نہ کسی طرح کام دھندے سے لگی ہی رہی آخرکار اس کا مقصد پورا ہی ہو گیا پورے دو سو روپے اس کی پوٹلی میں بندھے تھے اور اس نے طے کر لیا تھا کہ اب کے منگل کو وہ لکھنؤ چل دے گی اور خاں صاحب کا قرضہ ادا کر دے گی۔

جانے سے ایک دن پہلے پیر کو جب کریم مل سے واپس آیا تو اس نے اپنی ماں سے کہا "اماں شکر کے کارخانے میں مزدوروں کی ضرورت ہے۔ ڈھائی روپے روز کی مزدوری ہے۔ لیکن اس کے لئے ڈیڑھ سے روپیہ ضمانت میں جمع کرانا ہوگا۔ اب بڑا اچھا موقع ہاتھ آیا ہے میں اس کو جانے نہیں دوں گا اور وہیں مزدوری کروں گا"

"لیکن بیٹا! یہ ڈیڑھ سے روپیہ تم لاؤ گے کہاں سے؟" نصیبن نے کہا۔ "لاؤں گا کہاں سے تم ہی سے لوں گا۔ اماں خدا کے لئے ان کو روپے دینا بھول جاؤ۔ وہ اپنے روپیوں کی چوری کب کے بھول چکے ہوں گے"۔ "نہیں بیٹا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا" یہ کہنے کے بعد اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اس کو بڑا ہی دکھ ہوا کہ روپے اس کے پاس ہیں لیکن وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو دے نہیں سکتی۔ دوسرے دن صبح وہ روتی ہوئی لکھنؤ چل دی۔

شام ہو چکی تھی، نصیبن خاں صاحب کی کوٹھی پہنچ گئی۔ ڈر اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ اس کو اب تک یقین تھا کہ اس کے بیٹے پر کوئی الزام نہیں آئے گا اور روپے لوٹا دینے کے بعد کریم کا سارا گناہ دھل جائے گا۔ اور وہ اس قصور کو بالکل معاف کر دیں گے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ بجائے کریم کے اس ہی کو سزا دیں لیکن چلو روپے دے ہی دیں اور بقیہ معاملہ اللہ میاں کے سپرد۔ وہ یہ سب باتیں سوچتی ہوئی ان تک پہنچ چکی تھی۔ عذرا ٹہل رہی تھی۔

وہ اب ۱۵ سال کی لڑکی سے ۲۰ سال کی ایک مکمل اور خوبصورت عورت میں بدل چکی تھی۔ جیسے ہی اس نے نصیبن کو دیکھا وہ خوشی سے، بالکل بچوں کی طرح چیخ اٹھی "ہماری آپا آ گئی"۔ عذرا کو اس کے آنے کی بہت خوشی تھی۔ اس کو اپنی آپا سے بہت محبت تھی اور وہ بھی عذرا کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتی تھی۔

"ہاں بی بی" یہ کہکر اس نے عذرا کو گلے لگا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بولی "آپا تمہارے صدقے بی بی، میں تو یہی سمجھتی تھی کہ تم ابھی تک اتنی ہی سی ہوگی"۔ "میری آنکھوں میں خاک اب تو ماشاءاللہ تم نے خوب رنگ و روغن نکالا ہے۔ اللہ عمر دراز کرے — بی بی تمہارا بیاہ تو ہو گیا ہوگا" نصیبن ایک ہی سانس میں سب کہہ گئی۔ عذرا نے شرما کر کہا "ہاں میں آج صبح دہرہ دون سے آئی ہوں۔ لیکن تم اتنے دنوں ہم کو دیکھنے کیوں نہیں آئیں؟"

"عذرا بی بی کیا آپ کو ابھی تک ہمارے اوپر چوری کا شبہ ہے"

"چوری - چوری کیسی" لیکن کچھ سوچ کر وہ مسکرا کر بولی، "اچھا تم اس کو کہہ رہی ہو۔ میں سمجھ گئی۔ پاپا کو تو پہلے شبہ ہوا تھا کہ اس ڈکیتی میں تمہارا بھی ہاتھ ہے لیکن دوسرے دن نہیں تیسرے دن چور پکڑ لیا گیا۔ اور تمہارے اوپر کسی کو شبہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں"

"چور پکڑ لیا گیا" اس نے عذرا ہی کی بات دہرا دی۔ اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"ہاں آپا، اور پھر ہم کو ہر چیز مل گئی۔ جواہرات اور سارے روپے سب ہی چیزیں تو واپس آ گئیں۔ لیکن میں تو اس وقت بھی یہی سمجھ رہی تھی کہ ہماری آپا بالکل بے گناہ ہے"

نصیبن کی آنکھیں بھر آئیں وہ اپنے دل میں سوچ رہی تھی کہ چوری کا حال عذرا سے کہہ دوں یا نہ کہوں۔ اگر نہیں کہتی ہوں تو دل نہیں مانتا اور اگر کہتی ہوں تو یہ بھولی لڑکی جو مجھ پر اتنا بھروسہ کرتی ہے کیا خیال کرے گی کہ کریم نے کتنی چھوٹی بات کی آخر اس نے دل کڑا کر کے ساری رام کہانی سنا دی۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ کریم نے یہ چوری محض اپنی بہن کی وجہ سے کی تھی اور یہ ۲۰۰ (اس نے روپیوں کی پوٹلی چادر سے کھول کر سامنے رکھ دی) کریم نے واپس کئے ہیں"

لیکن نصیبن کے کانپتے ہوئے ہاتھوں، جھکی ہوئی پیٹھ، روئی کے گالے ایسے سفید بال اور چہرے کی جھریوں نے سارا راز کھول ہی دیا۔ اور عذرا نے یہ اندازہ لگا ہی لیا کہ یہ روپے آپا نے اپنی جان پر کھیل کر مصیبتیں اور تکلیف جھیل کر جمع کئے ہیں۔

(باقی صفحہ نمبر ۴۹ پر)

برطانیہ اور چرم سازی

برطانیہ میں جنگ کے دوران میں جو صنعتی کوششیں ہوتی رہی ہیں، ان پر حال کے چند بیانات سے تازہ روشنی پڑتی ہے۔ اس سلسلے میں مسٹر ایچ پرل آدم کی ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جو یقیناً ایک یادگار ثابت ہوگی۔

مصنف نے ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی ہے کہ جنگ کے سلسلے میں چمڑے کی ضرورت ہر جگہ اور ہر چیز کے لئے محسوس ہوتی رہی ہے۔ جنگی جہازوں، ہوائی جہازوں، ٹینکوں، اور دوسرے ساز و سامان کے لئے، اسپتالوں میں، اے آر پی کے مرکزوں میں جنگ میں حصہ لینے والوں کو اور ان لوگوں کو بھی جو شہری زندگی بسر کرتے ہوئے لڑائی کے کاموں میں امداد دیتے رہے ہیں، چمڑے کی ضرورت لازمی طور پر لاحق ہوئی۔ کبھی اس کی ضرورت معمولی طور پر محسوس ہوئی اور کبھی پوری اہمیت کے ساتھ لیکن ہمیشہ اس کا حصہ لازمی رہا اور اعداد و شمار سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ برطانوی کارخانے میں تیار کئے ہوئے چمڑے کا رنگ ہر جگہ جمتا رہا۔ سمندر کی گہرائی میں، جنگل کی وسعت میں، برف پوش پہاڑوں کی چوٹی پر جھلستے ہوئے صحراؤں کے دامن میں اور کبھی کبھی اٹلی اور برما کے دلدلی علاقوں میں بھی چمڑا اور وہ بھی برطانوی چمڑا قدرت اور انسان دونوں سے جنگ آزما رہا۔

برطانیہ میں صنعت چرم سازی کو اپنے نمایاں کارناموں پر ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ اس سلسلے میں اس نے کوشش کی کہ معیار گھٹنے نہ پائے اور اسی لئے برے کاریگروں سے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جیمز اول کے عہد حکومت میں ایک زین ساز کو محض اسلئے جرمانہ کی سزا دی گئی کہ اس کا کام معیار سے گرا ہوا تھا اور وہ چیز جو اس کی نالائقی سے خراب ہوگئی تھی، اسی کے دروازے کے سامنے جلادی گئی۔ اسی طرح شاہ چارلس کی وفات سے ایک سال پہلے چمڑے کے ایک کاریگر پر چھ آنے جرمانہ کیا گیا تھا۔ یہ رقم ان دنوں خاصی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کا قصور یہ تھا کہ اس نے چمڑے کے دو خراب تسمے بازار میں فروخت ہونے کے لئے پیش کر دئے تھے۔

چمڑے کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک سرکاری ذخیرے میں رکھی ہوئی مختلف چیزوں کی قسمیں ایک ہزار سات سو کے قریب تھیں۔ لڑائی کے دوران میں گھوڑوں کی زین، ساز و سامان اور فوجیوں کے جوتوں اور تھیلوں وغیرہ کے ساتھ دوسری چیزوں کی مانگ بھی بڑھتی رہی تاہم ان کا شمار سب سے زیادہ رہا۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ فوجیوں کے لئے جوتوں کے سات کروڑ جوڑے فراہم کئے گئے اور جب روس لڑائی میں شامل ہوگیا تو پانچ لاکھ جوڑے اس کی فوج کیلئے بھیجے گئے۔ اس تعداد میں ٹخنوں تک کے تمام قسم کے جوتے شامل تھے۔ برطانیہ کی خشکی کی فوج کے جوتے سب سے زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی افادیت کا لحاظ رکھتے ہوئے بحری اور فضائی فوجوں نے، ہوم گارڈ اور سول ڈیفنس کے لوگوں نے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ انہی کو پسند کیا۔ اس کے باوجود لڑائی کے خاتمے سے پہلے ہی برطانوی صنعت چرم سازی کے محکمے نے فوجی جوتوں میں ڈیڑھ سو کے قریب نئی قسموں کا اضافہ کردیا۔ یعنی ایسے جوتے بنائے جو برفانی مقامات پر، کانٹوں والے جنگلوں میں پہاڑوں کی چڑھائی کے لئے یا ان علاقوں میں پہننے کے لئے جہاں مچھر زیادہ ہوتے ہیں۔ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوسکے حتی کہ بعض ایسے جوتے بنائے جو صرف جبل الطارق کی چڑھائی کیلئے موزوں ہوسکتے تھے۔

چمڑے کی صنعت کے لئے لندن میں کچا سامان ساری دنیا سے آتا ہے اور حساب لگایا جائے تو کل فراہمی کا دو تہائی حصہ درآمد شدہ ہوتا ہے۔ دنیا میں چمڑے کی جو بہترین قسمیں سمجھی جاتی ہیں، ان میں سے زیادہ تر برطانیہ ہی میں تیار ہوتی ہیں۔ درآمد شدہ مال میں سے وہ چمڑا جو جوتے کا تلا بنانے کے کام آتا ہے، امریکہ، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، چین سے اور کچھ ہلکی قسم کا ہندوستان سے لیا جاتا ہے۔

لڑائی کے دوران میں جب جہازوں کی نقل و حرکت کا مسئلہ دشواریاں پیدا کرنے لگا تو برطانوی کارخانوں نے جوتوں کے لئے ایسے چمڑے کی دباغت بھی شروع کردی جو عام طور پر اس مقصد کے لئے استعمال نہیں ہوتا تھا۔ نیز گھوڑے کی کھال سے بھی مدد لی گئی تاکہ عمدہ قسم کا چمڑا زیادہ اہم کاموں مثلاً فوجی دستانوں کیلئے بچ جائے۔ فوجی ہوابازوں کے لئے ایسا چرمی لباس بھی تیار ہوا جو صحیح معنوں میں ان کو سر سے پاؤں تک ڈھک سکتا تھا۔ اس اعتبار سے چمڑے کی مانگ بہت زیادہ رہی۔ دوسری صنعتوں کی طرح چرم سازی کی صنعت میں بھی یہ نئی بات پیدا ہوئی کہ بہت سے کارخانے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوکر کام کرنے لگے اور نتیجہ یہ کہ اب سب مل جل کر برآمدی تجارت میں بڑی تیزی کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔

لڑائی کے دوران میں نت نئے تجربات نے کچھ مفید کام بھی کر دکھائے۔ چمڑے کی ایسی ہلکی پھلکی چیزیں تیار ہونے لگیں جو اس سے قبل ممکن نہ ہوسکی تھیں مثلاً کم وزن کا سامانِ سفر ان لوگوں کے لئے جو عموماً فضائی سفر کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسا سوٹ کیس تیار کیا گیا جس کا کل وزن ساڑھے پانچ پونڈ سے زیادہ نہیں ہے۔

(لندن کولنگ سے ماخوذ)

نقد و نظر

ف - ح

مطبوعاتِ ادارۂ تعلیماتِ اسلام

۲۳ امین آباد پارک ۔ لکھنؤ

یہ ادارہ عبدالسلام صاحب قدوائی نے قائم کیا ہے جو فاضل ندوہ ہیں اس ادارے سے صرف مذہبی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ ان کا مقصد خدمت اسلام ہے پیش نظر کتابچوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انکی کوششیں کامیاب اور تعریف کے قابل ہیں۔ فی الحال سلسلۂ اشاعت کی چار کتابیں نمبر ۲ ۔ نمبر ۱۰ ۔ نمبر ۱۱ ۔ اور نمبر ۱۲ بغرض تبصرہ آئی ہیں جن کے نام یہ ہیں:۔ (۱) عربی کے دس سبق۔ (۲) حضرت ابوہریرہؓ (۳) حضرت بلالؓ (۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ اول الذکر میں جو مہتمم ادارہ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے، عربی سیکھنے کے بالکل ابتدائی قاعدے درج ہیں۔ کلام مجید کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے یعنی ان سبقوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد اتنی صلاحیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے کہ محض اٹکل سے قرآن شریف کے جملوں کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحیح معنے تو زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد ہی آ سکتے ہیں تاہم "نا سے ہاں بہتر ہے" کے مصداق اسے غنیمت کہا جا سکتا ہے۔ ہر سبق کے ساتھ ساتھ ترجمے کی مشق کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔ باقی تین کتابچے سوانح کے رنگ میں ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہؓ نامور اصحاب رسول مقبول صلعم اور حضرت بلالؓ حضور کے خاص خادم تھے۔ ان کی سیرتوں اور کارناموں پر بے شمار کتابیں اور متفرق مضامین قلمبند ہو چکے ہیں لیکن انھیں بہت ہی آسان زبان میں کم سن طلبا یا ایسے غیر مسلموں کے لئے لکھا گیا ہے جو ان حضرات کی عظمت سے غیر متعارف ہیں۔ تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں یہ خدمات یقیناً قابل تحسین ہیں۔ یہ علی الترتیب احتشام علی صاحب رحیم آبادی، عبدالسلام صاحب قدوائی اور بشیر الحق صاحب بحری آبادی کی تصانیف ہیں۔ ہر حصے کی قیمت چار آنے ہے۔ مندرجہ بالا پتے سے طلب کیجئے۔

قرآن آموز

مولف:۔ جناب نذیر بن ابی سلمیٰ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر قرآن آموز احاطہ شہزادہ محمد طاہر ۔ لدھیانہ ۔ صفحات ۴۶ قیمت ۸ر

یہ کتاب بھی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ بچوں کو قرآن شریف کا ترجمہ پڑھانے کے سلسلے میں لکھی گئی ہے۔ بہت عمدہ اور سریع الفہم طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ عربی میں زیر، زبر یا پیش کے استعمال یا شروع اور آخر میں چند حروف کے اضافوں سے معنی و مفہوم میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ ابتدائی سبقوں میں انہی اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ ان الفاظ کو خاص طور پر مدنظر رکھا ہے جو قرآن شریف میں بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان پر عبور حاصل کرنے کے بعد ہر کوئی شخص جس نے اس زبان کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کی ہو عربی لغت سے معمولی مدد لے کر تیسوں پاروں کو سمجھ سکتا ہے۔ عربی زبان کو عموماً مشکل کہا جاتا ہے لیکن یہ کتاب دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ اس کے سہل ہونے میں کلام نہیں ہے۔

میرا نام ہے تعلیم

مصنف:۔ جناب نعیم صدیقی۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ نشاۃ الثانیہ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن۔ بڑے سائز کے ۴۲ صفحات۔ بلا جلد۔ قیمت چھ آنے۔

اردو زبان میں اپنی قسم کا پہلا ڈرامہ ہے جسے تعلیم کے موضوع پر رمزیہ انداز میں لکھا ہے۔ ڈرامے کے افراد میں تمام علوم مثلاً ادب، فلسفہ، تاریخ، سائنس، سیاست، شہنشاہیت اور تعلیم شامل ہیں۔ سب سے اہم کردار ابلیس کا ہے جس کی تخریبی کوششوں سے نظام تعلیم ہمیشہ بگڑتا رہتا ہے۔ اس مختصر ڈرامے میں شروع سے آخر تک تمثیلی اور اشارتی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔ زبان نہایت شگفتہ اور موثر ہے۔ تاریخ ہند کے ایک دور کی جھلک پس منظر کا کام دیتی ہے۔

پیغام حق کا اقبال نمبر

مرتبہ:۔ سید محمد شاہ صاحب ایم۔ اے ملنے کا پتہ:۔ دفتر "پیغام حق" ظفر منزل تاجپورہ لاہور۔ ۲۰۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔

رسالہ "پیغام حق" کئی سال سے جاری ہے۔ اب جنوری، فروری اور مارچ ۱۹۴۶ء کی مشترکہ اشاعت "اقبال نمبر" کے نام سے جلوہ گر ہوئی ہے۔ حصول کاغذ کی مشکلات اور کتابت و طباعت کی دقتوں نے یہ تاخیر پیدا کی ہے لیکن "دیر آید درست آید" کے مصداق یہ خاص نمبر جسے ایک مستقل کتاب کہا جا سکتا ہے، بہت ہی قابل قدر ہے۔ اقبال کی شاعری اور ان کے پیغامات کے مختلف پہلوؤں پر صائب رائے رکھنے والے حضرات سے مقالے لکھوائے ہیں۔ ڈاکٹر میر ولی الدین، ڈاکٹر سید عبداللہ، خواجہ عبدالحمید، ڈاکٹر نکلسن، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، سید ابوسعید بزمی کے اسمائے گرامی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ عبدالقیوم باقی نے اقبال سے متعلق ایک ایسا دلچسپ غنائیہ لکھا ہے کہ وہی اس سارے مجموعہ کی جان ہے۔ اردو زبان میں اور خصوصاً اقبال سے متعلق ایسی چیز آج تک نہیں لکھی گئی۔ مغربی مفکرین نے اقبال کو سمجھنے میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کا جواب چراغ حسن صاحب حسرت نے بہت اچھے انداز میں لکھا ہے۔ حصۂ منظومات میں سائل صاحب انبٹھوی کو نمایاں حیثیت دی جا سکتی ہے۔ اس حصہ میں دو ایک غیر متعلق چیزیں بھی ہیں جن کو شامل نہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا۔

اختر شیرانی کے شاہکار

ہندوستان کے مشہور و معروف رومانوی شاعر حضرت اختر شیرانی کا بے نظیر کلام چار حصّوں میں شائع ہوگیا ہے جب دنیا سوتی ہے شاعر سوچتا ہے جب مزدور محنت کرتا ہے سرمایہ دار روپیہ کی جھنکار سے غریب کی عصمت لوٹنے پر فخر کرتا ہے کسان خون پسینہ ایک کرکے دنیا کی قوت لایموت کا انتظام کرتا ہے تو شاعر ان مشاہدات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ مندرجہ ذیل تصنیفات انہی جذبات کی منہ بولتی تصویریں ہیں ایک ایک شعر کیف و سرور کا چھلکتا پیمانہ ہے۔

صبح بہار تین روپیہ — لالہ طور تین روپیہ — اختر ستان تین روپیہ — طیور آوارہ تین روپے آٹھ آنے

عمدہ کاغذ مضبوط جلد۔ دیدہ زیب گردپوش

جدید اُردو شاعری مصنفہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ادب اردو میں ایک لاجواب تصنیف کا اضافہ اردو شاعری کے نئے دور پر سیر حاصل تبصرہ فاضل مصنف ہندوستان کے تنقید نگاروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اس تصنیف میں جدید شاعری کے اسباب و علل اور محرکات اور اس کے بانیوں کے کلام و جذبات کا تذکرہ وسیع النظری سے کیا گیا ہے شاعری کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرکے اردو کے عروج کے متمنی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں جدید شاعری کے دلدادہ اور نئے رجحانات کے حامیوں کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف جو غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے تیسری دفعہ طبع ہوئی ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے۔

ماڈرن اُردو ڈکشنری مرتبہ صاحبزادہ عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری۔ اس لغت میں ہر حرف کے تحت تمام ضروری الفاظ درج کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں یہ کتاب انتہائی طور پر مستند اور مفید ہے عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بالعموم اور غریب طلبہ کے لئے بالخصوص یہ لغت ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

ضخامت ۵۵۲ صفحات مجلد تین روپے آٹھ آنے

ہمارا قائد قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن انکی قومی خدمات کے بعض پوشیدہ پہلو انگریزی کتاب مائی لیڈر کے فاضل مصنف زیڈ اے سلہری نے نہایت خوبی سے اجاگر کئے ہیں۔ ہمارا قائد اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس کو جہاں گرد صاحب نے نہایت قابلیت سے مزین کیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل تصنیف ہے قیمت مجلد عہ

کمال اتاترک مسیحائے ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں جس کی وجہ سے کمال اتاترک، موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اسوقت پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے قیمت مجلد عہ

بہترین اخلاقی افسانے

نیلوفر:۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ — عہ

قسمت:۔ دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے — عہ

صبر و ضبط:۔ معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ — عہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

ادارۂ آجکل

قارئین کرام گذشتہ چند اشاعتوں سے محسوس کررہے ہوں گے کہ ادارۂ آجکل میں غیر معمولی تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں بشیر احمد صاحب فلم سازی کی تعلیم کے سلسلے میں امریکہ تشریف لے گئے اور پھر راجیندر ناتھ صاحب شیدا کے چلے جانے کے بعد محترمی آغا محمد یعقوب صاحب دواشی بھی جو ادارۂ مطبوعات متحدہ میں ہندوستانی شعبے کے افسر اعلیٰ مقرر ہوگئے ہیں آجکل سے اسطرح الگ ہوگئے جیسے بوئے گل پھول سے جدا ہوجانے کے بعد بھی اس کے قریب ہی رہتی ہے یعنی اب اُردو آجکل ہی نہیں بلکہ ہندی آجکل دنیا اور فورن ریویو کا نظم و نسق ان کے سپرد ہوگیا ہے اور ان کی بجائے ادب اُردو کے مسلم نقاد جناب وقار عظیم صاحب ایم اے، جو عرصہ دراز تک "و۔ ع" کے قلمی نام سے صفحات آجکل میں نقد و نظر لکھتے رہے ہیں، باقاعدہ طور پر ادارہ میں مدیر اعلیٰ کی حیثیت سے شامل ہوگئے ہیں ہم یقین دلاتے ہیں کہ آغائے محترم جس خوبی کیساتھ چمنستان ادب سے رنگا رنگ پھول چن چن کر نت نئے گلدستے بناتے رہے ہیں وہ وقار صاحب کے عہد میں بدستور قائم رہیگی بلکہ زیادہ حسن نوازیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوگی:۔

فضل حق قریشی دہلوی

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

مضامین لطیفی پریس لمیٹڈ دہلی میں اور تصاویر کلکتہ آرٹ پریس دہلی میں چھپوا کر ادارۂ مطبوعات متحدہ نے پوسٹ بکس نمبر ۱۲۶ سے شائع کیا

شیشے پر نقاشی کا فن۔

شیشے پر نقاشی کا فن ان چند فنون لطیفہ میں سے ھے جو ایک بار مٹ جانے کے بعد دوبارہ زندہ ہوگئے۔ اس وقت برطانیہ کے بہت سے ماہرین فن وار میموریل کی کھڑکیوں میں پرانے شیشوں کی جگہ نئے شیشے لگانے میں مصروف ھیں۔ قدیم زمانے میں راہبوں نے اس ہنر کو پروان چڑھایا تھا۔ شروع میں اہل کلیسا اس فن کے سب سے بڑے قدردان تھے۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں جب اصلاح و ترقی کا
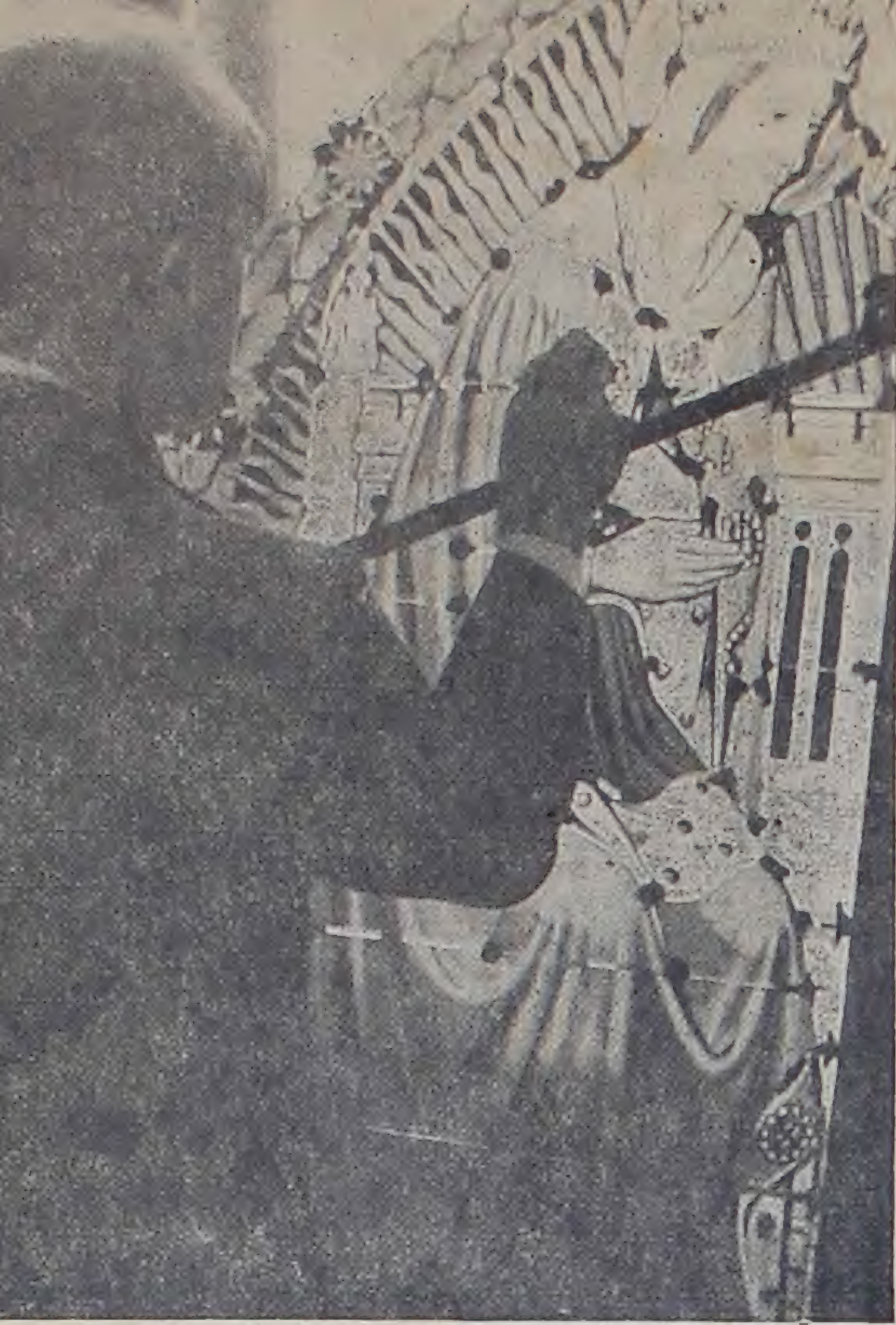
ایک ماہر فن وار میموریل کی ایک کھڑکی کے شیشے پر تصویر کے آخری نقوش مکمل کرنے میں مصروف ھے۔

دور دورہ ہوا تو اس قدیم صنعت پر پابندیاں عائد کردی گئیں۔ حتی کہ ۱۵۵۰ء میں جب انگلستان میں مینا کاری کا زور بندھا تو شیشے پر نقاشی کا فن بالکل معدوم ہوگیا۔ تاہم زمانے نے ایک بار پھر رنگ بدلا ھے اور اس قسم کی نقاشی کی وہ تمام خوبیاں جو کچھ عرصے پہلے ناممکن سمجھی جانے لگی تھیں اپنا جلوہ دکھانے لگی ھیں۔ مختلف رنگوں کا اتار چڑھاؤ اب پہلے سے بھی زیادہ نزاکت کے ساتھ اپنا نقش جمانے لگا ھے۔ بعض ایسے کمالات پیدا کئے گئے ھیں جو زمانۂ وسطی کے لوگوں کو بھی معلوم نہیں تھے۔

اس تصویر میں نقاشی کی ابتدائی منزلیں دکھائی گئی ھیں۔ دائیں طرف محض خطوط سے بنا ھوا ایک خاکہ ھے اس میں یہ بھی دکھایا گیا ھے کہ تصویر کو مکمل کرنے کیلئے مختلف رنگوں کے شیشے کس وضع کے کاٹے جائینگے۔ بائیں طرف نقش و نگار ایک حد تک مکمل ہو چکے ھیں۔

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ہے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی) (اردو - ہندی) (پشتو - روسی) (برمی - رومن اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)	-	ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں - ایک سو اسی صفحات - دو نقشے - کپڑے کی جلد - قیمت دو روپیہ (**بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں**) -

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) -

خاص رعایت «عربی - انگریزی جملے» نوے صفحات - گتے کی جلد - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ - کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ -

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد - قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) -

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ - پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ - دہلی

آج کل

"DAHR" NASRI

اتحادِ شوروی
چین
تبت
افغانستان
ایران
عراق
شام
ترکی
عربستان
نیپال
ہندوستان
برما

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایم اے' پی ایچ ڈی (برلن)

اس شمارے کے دو مقالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ صفحہ نمبر ۸ سے شروع ہونے والے مضمون میں شیخ الجامعہ کے حالات زندگی اور انکی تعلیمی سرگرمیوں پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ دوسرے مضمون میں جامعہ ملیہ اسلامیہ' دہلی کے تعلیمی نظم و نسق کا مکمل نقشہ کھینچا گیا ہے جو صفحہ ۱۷ سے شروع ہوتا ہے۔

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنی مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ۲؍

دلیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت ۲؍

ادلبستان

حضرت مولانا خلیقی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بینظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

تیسرا ایڈیشن قیمت ۲؍

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی۔ اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے۔ یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں۔ آج ہی آرڈر دیجئے نام ہی سے اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ نے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے (۳)۔

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولانا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تشریحاً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز روزہ و دیگر عبادات و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں۔ یہ آپ کو عالم و مفتی سے بےنیاز کر دے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے۔ کامل ۱۷ حصے۔

بلا جلد ——— مجلد

پچیس روپے ۲۵ ——— اکتیس ۳۱ روپے

معاشیات قومی

ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خان پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی، یہ کتاب فریڈرک لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسائل پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز اور تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہیئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں قیمت تین روپے

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کرینگے۔ کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو کس خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

ہمارے ہاں

اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف۔ حمائل، پنجسورے اور سیپارے شائع ہوتے ہیں۔

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اوراق پارینہ

از شیر جنگ۔ ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں ملکی حالات غریب مزدور و کسان کی تکالیف، معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے، محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱۸؍)

اُردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید ہلر رضوی اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد ۲؍

قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حقدار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم کیا گیا ہو۔ قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ فاضل مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔

(قیمت ایک روپیہ)

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ۔ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی درد سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کا اثر دیکھ کر انہیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تمحیص کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔

تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے

قیمت مجلد چھ روپے

ملنے کا پتہ: **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل** کشمیری بازار لاہور

"لکس
ٹائیلیٹ صابن ہی میرے
حُسن وجمال کا آسان طریقہ ہے"
مایا بینرجی کہتی ہے

میں لکس ٹائیلیٹ صابن کا بھرپور جھاگ تیار کرتی ہوں اور اسے اپنی جلد پر بلا ہمیت لگاتی ہوں۔

اس کے بعد میں صاف و ستھرے اور ٹھنڈے پانی سے دھو ڈالتی ہوں۔

آخر میں باہستگی اپنا چہرہ نرم تولئے سے خشک کرتی ہوں۔

LUX
TOILET SOAP

فلمی اسٹارس کا
حُسن بخش صابن

فلمی اسٹار اپنے کامل جلد کی قدر اس لئے نہیں کرتی کہ وہ اس کے دلکش خوبصورتی کا ایک جز ہے۔ بلکہ وہ اس کے زندگی کی ایک انمول پونجی بھی ہے ÷ اسی لئے ہندوستانی رہنما فلمی اسٹارس لکس ٹائیلیٹ صابن سے اپنے قیمتی حُسن کی حفاظت کرتی ہیں ÷ آپ خود اپنے مکان میں اس آسان طریقہ کو استعمال کرسکتے ہیں۔ اس کا ۳۰ دن کے لئے تجربہ حاصل کیجئے پھر آپ اسکے صاف کرنے والے و ترغیب دینے والے انجام سے خوش ہونگے۔

LTS. 137-23 UD
LEVER BROTHERS (INDIA) LIMITED

آجکل

باتصویر — اردو کا پندرہ روزہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ - نمبر ۱۱ | یکم نومبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

فہرست

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

نائب مدیر
فضل حق قریشی
دہلوی

ادارۂ مطبوعات متحدہ
پوسٹ بکس نمبر ۱۶۹ دہلی

رفتارِ زمانہ

ہندوستان اور مسئلۂ خوراک

وزیر اغذیہ کی تقریر

عبوری حکومت کے وزیر زراعت و اغذیہ، آنریبل ڈاکٹر راجندر پرشاد نے رانچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:۔ "جب تک میں حکومتِ ہند کا رکن ہوں، میں کسی قسم کے اناج کی قیمتوں میں کوئی اضافہ ہونے نہیں دونگا اور ان لوگوں کو جو زیادہ داموں پر بیچنے کے خیال سے اناج جمع کر رکھتے ہیں، زبردست مایوسی ہوگی۔" نیز مسئلۂ خوراک حل کرنے کے سلسلے میں ہر شخص سے اپیل کرتے ہوئے انھوں نے چار باتوں پر خاص طور سے زور دیا۔ (۱) اناجوں کی پیداوار میں اضافہ ہو، (۲) سرکاری تحصیلات کو کامیاب بنایا جائے (۳) چور بازار کو لازمی طور پر ختم کر دیا جائے۔ اور (۴)... جتنا کچھ بھی اناج دستیاب ہو، مساوی طور پر تقسیم کر دیا جائے۔ انھوں نے اس امر پر اظہارِ افسوس کیا کہ سرکاری تحصیلات کے سلسلے میں صوبہ بہار نے کوئی اچھی مثال پیش نہیں کی یعنی حکومت کو صرف ۳½ لاکھ من چاول اور دھان مل سکے۔

گاندھی جی کے مشورے

ہندوستان کے مسئلۂ خوراک پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے گاندھی جی نے "ہریجن" اخبار میں لکھا ہے: "ہندوستانیوں کو سمجھنا چاہیئے کہ ابھی تک باہر سے تو نام کی ہی خوراک ہندوستان میں آئی ہے۔ کئی دوسرے ملک مدد کرنا چاہتے ہیں، پر بہت کرکے وہ خود مصیبت میں ہیں، یا ان کے پاس اتنی مانگیں ہیں کہ وہ انھیں پورا نہیں کر سکتے...... اسلئے بیوہار بدھی (اچھی عقلمندی) یہی ہے کہ ہم کمر کس لیں اور ایک آواز سے اپنا ارادہ ظاہر کریں کہ ہم اپنی خوراک خود پیدا کرینگے اور ضرورت پڑی تو اس کوشش میں بہادری سے مر مٹیں گے۔ یہی ایک راستہ ہے دوسرا نہیں۔" اسی سلسلے میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "اس وقت تو ہندوستان کے سب ذمہ دار آدمی اگر اپنے اپنے صوبوں کو، ضلعوں کو اور ریاستوں کو صاف صاف کہدیں کہ خوراک کے لئے وہ دوسرے ملکوں کی طرف نہ دیکھیں۔ جتنا ہوسکے خود اُگا دیں، اور اپنی ہی اپج پر گذارہ کرنا سیکھیں، تو میرا کام ہوجائے۔ میرے پاس بہت سے بھروسے لائق لوگوں کے خط آرہے ہیں۔ اگر وہ اصلی حالت کے سوچک (بتانے والے) ہوں، جیسا کہ انھیں ہونا چاہیئے، تو ہمیں بھوکوں مرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ شاکاہاریوں کے لئے جیون دینے والی سبزیاں اور تھوڑا سا دودھ اور مانساہاریوں کے لئے مچھلی گوشت وغیرہ بس ہونگے۔"

سمندر پار ملکوں سے

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں کے پاس جو کچھ اناج بچ رہتا ہے، اسمیں سے وہ ہندوستان کی مدد برابر کر رہے ہیں۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے اس امداد و تعاون کی نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اقسامِ اناج	۲۶ ستمبر کو ختم ہونیوالے ہفتے میں	یکم جنوری ۱۹۴۶ء سے ۲۶ ستمبر تک کل مقدار
گیہوں	۴۲,۰۰۰ ٹن	۸,۹۰,۰۰۰ ٹن
چاول	۲۳,۵۰۰ ٹن	۱,۹۶,۰۰۰ ٹن
مکئی	۱۹,۵۰۰ ٹن	۱,۴۲,۸۰۰ ٹن
جوار، باجرہ وغیرہ	۵,۷۰۰ ٹن	۳۶,۰۰۰ ٹن

پیرس کانفرنس کے مصارف

یورپ بھر میں امن و عافیت قائم کرانے کے سلسلے میں جو کانفرنس پیرس میں ہورہی تھی، وہ بارہ ہفتے قائم رہنے کے بعد بخیر و خوبی ۶ اکتوبر کی شام کو ختم ہوگئی۔ اس میں ان چار بڑے اتحادی ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے تھے۔ امریکہ، برطانیہ، روس اور فرانس۔ اس کانفرنس کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ حکومتِ فرانس کو اس سلسلے میں زبردست مصارف برداشت کرنے پڑے۔ کُل رقم کا اندازہ ۲,۸۳,۸۵۰ پونڈ کے قریب ہے۔ گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف اشیائے خوراک، قوتِ برقی اور پٹرول وغیرہ پر ۱,۲۴,۲۵۰ پونڈ خرچ ہوئے۔ اس کانفرنس کے دفتری نظام کے سلسلے میں جو عملہ رکھا گیا تھا، اسمیں ۱۲۰۴ اشخاص ملازم تھے۔ ان کی تنخواہیں ۵۹,۰۰۰ پونڈ کے قریب ہوئیں۔ ۲۰۶ سرکاری موٹروں کے لئے ۴۴,۴۶۴ گیلن پٹرول خریدا گیا۔ کاغذ کے ایک کروڑ بڑے تاؤ، جن کا

مجموعی وزن تقریباً ایکہزار چارسومن تھا، اس سلسلے میں کام آیا۔ کاغذ کی زیادہ مقدار روزانہ کی کارروائیوں کی نقلیں چھاپنے میں خرچ ہوئی۔ کارروائیوں میں تمام سندوں کی اصل تقریریں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ "ذاتی اخراجات" کے ضمن میں ان ملازموں، خدمتگاروں اور باورچیوں کی تنخواہیں درج ہیں جو قصر ہمبرگ کے شراب خانوں اور قہوہ خانوں میں کام کرتے تھے۔ ۳۲۸ موٹر ڈرائیور، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے ۵۰ اکارکن، ۴۰ و اسیکوریٹی ایجنٹ اور بے شمار مترجم و ناشران کے علاوہ ہیں۔

صدر جمہوریہ چین

کومنتانگ کی مرکزی مجلس انتظامیہ کے ۱۰ اکتوبر والے اجلاس میں صدر جمہوریہ چین کا انتخاب عمل میں آیا۔ جنرلیسمو چیانگ کائی شیک کی شخصیت انکی سیاسی سرگرمیوں اور پرخلوص ہمدردیوں کے باعث اتنی اہم اور ہردلعزیز ہوگئی ہے کہ ان کے سوا کسی اور کو منتخب نہ کیا جاسکا۔ ان کا عہدہ تین سال کے لئے تھا جسکی معیاد ۹ اکتوبر کو ختم ہوگئی۔ آئندہ کے لئے کوئی خاص مدت مقرر نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اسکا سلسلہ اسوقت تک قائم رکھا جائے جب تک کہ مجلس ملی نئے دستور کے مطابق نئے صدر کا انتخاب نہ کرے۔ مجلس ملی حال ہی میں ایک نیا دستور اپنے ملک کے لئے وضع کرنے والی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ اس کے ماتحت عمل میں آنے والے انتخابات میں بھی چیانگ کائی شیک کا مدمقابل کوئی نہ ہو اور ایکبار پھر انہی کو جمہوریہ چین کا صدر مقرر کیا جائے۔

چینی تہواروں کی تجدید

چین کے بہت بڑے مشرقی حصہ پر جاپانی تسلط ہو جانے کے باعث وہاں کی سماجی زندگی کا شیرازہ بالکل بکھر گیا تھا۔ خصوصاً تہواروں کی دلچسپیاں یکسر مفقود ہوگئی تھیں۔ تاہم جاپان کی سپر اندازی کے بعد اب پہلی بار نئے جوش و خروش کے ساتھ انکی تجدید کی جارہی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو منعقد ہونے والا تہوار منایا جائیگا۔ اس تہوار کو آسمان پر رہنے والی جلاہے کی لڑکی، ویگا، سے قریبی تعلق ہے۔ یہ دریائے فلک یعنی کہکشاں کے ایک طرف بیٹھی چرخہ کاتتی رہتی ہے اور صرف ساتویں مہینے کی ساتویں تاریخ کو اپنے محبوب سے ملنے کے لئے دریا کے پل کو عبور کرتی ہے جسے بہت سے راج ہنس ملکر اپنے بازوؤں سے تیار کرتے ہیں۔ عام عقیدہ ہے کہ یہ دیوی نسوانی ہنروں کی سرپرستی کرتی ہے۔ چنانچہ نوجوان لڑکیاں اس کی پوجا کرتی اور اسپر بھینٹ چڑھاتی ہیں۔ دوسرا تہوار سات دن بعد منایا جاتا ہے۔ اسے مسلمانوں کے تہوار "شب برات" سے ایک حد تک مشابہ کیا جاسکتا ہے۔ چینیوں کا عقیدہ ہے کہ اس تاریخ کو رات کے وقت مرے ہوئے بزرگوں کی روحیں "دوزخ" سے نکل کر اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے دنیا میں آتی ہیں۔ چنانچہ ان روحوں کے لئے بہت سی مٹھائیاں وغیرہ تیار کی جاتی ہیں۔ ہندوستان میں شب برات کے موقع پر آتشبازی چھوڑی جاتی ہے۔ چین کے لوگ اس رات لوبان سلگاتے اور سڑکوں پر پیسے برساتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔ ان تہواروں کی تجدید سے ثابت ہوتا ہے کہ چینی اپنی پرامن روایتی زندگی دوبارہ حاصل کررہے ہیں۔

برطانیہ میں ہندوستانی طلبا

"لندن مجلس" کے صدر مسٹر ذکریا نے جو بمبئی یونیورسٹی کی طرف سے علمی تحقیقات کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے ہیں، برطانیہ میں رہنے والے ہندوستانی طلبا کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا کہ آجکل قیام و طعام کی دشواریاں انہیں بُری طرح تنگ کررہی ہیں۔ لندن میں انکی کل تعداد تقریباً پانچسو ہے۔ چار یا پانچ ہوسٹل صرف ان کے لئے مخصوص ہیں لیکن وہاں ڈیڑھ سو سے زیادہ طلباء کے رہنے سہنے کا انتظام نہیں ہوسکتا۔ پھر ان ہوسٹلوں کی حالت بھی اسدرجہ خراب ہے کہ ان میں قیام کرنا دوبھر ہوجاتا ہے۔ باقی طلبا ادھر اُدھر کوششیں کرتے ہیں اور کوئی معقول قابل اطمینان جگہ نہیں ملتی۔ مسئلہ خوراک بھی بہت تکلیف دہ ثابت ہورہا ہے، کیونکہ کم مقدار میں مختلف قسم کی غذائیں ہندوستانی مزاج کے لئے موافق نہیں آتیں۔ اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ ہندوستان میں ایک طالب علم سو روپے خرچ کرکے خوب عیش کرسکتا ہے اور لندن میں چارسو میں بھی پوری نہیں پڑتی۔ چونکہ لندن میں کوئی اقامتی یونیورسٹی موجود نہیں ہے۔ اس لئے طلبا کو سماجی دلچسپیوں میں حصہ لینے کا کم موقعہ ملتا ہے۔ وہ لے دے کے ہندوستانی طلبا کے ساتھ ربط ضبط بڑھاتے ہیں۔ کیونکہ برطانیہ کے لوگ عموماً ان سے کوئی تعلق پیدا کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اس لئے ہر ہندوستانی طالب علم اپنی آمد سے روانگی تک ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے جہاں اسکی شخصیت کو پوری طرح نشوونما پانے کا موقع نہیں ملتا۔ مسٹر ذکریا نے یہ بھی بیان کیا کہ ہندوستانی طلبا کے برعکس دوسرے ملکوں کے طالب علم خصوصاً چینی، امریکی اور مصری بڑے اطمینان کی زندگی بسر کرتے ہیں کیونکہ ان کے لئے ایسی کلبیں بنی ہوئی ہیں جن کے مصارف ان کی حکومتوں کے سر ہیں۔ ان کلبوں میں دوسری قوموں کے لوگ آتے جاتے ہیں اور اسطرح دلچسپیاں حاصل ہونے کے علاوہ انکی معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مسٹر ذکریا نے آخر میں کہا کہ عبوری حکومت کے لئے اس سلسلے میں فوراً قدم اٹھانا ضروری ہے۔

سندھ کیلئے برق آبی

حکومت سندھ نے سکھر کے قریب نہر روہری کے دامن میں برق آبی کا ایک بہت بڑا اسٹیشن قائم کرنے کے لئے ایک نئی اسکیم مرتب کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ روپے منظور کئے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے نہر مذکور کو نئے

سے کرسے درست کیا جائیگا تاکہ پانی زیادہ سے زیادہ مقدار اور تیزی کے ساتھ موقعہ پر پہنچ سکا کرے۔ اس کام کے لئے ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے کی رقم علیحدہ منظور کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے مطابق دس ہزار کلوواٹ کا بجلی گھر تیار ہوگا جہاں سے سکھر، جیکب آباد اور لرکانہ نامی ضلعوں کے پچیس بڑے بڑے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں میں بجلی کا انتظام کیا جائیگا۔ ان کے علاوہ آس پاس کی چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں حسب ضرورت بجلی پہنچائی جائے گی۔ بجلی گھر کے قریب ہی تیل سے چلنے والا ایک انجن بھی لگایا جائے گا تاکہ اگر نہر میں پانی کی کمی پڑے یا کوئی اور خرابی پیدا ہو جائے تو وقت ضرورت اس سے کام چلا لیا جائے۔ نہر کی نئی تشکیل کا کام فوراً شروع ہو جائیگا۔ لیکن بجلی گھر کا انتظام اس کے بعد یعنی تقریباً ۱۹۴۸ء میں شروع ہوگا۔

نئے سکوں کی چند خصوصیات

اس سال ۲۲ مئی کو حکومت ہند نے ریزرو بنک کے منتظمین کو اختیار دیا تھا کہ وہ خالص نکل کی چونیاں اور اٹھنیاں ڈھال لیں۔ چنانچہ یہ نئے سکے کچھ عرصے سے ملک کے طول و عرض میں چلنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان سکوں کے اجراء سے ہندوستان کی تاریخ سکہ سازی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے فی الحال یہ سکے بڑے بڑے شہروں میں چل رہے ہیں لیکن بہت جلد چھوٹے دیہاتوں تک بھی پہنچ جائیں گے۔ دنیا میں پہلے پہل ۱۸۸۱ء میں خالص نکل کے سکے سوئٹزرلینڈ میں جاری ہوئے تھے۔ پھر فرانس، بلجیم، اٹلی، کینیڈا اور آسٹریا میں بھی ان کا رواج ہوگیا چنانچہ آج ہندوستان سمیت دنیا کے انیس ملکوں میں ایسے سکے چل رہے ہیں۔ نکل کے سکوں کی چند خصوصیات قابل ذکر ہیں۔ وہ معمولی آگ میں پگھل نہیں سکتے کیونکہ نکل ایک ایسی دھات ہے جسے گلانے کے لئے تقریباً ساڑھے چودہ سو سنٹی گریڈ درجہ حرارت کی ضرورت ہے۔ نکل میں مقناطیس کی طرف کھنچ جانے کی صلاحیت بھی موجود ہے اسی لئے اس کے سکوں کو مقناطیس کے ذریعہ آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر انہیں کسی دوسری دھات کا میل کر دیا جائے تو یہ خصوصیت زائل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ نئی قسم کی اکنی اور ادھنے کو جن میں نکل کے ساتھ کچھ تانبا بھی ملا ہوا ہے، اس طرح جانچنا مشکل ہے۔ ان سکوں کی چمک دمک عرصہ دراز تک قائم رہ سکتی ہے کیونکہ نکل پر زنگ نہیں لگتا۔ زیادہ سخت ہونے کے باعث نکل کے سکے کثرتِ استعمال سے گھس بھی نہیں سکتے۔ ان خصوصیات کے ہوتے ہوئے جعلی سکوں کا بننا تقریباً ناممکن ہے۔ ان سکوں کی آواز بھی نہیں ہوتی، اس لئے چٹکی لگانے کی بجائے ان کو مقناطیس کے ذریعہ جانچا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کے کناروں پر لکیریں نہیں ہیں کیونکہ جعلسازی کا امکان نہ ہونے کے باعث ان کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ان پر ایک طرف بادشاہ کی اور دوسری طرف شیر ببر کی تصویریں نقش ہیں۔ شیر یا کسی دوسرے جانور کی تصویر آج تک کسی ہندوستانی سکے پر نہیں بنائی گئی تھی یہ بھی ہمارے ملک کی تاریخ سکہ سازی میں پہلی اور اہم مثال ہے۔

ساحلی علاقوں کی غرقابی

سمندری موجوں کے تیز تھپیڑوں اور کھاری پانی کے اثرات سے ہر جگہ کے ساحلی علاقے کٹ کٹ کر سمندر کی تہ میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ کہیں اس غرقابی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے اور کہیں کم۔ کہا جاتا ہے کہ جبل الطارق کا ساحلی علاقہ بڑی تیزی کے ساتھ کٹتا ہے کیونکہ زمین کسیقدر نرم ہے اور موجیں اس کے برعکس بہت شدید طوفان برپا کئے رکھتی ہیں۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ سرزمین برطانیہ کا کچھ نہ کچھ ساحلی علاقہ بھی اسی سرعت اور تیزی کے ساتھ ہر سال نذر آب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ تمام ملک کے مقامی حکام نے پرزور الفاظ میں حکومت سے درخواست کی ہے کہ قومی مفاد کی خاطر سمندر سے بچاؤ کی مناسب تدابیر فوراً عمل میں لائی جائیں۔ مسٹر ہربرٹ موریسن نے ذاتی طور پر ایک علاقے کا معائنہ کیا جہاں ساحل کے کٹاؤ نے سڑکوں اور مکانوں کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ حکومت سے پانچ کروڑ پونڈ کی مدد مانگی گئی ہے تاکہ دیوار چین جیسی ایک طویل و عریض اور مستحکم دیوار ساحل کے ساتھ ساتھ اس طرح تعمیر کر دی جائے کہ وہ پشتے کا کام دے اور ساحل آئندہ کٹنے سے محفوظ رہے۔ طوفان خیز موجوں کا سب سے زیادہ تباہ کن اثر ضلع یورک شائر کے اطراف میں ہوتا رہا ہے جہاں گذشتہ تین سو سال کے عرصے میں ایسے رقبے کے تقریباً پندرہ قصبات سمندر کی نذر ہو گئے اور ابھی سلسلہ جاری ہے۔

سانحۂ ارتحال

بمبئی سے جناب عرش تیموری نے یہ افسوسناک خبر بھیجی ہے کہ ۲۹ ستمبر کی شام کو ان کے والد بزرگوار میرزا نظام شاہ، لبیب گورگانی کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ۔ مرحوم دلی کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے تھے۔ ایک ممتاز شاعر ہونے کے علاوہ خاندان تیموریہ کی چند باقیماندہ معزز ہستیوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اسوقت مرحوم کی عمر تقریباً ستر سال تھی۔ وہ سرطان جیسے موذی مرض میں آٹھ ماہ مبتلا رہنے کے بعد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ دریائے پدمیر کے کنارے ان کی آخری آرام گاہ بنائی گئی ہے۔ ان کی وفات سے اردو شاعری کو ایک صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔ دعا ہے کہ خدا ان کو غریق رحمت کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

غزل

نوح ناروی

ہونے کو ٹھکانے لاکھوں ہیں لیکن مرے قابل کوئی نہیں
مدفن کے علاوہ دنیا میں آرام کی منزل کوئی نہیں

انداز سے اک اک دل میں خوش اغماض سے خوش دل کوئی نہیں
جس قسم کی تیری محفل ہے اس قسم کی محفل کوئی نہیں

نازاں ہو تم اپنی صورت پر دعویٰ ہے بہت یکتائی کا
یہ شمع یہ گل یہ آئینہ کیا مدِ مقابل کوئی نہیں

غمزوں کی طرف بھی دھیان کرو عشووں کی طرف بھی غور کرو
اتنے تو ہمارے قاتل ہیں تم کہتے ہو قاتل کوئی نہیں

ہم کس پہ اثر ڈالیں اپنا آدابِ وفا سے دو ہیں سب
جو درد بھرے کا درد سنے یوں درد بھرا دل کوئی نہیں

کیا نجد کے صحرا میں جا کر دل اہلِ جنوں کا بہلے گا
محمل تو ہزاروں ہیں اب بھی ہاں لیلیٰ محمل کوئی نہیں

جو عشق و وفا میں جھیل سکے یہ جوش یہ ہمت کس میں ہے
دل ہو کہ جگر ہو کوئی ہو غم سہنے کے قابل کوئی نہیں

بدلی بھی اٹھی بارش بھی ہوئی شیشے بھی کھلے ساغر بھی چلے
ہشیار سب اپنے کام سے ہیں میخانے میں غافل کوئی نہیں

برمایا جگر کو ناوک نے زخمی کیا دل کو خنجر نے
لیکن ہے مرے قاتل کا گماں دونوں میں سے بسمل کوئی نہیں

اے حسن نکل آ خلوت سے توقیر بڑھائے جلوت کی
محفل میں سب اہلِ محفل ہیں رونق دہِ محفل کوئی نہیں

میں ترکِ وفا کا قصد کروں وہ ترکِ جفا پر مائل ہو
یہ سب سے زیادہ مشکل ہے جیسی یہ ہے مشکل کوئی نہیں

یارانِ جہاں کو دیکھ لیا اخلاص و وفا کو جانچ لیا
آرام کے ساتھی کتنے تھے تکلیف میں شامل کوئی نہیں

وہ مجھ سے خفا دل سے بھی خفا سب اپنے پرایوں سے بھی خفا
کیا عشق و وفا کی دنیا میں احسان کے قابل کوئی نہیں

کم بخت کی ہمت کو دیکھو آزارِ محبت کو دیکھو
اُس کا متمنی دل ہے مرا جس کا متحمل کوئی نہیں

وہ رنگِ محبت بوئے وفا وہ زخمِ ستم وہ داغِ الم
جتنے نظر آئے غنچہ و گل ان میں سے مرا دل کوئی نہیں

زندانِ محبت کے قیدی آزاد ہمیشہ رہتے ہیں
ممنونِ سلاسل ہو کر بھی پابندِ سلاسل کوئی نہیں

اے نوح ڈبو دیگا تم کو امواجِ محبت کا طوفاں
ہر بحر میں ساحل ہوتے ہیں اس بحر میں ساحل کوئی نہیں

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

ایک موقع پر مجھے ڈاکٹر ذاکر صاحب کے اعزاز میں تقریر کرنی پڑی۔ میں نے تھوڑی دیر تک یہ سوچا کہ ان پچیس تیس سال میں ڈاکٹر صاحب کی کونسی بات مجھے سب سے زیادہ ممتاز نظر آئی۔ فی الفور میرے ذہن میں یہ آیا کہ ذاکر صاحب نے طالب علمی کے زمانہ سے لیکر آج تک کوئی کام ایسا نہیں کیا جو دوسرے درجہ کا ہو۔ تیسرے درجہ کا تو سوال ہی نہیں۔

ذاکر صاحب علی گڑھ کے طالبعلم تھے، نان کوآپریشن میں وہاں سے علیحدہ ہوئے اور جرمنی چلے گئے، وہاں سے آکر جامعہ کا کام سنبھالا۔ جامعہ کو ذاکر صاحب نے کس حال میں پایا، کیسے نازک مواقع پر اس کو سنبھالا اور کس طرح اس کو سنوارا، اس زمانہ میں ان برادران کے ساتھیوں پر کیا گذری، اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ اسکا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔ کئی سال ہوئے دولت آصفیہ سے جامعہ کو گرانقدر مالی امداد ملی۔ ذاکر صاحب سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے مبارکباد دی۔ تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ رشید صاحب آج گیارہ سال بعد جامعہ کے اسٹاف کو پوری تنخواہ دی جاسکی۔ میں متحیر رہ گیا، میں نے کہا، ذاکر صاحب یہ واقعہ جامعہ کی تاریخ میں نہیں ہماری تمام قومی تحریکوں میں یاد رکھا جائیگا۔ جہاں ایسے کام کرنیوالے ہوں وہاں میرا گذر تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن کسی دن ریڈیو پر تقریر کرنے دہلی آیا تو دو رکعت نفل پڑھنے جامعہ نگر ضرور آؤں گا!

نان کوآپریشن کی زد میں علی گڑھ ہی کا ایک حصہ ٹوٹ کر جامعہ بنا۔ "چشم زلیخا" کو "نور دیدۂ یعقوب" ہی روشن کئے ہوئے ہے۔ اس زمانہ کے بیشتر بہترین طالب علم بھی علی گڑھ سے نکلکر جامعہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن جامعہ کو موجودہ شکل، حیثیت اور شہرت دینے کا سہرا تمامتر ذاکر صاحب اور ان کے بے لوث رفقا کے سر ہے۔

ذاکر صاحب نے سب سے الگ ہو کر لیکن سب کے لئے جامعہ کی بنیاد ڈالی، محنت سہی، بے لبسی دیکھی، گالیاں سنیں، رسوائی اٹھائی، انتظار جھیلا، لیکن منہ نہ موڑا مسکرانے سے باز نہ آئے، دشمن سے نہ ڈرے نہ اسے دھتکارا، اس نے مانگا تو دیدیا، اس نے چرالیا تو جانے دیا۔ خود سہتے رہے، جامعہ کو سپرنہ بنایا، اسکو صرف سنوارا۔ وہ انتظار کرنے سے گھبرائے نہیں اسلئے کہ اچھے اور بڑے کام کرنے میں انتظار کی منزل سرے سے مفقود ہوتی ہے، انجام کا ڈر نہیں ہوتا۔ کام و انجام ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ انجام یا انعام کا جویا وہ ہوتا ہے جس کو اپنے کام پر نہ ایمان ہو نہ اطمینان۔ سب سے بڑا اور سب سے اچھا انعام وہ ہے جو ہم خود اپنے آپکو دے سکیں نہ وہ جو دوسرے سے ملے!

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ جامعہ کا پروگرام لمبا ہے، اسکے نتائج دیر میں برآمد ہونگے ملک کے حالات اس کے مقتضی ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں جلد سے جلد حصہ لیا جائے۔ اس سے جہاں اور فوائد ہیں، وہاں جامعہ کے کاموں کو بھی تقویت پہنچے گی۔ ملک و قوم کی حالت روز بروز دگرگوں ہو رہی ہو تو لمبے پروگرام کو اپنی توجہ و محنت کا تنہا مرکز بنانا مناسب نہیں۔

لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ سیاسی سرگرمیاں بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ ان میں صحت و استواری اسی وقت آتی ہے جب انکی آبیاری کے لئے ہمارے ذہنوں میں صاف اور شفاف پانی کے گہرے اور نہ سوکھنے والے سوتے ہوں۔ یہ سوتے تعلیم ہی سے منکشف بھی ہوتے ہیں اور پیدا بھی۔ بازاروں اور اخباروں میں قومیں بنتی نہیں بدنام ہوتی ہیں۔ تعلیم کو سیاست پر قربان کرنا تنگ نظری اور خود غرضی ہے۔ سیاست کو تعلیم کی باندی ہونا چاہیئے۔ تعلیم میں نتائج کی دیر سویر بے معنی سی بات ہے۔

ذاکر صاحب جامعہ کو ۲۵ سال سے چلا رہے ہیں۔ اس دوران میں جامعہ اور جامعہ میں کام کرنے والوں کو طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ دونوں پر مسلسل اور بے پناہ غیر شریفانہ حملے ہوئے۔ لیکن نہ یہاں کوئی اسٹرائک ہوئی، نہ کوئی بد دل ہوا۔ نہ جامعہ کو چھوڑ کر شہرت یا روزی کمانے کہیں اور گیا۔ یہاں ایسے لوگ بھی نہ تھے جن پر رزق اور موت کے دروازے بند رہے ہوں اور جامعہ کے علاوہ کہیں اور ٹھکانا نہ ہو بلکہ ان میں سے اکثر اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ایسی شہرت رکھتے تھے کہ ہندوستان کی بڑی سے بڑی یونیورسٹی میں انکی پذیرائی احترام کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ یہ صرف ذاکر صاحب کی بلند و برگزیدہ شخصیت تھی جس نے جامعہ کے تار و پود کو نہ صرف بکھرنے سے بچایا بلکہ اس کو مربوط و مستحکم کر دیا!

جامعہ کا ہر چھوٹا بڑا ہمہ وقت یہ دیکھتا تھا کہ وہ خود کیا ہے اور کیا کر رہا ہے اور ذاکر صاحب کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ سارا قضیہ اسی ترازو میں تل کر ختم ہو جاتا۔ ذہنی قابلیت میں جو شخص اپنے آپ کو بڑا سمجھتا تھا وہ ذاکر صاحب کی ذہنی قابلیت کے سامنے سر جھکا دیتا، اپنے ایثار، قربانی اور اخلاقی فضائل کا کسیکو خیال آتا تو وہ یہ پاتا کہ ان فضیلتوں میں بھی ترازو کا پلڑا ذاکر صاحب کی طرف جھکتا ہے۔ خاندانی شرافت و نجابت یا سوشل اور سرکاری تعلقات یا رسوخ پر کسی کو ناز ہوتا تو وہ یہ پاتا کہ ان کا سردار خاندانی اعتبار سے بھی زر خالص ہے اور اس کے تعلقات بھی زیادہ وقیع، زیادہ مستحکم اور زیادہ وسیع ہیں محنت کرنے اور فرائض سے عہدہ برا ہونے کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ ذاکر صاحب جیسا محنتِ شاقہ

رشید احمد صدیقی

کرنے والا اور اپنے فرائض پر آرام و تفریح کو قربان کر دینے والا حلقہ میں آن جیسا کوئی اور نہ تھا کسی کو اپنے ذوق ذہانت و فطانت کا دھیان ستاتا تو وہ دیکھتا، کہ اس وادی میں بھی امام ذاکر صاحب ہی ہیں۔ کلرک یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ کلرکی کرتے ہیں۔ چپراسی یہ پاتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ دوڑ دھوپ اٹھاتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ بچہ یہ دیکھتا کہ ذاکر صاحب جیسا بچہ کوئی نہیں ہے، جوان یہ محسوس کرتا کہ ذاکر صاحب اس سے زیادہ جوان ہیں، اور بوڑھا یہ جانتا کہ جب بڑھاپا ذاکر صاحب کے قریب جانے سے ڈرتا تھا تو پھر وہ بڑھاپے کو کیوں خاطر میں لائے!

ان کے علاوہ ہر شخص کا عقیدہ تھا کہ ذاکر صاحب دوسروں کے فائدہ کے لئے جان کھپاتے ہیں، اس کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد اور اس کی عزت و فراغت کو اپنی عزت و فراغت سمجھتے ہیں تو پھر کون ایسا ہو سکتا تھا جو ذاکر صاحب کو چھوڑ کر اپنے ضمیر کی سرزنش گوارا کرتا۔

ذاکر صاحب سے میرے تعلقات بڑے گہرے اور بڑے پرانے ہیں لیکن قومی زندگی میں میرا ان کا کبھی ساتھ نہ ہوا۔ وہ قلندر ہیں دنیا دار۔ انھوں نے زندگی کے جو مصائب اٹھائے ہیں ان کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی کے جن آستانوں پر میں نے سر جھکایا۔ ان آستانوں نے ذاکر صاحب کے سامنے پیہم سجدے کئے اور ٹھکرائے گئے۔ ذاکر صاحب مجھ سے تھوڑی سی بھی قربانی کرنے کو کہیں تو شاید میں نہ کر سکوں۔ ممکن ہے یہی سبب ہو کہ انھوں نے مجھ سے اس قسم کی فرمائش کبھی نہ کی۔ میں نے ان سے بڑی سے بڑی فرمائش کی اور انھوں نے ذرہ برابر ہچکچائے بغیر اسے پورا کر دیا۔ ایک واقعہ سنئے ۷۔۸ سال ہوئے ہوں گے۔ ایک دن صبح کو میں اور ذاکر صاحب ناشتہ کر کے کمرہ سے نکلے تھے کہ میرے دل میں اچانک خیال آیا۔ میں نے کہا ذاکر صاحب آپ فلاں صاحب سے صلح کیوں نہیں کر لیتے؟ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ ذاکر صاحب میری طرف دیکھکر مسکرائے اور فرمایا۔ سبحان اللہ کیا مصرعہ موزوں فرمایا ہے۔ آخر آپ کو سوجھی کیا؟ میں نے کہا اس کو کیا کیجئے، مجھے تو ایسی ہی سوجھتی ہے۔ کہنے لگے تو یہ کونسی بڑی بات ہے۔ آپ کہتے ہیں تو ہو جائیگا۔ میں نے کہا ابھی چلئے، مرشد تیار ہو گئے اور ہم دونوں وہاں پہنچے تو معلوم ہوا وہ صاحب موجود نہیں ہیں۔ بات آئی گئی ہوئی اور جہاں کی تہاں رہ گئی۔

یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جن صاحب سے میں صلح کرانے گیا تھا وہ ذاکر صاحب کے جب بھی سب سے بڑے دشمن تھے اور اب بھی ہیں!

جب کبھی اس واقعہ کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے لیکن ذاکر صاحب کی شرافت، وسعت قلب اور دوست نوازی پر نظر کرتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ذاکر صاحب کی بلند نظری، دردمندی اور وسعت قلب کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے مخالف بھی جب کبھی ان کی مدد کے خواستگار ہوئے تو انھوں نے نہ صرف بغیر پس و پیش کے بلکہ بڑے لطف اور خلوص سے انکی مدد کی۔ بنیادی تعلیمی کمیٹی رپورٹ کے سلسلہ میں ان کو جس سفاہت اور سفاکی سے رسوا کیا گیا وہ کوئی راز نہیں ہے اور کوئی قابل فخر کارنامہ بھی نہیں۔ اس رپورٹ کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کمال یار جنگ تعلیمی کمیٹی کی طرح ڈالی۔ جسکا کام اب تک ختم نہیں ہوا ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس زمانہ میں اس کمیٹی پر ایک نازک دور گذر رہا تھا، نواب کمال یار جنگ مرحوم جب کبھی دہلی آتے تو ذاکر صاحب سے ملتے اور کمیٹی کے کام کو حسن خاتمہ پر پہنچانے کی سبیل ذاکر صاحب سے دریافت کرتے اور اعانت کے طلبگار ہوتے تھے یہ رپورٹ جب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف منازل سے گذر کر صوبہ متحدہ کی حکومت میں پہنچی تو کانفرنس کی حمایت میں اور کانفرنس کے ہی نقطۂ نظر کو ذاکر صاحب نے وہاں کے ماہرین فن کے سامنے واضح کیا اور منوایا! میں نے کہا مرشد یہ کیا بات ہوئی تو فرمایا، ہوئی کیا! اغیار میں اپنوں کی رسوائی دیکھی نہیں جاتی۔

واردھا رپورٹ سب سے پہلے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پٹنہ کے اجلاس میں پیش ہوئی۔ ذاکر صاحب آنکھوں کی سخت اذیت میں مبتلا ہو کر بمبئی گئے ہوئے تھے، جہاں ان کی آنکھوں پر آپریشن کیا گیا تھا، ڈاکٹروں کی سخت ممانعت کے باوجود انھوں نے ایک صاحب کو خفیہ طور پر بلا کر اسی حالت میں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور طبیعت نڈھال تھی۔ ایک خط نواب صدر یار جنگ بہادر، سیکرٹری کانفرنس کو لکھوایا جسمیں انھوں نے کمیٹی کی بنیادی سفارشات کی اہمیت بڑی قابلیت، اور بڑے ہی درد سے جتائی تھی۔ یہ خط ذاکر صاحب کے خلوص، قابلیت، دلسوزی اور زور انشا پردازی کا بڑا نادر نمونہ ہے یہ خط عام نظروں کے سامنے آیا یا نہیں مجھے نہیں معلوم، لیکن میں نے اسے دیکھا ہے غور سے اور دیر تک پڑھا ہے اسکا آخری شعر یہ ہے ؎

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری ✤ مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

موقع کی اہمیت اور خود لکھنے والے کی حالت کا اندازہ کرتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال نے بھی کچھ ایسے ہی عالم میں بیٹھکر یہ شعر کہا ہوگا شاعری اور انشا پردازی میں بھی ایک مرحلہ آتا ہے۔ جب ع

ریحاں دمد از مینا، رامش چکد از قلقل!

یہ بات صنعت گری کے بس کی نہیں ہے۔ یہ تو اسی وقت آتی ہے جب نظر میں وسعت، فکر میں گہرائی، دل میں سچائی اور اخلاق میں پاکی ہو!

بنیادی تعلیمی اسکیم کی رپورٹ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں میرے ہی مکان پر ایک کمرہ میں بیٹھ کر شاید ایک ہفتہ کے اندر مرتب کر ڈالی۔ کمرہ بھی ایسا جو بیک وقت سونے، بیٹھنے، کھانے، لکھنے پڑھنے اور دند مچانے کا کام دیتا تھا۔ ہر طرح کے لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، کچھ دیر تک تعلیمی مسائل پر بحث رہی، اسی سلسلے میں کچھ دوست ملنے آ گئے تو ان سے خوش گپی ہونے لگی، کتابوں، رپورٹوں، فائل وغیرہ کا انبار ہے۔ کاغذات پھیلے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ کالج کے لوگ آ گئے تو ان سے تعلیمی مسائل پر بحث چھڑ گئی۔ کوئی خوانچہ والا آ گیا تو جو کچھ اس کے پاس رہا اسی سے شغل شروع کر دیا گیا۔ ڈاکٹر آ گئے تو امراض و علاج کے لطائف چھڑ گئے، شعر و شاعری کا شائق آ گیا تو شعر خوانی کی مجلس گرم ہو گئی، کوئی اچھا طالب علم آ نکلا تو اسی کے مضمون پر باتیں ہونے لگیں، غرض جو آیا اسی کے مذاق کے مطابق گپ ہونے لگی۔ اس تمام بحث مباحثہ میں ذاکر صاحب اس خلوص و خوبی سے حصہ لیتے جیسے تمام عمر اسی شغل میں زندگی بسر ہوئی ہے۔ جو آتا بہت کچھ سیکھ جاتا اور ایسا خوش ہوتا جیسے اس نے اس دن کوئی بڑا کام کیا تھا۔ ذرا مہلت ملتی تو پھر رپورٹ کی ترتیب شروع ہو جاتی۔ وہ ہر شخص کے سامنے اپنے خیالات اور نتائج پیش کرتے، اسکا مشورہ طلب کرتے۔ اپنی سمجھاتے، اس کی سنتے اور پھر آخری رائے قائم کرتے۔

ایک دن میں نے تنگ آ کر کہا مرشد یہ کہاں کا کھٹراگ پھیلایا، جب دیکھئے بچوں کی عمر، بچوں کے مشاغل، گلی ڈنڈے اور سوت کپاس کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ تمام دن خدائی خوار وں یا حق بخشوائے ہوئے لوگوں کا مجمع رہتا ہے۔ فرمایا، سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج اتفاق سے پنسل بنانے کے لئے کسی کے پاس چاقو نہ ملا ورنہ بقیہ مراحل بھی طے ہو جاتے۔ اب کل کوئی سبیل ایسی نکالئے کہ مجھے چند گھنٹے یکسوئی کے مل جائیں، سارا خاکہ ذہن میں ہے، رپورٹ مکمل ہو جائے گی۔

دوسرے دن میں نے اپنے پرانے مکان کے بالاخانہ پر ذاکر صاحب کو مقفل کر دیا۔ مقفل اس لئے نہیں کہ کوئی ملاقاتی بار نہ پائے بلکہ اسکا خطرہ تھا کہ خود مرشد نکل جائیں۔ ہوا وہی جسکا خطرہ تھا۔ صبح بالاخانہ پر مقفل ہوئے۔ دو گھنٹے گذرے ہوں گے۔ ایک صاحب ملنے آئے۔ نوکر نے کہا۔ ذاکر صاحب کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے نقد و جرح شروع کی۔ مرشد کے کان تک آواز پہنچی، روشن دان کچھ اونچا نہ تھا۔ اسٹول رکھکر غرفہ سے بولے ارے میں یہاں مقفل ہوں کنجی رشید صاحب کے پاس ہے، لیکن کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ اسبات کا پتہ لگا لائے۔" انھوں نے کہا، ہاں، رپورٹ نقل کرا لایا ہوں، فرمایا سنائیے، انھوں نے سنانا شروع کیا۔ میں یونیورسٹی سے آیا تو رومیو جولیٹ کا یہ ڈرامانظر آیا۔ میں نے کہا مرشد یہ کیا ہے، فرمایا ذرا ٹھہرئے گا، بس ایک منٹ۔ افسانہ ختم ہو گیا۔ میں نے بالاخانہ پر پہنچکر قفل کھولا۔ تو مرشد سارا کام ختم کئے ہوئے چاروں شانے چت کچھ گنگنا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو لیٹے ہی لیٹے ایک زقند بھری اور سرو قد کھڑے ہو گئے۔ فرمایا ذرا پانی پلوائیے۔ کام ختم ہو گیا، میں نے کہا یہ آپ کیا سن رہے تھے۔ کہنے لگے فلاں رپورٹ کا حوالہ دینا تھا۔ ایک جگہ شبہ ہوتا تھا، اس لئے ان صاحب سے کہا تھا کہ اصل رپورٹ دیکھ آئیں۔ انھوں نے جو سنایا تو اطمینان ہو گیا کہ جو یاد تھا وہ ٹھیک تھا۔ میں نے کہا اب تو جب تک آپکا قیام ہے کوئی زق زق نہ ہو گی، فرمایا ہرگز نہیں۔ میں نے کہا اللہ کا شکر ہے۔ آج ڈاکٹر اصغر کے ہاں چائے پی جائے تو کیسی رہے گی؟ کہا ضرور، ان سے بلی کا بچہ بھی لینا ہے، میں نے کہا بلی نے تو بچہ نہیں دیا ہے، کتے نے البتہ دیا ہے، کہنے لگے اسی کا سہی! سعیدہ (ذاکر صاحب کی بچی) کے لئے کچھ نہ کچھ لے جانا ضروری ہے۔ گھر پہنچنے پر دو ہی تو سوال کئے جاتے ہیں۔ بیوی کہتی ہے کیا کھویا اور سعیدہ پوچھتی ہے کیا لائے!

ذاکر صاحب کی تقریر و تحریر دونوں میں ایک خاص چیز ملتی ہے جو کہیں اور کم دیکھی گئی ہے۔ ماہرین طبیعات کا مدتوں خیال رہا کہ روشنی کی رفتار بخط مستقیم ہوتی ہے۔ بعد کی تحقیقات یہ ہے کہ اس کی رفتار بخط مستقیم نہیں بلکہ جست و خیز کے ساتھ ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی تحریر و تقریر دونوں میں یہ بات ملتی ہے۔ وہ مروجہ طریقوں سے کام نہیں لیتے بلکہ شروع سے آخر تک سامع یا قاری کی توجہ کو اپنے الفاظ اور خیالات کی تازگی و توانائی سے تب و تاب دیتے رہتے ہیں اور اس کے تصورات کو نہ تھکنے دیتے ہیں نہ دم لینے دیتے ہیں۔ الفاظ و عبارت میں صفائی، خیالات میں رفعت اور جذبات میں سچائی ہوتی ہے۔ کم لوگوں کی تحریر و تقریر حشو و زوائد یا بندھے ٹکے الفاظ و عبارت سے اتنی پاک ہوتی ہے جتنی کہ ذاکر صاحب کی۔ ان کی تقریر میں نہ خطابت ہوتی ہے نہ موعظت لیکن خطابت کا زور اور گرمی اور موعظت کی رقت و شائستگی بدرجہ اتم ملتی ہے۔ ذاکر صاحب تقریر کرتے ہیں تو مجھے پہاڑ کی فضا یاد آ جاتی ہے۔ پہاڑ ہی کا اوج، وزن و وقار۔ ان کی تقریر اس چشمہ کی مانند ہوتی ہے جو اپنی سبیل سفر کی ہر منزل میں شفاف، شادماں و شنگرف کار رہتا ہے لیکن جہاں کہیں

ذاکر صاحب نے ملک پر چھاتی ہوئی تاریک کہر اور ساتھیوں کے تذبذب یا تھکن کی طرف اشارہ کیا ہے، وہاں ان کا لہجہ دھیما اور حزیں ہو گیا ہے۔ الفاظ میں غم ہے لیکن پیغام میں وہی گرمی اور جگر تابی ہے جو ذاکر صاحب کی رگ رگ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔

ذاکر صاحب کی تقریر کا لطف اسوقت دوبالا ہو جاتا ہے جب حاضرین میں سے کوئی بڑا اور برخود غلط آدمی بے سمجھے بوجھے محض اپنی اہمیت جتانے کے لئے اعتراض کر دے۔ طالبعلمی کے زمانہ میں یونین میں ذاکر صاحب کی جوابی تقریر سننے کے لئے ہم سب خاص طور پر جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک سال وائس پریسیڈنٹ کے عہدہ کے لئے ذاکر صاحب بھی امیدوار تھے۔ سارے طلبا خواص و عوام کے نام سے دو گروہ میں منقسم ہو گئے تھے۔ ذاکر صاحب عوام کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے۔ ہر فریق کے امیدوار کے لئے ضروری تھا کہ وہ اپنی قابلیت و اہلیت جتانے کے لئے یونین میں تقریر کرے۔ چنانچہ ذاکر صاحب کو بھی بحث کے لئے عنوان دینا پڑا۔ مخالف جماعت نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ ذاکر صاحب کے لئے فلاں پروفیسر نے تقریر لکھدی ہے اور وہ اس کے رٹنے میں مصروف ہیں۔ مباحثہ کا وقت آیا۔ یونین میں تل رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ ذاکر صاحب کا نام لیا گیا اور ہال تالیوں اور سیٹیوں سے اسطرح گونج اٹھا جیسے ہوئے فدا در و دیوار در و دیوار! ذاکر صاحب داہنی طرف کے اسٹینڈ پر آئے اور بولے، میں نہایت ادب کے ساتھ لیکن ضابطہ سے اپنے موضوع بحث کو اس مجلس کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس بارہ میں جو کچھ عرض کرنا ہے وہ میں اپنی جوابی تقریر میں عرض کرونگا۔ فی الحال اتنا ہی عرض کرنا ہے۔ یہ کہہ کر اپنی جگہ پر لوٹ آئے، لیکن فوراً ہی ایک اودھم مچ گیا۔ فریق مخالف نے خوب خوب پھبتیاں کسیں۔ اور شور مچایا۔ یہ معلوم ہوا جیسے الکشن کے نتیجہ کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ ذاکر صاحب کے حامیوں کا یہ حال کہ کوئی غصہ میں کوئی مایوس ہو کر کوئی اپنے آپ پر نفریں کرتا ہوا اور کوئی ذاکر صاحب کو آنکھوں آنکھوں میں تناول کرتا مجمع سے جانے لگا۔ کچھ اس طور پر جم کے بیٹھ گئے گویا تو مار ڈالیں گے یا مر کے اٹھیں گے۔ مخالفین کی بن آئی تھی۔ اسدن صرف مخالفین نے تقریریں کیں اور جسکے دل میں جو آیا اس نے ذاکر صاحب اور ان کے حامیوں کو سنا ڈالا۔

جواب کا وقت آیا تو ذاکر صاحب پھر اسٹینڈ پر آئے۔ انکے موافقین بھی جو یونین کے باہر آس پاس چہ میگوئیوں میں مصروف اور کچھ بپھرے ہوئے دروازہ سے لگے کھڑے تھے۔ رفتہ رفتہ آگئے۔ ذاکر صاحب پر عالم کچھ ایسا طاری تھا کہ کسی نے تالی تک نہ بجائی۔ ذاکر صاحب نے کہا کہ موضوع بحث پر اب بھی میں کوئی تقریر نہ کروں گا، صرف مخالف تقریروں کا جواب دونگا۔ اسکے بعد انھوں نے ہر مخالف کے دلائل کے جواب دینے شروع کئے اور جہاں تہاں ان کے آداب محفل انداز و لہجہ پر فقرے بھی چست کرتے گئے۔ مجمع سے صدائے تحسین بلند ہونی شروع ہوئی۔ تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت بڑا شاعر اپنی بہترین نظم سنا رہا ہے جسکے ایک ایک شعر پر مجمع تلے اوپر ہو رہا ہے۔ تقریر ختم ہوئی رائے لی گئی تو سارا ہال موافقت میں کھڑا ہو گیا۔ صدر نے نتیجہ کا اعلان کیا۔ اب ذاکر صاحب کے موافقین کی بن آئی تھی۔ انہوں نے مخالفین کا پیچھا گھر تک نہ چھوڑا۔ پانی پت کی آخری لڑائی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو ایسی شکست دی کہ جنوبی ہند میں کوئی مرہٹہ خاندان ایسا نہ تھا جس کے ہاں صف ماتم نہ بچھ گئی ہو۔ یہی حال ذاکر صاحب کی تقریر اور ان کے کھنچے تلے برجستہ فقروں نے مخالفین کا کیا۔

مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک جلسہ میں سر سلیمان مرحوم صدر تھے۔ اراکین میں سے ایک صاحب اپنے آپ کو بڑا طباع اور یگانہ روزگار سمجھتے تھے اور ہر لمحہ اپنی نشست سے بیٹھے بیٹھے لوگوں پر فقرے چست کیا کرتے تھے اور کوشش یہ کرتے تھے کہ ان کی موجودگی میں کسی کی پیش نہ جائے۔ ذاکر صاحب نے ایک مسئلہ پر تقریر کی جس کو ہر شخص نے غور و احترام کے ساتھ سنا۔ بڑے سے بڑے مخالف مجمعوں میں بھی ذاکر صاحب کی تقریر ہمیشہ خاموشی اور احترام سے سنی گئی یہ امتیاز میں نے کم لوگوں میں پایا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی، وہ صاحب تلملا اٹھے اور فوراً اپنی نشست پر سے ایک پوائنٹ آف آرڈر رکیا جس میں تفاخر اور خودنمائی کی شان پورے طور پر جلوہ گر تھی، بولے، جناب والا نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ ذاکر صاحب نے ابھی جو تقریر کی ہے وہ بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کچھ اور ارشاد فرمانے والے ہی تھے کہ ذاکر صاحب نے اٹھکر فرمایا، جناب والا میں نے اپنی تقریر میں کہیں اسکا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ میری تقریر محترم ممبر کی سمجھ میں آئے گی۔ اسپر ایسا بے محابا قہقہہ پڑا کہ سر سلیمان مرحوم جیسے ثقہ آدمی جو ایسے مواقع پر اپنی طرف سے کبھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے بے اختیار ہنس پڑے اور معترض صاحب کچھ ایسے سٹ پٹائے کہ دوران مجلس میں صرف سکوت پر قانع رہے۔

کورٹ ہی کا ایک اور جلسہ بھی مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ اسمیں جو مسئلہ زیر بحث تھا وہ اسدرجہ اہم اور متنازعہ فیہ تھا کہ کورٹ کے باقتدار اراکین ہر گوشہ ملک سے شریک ہوئے تھے اور جو کچھ فیصلہ ہونے والا تھا اسمیں کہیں شک شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ فضا ایسی دگرگوں تھی کہ بڑے سے بڑے شخص کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ مخالفت میں تقریر کرنا تو درکنار مخالفت میں چپکے سے ہاتھ اٹھانے کی بھی ہمت کر سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہر طرف سنگینیں کھچی ہوئی ہیں جس نے قدم اٹھایا وہ جان سے گیا۔ معمولی ابتدائی کارروائی شروع ہو کر ختم ہوئی۔ تحریک پیش کرنیوالوں نے

ایسے اصحاب تھے جو قانونی قابلیت، قومی خدمات، ذاتی جاہ وحشمت ہر اعتبار سے قوم اور ملک میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ یہ مرحلہ بھی ختم ہوا اور وہ لمحہ آیا جب اس کی مخالفت میں کوئی کھڑا ہو۔ چند لمحے ایسا سناٹا رہا کہ ہر شخص اپنے قلب کی حرکت سن سکتا تھا۔ معرکہ میں پہلا قدم اٹھانے والا اور پھر پیچھے مڑکر دیکھنے والا ہی مرد کہلاتا ہے۔ ذاکر صاحب سب سے پیچھے کی نشست پر بیٹھے ہوئے تھے، اٹھے اور محض ایک جملہ کہہ کر بیٹھ گئے "یہ تحریک قانوناً پیش نہیں کی جاسکتی"! سارا مجمع مڑکر پیچھے دیکھنے لگا۔ قانون میں جن صاحب کا پایہ ہائی کورٹ تک مسلم تھا اور جو اس تحریک کے قانونی پشتیبان تھے، اکڑ کر بولے قانونی سقم کوئی نہیں ہے میں چیلنج کرتا ہوں! جلسہ میں جو لوگ بحث کرنے یا سمجھنے کے لئے نہیں بلکہ ہاتھ اٹھانے یا ادھم مچانے کے لئے آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں ان کی بن آئی۔ ذاکر صاحب نے ایک لفظ نہ کہا، بڑی مشکلوں کے بعد جب مجمع کو کسیقدر خاموش کیا گیا اور فاضل معترض نے اپنا چیلنج دہرایا تو ذاکر صاحب نے انکو ایک اور موقع کی یاد دلائی جب انھوں نے ایسے ہی ایک مسئلہ میں ذاکر صاحب کو چیلنج دیا تھا اور بعد میں اپنی غلطی تسلیم کی اور فرمایا ایسے مواقع پر چیلنج نہیں دیتے سوچتے ہیں۔ ذاکر صاحب نے اب ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنے اعتراض کی بڑی سنجیدگی لیکن وثوق اور دبدبہ کے ساتھ وضاحت کی۔ جلسہ کے مدبروں نے غور کیا تو ذاکر صاحب کا اعتراض صحیح نکلا۔ معترض نے اپنی غلطی تسلیم کرلی۔ ہال کے اندر بڑی دیر تک دوڑ دھوپ اور خفیہ سرگوشیاں ہوتی رہیں بالآخر ذاکر صاحب ہی کی مشورت سے مطالبہ کی نوعیت بدل گئی۔ اور کارروائی شروع ہوئی۔

ذاکر صاحب کے بارہ میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ ان کی اردو کی تقریر و تحریر بہتر ہوتی ہے یا انگریزی کی۔ طالب علمی کے زمانہ میں کالج میگزین میں رب کے نام سے وہ کالج کی زندگی پر بڑے دلکش مضامین لکھا کرتے تھے جنکا لوگ بڑے شوق سے انتظار کیا کرتے تھے۔ انگریزی کے بارہ میں ایکبار مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر مسٹر رمیز باشم نے کہا تھا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی انگریزی تحریر و تقریر بالخصوص انکی حاضر جوابی کا مقابلہ برطانوی پارلیمنٹ کے بہترین اراکین سے کیا جاسکتا ہے۔ علی گڑھ میں رہ کر اور اس سے باہر بھی میں نے انگریزی ہی کی اچھی تقریریں سنی ہیں، لیکن ہر طرح کے تکلفات سے قطعاً بری، رواں، جچی تلی، دلنشیں، فکر انگیز۔ انگریزی تقریریں نے ذاکر صاحب ہی سے سنی۔ انکی تقریر کا ایک جملہ بھی زائد از ضرورت نہیں ہوتا اور شروع سے آخر تک استوار، شریفانہ اور ہر فقرہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوتی ہے، آپ ان کے کسی فقرہ کے ابتدائی الفاظ سن کر یہ نہیں بتا سکیں گے کہ اس فقرہ کی یہ پرواخت ہوگی یا یوں ختم ہوگا۔ ہمیشہ وہ اسکو اس طرح ختم کرینگے کہ آپ متحیر بھی ہوں گے اور خوش بھی۔ عام تقریر کرنے والوں کی مانند وہ جسم کے کسی حصہ کو خاص طور پر جنبش یا جھٹکے نہ دینگے لیکن بحیثیت مجموعی آپ کو یہی محسوس ہوگا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس میں ان کے سارے جسم وجان کی کارفرمائی ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ اپنی تقریر سے اپنے گرد ویسی ہی فضا پیدا کرلیتے ہیں یا وہ خود ایک فضا ہیں جس سے ویسی ہی تقریر برآمد ہوتی ہے۔ ذاکر صاحب کی خاموشی دیکھکر اکثر ذہن غالب کے اس مصرعہ کیطرف منتقل ہوتے ہیں ع

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے!

غزل

اوج مقام دوست پہ اپنا گزر کہاں
شایان سدرہ طائر بے بال و پر کہاں

تو ہے خیال میں تو دل آرزو طلب
تیری نہ ہو نظر میں تو ذوق نظر کہاں

بیٹھے ہیں بے خودی میں سر منزل خراب
دنیا ہے ست خرابی جاں کی خبر کہاں؟

ہے جستجو تو ابتدائے شام سے قلمات کا سفر
ہوتی ہے دیکھئے شب غم کی سحر کہاں

تقدیر میں ہے ان کی فتار ہجر وہی
ہم بیکسوں کو بخت کی یاوری کا مقدر کہاں

موجود ہیں ہزاروں ہی ہنگامہ آرزو
عالم میں ہم سا بھی تو ہے دل آشنا مگر کہاں

مطلع ثانی

تزئین زلف، بارش رخ پر نظر کہاں
وہ عہد ذوق و شوق وہ شام و سحر کہاں

مدت ہوئی کہ ضبط تمنا سے شادماں
بیت کے جہاں میں طوفان رنگ و بو
باقی ہے بجز خیال رخ دوست یاد گار

لیکن نگاہ ناز کے قابل جگر کہاں
دن کی تھکن آئی ذکر وہ صبح و شام کے
وہ دل کی آہ سرد وہ اشک سحر کہاں
اے زندگی ابد کے بنا وہ نظر کہاں

فراق اسے شباب کا عالم وہ روز و بام
وہ جوش ابتدا ہی نہیں منظر کہاں

— تمکین چیمہ محروم

افسانہ

ایک خواب

مصنفہ جبران خلیل جبران

مترجمہ حبیب اشعر دہلوی

"دائی کاؤنٹس (س۔ل) کے نام، اس مکرمت نامہ کے جواب میں، جس سے انھوں نے مجھے سرفراز فرمایا۔"

جوانی میرے سامنے سے گذری اور میں اس کے پیچھے پیچھے ہولیا —— دور ایک کھیت میں پہنچکر وہ کھڑی ہوگئی اور بادلوں اور درختوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی —— ان بادلوں کو، جو خط شفق پر اس طرح رواں تھے گویا سفید بھیڑوں کا ایک ریوڑ ہے، اور ان درختوں کو، جو اپنی ننگی، بوچی شاخوں سے بلندی کی طرف اس طرح اشارہ کر رہے تھے گویا آسمان سے اپنے سرسبز پتوں کو واپس مانگ رہے ہیں۔

آخر میں نے پوچھا:۔ "جوانی! اسوقت ہم کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا:۔ "ہوشیار! کہ ہم حیرت کے سبزہ زاروں میں ہیں!"

میں نے کہا:۔ "چلو! واپس چلیں!! یہاں کی تنہائی مجھے دہلا رہی ہے اور ان بادلوں اور درختوں کا نظارہ میرے دل کو تکلیف پہنچا رہا ہے۔"

جواب ملا:۔ "صبر کرو! کہ حیرت، معرفت کا سرچشمہ ہے!!"

میں نے نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ ایک حور، سائے کی طرح، ہماری طرف آرہی ہے۔ میں متحیر ہو کر چلّایا: "یہ کون ہے؟"

جوانی نے جواب دیا: "ملپومین! جو جیٹر کی بیٹی اور غمگین کہانیوں کی دیوی[1] ہے!!"

میں نے کہا:۔ "غم والم کو مجھ سے کیا واسطہ؟ جبکہ اے نشاط افزا جوانی! تو میرے پہلو میں ہے!"

جوانی نے جواباً کہا:۔ "وہ تمھیں دنیا اور اس کے آلام ومصائب دکھانے آئی ہے اور جو شخص مصیبت والم کو نہیں دیکھتا، وہ فرحت وسرور سے ناآشنائے محض رہتا ہے۔"

حور نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھدیا اور جب ہٹایا، تو میں نے اپنے تئیں جوانی سے الگ اور مادّی لباس سے عاری پایا۔ میں نے اس کو پوچھا:۔ "اے دیوی کی لخت جگر! جوانی کہاں ہے؟"

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنے بازوؤں میں لپیٹ کر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر اڑا لے گئی۔ وہاں پہنچکر میں نے دیکھا کہ دنیا اور اس کی ہر چیز میرے سامنے صفحہ کی طرح کھلی رکھی ہے اور اس میں رہنے بسنے والوں کے راز تحریروں کی طرح میری نگاہ کے سامنے نمایاں ہیں۔ میں سہم کر اس حور کے پہلو میں کھڑا ہوگیا اور انسان کے بھیدوں پر غور وفکر اور زندگی کے اسرار ورموز کی تلاش وجستجو کرنے لگا۔ اسوقت جو کچھ میں نے دیکھا، کاش نہ دیکھتا!

—— میں نے دیکھا:۔ محبت اور نفرت انسان کے دل سے کھیل رہی ہیں۔ محبت اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کر رہی ہے اور اسے تسلیم ورضا کی شرارت سے مدہوش کر کے اسکی زبان کو مدح وستائش کے لئے کھول رہی ہے اور نفرت اسکی دشمنی کے جذبات کو بھڑکا رہی ہے اور اسے حقیقت کی طرف سے اندھا کر کے اس کے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک رہی ہے۔

—— میں نے دیکھا:۔ آبادی ایک بھک منگی عورت کی طرح، انسان کے دامن سے چمٹی بیٹھی ہے اور حسین وخوشگوار ویرانی دور کھڑی اسکی قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔

میں نے دیکھا:۔ پادری لومڑیوں کی طرح مکر وفریب کے جال بچھا کر لوگوں کو پھانس رہے ہیں اور جھوٹے واعظ اپنی حیلہ کاریوں سے ان کے روحانی میلانات پر چھاپے مار رہے ہیں اور انسان چیخ چیخ کر عقل وحکمت سے مدد مانگ رہا ہے، لیکن عقل وحکمت اس کی ایک نہیں سنتی بلکہ نفرت وغضب کے ساتھ اسے ٹھکرا رہی ہے۔ اس بنا پر کہ جب اس نے کھلے بندوں، ہر بازار، ہر گلی اور ہر کوچہ میں انسان کو پکارا، تو کسی نے اسکی آواز کو درخور اعتناد نہ سمجھا۔

میں نے دیکھا:۔ مذہبی اجارہ دار بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں لیکن ان کے دل حرص وطمع کی قبروں میں مدفون ہیں ——

---

[1] :۔ قدیم یونانیوں کے نزدیک فنون کی ۹ دیویاں (میوز) تھیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے ارادتمند کو اسکی محبت اور اہلیت کے مطابق اپنے عطیوں سے نوازتی تھی۔ ان دیویوں کی تفصیل یہ ہے:۔ (۱) ملپومین: غمگین کہانیوں کی دیوی —— (۲) یوٹمپیا:۔ شعر وغنا کی دیوی —— (۳) تھالیا:۔ ہزلیات کی دیوی —— (۴) کالیوپ:۔ فصاحت اور رجزیہ شاعری کی دیوی —— (۵) اراتو:۔ غزل اور عاشقانہ شاعری کی دیوی —— (۶) ترسکوری:۔ رقص کی دیوی —— (۷) اورانیا:۔ علم الفلک کی دیوی —— (۸) کلیو:۔ تاریخ کی دیوی —— (۹) اوتربی فن موسیقی کی دیوی۔

میں نے دیکھا:۔ نوجوان زبانوں سے محبت کے دعوے کر رہے ہیں اور اپنے بے قابو جذبات سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن ان کی "الوہیت" ان سے کوسوں دور ہے اور ان کے جذبات، محو خواب ——میں نے دیکھا:۔ خدا ذندانِ قانون مکرو فریب کے بازار میں اپنی چرب زبانی سے باقاعدہ تجارت کر رہے ہیں اور طبیبا وہ روح معتقدین کی روحوں سے کھیل رہے ہیں —میں نے دیکھا:۔ جاہل عقلمند کی صحبت میں مبتلا ہے اور اپنے ماضی کو عظمت و اقتدار کی بلندیوں پر پہنچا رہا ہے۔ اپنے حال کو بے فکری و فراخ دستی کی مسند کا تکیہ بنا رہا ہے اور اپنے مستقبل کے لئے شان و شوکت کا فرش بچھا رہا ہے۔ ——میں نے دیکھا:۔ مفلس و فاقہ کش بو رہے ہیں اور طاقتور و دولت مند انکی محنتوں سے مزے اڑا رہے ہیں اور اس ظلم کا نام لوگوں نے قانون رکھا ہے——میں نے دیکھا: تاریکی میں چوری کرنے والے عقل کے خزانوں کو لوٹ رہے ہیں اور روشنی کے چوکی دار سستی اور کاہلی کی چادر میں لپٹے پڑے سو رہے ہیں —— میں نے دیکھا:۔ عورت ایک رباب کی طرح اس مرد کے ہاتھ میں ہے، جو نہیں جانتا کہ تار پر مضراب کس طرح رکھی جاتی ہے، اسلئے جو نغمے اس سے نکلتے ہیں، ناپسندیدہ اور ناگوار ہوتے ہیں ——میں نے دیکھا:۔ نام نہاد شریفوں کی فوج نے موروثی شرافت کے شہر کا محاصرہ کر رکھا ہے اور اصل نسل شریف زادہ اپنی اقلیت و ناانصافی کی بنا پر ان کے مقابلہ میں پسپا ہو رہا ہے۔ —— میں نے دیکھا:۔ حقیقی آزادی تنہا بازاروں میں ماری ماری پھر رہی ہے وہ ہر دروازہ پر جاکر سر چھپانے کی جگہ چاہتی ہے لیکن لوگ اسے دھتکار دیتے ہیں۔ اسکے برخلاف رذالت و کمینگی ایک عظیم الشان جلوس کی شکل میں رواں ہے اور لوگ اسے "آزادی" کہہ رہے ہیں ——میں نے دیکھا:۔ مذہب کتاب کی تہوں میں دفن ہے اور وہم نے اس کی جگہ لے رکھی ہے ——میں نے دیکھا:۔ انسان نے بزدلی کو صبر کا لباس پہنا رکھا ہے، سہل پسندی کو استقلال کا لقب دے رکھا ہے اور خوف کو مہربانی کے نام سے موسوم کر رکھا ہے ——میں نے دیکھا:۔ تہذیب و شائستگی کے دسترخوان پر طفیلیئے قبضہ کئے بیٹھے ہیں اور حقیقی مہمان خاموش ہیں ——میں نے دیکھا:۔ مسرف و عیاش کے ہاتھ میں دولت، اسکی بدمعاشیوں کا جال ہے اور بخیل و کنجوس کے ہاتھ میں لوگوں کی بدبختی کا آلہ، لیکن عقلمند کا ہاتھ مال و دولت سے بالکل خالی ہے۔

جب یہ سب کچھ میں نے دیکھ لیا، تو اس منظر کی تاب نہ لاکر، شدتِ الم سے چلا اٹھا! اے دیوی کی نورِ نظر! کیا یہی دنیا ہے؟ کیا یہی انسان ہے؟"

ایک جراحت کار خاموشی کے ساتھ اس نے جواب دیا:" یہ کانٹوں اور کیڑوں سے پٹی ہوئی روح کی راہ ہے! یہ انسان کا سایہ ہے!! یہ رات ہے، جس کی صبح ہونے والی ہے!!!"

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھا اور جب ہٹایا تو میں نے دیکھا کہ میں اور شباب آہستہ آہستہ جا رہے ہیں اور امیدیں ہمارے سامنے ناچ رہی ہیں ✣

جیون اُلجھن

عبدالمجید بھٹی

جھُن جھُن —— جھُن جھُن
جھُن جھُن —— جھُن جھُن
بن گئی اپنے جیون کی دُھن
پریت کی رانی آئی
من کی اک اک آشا جاگی لے لے کر انگڑائی
پریت کی رانی آئی
آشاؤں کے دیپ جلاکر
اپنی پیاری چھب دکھلاکر
اک تھالی میں پھول سجاکر
اوٹ میں جا مُسکائی
پریت کی رانی آئی
اتنے میں اک من کا راجا آیا مکٹ سجائے
من مندر کے دیپ جلائے پریت کی جوت جگائے
پریت کی رانی بولی رادھے! چھم چھم کرکے آؤ
ان پھولوں سے مالا گوندھو راجا کو پہناؤ
جیون جوت جگاؤ
چھم سے آگے بڑھ کر جونہی گننے لگی میں پھول
من مندر کے دیپ بجھے جانے کچھ ہوگئی بھول
پریت کی رانی ——
من کے راجا ——
لوٹ کے پھر نہیں آئے۔
اس جیون میں کون اب آکر من کے دیپ جلائے
جیون، اُلجھن!
اب ہے یہی دُھن
جھُن جھُن —— جھُن جھُن
جھُن جھُن —— جھُن جھُن

جامعہ ملیہ اسلامیہ

دہلی سے کوئی سات میل جنوب مشرق کی طرف اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار سے تین میل آگے جمنا کے کنارے اوکھلا ایک چھوٹی سی بستی ہے ــــ کچے کچے بے حیثیت گھروں اور پرانی دھرانی جھونپڑیوں کی ایک بستی۔ اسی بستی کے سامنے سے سرکار نے ایک نہر نکالی ہے۔ نہر اور جمنا کے آس پاس کچھ سایہ دار درخت لگاکر اور لال بجری بچھاکر کسی خوش مذاق انجنیئر نے اس دور افتادہ جگہ کو خاصا خوش منظر بنا دیا ہے۔ اور شہری آبادی سے سات میل دور یہ ویران اور سنسان سی جگہ اب شہر والوں کی سیرگاہ ہے۔ صبح سے شام تک یہاں ہر طرح کے سیلانیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے ــــ امیر، غریب، بڈھے، جوان، ہندی، انگریز، امریکی، غرض ہر وہ شخص جو شہری ہنگاموں سے تھک ہار کر فطرت کی گود میں سکون کے کچھ لمحے گذارنا چاہتا ہے، یہاں آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ان آنے والوں کو لانے والی موٹریں، بسیں، سائیکلیں، گاڑیاں اور طرح طرح کی سواریاں اوکھلے کی اس سیرگاہ تک پہنچنے سے کوئی چار فرلانگ پہلے ایک ایسے حصے سے گذرتی ہیں جہاں ایک طرف دو بڑی بڑی شاندار عمارتیں ہیں۔ سفید گنبد والی باوقار، باعظمت عمارتیں، جو ہر آنے جانے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور ہر گذرتے ہوئے سیلانی کے دل میں کسی عظمت کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ دوسری طرف، اونچی نیچی، ناہموار پتھریلی زمینوں پر کچھ چھوٹے، کچھ بڑے دور دور بکھرے ہوئے، نئی وضع کے تھوڑے سے مکان ہیں ــــ ایسے مکان، جن کی سادگی میں بھی ایک رنگینی اور پرکاری ہے، زندگی سے دوری کے باوجود زندگی کا سارا استقلال اور ساری توانائی ــــ یہ اونچی اونچی باعظمت، باوقار، سفید گنبدوں والی شاندار عمارتیں جامعہ ملیّہ اسلامیہ کی ہیں اور اس کے دوسری طرف جامعہ کے استادوں کے مکان۔ جامعہ کی عمارتوں کو دیکھکر اس بلند مقصد کی تصویر سامنے آتی ہے جو جامعہ کے سامنے ہے، اور استادوں کے مکان دیکھکر اس سادگی اور سچائی کی جس کے بغیر کوئی مقصد، بلند نہیں بنتا، کسی آدرش میں جان نہیں پڑتی۔

جامعہ کی یہ شاہانہ عمارت ہمیشہ سے ایسی نہیں، ایسا بننے کے لئے اسے بڑے سخت اور کڑی آزمائشوں کے ۲۵ سالوں میں سے گذرنا پڑا ہے۔ جامعہ والوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں، ہر طرح کے دکھ جھیلے ہیں، جسمانی ذہنی اور روحانی اذیتیں اٹھائی ہیں۔ کڑی نظروں کے تیروں کا نشانہ بنے ہیں، بری باتیں سنی ہیں، ملامتیں برداشت کی ہیں ــــ اور ان ساری باتوں کے باوجود نظر کو بلندی کی طرف رکھا ہے، قدموں میں جھجک نہیں آنے دی۔ دل میں نیکی، دھیان کام کی طرف، اور قدم آگے کو بڑھتے ہوئے۔ یہ سب کچھ کرکے جامعہ کو جامعہ بنایا ہے ــــ اور ایسا بنا لیا ہے کہ اب اس کی گنتی ہندوستان کے، بلکہ دنیا کے اچھے تعلیمی اداروں میں ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں علی گڈھ میں پڑی تھی۔ گنتی کے چند آدمی اس کے ساتھ تھے۔ اور ان تھوڑے سے پڑھنے پڑھانے والوں کے پاس اپنا کام چلانے کے لئے کوئی عمارت نہ تھی۔ ایسی چھوٹے چھوٹے خیمے ڈیرے ہی ان کے گھر تھے، وہی ان کا دارالاقامہ، اور وہی ان کا مدرسہ۔ اسی سادگی سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد اور طالب علم اپنی اس ابتدائی منزل میں، قومی تعلیم کا کام خلوص اور سچائی سے انجام دیتے رہے۔ لیکن غلط فہمیوں نے علی گڈھ کی فضا کو کبھی جامعہ کے مقصد کے لئے سازگار نہ ہونے دیا، اور اس لئے ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاںؒ اسے دہلی لے آئے۔ دہلی میں قرولباغ کی کچھ عمارتیں کرائے پر لی گئیں اور جامعہ کا کام اسی خلوص، اور نیک نیتی سے چلنے لگا، جس سے وہ شروع ہوا تھا۔ جامعہ کو اس منزل میں قدم قدم پر کسی رہبر کامل کی ضرورت تھی۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کو اس سے بڑے بڑے اور بہت سے کام بھی تھے، اس لئے انتہائی ایثار اور خلوص کے باوجود وہ اپنا سارا وقت جامعہ کو نہیں دے سکتے تھے۔ اسی زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں یورپ سے واپس آئے اور جامعہ کا کام ان کے ہاتھوں میں آگیا، اور اسطرح جامعہ کو وہ رہبر کامل مل گیا جسکی اسے ضرورت تھی۔ جامعہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے آنے کے بعد کس کس طرح ترقی کی طرف قدم بڑھائے، اس کے راستے میں کیسے روڑے اٹکے۔ کیا کیا رکاوٹیں پیدا ہوئیں، شک، شبہے بدگمانیاں، بڑے سے بڑے الزام اور بڑی سے بڑی باتیں، لیکن ان سب کی کہانی بڑی لمبی ہے، اور کچھ ایسی خوشگوار بھی نہیں ــــ جو بری باتیں خود اندھیرے میں جا چکی ہیں انہیں اجالے میں لاکر دوسروں کو دکھانے میں، فائدہ کسی کا بھی نہیں، نقصان بہت سوں کا ہے۔ اسلئے گذری ہوئی باتوں کو چھوڑ کر صرف یہ دیکھیے کہ جامعہ اب کیا ہے۔ اس پچیس سال کے تجربہ کے بعد اس نے ملک اور قوم کو کیا دیا ہے ــــ اور جو کچھ دیا ہے اس میں کیا اچھا ہے، کتنا کام کا ہے۔

وقار عظیم

جامعہ ملیہ اسلامیہ ہر عمر کے ہندوستانی کے لئے تعلیم دینے کا ایک تجربہ ہے۔ یہاں چار برس کے تتلاتے ہوئے بچے سے لے کر اس بڈھے تک کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے، جس کے پوپلے منہ میں

زبان کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بالکل چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے جامعہ کی طرف سے دو ابتدائی مدرسے ہیں ——— ایک قرول باغ میں اور دوسرا جامعہ نگر میں (اوکھلے کا وہ حصہ جہاں جامعہ کی بستی ہے، جامعہ نگر کہلاتا ہے) قرول باغ میں شہر کے ہر حصّے کے بچّے ——— لڑکے اور لڑکیاں دونوں ——— پڑھنے آتے ہیں۔ جو قریب ہیں وہ پیدل اور جو دور ہیں وہ جامعہ کی لاری پر۔ یہ ابتدائی مدرسہ ساتویں جماعت تک ہے۔ اسی طرح کا دوسرا مدرسہ جامعہ نگر میں ہے لیکن وہ اقامتی ہے۔ وہاں پڑھنے والے بچے رہتے بھی وہیں ہیں۔ پڑھائی دونوں مدرسوں میں ایک ہی طریقہ کے مطابق ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ جامعہ نگر میں پڑھنے والے بچے چونکہ دن رات وہیں رہتے ہیں اس لئے ان کا پروگرام شہر والے بچوں کے مقابلہ میں زیادہ مکمل ہے۔ اگر آپ کبھی جامعہ نگر کے ابتدائی مدرسے میں جاکر رہیں تو آپ کو وہاں کا پروگرام کچھ اس طرح کا دکھائی دے گا۔ سورج نکلنے سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے چھوٹے چھوٹے بچے ایک ایک کرکے اٹھیں گے۔ اللہ رسول کا نام لے کر، اپنے بستروں کو صاف کریں گے۔ پھر ضروریات سے فارغ ہوکر وضو اور نماز۔ نماز کے بعد، اگر سردی ہے تو میدان میں کسرت اور گرمی ہے تو دریا میں پیراکی۔ اس کے بعد یہ بچے بورڈنگ واپس آتے ہیں، ناشتہ کا وقت آیا، ناشتہ کیا۔ اپنی جگہ پر آئے کتابیں درست کیں اور مدرسہ کی طرف چلنے لگے۔ جانے سے پہلے انھیں کے چنے ہوئے مانیٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور ان سے بازپرس کی ——— دانت کیوں میلے ہیں؟ بالوں میں تیل کیوں نہیں ڈالا؟ بٹن کیوں کھلا ہوا ہے؟ ٹوپی کہاں ہے؟ بازپرس کے بعد اصلاح اور اس کے بعد اسکول۔ پڑھائی شروع ہونے سے پہلے سب بچے میدان میں اکٹھے ہوئے، سب نے مل کر ترانہ پڑھا ——— لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری، خبریں سنیں اور اپنی اپنی جماعتوں میں چلے گئے۔

ان بچوں کی جماعتوں کا کام بھی دوسرے مدرسوں سے ذرا مختلف ہے۔ یہاں بھی دوسرے مدرسوں کی طرح زبان پڑھائی جاتی ہے، حساب سکھایا جاتا ہے، حرفہ اور جنرل سائنس کی تعلیم دی جاتی ہے لیکن ان میں سے ہر چیز کی بنیاد کسی پروجکٹ پر ہے ——— مثلاً بچوں کا بینک، بچوں کی دوکان دو مستقل چیزیں ہیں۔ بچے بینک کا سارا کام خود کرتے ہیں، لکھا پڑھی خط و کتابت، حساب کتاب، رجسٹر، کھاتے، چک بکیں۔ اس ننھے منے بینک میں سب کچھ وہی ہے جو ہمارے آپ کے بینک میں۔ اور اسی ننھے منے بینک کے کام سے بچہ سب کچھ سیکھتا ہے۔ زبان بھی، حساب بھی، حرفہ بھی۔ یہی حال دوکان کا ہے۔ پھر اس کے علاوہ بعض عارضی پروجکٹ بھی ہوتے رہتے ہیں اور انھیں بچے اپنا کام سمجھ کر کرتے ہیں اور اپنے اس کام کو کرکے وہ سب کچھ سیکھتے ہیں جو تعلیم سکھانا چاہتی ہے۔ جامعہ کی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم نہیں۔ صرف ذہن کی تربیت نہیں ——— وہ انسان کو انسان بننا سکھاتی ہے۔ انسان کو دنیا میں رہنا ہے۔ دنیا والوں کے ساتھ رہنا ہے اور اپنی آزادی اور دوسرے کے حق کو باقی رکھ کر رہنا ہے۔ انسان کی انفرادی زندگی، اجتماعی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اس لئے ہر فرد کی اپنی ذمہ داری ہے، اپنا کام ہے۔ اس میں کوتاہی کا نتیجہ اجتماعی زندگی پر پڑتا ہے۔ جامعہ کے بچے اپنی جماعتوں سے نکل کر اس طرح کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ہاسٹل کی زندگی میں وہ اپنے سارے کام خود کرتے ہیں خود اپنے لیڈر چنتے ہیں اور ان کے کہے پر چلتے ہیں۔ اپنا کام خود کرتے ہیں دوسرے کو اس کے کام میں مدد دیتے ہیں۔ کھانے کے وقت بزم ادب کے جلسوں میں، کتب خانوں کے انتظام میں، اپنے روزانہ اخبار کی ترتیب میں، اپنی پنچایت میں جامعہ کے یہ چھوٹے چھوٹے بچے، جس سلیقہ جس سوجھ بوجھ اور جس ذمہ داری اور انہماک سے کام لیتے ہیں اسے دیکھ کر ایک بے حد حسین اور جمیل مستقبل کی تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے ——— خدا نظر بد سے بچائے۔

جامعہ کے یہ چھوٹے بچے سال بھر ایک خاص طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اس زندگی میں انھیں جو مختلف طرح کے کام کرنے ہوتے ہیں ان میں ان کے لئے ایک ابدی سرور اور مسرت ہے ——— لیکن شہر سے اتنا دور رکھ کر کیا انھیں زندگی سے دور رہنا نہیں سکھایا جاتا؟ جامعہ والوں کے پاس اس کا بھی جواب ہے۔ انھوں نے جامعہ کی زندگی کو شہری زندگی کی ہلچل سے دور نہیں ہونے دیا۔ بچوں میں یہ احساس پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ دوسروں سے الگ کچھ ہیں۔ ہر سال یہاں محمد علی ٹرافی کے مقابلے ہوتے ہیں۔ کھیل، کود، اسکاوٹنگ، کیمپنگ، تقریر، تحریر، لطیفہ گوئی، ہنسی مذاق، ہر چیز کا مقابلہ کرنے کے لئے دور دور کے مدرسوں کے سیکڑوں بچے ہر سال جامعہ آتے ہیں۔ کئی دن وہاں رہتے ہیں۔ ہر طرح کے مقابلوں میں شریک ہوتے ہیں، ہارتے ہیں، جیتتے ہیں اور چلے جاتے ہیں اور جامعہ کے بچوں کے دل میں یہ احساس چھوڑ جاتے ہیں کہ زندگی ان کی اپنی زندگی سے باہر بھی دور تک پھیلی ہوئی ہے اور اس میں ہار جیت بھی ہے، خدمت گذاری بھی ہے، ایثار اور قربانی بھی اور فرض شناسی بھی۔

پھر جامعہ میں ہر سال بچوں کا میلہ ہوتا ہے۔ اس میلے کی بچے بہت دن پہلے سے تیاری کرتے ہیں۔ دکانیں لگاتے ہیں، اپنی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش کرتے ہیں۔ ڈرامہ کرتے ہیں اور یہ سب کچھ دیکھنے کے لئے ان کے بڑے بوڑھے دور دور سے آتے ہیں اور اس طرح جامعہ کی تعلیم میں یہ احساس جاری و ساری رہتا ہے کہ مدرسہ، سوسائٹی سے الگ کوئی چیز

نہیں — وہ اس سے الگ ہو کر کچھ بن ہی نہیں سکتا۔

* * *

اس خیال کو جامعہ نے کئی اور مختلف طریقوں سے بھی عملی جامہ پہنایا ہے اور اس سلسلے میں بے حد مفید کام کئے ہیں — مثلاً جامعہ کے قرول باغ والے بچوں کے مدرسے میں ایک حلقہ قائم ہوا ہے۔ شام کو قرول باغ کی بستی کے ہندو، مسلمان، سکھ — وہ سارے لوگ جو دن بھر کا کام کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو زندگی سے ہم آہنگ رکھنا چاہتے ہیں، یہاں آکر جمع ہوتے ہیں باتیں کرتے ہیں، اخبار پڑھتے ہیں، شعر و ادب پر، سیاست و معاشرت پر دوستانہ بحثیں کرتے ہیں، کھیل کود اور علم کے ہلکے پھلکے شغلوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اس طرح زندگی کو محض کاروباری یا کھوکھلا سمجھنے کے بجائے وہ اس میں لذت محسوس کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں، اس کے تنوع میں انھیں رنگینی اور معنویت دکھائی دیتی ہے۔

* * *

جامعہ کی تعلیم کا دوسرا حصہ مدرسہ ثانوی ہے۔ یہاں بھی تعلیم کے بنیادی اصول وہی ہیں جو مدرسہ ابتدائی میں۔ ابتدائی مدرسہ میں شہریت اور قومیت اور ان دونوں کی ذمہ داریوں کا جو احساس ایک ہلکے پھلکے انداز میں غیر محسوس طریقہ پر پیدا ہوتا ہے، اسکا انداز مدرسہ ثانوی میں آکر زیادہ واضح اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ مدرسے کے مضامین کی تعلیم کے سلسلے میں یہاں بھی دکان، بزم ادب، اسکاؤٹ، رسالے، اخبار یہ ساری چیزیں اور ان سے پیدا ہونے والے مختلف پروجکٹ درسی مضامین کی تعلیم کی بنیاد بنتے ہیں اور اپنی درسی تعلیم میں بھی طالب علم زندگی کے عملی پہلو کی طرف مائل اور اس کے احساس اور شعور سے پُر نظر آتے ہیں — مثلاً جب وہ سائنس کی کلاس میں جاتے ہیں تو اپنے کتابی سبق کے علاوہ، روزانہ کی ضرورتوں کی بہت سی اچھی اچھی چیزیں بناتے ہیں — مچھر مار تیل، کریم، منجن روشنائی، جام، جیلی اور مزے مزے کی چٹنیاں۔ اپنی اقامتی زندگی میں اور اس کے باہر جامعہ کی عام زندگی میں ہندوستان کے یہ آئندہ ہونے والے شہری عملی حیثیت سے اپنے آپ میں شہریت کا احساس پیدا کرتے ہیں اور شہری زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے سروں پر اٹھاتے ہیں — جامعہ کے انھیں بچوں نے آس پاس کی پتھریلی کنکریلی زمین کو کھود کر اسے ہموار کیا، اور جہاں سے چوپایوں کا گذرنا بھی آسان نہ تھا، وہاں سے اب موٹریں گذر سکتی ہیں۔ یہی بچے باری باری رات کو جامعہ کی آبادی کے گرد گشت کرتے اور پہرہ دیتے ہیں، اور یہی بچے ہر سال اوکھلے کی سیرگاہ میں چھ سات ڈوبتے ہوئے سیلانیوں کو موت کے منہ سے نکال کر لاتے ہیں اور اس طرح زندگی کی کشمکش میں داخل ہونے سے پہلے، زندگی کا وہ بلند منصب ان کے ذہنوں میں رچ بس جاتا ہے جس میں انسان دوسروں کی خدمت کو اپنا سب سے بڑا کام سمجھتا ہے — اپنے فرض کا احساس، دوسرے کے حق کی نگہبانی اور خدمت سے انسان کی زندگی کو بہتر بنانے کا کبھی نہ تھکنے والا جذبہ

* * *

جامعہ میں اس ثانوی مدرسہ کے بعد کالج ہے — یونیورسٹیوں کے عام کالجوں سے بالکل مختلف۔ یہاں طالب علموں کو انگریزی، اردو، تاریخ، سیاسیات اور معاشیات سب کچھ پڑھنی پڑتی ہے اور ان کے ذہنوں میں پختگی، ان کی فکر میں صفائی اور توانائی، اور ان کی زبان اور قلم میں اظہار کا جوش، اور ٹھیراؤ پیدا ہوتا ہے اور یہاں پڑھنے والے زندگی کو معصیبت نہیں، راحت سمجھ کر نکلتے ہیں۔ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ کرنا، اور اسے قدم قدم پر زیر کرنا ان کی سیرت میں داخل ہے۔

* * *

جامعہ کی ابتدائی تعلیم کا نہج بنیادی تعلیم کے اصولوں پر ہے۔ اسی اصول کے ماتحت اوکھلے کے گاؤں میں بچوں کا ایک مدرسہ کھولا گیا ہے اور اس سے ذرا فاصلہ پر ٹریننگ اسکول ہے، جہاں بنیادی مدرسوں میں پڑھانے والے استادوں کو عملی اور نظری تعلیم دی جاتی ہے۔

* * *

جامعہ نے اپنا کام چار برس کی عمر کے بچوں سے شروع کیا، اور انسانی زندگی کی ہر منزل کو نظر میں رکھ کر ہر عمر کے لوگوں کی تربیت اور اصلاح کو اپنا مقصد بنایا۔ قرول باغ میں جامعہ نے تعلیم بالغان کا شعبہ کھول رکھا ہے۔ تعلیم بالغان کے شعبہ نے اپنے کام کے دو حلقے کئے ہیں۔ ان میں سے ایک سے ایک مخصوص علاقہ کے باشندوں کو فائدہ ہوتا ہے اور دوسرے کا اثر اس علاقے سے باہر بھی دور دور پڑتا ہے۔ تعلیم بالغان والے ایک خاص علاقہ میں اپنا کام اس طرح شروع کرتے ہیں کہ پہلے اس علاقہ کی پوری مردم شماری کی۔ اور یہ دیکھا کہ ہر گھر میں کتنے مرد، کتنی عورتیں ہیں، ان کی تعلیمی حالت کیا ہے۔ اس جائزہ کے بعد اپنا کام شروع کیا۔ علاقہ میں ایک مرکز قائم کیا۔ اس مرکز میں ایک ریڈیو ہے، کچھ اخبار آتے ہیں۔ جو لوگ اخبار نہیں پڑھ سکتے ان کے لئے سرخیوں اور تصویروں سے ملا جلا کر ایک "وال پیپر" تیار کیا جاتا ہے۔ خبروں کا مطلب سمجھایا جاتا ہے، نقشے دکھائے جاتے ہیں۔ پھر ان آنے والوں میں سے جسکا جی چاہے اُسے پڑھایا جاتا ہے۔ عورتوں کو گھروں پر کتابیں پہنچائی جاتی ہیں — اور اس طرح اس علاقہ کی عام فضا میں علم کا شوق، زندگی کو جاننے اور اس سے قریب آنے کی خواہش فطری بن جاتی ہے۔ اس خواہش اور شوق کو پورا کرنے کے لئے جامعہ نے تین سو چھوٹے چھوٹے رسالے تیار کرنے کی

اسکیم بنائی ہے — ان رسالوں میں قصے کہانیاں، اچھی اچھی کتابوں کے خلاصے دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کی سوانح عمریاں ہر طرح کے اخلاقی، اصلاحی، مذہبی معاشرتی، تاریخی، سیاسی مسائل، زندگی کی بہت سی اور چھوٹی بڑی باتیں — غرض وہ سب کچھ ہے، جس سے علم کی بھوک تیز ہوتی ہے اور پھر اس بھوک کی تسکین کی خواہش، پھر بھوک، اور پھر اس کی تسکین کی خواہش کا شدید جذبہ — یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اس طرح کے سو سے زیادہ رسالے جامعہ نے تیار بھی کئے ہیں۔ اگر ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا ان رسالوں کو پڑھ سکے تو اسکی ذہنی تربیت کے لئے ہماری سیاست کو پھر کسی کاوش کی ضرورت نہیں۔

اس سے اگلی منزل وہ ہے جب انسان صرف اچھے علم کا شیدائی بنجاتا ہے۔ اچھے اچھے مصنفوں کی، اچھی اچھی کتابیں پڑھنا چاہتا ہے۔ اس کام کے لئے جامعہ میں "مکتبہ جامعہ" ہے — ایک ایسا ادارہ جس نے اردو کے ناشروں کو پبلشنگ کی وہ ساری روایات دیں، جن پر چل کر اب یہ ناشر اردو ادب کو حسن و جمال کا مرقع بنا رہے ہیں۔

جامعہ نے یہ سارا کام پچیس سال میں کیا ہے — بڑی بڑی مصیبتیں جھیل کر، دوسروں کی پابندیوں سے بچکر کہ اس طرح کہیں اس کے بلند مقصد میں فرق نہ آجائے — وہ بلند مقصد اب بھی جامعہ کے سامنے ہے، اب بھی اسکا قدم آگے کی طرف بڑھ رہا ہے، اس کے سامنے بعض ایسی اسکیمیں ہیں جن پر جلد ہی عمل شروع ہونے والا ہے — لڑکیوں کا ایک مدرسہ، ایک پالی ٹکنیک، ایک بچوں کا اسپتال۔ جامعہ نے ہمیشہ نئی راہوں کی جستجو کی ہے، ایسی راہیں جن پر چل کر زندگی پہلے سے بہتر بن سکے، انسان کو ایک ابدی سکون اور مسرت مل سکے — وہ علم اور خدمت کو اپنے لئے سب کچھ سمجھے۔ جامعہ نے ۲۵ سال کی مختصر مدت میں ہندوستانی آبادی کے ایک حصے کو روشنی دی ہے، اسے بیدار کیا ہے اور اب بھی اس کے ہر گوشے سے یہ آواز آرہی ہے — "جاگو اور جگاؤ" جامعہ نے خود جاگنے اور دوسروں کو جگانے کے جس جذبہ کی مشعل جلائی ہے، جی چاہتا ہے کہ وہ ہندوستان کے چپہ چپہ میں عام ہو جائے۔

آجکل

ہندوستان کے طول و عرض میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس غیر معمولی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کی اشاعت میں حیرت انگیز اضافہ ہو رہا ہے
آجکل کے صفحات میں اشتہارات دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے
منیجر۔ ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۱۶۶ دہلی

اختر شیرانی کے شاہکار

ہندوستان کے مشہور و معروف رومانوی شاعر حضرت اختر شیرانی کا بے نظیر کلام چار حصوں میں شائع ہو گیا ہے جب دنیا سوتی ہے شاعر سوچتا ہے۔ جب مزدور محنت کرتا ہے سرمایہ دار روپیہ کی جھنکار سے غریب کی عصمت لوٹنے پر فخر کرتا ہے۔ کسان خون پسینہ ایک کر کے دنیا کی قوت لایموت کا انتظام کرتا ہے تو شاعر ان مشاہدات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ مندرجہ ذیل تصنیفات انہی جذبات کی منہ بولتی تصویریں ہیں ایک ایک شعر کیف و سرور کا چھلکتا پیمانہ ہے۔

صبح بہار تین روپے **لالہ طور** تین روپے **اختر ستان** تین روپے **طیور آوارہ** تین روپے آٹھ آنے
عمدہ کاغذ۔ مضبوط جلد۔ دیدہ زیب گرد پوش

جدید اردو شاعری مصنفہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری
ادب اردو میں ایک لاجواب تصنیف کا اضافہ اردو شاعری کے نئے دور پر سیر حاصل تبصرہ فاضل مصنف ہندوستان کے تنقید نگاروں میں خاص درجہ رکھتے ہیں اس تصنیف میں جدید شاعری کے اسباب و علل اور محرکات اور اس کے بانیوں کے کلام و جذبات کا تذکرہ وسیع النظری سے کیا گیا ہے شاعری کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرنے کے اردو کے عروج کے متمنی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں جدید شاعری کے دلدادہ اور نئے رجحانات کے حامیوں کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف جو غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے تیسری دفعہ طبع ہوئی ہے۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنے

ماڈرن اردو ڈکشنری مرتبہ صاحبزادہ عبدالحکیم خان زرق۔ جالندھری
اس لغت میں ہر حرف کے تحت تمام ضروری الفاظ درج کئے گئے ہیں اور اسکے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں۔ یہ کتاب انتہائی طور پر مستند اور مفید ہے عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بالعموم اور غریب طلبہ کیلئے بالخصوص یہ لغت ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔
ضخامت ۵۲۵ صفحات مجلد تین روپے آٹھ آنے۔

ہمارا قائد قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن انکی قومی خدمات کے بعض پوشیدہ پہلو انگریزی کتاب نامی لیڈر کے فاضل مصنف زیڈ اے سلہری نے نہایت خوبی سے اجاگر کئے ہیں ہمارا قائد اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس کو جہان گرد صاحب نے نہایت قابلیت سے مزین کیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اصل تصنیف ہے۔ قیمت مجلد: دو روپے آٹھ آنے

کمال اتاترک مسیحائے ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں جس کی وجہ کمال اتاترک کی موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اس وقت پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ قیمت مجلد (۳ روپے)

بہترین اخلاقی افسانے نیلوفر۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ (۱/۴)
قسمت۔ دنیا کی کشمکش کی دلچسپ پاکیزہ افسانے (۱/۴)
صبر و ضبط۔ معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ — (۱/۴)

ملنے کا پتہ
شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

اُردو - ایک ترقی پسند زبان

مسعود حسین

ترقی پسندی کی اصطلاح ادب کے ساتھ کچھ اس طرح ناتھ دی گئی ہے کہ اسے علم کے کسی دوسرے شعبہ میں استعمال کرتے وقت تامل ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ترقی پسندی کی اصطلاح کا جتنا صحیح اطلاق زبان کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے دھارے پر ہو سکتا ہے ادب پر نہیں ہوتا۔ ادب پھر بھی فن ہے۔ وہ اجتماعی زندگی کی اتنی بڑی لہر نہیں جتنی کہ زبان!

زبان سماجی پیداوار ہونے کی حیثیت سے آگے بڑھتی اور پیچھے ہٹتی رہتی ہے۔ لیکن مجموعی لحاظ سے تاریخ انسان اور تاریخ زبان دونوں کا ڈھنگ ایک ہے۔ زبان کی ترقی پسندی میں وہ تمام فنی حرکات شامل ہیں جن سے زندگی کا آہنگ تیار ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک بڑھتی ہوئی لہر ہے جو اٹکتی ٹھٹکتی آگے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آریائی زبان کی تاریخ میں "دریا ہی کا سا پھیر" ہے۔ اس دریا کے بہاؤ پر بندھی باندھے گئے، اس کے رخ پھیرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن تاریخ اور زبان کا بہاؤ کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ یہ ارتقا کے چند کڑے اصولوں کے ماتحت ہوتا ہے جس میں ادب کے برعکس انفرادیت کا بالکل دخل نہیں۔

موجودہ زمانے میں ہند آریائی زبان کی سب سے نکھری ہوئی شکل اردو ہے، جس کی ابتدا کے متعلق اب تک کئی دلچسپ نظریے پیش کئے جا چکے ہیں۔ یہ نظریے دلچسپ زیادہ ہیں اور نظریے کم۔ اردو کو کبھی تو شاہجہاں کے اقبال سے منسوب کیا گیا ہے (سر سید) اور کبھی اکبر کے عہد سے (میر امن)۔ پروفیسر شیرانی نے اس بنا پر کہ فتح دہلی سے قبل مسلمان ڈیڑھ دو سو برس تک پنجاب میں قیام کر چکے تھے اسی سرزمین کو اردو کی جنم بھومی بتایا ہے۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی اسے کھینچ کر محمد بن قاسم کی فتح سندھ تک لے جاتے ہیں۔ لیکن ہند آریائی زبان کی تاریخ جاننے والا اس زبان کے تسلسل کی نشان دہی آریوں کے داخلۂ ہند (۱۵۰۰ ق-م) سے کرے گا۔ یہ زبان اس وقت بھی ہندوستان میں موجود تھی۔ البتہ نام اور روپ رنگ مختلف تھے۔ اسلئے اردو زبان کا جنم مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں ہوا بلکہ یہ کسی نہ کسی شکل میں قدیم زمانے سے جمنا کی وادی میں رائج تھی۔ جمنا کے نیلے دھارے کی طرح ہماری زبان کا دھارا بھی قدیم زمانے سے اس سرزمین میں بہہ رہا ہے جس کی ہر عہد اور زمانے میں سب سے بڑی خصوصیت یہی رہی ہے کہ اس نے ہر قسم کے ترقی پسند اثرات کو قبول کیا ہے۔ اسکو بارہا ادبی شکل میں روکنے اور جامد کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن ہمیشہ ناکامی ہوئی۔ انہیں ناکام کوششوں کو ہم منفی لسانی تحریکوں کا نام دے سکتے ہیں۔

اس قسم کی پہلی تحریک ۶۰۰ ق-م کے لگ بھگ ہوئی جب کہ اس کی ارتقائی شکل کو سنسکرت کی صورت میں مسخ کیا گیا۔ ایک ہزار برس کے (۱۵۰۰ ق-م تا ۵۰۰ ق م-) عرصے میں آریہ پشاور سے لیکر بنگال اور دکن تک پھیل چکے تھے اور غیر آریوں کے میل جول کی بنا پر عوام میں نئی نئی زبانیں پراکرتوں کی شکل میں پھوٹ نکلی تھیں۔ انہیں پراکرتوں کے چلن اور رواج سے خائف ہو کر پنڈتوں اور برہمنوں نے آریائی زبان کی روح کو زندہ رکھنے کے لئے زبان کو سنسکرت (صاف) کیا اور بعد کو یہی زبان کا نام قرار پایا۔ یہ حقیقت ہے کہ باوجودیکہ سنسکرت زبان کو "بھاشا" (بولی جانے والی زبان) کہا گیا ہے یہ کبھی بھی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ بدھ اور جین مت کے بانیوں نے اسی لئے عوام کی پراکرتوں کو اپنا کر انہیں ادبی مرتبہ بخشا۔ علمی اور ادبی حیثیت سے گو سنسکرت مسلمانوں کے عہد تک استعمال میں لائی جاتی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ہند آریائی زبان کا ایک مردہ بچہ تھا جو اس کے بطن سے پیدا ہوا۔

مسلمانوں کے داخلۂ ہند کے وقت ہماری زبان زندگی کے پچیس سو زینے چڑھ چکی تھی۔ اس ڈھائی ہزار برس میں اسے ہر قسم کی منفی تحریکوں کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن وہ تمام رکاوٹوں کو ہموار کرتی ہوئی اپنے فطری میلانات کے مطابق ترقی کرتی رہی جتنی کہ گیارہویں صدی میں مسلمان ایک نئی زبان اور نئے تمدن کو لئے سیلاب کی شکل میں ہندوستان کے اندر داخل ہوئے۔ اس بڑے الٹ پھیر سے زندگی اور زبان کا ایک نیا آہنگ تیار ہوا جس نے سلاطین مغلیہ کے عہد میں ایک مفید شکل بھی اختیار کر لی۔ دہلی کے آس پاس کی سانولی سلونی ایک نئے رنگ روپ میں سامنے آئی اور تھوڑے ہی عرصے میں رانی بن کر سارے ہندوستان پر راج کرنے لگی۔ اس کے بنتے ہی تمام رجعت پسندانہ لسانی رجحانات کا خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان چونکہ سنسکرت سے ناواقف تھے اسلئے اس کا طلسم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔ مختلف صوبائی بولیاں

موقعہ پاکر چمک اٹھیں جنکی سرپرستی وہاں کے مسلمان حاکموں نے قبول کی۔ بنگالی زبان کا ارتقا مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی ہی میں ہوا۔ سیاسی مرکز سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خسرو کی زبان دہلوی نے گجرات، دکن اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ادبی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ البتہ خود دہلی میں فارسیت کے غلبہ کی وجہ اسے ادبی حیثیت اختیار کرنے اور فارسی کی جگہ لینے میں چند سو سال کی دیر لگی۔ فارسی کا یہ چرچا جو سلاطین دہلی کے زیر سرپرستی شمالی ہند میں ہوا دوسری منفی لسانی تحریک تھی جس نے اردو کے ارتقا کو نقصان پہونچایا۔

دکن اور گجرات کے اجنبی ماحول میں اس کے برعکس یہ زبان خوب پھلی پھولی۔ دکنی زبان کی شکل میں شاید اس نے ترقی پسندی کا سب سے اونچا زینہ چھو لیا تھا۔ اگر قدیم دکنی کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں حسب ذیل ترقی پسند رجحانات ملیں گے جو شمالی ہند میں آکر رفتہ رفتہ زائل ہو جاتے ہیں۔

(۱) ہندوستان کی بنیادی زبان (دہلی کے آس پاس کی بولی) کے الفاظ کی کثرت (موجودہ اردو سے تقریباً بیس فی صدی زیادہ)

(۲) عربی فارسی الفاظ کو اپنی صوتیات پر ڈھال لینا (مثلاً نفع کی بجائے نفا وغیرہ)

(۳) اردو کی قواعد کو فارسی عربی کی قواعد پر ترجیح دیتے ہوئے ان زبانوں کے الفاظ اس پر ڈھالنا۔ اس میں اسماء اور افعال دونوں بکثرت مل جاتے ہیں۔

لیکن زبان کا یہ ڈول اور رکھنڈا عرصے تک نہ رہ پایا۔ دہلی والوں نے دکنی اور اس کے ادب کو "ایک بجر سی بات" سمجھا۔ چنانچہ ولی کے فوراً بعد ہی دہلی میں دکنی زبان کے خلاف سخت قسم کا ردعمل ہوتا ہے۔ اسے پہلی تحریک اصلاح زبان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاں تک متروکات کا تعلق ہے یہ ضرور ایک "مثبت لسانی تحریک" کی حیثیت رکھتی تھی۔ دکنی زبان جنوبی ہند کی زبانوں کے اجنبی ماحول میں جاکر کسی حد تک جامد ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس فارسی اور برج بھاشا کے باوجود دہلی کے بازاروں میں یہ تیزی سے ترقی کے مدارج طے کر رہی تھی۔ یہاں کے آس پاس کی بولی سے گہرا رشتہ ہونے کی وجہ سے اردو زبان کو ہر لحظہ نیا خون بھی پہونچتا رہتا تھا۔ لیکن اس تحریکِ اصلاح زبان نے اردو کو کسی حد تک نقصان بھی پہونچایا۔ ترک و اختیار دونوں میں غلو برتا گیا اور ایک طرف اگر فارسی کو بے جا طور پر جگہ دی گئی تو دوسری طرف ہندی کے اکثر الفاظ کو بلا وجہ نکال باہر کیا گیا۔ اس تحریک کا ایک پہلو یقیناً اردو کی ترقی میں ممد ثابت ہوا۔ سنسکرت کے اکثر تت سم (خالص) الفاظ جو خام مواد کی شکل قدیم زمانے میں دکن چلے گئے اور وہاں رائج تھے خارج ہو گئے اس میں سے بیشتر وہ تھے جنکی ارتقائی شکل شمالی ہند میں بدل چکی تھی۔

اردو کے ترقی پسند میلانات کو سب سے بڑی ٹھیس لکھنؤ اور وہاں کی تحریک اصلاح زبان نے پہونچائی جسطرح دکن والوں کی صدہا سال کی کوششوں کو دہلی والوں نے تباہ کر دیا تھا، دہلوی زبان کے رنگ روپ کو لکھنوی لسانی اثرات نے کسی حد تک مسخ کر دیا۔ ناسخ کی تحریک اصلاح زبان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل عناصر نظر آئیں گے:۔

(۱) دہلوی زبان کے "ٹھیٹھ" روپ سے انحراف۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ لکھنؤ اودھی (پوربی) زبان کے علاقے میں ہے۔ دہلی کے آس پاس کی بولی لکھنؤ کی اس اودھی بولی سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اودھی نے جس پراکرت کے بطن سے جنم لیا ہے وہ دہلی اور مغربی یوپی کی شورسینی پراکرت سے مختلف تھی۔ زبان کا صحیح خمیر اٹھانے میں لکھنؤ والوں کو کسی حد تک انہیں دقتوں کا سامنا تھا جو ملا وجہی اور قلی قطب شاہ کو دکن میں درپیش آئیں تھیں یہی وجہ ہے کہ شہر لکھنؤ کی زبان مضافات لکھنؤ کی زبان پر پوری طرح کبھی بھی حاوی نہ ہو سکی، اور نہ اودھی زبان اس کی رگوں میں تازہ خون پہونچا سکی۔ لکھنؤ کا روزمرہ اور محاورہ اسی لئے عرصے تک جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کا منہ تکتا رہا۔ ناسخ کے زمانے میں جاکر کہیں اہل لکھنؤ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور انہوں نے بعض الفاظ کو متروک قرار دیا۔ ان متروک الفاظ کی فہرست اٹھا کر دیکھئے معلوم ہو جائیگا کہ دہلی والے عوام سے قریب تر ہیں یا اہل لکھنؤ۔

(۲) لیکن لکھنؤ والوں کا ناقابل معافی جرم یہ تھا کہ انہوں نے فصاحت اور بلاغت کے نام پر اردو کو فارسی الفاظ اور تراکیب سے گراں بار کیا۔ دہلی کے ترقی پسند لسانی رجحانات نے غالب کا گلا گھونٹ دیا اور انہیں اپنی روش ترک کرنا پڑی۔ لیکن لکھنؤ نے زبان پر اپنا ٹھپہ اس طرح لگایا کہ وہ خالص شہری اور درباری زبان بن کر رہ گئی۔

لیکن اس عہد کی سب سے بڑی منفی لسانی تحریک جدید ہندی ہے جس کی داغ بیل انگریزوں کی حکمت عملی نے فورٹ ولیم کالج میں ڈالی تھی۔ جدید ہندی کی عمر کا اندازہ اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ اسکا پہلا بڑا شاعر تا حال بقید حیات ہے۔ للو لال جی اور فورٹ ولیم کے دوسرے پنڈتوں کو واضح طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ہندوؤں کے لئے ایک ایسی زبان تیار کریں جو ان تمام لسانی روایات کی حامل ہو جو انہیں عزیز ہیں۔ اس کے لئے ترکیب یہ نکالی گئی کہ عربی فارسی الفاظ نکال کر اردو کا جو ڈھانچہ باقی رہ جاتا تھا اس میں سنسکرت کے لفظ بٹھا دئے گئے۔ سنسکرت کے

ایجاد کی یہ تحریک ہمیں یاد رکھنا چاہیئے۔ بنگال کی سرزمین سے اٹھی تھی جہاں کی زبان پہلے ہی سے سنسکرت آمیز تھی۔ جدید ہندی کی تشکیل میں تجزیہ کرنے پر حسب ذیل عناصر ملیں گے۔ جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی منفی لسانی رجحان کا حامل ہوگا۔

(۱) عربی فارسی الفاظ سے اجتناب! خدا معاف کرے انشاء کی طبع ظریف کو جس نے رانی کیتکی کی مثال سامنے رکھکر ایک نئی راہ سجائی۔ شروع شروع میں صرف اصطلاحی اور ادبی الفاظ سے اجتناب کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ ہندی کے ادیب نے یہ التزام کر لیا کہ اردو کا عام مستعمل لفظ بھی ممکن ہو تو نہ آنے پائے۔ ہندی کی سب سے بڑی لغت "شبد ساگر" میں فارسی کے بے شمار الفاظ مل جائیں گے لیکن وہ بھی رفتہ رفتہ متروک ہوتے جا رہے ہیں۔

(۲) ہماری بنیادی زبان (کھڑی بولی) عالم تفصیل میں ہے۔ اسلئے بعض مطالب کے اظہار کے لئے اسے کسی نہ کسی ترکیبی زبان (فارسی یا سنسکرت) کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ہندی والے اپنا رشتہ صرف سنسکرت سے رکھنا چاہتے ہیں اور اس طرح سنسکرت کو بنیادی زبان مان کر بنگالی، گجراتی اور مرہٹی کے دوش بدوش ہونا چاہتے ہیں۔ یہ رجحان ایک بڑے تمدنی نقطۂ نظر کے برخلاف۔ سخت قسم کی تنگ نظری پر مبنی ہے۔

(۳) ہندی والوں کا سب سے بڑا "زبان کش" میلان سنسکرت کے تت سم (خالص) الفاظ کا استعمال ہے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے۔ صدیوں کے الٹ پھیر میں زبان کی صوتیات اور اس کی صرف و نحو بدلتی رہی ہیں۔ ہندی والے اس امتیاز سے زبان کو ڈھائی ہزار برس پیچھے گھسیٹنا چاہتے ہیں۔ زبان کے جس ارتقا کو ماہر لسانیات سنوارنے سے تعبیر کرتا ہے وہ اسے بگڑنا کہتے ہیں اور حتی الامکان زبان کی اس ترقی یافتہ شکل سے اجتناب کرتے ہیں۔ مثلاً

سنسکرت کا لفظ	اسکی ترقی یافتہ مروجہ شکل	جدید ہندی میں
چھایا	چھاؤں	چھایا
شرنگار	سنگھار	شرنگار
سوریہ	سورج	سوریہ
استمبھ	کھمبا	استمبھ
سینہ	سیج	سینہ
راتری	رات	راتری

غزل

تصور بھی فریاد کرنے نہ پائے — مدد اے محبت! وہ پھر یاد آئے
خلش بن کے جب آپ دل میں سمائے — تسلی کو آنکھوں میں آنسو بھر آئے
تیرا نام لیتا ہے دل چپکے چپکے — اکیلے میں جیسے کوئی گنگنائے
نہیں آج تک روٹھنا بھی نہ آیا — نگاہیں ملیں اور وہ مسکرائے
فریب محبت کی توہین ہے یہ — وہ دل کیا جو اک بار دھوکا نہ کھائے
میں فہرستِ آلام خود لکھ کے رکھ دوں — نہ جانے زمانہ کہاں چوک جائے

اسی سوچ میں اب تو رہتا ہوں دانش
مجھے ہو گیا کیا یہ بیٹھے بٹھائے

دانش

ہندی کی تشکیل کے اس اصول پر ہندی والے بڑی سختی سے کاربند ہیں۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

زبانوں کی موجودہ کشمکش میں اگر کوئی شخص یہ پوچھ بیٹھے کہ ترقی پسند زبان ہونے کی حیثیت سے اردو کے فطری میلانات کیا ہیں؟ اور کونسا ادیب ان پر عمل کر کے اپنے نقش کو ابدی بنا رہا ہے؟ تو اس کے جواب میں اس بولی طرف اشارہ کروں گا جو جدید ہندی اور اردو دونوں کی بنیاد ہے۔ اس کا اپنا لب ولہجہ اور محاورہ ہے۔ اسے بعض تاریخی انقلابات کی بنا پر کچھ بیرونی لسانی اثرات کو بھی قبول کرنا پڑا ہے۔ یہ بیرونی اثرات اب اس کے گوشت پوست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں بدیسی نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری زبان کے بڑھانے اور پھیلانے میں یہ اثرات مفید بھی ثابت ہوئے اسلئے شکرانہ کی جاہے نہ کہ رنجش کی۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ترقی پسند زبان وہی ہو سکتی ہے جسمیں مسلمانی تمدن کے نقوش مناسب حد تک ملیں۔ اور جو سنسکرت کے مصنوعی رجحان سے دبا کرے۔ اردو زبان کی خصوصیات شروع سے یہی رہی ہیں۔ انہیں کو لیکر وہ آج بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ انہیں کی بنا پر وہ آج بھی عوام اور بازار کی رانی بنی ہوئی ہے۔ اس کی جیت پروپیگنڈے اور دولت کے زور پر نہیں بلکہ لسانی ارتقا کے ان اصولوں کے بل پر ہوگی جو اٹل ہیں۔ یہ دو تمدنوں کا ایک مقدس سمجھوتہ تھی اس لئے ہماری دیانت اسی میں ہے کہ اپنی زبان کے صاف شفاف دھارے کو تعصب اور تنگ نظری سے گدلا نہ کریں، پھر دیکھیں الٹی گنگا کون بہا سکتا ہے؟

ہجومِ تجلّی سے معمور ہو کر

جگر کی شاعری کا روشن ترین پہلو

۲   ۲

قلب انسانی میں عشقِ حقیقی کے ساتھ ساتھ "طلبِ صادق" پیدا ہوتی ہے۔ صوفی انتہائے شوق میں "محبوبِ حقیقی" سے اس کے دیدار سے مشرف ہونے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ملتجی ہوتا ہے اور نہایت عاجزی اور انکساری سے اپنی سچی محبت اور عمیق آرزو کا یقین کامل دلانے کے لئے محبوب کو اپنی طرف متوجہ کرتا اور مختلف انداز گفتگو اختیار کرتا ہے۔ جگر نے تصوف کے اس پہلو کو بھی نہایت دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے اور جہاں کہیں گفتگو کا انداز "حریفانہ" اختیار کیا ہے وہاں لطافت شعری اور دلکشی کو چار چاند لگ گئے ہیں ؎

نہیں معلوم کہ کس وضع کے انساں ہونگے
جن پہ تیرِ ستمِ خاص کے ساماں ہونگے!

تیری حسرت کی قسم آپ اٹھائیں تو نقاب
میرا ذمہ ہے کہ جلوے نہ پریشاں ہونگے!!

کبھی کبھی انتہائی سپردگی اور تسلیم و رضا اختیار کرتے ہوئے محبوبِ حقیقی کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

میرا جو حال ہو سو ہو برقِ نظر گرائے جا
میں یونہی نالہ کش رہوں تو یونہی مسکرائے جا

لحظہ بہ لحظہ دمبدم جلوہ بجلوہ آئے جا
تشنۂ حسن ذات ہوں تشنہ لبی بڑھائے جا

اور ساتھ ہی ساتھ اپنی حرماں نصیبی سے مایوس نہ ہوتے ہوئے اپنے قلبِ مضطرب کو اس طرح تسکین دیتا ہے ؎

لطف سے ہے کہ قہر سے ہوگا کبھی تو روبرو
اس کا جہاں پتہ چلے شور وہیں مچائے جا

حسنِ طلب کی چند اور دلکش مثالیں ملاحظہ فرمایئے ؎

تری امانتِ غم کا تو حق ادا کر لوں
خدا کرے شبِ فرقت ابھی دراز رہے

جراحتیں دلِ بسمل کی روح تک پہونچیں
درازدستیٔ قاتل ابھی دراز رہے

تجھے نثار عطا کردہ ایک لطیف خلش
تمام عمر محبت کو جس پہ ناز رہے

مجھے چاہیئے وہی ساقیا جو چھلک چلے جو برس چلے
ترے حسنِ شیشہ بدست سے تری چشمِ بادہ بجام سے

مجھے خاک میں تو نہ یوں ملا ہوں اگرچہ میں ترا نقشِ پا
ترے جلوے جلوے کی ہے بقا مرے شوقِ نام بنام سے

اب نہ بال بھی دے ادائے شکر کے قابل مجھے
درد بخشا ہے اگر تو نے بجائے دل مجھے

پھونک دے اے غیرتِ سوزِ محبت پھونک دے
اب سمجھتی ہیں وہ نظریں رحم کے قابل مجھے

بات کہاں سے کہاں پہونچی۔ ذکر یہ تھا کہ جب تک اس عالمِ رنگ و بو کی تخلیق نہیں ہوئی تھی "حسنِ حقیقی" (جس کو "وجودِ حقیقی"، "وحدت الوجود"، "ذاتِ باری" اسماء سے بھی تعبیر کرتے ہیں) ہزار ہا پردوں میں مخفی تھا اور تمام اسماء اور اعیان اسی میں مستغرق تھے۔ اسی مقام کو "وحدت" کہتے ہیں۔ جب یہ وجودِ حقیقی تعینات کی طرف مائل ہوا تو وہ شے پیدا ہوئی جس کو ہم عالم یا کائنات کہتے ہیں۔ کسی شاعر نے لکھا ہے ؎

پہلے کچھ بھی نہ تھا یہ ارض و سما
جلوہ فرما تھا بس خدا ہی خدا

مالک الملک لاشریک لہٗ
وحدہٗ لا الٰہ الا ہو

اس نے چاہا کہ اب ظہور کروں
سب پہ ظاہر میں اپنا نور کروں

لہٰذا بقول جگر ؎

کن کہتے ہی جلووں کی یہ کثرت نظر آئی
اللہ کو اللہ کی صورت نظر آئی

پس معلوم ہوا کہ "کائنات" "خالقِ کائنات" سے علیحدہ نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی مستقل وجود ہے بلکہ یہ عالم ذاتِ باری تعالےٰ کے تمام اسماء وصفات کا مظہر ہے جو مرتبۂ غیب یا پردۂ وحدت سے نکل تعینات کی شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ تعینات عوام الناس کے لئے حجابِ نظر بن جاتے ہیں لیکن چشمِ بینا پر حقیقت آشکارا ہوئے بغیر نہیں رہتی ؎

بہارِ لالہ و گل شوخیٔ برق و شرر ہو کر
وہ آئے سامنے لیکن حجاباتِ نظر ہو کر

لطافت مانعِ نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکتا دل کا کہتا ہے وہ نکلے ہیں ادھر ہو کر

تمام تعینات میں افضل ترین انسان کا وجود ہے جو مظاہرِ صفاتِ باری میں سب سے اکمل ہے اس لئے اس کو "اشرف المخلوقات" کہا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی اس رفعتِ کمال پر خالق کو بھی ناز ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "فتبارک اللہ احسن الخالقین"۔ اس ضمن میں جگر کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تمہیں بھی خبر ہے جو تم کہہ گئے ہو؟!
خود اپنی اداؤں سے مسحور ہو کر!

تعینات کا دوسرا نام "مجاز" یا "کثرت" ہے۔ وحدت و کثرت، مجاز و حقیقت کے متعلق جگر نے خوب خوب لکھا ہے ؎

نظر فروز رہے سامعہ نواز رہے
رہے مجاز کہ وہ زینتِ حجاز رہے

کچھ اس طرح وہ پسِ پردۂ مجاز رہے
حجاب ساز میں جیسے صدائے ساز رہے

آشنا قیدِ مکاں سے کب ہی برقِ جمال
ذرّے ذرّے میں ہر دہ جو وادیٔ ایمن میں تھا

اکبر فاروقی مرادآبادی

جس رنگ میں دیکھو اسے وہ پردہ نشیں ہے

اور اس پہ یہ پردہ ہے کہ پردہ ہی نہیں ہے

ہر ایک مکاں میں کوئی اس طرح مکیں ہے

پوچھو تو کہیں بھی نہیں دیکھو تو یہیں ہے

وحدتِ خاص عشق میں ذکرِ بخبریت کا کیا

اپنے ہی جلوے دیکھئے اپنی ہی بزمِ ناز میں

قرآن مجید میں آیا ہے "نَحْنُ اَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ" (یعنی ہم تو تمہاری رگِ گلو سے بھی زیادہ قریب ہیں) ایک اور آیہ کریمہ ہے هُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ (یعنی حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو) جگر کہتا ہے ؎

ہر تڑپ کیساتھ اک جلوہ نمایاں ہوگیا	آج ثابت یار کا قربِ رگِ جاں ہوگیا
تجھی میں رہے مجھ سے مستور ہوکر	بہت پاس نکلے بہت دور ہوکر

سنتا ہوں کہ ہر حال میں وہ دل کے قریں ہے

جس حال میں میں ہوں مجھے افسوس نہیں ہے

اس طرح نہ ہوگا کوئی عاشق بھی تو پابند

آواز جہاں دو اسے وہ شوخ وہیں ہے

آنکھوں میں نور جسم میں بنکر وہ جاں رہے	یعنی ہمیں میں رہ کے وہ ہم سے نہاں رہے
ہر چند وقفِ کشمکشِ دو جہاں رہے	تم بھی ہمارے ساتھ رہے ہم جہاں رہے

دبستان تصوف میں پہلا سبق یہ ہے کہ صوفی ماسواء اللہ کے تمام موجودات کو اپنے قلب سے دور کر کے صرف "ذاتِ حقیقی" کا تصور کرے یہاں تک کہ حسنِ حقیقی کی کامل معرفت حاصل۔ دوسرے الفاظ میں صوفی ذاتِ حقیقی کو اپنی ذات میں مشاہدہ کرتا ہے۔ کلمۂ طیبہ کا پہلا حصہ یعنی لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ اسی تعلیم متبرکہ کا حامل ہے۔ اصطلاح صوفیہ میں لا الٰہ (کوئی معبود نہیں) کو نفی اور الا اللہ (سوائے اللہ کے) کو اثبات کہتے ہیں۔ نظیری کا ایک شعر ہے ؎

کے از موذن بشنوم توحید شرک آموز را

کو عشق تا بکیو نہم شرع خلاف انگیز را

کلمۂ توحید مشاہدۂ ذات کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ یہی مشاہدۂ ذات تکمیل کو پہونچکر "شاہد" کو "مشہود" سے واصل کر دیتا ہے اور من و تو کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اس منزل پر پہونچکر صوفی بادۂ وحدت سے سرشار ہو جاتا ہے اور اس کے لئے "شش جہت" کی حقیقت "ایک ٹوٹے ہوئے پیمانہ" سے زیادہ نہیں رہتی۔ وہ ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتا ہے جس کی لطافت کو بیان کرنا قریب قریب ناممکن ہو جاتا ہے ؎

کیا حسن کا افسانہ محدود ہو لفظوں میں (جگر) آنکھیں ہی کہیں اس کو انکھوں نے جو دیکھا ہو

صوفی منزل وحدت پر پہونچکر حسن حقیقی سے اس درجہ مسحور ہو جاتا ہے کہ حیرت اس کی زبان پر مہر سکوت لگا دیتی ہے لیکن اس کا رواں رواں شاہد مطلق کی حمد و ثنا میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کیفیت اور تحیر کو جگر نے کیسے دلکش انداز میں بیان کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

نظر سے حسن دو عالم گرا دیا تو نے!	نہ جانے کونسا عالم دکھا دیا تو نے!!
ہزار جانِ گرامی فدا بایں نسبت	کہ میری ذات سے اپنا پتا دیا تو نے!!

غیر اللہ کی پرستش کو شریعت اسلامیہ کفر کہتی ہے عشق حقیقی اور حسن حقیقی کو جس کا مفصل بیان عبارت بالا میں ہوا ہے پیش نظر رکھ کر جگر کا یہ شعر پڑھئے اور وجد کیجئے ؎

حسن ہے میرے سامنے حسن کے ماسوا نہیں

عشق میں مبتلا ہوں میں کفر میں مبتلا نہیں

مضمون ہذا غیر ضروری طور پر طویل ہو گیا ہے اس لئے جناب جگر کے چند اشعار اور پیش کر کے ختم کیا جاتا ہے۔

ارشاد باری ہے کہ لَا یَسَعُنِیْ اَرْضِیْ وَلَا سَمَاوِیْ اِلَّا یَسَعُنِیْ فِیْ قَلْبِ عَبْدِ الْمُؤْمِنِ یعنی میری وسعت نہ زمین میں ہے نہ آسمان میں ہے لیکن اگر ہے تو مومن کے دل میں ؎

وہ حقیقت کہ جو محدود حقیقت میں نہیں

دل کی وسعت میں ہے کونین کی وسعت میں نہیں

جو نہ کعبے میں ہے محدود نہ بتخانے میں!

ہائے وہ اور ایک اجڑے ہوئے کاشانے میں!!

تجھی میں ہے جگر ایک حسن معتبر پنہاں

بہار در بر و میخانہ در نظر پنہاں

بہت اشارۂ مبہم مگر لطیف ترین

ہزار ہا نگہ ملتفت مگر پنہاں

جگر کو درس حقیقت بہت نہ دے واعظ

وہ بے خبر تو بہ ظاہر ہے با خبر پنہاں

ضروری

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالے میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ —— (ادارہ)

ثمرات

آئی وہ منزلِ مراد ختم ہے راہِ امتحاں
حوصلہ بلند و تیز گام اے مری ملّتِ جواں

ہے مرے دستِ شوق میں ساغرِ مئے طرب فشاں
دور ہوئے غمِ جہاں، دور ہوئے غمِ جہاں

گرمیٔ عشق کے بغیر لطفِ حیات رائیگاں
عشق ہے زندگی کا روپ، عشق سے زندگی جواں

عرصۂ کائنات پر رحم خدائے دوجہاں
عرصۂ کائنات ہے صید گہِ درندگاں

ہائے وہ چند ساعتیں، گذریں جو تیرے قرب میں
رشک سے دیکھتی رہی جنکو حیاتِ جاوداں

اُف ری منازلِ بلند تیری حریمِ ناز کی
پائے طلب کو کتنے طے کرنے پڑے ہیں آسماں

برق کی دسترس سے دور، عصرِ نوی کے طیور
اور بلند آشیاں، اور بلند آشیاں

تند ہوائے انتشار، روئے زمیں ہے پُر غبار
گونج رہی ہے یہ پکار، آدمِ عصر ہے کہاں

گذری ہے جو نگاہ سے کیفیتِ چمن نہ پوچھ
مجھ پہ گراں ہے اِن دنوں لذتِ خوابِ آشیاں

گرمِ حصول جوئے شیر، ہاں یونہی مردِ تیشہ گیر
تیشہ زنی ہے دہر میں، اصلِ حیاتِ کامراں

لاکھ ہو یورشِ الم، لاکھ ہو بارشِ ستم
ذوقِ حیات کی قسم، پھر بھی رہونگا نغمہ خواں

مشقِ سخن سے دیجئے، شعر کو زینتِ دوام
خونِ جگر سے کھینچئے نقشِ بہارِ بے خزاں

محتسبِ شراب تو بزمِ جہاں میں ہیں بہت
یہ بھی کہو کہ ہے کوئی محتسبِ غمِ جہاں

جذبۂ ہمت اے نہال جب ہو مرا شریکِ حال
میرے لبوں پہ آئے کیوں، شکوۂ گردشِ زماں

نہال سیوہاروی

غزل

سوزشِ دل کا اثر یہ شبِ ہجراں ہو جائے
کہ ہر اک اشک مرا برقِ بداماں ہو جائے

چشمِ دل میں ترا وہ رنگ نمایاں ہو جائے
کانٹے کانٹے کو بھی دیکھوں تو گلستاں ہو جائے

آتشِ سوزِ جگر گر کہیں عریاں ہو جائے
تو ہر اک قطرۂ خوں شعلۂ رقصاں ہو جائے

اثر انداز جو کچھ سوزشِ پنہاں ہو جائے
شبِ غم نالۂ دل شعلۂ رقصاں ہو جائے

جلوہ بے پردہ جو اس بُت کا نمایاں ہو جائے
کافرِ عشق ہر اک گبر و مسلماں ہو جائے

نورِ جاں سے جو منور ہر اک ارماں ہو جائے
خانۂ دل میں مرے بزمِ چراغاں ہو جائے

دو طرح یوں ترا اک رنگ نمایاں ہو جائے
کہیں پیدا ترا جلوہ کہیں پنہاں ہو جائے

دعوتِ وعظ کا میخانہ میں ساماں ہو جائے
پھر تو واعظ بھی خدا کے لئے انساں ہو جائے

خونِ ارماں کا مرے رنگ جو مل جائے کہیں
گلِ خوشرنگ ترے تیر کا پیکاں ہو جائے

انگلیاں رکھتا ہوں پیشانی پہ یوں بہرِ سلام
سجدۂ سنگِ درِ بت نہ نمایاں ہو جائے

گلِ نظارہ ترے اتنے بکھر جائیں یہاں
کہ مجھے پھر گلۂ تنگیٔ داماں ہو جائے

سوزشِ دل میں کمی آنے لگی ہے شاید
اب ہر اک سانس مرا جنبشِ داماں ہو جائے

جا سکے دیدۂ دل میرا نہ چوری چوری
حرمِ ناز کا ایک اور نگہباں ہو جائے

سُن کے توحید میں اشعار ترے اے شیدا
چپ رہے گبر تو خاموش مسلماں ہو جائے

شیدا دہلوی

ماھرین اثریات

۱۰ ستمبر کو نئی دھلی میں محکمہ اثریات کی مرکزی مجلس مشاورت کا ایک جلسہ منعقد ھوا تھا۔ اس میں محکمے کے ڈائرکٹر جنرل مورٹیرو ھیلر نے اپنی تقریر میں ھڑپا اور موھنجودارو کے آثار قدیمہ کا حوالہ دیتے ھوئے ثابت کیا کہ عہد قدیم میں وادئ سندھ اور عراق کے رھنے والوں میں زبردست ثقافتی تعلقات قائم تھے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی بتایا کہ دونوں جگہ کے باشندے اپنے مردوں کو یکساں طریقے سے دفن کرتے اور اپنے شہروں کے گرد پختہ اینٹوں کی دیواریں بناتے تھے۔

جلسے میں سر ایس۔ رادھا کرشنن تقریر کر رھے ھیں۔

امن کانفرنس کے نمایندے

پیرس والی امن کانفرنس کے ھندوستانی نمائندوں کے اعزاز میں سر سیموئل رنگا نادھن نے ایک پرتکلف دعوت دی ۔ یہ تصویریں اسی موقعہ پر لی گئی تھیں۔

برطانیہ کے ناظم خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون سر راگھون پلائی اور سر سیموئل رنگانادھن کے درمیان تشریف فرما ھیں۔

برطانوی بحریہ کے پہلے لارڈ مسٹر اے وی الیگزنڈر دعوت ختم ھونے کے بعد ھندوستانی نمائندوں سے گفتگو کر رھے ھیں۔

ثقافتی جلسہ

حال ھی میں حیدرآباد کی عرب کلچرل ایسوسی ایشن کا ایک عام جلسہ ھوا جس میں ریاست کے علم دوست حضرات نے بھی شرکت کی۔ جلسے کی صدارت حیدرآباد کے مفتئ اعظم مولانا عبدالقادر بدایونی نے فرمائی جو تصویر کے بیچ میں رونق افروز ھیں۔

طاق بستان کا ایک حصہ۔ یہ ایران کی قدیم عظمت کا ایک روشن نمونہ ہے۔ یہ مضبوط عمارت کرمان شاہان کے قریب واقع ہے۔

ایران میں نقاشی کا ایک قدیم شاہکار

طاق بستان کے باہر محراب کے اوپر یہ دلکش نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ دو فرشتے تاج کی نگہبانی کر رہے ہیں۔ پچھلی دیوار دو حصوں میں منقسم ہے۔ نیچے کے حصے میں ایک زرہ پوش سوار ہے جس کے ہاتھ میں نیزہ ہے۔ اس دیوار پر نقاشی کا کام بہت اعلی اور نفیس ہے۔ اوپر کے حصے میں تین آدمی نظر آرہے ہیں جن کے بیچ میں بادشاہ ہے۔ اس کا ایک ہاتھ تلوار کے قبضے پر ہے۔ دونوں طرف شکار کے دو میدان ہیں۔ مغربی دیوار میں ایک بادشاہ کی تصویر ہے جو کشتی میں بیٹھا ہے اور ایک سؤر کو مار رہا ہے۔ ہاتھی شکار کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رقاصائیں ساز بجا رہی ہیں۔ ایک طرف کچھ آدمی شکار کئے ہوئے جانوروں کی کھال اتار رہے ہیں۔ دائیں طرف کی تصویر نامکمل ہے۔

وہ ہرنوں کی شکار گاہ کا منظر پیش کرتی ہے۔ بادشاہ گھوڑے پر سوار ہے۔ عورتیں دائیں طرف تخت پر بیٹھی ہیں۔ چھوٹے دالان کی تصویریں اہمیت کے لحاظ سے بڑے دالان کی تصویروں کے برابر نہیں ہیں۔ کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام بن شاپور بن نرسی کے عہد میں یہ عمارت تعمیر ہوئی تھی۔ اس دالان کے داہنی طرف کی دیوار کے نقش میں دکھایا گیا ہے کہ بادشاہ کسی قیدی کے سینے پر پیر رکھے کھڑا ہے۔ اس کے قریب کے میدانوں میں ساسانی زمانے کے ستونوں کے بالائی حصہ ملا ہے۔ اثریات کے ماہرین نے ان میدانوں میں باقاعدہ کھدائی نہیں کی ہے لیکن بارہا ہل چلانے اور زمین کھودنے کے دوران میں کسانوں کو ساسانی سکے مل جاتے ہیں۔

آسٹریلیا کی مشینیں اور زراعت

نیچے کی تصویر میں ایک مشین زمین کھود کر آلو نکال رہی ہے۔

لونگرنونگ (آسٹریلیا) کے زراعتی کالج کے طلبا کھیتوں میں ہل چلا کر گیہوں بو رہے ہیں۔ پیٹرول کی کمی کے باعث اب یہ ہل آٹھ آٹھ گھوڑوں سے چلائے جاتے ہیں۔

——:o:——

آسٹریلیا میں مشینوں سے کھیت میں ہل چلانے، بیج بونے، فصل کاٹنے اور اناج نکالنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اسطرح اوسط پیداوار میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے۔ آسٹریلیا کے گیہوں سے نہ صرف ہندوستان میں قحط کا خطرہ کم ہوگیا بلکہ اسنے دنیا بھر کے مسئلۂ خوراک کا حل پیش کردیا۔ مفصل مضمون اسی شمارہ کے صفحہ ۴۶ سے ملاحظہ کیجئے۔

——:o:——

ضلع ولڈسر (آسٹریلیا) کے باغات میں پھلوں کے درختوں پر پانی چھڑکنے کی مشین۔

دور نظر آنے والی مشین پھلیاں کاٹ رہی ہے۔ نزدیک والی دوسری مشین انہیں چن کر بوریوں میں بند کررہی ہے۔

عمارت کا ایک دلکش منظر۔ گول دائرہ سامنے والی عمارت کا ایک روشندان ہے

جامعہ ملیہ اسلامیہ دهلی

مفصل مضمون اس شمارے کے صفحہ نمبر ۱۷ سے ملاحظہ ہو۔
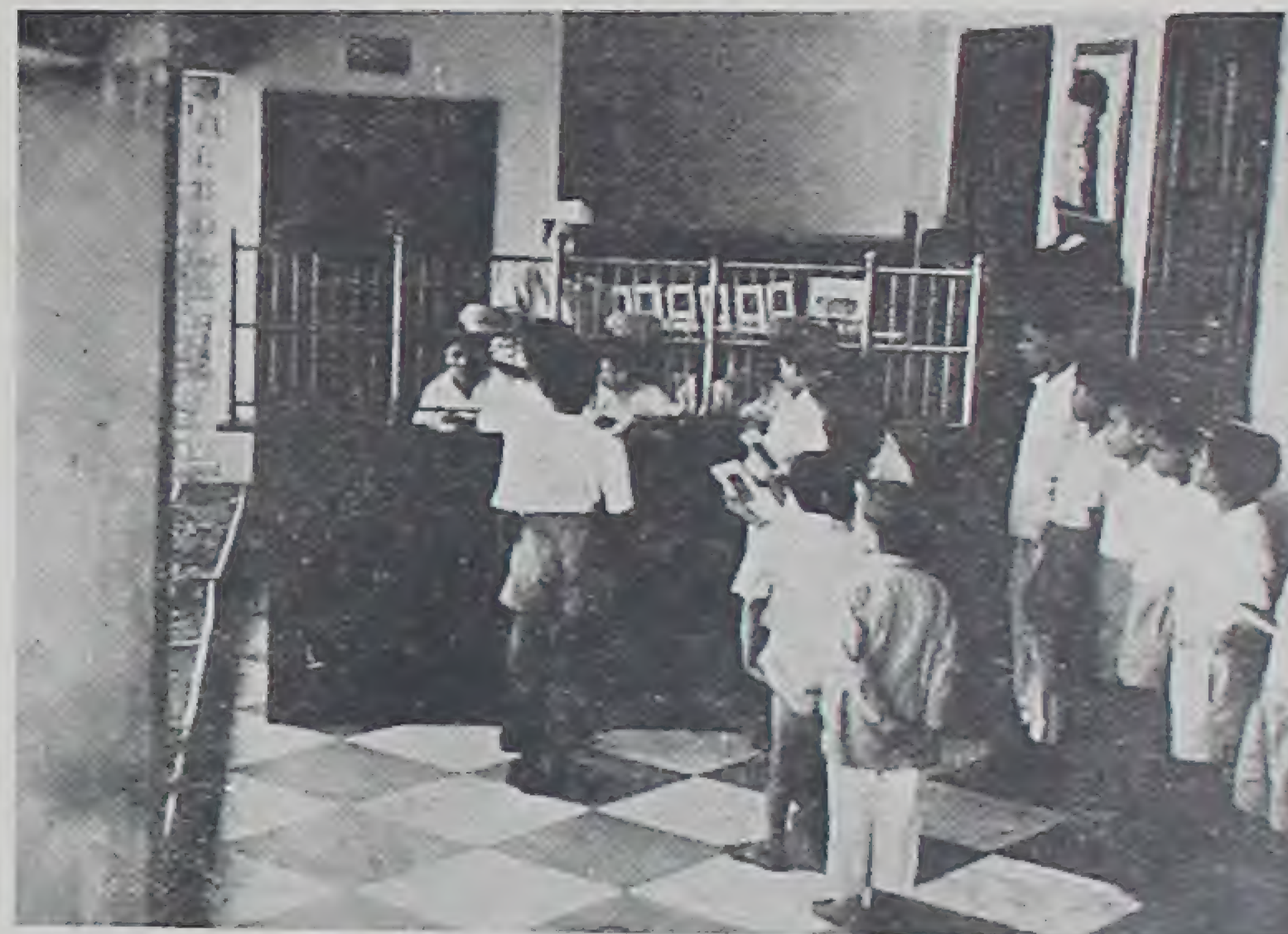
بچوں کا بنک۔ روپے جمع کرانے یا نکالنے والے قطاریں باندھے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔

کھانے کا کمرہ۔ کھانے کا سارا انتظام طالب علم اپنے آپ کرتے ہیں۔

عمارت کے قریب ہی ایک وسیع میدان میں پھولوں اور ترکاریوں کی کیاریاں۔ طلبا کام میں لگے ہوئے ہیں۔

پوری عمارت کا ایک خوشنما منظر۔ کھلے میدان میں طلبا مختلف قسم کی ورزشیں کر رہے ہیں۔

بچے کھیل کھیل میں کام کی باتیں سیکھ رہے ہیں

اوکھلا گاؤں کا مدرسے کا ایک منظر۔ کچھ بچے لکھ رہے ہیں، کچھ تکلی چلا رہے ہیں۔

بچوں کی پنچایت۔ آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ بھی پنچایت کرتی ہے۔

ہنس مکھ بچے چھٹی ملنے پر اپنی اپنی جماعت سے نکل کر قیام گاہ کی طرف جارہے ہیں۔

فغانستان کے کھلاڑی

ور، ٹیموں کے کھلاڑی
یلے کیلئے میدان میں
دوڑے آرہے ہیں۔
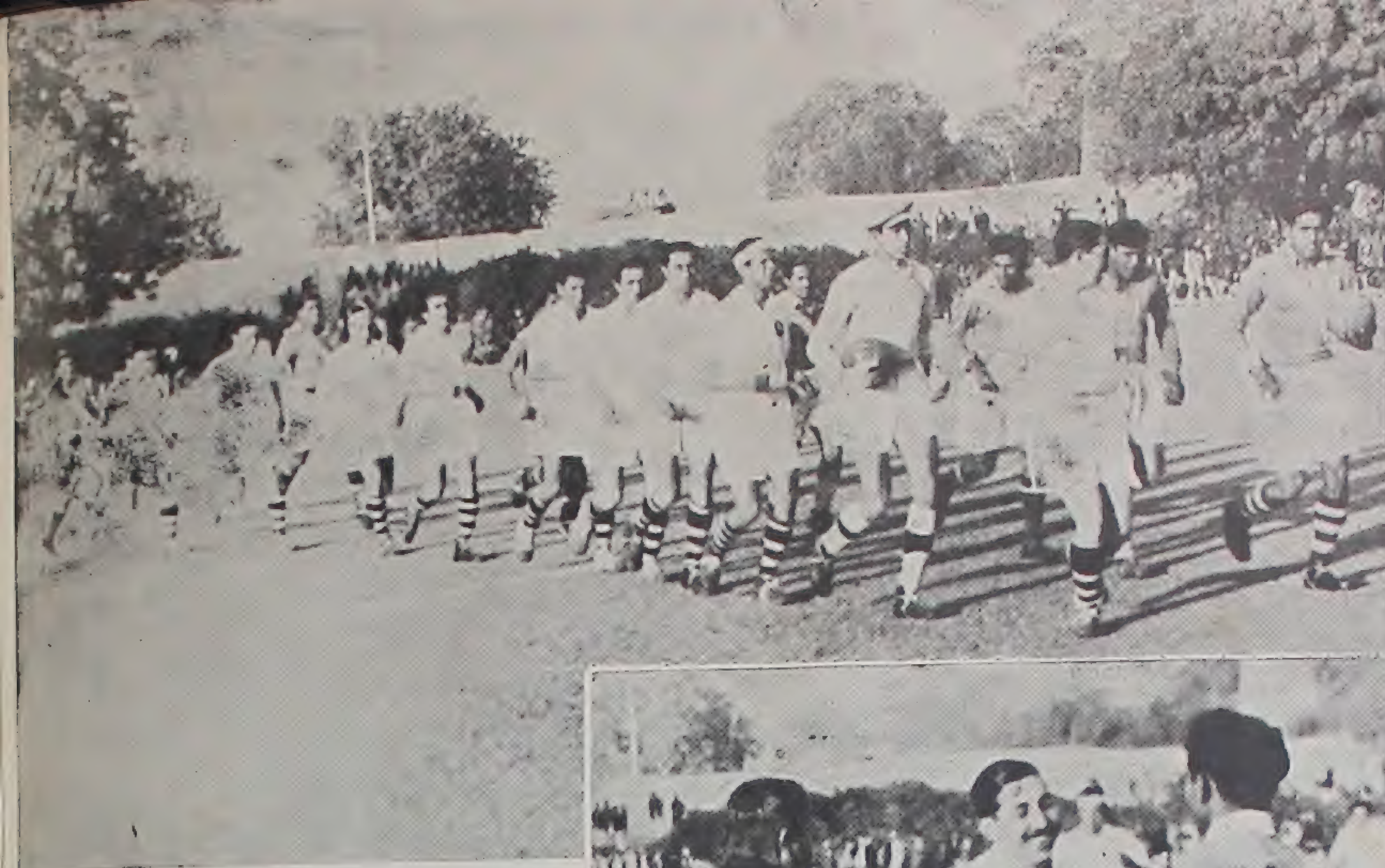
چند ماہ ہوئے کابل کی ٹیم، "آریانا" حکومت افغانستان کے وزیر تعلیم سردار محمد فاروق خاں کے ہمراہ ہندوستان آئی اور تمام بڑے بڑے شہروں میں فٹ بال کے میچ کھیل کر چلی گئی۔ دہلی میں اسکے دو میچ جو مغل کلب اور جناح سپورٹنگ کلب کے ساتھ ہوئے، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میچوں کو دیکھنے کیلئے افغانستان کے قونسل جنرل متعینہ ہند اور قائد اعظم محمد علی جناح بھی تشریف لائے تھے۔

ں ٹیموں کے کپتان کھیل
ع ہونے سے پہلے ہاتھ
ملا رہے ہیں

ڑیوں کے درمیان افغانستان
قونصل جنرل متعینۂ ہند اپنے
ی کے اراکین کے ساتھ
کھڑے ہیں

برطانیہ میں مسلمان

کارڈف کی نئی مسجد کے افتتاح سے پہلے ساوتھ ویلز کے مسلمان اپنے قائد شیخ حسام اسمعیل کے ساتھ مسجد میں داخل ہو رہے ہیں۔

مغربی دنیا کے مسلمانوں میں کارڈف کے رہنے والے مسلمان وسیع اور خوشحال گھرانوں کے رکن ہیں۔ ان میں عدن اور عربستان کے باشندے شامل ہیں۔ ۴۱ - ۱۹۴۰ع میں جب اہل جرمن نے کارڈف پر حملہ کیا تو نازیی بموں سے مقامی مسجد بالکل فنا ہوگئی۔ تاہم مختلف ذرائع سے روپیہ جمع کرکے مسجد کو دوبارہ تعمیر کرلیا گیا اور ساتھ ہی ایک اسلامی ثقافتی مرکز قائم کیا گیا۔ دونوں کا افتتاح بڑے شاندار طریقے پر ہوا۔ یہ جشن تین دن تک منایا گیا۔ ویلز کے مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شریک ہوئے۔ مسجد کے باہر کارڈف کے لارڈ میئر جیمز گریفتھ نے ننے جلسے کی صدارت کی۔

کارڈف میں ایک مسلمان بچہ اذان کی آواز سنکر اسکی طرف متوجہ ہے۔ یہ ان خاندانوں میں سے ایک خاندان کا رکن ہے جو عرب سے ساؤتھ ویلز آکر آباد ہوگئے۔

کارڈف میں مسلمان بچوں کو قرآن شریف کی تعلیم قائدشف دیتے ہیں اس سے پہلے یہ جہازراں تھے۔ لیکن ناروے کے محاصرہ میں جب انکے جہاز کو تارپیڈو کے ذریعہ اڑادیا گیا اور یہ جسمانی طور پر معذور ہوگئے تو انھوں نے خلوت نشینی اختیار کرلی۔

ممتاز شانتی ـ آسمان فلم کا ایک مسکراتا ستارہ ۔

غزل

ستم پذیر ہوں بیداد آشنا ہوں میں
جفائے دوست کے صدقے میں جی رہا ہوں میں

تلاشِ دوست میں کچھ ایسا گم ہوا ہوں میں
ہر اک سے اپنی خبر آپ پوچھتا ہوں میں

رواں دواں ہے سوئے نیستی مری ہستی
اجل کی گود میں مدت سے پل رہا ہوں میں

بنا دیا مرے احساس نے مجھے بندہ
خودی کی حد سے گزر جاؤں تو خدا ہوں میں

نمود و بودِ بشر کیا ہے؟ اک طلسم خیال
مگر فریبِ عناصر میں مبتلا ہوں میں

حریم قدس میں او چھپ کے بیٹھنے والے
تری شبیہہ تصور میں کھینچتا ہوں میں

نہ آنسوؤں میں کمی ہے نہ دل کی سوزش میں
برس رہی ہے گھٹا اور جل رہا ہوں میں

چھلک پڑے نہ کہیں زندگی کا پیمانہ
بذوقِ بادہ کشی جام بھر رہا ہوں میں

یہ مانتا ہوں کہ تم میری جان ہو، لیکن
خود اپنی زیست سے بھی ان دنوں خفا ہوں میں

کوئی دکھاؤ زمانے میں اور اپنا سا
تمھیں نہ چاہوں تو پھر اور کس کو چاہوں میں

جسے وفاؤں سے نفرت، جسے جفائیں عزیز
بھلا نباہوں تو ایسے سے کیا نباہوں میں

چراغِ کشتہ کے مانند بزمِ عالم میں
فروغ پانے سے پہلے بجھا ہوا ہوں میں

مرا وجود تھا خنجرؔ اسکوں پذیرِ فنا
جگا کے بزم نشینوں کو سو گیا ہوں میں

خنجرؔ لکھنوی

کوئٹہ

اسدؔ ملتانی

(گیارہ برس ہوئے کوئٹہ کے زلزلے پر ایک نظم لکھی تھی جسکا ایک شعر تھا :-

وہ دیارِ دلکش و دلکشا جسے خلق کہتی تھی کوئٹہ
اسے زلزلے نے دیا مٹا اسے زلزلے نے مٹا دیا

اب جو کوئٹے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو ایک بالکل نو تعمیر شہر آباد پایا اور زلزلے کی تباہ کاری کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔ اس نئے کوئٹے کی سیر کے تاثرات نے ذیل کی نظم کی صورت اختیار کی ہے :- اسدؔ)

برداشت کی طاقت ہو تو کوئٹے کا سفر کر ❊ جنت میں پہنچنا ہے جہنم سے گذر کر
سب خشک پہاڑ اور یہ اک قطعۂ سرسبز ❊ اللہ کی قدرت کے کرشمے پہ نظر کر
گر شوقِ تماشا ہے تو چل شہر کے باہر ❊ نظارۂ کشتِ دچمن دکوہ و کمر کر
وادیٔ اُڑک چل کے ذرا آبِ رواں دیکھ ❊ کس زور سے بہتا ہے پہاڑوں سے اُتر کر
محنت ہی سے خوشحال ہیں افغانِ تنومند ❊ کھیتوں میں کس انداز سے پھرتا ہے سنور کر
کہسار کی عورت بھی ہے کس درجہ جفاکش ❊ سر پر لئے جاتی ہے بڑی مشک کو بھر کر
ہنہ کی چراگاہ میں دُنبوں کے ہیں گلّے ❊ یا آ گئی کنعان کی تصویر اُتر کر
یہ سیب کے پیڑ اور یہ انگور کی بیلیں ❊ مسرور ہیں سب دامنِ اُمید کو بھر کر
ہر راہگذر کہتا ہے اٹھ کر اِدھر چل ❊ ہر باغ یہ کہتا ہے یہیں عمر بسر کر
چلتن کے جو سائے میں ہے گھوڑ دوڑ کا میدان ❊ کہسار میں اس شان کی وسعت پہ نظر کر
سڑکوں پہ فلک بوس چناروں کی قطاریں ❊ سورج کی کرن آ نہ سکے جن سے گذر کر
قدرت کے مناظر بھی ہیں بستی کی بھی رونق ❊ جو سیر ہو منظور یہاں شام و سحر کر
یہ دامنِ کہسار میں پھیلے ہوئے بازار ❊ کچھ وقت یہاں گشت اِدھر اور اُدھر کر
کہتے ہیں کہ اس شہر میں آئی تھی قیامت ❊ ہے اب جو یہ آباد تو زندہ ہوا مر کر
کوئٹے کا نیا شہر ہے پیغام مجسم ❊ دل مُردہ جوانوں کو اسدؔ اسکی خبر کر

منظور ہے تعمیر اگر عالمِ نو کی
دُنیا جو پرانی ہے اُسے زیر و زبر کر

ما: اس شہر کا اصلی نام قلعہ ہے جو انگریزی میں بگڑ کر کوئٹہ ہو گیا۔
۲ : ۔ کوئٹہ کے خشک پہاڑوں میں اُڑک کی وادی ہے جہاں پانی بہ کثرت پایا جاتا ہے یہیں سے کوئٹہ شہر کے لئے پانی کی بہم رسانی کا انتظام ہے۔
۳ : ۔ خاص طور پر لٹن روڈ (ٹھنڈی سڑک) کے وہ چنار قابلِ دید ہیں، جو ریذیڈنسی کے سامنے واقع ہیں۔ اسدؔ۔

دھندلاہٹیں

افسانہ

انور سدید

جمال کو میں نے جب پہلی بار دیکھا تو میں ڈر گئی۔ اسکی موٹی موٹی سرخ وحشتناک آنکھیں دیکھ کر میں سہم سی گئی جی چاہا کہ امی سے لپٹ جاؤں کہ وہ بولیں۔

"شیریں! ان سے ملو یہ تمہارے چچازاد بھائی جمال ہیں"! یہ کہہ کر انہوں نے ایک عجیب سی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر ظاہر کی اور میرا جی چاہا کہ انہیں آداب کرنے کی بجائے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ مگر اف! میرے ساتھ میری امی تھیں۔ اور ان کا غصہ ـــــ الامان الحفیظ ـــــ خدا کسی کو نہ دکھائے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جھجکتے آخر کہہ ہی دیا۔

"بھائی جان آداب"۔ اور میری آنکھیں افق پر پھیلے ہوئے بادلوں پر گڑ گئیں۔ جمال نے شاید مجھے مرعوب نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"شیریں اب تو ماشاء اللہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ گڑیا سی تھی جب میں نے اسے دیکھا تھا"

مجھے غصہ آگیا۔ ہونہہ! یہ کون ہوا میرے متعلق ایسے ریمارکس دینے والا۔ میرے ماتھے پر شکن پڑ گئے۔ اور افق کے پاس بادل حرکت میں آگئے۔

"اب کے دسمبر میں پورے اٹھارہ سال کی ہو جائے گی اللہ رکھے" امی نے کہا۔

"اٹھارہ سال کی"! جمال نے حیرت سے کہا۔ جیسے انہیں اس میں کچھ اعتراض ہے۔

"ہاں ہاں، اٹھارہ سال کی"! امی اسے یقین دلانے لگیں۔

میری نگاہیں بادلوں سے ہٹ کر ان پرندوں کو دیکھنے لگیں۔ جو شام کے بھیگ جانے پر اپنے گھونسلوں کو اڑے جا رہے تھے۔

"اٹھارہ سال کی ہو گئی ہے؟ اور آپ نے ابھی اسے یونہی....."

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ میں اس کے ادھورے فقرے کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور امی مغموم ہو گئیں۔ جانے کیوں؟

"کیا کہوں جمال۔ کوئی اچھا رشتہ ہی نظر نہیں آتا"۔

اب میں سمجھی! اور مجھے جمال پر غصہ آنے لگا۔ دیکھو بھلا یہ کہاں کی تہذیب ہے آخر یہ میرے سامنے ہی ایسی باتیں کر رہا ہے ہونق! میں نے اپنا ایک پاؤں الٹا رکھ دیا اور چلائی۔

"اوئی۔ امی میں گری"۔

اور پھر جو زور سے چیخ ماری تو امی بھی دہل گئیں۔ امی نے مجھے اٹھایا تو میں نے روتے ہوئے کہا۔

"امی موچ آگئی پاؤں میں شاید سخت درد ہو رہا ہے"۔ جمال میرا پاؤں دبانے کیلئے جھک گیا۔

"میرے خیال میں واپس لوٹ چلیں چچی جان"، جمال نے کہا۔ میں نے ایک اور چیخ ماری "اوئی امی چلا بھی نہیں جائیگا اب تو" امی جان بوکھلا گئیں۔ اور اس روز کی سیر یونہی گئی۔

جب گھر پہنچی تو مجھے اپنی ماما کی زبانی معلوم ہوا کہ جمال کی والدہ بھی کل آرہی ہیں۔ اس کی مبہم مبہم باتوں سے مجھے پتہ چل گیا کہ یا دش بخیر مجھے جمال کے ساتھ باندھ دینے کے ارادے کئے جا رہے ہیں۔ معاً میرے ذہن کی سطح پر جمال کی موٹی موٹی سرخ وحشتناک آنکھیں ناچ گئیں اور اپنی قسمت کی لکیروں کو یوں تاریکی میں گم ہوتا دیکھ کر ڈر گئی۔ میرا جی چاہا رو دوں اور اگر بن پڑے تو دیدہ دہنی سے انکار ہی کر دوں۔

اس رات میں ایک پل بھی نہ سو سکی۔ ستارے چمکتے رہے۔ چاند کی ضیا باریاں زمین کو منور کرتی رہیں۔ لیکن میں چارپائی پر کروٹیں بدل بدل کر یہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس چنڈ صحرائی سے چھٹکارا حاصل کروں۔ وہ امی کا اکلوتا بھتیجا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ عالیہ چچی کے کہنے پر وہ جھٹ مان جائیں گی ـــــ صبح ہو بھی گئی لیکن میرے دماغ میں کوئی ایسی ترکیب نہ آئی جس سے میں نجات حاصل کر سکتی۔

دوپہر کو عالیہ چچی بھی آگئیں انہوں نے خوب بڑھ بڑھ کر میری بلائیں لیں۔ جمال اپنی ابلی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔ اور میں غصے سے اپنے ہونٹ ہی کاٹتی رہی۔ تمام دن کوشش کے باوجود میں کسی کام میں بھی حصہ نہ لے سکی۔ شام کو جمال میرے کمرے میں آیا۔

"شیریں سیر کو نہ چلو گی"۔

"نہیں!" میں نے تنک کر اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اور وہ سہم گیا۔ پھر خاموشی سے باہر چلا گیا۔

میں کرسی پر دراز اپنے مستقبل کے دھندلے نقوش دیکھ رہی تھی کہ معاً ساتھ کے کمرے سے امی جان اور چچی عالیہ کی سرگوشیوں کی آوازیں مجھے آئیں۔ دبی دبی آوازیں۔ جیسے کوئی بہت رازداری کی باتیں ہو رہی ہوں ـــــ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ اف! یہ سب باتیں میرے متعلق ہی ہو رہی تھیں۔

"مجھے اعتراض تو کچھ نہیں۔ مگر سوچتی ہوں لڑکی سے پوچھنا بھی تو ضروری ہے"۔

"توبہ آپا! یہ ہمارا تمہارا کام ہے۔ طے پایا۔ بات ختم ہوئی ـــــ

یہ بھی کیا کہ لڑکیوں سے پوچھتے پھریں لڑکا تمہیں پسند ہے؟ نہیں ہے؟ نوج!"

"ٹھیک ہے یہ۔ مگر آخر اس میں ہرج ہی کونسا ہے؟"

"جیسا آپ کہیں۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں۔"

اور پھر سرگوشیاں ختم ہوگئیں۔ مجھے امید کی ایک مدھم سی جھلک نظر آئی۔

چاندنی رات میں میں ہارسنگھار کے ایک پودے کے قریب کھڑی تھی۔ کہ جمال میرے قریب آہستگی سے آکر کھڑا ہو گیا۔ میں ایک پھول توڑنے کے لئے جھک گئی۔

"شیریں"! میں نے اسکی آواز میں ایک قسم کی لجاجت پائی۔

"جی۔ فرمائیے"۔

"کیسی سہانی چاندنی رات ہے"

اس نے ذرا رومانی بنتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں بہت"۔ میں نے بھی نرمی سے کہا۔ وہ میرے قریب آگیا۔

"یہ آسمان پر پھیلی ہوئی شاہراہ دیکھ رہی ہو شیریں"؟

"کہکشاں! جی ہاں" میرے انداز سے اب بھی نرمی ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے قریب آکر اپنی انگلیوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنی شروع کر دی۔ میں ذرا نہیں ہچکچائی۔ خاموش رہی جیسے کچھ ہوہی نہیں رہا۔ اور وہ ہواؤں میں محل کھڑے کرنے لگا۔

"کاش ہم اس شاہراہ پر دونوں اکٹھے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے"۔

اس نے کچھ عجیب انداز سے کہا اور میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"یہ ٹھنڈی آہیں کیسی"؟ اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہی سوچ رہی ہوں کہ" میں نے بے حد مایوس انداز میں کہا "کاش میں آپ سے کچھ عرصہ پہلے ملی ہوتی"۔

"کیا مطلب ہے تمہارا شیریں"؟ اس نے متحیر انداز میں پوچھا۔

"کیسے کہوں جمال کہ میں نے اپنا جیون ساتھی عرصہ ہوا انتخاب کر لیا ہے"۔

"جیون ساتھی"! اس نے انگلیاں میرے بالوں سے نکال لیں۔

"ہم دونوں کالج میں اکٹھے پڑھتے رہے تھے۔ بی اے تک زندگی کے چار سال اکٹھے رہ کر ہم نے ایک دوسرے کے جذبات و خیالات کا اچھی طرح سے مطالعہ کیا...... اور پھر...... اور پھر......"

میں آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ آواز تھرا گئی۔

"کاش میں آپ سے پہلے ملی ہوتی جمال"۔

"مجھے نہایت افسوس ہے شیریں"۔

"کیسا افسوس بھائی جان!"

"یہی کہ تمہارے جذبات کو محض میری وجہ سے تکلیف پہنچی"۔

میں خاموش رہی۔ اور انہوں نے ایک خوبصورت پھول توڑ کر میرے بالوں میں ٹانک دیا۔ میرے جی میں آئی کہ جھٹ سے اتار کر پرے پھینک دوں۔ مگر پھر میں نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ سمجھا۔

"ایک ناکامِ الفت کا یہ تحفہ تو نہ ٹھکراؤ گی"، اس نے ملتجی انداز میں کہا۔ اور مجھے ناکامِ الفت کی حالت پر ہنسی آگئی۔

اسی روز رات کو جمال عالیہ چچی سے کہہ رہا تھا کہ میں شیریں سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اور عالیہ چچی پریشانی کے عالم میں پوچھ رہی تھیں "تم اس سے کیوں شادی نہیں کرتے۔ آخر اس میں کونسا عیب ہے"۔

دوسری صبح چچی عالیہ اور جمال جا رہے تھے۔ اور میں اپنے کمرے میں کرسی پر دراز اپنی اداکاری پر مسکرا رہی تھی۔ "کیسے جمال میاں سے نجات حاصل کی"! اگر میری شادی اس سے ہو جاتی تو! مستقبل مجھے دھندلا، دھندلا دکھائی دینے لگا۔ معاً باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ جمال میاں جا رہے تھے۔ اور میرے مستقبل کی دھندلاہٹیں دور کسی اجالے میں غائب ہوتی جا رہی تھیں۔

ضبطِ غم

خورشید بیگم

راز الفت چھپائے بیٹھے ہیں — آگ دل میں دبائے بیٹھے ہیں

آس جھوٹی ہم ان کے آنیکی — ہائے کب سے لگائے بیٹھے ہیں

دل بہلتا ہے ان خیالوں میں — فرض کرتے ہیں آئے بیٹھے ہیں

دل ہے مصروفِ گریہ لیکن ہم — ہنستی صورت بنائے بیٹھے ہیں

گھر کے گوشے کو آخرش خورشید

غم کا دفتر بنائے بیٹھے ہیں

افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات

۲

احمد علی کہزاد

بدھ مت نے افغانستان ہیں گیان ودّیا اور ہندوستانی رنگ ڈھنگ کو رواج دیا۔ چنانچہ اشوک کے زمانہ ہی میں گندھارا اور کپیکا میں اسٹوپا اور خانقاہیں بن چکی تھیں۔ نیز بدھ مت کی بہت سی قیمتی یادگاریں شاندار سنگھراموں میں محفوظ کرلی گئیں۔ افغانستان میں پھیلی ہوئی زردشتی روح نے بدھ مت کے تنگ نظر فلسفے کو وسیع اور متاثر کرنے میں بڑا کام کیا۔

بدھ مت نے جو چھٹی صدی قبل مسیح میں مگدھ اور بنارس میں وجود میں آیا تھا صرف ایک تنگ زاویہ نظر کا پرچار کیا یعنی "ہنایانا" یا "مکتی کا چھوٹا راستہ" انہی دنوں افغانستان کے کشان شاہی خاندان کے شہنشاہ کنشک اور نئے مگدھ یعنی گندھارا کے پروہتوں اور راہبوں نے مل کر ایک دوسرے فرقے کو جنم دیا جو "مہایانا" یا "مکتی کا بڑا راستہ" تھا۔ اس منزل میں ایک نئی ودّیا یعنی "سرسوتی وادن" نے بدھ مت کے لئے ایک نیا افق پیدا کر دیا۔ چنانچہ افغانستان اور ہندوستان ہیں دونوں جگہ دھرم کے معاملوں میں اشوک کی سرگرمیاں کنشک کی سرگرمیوں کے برابر ہیں۔

بامیان میں ۳۵ میٹر لمبے بت کو یا کم سے کم اس کے دامن میں بنے ہوئے اسٹوپاؤں کو جو آگے چل کر اس مشہور وادی میں بودھی تعمیرات کے مرکز ثابت ہوئے اسی سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی موسم سرما کی قیامگاہ "پورشپور" (پشاور) میں ڈیڑھ سو فٹ اونچے اسٹوپا کے ساتھ ایک شاندار سنگھرام بنوایا تھا۔

افغانستان نے بدھ مت ہندوستان سے لیا لیکن اس کے عوض مذہبی خیالات کے تصویری پیکروں کی صورت میں ایک مکمل نمونۂ صنعت ہندوستان کو دیدیا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے آخری نصف حصے میں یونانی ذوق نے قدیم باختری حسن کاروں کے خیالات کے ساتھ مل کر فن کو ایک نئی شکل میں ڈھالا جس کے بعد وہ عام طور پر یونانی باختری فن کہلانے لگا۔ مشہور روسی شائقینِ علم مسٹر اور مسز ٹرپور کا خیال ہے کہ یہی دلستان فن ہندوستان، ایران، سنکیانگ اور منگولیا والوں کے لئے خیالات کی رفعت کا باعث بن گیا۔ اسی سے کشانی فن کے ذریعہ ساسانی فن بھی متاثر ہوا۔ بدھ مت کے افغانی حسن کاروں نے جنھوں نے یونانی باختری اسکول کی پیروی کی تھی ایک نئے یونانی بودھی طرز کو جنم دیا جو ہندوکش کے دونوں جانب پھیل گیا۔ ابھی چند سال پہلے اس فن کی ابتدا گندھارا (وادیٔ کابل) میں بتائی جاتی تھی لیکن ۱۹۳۶ء میں جب مسٹر ہاکن نے کندز میں اور ایک روسی ماہر آثارِ قدیمہ نے ترمذ کے قرب وجوار میں تحقیقات کیں تو باختر کو اس سلسلے کا مرکز قرار دیا۔ مسٹر ہاکن نے اپنے خیالات کا نچوڑ ایک مختصر رسالہ میں پیش کیا جو کابل میں فارسی اور فرانسیسی زبانوں میں شائع ہوا تھا۔ چنانچہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یونانی بودھی فن نے باختر میں جنم لیا اور پھر گندھارا میں سن عیسوی کی پہلی صدی کے آخر اور دوسری صدی کے شروع میں عروج حاصل کیا خصوصاً جب کنشک کا عہد حکومت تھا۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فن کے اس اسکول نے شمال مغربی ہندوستان پر اپنا کیا اثر ڈالا ہمیں چاہئے کہ مختصر طور پر اس ملک میں رونما ہونے والے فنی ارتقا پر بحث کریں۔

درحقیقت چوتھی صدی قبل مسیح کے آخر میں یا تیسری صدی قبل مسیح کے شروع میں ہندوستانی آرٹ نے سانچی فن کے اسکول کی صورت میں جنم لیا۔ اسوقت موریا اور سنگا خاندانوں کی حکومت تھی۔ اس فن نے جسے جانوروں کی شکلیں بنانے یا بیل بوٹوں سے زینت دینے میں بڑا کمال حاصل تھا خود گوتم بدھ کی تصویر بنانے سے بالکل احتراز کیا کسی فنکار کی یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے مہاتما کو رمزیہ طریقۂ اظہار کی بجائے اصل روپ میں پیش کر سکتا۔ یہ ہندوستانی فن کا پہلا دور تھا۔

دوسرا دور سن عیسوی کے ساتھ شروع ہوا اور تقریباً پانچویں صدی تک برقرار رہا۔ اس ضمن میں تین خاص علاقوں کے فنون کے تین اسکول گنوائے جاسکتے ہیں۔ اول متھرا کا طرز جس نے وسطی اور شمالی علاقے میں رواج پایا (یہ پہلی سے چوتھی صدی تک سانچی کی ایک نئی شکل) دوسرا امراوتی طرز جو جنوب مشرق میں پھیلا (اس عہد کے متھرا اسکول کے ساتھ ساتھ) اور آخر میں یونانی بودھی فن جو شمال مغرب میں پھیلا اور جس نے دونوں اول الذکر طرزوں پر اپنا اثر جما لیا۔ اس طرح ہم آسانی سے پتہ چلا سکتے ہیں کہ وہ باختری فن کس طرح گندھارا سے شمال مغربی ہندوستان تک پہونچ گیا۔ تختِ بہی (ڈاکٹر ڈی بی اسپونر کی تحقیقات) ٹکسلا (سر جان مارشل کی تحقیقات) اکا بیکا اور ہڈا سے

برآمد ہونے والی چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں زبردست مشابہت ہے۔ مسٹر اسے فوشر نے جلال آباد اور راولپنڈی کو ایک ہی ضمن میں رکھا ہے لیکن مسٹر جے ہاکن نے ہدا کو ترجیح دی ہے جو جغرافیائی اعتبار سے گندھارا کے عین وسط میں واقع تھا۔

ہندوستانی فن کا آخری دور گپتا اسکول سے شروع ہوا جس نے زیادہ ترقی پانچویں اور نویں صدی کے درمیان حاصل کی۔ یہ ہندوستانی طرز میں یونانی بودھی فن کی ایک ارتقائی صورت تھی۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور دوسری سے چھٹی صدی تک رہا۔ اس کے نمونے اجنتا میں ملتے ہیں۔ دوسرا دور چھٹی سے آٹھویں صدی تک رہا۔ اس کے نمونے الفنٹا اور ایلورا میں ملتے ہیں۔ گپتا اسکول نے اپنے طور پر بودھی فن کے آخری دور پر اثر ڈالا۔ یہ اثر افغانستان میں خصوصاً فوندوکستان (دوائی غوربند) میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے بدھ مت نصف افغانستان پر کم و بیش ایک ہزار سال تک پھیلا رہا۔ نصف مغربی ملک پر زردشتی مذہب اور اس کی شاخیں اپنا اثر جمائے رہیں۔ یہ بات کشان بادشاہوں کے ان سکوں سے ثابت ہوتی ہے جن پر اولیتائی اور ہندوستانی دیوتا اور دیویاں نقش تھیں۔ عہد کشان گذرنے کے بعد چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں افغانستان میں کچھ لوگوں نے سورج کی پوجا شروع کی۔ ان کی نشان دار عبادت گاہیں اب بھی جبل اذر کابل اور کابل کے جانب جنوب لوگا زمین ملتی ہیں۔ مسٹر جے ہاکن نے ونٹرنٹز کی تاریخ ہندوستانی ادبیات، جلد اول صفحہ ۵۶۷ کے حوالے سے درۂ خیر خانہ کے آثار قدیمہ کا ذکر کیا ہے۔ (یہ رپورٹ پیرس سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی تھی) ان کا بیان ہے کہ "آگ اور سورج کا زردشتی مسلک سیستان کے سارے علاقے پر چھا گیا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر وہ ہندوستان کے عین دروازے تک پہونچ گیا" (اس طرح ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کر سورج کی پوجا جنوبی افغانستان سے چل کر ہندوستان میں رائج ہوئی)

ظہور اسلام کے وقت کشان قوم کا ایک خاندان کابل پر حکمراں تھا اور برہمنی بدھ مت کا سکہ چل رہا تھا۔ اس کی سلطنت سندھ سے ہاموں تک یعنی ہندوکش کے جانب جنوب سارے علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ عام طور پر صفحاتِ تاریخ میں اس خاندان والوں کو برہمنی شاہان کابل یا رؤسائے کابل لکھا گیا ہے۔ ان بادشاہوں اور ہندوستان کے برہمنی اور ہندو راجکماروں میں بڑا ربط ضبط اور قریبی تعلق تھا۔ لوگا رمیں سگاوند کا مندر جنوبی افغانستان کے مذہبی عقائد کا مرکز تھا۔ محمد عوفی کے بیان کے مطابق ہندوستان کے بے شمار یاتری ہر سال وہاں پہنچتے تھے۔ پھر افغانستان میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا تو رؤسائے کابل کا صدر مقام کابل سے منتقل ہو کر پہلے اٹک کے قریب ویہند میں اور پھر اس کے بعد ہندوستان کے وسط میں قائم ہو گیا۔ اس منزل پر پہنچ کر قدیم افغانستان و ہند کے مابین ثقافتی تعلقات کا پہلا باب ختم ہو جاتا ہے۔ نئے باب کا آغاز ظہور اسلام کے وقت سے ہوتا ہے۔

اسلامیات کے رائج ہوتے ہی افغانستان و ہندوستان نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ ذہنی انقلاب کے ساتھ ساتھ "ثقافت" ادبیات، فنون لطیفہ اور فکر و نظر میں نت نئے پہلو پیدا ہونے لگے۔ ساتویں صدی کے نصف اول میں عربوں نے سیستان کو طے کیا اور افغانستان و ہندوستان کی جانب بڑھ گئے۔ لیکن ان کی یہ چڑھائی رطبل شاہیوں کی رکاوٹوں سے التوا میں پڑ گئی۔ مکران اور سندھ نے مدافعت کی بیکار کوشش کی۔ محمد قاسم ثقفی نے سندھ پر دھاوا بول کر اس کے شہر منصوری، کسدار، کنداہل، بیضا، محفوظ اور ملتان پر اپنا قبضہ جما لیا۔ افغانستان میں اسلام خاص شہر کابل تک رائج ہو گیا۔ بنی امیہ کے زمانہ میں اہل عرب سندھ سے آگے قدم نہ بڑھا سکے تھے۔ عہد عباسیہ میں خلیفہ معتمد نے ہندوستان کے پہلے اسلامی صوبے کی عنان حکومت یعقوب بن لیث صفاری کے ہاتھ میں دے دی۔

اس وقت جبکہ اسلام نے ایک طرف افغانستان کے صرف ایک حصے تک اور دوسری طرف بمشکل ہندوستان کی سرحد تک رسائی حاصل کی تھی ہم دیکھتے ہیں کہ افغانستان اور اسلامی ہندوستان کے مابین براہ راست کسی قسم کے ثقافتی تعلقات قائم نہیں ہو سکے تھے بلکہ یہ تعلق خلافت بغداد کی معرفت پیدا ہوا تھا۔ افغانی خاندان برامکہ کے افراد جو بلخ کے آتش پرستوں کی اولاد تھے، خلفائے بغداد کے وزیر تھے۔ اسی خاندان کے وسیلے سے ہندوستان اور دنیائے عرب کے مابین ثقافتی تعلقات پیدا ہوئے۔ انہی نے علم الادویات و فلکیات کے مطالعے کے لئے طالب علموں کو ہندوستان بھیجنے کی تجویز پیش کی اور انہی نے سائنسی کارناموں کو سنسکرت سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستانی اربابِ علم کو بغداد آنے کی دعوت دی۔

لیکن عربوں کے اس اثر و رسوخ کے باوجود اسلام سندھ سے آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ صورت حالات کم سے کم دو سو سال تک قائم رہی حتیٰ کہ خاندان غزنوی کو افغانستان میں عروج حاصل ہوا۔ اس خاندان کے بادشاہوں خصوصاً محمود غزنوی کے حملوں کے ساتھ اسلام کے مذہبی اور ثقافتی اثرات خاص قلب ہندوستان تک پھیلتے چلے گئے۔ شاہان غزنی نے تاریخ ہند میں دو شاندار

ابواب کا اضافہ کیا۔ ان میں سے ایک مذہبی تھا اور دوسرا ادبی۔ پہلا ہمارے فاضل علمائے کرام کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور دوسرا ہمارے ادبا کی سرگرمیوں کا حاصل۔ فضلائے افغانستان میں سے، جو ہندوستان کے مختلف حصّوں میں آباد ہو گئے، ہجویری اور جلابی خاندانوں کے کچھ افراد خاص اہمیت رکھتے ہیں جنہوں نے شاہ مسعود کے عہد حکومت میں ہجرت کی تھی۔ ہجویر اور جلاب غزنی کے دو علاقے تھے۔ علی ابن عثمان الہجویری ۴۳۱ھ میں لاہور پہنچے۔ یہ اس خاندان کے بڑے اہم رکن تھے۔ انھوں نے لوگوں میں اسلام کی تبلیغ کی اور اپنے مقلدین پر تصوّف کا رنگ جمایا۔ ان کی تصانیف میں سے چند قابل ذکر ہیں مثلاً منہاج الدین البیان الاہل العیان اسرار الخرق والمعنیات، کاشف الاسرار، الرّاعیات بہ حقوق اللہ۔ اور آخر میں کاشف المحجوب جو ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے۔ ہندوستان میں تمام عمر اپنے خیالات کی روحانی تبلیغ کرتے رہنے کے بعد ۴۶۵ھ میں ان کی وفات ہو گئی۔ سلطان مسعود پہلا شہنشاہ تھا جس نے غزنی جا کر اس فاضل اجل کے مقبرے کی زیارت کی اور اس پر ایک شاندار درگاہ تعمیر کرا دی۔

ہندوستان میں ادبی دور کا آغاز سلطان محمود کے زمانے سے ہوا۔ محمود کے ساتھ یا اس کے بعد افغان شاعروں اور ادیبوں کا ایک گروہ ہندوستان آیا۔ ان میں سے فرخی، انصاری، اسجدی، عوفی اور بیرونی قابل ذکر ہیں۔ ان کے دم سے ہندوستان میں ادبی ذوق کو نشو و نما حاصل ہوئی۔ خراسان کی زبان "دری" میں جو عام طور پر فارسی کہلاتی تھی، ایک خاص طرز شاعری رائج تھا جس کی نشاۃ الثانیہ کے لئے غزنی ایک اہم مرکز بن گیا۔ یہ زبان شمال مغربی ہندوستان میں پھیلی اور بہت جلد مقبول عوام ہو گئی۔ محمود کی سخن پروری اور ادب نوازی کے سلسلے میں گردیزی نے ایک دلچسپ حکایت بیان کی ہے۔ "طویل محاصرے کے بعد قلعہ کالنجار کے لوگوں نے محمود کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ قلعہ کے محافظ راجہ نندا نے اس محاصرے اور طویل مدافعت کو موضوع بناتے ہوئے ایک عمدہ نظم موزوں کی اور اس کی ایک نقل سلطان کے پاس بھیجدی۔ درباری شعرا نے ایک زبان ہو کر اعتراف کیا کہ فصاحت و ترنم کے لحاظ سے کوئی دوسری نظم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ بخشش کے طور پر سلطان محمود نے راجہ مذکور کو پندرہ قلعوں کا امیر بنا دیا۔" اس طرح سلاطین غزنی نے ہندوستانی شعرا کی ہمت افزائی کی، ان شاعروں کی بھی جو ہندوستانی بولیوں میں مشق سخن کرتے تھے۔ اس کی فیاضی نے عوام میں ایک ادبی ذوق پیدا کر دیا۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں صدی کے شروع میں ادیب اور سائنس داں افغانستان سے ہندوستان آتے رہے۔ یہاں کافی عرصے رہنے کے باعث انھیں ہندوستان کی زبان، طور طریق، رنگ ڈھنگ اور رسم و رواج کا بخوبی علم ہو گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں رہتے ہوئے یا افغانستان واپس جانے کے بعد انھوں نے مفید کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے صرف بیرونی، گردیزی اور ایک صدی بعد کے عوفی کا ذکر کروں گا۔

خوارزم جیسے مختصر سے گاؤں کے رہنے والے بیرونی نے ہندوستان کا خوب مطالعہ کیا اور اس کی روح کو اپنے ہمعصروں سے زیادہ سمجھا۔ اس نے جو خدمت اس ملک کے لئے کی، وہ ناقابل فراموش ہے۔ دربار غزنی سے متعلق ہونے کے باعث اس نے محمود کے عہد حکومت میں مطالعے کی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا۔ اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوستان کے مذہبی، سائنسی اور ثقافتی نظریوں کو سمجھ بوجھ کر اپنی واقفیت میں اضافہ کیا۔ غزنی واپس جا کر ۴۲۱ھ میں اس نے "کتاب الہند" نامی کتاب لکھی۔ ہندوستان اور افغانستان کے ثقافتی تعلقات کو سمجھنے میں البوریحان البیرونی اور اس کی قابل قدر کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس نے انقلابی تغیرات کی پیشین گوئی کی تھی۔ البیرونی نے یہی نہیں کیا کہ دنیائے اسلام کو ہندوستان سے روشناس کر دیا بلکہ اس نے بہت سی عمدہ کتابیں عربی سے سنسکرت میں ترجمہ کر ڈالیں۔ چنانچہ "مبادیٔ اقلیدس" سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ اس نے ہندوستان کی سائنس کو ترقی دینے میں بھی نمایاں حصّہ لیا۔ پچاس سال بعد ہمارے مورخ اعظم گردیزی نے ہندوستان کے ہندوؤں کی مذہبی رسوم اور تعلیم وغیرہ پر بہت کچھ لکھا۔

غوریوں کے بعد حکومت کرنے والے بادشاہوں نے بھی جو مملوک کہلاتے تھے ہندوستان کی ثقافت، تعلیم اور فن تعمیر کو ترقی دینے میں بڑا حصّہ لیا۔ انھوں نے افغانی رسم و رواج اور خیالات و افکار کو رواج دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے تعمیری خاکوں خصوصاً مینار کے طرز تعمیر میں گردیزی فن تعمیر سے بہت کچھ اثر لیا گیا ہے۔ عہد غزنوی میں سے میں نے البیرونی اور گردیزی کا ذکر کیا ہے۔ عہد گردیزی میں سے میں طبقات ناصری کے مصنف منہاج السراج اور لبوب الالباب اور جامع الحکایات کے مصنف عوفی کا ذکر کروں گا۔ ہندوستان میں غوریوں کے دربار میں رہتے ہوئے ان دو فاضل مصنفوں نے اپنی اہم تصانیف تیار کیں۔ نیز افغانستان اور ہندوستان کی ثقافت، تاریخ اور ادب کے

سلسلے میں ایسی خدمات انجام دیں جن کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ طبقات ناصری ایک لائق تحسین کارنامہ ہے جس میں عام تاریخی حالات خصوصاً غزنوی اور غوری خاندانوں کے تاریخی واقعات درج ہیں۔ لبوب الالباب ہندی اور افغانی شعرا کے حالات زندگی کا مجموعہ ہونے کے باعث مشہور ہے۔ جامع الحکایات میں قصے کہانیوں کے انداز میں ایسے رسم ورواج اور طرز حیات کا ذکر کیا ہے جن کے مطالعہ سے افغانیوں اور ہندوستانیوں کے مختلف طبقوں کی زندگی پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ بلاشبہ یہ اہم کارنامہ بھی دونوں ملکوں کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے۔

اس کے بعد چنگیز خاں اور تیمور لنگ کے حملے شروع ہوئے۔ موخرالذکر کے جانشینوں نے دو سلطنتیں قائم کیں اور دو خاندان پیدا کئے۔ افغانی خاندان "تیموری" کہلایا اور ہندوستانی خاندان کو "مغل" کہا گیا۔ اس وقت سے دونوں ملکوں میں ادب وفنون کے نشاۃ الثانیہ کا ایک نیا باب کھلتا ہے۔ خراسان یا افغانستان کا ایک ادارہ ہرات میں قائم تھا۔ وہ مصوروں اور خوشنویسوں کے لئے مرکز بن گیا۔ چنانچہ بہزاد، میر علی اور سلطان محمد جیسے حسن کاروں نے اپنے عہد کے ذوق وشوق اور خیالات ورجحانات کی ترجمانی کی ہے۔ اسی طرح ہندوستان بھی خوبصورت اور دیدہ زیب طرز تعمیر اور ایرانی ادبیات کا خاص مرکز بن گیا۔ زبان بھی جو سلطان محمود ہی کے عہد میں افغان شعرا کے ذریعہ رائج ہو گئی تھی ہندوستانی ماحول میں ترقی کرنے لگی اور اس نے ایک خاص ہندوستانی طرز اختیار کر لیا۔ اس طرز نے ایسی مقبولیت حاصل کی کہ خود افغانستان میں رسائی حاصل کر کے وہاں کے لوگوں میں پسند کیا جانے لگا۔ بہت سے افغان شاعر اور ادیب مغلوں کے دربار میں جمع رہے اور انھوں نے علم وادب اور تاریخ وفنون کے ضمن میں بڑی خدمات پیش کیں۔ چونکہ ان کے نام اور کارنامے بھی خاص توجہ کے مستحق ہیں اس لئے میں بر سبیل تذکرہ صرف ایک ہستی نظام الدین احمد ہراوی کا ذکر کروں گا جس نے طبقات اکبری یا اکبر شاہی لکھ کر تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔

اس دور کے بعد افغانستان وہند کے مابین ثقافتی تعلقات میں کمی پیدا ہونے لگی لیکن پوری طرح اس کا خاتمہ کبھی نہیں ہوا۔ دونوں ملک اپنی اپنی جگہ ترقی کرتے رہے۔ چنانچہ آج ہم نہایت مسرت وشادمانی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے ادبی، تاریخی اور علمی ادارے اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ افغانستان اور ہند کے مابین ثقافتی تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔

اس مختصر خاکے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان وہند کے پڑوسی ملک نہ صرف ظہور اسلام سے پہلے بلکہ قرن وسطیٰ اور موجودہ زمانے میں بھی آپس میں ثقافتی تعلقات قائم رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

اب ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کو بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی سے کس حد تک فائدہ پہونچا ہے۔ کیونکہ یہی ایک ادارہ ہے جو ہندوستان، ایشیا بلکہ سارے مشرق میں تاریخی، ادبی اور علمی موضوعات پر چھان بین کرتا رہتا ہے۔ وہ نور جو سر ولیم جونز نے ۱۷۸۴ء میں چمکایا تھا، صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا اور مشرق کے دوسرے ملکوں میں بھی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اس کی جوت خصوصیت کے ساتھ افغانستان میں پھیل رہی ہے۔

بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی دنیا بھر میں پہلی تاریخی، ادبی اور علمی سوسائٹی ہے جس نے ہمارے ملک کے حالات کی چھان بین کی اور بتایا کہ وسطی ایشیا کے عین دروازے پر ہندوستان، چین اور ایران کے درمیان گھری ہوئی حالت میں اس کی تاریخی جغرافیائی اور ادبی حیثیت کس درجہ اہم ہے۔ اس ادارے نے تعصبات سے الگ ہو کر بالکل غیر جانبدارانہ انداز میں لائق اعتماد اور ٹھوس کام کیا ہے۔ چارلس میسن پہلا عالم ہے جس نے آج سے سو سال پہلے قدیم افغانی سکے جمع کرنے شروع کئے تھے۔ اس کا مقالہ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ چارلس میسن اور جیمز پرنسپ پہلے دو عالم ہیں جنہوں نے خروشتی حروف ابجد کا مطالعہ شروع کیا۔ انھوں نے افغانستان اور ہندوستان کے خروشتی خط کے کتبات کو پڑھنے کی کوشش کی۔ بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک اور فاضل رکن پروفیسر ڈبلیو ایچ ایچ ولسن نے ان عالموں کے مقالات کو مربوط و مرتب کیا اور اپنی تحقیقات کے ساتھ ملا کر شائع کر دیا۔ اس کا نام "آریانہ اینٹیکا" رکھا جس کا ذکر میں شروع میں کر چکا ہوں۔ بعد ازاں دوسرے انگریزی عالم مثلاً جیرارڈ، بیٹ ہونگبر گر، ٹالبوٹ، ڈبلیو میسن اور ریلا تھیکے بعد دیگرے اسی قسم کی تحقیقات میں اضافہ کرتے رہے اور بنگال کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی انکے نتائج افکار وتحقیقات کو برابر شائع کرتی رہی۔ ان مطبوعات نے بہت سے مستشرقی اداروں کی توجہ افغانستان کی طرف مبذول کرائی۔ سب سے پہلے فرانس میں مسٹر روزنتی اور مسٹر جیکیٹ نے باختری سکوں پر اپنی تحقیق کا حاصل پیش کیا۔ اسکے بعد جرمنی اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں تحقیقات و تصنیفات کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ میں اس مختصر مضمون میں اُن مصنفوں اور ان مقالوں کی مکمل فہرست پیش نہیں کر سکتا جو افغانستان پر لکھے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات ثقافتی تاریخی اور ادبی اعتبار سے افغانستان اور ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی ثقافت کیلئے قابل قدر ہیں۔

(مجلہ "افغانستان" سے ماخوذ)

مرد برائے صحتِ جلد ریکسونا استعمال کرتے ہیں

THE NEW
Rexona
MEDICATED SOAP

Rexona

اب جھاگ سے لبریز خوشبو سے معطر

ایسی رائے جلدی قائم نہ کیجئے کہ ریکسونا صرف مستورات ہی کی خوبصورتی کیلئے ہے۔ یہ ٹائلیٹ صابن ہر اس فرد و بشر کیلئے نہایت مفید ہے جو کہ صحتِ جلد کا خواہشمند ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ قسم کا صابن ہے جو کہ جسم کو قوت تر و تازگی اور راحت بخشتا ہے اس کے استعمال کا لطف خاصکر مرد ہی اٹھاتے ہیں

سب سے بڑا فائدہ اس عمدہ سبز اور زرد جھاگ پیدا کرنیوالے صابن کا یہ ہے کہ اس میں حفظانِ صحت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مضر جراثیم کو نیست و نابود کر دینے والی۔ بدن کو فرحت دینے والی کیڈا ارل نام دوائی آمیزش کی گئی ہے جسے ریکسونا کی بہت جلدی اور بہت پیدا ہونیوالی جھاگ جلد کے ہر مسام تک بہم پہنچاتی ہے اور خاصکر ان اجزا میں جہاں عام طور پر جلد کو ضرب پہنچانیوالی مہلک بیماریاں یعنی کھجلی وغیرہ اور بدزیب داغ پیدا ہونے لگ جاتے ہیں اسطرح سے آپکا سارا بدن گندی بیماریوں سے بری ہوکر تر و تازہ اور ٹھنڈا رہتا ہے

آپ اس سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ کس قدر آسانی اور بہت جلدی ریکسونا کے باقاعدہ استعمال سے جلد کی صحت درست کی جا سکتی ہے اور اُسے ہر طرح سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے ایسے سبز اور زرد جھاگ دینے والے ادویات سے مرکب صابن کو آج ہی سے فوراً عمل میں لائیں اور اس کے استعمال کو جاری رکھیں۔

نوٹ:۔ یہ ایک نقطہ خاص قابلِ ذکر ہے کہ جلد کی صحت پر ہی خوبصورتی کا انحصار ہے اور ہر مرد کو اپنے بدن کی جلد کو عمدہ اور محفوظ رکھنے کا اتنا ہی فخر حاصل ہے جو کہ ایک عورت کو۔

ریکسونا بچے کیلئے:۔ یہی ریکسونا جو کہ باپ استعمال کرے بچہ بھی کرے۔ اس کی جھاگ بدن کے مضر جراثیم سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہمیشہ بچوں کو غسل کراتے وقت ریکسونا کو استعمال فرمائیں تاکہ وہ بچے کے نازک جلد کو ٹھنڈک پہونچائے اور اسے ہر طرح کی کھجلی و خارش و سوزش سے بچائے رکھے۔

★ کیڈا ارل ریکسونا میں ایک خاص قسم کا جراثیم کش۔ آرام دہ تقویت دہ تیلوں کا مرکب ہے جو کہ جلد کی صحت کو برقرار رکھنے میں اپنا خاصا اثر رکھتا ہے کیڈا ارل کے جلد کو ٹھنڈہ اور مہلک بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے فوائد کو بڑے بڑے ماہرانِ سائنس نے تسلیم فرمایا ہے اور اس کے ہر روز کے استعمال کو ترجیح دی ہے

ریکسونا مرہم کا استعمال کیجئے:۔ درد دوں۔ سوزش۔ پھوڑے۔ داد۔ ناسور۔ مہاسے۔ پھنسے۔ جلن اور دوسری تمام جلدی امراض کیلئے۔ گو مال کی کمی ہے مگر پھر بھی تھوڑی ڈبیہ بہت سے تاجروں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

REXONA OINTMENT

RP. 30-23 UD

REXONA PROPRIETARY LIMITED

بہار کے دیہاتی گیت

شکیلہ اختر

دیہاتی شاعری آزاد آب و ہوا میں پروان چڑھی ہے۔ بچارے جاہل دیہاتی خوشی و غم فکر و مسرت کی جو کیفیتیں اپنے دھڑکتے ہوئے دلوں میں محسوس کرتے ہیں، وہی جذبات بن کر ان کی زبان پر ٹوٹے پھوٹے جملوں کی شکل میں قافیہ اور ردیف کی کڑی پابندیوں سے عموماً آزاد گیت کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ دیہاتی شاعر صرف اپنی کانوں میں بھلے لگنے والے ترنم کو جانتے ہیں اور بس وہ اسی سے خوش ہو لیتے ہیں۔ یادگار واقعات، جذبات کی تیزی اور محسوسات کی شدت کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کے محدود دائرے میں کوئی اور ادبی صورت نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری ان کی اپنی روزمرہ زندگی کی طرح بہت ہی سادہ اور بے تکلف الفاظ میں ہوتی ہے۔ ان دیہاتی گیتوں کے بنانے والے زیادہ تر ان پڑھ اور گنوار مرد اور عورتیں ہوتی ہیں لیکن جہالت اور گنوار پن میں ڈوبے ہوئے تعلیم و طریقہ سے ناواقف ہونے پر بھی ان کے گیتوں کا نمایاں کمال اور انوکھی خصوصیت یہ ہے کہ مہذب شاعری کے پر تکلف گلدستوں کے سامنے ان کا دامن ہر سال ہر موسم اور ہر روز کھلنے والے ان گنت قسم کے پھولوں سے بھرا پڑا ہے۔ آئے دن کے خیالات، چھوٹی چھوٹی باتیں، شادی بیاہ، ملنے جلنے، غمی و خوشی کے قصے، گذرے ہوئے واقعات اور بدلتے ہوئے رُت کی کیفیتیں، ان کی شاعری میں آزاد، انوکھی جدت اور مٹھاس کے ساتھ موجود ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو کے گانے ان کے یہاں اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر صرف شادی ہی کے گیت لکھے جائیں تو ایک داستان سے کم نہ ہوں۔ بڑی خوبصورتی سے ایک ایک گھڑی کی گیتیں اپنی جداگانہ حیثیت کے ساتھ موزون کی گئی ہیں اور یہ نمایاں حسن سوائے دیہاتی شاعری کے اور کہیں نہیں ملے گا۔ شادی بیاہ میں ساری رسموں کے مخصوص ناموں کے ساتھ ساتھ گیتیں منزل بمنزل اپنی امتیازی شان سے آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ سہانے گیت لڑکے لڑکی اور اس کے عزیزوں کے دلی جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں، جوگ اور ٹونے دلہن اور دولہا کو محبت اور پیار میں جکڑ دینے والی مضبوط اور فولادی زنجیر سمجھے جاتے ہیں۔ سہاگ آنے والی خوشیوں کا پیغام بر ہے، جھومر پر مسرت جذبات کی گہرائیوں کا رسیلا اظہار ہے۔ جھومر کو ہم دیہاتیوں کی کامیاب نظمیں کہہ سکتے ہیں۔ گیتوں کی دوسری قسموں سے زیادہ جھومر میں شاعری کا عروج ترنم اور تسلسل کے ساتھ ہوتا ہے۔ کہبر کی مخمور گیتیں اور رخصتی کے دلسوز گانے اس کے علاوہ ہیں۔ اتنے قسم کی آزاد شاعری اتنے رسیلے مدھ بول کے ساتھ کہیں اور کہیں نہ مل سکے گی۔ سہانے گیت میں شادی ہونے سے پہلے لڑکی اور اسکے باپ کی دلی کیفیتوں کی تھوڑی سی جھلک دیکھئے۔

(۱) ”آبا جُوا، کھیلن تم کہاں جاؤ گے جی“؟
بیٹی جوا کھیلن تمرے سُسرے جائینگے جی
آبا جُوا میں کس کو تم ہارو گے جی؟
بیٹی جُوا میں تم ہی کو ہارین گے جی
آبا مال ملک سب ہاری جاتیو جی
آبا لچھمی دھیا کیسے ہارو گے جی
بیٹی مال ملک بڑا لچھمی ہے جی
بیٹی لچھمی دھیا بڑی بھاری ہے جی

لڑکی اپنے باپ سے کہتی ہے کہ میرے ابا تم جوا کھیلنے کہاں جاؤ گے؟ اس کے جواب میں اس کا باپ کہتا ہے کہ ”میں تمہارے سُسرال جُوا کھیلنے جاؤں گا۔“ اس پر وہ لڑکی سوال کرتی ہے کہ ”اگر تم جُوا میں ہار گئے تو کیا کرو گے؟ اور کس چیز کو ہارو گے“؟ باپ جواب دیتا ہے کہ ”جُوا میں ہم تم کو ہی ہار دیں گے“۔ بچاری لڑکی اس کی محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہے کہ ”اے میرے باپ تم مال اور ملک سب ہار جاتے لیکن اتنی دلاری بیٹی کو کیسے ہارو گے“؟ اس کا باپ کہتا ہے کہ ”بیٹی مال و ملک عزیز تو ہے لیکن عزیز ترین کنواری بیٹی اپنے باپ پر بہت بھاری ہوتی ہے جس کا ہار ہی جانا بہتر ہے“

—— ۲ ——

دروازے پر بُولی سُنایا لاڈو میں تیری ملن کو آیا
تمرے آبا نے بھیجا آبا کھیا نے بھیجا پروانہ لاڈو پروانہ لاڈو
میں تیرے ملن کو آیا ——

”میری لاڈو۔ تو نے دروازے پر اپنی بولی سنا کر مجھ کو اپنے ملنے کا مشتاق بنایا اسی لئے میں تیرے ملن کو آیا ہوں۔ اور اس کے علاوہ تمہارے آبا نے بھی مجھ کو پروانہ پر پروانہ بھیجکر بلایا ہے —— اور اب میں تیرے ملن کو آیا ہوں۔

—— ۳ ——

ٹیکہ جو لائے مُنتیا نہیں لائے کہو جا نیے سو کہ اب لاڈو رُوٹھیں

لاڈو جو رُوٹھیں پلنگ چڑھی بیٹھیں —— کہو جا بنّے سے

دو جا کر بنّے سے کہو کہ اس نے دلہن کے لئے جو ٹیکہ لیا ہے اس کا موتی نہیں لایا۔ اسی لئے لاڈو روٹھی ہوئی ہیں۔ اور بنّے سے جا کر یہ کہو کہ لاڈو رُوٹھ کر پلنگ پر بیٹھی ہوئی ہیں۔"

— ۴ —

سر بنے کے سونے کا سہرا، لڑیاں لگے ہیرے لال
بنے کو میں جانے نہ دوں گی
ساسو جو گنیاں کے دیس بنے کو میں جانے نہ دونگی

"میرے بنے کے سر پر سونے کا سہرا بندھا ہے اب ایسے ہیرے کی لڑیاں لگے ہوئے اپنے لال بنے کو میں اس کی جادوگرنی ساس کے دیس میں کبھی جانے نہ دونگی۔"

شادی کے موقعہ پر یہ گیت لڑکے کی طرف سے گایا جاتا ہے۔

— ۵ —

سُہانے گیت کا ایک اور لطیف نمونہ دیکھئے شرمیلی دلہن اپنے شوہر سے ملنا چاہتی مگر وہ جھجک رہی ہے:

"ارے میں کیسے آؤں نئے دُلہے پائل بولے جی
پائل کی آواز سے میرے دادا جاگیں جی دادا اٹھیا جاگیں جی
ارے میں کیسے آؤں نئے دلہے پائل بولے جی
پائل کو اتار کے تم دھیرے آؤ جی ہولے ہولے آؤ جی
ارے میں کیسے آؤں یہاں بندرے پائل بولے جی

"اے نئے دلہے میں تم سے ملنے کو کیسے آؤں۔ میرا پائل تو چلنے میں جھنا جھن ہونے لگتا ہے۔ میرے پاؤں میں جو پائل ہے اس کے جھنا کے سے تیرے دادا جاگ اٹھیں گے۔ نئے دلہے اب میں کیسے آؤں ——؟ اس کا دلہا کہتا ہے کہ آسان بات ہے پائل کو اتار کر آہستہ آہستہ چلی آؤ۔" لیکن دلہن اصرار کرتی ہے کہ میں آ ہی نہیں سکتی میرا پائل بہت بول رہا ہے۔"

دیہاتی شاعری کی ان تھوڑی سی مثالوں سے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس گنوار زبان میں جذبات کا کتنا خوبصورت اور فراوان بہاؤ ہے۔

جھومر میں نغموں کا ترنم اور لطیف اشارے اور کہیں کہیں پر شوخیاں ایک عجیب حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ جھومر میں ہمیں تسلسل خیال کے ساتھ تخیل کی بلند پروازیاں بھی ملتی ہیں اور شوق کی بے قراریاں بھی۔

جھومر — ۶ —

پردیسیا سا بیرن بھئے رے میرا کیسے کہ ملنا ہوئے
چلو سیاں چلو باگوں میں ملنا ہوئے
ارے ہُواں تو مالی مالن جگے رے میرا ہُواں بھی نہ ملنا ہوئے

"دشمن پردیسیا ہوا ہے چلی جا رہی ہے اپنے ساجن سے میرا ملنا کیسے ہو۔ میرے سیاں چلو باغ میں شاید وہیں کسی طرح ملنا نصیب ہو جائے، لیکن افسوس: وہاں باغ میں بھی تو مالی اور مالن جاگ رہے ہیں وہاں بھی تو ہمارا ملنا نہیں ہو سکتا ہے۔"

— ۷ —

"چھچھل ندیا بسی ڈوبت ناہیں۔ پرائی تریا ہاتھ آوت ناہیں
گھونگھٹ والی گھونگھٹ کھولو۔ گھونگھٹ لانبی بندیا چکت ناہیں
لگے نینا جیرا انت باہیں چھچھل ندیا بسی ڈوبت ناہیں"

"جس طرح کم پانی میں بسی نہیں ڈوبتی ہے اسی طرح پرائی عورت ہاتھ نہیں آسکتی۔ اے گھونگھٹ والی گھونگھٹ کھولو۔ تمہارا آنچل اتنا لمبا کھینچا ہوا ہے کہ تمہاری پیشانی پر لگی ہوئی بندیا بھی نہیں چمک سکی ہے جب سے مجھ کو تم سے محبت ہوئی ہے کہیں میرا دل لگتا ہی نہیں ہے"

ایک اور — ۸ —

کنکر دھیرے مارو مورے مہراجا — کنکر لگنے کا کچھ ڈر ناہیں
چندر بھیگ جیہیں مورے مہراجا — کنکر دھیرے مارو مورے مہراجا
چندر بھیگنے کا کچھ ڈر ناہیں ساس دیکھ پائیہیں مور مہراجا

"میرے مہاراج دیکھو کنکر بہت آہستہ سے مارو گے۔ ہم کو کنکر کے لگنے کا تو کچھ ڈر نہیں ہے مگر میری ساری بھیگ جائے گی۔ اے میرے مہراجا ساری بھیگنے کا بھی ہم کو ڈر نہیں پڑا ہے مگر اسی کا خوف ہے کہ میری بھیگی ہوئی ساری کہیں میرے شوہر نہ دیکھ لیں اسی لئے اے میرے مہراجہ تم کنکر بہت آہستہ سے مارو۔" —— (رعلے محبوب)

ان دیہاتی گیتوں میں اردو شاعری کی طرح کہیں کہیں قافیہ اور ردیف کا بھی خیال کیا گیا ہے۔ دیہاتی شاعری میں محبت اور ایثار کے جذبات بھی اوجاگر ہیں۔

— ۹ —

جھومر: سانولا رے تیرے لئے بدنام۔ سانولا رے
جیسے کوکت بن بن کی کوئلیا ویسے کوکوں تیرے ساتھ سانولا رے"

اور: "تہرے کرنواں سیاں سہی ہیوے بگاڑ ہوراما۔ تہرے کرنواں،،

"اے میرے ساجن میں تو صرف تیرے لئے بدنام ہوئی ہوں دیکھو جیسے بن میں کوئل کوک رہی ہے ویسے ہی میں بھی تیرے ساتھ ہر ہر جگہ کوکنے کو ساری مصیبتیں سہنے کو تیار ہوں۔"

ہمیں ان گیتوں میں کہیں کہیں لطیف جذبات سلجھی ہوئی زبان بھی نظر آتی ہیں اور کسی جگہ ٹھیٹھ زبان کا مکمل حسن۔

—— ۱۰ ——

راتے کہیے سیان چوڑیا منگادے، چوڑیا جھنر جھنر کریلا ہو بالما
رتیا سُنن سُنن کریلا ہو بالما، جیرا دھڑکتہ لاگے لا ہو بالما

"رات وہ ہمسے کہہ رہی تھی کہ سیاں چوڑی منگا دیے، وہی چوڑی جو کلائیوں میں جھن جھن کرتی ہے میرے بالم۔ رات کیسی خاموش ہے میرے بالم ایسی خاموش جس کے سناٹے میں صرف میرا دل ہی زور زور سے دھڑکتا رہتا ہے۔"

"بدیسیا" ایک بے بس اور مایوس جوانی کی نڈھال مگر بولتی ہوئی تصویر ہے۔ بہار کے دیہاتی گیتوں میں یہ ایک مخصوص گیت ہے، یہ چیت سے جیاکھ تک گایا جاتا ہے اور یہ گانا بہت ہی رومانی سمجھا جاتا ہے۔

—— ۱۱ ——

"آموان جو جھڑی کے ہمن لگ لیئی ٹیکورا[1]
رے تیوُ پیارا ہی پیارا ہی رہے بدیسیا
ہمرا سے چھوٹی چھوٹی بعیلن لڑکوریا
رے ہمرا کے دن بیتے روئی رے بدیسیا
رے جُھنیاں ٹوٹے لالمبی کتیں رے بدیسیا"

"آم کا پھل لگ کر جھڑ گیا اور پھر دوبارہ اس میں ٹیکورا بھی لگ گیا ہے۔ دنوں پر دن بیتے چلے گئے مگر تب بھی میرا پیارا ہی کارا ہی ہے رے بدیسی۔ ہم سے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بچوں کی ماں بن گئی ہیں۔ لیکن ایک ہم بدنصیب ہیں کہ میرا دن روتے ہی بیتا ہے۔ اے بدیسی۔ میرے لمبے بال کس کام کے جو حزن و ملال میں صرف زمین ہی پر لوٹتے رہے ہیں۔"

ایک اور خالص بہار کا دیہاتی گیت سن لیجئے:۔

۱۲ — "مَیا گے مَیا دَ ماد ال ہُو۔ اِلی کے سُور پر بیٹھل ہُو۔
حُقہ تماکُو ما منگت ہُو۔ چلیا منگادے سکیتے جادن
چندی رنگادے لچکتے جاؤن"

"ارے ماں رے ماں تیرا داماد آیا ہے جو املی کی جڑھ پر بیٹھا ہوا ہے وہ حقہ اور تما کو پینے کو مانگ رہا ہے۔ ارے ماں مجھ کو چولی منگا دے جس کو پہن کے مسکاتی ہوئی میں وہاں پر جاؤں جلدی سے چندری رنگا دے جس کو پہن کر لچکتی ہوئی میں اس کے پاس جاؤں۔"

---

[1] بہار میں آم کی کیری کو "ٹیکورا" کہتے ہیں۔ [2] محبوب

غربت اور بیچارگی کا کتنا نمایاں اظہار ہے اس گیت میں بھیگی ہوئی آنکھوں کے سامنے کبھی کبھی موہوم سے خواب جھلک آتے ہیں مگر تھکی ہوئی مضمحل روح ایک غمناک آہ کے ساتھ ان کے آنسوؤں کو پونچھ دیتی ہے۔

—— ۱۳ ——

"بابا مورا اَرہی تن، بگیا لگئی تن
ہم بھلوا لوڑھیے جیتی نو ہیے یار گوئیاں
بھلوا لوڑھی اِیے لوڑھی بھرتی جنگریا
بلموان پر چڑھیتی نو ہیے یار گوئیاں"

"اگر میرا باپ زندہ رہتا تو وہ ایک باغ لگاتا اور ہم وہاں پھول چننے کے لئے جاتے سنتی ہو میری سہیلی اور سکھیاں۔ ہم اتنا پھول چنتی کہ جس سے چنگریاں بھر جاتیں اور پھر ہم وہ سارے پھول اپنے بالم پر لاکر چڑھا دیتے۔"

حسرت و یاس کے کتنے شعلے ان گیتوں میں بھر دیے گئے ہیں غیر مانوس زبان کے ہوتے ہوئے بھی ان گیتوں کے نشتر دلوں میں جبر کے لگا دیتے ہیں۔ بدیسیا چیت اور بسنت بھی بہار کے خاص گیتوں میں سے ہے۔

—— ۱۴ ——

"کوُن بن کُوکت کوئیلا ہو راما۔ کوُن بن کُوکت"
"یہ کوئل کس جنگل میں کوک رہی ہے۔ رام جس کی آواز سے میرے دل میں بھی ہوک اُٹھ رہی ہے۔"

اور —— ۱۵ ——

"چیت ماسا چُندری رنگا دے ہو راما، چیت ماسا چندری"
میرے محبوب چیت کا جنون خیز موسم آگیا ہے ہم کو چندری رنگا دو کہ ہم اس رنگ رلیوں میں زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں۔

بڑھتے ہوئے موسم کے سنگم پر گلی گلی میں بسنت اور چیت کے نغمے کوئل اور پپیہے کے مضراب سے ہم آہنگ ہو کر کیف و سرور برساتے ہیں۔

بہار کی بھوجپوری بولی کا گیت بھی سن لیجئے جن کے اتار و چڑھاؤ زیر و بم اور اظہار میں کتنی نغمگی ہے۔

—— ۱۶ ——

"تُھسک میں رُوا کے باٹے ہم تو بھیٹی لی بکرا۔ بے کھودی ہکیے بُولا چھین کے منواں ہمار ہمکو کا معلوم تھا دل کے کے توُں کر باڈ کا۔ ہم تو اتنا جانتی تو پیت نا کرتی نہار"

"اے میرے محبوب ہم تمہارے عشق میں بہت زیادہ بیقرار ہیں تم نے میرا دل چھین کر ہم کو بیخود بنا دیا ہے۔ ہم کو کیا خبر تھی کہ تم میرا دل لیکر ہم سے اس طرح بیوفائی کروگے۔ اگر ہم کو یہ معلوم ہوتا تو ہم کبھی بھی تم سے محبت نہ کرتے۔"

آسٹریلیا کی مشین اور دنیا کی غذا کا مسئلہ

جیسے فصل پیدا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے زمین تیار کرلی جائے اسی طرح کاشتکار طبقہ کو امداد باہمی کے اصول پر مشترکہ مشینوں، کے ذریعہ کام کرنے پر بھی تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس اسکیم میں جو مفید امکانات پوشیدہ ہیں ان کی کوئی حد و انتہا نہیں۔"

نیو ساؤتھ ویلز کی فارم میکنائزیشن (مشین کے ذریعہ زراعت کرنے کی) اسکیم کے اگزیکٹو افسر مسٹر لیونرڈ ھڈ نے اس تحریک کی ——— جو آسٹریلیا میں کافی ترقی کر چکی ہے اور جس میں ہندوستان کیلئے بھی کافی دلچسپی کا سامان ہے، دشواریوں کا خلاصہ اور اس کے مستقبل کے متعلق اپنا اندازہ مذکورہ بالا الفاظ میں پیش کیا ہے۔

مسٹر ھڈ کی خوش امیدی بیجا نہیں ہے۔ نیو ساؤتھ ویلز کے بعض ساحلی ضلعوں کے ان علاقوں کی پیداوار جہاں کاشت ہوتی ہے اس اسکیم کے ذریعہ انفرادی کاشت کے مقابلہ میں تین سو فیصدی تک بڑھ گئی ہے اور یہ محض اسلئے ممکن ہوسکا کہ صحیح وقت پر مشینری فراہم کردی گئی تھی۔ دودھ اور اس سے تیار ہونے والی اشیاء میں جو کمی ہوئی تھی وہ بہت کچھ اسی اسکیم کی وجہ سے خطرناک صورت اختیار کرنے سے رک گئی۔ اور یہ کامیابی ایسے حالات میں ہوئی جب ملک کے ایک بڑے حصہ میں قحط کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ یہ وہی دو سالہ قحط تھا جو ابھی حال میں دور ہوا ہے۔

مسٹر ھڈ کا خیال ہے کہ " آگے چلکر پورے ملک میں اس اسکیم کے ذریعہ کاشتکاری کے طریقوں اور کاموں میں اہم ترقی ہوگی جس سے معاشی پیداوار بڑھیگی اور اس طرح ہی صنعت و حرفت کی خوش حالی میں اضافہ ہوگا"

مسٹر ھڈ نیو ساوتھ ویلز کے محکمہ زراعت میں ایک بڑے استاد کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔ انہیں سالہا سال کا عملی تجربہ ہے کیونکہ وہ گیہوں پیدا کرنے والے ضلعوں میں نیز ان ضلعوں میں جہاں دودھ اور اس سے تیار ہونے والی چیزوں کا کاروبار ہوتا ہے فیلڈ افسر رہے ہیں اور اس کے علاوہ ہاکنسبری ایگریکلچرل کالج اور ریٹمور اکسپرمنٹ فارم میں فارم منیجر بھی رہ چکے ہیں لہذا انہیں اس طرح کی چیزوں سے پوری واقفیت ہے۔

ایڈگر بی

اس اسکیم کے لگ بھگ کوئی نہ کوئی چیز تو ہونی ہی تھی اسلئے کہ اسٹریلیا۔ جس کی کل آبادی ستر لاکھ ہے۔ جنگ کے زمانے میں علاقہ بحرالکاہل کے ایک کروڑ بیس لاکھ انسانوں کو غذا فراہم کرنے کی ذمہ داری لے چکا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ دیہاتوں میں سیکھے ہوئے اور تجربہ کار کام کرنے والوں کی بیحد کمی تھی کیونکہ لوگ لڑائی میں بھرتی ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ نئی مشینیں اور فالتو پرزے بھی نایاب ہو رہے تھے۔ اس سب کے باوجود یہ اسکیم کچھ ایسی کامیاب ہوئی کہ اب اس کا جاری رہنا لازمی ہے۔ ماہرین یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ اگر اسٹریلیا کو سمندر پار کی منڈیوں میں تجارتی مقابلہ اور برابری کرنی ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ ابتدائی اور اہم پیداوار کے سلسلہ میں بالکل مشینوں سے کام لینا شروع کردے۔ اور آسٹریلیا کو مقابلہ بہر حال کرنا ہی پڑے گا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آسٹریلیا کی برآمد کا تقریباً بیاسی فیصدی۔ جسکی اوسط مالیت ڈیڑھ ارب روپیہ سالانہ آتی ہے۔ زرعی صنعتوں کی پیداوار ہے۔ آسٹریلیا کے فارموں کی کل پیداوار کا تقریباً چالیس فیصدی باہر بھیجدیا جاتا ہے۔

امداد باہمی کا طریقہ

مسٹر جیمس مارس بادن (کوئنس لینڈ) صدر اسٹریلین امریکن اسوسی ایشن نے حال ہی میں اخبارات کو یہ اطلاع دی ہے کہ ان کے پاس محکمہ جنگ کے پندرہ سو آدمیوں کی فہرست ہے جو اپنے وطنی ضلع میں واپس آنا چاہتے ہیں مگر وہ چاہتے ہیں کہ انہیں نوآبادکاری کی کوئی اسکیم دی جائے اور وہ اپنے طور پر مشینی ذرائع استعمال کرکے اس کو عمل میں لائیں۔ وہ ہمارے "کدال، بیلچہ اور ہاتھ گاڑی" کے تصور سے بیزار ہیں۔

اگرچہ آسٹریلیا میں جہانتک وسیع پیمانہ کی کاشت کا تعلق ہے، خصوصاً گیہوں کی کاشت کا، وہ مشینی ذرائع سے ہوتی ہے تاہم "کدال، بیلچہ اور ہاتھ گاڑی" کا جو نام لیا گیا ہے وہ غلط نہیں ہے اسوجہ سے کہ جنگ شروع ہونے تک چھوٹی چھوٹی آراضیوں کی کاشت میں انہیں چیزوں کا استعمال رہا ہے بلکہ بعض بعض جگہ اب بھی یہی صورت قائم ہے۔ البتہ اتنا یقین کیسا تھ کہا جاسکتا ہے کہ نیو ساؤتھ ویلز کی میکنائزیشن اسکیم نے دلوں میں جگہ کرلی ہے۔ اس اسکیم نے نیز اس قسم کی دیگر اسکیموں مثلاً غذائی کنٹرول

وکٹوریہ گورنمنٹ میکنائزیشن اسکیم وغیرہ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آسٹریلیا کے کاشتکار اور وہاں کی حکومتیں یہ تہیہ کر چکی ہیں کہ امداد باہمی کے طریقوں پر چل کر وہ خوش حالی کی منزل تک پہونچیں۔

مشترکہ مشینری، کے نظام نے ترقی پسند کاشتکاروں پر پوری طرح یہ بات روشن کر دی ہے کہ کاشتکاری کے مختلف مرحلوں کو جنہیں وقت کا مسئلہ کافی اہم ہوتا ہے، اگر جلد از جلد طے کیا جائے تو اس سے کتنا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کاشتکاری کے جن جدید آلات کو کاشتکار امداد باہمی کے اداروں سے کرایہ پر لیا کرتا تھا اب انہیں اوزاروں کو وہ چاہے گا کہ اس کی ذاتی ملکیت ہو جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر ان کی قیمتیں اس کی دسترس سے باہر ہوئیں تو وہ کرایہ ہی پر لیکر کام چلاتے رہنے پر مجبور ہو گا۔

مسٹر جڈ کہتے ہیں کہ حکومت کی تحریک پر امداد باہمی کے ذریعہ کاشتکاری کا یہ تجربہ ایک انوکھی چیز ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں اس سے ملتی جلتی اسکیمیں تو ضرور چل رہی ہیں مگر بعینہٖ اس قسم کی کوئی اسکیم نہیں ہے۔ اس طریقہ میں جو نمایاں فائدے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس اسکیم کے ذریعہ غلہ پیدا کرنے والوں کا دیہی صنعت پر سو فیصدی اقتدار قائم ہونا آسان ہو جاتا ہے۔

اس قسم کا پہلا مرکز جون ۱۹۴۳ء میں نادرا میں قائم کیا گیا اور نومبر ۱۹۴۵ء تک نیو ساؤتھ ویلز کے ۳۰۹۴۳۳ میل تک پھیلے ہوئے علاقہ کے مختلف مقامات میں امداد باہمی کے اصول پر مشترکہ مشینری، کے ۱۷ مرکز قائم ہو چکے تھے اور ۸ میں مرکز اور قائم ہو رہے تھے مینڈی جیسے دور دراز مقام پر بھی جو دریائے ڈارلنگ پر واقع ہے ترکاری کی کاشت کرنے والوں نے مشترک ہو کر کام شروع کر دیا تھا۔ ان مشترکہ مشینری کے مرکزوں میں سے تقریباً ۳۷ فیصدی شمالی اور وسطی ساحل پر ہیں۔ ۲۱ فیصدی اندرون ملک کے قطعوں میں ہیں۔ ۱۶ فیصدی جنوبی سطح مرتفع میں ہیں اور ۱۱ فیصدی شمالی سطح مرتفع میں یا اس کے قریب واقع ہیں۔

سرکاری امداد

مختصر یہ کہ ملکی حکومت نے غیر سودی رقمیں دیکر کاشتکار طبقہ کو امداد باہمی کے اصول پر استعمال کرنے کے لئے مشترکہ مشینری فراہم کرنے میں کافی مدد دی ہے۔ کیوں؟ اسلئے کہ اگر عام کاشتکار ذاتی طور پر اپنی کاشتکاری کا کام بالکل مشین کے ذریعہ سے انجام دینا چاہے تو اس کی مالی حیثیت اسے برداشت نہیں کر سکتی۔

سطح مرتفع کے علاقوں میں عام طور پر دو قسم کے مرکز قائم ہیں، ایک وہ جن سے غلہ کی کاشت میں مدد ملتی ہے دوسرے وہ جن سے فصل کاٹنے میں مدد ملتی ہے۔ جہاں دودھ وغیرہ کا کاروبار ہے وہاں عموماً پہلی قسم کے مرکز قائم ہوئے ہیں۔ جانوروں کے چارہ اور پانی کے ذخیروں کے سلسلہ میں بھی مشترکہ مشینری کے مرکز قائم کرنے کے لئے لوگوں میں قومی رجحان پایا جاتا ہے۔

پہلی قسم کے مرکز میں جو مشینیں ہوتی ہیں وہ یہ ہیں — ٹریکٹر ہل مشین اور تخم ریزی کے آلات سطح مرتفع کے علاقوں میں ان مشینوں کے علاوہ کھیت کاٹنے کی مشین گٹھے باندھنے کی مشین اور آلو کھودنے کی مشین بھی ہوتی ہے۔ بعض مرکزوں میں پورے اوزار ہوتے ہیں مثلاً اناج کاٹنے گھاس کاٹنے، گٹھا باندھنے، سوکھی گھاس باندھنے، گھاس سمیٹنے وغیرہ کی مشینیں۔ ان میں سے بعض اوزار ایسے ہیں جنہیں باہر سے منگانا پڑتا ہے۔ جنگ سے پہلے آسٹریلیا میں اوزار بنانے کی صنعت تھی جو ڈیزائنوں کی جدت اور اوزاروں کی عمدگی کیوجہ سے ساری دنیا میں مشہور تھی لیکن موجودہ حالات میں جس قسم کے اوزار وہاں کاشتکاری میں کام آتے تھے ان کی بنا پر

معذرت

فرید جاوید

دیکھ کے حسین چہروں پر
دل کہ سوزِ دروں سے ہے مانوس
تیرا پیغام سرخوشِ تسلیم
مسکرانا بھی ہے محال اے دوست
بارہا نامراد آنکھوں نے
جائزہ لے نہ لیوں محبت کا
ادھ کھلی ہی رہے تو اچھا ہے
مجھکو رنگین آبگینوں میں
مجھ سے لازم ہے اجتناب تجھے
شامِ غم اضطراب کم نہ ہوا

کس کو فرصت نگاہ کون اٹھائے؟
ماہ پاروں سے کون آنکھ لڑائے؟
شدتِ غم سے دل اگر بھر آئے!
کسطرح قہقہوں سے کھبلا جائے
بے ارادہ بھی اشکِ خوں چھلکائے
دیکھ اخلاص پر نہ حرف آ جائے
پھول بنکر کلی عبث مرجھائے
تلخ تر گھونٹ زندگی نے پلائے
گل کدے پر ترے خزاں کیا چھائے
دھیمے دھیمے سروں میں گیت بھی گائے

ایک بیدارِ دل جواں شاعر
تا کجے رنگ و بو سے دل بہلائے

یہاں تیار ہونے والے اوزاروں کی قسمیں جو محدود تھیں۔ لیکن لڑائی کے زمانہ میں اس سلسلہ میں کافی ترقی ہوئی۔ اسلئے اب جس جس قسم کی مشینوں کی ضرورت ہوگی وہ تقریباً سب کی سب یہاں بن سکیں گی۔

قرضہ اور پٹہ کی اسکیم کے ماتحت یہ صورت ہوگئی تھی کہ اگر کوئی مشینری آسٹریلیا میں بن سکتی ہے تو وہ ممالک متحدہ امریکہ سے نہیں آسکتی تھی۔ لہذا کامن ویلتھ فوڈ کنٹرول کے مشینری سکشن نے صنعتی سہولتوں اور پیداوار کی بدلتی ہوئی ضروریات کا جائزہ لینا شروع کیا اور ۱۹۴۳ء میں ایک ایسا پروگرام شروع کیا جس سے فرموں کو کامن ویلتھ گورنمنٹ سے معاملات طے کرکے نئے نئے اوزار اور مشینری بنانے کی ہمت افزائی ہو کامن ویلتھ کی وزارت سامان جنگ نے احکام نافذ کئے جنکی رو سے فرموں کو ۱۹۴۵ء کے اختتام تک ساڑھے سات کروڑ سے اوپر مالیت کی مشین تیار کرنیکے لئے خام اشیاء مزدور اور وسائل فراہم کرلینے کا حق مل گیا۔ اب ایسی پچیس قسم کی نئی مشینیں تیار ہو رہی ہیں جو کامن ویلتھ میں اس سے پہلے نہیں بنی تھیں۔ ان مشینوں میں آلو کھودنے کی وہ مشینیں بھی ہیں جو پاور سے چلتی ہیں اور بیج بکھیرنے کی مشین، ترکاری بونے کی مشین، چقندر نکالنے کی مشین، ہسراون، پھلی توڑنے کی مشین وغیرہ بھی ہیں۔ آسٹریلیا میں مشینی کاروبار کی مسلسل ترقی کے لئے یہ ایک عمدہ بنیاد مل گئی ہے۔

ان مشینوں کے علاوہ باہر سے بھی مشینیں منگائی گئیں اور اب بھی منگائی جارہی ہیں۔ مثلاً لڑائی سے پہلے تقریباً ڈیڑھ ہزار ٹریکٹر سالانہ کی درآمد کا اوسط تھا۔ ۱۹۴۳ء میں دو ہزار سے زیادہ ایسے ٹریکٹر درآمد کئے گئے جو ممالک متحدہ امریکہ میں وسیع پیمانہ کی کاشت کیلئے موزوں ثابت ہوچکے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی دیگر اقسام کی مشینیں منگائی گئیں۔ ۱۹۴۴ء میں چھ ہزار سے زیادہ ٹریکٹر درآمد ہوئے۔

سوسائٹیوں کی امداد

امداد باہمی کے مشترک مشینری والے اداروں کی ترقی امداد باہمی کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ گذشتہ چند سال سے آسٹریلیا کی زندگی میں امداد باہمی کی سرگرمیاں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ نیو ساؤتھ ویلز گورنمنٹ اب تک اکیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ سے زیادہ کاشتکار طبقہ کو قرض دے چکی ہے اور مزید رقمیں بھی مقرر ہوچکی ہیں۔

افراد کو تیس ہزار روپیہ تک دیا جاسکتا ہے اور وہ بھی بلاسود۔ یہ البتہ ضروری ہے کہ سوسائٹی منظور شدہ ہو، کاشت کرنے اور فصل کاٹنے کے سلسلہ میں منظور شدہ مشینریاں لینے پر آمادہ ہو اور اس کے لئے تیار ہو کہ ان مشینوں کو کاشتکاران ضلع کے فائدہ کے لئے اپنی نگرانی میں استعمال کرائیگی۔

اس رقم میں جو حکومت کی طرف سے دی جاتی ہے اس میں کام کا ابتدائی خرچ، تین مہینہ کی تنخواہ ایندھن، تیل، پرزے اور مرمت کے اخراجات بھی لازماً شامل ہونے چاہئیں۔ اور بشرط ضرورت مکان فراہم کرنے کی سہولتیں بھی ہونی چاہئیں۔ اس اسکیم میں موٹر لاری یا ایسی مشین جو ضلع کی عام ضروریات کے لئے کارآمد نہ ہو یا وہ اوزار جسے اوسط درجہ کے کاشتکار کو خود خریدنا چاہئے شامل نہیں ہیں۔

سوسائٹی کی ضروریات کی تفصیل نیو ساؤتھ ویلز کے دیہی بنک کی مقامی شاخ کے ذریعہ بھیجی جاتی ہے۔ جو رقم دی جاتی ہے وہ اسی شاخ کے مشینری ٹرسٹ اکاونٹ میں جمع کردی جاتی ہیں۔ مشینری کی خرید اس کی نگہداشت اور چلانے کے لئے جو رقم بھی نکالی جاتی ہے وہ ٹرسٹ اکاونٹ سے نکالی جاتی ہے اور مشین کے کرایہ کی جو رقم جمع ہوتی ہے وہ بھی اسی اکاونٹ میں جمع کی جاتی ہے۔ تین مہینہ کی ابتدائی مدت کے بعد کاشتکاروں سے جو رقم جمع کیجاتی ہے اس میں سے سوسائٹی مشین کی نگہداشت اور اس کے چلانے کے اخراجات وصول کرتی ہے۔

سوسائٹی کے ممبروں میں سے پچھتر فی صدی کا کاشتکار ہونا ضروری ہے۔ سوسائٹی کے لئے لازمی ہے کہ وہ مستقل اور معقول تنخواہ دار سکرٹری رکھے جسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ پورا وقت دینے والا آدمی ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہوشیار اور لائق مشین چلانے والا یا چلانے والے رکھے۔ سوسائٹی کے ڈائرکٹر ایسے لوگ ہوں جنکی اس طبقہ میں وقعت ہو۔ سوسائٹی کے لئے لازمی ہے کہ وہ ان قرضہ جات کی ادائیگی کا ذمہ لے اور کوآپریٹیو ایکٹ ۱۹۲۳-۴۵ء کے ماتحت رجسٹرڈ ہو۔ منافع ادا شدہ سرمایہ کا چھ فیصدی سے زیادہ نہ مقرر کیا جائے اور کوئی رکن اس کے حصوں کی مجموعی تعداد کے ۱/۵ سے زیادہ حصہ نہ خریدے۔

امداد باہمی سوسائٹی کے ارکان کی تعداد کم از کم سات ہو اور ہر رکن کے پاس کم از کم پانچ حصے ہوں اور ایک حصہ کی قیمت عـ۱۱ ہو۔ ایک ہی قسم کی دو یا دو سے زیادہ سوسائٹیاں اگر چاہیں تو باہمی

مفاد کے پیش نظر متحد ہو کر ایک اسوسی ایشن بنالیں اور دو یا دو سے زیادہ اسوسی ایشن متحد ہو کر ایک یونین بنالیں ۔ یقین کیا جاتا ہے کہ ان حلقوں سے امداد باہمی کے اصول پر فارموں کو مشینری کے ذریعہ چلانے میں کافی اہم قسم کی مدد ملے گی ۔

کاشتکار کا نفع اس اسکیم سے کاشتکاروں کے لئے نفع کی حسب ذیل صورتیں ہونگی ۔

(۱) زندگی کا بہتر طریقہ ۔ خصوصاً دودھ اور اس سے تیار ہونے والی چیزوں کا کاروبار کرنے والوں کو پبلک کاموں کیلئے یا مثلاً تفریحی اور تعلیمی مشاغل کیلئے زیادہ وقت ملیگا ۔ خصوصاً پیداوار کے مسائل پر تفصیل کیساتھ غور و خوض کرنے کا زیادہ وقت ملیگا ۔
(۲) پیداوار میں جلد اور موثر اضافہ ہوگا ۔ (۳) اس وقت آدمیوں کی محنت کی کمی بیشی پر پیداوار کا بہت زیادہ انحصار ہوتا ہے اس کے بعد اس حد تک یہ انحصار نہیں باقی رہیگا ۔ (۴) ایک ایسے مکمل اور جدید ترین یونٹ کی خریداری کے لئے جو سوسائٹی کی ضروریات کے لحاظ سے موزوں ہو مالی وسائل بہ اطمینان فراہم ہوسکیں گے اور اس رقم کی جو غیر سودی قرض کے طور پر ملے گی ادائیگی کی صورت بھی سوسائٹی کی حیثیت کے مطابق مقرر ہوگی (۵) ڈیری فارم کے مویشیوں کی بہتر نگہداشت ہوسکے گی اور ترقی کی نئی نئی صورتیں سوچنے کا موقع زیادہ ملے گا (۶) فارم کا کام زیادہ بہتر اور سلجھے ہوئے طریقہ پر ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کے حوصلے بڑھے رہینگے ۔ وہ زیادہ دلچسپی اور جوش و خروش سے کام کرینگے ، زیادہ بہتر کام کرینگے ۔ اور اس کا یہ اثر ہوگا کہ زراعت کا کام جدید ترین سائنٹفک اور اقتصادی طریقوں پر ہونے لگیگا ۔ (۷) ایک ایسی بنیاد مہیا ہوجائیگی جس پر صحیح معنوں میں کاشتکاروں کے درمیان امداد باہمی اور پیدا کرنے والوں کے اقتدار کی عمارت تعمیر ہوسکے گی ۔ (۸) اس وقت کے ذاتی فارموں میں جو ضرورت سے زیادہ سرمایہ دارانہ حیثیت پائی جاتی ہے وہ ختم ہوجائے گی (۹) زراعتی کام وقت پر مکمل ہونگے ۔ (۱۰) جدید طریقے جلد سے جلد پھیل جائینگے ۔ (۱۱) غلامانہ مشقت کا قصہ ختم ہوجائے گا ۔ (السٹریٹیڈ ویکلی بمبئی سے ماخوذ)

لکھنے والوں سے : ۔ رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ ان کو اسی رسالہ میں شائع کرلیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کرلیا جائے علمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں ۔ (ادارہ)

منتخب کتابیں

امیر پاکستان : ۔ مصنفہ عارف بٹالوی ؛ ۔ ناخدائے ملت اسلامیہ قبلہ جناح کی بلند و برتر شخصیت اور ۱۹۰۶ء سے کانگریس کا ردیہ مسلمانوں کے ساتھ ۔ قیمت دو روپے ۔
حالات قائد اعظم : ۔ مسیح الملک ملت قائد اعظم مدظلہ کی سوانح ادبی رنگ میں ۔
انجم کدہ : ۔ دور حاضرہ کے اساتذہ اور مشاہیر شعرا کا ۱۹۴۵ء کا بہترین کلام نظم و غزل معہ فوٹو اور حالات ۔ قیمت دو روپے ۔
میر صاحب : ۔ عادل رشید کا شاہکار جس میں فلم و ادب پر بہترین انداز میں طنز کیا گیا ہے ۔ قیمت تین روپے ۔
فتح بیت المقدس : ۔ مصنفہ صادق حسین صدیقی ؛ جس میں مساوات اور بہادری کے انمول نمونے دکھائے گئے ہیں ۔ قیمت ۸؍
بیل بوٹے ، مصنفہ مظفر حسین شمیم ۔ پر از معلومات مضامین کا دلکش مرقع رنگین افسانوں کا مجموعہ ۔ قیمت دو روپے ۔
جھلکیاں : ۔ مصنفہ رہبر بٹالوی : ۔ اس مجموعہ میں افسانوں کے ذریعہ زندگی کی وہ تصویریں دکھائی گئی ہیں جو محبت بھرے دلوں کے لئے پیام کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ قیمت عہ
دل کے آنسو : ۔ مصنفہ رئیس احمد جعفری ؛ ۔ آئینہ ہے ان ٹھوس حقیقتوں کا جن سے ہمیں روزانہ سابقہ پڑتا ہے ۔ قیمت عہ
منجدھار : ۔ مصنفہ نادم سیتاپوری : ۔ ان افسانوں میں ہماری اخلاقی اور سماجی زندگی کے خاکے پیش کئے گئے ہیں ۔ قیمت عہ
ان سنی : ۔ مصنفہ نادم سیتاپوری : ۔ طوائف جب محبت کرتی ہے تو سماج اور سوسائٹی چیخ اٹھتی ہے ۔ نہ جانے کیوں !! قیمت عار
گھروندے : ۔ مصنفہ عرش تیموری ؛ ۔ بہترین مکالموں ، لطیف طنز اور کردار نگاری کا حامل ڈراموں کا مجموعہ ۔ قیمت عہ
جویائے حق : ۔ مصنفہ شرر مرحوم : حضرت سلمان فارسی اور حضور اکرم صلعم کے حالات نہایت دلکش انداز میں بیان کئے گئے ہیں قیمت فی جلد ۸؍ اور ہر سہ مکمل حصہ سات روپے آٹھ آنے ۔
غیب داں دلہن : ۔ مصنفہ شرر مرحوم : ۔ بری سوسائٹی کے نتائج بیوی کی حیرت انگیز غیب دانی ، ریاکار دوستوں کی چالیں ۔ ایک شریف خاندان کا تباہی سے بچنا ۔ قیمت عہ

فہرست کتب مفت طلب کریں

مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳

آشوب

افسانہ

رفیق علی

طاہرہ کے لئے رو بے تو وبال جان ہو کر رہ گئے تھے۔ جب اس کی بوڑھی ماما پیالی میں سفیدہ گھس کر لاتی تو اس کی روح کانپ اٹھتی، وہ ایک جھرجھری سی لیتی، مگر اس کی تمام مدافعانہ کوششیں بے کار جاتیں، وہ اس کے سر کو بری طرح دبوچتی، وہ حیران رہ جاتی آخر اس مرگھلی بڑھیا میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے، اور اس کی سخت سخت سی انگلیاں جیسے کسی نے پتھر کی سلائی پھیر دی ہو، وہ سر شام ہی مرغی کی طرح لحاف میں سکڑ کر دبک جاتی، وہ خرخر خراٹے بھی لینے لگتی، اس کا باپ کہتا "طاہرہ بڑی گہری نیند سو رہی ہے" اسے اپنے باپ کی سادہ لوحی پر بڑی ہنسی آتی، وہ دوپٹے کا پلو اپنے منہ میں ٹھونس لیتی، مگر ماما کے پیروں کی چاپ سن کر وہ یوں کلبلانے لگتی جیسے بین پر سانپ ناچ رہا ہو، اس کے لئے ماما عزیزن افسانوی جادوگرنی سے کم خونخوار نہ تھی، پوپلا منہ، سفید بال، جھریوں دار کھال، موٹی موٹی ابھری نسیں، مگر جب وہ پیار بھرے لہجہ میں کہتی "اٹھو بھی میری شہزادی" تو اس کا تمام خوف دور ہو جاتا، اور وہ یوں سب باتیں مان لیتی جیسے سچ مچ وہ شہزادی ہے کیونکہ اس نے کہانیوں میں سنا تھا کہ شہزادی کبھی بری لڑکی نہیں ہوتی۔

وہ اگر بچوں کی طرح ٹھنکتی تو بڑھیا کی گرفت اور سخت ہو جاتی، وہ اسے جھنجوڑ ڈالتی "اے ہے بی بی اب تم بچہ تھوڑی ہو" اور وہ اس طرح دل کڑا کر لیتی جیسے اس نے ماما کے چیلنج کو منظور کر لیا ہو، مگر اس کی تسلی میں سچی ہمدردی کی چاشنی ہوتی "بی بی اس میں میرا کیا فائدہ، تمہاری ہی آنکھیں پھریری ہو جائیں گی، ایسی بڑی بڑی نکل آئیں گی کہ بس دیکھا کرو" یہ سن کر وہ اطمینان کی ٹھنڈی سانس بھرتی، کیونکہ اسے احساس تھا کہ بغیر آنکھیں ہیرا ہوئے اس کا شہزادہ اس کے پاس نہ آئے گا، وہی شہزادہ جس کے بارے میں وہ لاکھوں بار کہانیوں میں سن چکی تھی۔

وہ ایسی منزل پر کھڑی تھی جہاں بچپن اور جوانی گلے ملتے ہیں اسی لئے جب وہ اپنے بچپن کے بارے میں سوچتی تو اوروں کی طرح ہلکی سی ٹھنڈی آہ اس کے نمکین ہونٹوں کو مرتعش نہ کرتی، ماضی کی یاد گدگدی بن کر بدن میں تحلیل نہ ہوتی بلکہ اسے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کل کی بات ہو، ایک ایسی کہانی جو بوجھل پپوٹوں کی وجہ سے پوری نہ سن سکی ہو اور دوسرے دن پھر اسی کی فرمائش کر لے۔

ماں کی وفات طاہرہ کے لئے ایک جانسوز واقعہ تھی، یہیں اس کو زندگی کا تسلسل دم توڑتا محسوس ہوتا جیسے زندگی کی کچھ کڑیاں ایک دوسرے میں پروئے جانے سے رہ گئی ہوں، وہ بھولی ہوئی تھی کہ اس کی ماں نہیں ہے، وہ تو یہی سمجھتی جیسے وہ پریوں کے ملک میں اس کے لئے شہزادہ ڈھونڈنے گئی ہے، اس کی ماں کی تمام چیزیں ویسی ہی رکھی تھیں، اس کا باپ ہر اس شے کو جو ہاجرہ کی زندگی سے متعلق تھی علیحدہ کرنے پر تیار نہ تھا۔ اس کی خالہ زاد بہن نے اس سے رازدارانہ طور پر کہا "اے ہے بہنو! خالو ابا بھی کیا سٹھ گئے ہیں، کوئی مردوں کے کپڑے بھی یوں سینت سینت کے رکھتا ہے" اور نواور خود دادی جان نے بھی کہا "اس سانحہ سے صمد کا دماغ ماؤف ہو گیا ہے" جتنے منہ اتنی باتیں سن کر وہ سراسیمہ ہو جاتی، وہ جائے نماز پر بیٹھ کر بہت گڑگڑا کر دعائیں مانگتی یا اللہ میاں میرے ابا اچھے رہیں" مگر جب اس کی ماما اسے سمجھاتی کہ بیٹی اس دنیا میں سچی محبت کرنے والے ہی تو دیوانے کہلاتے ہیں"! تو اس کا تحیر کچھ مٹ جاتا اور وہ اپنی لٹوں کو اوپر پھینک کر کہتی "مٹ جائیں میرے ابا کو پاگل کہنے والے!"

اسے پچھلی باتیں اچھی طرح یاد تھیں جیسے وہ بھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں سی ہوں۔ اس نے اپنی آنکھوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہ کی تھی مگر اس نے اپنے ابا کو اکثر کہتے سنا تھا کہ ہاجرہ طاہرہ کی آنکھیں تم سے کتنی ملتی ہیں، اس کی ماں کی آنکھیں کتنی شربتی تھیں، کتنی نیلی گہری آبی۔ وہ بڑے اشتیاق سے سنا کرتی کہ اس کے پیدا ہونے پر اس کی آنکھوں پر کیسا کیسا تبصرہ ہوا، اوٹ پٹانگ باتیں جن کا سر نہ پیر، کسی نے کہا یہ تو صمد کی لڑکی ہی نہیں معلوم ہوتی اور ہاجرہ پر گھڑوں پانی پڑ گیا، طاہرہ سانولی تھی اور ہاجرہ اور صمد دونوں گورے۔ مگر وہ بہت ملیح تھی، جیسے سپیدۂ سحر میں شبنمی رات کی تازگی جھلملاتی ہو، اس کی آنکھوں کے بارے میں سب کی ایک ہی رائے تھی، صمد جب یہ کہتا کہ "ہاجرہ اس کی آنکھیں تو تم سے بھی زیادہ کٹیلی ہیں" تو وہ اس طرح کھل اٹھتی جیسے اس کی تعریف میں آخری الفاظ کہہ دئے گئے ہوں، طاہرہ کی آنکھوں کے بارے میں عجیب عجیب تاویلیں پیش کی جاتیں، کچھ کا خیال تھا کہ ہاجرہ کلکتہ میں جو ایک سال رہی ہے یہی تاویل سب سے زیادہ سراہی جاتی، اسی لئے سب اسے پیار میں بھولی بنگالن کہتے، اس کی لانبی پلکوں پر عجیب سحر منڈلاتا رہتا، اس کے بھولے چہرے میں دل میں گھر کرنے کی بے پناہ قوت تھی، طاہرہ ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لی جاتی اور ہاجرہ کو گود میں لینا بہت کم نصیب ہوتا، جب وہ بہت کڑھتی تو صمد اسے تسلی دیدیتا "ہر خوبصورت شے کسی ایک کا اجارہ نہیں ہوتی، اب جو لوگ مڑ مڑ کر تمہیں دیکھتے ہیں تو میں برا تھوڑی ہی مانتا ہوں" اور ہاجرہ لجا کر سمٹ کر پلکوں کی عجیب جنبش

سے کہتی "آپ تو نرے شاعر ہیں!" جس میں کچھ طنز بھی ملی ہوتی کیونکہ صمد کا یہی رونا تھا کہ ہاجرہ تمہارے حسن میں کتنی شعریت ہے اور میں کتنا روکھا پھیکا آدمی ہوں کہ اس کی اچھی طرح تعریف بھی نہیں کر سکتا۔

آج جب وہ اپنے گھر لوٹی تو اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں، جذبات کے کالے کالے بادل اسکے عضو عضو میں منڈلا رہے تھے، اس نے تہیہ کر لیا کہ اب وہ خالہ کے گھر کبھی نہ جائے گی، کیونکہ ساجدہ، شہلا، فاخرہ، نے آج اسے دل کھول کر چندی چندی کہا، وہ بھی صرف اس لئے کہ عابد کسی ایسی ویسی نظر سے نہ دیکھے، کتنی اتراتی ہیں بیچاری اپنی صورتوں پر، وہ چندی ہے تو اپنے لئے ہے۔ یہ یاد کر کے اس کی آنکھیں بھر آئیں کہ چندی کہنے پر اس کی ماں کتنی برہم ہوا کرتی تھیں، وہ بہت وہمی تھیں زیادہ محبت کرنے والے وہمی بھی ہوتے ہیں، ان کا خیال تھا کہ نانی عشو کی نظر طاہرہ کی آنکھوں کو کھا گئی کیونکہ انہوں نے ان کی شادی میں بھاجی ماری تھی، اس لئے وہ اکثر مرچوں سے اس کی نظر اتروا دیتیں وہ اپنی ماں کی سنگار میز کے پاس کھڑی ہو گئی، اس کی ماں کی ایک ساڑی الگنی پر ٹنگی ہوئی تھی جیسے چوہے کتر گئے تھے ڈھول میں اٹے ہوئے پرانے چپل پڑے ہوئے تھے، کٹوری میں میلا میلا سا ناریل کا تیل جما ہوا تھا، طاہرہ مبہوت سی کھڑی تھی جیسے کسی نے اس پر مسمریزم کر دیا ہو، اس کے دل و دماغ میں ایک تازگی سی دوڑ گئی، اس نے یونہی ماما کو پکارا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ چائے تیار رکھے۔ امی طارق میاں کے یہاں سے لوٹیں گی تو چائے مانگیں گی مگر اسے ایک دھچکا سا لگا جیسے وہ آسمان سے زمین پر آ رہی ہو، طلسم ٹوٹ چکا تھا، وہ اپنی ماں کی ساڑی کو گالوں سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر خوب روئی، وہ سوچتی اسکی تعلیم کی وجہ سے اکثر امی ننہیال جاتے وقت اسے چھوڑ جاتیں، وہ سوچتی جیسے وہ ان کو ایک لمبا چوڑا شکایتوں سے بھرا خط لکھے گی ...." امی تم ایسی گئیں کہ لوٹی ہی نہیں، ماما عزیزن کی انگلیاں لوہا ہوتی جا رہی ہیں۔ سب کام کاج میں کرتی ہوں ابا کہتے ہیں وہ تمہاری غیر موجودگی کو بھول سے گئے ہیں..... میری اچھی امی اب کے آنا تو میرے لئے اچھی سی رو ہوں کی دوا لیتی آنا"...... وہ ڈبڈبائی آنکھوں، گرم گرم گالوں اور کچے کچے خیالوں میں بالکل گڑیا سی لگ رہی تھی!!

وہ جب کبھی بھی اپنی بہنوں کے ساتھ بازار جاتی تو بناؤ سنگھار نہ کرتی، بہت کیا تو ڈھنگ سے ڈوپٹہ لپیٹ لیا، وہ بازار کی دوکانوں اور چلتے پھرتے آدمیوں کو کم دیکھتی بلکہ زیادہ تر وہ حیرت سے ساجدہ اور شہلا کو دیکھا کرتی، کس طرح ان کی آنکھیں ناچا کرتی ہیں، وہ دونوں پسینہ میں شرابور ہوئی جاتیں، وہ اگر ان سے بازار میں خوش ہو کر لپٹنے کی کوشش کرتی تو وہ جھٹک دیتیں" طاہرہ یہ کیا بدتمیزی ہے اپنے سہارے چلو" اور وہ یوں چونک اٹھتی جیسے واقعی اسے سہارے کی ضرورت ہے، اس نے اکثر بازار سے لوٹ کر گھبرا گھبرا کر ساجدہ کو کہتے سنا "نہ جانے کیا لوگوں کی بدتمیز عادت ہے جو گھور گھور کر دیکھتے ہیں" اور وہ یہ کہکر بیر بہوٹی سی ہو جاتی یہ سوچ کر اس کی آواز عابد نے ضرور سن لی ہوگی، مگر دل میں طاہرہ خوش ہوئی کہ وہ بہت خوش قسمت ہے لوگ اسے گھور کر نہیں دیکھتے، ورنہ اسکے ریشمین کپڑے بھی ساجدہ اور شیلا کی طرح پسینہ میں بھیگ جایا کریں!

اس کی آنکھیں اچھی ہو گئی تھیں پھر بھی وہ چندی تھی، اسی لئے اب وہ چڑچڑی سی ہو گئی تھی، وہ ساجدہ اور شہلا سے ایک عجیب قسم کا انتقام لینے کے منصوبے باندھا کرتی، وہ چاہتی کسی طرح عابد بھی اسے چندی کہے اور ادھر وہ ایک دو تھپڑ کس کے اس کے منہ پر مارے کہ پانچوں انگلیاں بن جائیں اس طرح وہ ساجدہ اور شہلا سے اپنی ہتک کا بدلہ لے لے مگر ایسا تو کوئی موقعہ ہی نہ آیا اور انتقام کی آگ اس کے دل و دماغ میں سلگتی رہی، ایک دن وہ کمرے میں بیٹھی چوٹی گوندھ رہی تھی، دالان میں سب میٹھی باتیں کر رہی تھیں، ان میں عابد بھی تھا، آنکھوں کی تعریفیں ہو رہی تھیں، ساجدہ کا کہنا تھا کہ شہلا کی غلافی آنکھیں اچھی ہیں، شہلا جھپ کر بولی نہیں "آپا نجمہ کی ہرن جیسی بڑی تو خاندان میں کسی کی بھی نہیں" مگر عابد کے منہ سے یہ سن کر "نہیں بھئی طاہرہ کی سی کشش کسی میں نہیں جیسے کوئی دل کھینچ رہا ہو" وہ چونک پڑی اس نے غیر شعوری طور پر نرم نرم گالوں پر ہاتھ پھیرنے شروع کئے یہ محسوس کرنے کے لئے کہ عابد کی انگلیوں کے لال لال نشان تو نہیں بن گئے ہیں!

وہ جب ان دونوں کے ساتھ بازار سے لوٹی تو بہت خوش تھی، مگر ساجدہ اور شہلا یوں کچھ خاموش خاموش سی تھیں، وہ دونوں کچھ اس طرح ہانپ رہی تھیں جیسے کسی نے ان کو دوڑایا ہو، وہ دونوں طاہرہ سے بول بھی نہیں رہی تھیں، ان کی نظر میں آج طاہرہ نے وہ ناگفتہ بہ حرکتیں کی تھیں کہ اس کے ہاتھ جوڑنے پر بھی اس کو معاف نہ کیا گیا ان کو اتنا تعجب ضرور تھا کہ آخر یہ حرکتیں اس نے سیکھی کہاں سے، یہی کہ لیمو نیڈ پی کر ہنسکر دوکاندار سے بولی "کیا کیجئے گا پیسے لیکر" وہ دونوں ہانپتی جاتی تھیں، زیور اوتارتی جاتی تھیں اور فاخرہ کو سناتی جاتی تھیں "بہنوا اس مردود نے جب پیسے پھینک دئے تو اس قطامہ نے اٹھا بھی لئے" اور طاہرہ یہ سب سن کر

(باقی صفحہ ۶ پر)

ہندوستان اور چین کے مابین تجارت

شمشیر سنگھ

دنیا کے کوئی سے دو ملک ایک دوسرے سے اسقدر مشابہ نہیں ہیں جتنے کہ چین اور ہندوستان ہیں۔

دونوں کے رقبے وسیع، آبادیاں گنجان، باشندے غریب اور ثقافتیں قدیم ہیں۔ دونوں اپنے اپنے ملک میں زراعت کو ترقی دینے، نت نئی صنعتوں کو اختیار کرنے اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ چین نے حال ہی میں صحیح معنوں میں آزادی حاصل کی ہے، ہندوستان اس آزادی کے دروازے پر ہے۔ قدیم زمانے میں ان دونوں کے مابین گہرے تعلقات قائم تھے۔ دونوں کا مستقبل بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہے کیونکہ دونوں ایشیا میں امن و عافیت کے خواہاں ہیں۔ ان کے پچھلے تعلقات اور اگلے ارادوں کے پیش نظر کہنا پڑتا ہے کہ ان کے مابین اتحادِ باہمی کا قائم ہونا لازمی ہے۔ اس پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے چین کے لئے ایک تجارتی وفد کا بھیجا جانا ثابت کرتا ہے کہ حکومت کا یہ اقدام بالکل مناسب اور برمحل ہے لہذا اقتصادی اعتبار سے چین اور ہندوستان کی راہ اتحاد پر یہ وفد ایک اہم سنگ میل نصب کرے گا۔

لڑائی سے پہلے چین و ہند کی تجارت کچھ زیادہ قابلِ ذکر نہیں تھی۔ ہندوستان سے جانے والے مال کی مجموعی قیمت دو کروڑ روپے کے لگ بھگ ہوتی تھی۔ یہاں سے جانے والی چیزوں میں کچی روئی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ دوسری قابل ذکر چیزوں میں سن کا سامان، کپاس، تمباکو، کٹ پیس کا مال، کوئلہ، چٹائیاں، چمڑا، کھالیں لوہا اور صندل کا تیل شامل تھا۔ اس کے برعکس چین سے آنے والے مال میں سوتی دھاگے، کچے ریشم، اور ریشم کے سامان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ دوسرے ملکوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چین کی غیر ملکی تجارت میں ہندوستان کا حصہ بہت ہی قلیل تھا۔ تاہم لڑائی نے صورتِ حالات کو بڑی تیزی کے ساتھ یکسر بدل ڈالا۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۴۱ء میں چین جانے والے ہندوستانی مال کی قیمت آٹھ کروڑ نوے لاکھ کے قریب ہو گئی۔ لیکن جب امریکہ لڑائی میں شامل ہو گیا اور جاپانیوں نے چین کے بہت بڑے علاقے پر قبضہ جما لیا تو تجارت کو ایک زبردست دھکا لگا چنانچہ اب امن و عافیت کی فضا قائم ہو جانے پر حکومت ہند نے چین کے ساتھ اپنے ملک کی تجارت کو بحال کرنے کے لئے اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ بہ ظاہر ہے کہ ہندوستان چین کو وہ سب سامان دے سکتا ہے جو لڑائی سے پہلے یہاں سے جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان مختلف صنعتوں کا مال بھی دیا جا سکتا ہے جنکو لڑائی کے دوران میں ترقی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن اس سے قبل کہ ہندوستان سے مال جانا شروع ہو یہ پتہ چلانا لازمی تھا کہ چین میں بازار کے حالات کیا ہیں اور وہاں کے لوگوں کو ٹھیک ٹھیک کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اسی لئے حکومت ہند نے ایک تجارتی وفد اس ملک میں بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ ضروری معلومات حاصل کر لائے۔

اس وفد کے اراکین میں سے کے چینیز، تلسی داس، کلہ چند، جی بی کوٹک ایم ایس سی جیسا دالا اور اے اے جاویری شامل تھے۔ یہ لوگ کلکتے سے ۲۰ فروری کو روانہ ہوئے اور تقریباً آٹھ ہزار میل کا ہوائی سفر کرنے کے بعد ۲۹ مارچ کو واپس آ گئے۔ اس مختصر عرصے میں وفد نے ہانگ کانگ، شنگھائی، پائینگ، تین تسن اور چنکنگ کا دورہ لگایا۔ شنگھائی سب سے اہم بندرگاہ ہے عام دنوں میں چین کی نصف غیر ملکی تجارت اسی بندرگاہ سے ہوتی تھی۔ پائینگ چین کا تاریخی شہر ہے اور اپنے شاندار محلوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ چنکنگ زمانۂ جنگ کا صدر مقام اور ملکوں کے عزم راسخ اور آئندہ کی امیدوں کا مثالی نمونہ ہے۔ وفد مذکور نے ان تمام مقامات کے تجارتی حالات کا جائزہ لیا، اعداد و شمار جمع کئے، مشہور کاروباری لوگوں، سوداگروں اور ایوانِ تجارت کے ممبروں سے ملاقات کی، نیز جنرلیسیمو چیانگ کائی شیک اور ڈاکٹر ٹی وی سونگ جیسے نامور چینی راہنماؤں سے تبادلہ خیالات کیا۔ ہر موقع و محل پر چینیوں اور ان ہندوستانیوں نے جو چین میں آباد ہیں اس وفد کے اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے پرخلوص مہمان نوازی اور دلی اتحاد و تعاون کا اظہار کیا۔ وفد کی جمع کی ہوئی اطلاعات، ان بنیادوں پر نکالے ہوئے نتائج اور سفارشات ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہو گئی ہیں جس کا نام "چین جانے والے تجارتی وفد کی روداد" ہے۔ اس روداد میں چینی صنعت پارچہ بافی کی نوعیت، تمباکو کی پیداوار اور روپے پیسے کے مفصل حالات

شامل ہیں۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین تجارتی امکانات کس حد تک قائم ہو سکتے ہیں۔

دنیا کے نئے ترقی یافتہ ملکوں میں صنعتِ پارچہ بافی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جاپان اپنی اسی صنعت کی بدولت دنیا کے صنعتی ملکوں کی صف اول میں آ گیا تھا۔ اب سے کچھ عرصے پہلے چین بھی اپنی اس صنعت کو ترقی دینے میں لگا رہا تھا۔ وفد کا بیان ہے کہ وہاں لڑائی کے ہاتھوں اس صنعت کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔ لڑائی سے پہلے اس کے کارخانوں میں پچپن لاکھ تکلے موجود تھے جنکی تعداد اب چالیس لاکھ رہ گئی ہے۔ قیاس ہے کہ ان میں سے نصف تکلے اس سال کے آخر تک اور باقی ایک آدھ سال میں چلنے شروع ہو جائینگے۔ چین کے ارباب تجارت اس صنعت کو فروغ دینے کے لئے ایک بڑا امید افزا لائحہ عمل بنا چکے ہیں تاکہ ایک طرف اس نقصان کی تلافی ہو جائے جس سے لڑائی کے ہاتھوں دوچار ہونا پڑا ہے اور دوسری طرف جنوب مشرقی ایشیا میں ان منڈیوں پر قبضہ جما لیا جائے جنکو لڑائی سے پہلے جاپانیوں نے ہتھیا رکھا تھا۔ اگر وہ فالتو تکلے جنکی فراہمی کی فرمائش برطانیہ اور امریکہ سے کی گئی ہے، وقت مقررہ تک پہنچ گئے تو چین تین سال کے اندر اندر اپنے ملک میں تیار ہونے والے کپڑے کی مقدار کو دوگنا کر دے گا۔ لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا چین اپنے کارخانوں کا پیٹ بھرنے کے لئے کچی روئی کافی مقدار میں پیدا کر سکتا ہے؟ لڑائی سے پہلے روئی کی پیداوار کے سلسلے میں چین کا تیسرا نمبر تھا۔ اسکی کوشش تھی کہ وہ اپنا کفیل خود بن جائے چنانچہ ۱۹۳۶ء تک اسے اس کوشش میں کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ لیکن لڑائی اور پھر ۴۱-۱۹۴۰ء میں آنے والے طوفان نے اس کے لائحہ عمل کو درہم برہم کر دیا اور نتیجہ یہ کہ آج چین کو اپنے کارخانے چالو رکھنے کے لئے غیر ملکی کپاس پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اب وہ اپنی اس حکمتِ عملی کو کہ اس سلسلے میں اپنا کفیل آپ ہو جائے، بروئے کار نہیں لا سکتا کیونکہ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ پالنے کے لئے اسے لامحالہ اشیائے خوراک کی پیداوار کو ترجیح دینی پڑے گی لیکن صنعت پارچہ بافی کو حسب ارادہ فروغ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ روئی کی مانگ بڑھ جائے گی۔ نیز جاپان کے قائم کئے ہوئے وہ کارخانے جو اب چین کے قبضے میں ہیں، بہتر طریقے پر چل سکتے ہیں بشرطیکہ درمیانی اور چھوٹی قسم کی ہندوستانی روئی استعمال کی جائے۔ ان حالات کے پیش نظر یقینی ہے کہ آئندہ کئی سال تک چین میں ہندوستانی روئی کی مانگ کا سلسلہ جاری رہیگا۔

روئی کے علاوہ چین کو ہندوستانی تمباکو کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اس کی کاشت وہاں کے تقریباً سبھی صوبوں میں ہوتی ہے۔ کپاس کی طرح اس کی پیداوار میں بھی شنگھائی کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن اسوقت سگرٹوں میں استعمال ہونے والے تمباکو کی اس ملک کو سخت ضرورت ہے۔ کم سے کم پانچ کروڑ بیس لاکھ پونڈ درکار ہے۔ اس کمی کو امریکی اور ہندوستانی تمباکو کی درآمد سے پورا کرنا پڑے گا۔ سگرٹ بنانے کے واسطے معیاری مرکب کے لئے بیس فیصدی امریکی، دس فیصدی ہندوستانی اور ستر فیصدی چینی تمباکو کو ملانا پڑتا ہے۔ اس حساب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال چین کو ستر لاکھ سے ایک کروڑ پونڈ تک ہندوستانی تمباکو کی ضرورت ہوگی۔ اس وقت یہ اندازہ لگانا دشوار ہے کہ آئندہ چین کی منڈیوں میں ہندوستانی تمباکو کے امکانات کس حد تک خوشگوار ہونگے۔ چین میں موجودہ رجحانات یہ ہیں کہ کسی طرح سگرٹوں والے تمباکو کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے تاکہ باہر کا مال کم منگانا پڑے۔ تاہم شمالی چین میں غیر معین صورتِ حالات، حمل و نقل کی سہولتوں میں کمی، اور اقتصادی زندگی میں ابتری ہونے کے باعث ابھی کچھ عرصے تک ہندوستانی تمباکو کے بغیر گزارہ کر لینا چین کے لئے ممکن نہیں ہو سکے گا۔

عام ضروریات کی چیزوں کے لئے بھی چین میں عمدہ تجارت کا موقع ہے۔ روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء کا دس سال تک کال پڑا رہا ہے اسلئے ان کی مانگ بہت بڑھی ہوئی ہے۔ جنگ سے پہلے چین تقریباً چوبیس لاکھ روپے کا مال جرمنی سے منگواتا تھا۔ اس مال میں بائسکلیں، صابن، چمڑا، چمڑے کا سامان، چینی کے ظروف، بٹن ہیز اور دفتر کا ضروری سامان شامل تھا۔ اب ان میں سے بعض چیزیں ہندوستان بھی بھیج سکتا ہے لیکن وہ اتنی ہی رقم کے عوض ان تمام اقسام کا سامان نہیں بھیج سکتا جو پہلے جرمنی سے آتا تھا کیونکہ اول تو دوسرے ملکوں کے تاجر مقابلے کے لئے موجود ہیں اور پھر خود ہندوستان بھی خوبی اور پائداری کے لحاظ سے اتنا اچھا سامان تیار نہیں کر سکتا جو جرمن کے مال کا مقابلہ کر سکے۔ تاہم اس کے لئے اس تجارت پر حاوی ہو جانے کا زرین موقع ہے جسپر جاپان قبضہ کئے ہوئے تھا کیونکہ مغربی ممالک میں تیار ہونے والے عمدہ مال کے برعکس جاپانی مال کا مقابلہ کر لینا ہندوستانی مال کے لئے کہیں زیادہ ممکن ہے۔ لڑائی سے

پہلے چین کروڑوں روپے کا مال جاپان سے منگاتا تھا مثلاً سوتی کپڑے کے ٹکڑے، لوہے اور فولاد کی چیزیں، چینی کے ظروف، عمارتی سامان، ربڑ کی چیزیں اور دیا سلائی کے بکس وغیرہ۔ یہ چیزیں ہندوستان سے بھیجی جاسکتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تجارتی میدان میں دوسرے ملکوں سے سخت مقابلہ رہے گا خصوصاً امریکہ سے کیونکہ وہاں سے اس وقت بھی امداد باہمی اور رفاہِ مشترک کے طور پر کثیر مقدار میں ہر قسم کا سامان اس ملک میں بھیجا جا رہا ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ قیمت کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مال کے لئے مغربی سامان کا مقابلہ کر لینا ممکن ہے بشرطیکہ کافی عمدہ اور پائدار ہونے کے ساتھ ساتھ قیمت کے لحاظ سے بھی وہ اتنا ارزاں ہو کہ چینیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرلے۔ یہ سچ ہے کہ خود ہندوستان میں بھی عام ضروریات کے سامان کی کمی محسوس ہو رہی ہے تاہم یہ حقیقت بالکل صاف اور واضح ہے کہ اگر اس نزدیک ترین موقع پر ہندوستان نے اپنے مال کا کچھ حصہ وہاں نہ بھیجا تو آئندہ وہ اچھی صورت مشکل ہی سے ممکن ہوسکے گی جو لڑائی سے پہلے جرمنی اور جاپان کو تمام جنوب مشرقی ایشیا کی منڈیوں میں حاصل تھی۔ پھر یہی نہیں کہ ہندوستان کی تجارت کا یہ تعلق صرف چین سے وابستہ ہو کر رہ جائیگا۔ بلکہ جنوب مشرقی ایشیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی تعلقات پیدا ہونے کی صورتیں نکل آئیں گی۔

روئی، تمباکو اور عام ضروریات کے سامان کے عوض چین اپنا ریشم، ٹنگ کا تیل، ہری چھلیاں، سویابین، سبز چائے، سوٗر کے بال اور دھات وغیرہ ہندوستان بھیج سکتا ہے۔

ریشم کو قدیم ترین زمانے سے چین کی برآمدی تجارت میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ پہلے بھی ہندوستان چین سے کچا ریشم اور ریشم کا سامان منگایا کرتا تھا۔ آج بھی اسے ہر قسم کے ریشمی سامان کی ضرورت ہے۔ اگرچہ آجکل چین کے ریشمی مال کی قیمتیں لڑائی سے پہلے کے مقابلے میں تین گنی ہوگئی ہیں تاہم ہندوستان میں اب بھی اس کا سکہ آسانی سے چل سکتا ہے۔ بہترین قسم کا کچا ریشم کوانگ سو اور رچی کیانگ میں تیار ہوتا ہے۔ کچا زرد ریشم ذیلی شون میں اور ٹ منچوریا اور شان تنگ میں بنتا ہے۔ چین میں ریشم کا موسم مئی میں شروع ہو کر اکتوبر میں ختم ہوتا ہے۔ ٹنگ کا تیل ٹنگ کے درختوں سے مشنگھائی کوانگ سی، ہونان، شمالی ہوپی اور رچی کیانگ کے صوبوں میں نکالا جاتا ہے۔ یہ تیل مختلف چیزوں میں کام آتا ہے مثلاً وارنش، روغن، آئل کلاتھ اور چھاپے کی سیاہی وغیرہ بناتے ہیں۔ لڑائی کے دنوں میں ٹنگ کا تیل بڑے بڑے صنعتی اداروں میں ایندھن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے چینی سوچ رہے ہیں کہ اس تیل کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ لڑائی سے پہلے چین سے ہندوستان آنے والے مال میں ہری چھلیوں کا اوسط بہت کافی ہوتا تھا۔ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ اس سال مال کی فراہمی کس حد تک ممکن ہوگی۔ ہندوستان میں سویابین کی کھپت کچھ زیادہ نہیں ہوئی تاہم اس کی غذائی ماہیت کا لحاظ رکھتے ہوئے غور کرنا پڑے گا کہ کیوں نہ اس کی کافی مقدار منگائی جایا کرے۔ ہندوستان میں سبز چائے کی سالانہ کھپت بیس لاکھ ٹن کے قریب ہے۔ چونکہ اس ملک میں چائے نوشی کی عادت برابر بڑھتی جارہی ہے، اسلئے آئندہ کثیر مقدار میں اسکے خرچ کی توقع کی جاسکتی ہے۔ برش بنانے کی صنعت کے سلسلے میں ہندوستان چین سے سوٗر کے بال بھی لے سکتا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں برش کے کارخانوں میں تقریباً ایک سو ساٹھ ٹن بال کام آئے تھے، غالباً آئندہ ایک سو ٹن کی مزید ضرورت لاحق ہوگی۔ ہندوستان کو چین کی بعض دھاتوں مثلاً سرمے، ٹنگسٹن، پارے اور چاندی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

ہندوستان اور چین کے مابین آزادی سے تجارت ہونے میں کئی رکاوٹیں حائل ہیں مثلاً دونوں ملکوں کے درمیان تبادلۂ زر کی آسانیاں مفقود ہیں دوسرے حمل ونقل کی دشواریاں موجود ہیں۔ تیسرے یہ کہ چین اور ہندوستان کے ان تاجروں کو جو تجارتی حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کے ملک میں آنا جانا چاہتے ہیں، آسانی سے پروانۂ راہداری نہیں ملتا ہے۔ پہلی رکاوٹ کا آسان علاج یہ ہے کہ حساب کتاب کے خاص انتظامات اختیار کر لئے جائیں۔ دوسری دشواری کا حل یہ ہے کہ ہندوستان اپنے بحری اور ہوائی جہاز تیار کرے اور تیسرے یہ کہ پروانۂ راہداری جلدی سے مل جایا کرے۔

وفد مذکور نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ ہندوستان کی طرف سے ایک ٹریڈ کمشنر شنگھائی اور ایک اسٹنٹ ٹریڈ کمشنر ہانگ کانگ میں مقرر کیا جائے اور چین سے ہندوستان آنے والے مال کے سلسلے میں درآمد کا لائسنس جاری کرنے کی شرط اٹھادی جائے۔ نیز یہ کہ اس ملک میں بیمے اور بنک کی ہندوستانی کمپنیاں قائم کی جائیں۔ اگر ان سفارشات کا خیال رکھتے ہوئے قدم اٹھایا گیا تو چین کے ساتھ ہندوستان کی تجارت نہ صرف اس حد تک آسکتی ہے جو لڑائی سے پہلے قائم تھی بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر بہتر صورت اختیار کر سکتی ہے۔

روس کی روزمرّہ زندگی

جان لورنس

روس میں زندگی کا صحیح نقشہ کیا ہے؟ لوگ کس طرح رہتے سہتے ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات جو روس سے واپس آنے کے بعد تقریباً روزانہ ہر شخص نے مجھ سے کئے۔ آج بھی آپ کو بتانے کے لئے جب میں ان مسائل پر غور کر رہا تھا میں نے تصور کی آنکھ سے ماسکو کے ایک خاص گھرانے کو دیکھنے کی کوشش کی، یہ اندازہ لگانے کے لئے کہ اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہوگا یقین مانئے۔ آپ کی طرح وہ بھی اتوار کے کھانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے لیکن ایک بات ہے۔ وہاں ابھی لنچ کا وقت بھی نہیں ہوا ہوگا۔ روس میں کھانے کے مقررہ اوقات نہیں ہیں لیکن جس کھانے کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ سہ پہر کے بعد تین اور چھ بجے کے درمیان کھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی کھانے ہلکے پھلکے اور غیر معین ہوتے ہیں۔ روس میں چائے ہم انگلستان والوں سے بھی زیادہ پیتے ہیں۔ لڑائی کے دنوں میں چائے سے زیادہ چینی کی کمی ان کے لئے تکلیف دہ تھی۔ روسی چائے میں دودھ ملا کر پیالیوں میں کبھی نہیں پیتے۔ وہ بغیر دودھ کی چائے گلاسوں میں پیتے ہیں مگر چینی ضرور ملائی جاتی ہے۔ وہ مٹھاس کے بغیر چائے کبھی نہیں پئیں گے۔ اگر اتفاق سے کبھی چینی نہ مل سکے تو مربہ ہی گھول دیں گے یا چائے پینے کے ساتھ چاکلیٹ چباتے رہیں گے۔ وہ چائے میں لیموں کا ٹکڑا ڈال دینا بھی پسند کرتے ہیں۔ آجکل روسی لوگ چائے عام طور پر چائے دانی میں بنا لیتے ہیں تاہم سماوار نا پید نہیں ہوئے۔ وہ اب بھی نظر آتے ہیں۔ سماوار کو قدیم زمانے کے انگریزی چائے دان سے مشابہ سمجھنا چاہیئے۔ بس اتنا فرق ہے کہ اس میں اسپرٹ کی بجائے لکڑی کا کوئلہ جلتا ہے۔ اس طرح دن میں ہر وقت تازی چائے مل سکتی ہے۔

انقلاب سے پہلے روسیوں نے محض تجربے کے طور پر پانچ دن کا ہفتہ منانا شروع کر دیا تھا تا کہ لوگوں کی چھٹی ہمیشہ اتوار ہی کے دن نہ ہوا کرے۔ لیکن اب یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے چنانچہ آج وہ کسی باغیچے میں یا شہر سے دور کسی دیہاتی ماحول میں تفریح کے لئے گئے ہوئے ہوں گے۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ سب ماسکو سے باہر کسی جگہ اپنے اپنے وقتی کھیت میں کام کرنے کے لئے گئے ہوں۔

لڑائی کے دنوں میں انھوں نے شہروں کے نزدیک وقتی کھیتوں کی ایک اہم تحریک شروع کی تھی۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بعض مصیبتوں سے نجات پانا ان کے لئے دشوار ہو جاتا۔ ہمارے ملک کے مقابلے میں روس میں یہ تحریک زیادہ جدید تھی۔ چنانچہ میں نے ان دنوں ماسکو سے شائع ہونے والے اپنے اخبار میں ایسے مضامین اور تصویریں شائع کیں جن سے روسی یہ اندازہ لگا سکے کہ ہم فتح حاصل کرنے کی جدوجہد میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ ان کھیتوں میں زیادہ تر آلو اور کرم کلے کی کاشت کی گئی۔ کیونکہ کرم کلہ روسیوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ شوربہ بنانے کے علاوہ وہ لوگ کرم کلہ بھر کر دلمے کی قسم کا ایک کھانا پکاتے ہیں جو انگلستان میں تیار ہونے والے کرم کلے کے کھانے سے کہیں زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ پہلے پہل مجھے خیال ہوا کہ وہ کرم کلے کی کوئی مختلف قسم ہوگی لیکن پھر معلوم ہوا کہ صرف پکانے کا طریقہ مختلف ہے۔ یہ طریقہ معلوم کر لینا بہت مفید ثابت ہوگا۔

روس میں زیادہ اہم خوراک ڈبل روٹی ہے۔ چنانچہ وہاں روٹی کا خرچ انگلستان سے زیادہ ہے۔ حالانکہ پانچ سال سے اس پر راشن ہے۔ یہ روٹی زیادہ تر سیاہ رائی کی ہوتی ہے پکنے کے بعد بھی وہ سیاہ رہتی ہے۔ اس کا ذائقہ ترش تلخ ہوتا ہے۔ اس لئے نئے لوگوں کو پہلے پہل بہت برا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن شراب کی طرح اس کا عادی ہو جانے پر وہ کیفیت برقرار نہیں رہتی۔ پھر اس روٹی میں غذائیت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ روسی مزدور روکھی روٹی کھا کر بھی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ روسی قد آور اور قوی ہوتے ہیں۔ ان کے دانت بھی اچھے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انھیں قبض کی شکایت کبھی لاحق نہیں ہوتی۔ میرے ایک دوست نے جو ڈاکٹر تھا، مجھے بتایا کہ یہ سیاہ روٹی کی بدولت ہے۔ روٹی کے بعد دوسری اہم خوراک ایک قسم کا دلیہ ہے جسے "کاشا" کہتے ہیں۔ مختلف اناجوں سے کئی مختلف قسم کے "کاشا" بنائے جاتے ہیں۔ اگر آپ کبھی اٹلی گئے ہیں تو آپ کو "پولینتا" یاد ہوگا جو وہاں کے غریبوں کی خوراک ہے۔ آپ اسے مکئی سے بنا ہوا "کاشا" کہہ سکتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ خوراک کی یہ یک رنگی اکتا دینے والی ہوگی لیکن کچھ کھانے اس کے علاوہ بھی ہیں۔ مثلاً موسم گرما میں "کسل" یعنی پھلوں کا عرق جو میٹھا کرنے کے بعد آلو کا آٹا یا میدہ ملا کر پیا جاتا ہے۔ اگر وہ ٹھیک طرح تیار نہ ہو تو بہت ہی برا معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا ذائقہ نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ اور پھر ککڑیاں ہیں، فصل کے موقع پر تازہ بتازہ اور باقی دنوں میں نمک لگی ہوئی خشک۔ کھمبیوں کی چٹنی بھی مزا دیتی ہے۔ روسی اچار چٹنی کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اور جب وہ اپنے ملک سے باہر جائیں تو وہاں کے تیز مرچ کا ذائقہ انھیں یاد آتا رہتا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح دودھ مکھن اور گوشت وغیرہ بھی روزمرہ خوراک کا جزو ہیں۔ لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ آجکل ہر روسی کو یہ چیزیں کس مقدار میں نصیب ہو جاتی ہیں کیونکہ کوئی تمام معیاری قسم کا راشن رائج نہیں ہے۔ محفلوں میں مچھلی کے کباب کے ساتھ ووڈکا (شراب) کا دور بھی لگتا ہے۔ معمولی ووڈکا خالص جن کی طرح تیز ہوتی ہے۔ وہ

چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں پی جاتی ہے اور سارا گلاس ایک دم چڑھا لینا پڑتا ہے۔ اگر ووڈکا پینے کے بعد کوئی چیز کھائی نہ جائے تو اثر زیادہ دیر پا نہیں ہوتا اور اگر اسے روسی "زاکوسکا" کے ساتھ پیا جائے تو سارے دن اثر رہتا ہے اور دوسرے روز بھی طبیعت بحال رہتی ہے بشرطیکہ شراب عمدہ قسم کی ہو اور جسم میں جان بھی ہو۔ روسی لوگ محفلوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک بار کسی محفل میں شریک ہو جائیں تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔ ایک بار ایک روسی نے مجھے ڈیڑھ بجے کے قریب لنچ کے لئے مدعو کیا۔ ساڑھے پانچ بجے ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ میرا مطلب ہے کہ دوسرے روز صبح کے ساڑھے پانچ بجے۔ سہ پہر کی چائے، شام کا کھانا رات کا سپر اور پھر ساری رات شراب و کباب۔ ابتدائی بارہ گھنٹوں میں گفتگو نہایت معقول رہی لیکن پھر مزا خراب ہوتا چلا گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ ایسی محفلوں کے لئے اتنی بڑی مقدار میں کھانا کہاں سے آجاتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے راشن کے طریقے کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ سوویٹ یونین میں ہر چیز کا معاوضہ نتائج کے اعتبار سے ملتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کے راشن کا انحصار اس کام پر ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ چنانچہ سخت کام کرنے والوں کو دفتر کے منشیوں سے زیادہ مقدار ملتی ہے۔ اگر کام زیادہ ذمہ داری کا ہو تب بھی اس میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ بے روزگار لوگوں کو بہت ہی کم راشن ملتا ہے۔ ایسی صورت میں بوڑھے اور بیمار لوگوں کو زیادہ دقت رہتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں اگر بیٹیوں پوتوں کے ساتھ نہ رہیں تو گذارہ مشکل سے ہوتا ہے۔ وہ گھر کے کام کاج میں مدد دینے کے علاوہ راشن لانے میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ وہ ہر چیز کے لئے گھنٹوں قطاروں میں کھڑی رہتی ہیں۔ ماسکو میں بڑی لمبی لمبی قطاریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لوگ اپنی مرضی کے مطابق کسی دوکان کو اپنے راشن کے لئے مخصوص نہیں کر سکتے بلکہ کام کاج کے ہر مرکز سے ملحق ایک علیحدہ دوکان ہوتی ہے اور اس مرکز کے لوگوں کو اسی جگہ سے چیزیں خریدنی ہوتی ہیں۔ ہر چیز کی قیمت سرکاری طور پر مقرر ہوتی ہے اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں وہاں گرانی کم ہے۔ لیکن ایک بات عام ہے۔ کوئی شخص سخت کام کرنے والا ہو، یا کسی ذمہ دار ادارے کا مالک و منتظم ہو اسے صرف ضروریات زندگی ہی مل سکیں گی۔ اگر کوئی شخص زیادہ عیش کرنا چاہے تو اسے لازمی طور پر فالتو کام کرنا پڑے گا۔ بس یہی ایک طریقہ خاص طور پر دوسرے ملکوں کے راشنی نظام سے مختلف ہے۔ اپنے نام کا مقررہ راشن لے چکنے کے بعد ہر شخص اس بازار میں جا سکتا ہے جہاں چیزیں کھلے بندوں بکتی ہیں۔ ان تجارتی دوکانوں سے فالتو اشیاء حسب ضرورت مل سکتی ہیں خواہ وہ راشن میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔

اب تک ان گھرانوں کے نظامِ حیات کی تصویر کھینچی گئی ہے جو بڑے شہروں میں آباد ہیں۔ لیکن یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بازار میں کھلے بندوں فالتو چیزیں کس طرح مل سکتی ہیں، یہ جاننا ضروری ہے کہ دیہات کے لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

روس کے زیادہ باشندے دیہاتوں میں رہتے ہیں اور بہت سے دیہات بڑے شہروں سے کافی فاصلے پر آباد ہیں۔ سڑکیں خراب ہیں اور اگر ریل کی پٹری یا نہر قریب نہ ہو تو بہت سے دیہاتوں کا عام سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ لیکن روس میں یہاں ہونا فائدے سے خالی نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مقامی طور تیار کی ہوئی چیزوں پر کوئی راشن نہیں ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑائی کے زمانے میں دیہاتیوں کو کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں ہوئی۔ البتہ دوسری چیزوں کی کمیابی یا نایابی نے ان کو مشکلات میں مبتلا کر رکھا۔ مثلاً جاڑے کی راتوں میں انھیں شدید تاریکی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ چراغوں میں جلانے کے لئے پیرافین بالکل نہ مل سکی۔ روس کے دیہات عموماً "مشترک کھیتوں" کی صورت میں منظم ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گاؤں کے چاروں طرف کی ساری زمین ایک بڑے کھیت کی حیثیت رکھتی ہے جس میں سب لوگ مل کر کام کرتے ہیں۔ پیداوار میں سے ہر شخص کا حصہ اس کام کی نوعیت اور مقدار پر منحصر ہوتا ہے جو وہ انجام دیتا ہے۔ ہر "مشترک کھیت" کے لئے سرکاری ہدایت ہوتی ہے کہ وہ کونسا اناج بوئے۔ یہ صورت انگلستان کی "وار ایگریکلچرل کمیٹیوں" کے طریقۂ کار سے ملتی جلتی ہے۔ کل پیداوار میں ہر چیز کی ایک مقررہ مقدار حکومت کے سپرد کر دی جاتی ہے تاکہ اسے شہروں میں لیجا کر لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ اس مقدار کے علاوہ جو کچھ ہو وہ دیہاتیوں کا حصہ ہے اور وہ اسے جس طرح چاہیں صرف کر سکتے ہیں۔ اگر کسی کھیت میں فالتو مقدار پیدا نہ ہو سکے، تو اسے بہت ہی ناقص سمجھا جا سکتا ہے۔ اس فالتو مقدار سے دیہاتی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی چیزیں مختلف طریقوں سے شہر والوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔

روس میں قطاروں میں بنے ہوئے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے مکانات مل کر ایک گاؤں بن جاتا ہے۔ ان مکانوں میں فاصلہ بھی کافی ہوتا ہے۔ ہر مکان کے چاروں طرف ایک آدھ ایکڑ زمین ہوتی ہے۔ یہ مشترک کھیت کے علاوہ ہوتی ہے۔ لوگ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق اس میں چیزیں بوتے اور کاٹتے ہیں۔ اس پیداوار میں سے بھی جو کچھ مقدار اپنی ضروریات کے بعد بچ رہتی ہے، اسے بازار میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ گھرانے کے لوگ اپنی چیزیں خود لے کر بازار میں جاتے ہیں کیسی معاوضے یا کمیشن پر یہ کام دوسروں سے کرانا قانون کے خلاف ہے۔ چنانچہ کسانوں کی ایسی منڈیاں ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان منڈیوں میں کسانوں کی عورتیں سر سے پائیں تک شال لپیٹے، مکھن کی ٹکیاں، انڈے اور مرغیاں بیچتی نظر آتی ہیں۔ اگر یہ چیزیں ان کی ذاتی ملکیت ہوں تو وہ مرضی کے مطابق قیمت بھی وصول کر سکتی ہیں۔

غرض یہ کہ سوویت یونین میں رہنے والوں کا طریقۂ زندگی یہی کچھ ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ راشنی نظام سے بہت جلد چھٹکارا

حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔ انھیں امید ہے کہ اس سال ڈبل روٹی کا راشن ضرور ختم ہو جائیگا اور باقی چیزوں کی پابندی اگلے سال تک اٹھ جائے گی۔ ایسا ہو جانے پر کوئی بناوٹ باقی نہیں رہے گی کیونکہ پچھلے دو سال میں وہاں تمام بڑے بڑے شہروں میں ایسی دوکانیں کھلی رہی ہیں جہاں کپڑے، ٹین بند اشیائے خوراک، شراب، گراموفون کے ریکارڈ، گرم پانی کی بوتلیں، کھلونے، اور تمام ضروریات کی وہ تمام چیزیں ملتی رہی ہیں جو انگلستان وغیرہ میں نایاب تھیں لیکن کنٹرول کا طریقہ رائج نہ ہونے کے باعث قیمتیں بے پناہ اور انگلستان کے عام معیار سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ دوکانیں حکومت نے خود چلائی تھیں تاکہ ان کا نفع جنگی مصارف پورا کرنے کے کام آسکے۔ لیکن ہی قیمتیں گھٹنی شروع ہو گئیں اور اب بھی کم ہوتی جا رہی ہیں۔

سنہ ۱۹۴۲ء میں جب میں پہلے پہل سوویت یونین پہنچا تو صحیح معنوں میں ہر چیز خرید لینی ممکن تھی سوائے اس کے کہ نرخ ہوش اڑا دینے کی حد تک زیادہ تھا۔ یعنی آرام سے زندگی بسر کرنے کے لئے لکھ پتی ہونے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ لوگ روپے پیسے کے دلدادہ نہیں تھے۔ کسی شخص سے کوئی کام لیا جاتا تو وہ یہ نہ پوچھتا کہ کیا تنخواہ ملیگی؟ بلکہ دریافت کرتا کہ اس کے عوض مجھے کیا ملے گا؟ مطلب یہ کہ کتنا کھانا اور کتنا کپڑا دوگے؟ روسی جب بھی کسی کارخانے میں کام کرتے ہیں، وہ معاوضہ کے طور پر کپڑا لینے کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔

سیرت کی کتابیں

خاتم النبیین:۔ ولادت۔ رضاعت ہجرت و معجزات کے مستند حالات۔۔۔۔۔ عہ/
حسین ابن علی:۔ واقعہ کربلا کے نفسیاتی اور اخلاقی پہلو کی تاریخ مجلد۔۔۔۔ ے/
الصدیق:۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے سوانح حیات۔۔۔۔۔۔۔ عمہ/
سیرۃ الفاروق:۔ حضرت عمر بن الخطاب کے حالات زندگی۔۔۔۔۔۔۔ عہ/
ذوالنورین:۔ حضرت عثمان غنی کی سوانح عمری۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۰/
اسد اللہ:۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے سوانح حیات۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ/
سیف اللہ:۔ خالد بن ولید کی جنگی خدمات کی تاریخ۔۔۔۔۔۔۔۔ عہ/
تذکرۃ الاولیا:۔ تمام اولیاء اللہ کے مفصل حالات زندگی۔۔۔۔۔۔۔ عہ/
سوانح عمری غوث الاعظم:۔ شیخ عبدالقادر صاحب جیلانی کی سیرت۔۔۔ ۱۲/
قصص الانبیا:۔ حضرت آدم سے لیکر حضور اکرم تک انبیا کے حالات۔۔۔ ے/
موازنہ صلیب و ہلال:۔ مسلمانوں کے تمدنی اور معاشرتی شعبوں کی مستند تاریخ۔۔۔ عمہ/
دوست درزیاں:۔ ہر فیشن کے کپڑوں کی کاٹ کا بہترین رہنما۔۔۔۔۔۔ مجلد ے/
ہوم ڈاکٹر یا گھر کا حکیم:۔ سر سے لیکر پاؤں تک تمام بیماریوں کا علاج۔۔۔۔ للعہ/

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کشمیری بازار لاہور

عشرتِ عید — تابش دہلوی

آج ہر اک پہ ایزد باری — ہو گئی عید کی خوشی طاری
عیش و عشرت کی یہ فراوانی — متبسّم ہوئی فضا ساری
بیش قیمت لباس ہے سب کا — لوگ دکھلا رہے ہیں زرداری
ہے معطر دماغ خوشبو سے — پائے تخیل عیش سے بھاری
خلد نظارہ ہے نگاہوں کو — حسن صورت کی آئنہ کاری
پردۂ گوش پر ہر اک آواز — آج کرتی ہے خوب گلکاری
کیوں نہ ہر ایک ہو سبک رفتار — سب کی دولت سے جیب ہے بھاری
لیکن ان کو خبر نہیں کچھ بھی — رنگ لائی خرد کی عیاری
دہر کی ہر خوشی ہے مصنوعی — عقل سے ہو گئے ہیں سب عاری
عیش غم کو بنا دیا تابش — زندگی بھی ہے ایک مکاری

سونے کیلئے — اظہار ملیح آبادی

کیوں گھٹا اٹھتی ہے منہ اشکوں سے دھونے کے لئے
آج ہم بیٹھے ہیں دنیا کو ڈبونے کے لئے
کیا حقیقت بحر کی، ہاں ایک صورت ہے فقط
آپ خود آئیں مری کشتی ڈبونے کے لئے
صبح کے تارے چمکتے ہیں نگاہیں چرخ پر
کتنا موزوں وقت ہے جی بھر کے رونے کے لئے
گاہ بادہ نوش گاہے عابد شب زندہ دار
دہر میں کیا کیا ہوئے تھے ہم نہ ہونے کے لئے
قبر کی جانب سے یہ کہتی ہوئی گذری حیات
اتنا شور و شر کیا تھا ایک کونے کے لئے
خار سے اظہار کچھ امید ہو سکتی نہیں
پھول جب تیار ہے کانٹا چبھونے کے لئے

پاکستان پر سال رواں کی بہترین کتاب

آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان

(از ڈاکٹر ناموس)

ہندوستان میں آزاد قوم کی تعمیر کے لئے کن اسباب و ذرائع کی ضرورت ہے۔ ہندو مسلم کشیدگی کیوں کر زائل ہو سکتی ہے؟ پاکستان کیوں کر ناگزیر ہے؟ مسلمان ایک الگ قوم کیوں ہیں؟ فاضل مصنف نے ایک نئے پہلو یعنی جغرافیائی نقطۂ نظر سے تمام حقائق پر گہری روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ ہندوستان کے لئے کونسی صورت بہترین ہے۔ جس سے یہ اپنی ترقی کے نصف النہار کو پہونچے۔ قیمت ۴/۸ (چار روپیہ آٹھ آنہ) جلد منگائیے ورنہ قلت کاغذ کے باعث دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ہماری دیگر مشہور کتابیں

تاریخ سلطنت خداداد۔ محمود بنگلوری ۶/۱۲/-
تاریخ جنوبی ہند .... " ۵/-/-
شاخسار .... عاشق بٹالوی ۱/۸/-
نگارستان .... ظفر علیخاں ۴/۸/-
چمنستان .... " ۵/-/-
غبار خاطر .... ابوالکلام آزاد ۴/-/-
نظارے .... کرشن چندر ۲/-/-
انار کلی .... امتیاز علی تاج ۳/۸/-
خانہ .... حجاب امتیاز علی ۱/۱۲/۰
بزم فردوس .... ڈاکٹر ناموس ۲/۸/۰

فہرست کتب مفت طلب کریں

پبلشرز یونائیٹڈ چوک انار کلی۔ لاہور

دو قابل قدر تصانیف

سید الانبیاء خاتم النبیین محبوب خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور عالم سیرت مبارکہ،

رحمتہ اللعالمین کامل تین جلد

مصنفہ:۔ علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری

فاضل مصنف نے آقا عربی کی سوانح حیات کو جس بالغ نظری سے مرتب کیا ہے اس نے رحمتہ اللعالمین کے شائع ہوتے ہی غیر معمولی مقبولیت عنایت کر دی چنانچہ کتاب کو ملک کے ہر حصہ میں ہاتھوں ہاتھ قبول کیا گیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقفیت پیدا ہو جائے گی۔

طرز بیان محبت اور عقیدت سے منجھا ہوا ہے سیرت کے ساتھ ہی بہت سے اہم مذہبی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتابت خوشخط کاغذ چکنا عمدہ طباعت دیدہ زیب کامل تین جلد مجلد قیمت ۷ ار روپے۔

اردو زبان میں قرآن حکیم کی بے نظیر و لاثانی تفسیر

تفسیر حقانی اردو کامل

مصنفہ فاضل اجل علامہ مولانا مولوی عبدالحق صاحب حقانی دہلوی

اردو زبان میں آج تک ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس سے آپ عمر کے ہر حصہ میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں زبان عام فہم اور سلیس بامحاورہ اردو استعمال کی گئی ہے حوالہ کتب۔ ربط آیات، نشان نزول اور دیگر متعلقات بھی درج کئے گئے ہیں، شائقان علم دین کے مسلسل اصرار پر نواں ایڈیشن آٹھ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔ جو اڑھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ قیمت کامل آٹھ حصے بلا جلد پچیس روپے، مجلد اکیس روپے ہم اسلامی، ادبی کتابیں اور قرآن مجید شائع کرتے ہیں فہرست مفت طلب فرمائیے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ ناشران کتب کتاب منزل
کشمیری بازار لاہور

نقد و نظر

ف۔ ح

مطبوعاتِ خاتون کتاب گھر۔ دہلی

یورپ کے بہت سے پبلشر اچھے مصنفوں کی کتابیں عمدگی اور نفاست کے ساتھ پیش کرنے کے سلسلے میں مشہور ہیں۔ جب ان کی مطبوعات پر نظر ڈالی جائے تو ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے طباعت و اشاعت کے کام کو بھی ایک مستقل فن لطیف کی حیثیت دے رکھی ہے۔ ہندوستان کے جن معدودے چند اداروں نے اس خصوصیت کو اپنایا ہے، ان میں خاتون کتاب گھر، دہلی کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت دی جا سکتی ہے۔ اس ادارے کو اردو نشرگاہ دہلی کی پیش کردہ کتابیں چھاپنے کا فخر حاصل ہے جسکے ارباب حل وعقد ہمیشہ عمیق زاویۂ نظر سے کام لیتے ہوئے صفِ اول کے بلند پایہ ادیبوں کے شاہکار شائع کرنے کی سفارش کرتے ہیں۔ پھر جس طرح میکے والے ہر دلعزیزی کے خیال سے دلہن کو بنا سنوار کر سسرال بھیجتے ہیں، اسی طرح خاتون کتاب گھر کے مالک و منتظم (شاید "خاتون" کی لفظی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے) ہر کتاب کو جہیز کے تحفہ کی طرح اسقدر سلیقے کے ساتھ شائع کرتے ہیں کہ اس کی عمدگی، نفاست اور پاکیزگی ہر صاحب ذوق کا دل موہ لیتی ہے اس طرح باطنی خوبیاں ظاہری رعنائیوں کے ساتھ مل کر ایک اچھا حسن امتزاج پیش کرتی ہیں۔ یہ ادارہ مصورِ غم علامہ راشد الخیری کی یادگار ہے اور ان مرحوم کے صاحبزادوں نے قائم کیا ہے۔ انہوں نے ترقی اردو کی خاطر میدان ادب میں ایک مضبوط عمارت کی بنیاد رکھی تھی یہ ادارہ نت نئے ادبی ستونوں کا اضافہ کرکے اس عمارت کو وسعت دے رہا ہے۔ اسوقت خاتون کتاب گھر کی سات کتابیں پیش نظر ہیں جن پر مختصراً اظہارِ خیال کرنا مقصود ہے۔

علامہ راشد الخیری | یہ کتاب اردو کے مشہور نقاد پروفیسر وقار عظیم ایم اے نے (جنکی خدمات اب ادارہ آجکل نے حاصل کرلی ہیں) مرتب کی ہے۔ اہلِ قلم میں مشہور ہستیاں شامل ہیں۔ ڈاکٹر اعظم کریوی نے علامہ راشد الخیری کی افسانہ نگاری، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے ان کی ناول نگاری، میجر ڈاکٹر نصیر الدین نے ان کی ٹریجیڈی، مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ان کے سفرناموں، ڈاکٹر سعید احمد بریلوی نے ان کی شاعری، جناب حامد علی نے ان کی انشاپردازی اور خود مرتب نے انکی ظرافت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مولوی شاہد احمد دہلوی (مدیر ساقی) نے انکے لٹریچر میں شاعرانہ عنصر اور ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردیہ نے ان کے ادب میں مشرقیت کے وجود کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے ان کو بحیثیت مصلح پیش کیا ہے اور سید محمود مورخ نے انکے تاریخی ناولوں پر نظر ڈالی ہے غرض یہ کہ ہر پہلو اور ہر زاویے سے مولانا مرحوم کے ادبی کارناموں کی خصوصیت اور انکی افادیت پر لکھے ہوئے تنقیدی مقالات کو یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا حضرات کے نام ہی کتاب کے معیاری ہونے کی ضمانت ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

پھانسی | لیونڈ آندریف روس کا سب سے بڑا ناول نویس گذرا ہے۔ وہ گورکی کا ہمعصر اور اسی کی طرح حقیقت نگار تھا۔ فرق اتنا ہے کہ اول الذکر نے زندگی کو بحیثیت مجموعی جوں کا توں پیش کیا ہے اور آندریف نے غیر معمولی لوگوں کی غیر معمولی زندگی پر نظر ڈالی ہے چیخوف کے ہاں جو چیز غمگین ظرافت کا رنگ اختیار کرتی ہے، وہ آندریف کے ہاں تلخ طنز بن جاتی ہے۔ اس کے ناولوں میں "سیون ہو ور ہینگڈ" کو ایک بلند درجہ حاصل ہے اس کو ہمارے ملک کے مشہور صحافت نگار اور مترجم شاہد احمد دہلوی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ یہ کتاب تجزیۂ نفس کے اعتبار سے بہت زیادہ وقیع ہے اسمیں سات مجرموں کے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ جب عدالت کی طرف سے ان کو پھانسی کا حکم سنایا گیا تو ان کے قلب و دماغ پر کیا کیفیات گذریں اور جب انہیں معلوم ہوگیا کہ بہت جلد موت کے گھاٹ اترنا یقینی ہے تو زندگی کے آخری لمحات انہوں نے کیونکر بسر کئے۔ وہ لمحات جنمیں خوف و ہراس، بے چینی و بے قراری اور اطمینان و سکون کی متضاد کیفیات ملی جلی موجود تھیں۔ وہ کبھی سہم کر اور کبھی اس خیال سے خالی الذہن ہوکر موت کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دلکش کتاب کا ترجمہ بھی دلکش ہے۔ کیونکہ شاہد صاحب صفِ اول کے مترجموں میں شامل ہیں اور موریس میٹرلنک کی طرح آندریف بھی ان کا مقبول مصنف ہے جس کے طرزِ بیان اور زاویۂ نظر کو انہوں نے خوب سمجھا اور اچھی طرح پیش کیا ہے۔ قیمت دو روپے۔

طغیان | ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے قاضی نذرالاسلام کی نظموں کو اردو کا جامہ پہنا کر بنگال کے اس باغی شاعر کو ہمارے ادب میں روشناس کرایا تھا۔ افسانوں کے ضمن میں یہ گرانقدر خدمت جناب محمد یونس احمر نے انجام دی ہے۔ احمر خود بھی شاعر اور بنگال کے رہنے والے ہیں، نذرالاسلام کے قریب اٹھتے بیٹھتے ہیں اسلئے انہوں نے اس شاعر کی روح، اسکے اندازِ بیان اور زاویۂ نظر کو خوب سمجھا ہے اور چونکہ طبعزاد افسانے لکھنے میں وہ پہلے سے مشاق تھے اسلئے اس کام میں انہیں کسی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔ نذرالاسلام کی نثر میں بھی وہی لطافت و شیرینی اور وہی حسن بیان اور رنگینی موجود ہے جو اس کی نظموں کے لئے طرۂ امتیاز رہی ہے۔ یہاں بھی اسکے خیالات بلند آہنگ ہوکر سنائی دیتے ہیں۔ ان افسانوں میں بھی وہ ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے رونما ہوا ہے۔ اس نے ہندوستانی سماج کو خصوصاً اسکی کمزوریوں کو گہری نظر سے جانچا اور اچھی طرح پیش کیا ہے۔ یہ آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہمارے ادب میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے قبل بہت کم لوگ نذرالاسلام کو افسانہ نویس سمجھتے ہونگے اس کی اشاعت ان کی معلومات میں اضافہ کرے گی۔ صادق الخیری صاحب کا دیباچہ سیر حاصل اور ٹھوس بنیاد پر قائم ہے۔ قیمت ڈھائی روپے۔

دھنک | علامہ راشد الخیری مرحوم کے صاحبزادے جناب صادق الخیری ایم اے نے ادبی ذوق ورثے میں پایا اور اسے اپنی خداداد ذہانت سے خوب نکھارا ہے۔ دھنک کے سات رنگوں کی طرح سات طبعزاد افسانوں کا یہ مجموعہ نہایت دلکش، رنگین، رومان پرور اور شعریت سے لبریز ہے۔ ہر افسانے میں زندگی اس طرح تڑپتی بل کھاتی اور جادو جگاتی نظر آتی ہے کہ پڑھنے والے کے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کرکے اپنا ہم آہنگ کئے بغیر نہیں رہتی۔ ہر افسانے کا ہر جملہ محسوس کراتا ہے کہ اسمیں ہماری ہی زندگی کے کسی ایک پہلو کا عکس جلوہ گر ہے۔ صادق صاحب نے روسی افسانہ نگاروں سے خوب متاثر ہوکر اپنے لئے ایک اسلوب پیدا کیا اور اسے بالکل مشرقی سانچے میں ڈھالا ہے جس طرح الیگزنڈر ڈوما کے ساتھ اس کے بیٹے کا نام زندہ ہے، مولانا مرحوم کے ساتھ صادق کا نام زندہ رہیگا۔ یہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے قیمت دو روپے۔

رنگ و نور | جناب جلیل احمد قدوائی ہمارے جدید ادب میں سب سے زیادہ قدیم اور

اسی اعتبار سے نہایت اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ وہ بیک وقت اچھے شاعر اور کامیاب افسانہ نگار ہیں، اس لیے انکی تحریریں دونوں رنگ ملے جلے نظر آتے ہیں یعنی شعر میں افسانوی رنگ اور افسانوں میں شاعری ان کی وہ خصوصیت ہے جو اس عہد کے کم مصنفوں کو نصیب ہوتی ہے۔ "رنگ ولو" ان کی نظموں، غزلوں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے۔ ہر شعر کیف پرور اور جادو اثر ہے۔ خصوصاً وہ نوحے جو مختلف حضرات کی وفات پر لکھے گئے ہیں، اپنے اندر اتنی تڑپ رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اصل درد کی کسک دل میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ غزلیں پابندِ بحر و عروض ہونے کے باوجود جدت فکر کی حامل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ہر شعر ذاتی جذبات کے ماتحت لکھا ہے۔ تصنع اور بناوٹ کا رنگ کہیں جھلکتا نہیں دکھاتا۔ آجکل شائع ہونے والے کلام کے مجموعوں کی طرح اگر اشعار کو پھیلا پھیلا کر شائع کیا جاتا تو ضخامت چار گنی ہو جاتی۔ اس مجموعے میں تاثرات طباعتی عیاشی سے احتراز کیا ہے۔ قیمت سوا روپیہ۔

اصنام خیالی | قدوائی صاحب کے اس مجموعے میں سات افسانے ترجمہ شدہ اور چھ طبعزاد ہیں۔ ترجموں میں ایک ترگنیف کا، ایک مولیاں کا اور پانچ چیخوف کے ہیں۔ روس کے ان بلند پایہ مصنفوں کو زندگی کی سچی تصویر کھینچنے میں عالمگیر شہرت حاصل ہے۔ اور چونکہ قدوائی صاحب کا فطری میلان ایسے ہی افسانوں کی طرف تھا اسلئے انہوں نے ان مصنفوں کو نہ صرف پسند کیا بلکہ ان کے خیالات کی ترجمانی نہایت کامیابی کے ساتھ کی۔ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے روسی افسانے پہلے پہل اردو میں پیش کئے۔ اسلئے بھی موصوف کو ہمارے ادب میں ایک خاص درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کا ہر افسانہ ایک علیحدہ ہستی کے نام معنون ہے۔ بعض انتسابات معنی خیز ہیں۔ مثلاً "تین ملاقاتیں" ایک خاتون کے نام جنہیں ان کے دل نے بھلا دیا۔ "بلی کے بچے" "چچیرے بھائی بہن کے نام اور "بھالو" ملا رموزی کے نام۔ جلد سازی کی ستم ظریفی سے اس کتاب میں بیچ کے ۳۲ صفحے شامل ہونے رہ گئے۔ اسلئے مطالعہ شروع سے آخر تک نہ ہو سکا۔ قیمت ڈھائی روپے۔

بے غیرت | بلجیم کے نامور ڈرامہ نگار موریس میٹرلنک ہے جسکو اس کی ادبی تخلیقات کے سلسلے میں نوبل پرائز ملا تھا۔ ایسے کئی ڈرامے لکھے ہیں جن میں ڈرامائی کشمکش کم اور مسائل حیات کی ترجمانی زیادہ ہے۔ لیکن "مونا وانا" ایسا ڈرامہ ہے جو فنی اور آورشی دونوں اعتبار سے بلند ہے۔ "بے غیرت" اسی کا کامیاب ترجمہ ہے جسے جناب قدوائی صاحب نے اردو کے سانچے میں ڈھالا اور نالوتن کتاب گھر نے اردو میں دوسری بار پیش کیا ہے۔ اس میں عصمت و عفت کی نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے سماج کے مروجہ اصولوں کے خلاف ایک آواز بلند کی گئی ہے۔ عورت کی بریت کے لئے ایک نیا پہلو پیدا کیا ہے۔ ترجمہ نہایت کامیاب اور دلکش زبان میں کیا گیا ہے۔ قیمت پونے دو روپے۔

آشوب

بقیہ صفحہ ۵۱

اس طرح ہنس رہی تھی جیسے یہ سب کچھ مذاق ہو، اس کی نظر میں آج زندگی بھی ایک بہت لطیف مذاق ہو کر رہ گئی تھی، مگر وہ دونوں تو سوچ سوچ کر شرم سے گڑی جا رہی تھیں، آج کس طرح اس کی آنکھیں پھرکی کی طرح گھومتی رہیں اور طرح طرح کی آنکھیں ان کو گھورتی رہیں، ساجدہ کے بدن میں تو ابتک سوئیاں سی چبھ رہی تھیں، اس نے کچھ جل کر کہا "آخر طاہرہ تم میں اور بازاری عورت میں فرق کیا رہا" مگر طاہرہ تو یہی سوچ رہی تھی کہ وہ اس کی پیاری پیاری آنکھوں سے جل کر دل کا بخار نکال رہی ہے! مگر آپا فاخرہ کا ایک لفظ اسے کاٹے کھا رہا تھا۔ وہ بے شرم تو نہیں تھی، اس کے جذبات کی ساری فصیلیں ٹوٹ گئیں، وہ اس قدر روئی کہ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ اسقدر بے بس تھی جیسے بھوکی شیرنی کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے، وہ سمجھتی تھی کہ سارے فساد کی جڑ عابد ہے، عابد کو آتا دیکھکر اس نے اپنا دوپٹہ سنبھال لیا، وہ سوچنے لگی کہ آج پہلی مرتبہ وہ اپنے دل کا راز اس سے کہے گی، وہ ضرور اس کے رونے کا سبب پوچھے گا تو وہ صاف صاف کہدے گی کہ ساجدہ شہلا اس سے اسی لئے حسد کرتی ہیں کیونکہ اس نے اس کی آنکھوں کی تعریف کی ہے۔ "ارے طاہرہ کیا پھر تمہاری آنکھیں دکھنے کو آ گئیں"۔

وہ لاپرواہی سے کہتا نکل گیا اور طاہرہ نے ہتھیلی سے اپنے ہونٹ دبا لئے کہ کہیں سسکی نہ نکل جائے!

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

اسپتال کا ایک منظر۔ اوپر کے حصۂ عمارت کو گھما کر اسطرح
کے سامنے کیا جاسکتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ شعاعیں اندر پہنچ

جام نگر میں سورج کی
شعاعوں کا اسپتال

سوکھے کی بیماری کا علاج الٹراوائلٹ شعاعوں سے کیا جا رہا
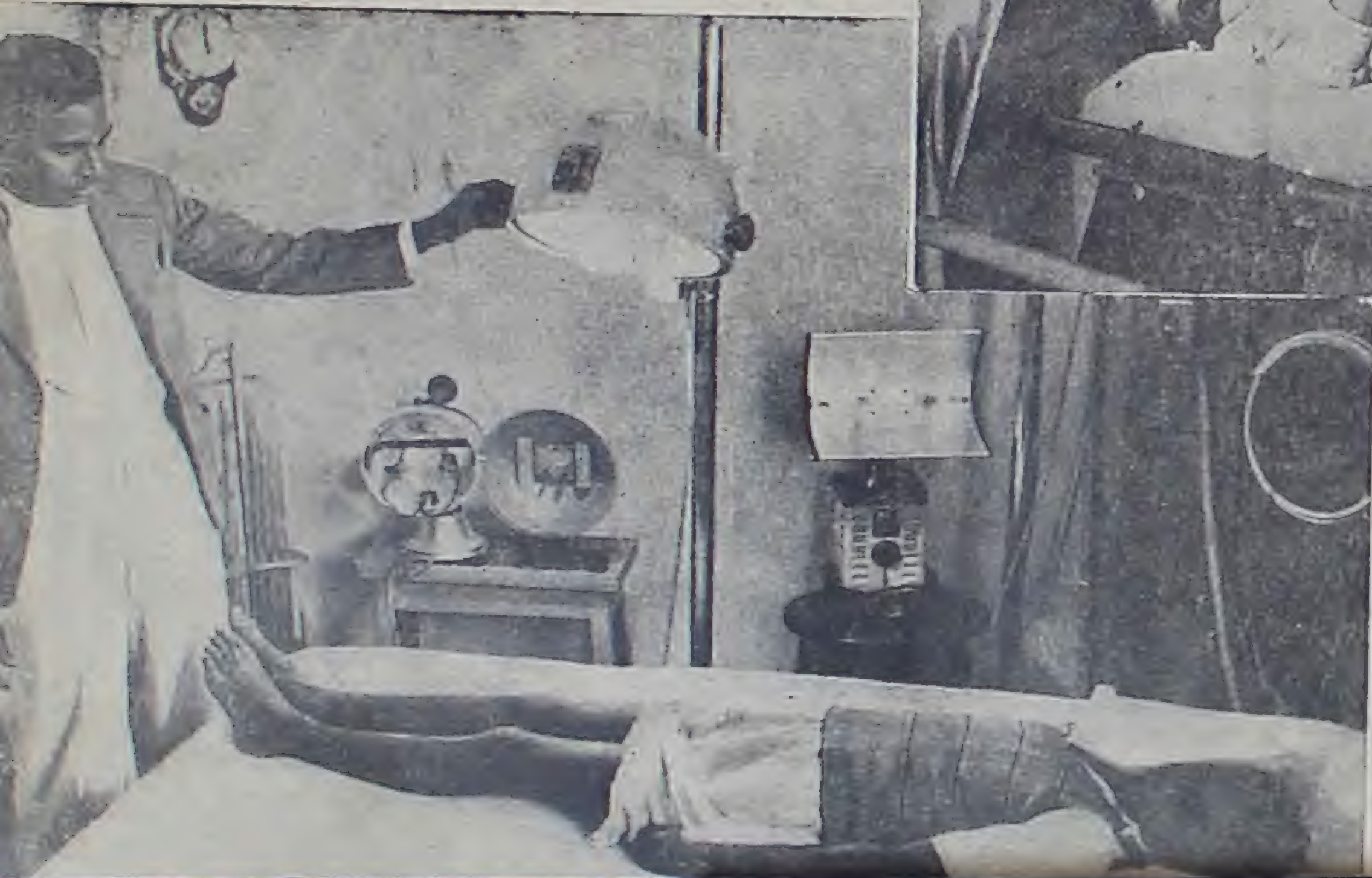
پھیپڑوں کے ایک مریض پر آلوں کے ذریعہ سورج کی شعاعیں ڈالی جارہی ہیں۔

—— :o: ——

نوانگر کے صدر مقام جام نگر میں بالکل نئی وضع کا ایک اسپتال بنایا گیاہے۔ جہاں سورج کی شعاعوں سے مختلف بیماریوں کا علاج کیا جاتاہے۔ جلدی اور اعصابی امراض کے علاوہ گنٹھیا بہرے پن اور سوکھے کا علاج خاص طور پر ہوتا ہے۔

مالو شو کمپنی لمیٹڈ لاہور

(رجسٹری شدہ زیر انڈین کمپنیز ایکٹ ۱۹۱۳ء بطور پبلک لمیٹڈ کمپنی)

اغراض و مقاصد

کمپنی عام طور پر اُن اغراض کیلئے قایم ہوئی ہے جو کمپنی کے میمورنڈم اوف ایسوسی ایشن میں مذکور ہیں۔ اُن میں دیگر کاموں کے علاوہ چمڑے کی رنگائی و پکائی صفائی اور درستگی کا کام دھوڑی کھال اور رنگے ہوئے چمڑے کی تجارت اور بُوٹ شوز۔ سُوٹ کیس اور ہر قسم کی اشیا کی تیاری کا کام بھی ہے خواہ وہ نقلی یا اصلی چمڑے یا ربڑ کے ہوں مگر جس کام پر کمپنی اپنی توجہ صرف کرنا چاہتی ہے وہ اعلیٰ قسم کے بُوٹ شوز۔ سُوٹ کیسز کی تیاری ہے جو کہ غیر ملکی ساخت کی چیزوں کا خوب مقابلہ کرینگی اور اپنی عمدگی و قیمت کے لحاظ سے خریداروں اور استعمال کنندوں کی تسلی کا باعث ہونگی۔

ہر قسم کے بُوٹ شوز اور سُوٹ کیس کی مانگ فی زمانہ اسقدر بڑھ گئی ہے کہ اس سے پہلے کبھی اتنی نہ تھی حالانکہ ہر پانچ شخصوں میں سے صرف ایک شخص جُوتہ پہنتا ہے بالفاظ دیگر صرف ۲۰ فیصدی لوگ جُوتے استعمال کرتے ہیں اور باقی ۸۰ فیصدی لوگوں کیلئے بُوٹ شوز مُہیا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بُوٹ شوز اور چمڑے کی صنعت میں کس قدر توسیع کی گنجائش ہے

دیگر ہمارے ملک میں کاریگر اور مزدُور بآسانی و ارزاں اجرتوں پر مل سکتے ہیں خام پیداوار کی از بس کثرت ہے۔ کام کرنیوالے دماغوں کی کمی ہے محض تنظیم مطلوب ہے ہندوستان سے کروڑوں روپیہ کا خام چمڑا سستے بھاؤ ممالک غیر کو چلا جاتا ہے۔ جسے بنی ہوئی صورت میں ہم بہت بڑھی ہوئی قیمتوں پر خرید تے ہیں یہ خام پیداوار ہندوستان ہی میں رہے تاکہ ہمارے مُلک کے دستکار اور عوام اپنے مُلک کی قدرتی پیداوار کی فراوانی اور وسایل سے فائدہ اُٹھا سکیں اور ہندوستان کی صنعت و حرفت کو ترقی دے سکیں

مذکورہ بالا سے قطع نظر فی زمانہ ساری دُنیا میں سرمایہ دار اور مزدُور کے مابین کشمکش جاری ہے۔ مگر ہم اپنی کمپنی کو ایسے اصولوں پر چلانا چاہتے ہیں جس سے یہ پیچیدہ مسلہ بھی حل ہو جائے۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کسی صاحب کو دس ہزار روپے کی مالیت سے زیادہ کے حصص نہ دیے جایں اور کمپنی صحیح معنوں میں عوام کی کمپنی رہے اور اس میں سرمایہ دارانہ ذہنیت داخل نہ ہونے پائے۔

ہم لاہور سے تقریباً دس میل کے اندر ایک صنعتی شہر چھ سو ایکڑ اراضی پر بسانا چاہتے ہیں اسمیں ایک شاندار فیکٹری کھولی جائیگی جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن ڈاکخانہ۔ تار گھر۔ چھاپہ خانہ۔ ٹینری۔ بُوٹ شوز اور سُوٹ کیس بنانے کا کارخانہ چمڑے کا کام سکھانے والا کالج اور کاریگروں مزدُوروں کے رہنے کیلئے کوارٹرز بود و باش کی سہولت کے علاوہ مزدُوروں کی تعلیم کا انتظام کیا جائیگا۔ اور صحت جسمانی کے تحفظ کی خاطر ہسپتال کھولا جائیگا۔ کمپنی کے سالانہ منافع میں سے ایک حصہ کاریگروں میں تقسیم کرنے کیلئے مخصوص کر دیا جائیگا۔ جو ان کی رسمی اُجرتوں اور تنخواہوں کے علاوہ ہوگا۔ اور اس رقم سے کمپنی کے تمام کاریگروں اور ملازمین کی زندگیوں کا بیمہ ہوگا جس کے نصف مصارف کمپنی اور نصف بیمہ شدگان برداشت کرینگے۔ تاکہ کاریگر اور مزدُور اپنی زندگی کے آخری دن تسلی اور اطمینانِ قلب سے بسر کر سکیں۔

گذشتہ جنگ میں لوگوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ ہندوستان میں ہر قسم کی صنعت و حرفت بآسانی کامیاب ہو سکتی ہے چنانچہ جن لوگوں نے زمانہ جنگ میں کام کیا انہوں نے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا۔ آجکل ہمارے مُلک میں سرمایہ کی کوئی کمی نہیں تجارتی کامیابی کے تمام امور صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ ہندوستان ان پر عامل ہو کر صنعت و حرفت اور تجارت کے میدان میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے خوش قسمت ہونگے وہ اصحاب جو اس قسم کے تجارتی اور صنعتی شعبوں میں دلچسپی لیں گے۔ اور اپنے آپکو ان سے وابستہ کرینگے۔ موجودہ موقعہ عین مناسب اور زیر تجویز کاروبار کیلئے بیحد موزوں ہے۔ اسلئے ڈائرکٹران اس موقعہ سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں اور سردست پانچ لاکھ روپیہ کا سرمایہ جاری کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس سے عملی کام کا کچھ آغاز کیا جا سکے۔ نظر بریں ذیل کے پروگرام پر عنقریب عمل درآمد شروع کر دیا جائیگا۔ توقع ہے کہ کمپنی اپنے حصہ داروں میں بنکوں کی شرح سود اور مکانوں کے شرح کرایہ سے زائد منافع تقسیم کر سکے گی یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ مرکزی حکومت سے کمپنی کے منظور شدہ سرمایہ کا باقی حصہ یا اسکی مزید قسط جاری کرنے کی اجازت حاصل ہو جائے

پروگرام

مشینری کا کارخانہ مکمل ہونے سے قبل ہم نے انتظام کر لیا ہے۔ بہترین قسم کے ہینڈ میڈ بوٹ شوز بازار میں بغرض فروخت لے آئیں خیال ہے کہ تین ماہ کی مدت کے اندر بڑے بڑے شہروں میں کمپنی کے ہینڈ میڈ مال کی فروخت کیلئے ایجنسی کے طریق پر کمپنی کی دوکانیں کھول دی جائیں گی جہاں بہترین اور اعلیٰ قسم کا مال پبلک کو پیش کیا جائیگا۔ تاکہ اس سے کمپنی کی شہرت ہو۔ اور مالی فائدہ حاصل ہو۔

صنعتی شہر اور فیکٹری کیلئے زمین جلد حاصل کی جائیگی چمڑہ رنگنے۔ بُوٹ شوز اور سُوٹ کیس کی تیاری کی خاطر جدید ترین نمونہ کی مشینری منگائی جائیگی۔ کارخانہ اور عمارتوں کے نقشے تیار کرائے جائینگے۔ ایک طرف مشینری لگانے اور عمارتیں کھڑی کرنے کا انتظام ہوگا۔ دُوسری طرف جلد سے جلد دوکانیں قائم کر دی جائینگی تاکہ کمپنی کے مصنوعہ مال کی مانگ بڑھے اور کمپنی کو سال اوّل ہی میں منافع حاصل ہو۔

کمپنی کی خوش قسمتی ہے کہ اسے شیخ عبدالمالک اینڈ کمپنی کی خدمات بطور مینجنگ ایجنٹس حاصل ہو گئی ہیں مینجنگ ایجنسی کے ایک حصہ دار شیخ عبدالمالک ہیں جو کمپنی ہذا کے ڈائرکٹر بھی ہیں انہیں اس کاروبار میں ایک وسیع تجربہ حاصل ہے اور وہ اس تجارت کی اُونچ نیچ سے خوب واقف ہیں لہٰذا ان کا عملی تجربہ کمپنی کے لیے بہر نوع مُفید ثابت ہوگا۔

مینجنگ ایجنٹس

شیخ عبدالمالک اینڈ کمپنی بروئے آرٹیکلز اوف ایسوسی ایشن کمپنی ہذا کے مینجنگ ایجنٹس مقرر ہوئے ہیں مینجنگ ایجنٹس نے ڈائرکٹروں کو اطلاع دی ہے کہ وہ اسوقت تک آفس الاؤنس نہیں لینگے۔ جبوقت تک کمپنی اپنا عملی کاروبار شروع نہیں کرتی۔

سرمایہ منظور شدہ ۵۰ لاکھ روپیہ

منقسم بر حصص ذیل

۲۵ ہزار اے کلاس معمُولی حصے مالیتی یکصد روپیہ فی حصہ

۴۰ ہزار بی کلاس معمُولی حصے مالیتی پچاس روپیہ فی حصہ

۴۰ ہزار سی کلاس معمُولی حصے مالیتی پچیس روپیہ فی حصہ

موجودہ سرمایہ جاری شدہ ۵ لاکھ روپیہ

منقسم بر حصص ذیل

ایک ہزار اے کلاس معمُولی حصے بحساب یکصد روپیہ فی حصہ - ایک لاکھ روپیہ

۲ ہزار بی کلاس معمولی حصے بحساب پچاس روپیہ فی حصہ - ایک لاکھ روپیہ

۱۲ ہزار سی کلاس معمولی حصے بحساب پچیس روپیہ فی حصہ - تین لاکھ روپیہ

میزان ۵ لاکھ روپیہ

ڈائرکٹران

۱ - شیخ عبدالمالک صاحب :

پریذیڈنٹ : (الف) آل انڈیا فیڈریشن آف فٹ ویر ایسوسی ایشن

(ب) پنجاب مُسلم ٹریڈرز فیڈریشن - لاہور

(ج) لاہور فٹ ویر مرچنٹ ایسوسی ایشن لاہور

ممبر : فٹ ویر ایڈوائزری کمیٹی، گورنمنٹ آف انڈیا - دہلی

حصہ دار : (الف) کرنال شاپ - لاہور

(ب) انڈیا شو مینوفیکچرنگ کمپنی - لاہور

(ج) تھری نب شوز فیکٹری - لاہور

(د) ذکی فٹ ویر کمپنی - لاہور

(ہ) انارکلی شوز کمپنی لیدر مرچنٹس - لاہور

۲ - حاجی سید محمد امین شاہ صاحب فٹ ویر ایکسپرٹ :

مینجنگ پروپرائٹر "ڈیلیٹ فٹ ویر کمپنی" آگرہ

۳ - خواجہ عبدالغفور صاحب بی اے - مالک "رائل بوٹ شاپ" امرتسر

۴ - میاں ظہور احمد صاحب - فرم رلدو محمد دین اینڈ کمپنی گورنمنٹ کنٹریکٹرز سرکلر روڈ - لاہور

۵ - شیخ محمد شریف صاحب گوہر - سوداگر چرم و ملز اونرز - قصور و چک جھمرہ و رئیس اعظم قصور

۶ - حافظ سید احمد صاحب سوداگر نیا بازار سہارنپور

۷ - شیخ نصیر احمد صاحب سوداگر و رئیس انارکلی - لاہور

۸ - نوابزادہ مہدی علی خاں صاحب بی اے (علیگ) رئیس و زمیندار آف گجرات

مینجنگ ایجنٹس

شیخ عبدالمالک اینڈ کمپنی - لاہور

آڈیٹرز : ایس رسول اینڈ کو - رجسٹرڈ اکاونٹنٹس - آڈیٹرز ۱۴ - ہال روڈ - لاہور

رجسٹرڈ دفتر : حیات گنج - انارکلی - لاہور

بینکرز

حبیب بنک لمیٹڈ - لاہور - سنٹرل بنک آف انڈیا لمیٹڈ - لاہور

آسٹریلیشیا بنک لمیٹڈ - لاہور

نمونہ درخواست برائے خرید حصص

رجسٹر نمبر ـــــ الاٹمنٹ نمبر ـــــ سرٹیفیکیٹ نمبر ـــــ

مالو شو کمپنی لمیٹڈ

رجسٹرڈ دفتر گرجہ حیات گنج - انارکلی لاہور

درخواست حصص کے ہمراہ ذیل رقم ادا کرنی ہے

اے کلاس دس روپیہ فی حصہ

بی کلاس پانچ روپیہ

سی کلاس تین روپیہ

بخدمت ڈائرکٹران - مالو شو کمپنی لمیٹڈ لاہور

مکرمی بندہ - کمپنی ہذا کو ـــــ روپیہ جو کہ ـــــ روپیہ فی حصہ کے حساب سے ـــــ حصص مالیتی ـــــ روپیہ فی حصہ کے بطور پیشگی ارسال ہے درخواست ہے کہ ـــــ حصص یا اس سے کم حصص کمپنی کے میمورنڈم اور آرٹیکل کی رُو سے الاٹ کئے جائیں اور مجھے آپ کو اختیار دیتا ہوں کہ میرا نام کمپنی کے حصہ داران کے رجسٹر میں بطور حصہ دار درج کر لیا جائے ... الاٹمنٹ پر ... روپیہ فی حصہ ادا کر دوں گا اور اس کے بعد بقایا اقساط حسب ارشاد کمپنی ادا کرونگا ...

نام ـــــ ولدیت ـــــ پتہ ـــــ تاریخ ـــــ

دستخط عام ـــــ گواہ ـــــ پتہ ـــــ

(تمغۂ الیکٹرک پریس ... لاہور)

ضروری نوٹ : جاری کردہ حصص میں اسوقت تک ۲ لاکھ روپے سے زیادہ کے حصص فروخت ہو چکے ہیں

(اعلیٰ بلاک لکھوانے کا پتہ: ...)

آجکل

اتحادِ شوروی
ترکی
شام
عراق
ایران
افغانستان
چین
تبت
نیپال
ہندوستان
عربستان
برما
سیام
انڈو چائنا

Ajkal

۶

ادیب الملک حضرت اکبر حیدری (مرحوم)
آپ کی شاعری پر جناب عشرت رحمانی کا لکھا ہوا تنقیدی مقالہ اسی شمارے کے صفحہ نمبر ۸ سے ملاحظہ کیجئے۔

پیکر جمیل کی رنگینیوں کا مرقع اور نغمہ و موسیقی کا امتزاج

فلم ساز و ہدایت کار سبطین فضلی کی کامیاب تخلیق

"مہندی"

جو فضلی فلمز کی ایک ایسی مکمل تصویر ہوگی جسے آپ ہمیشہ یاد رکھینگے

نرگس اور بیگم پارہ کے ساتھ کرن دیوان ۔ سلطان مظہر
مراد ۔ جانی بابو ۔ غوری جیسے آرٹسٹ مہندی کی زینت ہیں

موسیقی :۔ غلام حیدر ۔ مکالمے :۔ ساغر نظامی!
گانے :۔ ساغر نظامی ۔ مجروح سلطانپوری ۔ عکاسی : پرشوتم ذدیچہ ۔ صدابندی : اے آمادر

آئندہ پروگرام :۔ خاتون ۔ گڑیا اور آوارہ ۔

فضلی فلمز ۔ رتن ولا ۔ دادر ۔ بمبئی

تقسیم کنندگان :۔ نیو دکن فلم ایکسچینج حیدرآباد دکن (جنوبی ہند) نگار پکچرز دہلی (انڈیا یوپی) یونیو پکچرز پشاور (پنجاب)

ہماری نئی مطبوعات

لندن سے آداب عرض

آغا محمد اشرف صاحب نے جنگ کی ہولناکیوں اور لندن پر بمباریوں کے دوران میں اپنے مشاہدات کو بی بی سی کے ذریعہ نشر کیا "لندن سے آداب عرض" انہی نشریات کا مجموعہ ہے بقول مصنف یہ جنگی پرچہ نویس کی ڈائری ہے جس کے مطالعہ سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

دوسرا ایڈیشن قیمت عہ

دیس سے باہر

آغا محمد اشرف صاحب کے تاریخی جنگی مضامین کا دوسرا مجموعہ "لندن سے آداب عرض" کی مقبولیت ہی اس امر کی ضامن ہے کہ مضامین افادی حیثیت سے قابل قدر ہیں آغا محمد اشرف نے دنیا کے مختلف حصوں میں جو کچھ دیکھا وہ الفاظ کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ قیمت ۱۲/

اوبستان

حضرت مولنا ضیغمی دہلوی مرحوم کے حسین و دلکش ادبی مقالات و تخیلات کا مجموعہ جن کو اختر شیرانی نے مرتب کر کے بے نظیر تصنیف بنا دیا ہے یہ مجموعہ بار بار شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے

تیسرا ایڈیشن قیمت عگر

وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ

بہترین ڈراموں کا مجموعہ مرتبہ اختر شیرانی اس مجموعہ میں مرتب نے ملک کے بہترین ڈراموں کو نئے انداز میں مرتب کیا ہے یہ ڈرامے آپ کی ذہنی خوراک ہیں آج ہی آڈر دیجئے نام سے ہی اندازہ کیجئے کہ ایک ڈرامہ سے دوسرا کیسا لاجواب ہوگا۔ قیمت تین روپے

بہار شریعت

مصنفہ حضرت مولنا مفتی حکیم امجد علی صاحب اسلامی عقائد اور قرآنی احکام کے لئے بہترین تصنیف تمام مسائل کو تقریباً اور استدلالاً مرتب کیا گیا ہے۔ اسلامی کتب میں بے نظیر تصنیف کا اضافہ کیا گیا ہے اگر آپ اپنے عقائد و اعمال نماز۔ روزہ و دیگر عبادت و معاملات کو درست کرنا چاہتے ہیں تو ہر وقت بہار شریعت کو زیر مطالعہ رکھیں یہ آپ کو عالم و مفتی سے بے نیاز کرے گی۔ مفتیان کرام کے لئے نوٹ بک کا کام دیتی ہے کامل، اچھے بلا جلد پچیس ۲۵ روپے مجلد اکتیس ۳۱ روپے

معاشیات قومی

مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی یہ کتاب عزیز وش لسٹ کے حقیقت افروز قلم کی مرہون منت ہے۔ جسے ڈاکٹر صاحب کے فاضلانہ دماغ نے اردو کا لباس پہنایا ہے یہ تصنیف بین الاقوامی اور سیاسی تجارت کے مسئلہ پر سیر حاصل بحث قوموں کے عروج و زوال کے اسباب و علل اور ان کی معاشی زندگی کے نشیب و فراز کی حقائق افروز تاریخی روداد ہے اردو زبان کے ہر بہی خواہ کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

مقالات شیرانی

از حافظ محمود شیرانی حافظ محمود شیرانی کا گوہر بار قلم ادبی دنیا میں بلند درجہ حاصل کر چکا ہے مقالات شیرانی ان کے بلند پایہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ گرانمایہ تصنیف ہر اہل ذوق کے زیر مطالعہ ہونی چاہئے۔ آج ہی طلب فرما کر ملاحظہ کریں۔ قیمت تین روپے۔

تاریخ انقلاب روس

مصنفہ شیر جنگ روس کے اقتصادی انقلاب کا پس منظر، تاریخی، معاشی، اخلاقی اور مجلسی رد و بدل کی روح فرسا تاریخ فاضل مصنف نے سینکڑوں تاریخی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاریخ مرتب کی ہے جو اختصار کے باوجود مکمل ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ شیر جنگ کے انقلابی ذہن نے واقعات کو خوش اسلوبی سے مرتب کر کے ایک لاجواب تصنیف بنا دیا ہے۔ قیمت صرف چار روپے۔

ہمارے ہاں اسلامی، ادبی اور تاریخی کتب کے علاوہ قرآن شریف حمائل پنجسورے اور سپارے شائع ہوتے ہیں۔

فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔

اوراق پارینہ

از شیر جنگ ایک انقلابی قیدی وہ بھی ادیب جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ملکی حالات غریب مزدور۔ کسان کی تکالیف معاشی مشکلات اور سوسائٹی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے۔ یہ کتاب انقلابی ذہنوں کے لئے ایک پروگرام اور ادبا کے لئے بہترین استعارے محاورے اور ادبی تخیلات کا لاجواب مجموعہ قیمت عہ

اردو زبان اور ہندو

مصنفہ ناظم سید بادری اردو زبان کی ترقی اور اس کے وسیع عمل و دخل میں ہندو اہل وطن نے جو گرانبہا خدمات سرانجام دی ہیں۔ یہ تصنیف آپ کو ان کے حالات و کلام سے بخوبی واقف کرے گی۔ تاریخی استدلالات سے کتاب اپنے موضوع کی بہترین تصنیف بن گئی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے (عہ)

قرآنی اخلاق دو حصے

انسان تو دنیا میں بہت ہیں لیکن انسان کہلانے کا حق دار تو صرف وہی ہے جس میں اخلاق کی تمام حدود کو قائم رکھا گیا ہو قرآن کریم انسانی ضروریات کا مکمل پروگرام پیش کرتا ہے۔ ناظم مرتب نے قرآن کریم کی آیات مقدسہ سے اخلاق کے ان جذبات کو جمع کیا ہے جس کے مطالعہ سے آپ کو اخلاقیات پر مزید کسی کتاب کی ضرورت نہ ہوگی۔

قیمت ایک روپیہ۔

کارل مارکس اور اس کی تعلیمات

مصنفہ شیر جنگ کارل مارکس نے دکھی دلوں کی آواز کو انتہائی رنج سے سنا اور اسے ایک نظریہ کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا۔ شیر جنگ نے اپنی آنکھوں سے ان ذہنی انقلابات کو دیکھا اور لوگوں پر کارل مارکس کی تعلیمات کا اثر دیکھ کر انھیں الفاظ کا جامہ پہنایا۔ ذاتی مشاہدہ کے علاوہ بیسیوں مدبروں سے بحث و تحقیق کے بعد یہ تصنیف مرتب کی ہے۔

تعلیمات کے ساتھ ساتھ کارل مارکس کی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کی بہترین کتاب ہے۔

قیمت مجلد چھ ۶ روپے

ملنے کا پتہ:- **شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور**

آجکل

اردو کا پندرہ روزہ مصور رسالہ

چندہ سالانہ نو روپے ششماہی پانچ روپے | سال ۵ - نمبر ۱۲ | فہرست | ۱۵ نومبر ۱۹۴۶ء | قیمت فی پرچہ چھ آنے

مدیر اعلیٰ
سید وقار عظیم
ایم۔ اے

نائب مدیران
فضل حق قریشی دہلوی ــــ بھگت سروپ ایم۔ اے

ادارہ مطبوعات متحدہ پوسٹ بکس ۲۶ دہلی

رفتارِ زمانہ

عہدوں کی نئی تقسیم

کئی ہفتے کی مسلسل گفت وشنید اور خط وکتابت کے بعد آخرکار یہ صورت پیدا ہوئی کہ ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ ایک مرکز پر آکر عبوری حکومت میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہوگئیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے نمائندوں کو مناسب عہدے دینے کی خاطر تفویض شدہ عہدوں کو نئے سرے سے تقسیم کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں وائسرائے ہاؤس سے حسبِ ذیل اعلان شائع ہوا ہے:-

"مسلم لیگ کے ان نمائندوں کو جو حال ہی میں عبوری حکومت کے ارکین مقرر ہوئے ہیں، ہز ایکسیلنسی گورنر جنرل نے حسبِ ذیل عہدے تفویض کئے ہیں:-

۱- مسٹر لیاقت علی خاں .... مالیات ....
۲- مسٹر آئی، آئی چندریگر .... تجارت ....
۳- مسٹر عبدالرب نشتر .... مواصلات (ڈاک خانہ اور فضا)
۴- مسٹر غضنفر علی خاں .... حفظانِ صحت ....
۵- مسٹر جوگندر ناتھ منڈل .... قانون سازی ....

اس طرح دوسرے عہدوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں، وہ حسبِ ذیل ہیں:-

۶- مسٹر جان متھائی .... صنعت وحرفت اور فراہمی ....
۷- مسٹر راجگوپال آچاریہ .... تعلیم وفنون ....
۸- مسٹر بھابھا .... امورِ عامہ، معادن وقوت ....

باقی عہدے جن میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی حسبِ ذیل ہیں:-

۹- پنڈت جواہر لال نہرو .... امورِ خارجہ اور تعلقاتِ دولتِ مشترکہ
۱۰- سردار ولبھ بھائی پٹیل .... امورِ داخلہ اور اطلاعات ونشریات۔
۱۱- ڈاکٹر راجندر پرشاد .... خوراک وزراعت ....
۱۲- مسٹر آصف علی .... حمل ونقل اور ریلوے ....
۱۳- سردار بلدیو سنگھ .... دفاع ....
۱۴- مسٹر جگجیون رام .... لیبر ....

دوسرے دن صبح کے ساڑھے دس بجے کابینہ کا اجلاس منعقد ہوا جس میں نئے ارکین نے حلفِ وفاداری اٹھایا۔

چین میں قحط کے امکانات

غیر سرکاری طور پر اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس سال موسم سرما میں چین کے تقریباً پانچ کروڑ باشندوں کو قحط کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صورت حالات اسوقت بھی نازک ہے۔ چنانچہ شمالی کوانگسی کے اضلاع میں اوسطاً سو آدمی ہر مہینے بھوک سے مرجاتے ہیں۔ صوبہ ہونان کے قرب وجوار میں شرح اموات اس سے بھی دس گنی زیادہ ہے۔ میڈم چیانگ کائی شیک نے اپنی قوم کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ چین کے نوے فیصدی باشندے دیہاتوں میں آباد ہیں۔ اس وقت انکی خوراک کا خاطرخواہ انتظام ملک کے سامنے ایک دشوار مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وزارتِ اغذیہ پورے وثوق کے ساتھ یہ اعلان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے کہ اس لڑائی میں جو قحط روکنے کے لئے جاری کر رکھی ہے، کامیابی نصیب ہوسکیگی یا نہیں۔ وزیر اغذیہ مسٹر ہاؤ کان نے کہا: "گذشتہ چند ماہ کے دوران میں قحط پر قابو پانے کے سلسلے میں ہماری کوششیں پوری طرح اطمینان بخش ثابت نہیں ہوسکیں کیونکہ لڑائی کے ہاتھوں حمل ونقل کی سہولتیں بالکل مسدود ہوگئی ہیں یا ناقابلِ اطمینان ہیں۔ آجکل چاول سے بھری ہوئی کشتی کو ہونان سے ذی خوان تک جانے میں پورے دو مہینے لگ جاتے ہیں خشکی کے راستے جانے میں دشواریاں اور بھی زیادہ ہیں۔ غیر ملکی اناج کے مقابلے میں خود چین کے بعض صوبوں کا مال قحط زدہ علاقوں میں زیادہ دیر سے پہنچتا ہے۔" چین میں چاول بکثرت پیدا ہوتا ہے لیکن اسوقت گیہوں کے علاوہ اسے چاول کے لئے بھی دوسرے ملکوں کا دستِ نگر ہونا پڑ رہا ہے۔ چنانچہ وزارت اغذیہ کو یقین ہے کہ بہت جلد آسٹریلیا، کنیڈا اور امریکہ سے گیہوں اور ہندچینی، سیام اور فارموسا سے چاول ان کے ملک میں پہنچ جائیگا۔

لندن کا ایک اخبار

لندن کے ایک ہفتہ وار اخبار "نیوز آف دی ورلڈ" نے حال ہی میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ کثیر الاشاعت ہے۔ چار ہفتے کی کل فروخت کا اوسط نکالتے ہوئے حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر اشاعت کے چوہتر لاکھ بارہ ہزار تین سو تراسی

پرچے فروخت ہوئے ہیں۔ اشاعت میں غیر معمولی اضافہ اخباری پابندیاں دور ہونے کے بعد ظہور میں آیا ہے۔ اس اخبار میں زیادہ تر جرم و سزا سے متعلق کہانیاں اور کھیل کود کے واقعات درج ہوتے ہیں۔ اس کا دعویٰ اگر صحیح ہے تو اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا تعداد حیرت انگیز ہے۔ ہندوستان جیسے ملک کا کوئی ہفتہ وار اخبار اپنی سال بھر کی مجموعی اشاعتوں کی کل تعداد سے بھی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لاہور سے چھ نئے اخبارات

لاہور کی موجودہ آبادی تقریباً آٹھ لاکھ ہے اسوقت اس شہر سے اٹھارہ روزانہ اخبارات شائع ہوتے ہیں، جن کے باعث شمالی ہند کے میدانِ صحافت میں لاہور کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اب جبکہ تین انگریزی اور تین اردو اخبارات کی اشاعت عمل میں آرہی ہے، وہ کلکتہ اور بمبئی کو بھی دور چھوڑ جائیگا اور اس طرح سارے ملک میں اولیت کا سہرا اسی کے سر رہیگا۔ بعض صحافتی حلقوں کا خیال ہے کہ ابھی اس تعداد میں اور اضافہ ہوگا کیونکہ عوام میں اخبار بینی کا شوق برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ ان چھ میں سے پہلا اخبار "پاکستان ٹائمز" کے نام سے نکلیگا مسلم لیگ کے چند مشہور اراکین جن میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر خان افتخار حسین دالئی ممدوٹ بھی شامل ہیں، اس کی مالی مدد کرینگے یہ اخبار مسلم لیگ کے خاص نصب العین (پاکستان) کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ لیگ کی اہم کارگذاریوں سے عوام کو آگاہ کرے گا۔ ایک اور اخبار "نیو انڈیا" کے سرپرستوں میں دو نام قابلِ ذکر ہیں۔ پنجاب نیشنل بنک کے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر یودھراج اور وزیر مالیات مسٹر بھیم سین سچر سیٹھ سدرشن ایم ایل اے انگریزی اخبار "بھارت" نکالیں گے جس میں کانگریس کے نصب العین کا پرچار کانگریس کے ایما پر ہوگا۔ اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے سیکرٹری مسٹر وریندر اردو میں "جے ہند" نکالیں گے۔ یہ بھی کانگریس کی حکمتِ عملی اور اس کے لائحہ عمل کی ترجمانی کریگا۔ لالہ لاجپت رائے آنجہانی کے "مرحوم" اخبار "بندے ماترم" کو کانگریس کے چند نوجوان حیاتِ نو بخشینگے۔ فارورڈ بلاک کے نئے اخبار کا نام "زنجیت" ہوگا۔ سبھاش چندر بوس کے سالارِ اعلیٰ سردار سردول سنگھ کولیشر اس کی مالی مدد کریں گے۔

اوسط پیداوار کا تناسب

کھیتی باڑی کے قدیم ترین طریقوں کو ابھی تک مدِ نظر رکھنے کے باعث ہندوستان زراعت کے میدانِ عمل میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ اسکا صحیح اندازہ آسانی کے ساتھ زمین کی اوسط پیداوار سے لگایا جاسکتا ہے یعنی یہ دیکھا جائے کہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی ایک ایکڑ زمین میں ایک خاص پیداوار کا اوسط وزن کسقدر ہوتا ہے، تو حیرت انگیز اعداد و شمار علم میں آتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل نقشے سے چند اشیائے خوراک کی اوسط پیداوار کا باہمی تناسب ظاہر ہوتا ہے:—

ملکوں کے نام	گیہوں	چاول	روئی	گٹ
	پونڈ فی ایکڑ	پونڈ فی ایکڑ	پونڈ فی ایکڑ	من فی ایکڑ
ہندوستان	٦٣٦	٨٥١	٨٩	٣٨٨
ارجنٹائن	٧٨٠	——	١٥١	——
ریاستہائے متحدہ امریکہ	٨٤٦	١٣٣٣	٢٦٤	——
کینیڈا	٩٧٢	-	——	——
اٹلی	——	٢٧٩٧	——	——
مصر	——	١٨٤٥	٥٣١	——
جاپان	——	٢١٢٤	——	——
جاوا	——	——	——	١٤٤٦
پیرو	——	——	——	١١٦٠

سبھاش چندر بوس

گذشتہ ایک سال کے دوران میں ہندوستان کی قومی فوج کے سالار مسٹر سبھاش چندر بوس کی زندگی اور موت کے سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں۔ وہ جس پُراسرار طریقے پر لڑائی کے دوران میں ہندوستان سے غائب ہوئے تھے، اس سے کہیں زیادہ پُراسرار صورت لڑائی ختم ہونے کے بعد پیدا ہوگئی۔ تاہم ملایائی یونین کے محکمۂ تعلقاتِ عامہ کی طرف سے جو اعلان حال ہی میں شائع ہوا ہے، اُسے پڑھنے کے بعد اب شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ موصوف ۱۹۴۵ء میں یقیناً موت کا شکار ہوگئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کے اعلیٰ اتحادی کمانڈر کی درخواست پر ٹوکیو میں عمیق تحقیقات ہوئیں اور اس نتیجہ پر پہنچا گیا کہ اب وہ اس دنیا میں زندہ موجود نہیں ہیں۔ امریکی محققین کا بیان ہے کہ ۱۸ اگست ۱۹۴۵ء کو ہوائی جہاز کے ایک حادثے سے زخمی ہوکر وہ تائی ہوکو ہسپتال میں داخل ہوئے اور جاں بحق ہوگئے۔ اس سلسلے میں چھ مختلف اشخاص سے مختلف اوقات میں جرح کی گئی اور سب کا بیان یکساں پایا گیا۔ انھوں نے یک زبان ہوکر انکی وفات کی تصدیق کی۔ اس ضمن میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ ان لوگوں سے من مانی باتیں کہلوانے میں پہلے سے کوئی سازش کر لی گئی ہوگی کیونکہ جن لوگوں کو طلب کیا گیا ان سب کو وقت کے وقت اطلاع دی گئی اور فیصلہ بھی یکلخت کیا گیا تھا۔

فلسطین میں نئے آثار قدیمہ

فلسطین میں لڈا نامی ہوائی اڈے کے شمال میں راس العین کے مقام پر دوسری یا تیسری صدی قبل مسیح کی چند عظیم الشان یونانی

عمارتوں کے آثار برآمد ہوئے ہیں۔ انکی پوری تفصیل ابھی شائع نہیں ہوئی ہے حکومت فلسطین کے محکمۂ اثریات نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ان عمارتوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ راس العین کانسی کے ابتدائی عہد یعنی دو ہزار قبل مسیح میں آباد اور حکومت کنعان کا صدر مقام تھا۔ عہد عتیق میں وہ آفک کہلاتا تھا۔ آسمانی صحائف میں بار بار اسکا ذکر آیا ہے۔ حضرت سیموئل کی پہلی کتاب کے چوتھے باب کی پہلی آیت میں ایک لڑائی کا ذکر ہے جو آفک کے مقام پر ہوئی اور جس میں اہل فلسطین نے اسرائیلیوں کو بری طرح شکست دی تھی۔ یونانیوں کے عہد میں اس شہر کا نام ا‍پگائے یعنی چشمہ تھا لیکن ہیرود اعظم نے شہر کی تعمیر نئے سرے سے کی اور اپنے باپ انٹی پیٹر کے نام پر اسکا نام انیٹی پیٹرس رکھا۔ ان انکشافات سے ظاہر ہے کہ تاریخ کے بہت سے گمشدہ اوراق تاریکی سے روشنی میں آجائیں گے۔

ہندوستان کیلئے اناج

اپنی غذائی ضرورتیں پوری کر لینے کے بعد سمندر پار ملکوں نے جن اناجوں سے ہندوستان کی مدد کی، ان کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں:۔

اقسام اناج	۱۰ اکتوبر کو ختم ہونیوالے ہفتہ میں	یکم جنوری سے ۱۰ اکتوبر تک کل تعداد
گیہوں	۸،۷۰۰ ٹن	۱۰،۷۷،۰۰۰ ٹن
چاول	۴،۵۰۰ ٹن	۲،۲۰،۰۰۰ ٹن
مکئی	۹،۶۰۰ ٹن	۱،۶۶،۴۰۰ ٹن
جو	۷،۰۰۰ ٹن	۱۲،۸۰۰۰ ٹن
جوار، باجرہ وغیرہ	۸،۵۰۰ ٹن	۱۷،۵۰۰ ٹن

چھتیس سال میں تیس میل

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو لندن سے ایک خط مسز آر جونسن کے نام روانہ کیا گیا تھا۔ لفافہ پر نصف پینی والا سبز رنگ کا ٹکٹ چسپاں تھا جس پر شاہ ایڈورڈ ہفتم کی تصویر بنی ہوئی تھی کیونکہ اس وقت انہی کی حکومت تھی۔ یہ خط حال ہی میں مسز جونسن کے پتہ پر مالٹنگ کوٹیج، لوزنام ہمپیفورڈ پہنچا ہے۔ حالانکہ ان کو وہ مکان چھوڑے کافی عرصہ ہو گیا اور ڈوورکوٹ کے مقام پر ان کے انتقال کو بھی چند ہفتے گذر چکے ہیں۔ لندن سے ہمپیفورڈ کا فاصلہ تقریباً تیس میل ہے جسے مذکورہ بالا خط نے چھتیس سال میں طے کیا۔ انگلستان کے محکمۂ ڈاک کی جلد بازی اور عجلت پسندی ضرب المثل سمجھی جاتی ہے۔ شاید یہ اس خصوصیت کی ایک زندہ مثال ہے جس طرح فوج کے بہت سے بہادر نوجوانوں کو اعزازی تمغے انکے مرنے کے بعد عطا کئے جاتے ہیں تاکہ ان کی بجائے انکی روح مسرت و شادمانی محسوس کرے۔ اسی طرح یہ خط مرحومہ کے مکان پر ان کی وفات کے بعد پہنچایا گیا۔

یو۔پی کے دیہاتوں میں شاہی سکّے

یو۔پی کی مجلس مسکوکات کی رپورٹ بابت ۴۶-۱۹۴۵ء کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ الٰہ آباد کے قریب ایک گاؤں میں کھدائی ہو رہی تھی کہ اچانک نو عدد ہسپانوی سکّے برآمد ہوگئے۔ ان سکوں پر شاہ فرڈیننڈ ہفتم کی تصویر ہے جو ۱۸۰۸ء سے ۱۸۳۳ء تک ہسپانیہ کا بادشاہ تھا۔ اس تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ہسپانیہ اور ہندستان کے مابین اس زمانے میں تجارتی تعلقات قائم ہونگے۔ مغل بادشاہوں کے چند سکّے فتحپور نامی گاؤں سے بھی نکلے ہیں جن میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی دو طلائی مہریں بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک مہر احمد نگر کی ٹکسال سے اور دوسری اورنگ آباد کی ٹکسال سے جاری ہوئی تھی۔ اسی طرح دہلی کے بادشاہ علاؤالدین محمد شاہ ثانی خلجی کے جاری کئے ہوئے چند ایسے سکّے برآمد ہوئے ہیں جن پر فارسی اور ناگری رسم الخط میں حروف کندہ ہیں۔ یہ سکّے ۶۹۷ھ سے ۷۱۱ھ تک مختلف اوقات میں بنے تھے۔

جامعہ ملّیہ کا جشن سیمیں

آج سے پچیس سال پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سنگ بنیاد علی گڑھ میں رکھا گیا تھا۔ اس کے پہلے امیر مولانا محمد علی مرحوم تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ درسگاہ وہاں سے منتقل ہو کر قرولباغ دہلی میں آگئی اور اب چند سال سے مستقل طور پر اوکھلے کے قریب جامعہ نگر میں قائم ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت اور تعلیمی سرگرمیوں پر ایک مفصل مقالہ آپ پچھلے شمارے میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ یہاں اس کے جشن سیمیں کا ذکر کرنا مقصود ہے جو ۱۵ نومبر سے ۱۸ نومبر تک منایا جا رہا ہے۔ اس کے پروگرام پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخی تقریب کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور کامیاب بنانے کے لئے جامعہ کے ارباب حل و عقد، خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب (شیخ الجامعہ) نے صحیح ذوق نظر کا ثبوت دیا ہے۔ اس دوران میں جامعہ کی مسجد اور مدرسۂ ابتدائی کی عمارتوں کے سنگ بنیاد رکھے جائینگے۔ نمائش کا افتتاح ہوگا، خواتین، طلبائے قدیم، تقسیم اسناد اور عربی کے خاص جلسے ہونگے۔ تیراکی اور دوسرے کھیلوں کے مقابلے، ڈرامہ، مشاعرہ، اسکاؤٹ ریلی، کیمپ فائر اور علمائے کرام کی تقریریں اسکی گوناگوں دلچسپیوں میں اضافہ کرینگی۔ امیر جامعہ کی طرف سے عصرانہ کی دعوت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے۔ اس طرح دماغی لطف و نشاط کے ساتھ ساتھ کام و دہن کی یہ لذت بھی اس تقریب کی ہمیشہ یاد دلاتی رہیگی۔ خواتین کے جلسے کی روح رواں محترمہ صالحہ عابد حسین ہیں۔ ان کے ایک پیغام سے پتہ چلتا ہے کہ جامعہ میں جلد سے جلد لڑکیوں کی تعلیم کے لئے بھی ایک مدرسہ قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے۔

غزل

آرزو لکھنوی

تقدیر پہ شاکر رہ کر بھی، یہ کون کہے تدبیر نہ کر
وا باب اجابت ہو کہ نہ ہو زنجیر ہلا تاخیر نہ کر

غم بڑھنے دے اور ذرا اے دل جانچ آہ کی بے تاثیر نہ کر
ہے خواب ادھورا آپ ابھی، بے سمجھے غلط تعبیر نہ کر

جب ظلم کا بدلہ ظلم ہوا مظلوم کا حق کچھ بھی نہ رہا
دے درد ہی میں لذت یارب نالے کو عطا تاثیر نہ کر

ہو لاکھ کمان کڑی قاتل، کچھ جذب نشانے میں بھی ہے
بازو کے بل پہ نظر کر کے، اندازۂ زخم تیر نہ کر

پیمانِ محبت ختم ہوا، اب ذکر سے اسکے فائدہ کیا
بکھری کڑیوں کے منہ نہ ہلا، تیار نئی زنجیر نہ کر

الفت کے عہدِ محکم میں، بودے کاغذ کی ضمانت کیا
یہ دل سے دل کی باتیں ہیں، رکھ یاد فقط تحریر نہ کر

ہر دل ہے حیات کا سرمایہ، اور دل میں جوش محبت کا
تو آرزو اور کہے گا بس رہنے بھی دے تقریر نہ کر

ادیب الملک اکبر حیدری مرحوم

جہانِ حسن میں مجھ ترنم ہے وفا میری ؛ میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے صدا میری
دلِ مضطر کو جب پر اعتمادِ کامرانی تھا ؛ مرے احساسِ خودداری میں تھی وہ التجا میری
مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی ؛ ہوئی ہے جذبِ اشکِ خونفشاں میں وہ دعا میری
اک آئینہ وہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ ؛ نہ دیکھی جائیگی دنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ سمجھنے کے لئے اکبر
سنی ہے کاتبِ قدرت نے برسوں التجا میری

یہ تھے وہ اشعار جو دہلی کی "بزم اردو" کے ایک اجلاس میں گونجے، سننے والوں نے داد کا غلغلہ بلند کیا۔ شاعر کی مترنم آواز نے ایک مخصوص تحت اللفظ کے انداز میں یہ اشعار پڑھے۔ مجمع میں دہلی اور بیرون دہلی کے مخصوص شعراء موجود تھے۔ داد کا شور کم ہوا تو حضرت سائل مرحوم کی بلند آواز گونجتی ہوئی سنائی دی۔ جو اس جلسہ کی صدارت فرما رہے تھے "حیدری صاحب۔ نیا رنگ اختیار کیا ہے آپ نے۔ ماشاء اللہ، بہت خوب۔ نادر انداز ہے" یہ تھے ادیب الملک اکبر حیدری جن کی وفات کو اب چھ برس گذر چکے ہیں۔ مگر ان کے احباب کو اب تک یقین نہیں آتا کہ ایسا صحت مند زندہ دل، آزاد مرد دیکھتے ہی دیکھتے بزم احباب کو اس طرح دغا دے سکتا ہے۔ مخصوص احباب میں ان کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اکبر نے شاعرانہ دل و دماغ مگر شکل پہلوانوں کی پائی ہے۔ متوسط قد، تنومند، گول چہرہ، خندہ پیشانی، مسکراتی ہوئی شربتی آنکھیں جن میں ہر وقت پائپ کے تمباکو کا دھواں ناچ ناچ کر ایک ہلکا خمار قائم رکھتا تھا۔ نہایت خوش پوش اور آشنا ہی خوش باش اور خوش مزاج مرنجان مرنج طبیعت کا انسان۔ اپنے مخصوص اصولوں کا سختی سے پابند۔ مذہب اسلام کا سچا شیدائی۔ دن بھر انگریزوں کو اردو ہندی پڑھاتا اور خود پنج وقتہ نماز پڑھتا۔ انھیں انگریزی اردو کے علاوہ ہندی اور پشتو اور فارسی میں معقول مہارت تھی۔ بذلہ سنجی اکبر کی فطرتِ ثانیہ تھی۔ بات بات میں لطیفے کہتے۔ دکھ درد میں بھی ہنستے رہتے لیکن دوسرے کے درد کے ہمدردی سے شریک بنتے۔ اور دوستوں کا دکھ اپنا دکھ سمجھتے۔ صاف باطن اور صاف گو حد درجہ تھے۔ وضع اور اصول کی پابندی ان کا ایمان تھا۔

ذیل کے قطعہ میں تصنع اور پُر فریب زندگی سے کس دیدہ دلیری سے طنزیہ گریز کیا ہے ؎

تصنع ہے تکلف ہے تعلی ہے تماشا ہے ؛ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ میری زندگی کیا ہے
خداوندا مری گمراہیوں سے درگذر فرما ؛ میں اُس ماحول میں رہتا ہوں جسکا نام دنیا ہے

اکبر کے احباب کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان کی بذلہ سنجی بہت جلد لوگوں کو ان سے بے تکلف بنا لیتی تھی۔ لیکن مخلص دوستوں میں صرف چند ہی تھے جن میں حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ، سید ذوالفقار علی بخاری (اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو) بھیا احسان الحق عشقی۔ ملا محمد الواحدی۔ ڈاکٹر سعید احمد بریلوی۔ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی، قاری عباس حسین (آف قوم دہلی) دیش بندھو گپتا (آف تیج، دہلی) اور مرحوم نقی تور دہلوی۔ ایک نظم میں دہلی کی بزم ادب کا تذکرہ اکبر مرحوم نے اس طرح کیا تھا ؎

خوبیٔ قسمت سے ہیں اہلِ نظر ارباب ہوش ؛ معنوی فرزند تیرے تیری بزم ناز میں
تیری خدمت پر کمر بستہ بصد جوش و خروش ؛ ہیں ترے نورِ نظر لیکن نئے انداز میں

ہیں بخاری، عشرت و محمود و تابان و حزیں
تیری بزم علم و فن میں آج تخئیل آفریں

بارگاہِ علم ہے نیرنگ کی بزم ادب ؛ خادمانِ بزم اردو ہیں یہاں مصروف کار
اکبر و وحشی سعید و برق و قاری سب کے سب ؛ تیری محفل کیلئے ہیں باعثِ عز و وقار

اے جہان آباد کی خطہ زمیں بیدار ہو
یعنی اب گل آفرینی کے لئے تیار ہو

اکبر مرحوم راقم الحروف اور متذکرہ بالا احباب مشاعروں، نجی صحبتوں اور ادبی جلسوں میں اکثر ساتھ رہے۔ ان دلچسپ علمی ادبی محفلوں کی رنگینیاں اب "نقش و نگار طاقِ نسیاں" ہو چکی ہیں۔ فانی دنیا کے نقوش کسقدر بے ثبات ہیں۔ چند سال گذرے ہیں۔ کیا کیا صحبتیں برہم ہوئیں۔ زیادہ مدت بھی نہیں گذری لیکن معلوم ہوتا ہے ؏

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

دہلی کی بزم ادب سالہا سال قائم رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑ گئی۔ اکبر مرحوم اس بزم کے سکریٹری تھے۔ اچھے اچھے مشاعرے اور مفید معرکتہ آلارا جلسے منعقد ہوگئے۔ اب صرف اکبر اور بزم اکبر کی یاد باقی رہگئی۔ بقول اکبر ؎

ایکدم کے ساتھ تھا ہنگامۂ سوز و گداز ؛ اب پڑے ہیں کہاں جب شمع محفل اٹھ گئی

اکبر کی زندگی میں اُنکی صحت قابلِ رشک تھی لیکن اس سے زیادہ رشک کے قابل شاید موت بھی ہوئی یعنی نہایت مختصر اور بے اعتبار سی علالت میں ۱۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو بھرے گھر کو الوداع کہا اور چل بسے۔ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ محترمہ بیگم اکبر حیدری جو اکبر مرحوم کے احباب میں اپنی مہمان نوازی اور انکی تصانیف میں خانم کے نام سے

عشرت رحمانی

یاد کی جاتی تھیں یعنی جنہیں اکبر نے کبھی تحریر و تقریر میں بھی اپنے سے جدا نہیں کیا یہ سانحہ کیونکر گوارا کر سکیں۔ اولاد کا تو کہنا ہی کیا ہے اور احباب کیلئے بقول شاعر ؎

جیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

اکبر حیدری کی شاعری ان کے ماحول اور اس کے اثرات سے قطعاً دور نہ تھی اور اس صاف گو، صاف باطن انسان کے دل میں جو کچھ تھا وہی زبان پر۔ یہی ان کی شاعری کا صحیح اور سچا پرداز ہے۔ غزل، مسلسل نظم، رباعی، قطعہ، مثلث، مسدس۔ تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور ہر صنف میں یکساں قادر الکلامی کے جوہر دکھلائے۔ کیونکہ انھیں حکیم سید الطاف احمد صاحب آزاد سہارنپوری مرحوم تلمیذ مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل تھا اور بجا طور پر اپنے استاد کا اثر اور رنگ قبول کیا۔ اسلئے کلام اکبر، غالب اور حالی کے قدیم و جدید اثرات و شعور سے بھرپور نظر آتا ہے۔ غالب کی معنی آفرینی، علو تخیل اور فلسفۂ جذبات، خواجہ حالی کا براعتِ اسلوب، تسلسلِ بیان اور روانی، اور آزاد انصاری کا ترنم اور سہلِ ممتنع۔ یہ سب خوبیاں جمع ہو کر جو دلکش کیف تیار ہو سکتا ہے وہی اکبر حیدری کا کلام اور یہی ان کی شاعری کی خصوصیت خاصہ سمجھنا چاہیئے۔

انکی غزل تمام حسن سادگی کے ساتھ ارفع و اعلیٰ جذبات و احساسات سے مرصع ہوتی۔ عامیانہ انداز سے ہٹ کر انہوں نے جو مخصوص راستہ اپنی منزل کیلئے اختیار کیا ان کا ایک شعر اس حقیقت کا آئینہ دار ہے ؎

ہر قدم پر اک نئی راہ گذر ایجاد کی ؛ یاد رکھے گی قیامت تک مری منزل مجھے

سیدھے سادے انداز میں فلسفہ کے عمیق مسائل کو غزل کے اشعار میں بے تکلف ادا کر دینا اکبر کا عام رنگ ہے۔ جبر و اختیار کے مسئلہ کو کس احتیاط سے بے تکلف ادا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

خود پرستی خدا نہ بن جائے ؛ احتیاطاً گناہ کرتا ہوں

یا ذیل کے اشعار میں کیفیاتِ جمیل ؎

درسِ عبرت عمر کی روداد ہے ؛ بڑھ گیا تو یہ فسانہ کم ہوا
حوادث میں فنا ہو کر بقا کے راز سمجھا ہوں ؛ مری جمعیتِ خاطر ہوئی میری پریشانی
اب دیکھئے کہ کون ٹھہرتا ہے دیر تک ؛ بزمِ شباب بھی ہے جہاں حباب بھی
کس چمن کی خاک میں پھولوں کا مستقبل نہیں ؛ دور بیں نظروں میں رنگ و بو میں آب و گل نہیں
مری انجام بیں نظریں مجھے مغموم کرتی ہیں ؛ لرز جاتا ہے میرا دل عروجِ ماہِ تاباں سے
مستقل اے نامرادی مستقل انجام تک ؛ دیکھ کتنی لغزشیں پنہاں ہیں لب سے جام تک
تذکرہ برق و شرر کا جو سنا میں نے کبھی ؛ آہ بھر کر دلِ غمگیں نے کہا ہائے شباب

ہر شعر بجائے خود فلسفۂ حیات کی دلکش اور رنگین تصویر ہے۔ اکبر نے فلسفۂ گناہ پر مختلف اشعار و قطعات میں مخصوص رنگ سے روشنی ڈالی ہے۔

ہر جگہ ندرتِ تخیل نے ایک نئی دنیا پیش کر دی ہے۔ کہتے ہیں ؎

فرشتے آدمی بنکر نہ رہ سکے اکبر ؛ وہ ایسی کونسی مشکل تھی آدمیت میں

"عذر گناہ بدتر از گناہ" کی حقیقت کو تسلیم کر کے اکبر عذر کو ریاکاری کی معصیت تصور کرتے ہیں اور اقرار و انفعال میں عفو کے قائل ہیں۔ کیا خوب کہا ہے ؎

بھلا میں بھی تو دیکھوں جو ملے دامانِ عصیاں کے
ذرا سجدے سے سر اٹھنے تو دے ذوقِ پشیمانی

نظرت نے لے کے اشکِ ندامت کی سرخیاں ؛ عنوان لکھ دیا مری فردِ گناہ پر
آبروئے گناہگاری ہوں ؛ عرقِ انفعال کیا کہنا

جوانی کی غلط روی کی طرف نئے انداز میں تنبیہ و اشارہ کرتے ہیں (قطعہ)

ضمیر پاک طینت آہ کتنا بے مروت ہے
ستمگر ہر مسرت کو گنہگاری بتاتا ہے
میں کس دل سے کروں طاعت کہ طاعت میں مسرت ہے
نکوکاری سے ڈرتا ہوں کہ مجھکو لطف آتا ہے

گناہوں میں یقیناً ایک احساسِ مسرت ہے
گناہوں کے لئے لیکن جوانی کی ضرورت ہے

جوانی میں گنہگاری بہت معصوم ہوتی ہے
یہی حکمِ جوانی ہے یہی آئینِ فطرت ہے

ریاکاری بدترین معصیت ہے۔ اور خود انکاری عین خدا پرستی ہے۔ ان حقائق کو اکبر نے کس کس انداز میں ادا کیا ہے ؎

دروغِ مصلحت آمیز ہے دل کی تسلی بھی
خدا کا واسطہ دیکر نہ پوچھو اہلِ ایماں سے

انسانی سرشت اور عام مسلک یہ ہے کہ ؎

جب دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

لیکن بے ریا عبدیت، اس سے کہیں بالاتر ہے۔ عبد و معبود کا رشتہ حقیقی معنوں میں یہ ہے ؎

نہ الفاظِ حمد و ثنا جانتا ہوں ؛ نہ دلچسپ طرزِ ادا جانتا ہوں
مری بندگی ہے یہی ہے کہ تجکو ؛ خدا مانتا ہوں خدا جانتا ہوں

کسقدر بلند تخیل ہے۔ سبحان اللہ اور پھر اسی کی مزید تصریح ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو ؎

سنیت کی پرستاری اداؤں نداز سی اکبر ؛ دعا لب پر نہیں آتی مگر آنسو نکلتے ہیں
ہے میری عبودیت الفاظ سے بالاتر ؛ اے اشکِ سرِ مژگاں آ اور دعا بن جا

ایک اچھوتا طرزِ بیان اور دیکھئے ؎

بے تکلف تجھے خدا کہنا ؛ میری سادہ دلی کا کیا کہنا
جانتا ہوں ضرورتیں اپنی مصلحت ہے تجھے خدا کہنا

ان حقائق سے قطع نظر اکبر کی شاعری جمالیاتی پس منظر سے حد درجہ رنگین ہے معاملات حسن و عشق کو مختلف انداز میں نادر و دلکش اسلوب سے غزل اور نظم دونوں صنف میں خوب بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو کسقدر حسین و جمیل کیفیات ہیں کہیں ایک بزم جمال آراستہ ہے کہیں عشق کی خودداریاں آشکار ہوتی جارہی ہیں۔ فریاد و جفا کی بے پناہ کشمکش نازک مرحلوں سے گزر رہی ہے شب ہائے فراق کی کارگذاریاں ہیں کہیں امید و بیم کے دوراہے پر عجب عالم حیرت برپا نظر آتا ہے کبھی آرزوؤں کی دلداری ہے تو کبھی حسن معصوم کی طرفداری، کہیں وصل کی تدبیریں ہیں اور کہیں جمال جہاں افروز کے افسانے اور فراق و وصال کے ترانے اپنے اپنے رنگ میں کیف بار ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ہر ہر شعر کی دل کھول کر تشریح کی جائے مگر خوف ہے کہ لطف نہ کھو جائے اس لئے ناظرین خود ہی پڑھیں اور اپنے اپنے ذوق کی رعایت سے اکتساب کیف کریں۔ ؎

شمع میں اک سوز تھا اک ساز پروانے میں تھا
حسن گویا عشق کے خاموش افسانے میں تھا

اے دردِ محبت مجھے گمراہ نہ کرنا ؛ دل اشک میں بہ جائے مگر آہ نہ کرنا
دور اندیشیاں محبت کی ؛ بے وفاؤں کو باوفا کہنا
جو ہی رہا تبسم، جو ہی رہا ترنم ؛ میں سنا چکا فسانہ شب غم کی کاوشوں کا
سرگزشت دل مرحوم کا عنواں دیکھا ؛ ایک معصوم سا آنسو سرِ داماں دیکھا
بتکدہ تھا اُدھر اِدھر کعبہ ؛ تھی جوانی کی رہگذر دلچسپ

ایک ہم ہیں دوستی پر بھی ہمیں دشمن خطاب
ایک تم ہو دشمنی پر بھی تمہارا نام دوست

دیکھا ہوس و حسن کو باہم جو بغلگیر ؛ ناکام محبت نے کہا ہائے محبت

سنگلاخ زمینوں میں بھی اکبر کی رنگیں نوائیاں کتنی عروج پر ہیں:۔

آنکھ کھل جائے گی امیدوں کی ؛ دیکھ اے چشم نیم خواب نہ چھیڑ

سہل ممتنع کی سحرکاری ملاحظہ ہو ؎

یوں نہ فتنے اٹھا خرامِ ناز ؛ میرا ایمان ہے قیامت ہے
ڈالدی بنیاد کعبہ جس جگہ ؛ یاد رکھے گا صنم خانہ مجھے
وہ اٹھیں دزدیدہ نظریں وہ اٹھیں ؛ جھومنے لگے کیف مستانہ مجھے
پرسشِ غم اگر تکلف تھی ؛ اس تکلف کو زیبا کرتے

اک تبسم ہے ان کے ہونٹوں پر
یا مری گمشدہ جوانی ہے

تڑپ کر کروٹیں پیہم دلِ ناکام لیتا ہے
لرز جاتا ہوں جب کوئی وفا کا نام لیتا ہے

حسرت بھی ہے اُمید بھی ہے آرزو بھی ہے
سب کچھ مرے نصیب میں ہے ایک تو نہیں

طوفانِ برق و باد کی ذرہ نوازیو!
میں خانماں خراب کے آشیاں کہوں

جدھر کروٹ بدلتا ہوں اُدھر دنیا بدلتی ہے
نہ پوچھو کونسی لذت ہے آخر دردِ پنہاں میں

ابھی تو ناخدا کے بعد میرے اک خدا بھی ہے
حوادث کیوں تڑپ کر رہ گئے آغوشِ طوفاں میں

تکمیلِ درز ہوتی ہے جب ہر دوا کے بعد
حسرت سے دیکھتا ہے مرا چارہ گر مجھے

بے کسی کا لطف بھی جاتا رہا ؛ شامِ غربت بھی سحر نے چھین لی

اکبر حیدری کی طبع خداداد بڑی حد تک غالب کے تتبع پر مائل تھی ؏
دامانِ غزل تنگ و گلِ حسن تو بسیار

چنانچہ انہوں نے غزل میں تو ایک لطیف انداز قائم کیا ہی تھا لیکن نظم کے میدان میں اس سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر نظر آتے ہیں بلکہ ابتدائی دور میں غزل گوئی کی طرف کسیقدر متوجہ تھے بھی مگر رفتہ رفتہ ان کا میلانِ طبع نظم کی طرف زیادہ بڑھتا گیا یہانتک کہ ۱۹۳۲ء سے آخری دم تک معدودے چند غزلیات کہی ہونگی ورنہ اس عرصہ میں ان کے کلام کا تمام تر سرمایۂ "نظم گوئی" پر مشتمل ہے۔ اکبر نظم میں قدیم روایات کی پابندی اور بحور و قوافی کی قید کے ساتھ ساتھ ایک حد تک طرز جدید کے موجد سمجھے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ردیف و قافیہ کی ایک آزاد پابندی اس انداز میں شروع کی جس سے ایک خوشگوار ترنم عام بحور میں پیدا ہونے لگا۔ یعنی مسدس اور مخمس کا عام رنگ لیکر انہیں میں ردیف و قافیہ میں اسطرح ترمیم کی کہ یہ انداز ان کا اپنا ہوگیا۔ یہ ایک دلکش اور مستحکم جدت تھی جو صرف اکبر کی نظموں ہی میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً ــ نظم "محبت اور پرستش" کا ایک بند ہے ؎

مجھے اب تم نے سمجھایا کہ میری بیخودی کیا تھی ؛ میں اب سمجھا حقیقت میں محبت کسکو کہتے ہیں
مجھے معلوم ہے میری پرستش میں کمی کیا تھی ؛ میں اب سمجھا کہ دو پرشوق دل کیونکر لپٹ رہتے ہیں
نظامِ زندگی بدلا مری دنیائے راحت میں
ذرا سا فرق تھا لیکن پرستش اور محبت میں

تخئیل و جذبات کے لحاظ سے مسلسل نظموں میں "تغزل" کا رنگ اور

لطف جس بے تکلفی سے پیدا کیا ہے اس کے لئے انکی نظمیں "مجھے تم سے محبت ہے"۔ "کیوں یاد آتے ہو"۔ "انگارہ"۔ "سحر موسیقی"۔ "پھول والی"۔ "نور و ظلمت"۔ "جرائت پروانہ"۔ "مصور کی موت"۔ "خواب ناز"۔ "کیوپڈ" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

"تصورات" کے چند بند ملاحظہ ہوں۔ الفاظ کا در و لبست، جذبات کی دلکشی اور اندازِ بیان میں موسیقیت کا کمال معراج پر نظر آتا ہے ؎

جب آدھی رات کو بزمِ جہاں خاموش ہوتی ہے
حیاتِ عالمِ ایجاد جب بیہوش ہوتی ہے
دلِ مہجور جب کہتا ہے افسانہ محبت کا
فلک پر بزمِ انجم جب سراپا گوش ہوتی ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

پپیہا "پی کہاں ہے" "پی کہاں ہے" کہکے رو تا ہے
کوئی سا فرادا بھونرا کلی کے دل میں سوتا ہے
تصور میں نظر آتی ہے اک دنیا محبت کی
گل و بلبل میں جب راز و نیازِ عشق ہوتا ہے
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

بساطِ آب و گل پر ہوتے ہیں جب رنگ و بو پیدا
کیا کرتے ہیں جب گلہائے تر جوشِ نمو پیدا
مری نظریں جب انسے اکتسابِ کیف کرتی ہیں
مرے دل میں ہوا کرتی ہے جب اک آرزو پیدا
خدا جانے مجھے اسوقت تم کیوں یاد آتے ہو

تخیل کے لحاظ سے اکبر کو قدامت کے پردہ میں ترقی پسند، شاعر کہنا بجا نہیں۔ انکی شاعری میں بھوک، ہڑتال، کسان، طوائف، مزدور، گھنگتے اور گندے زرد دیوار، بھیانک راتوں کی تاریکیاں نہیں ملتیں۔ مگر وہ سب کچھ پایا جاتا ہے جو شعر و ادب کی ترقی اور معراج کے لئے ضروری ہے۔ انکی نظموں میں جگہ جگہ وہ نظریاتی پہلو موجود ہیں، اور تخیل میں وہ لاشعوری کیفیات ہیں جس سے صاف طور پر پرانی لکیر سے جائز طور پر ہٹتے اور وجدانی تصورات کے سہارے پورے شعور کے ساتھ منزلِ ترقی کی ایک نئی راہ گزر کی طرف خطوط و نقوش بناتے چلے جاتے ہیں۔ اور صحیح معنوں میں ادبیات کا ترقی پسند انداز یہی سمجھا جا سکتا ہے۔ جذبات حسن و عشق کے اظہار میں تنوع۔ اشعار میں صوتیاتی ترنم، معنوی و تخیلی رنگین نوائیاں اور کیف و اثر کی ترقیاں دیکھتا ہوں تو اکبر کی نظموں میں خصوصاً "تخلیق حسن و عشق"۔ "جمال آتشیں"۔ "شہید آرائش"۔ "نوروز"۔ "رندانِ بادہ خوار"۔ "زاہد دیندار"۔ "دنیا اور شاعری"۔ "بچہ اور ہلال"۔ "نوجوان شاعر سے"۔ "رہبرانِ خود غرض سے"۔ "شاعر کا پیغام"۔ "عنوان"۔ "نور و ظلمت"۔ "سکونِ دل اور تجربہ" وغیرہ قابلِ مطالعہ ہیں۔

"سکونِ دل"

یہ انساں کم نظر انساں زر و سیم و جواہر پر
نہیں معلوم آخر کیا سمجھ کر جان دیتا ہے
یہ دُرِ بے بہا یہ بیش قیمت آتشیں گوہر
یہ وہ چیزیں ہیں جن پر آدمی ایمان دیتا ہے
مگر اے کاش اس ظالم کو یہ معلوم ہو جاتا
سکونِ دل کبھی ایسے میسر ہی نہیں آتا

"تجربہ"

محبت۔ دوستی۔ اخلاص۔ ہمدردی۔ وفاداری
یہ دولت لے کے آیا تھا میں انسانوں کی بستی میں
سمجھتا تھا کہ یہ چیزیں ہیں دنیا کو بہت پیاری
بہت کچھ ان کی قدر و منزلت ہے بزمِ ہستی میں
یہاں حق دوستی کے سینکڑوں ارمان رہتے ہیں
یہ انسانوں کی دنیا ہے یہاں انسان رہتے ہیں

مگر افسوس میرا تجربہ کچھ اور ہی نکلا ؛ غلط فہمی پہ اپنی کسقدر اب میں پشیماں ہوں
میں کیا سمجھا تھا اس دنیا کو کیا نکلی ہر یہ دنیا ؛ میں اس دنیا کے جلوے دیکھتا ہوں اور حیراں ہوں
نکوکاری کے پردوں میں گنہگاری کے جلوے ہیں
مقدس بارگاہوں میں ریاکاری کے جلوے ہیں

اکبر نے اصلاحی اور قومی نظمیں بھی لکھیں۔ جنکا پایہ ہمہ گیر اثرات کے لحاظ سے کافی بلند ہے۔ اصلاحی نظموں میں وہ نام نہاد مصلحین کے خلاف بغاوت کی ترغیب دیتے سنے جاتے ہیں اور قوم کی پستی، بداخلاقی، اور بے راہ روی پر آنسو بہاتے اور نعرۂ انقلاب بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ مذہبی اور اصلاحی نظموں میں "مسلم اور ہلال" کے چند بند سنئے :-

مسلم

اے ہلالِ عید۔ اے عنوانِ روداد نشاط
اے ہلالِ عید اے پیغامِ لطف و انبساط
میرے غم خانے میں درد انگیز اک آواز ہے
احتیاط اے شادمانی کے پیمبر احتیاط

یاد آتا ہے مجھے عہدِ گذشتہ کا عروج ؛ خوں رُلاتا ہے مجھے اسلام خستہ کا عروج
پرچمِ توحید پر وہ تیرے تصویرِ حسین ؛ جس سے وابستہ کبھی تھا بختِ رفتہ کا عروج
ہاں تجھے بھی یاد ہو وہ سرگذشتِ اولیں ؛ ہم صفیر و ہمنوا تیرا کبھی تھا میں حزیں
بدنصیبی ہے مری وہ ہو گئے خوابِ خیال ؛ جو فسانے سن چکی ہیں مجھ سے افلاک و زمیں
آج جب بدلا ہوا ہے بزمِ دنیا کا نظام ؛ آج کیوں آیا ہے تو لیکر مسرت کا پیام

آج کسکے دل سے دیکھوں تجھکو کسکی آنکھ سے ÷ کیا کروں آخر پذیرائی کا تیرے کیا اہتمام

ہاں مگر آ! ہمدمِ دیرینہ و دمساز آ!
جیسے آئیں ہیں ابھی تک مائلِ پرواز آ!

ہلال!

"ہوش میں آ ہوش میں او مسلمِ بے خانماں
کیوں مسلماں آپ کو کہتا ہے ننگِ دو جہاں
صاحبِ توحید ہوتا تو زمانے میں اگر
یوں نہ دنیا سے کبھی مٹتا ترا نام و نشاں

اپنی غفلت کا مجھے الزام کیوں دیتا ہی تو ÷ اپنی بربادی کے حیلے ڈھونڈتا ہی حیلہ جو
میں تو آمادہ ہوں تیری ہمسفری کیلئے ÷ تجھ میں باقی ہی اگر اب بھی کوئی شانِ نمو
دیکھ آنکھیں کھول کر اسلاف کا طرزِ عمل ÷ ہے اگر ہمت تو آ اس جادۂ مشکل پہ چل
چھوڑ دے باطل پرستی توڑدے ایوانِ کفر ÷ بتکدے میں پھر بنا کعبہ ذرا کروٹ بدل
از سرِ نو ملتِ برباد کی تنظیم کر ÷ مائلِ تبلیغ ہو قرآن کی تعظیم کر
اہلِ دنیا کو سنا حکمِ خدا حکمِ رسول ÷ نعرۂ تکبیر کی عظمت کو پھر تسلیم کر

پھر وہی نغمہ ہو تیرا پھر وہی سازِ حیات
پھر وہی میں ہوں وہی تو ہو وہی رازِ حیات

"آزادی کے نام"

مستقل سرمایہ داری اور بزمِ بے ثبات
اس سے بڑھکر ہوگی اب کیا اور توہینِ حیات
بزمِ ہستی میں نہ تھا جب زر پرستی کا جنوں
زندگی آزاد تھی آزاد تھی کل کائنات

"شہیدِ وطن" کے چند بند

اک گلِ افسردہ فرشِ خاک پر تھا محوِ خواب
جب مری نظریں پڑیں اک منظرِ غمناک پر
کانپ اٹھا میرے پہلو میں دلِ پُر اضطراب
اُف گلِ سرسبز اور صحنِ چمن کی خاک پر

خاک کے ذرّوں میں خوابیدہ تھی اک برقِ جمال
آہ یہ انجام رعنائی یہ ہستی کا مآل!

یہی پھول شاعر کے استفسار پر اپنی سرگزشت اسطرح سناتا ہے ؎

میں امانت دارِ حق تھا حق پرستی کیلئے ÷ منتظر تھی بزمِ گلشن مجھ سے ہر ایثار کی
میں نے دنیا کو دکھائے رنگ و بو کے معجزے ÷ میں نے اپنے خون سے نشو و نمائے خار کی

میری نکہت سے معطر ہوگئی بزمِ نسیم
میں نے صحنِ باغ میں ہر سمت پھیلا دی شمیم

اور پھر یہی "شہیدِ وطن" پھول انسانیت کو حب الوطنی اور بیداری کا پیغام سناتا ہے ؎

میری ہستی وقف تھی صحنِ چمن کے واسطے ÷ میں فنا ہو کر سماؤں گا چمن کی خاک میں
جان دی میں نے مگر اپنے وطن کیواسطے ÷ زندگی پیدا کروں گا میں وطن کی خاک میں

آب و گل میں جذب ہو کر گل کھلاؤں گا ابھی
ذرّے ذرّے میں مرے پنہاں ہے روحِ زندگی

یہ امر غالباً واقفینِ ادب سے پوشیدہ نہیں کہ اکبر حیدری محض شاعر نہ تھے بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی تھے۔ نثر میں بھی ان کا اندازِ مخصوص شعرگوئی کی طرح مرغوب و دلپسند تھا۔ نظم و نثر دونوں میں مزاحیہ رنگ بھی انکے صنفِ ادب کا ایک جزوِ خاص تھا۔ غماز کے پردے میں انھوں نے متعدد مزاحیہ اور اصلاحی انقلابی نظمیں مضامین اور افسانے لکھے ملک کے بلند پایہ اخبارات و رسائل انکے اس مخصوص رنگ کے شاہد ہیں۔ دہلی کے اخبار "قوم" رسالہ "نیرنگ" اور دیگر بے شمار جرائد میں حضرت غماز کے "ملفوظات" "بھاری بھرکم کی ڈائری" "شرارستان" وغیرہ مستقل عنوانات اربابِ ذوق کو اب تک یاد ہیں۔ غمازی انداز ملاحظہ ہو ؎

اربابِ عقل و ہوش کہاں اہلِ فن کہاں ÷ بزمِ سخن ہے آج وہ بزمِ سخن کہاں
تبدیل ہوچکی ہے بیاضِ معاشرت! ÷ ندرت دکھائے شاعرِ شیریں سخن کہاں
اتوا اڑائے پھرتی ہیں ایرو بلین کو ÷ اب فرشِ مخملی پہ کوئی گلبدن کہاں
کاکل تراش کرتے ہیں اب مو سکائیاں ÷ اب وہ عروجِ زلفِ شکن در شکن کہاں
اب میکدے کے نام پہ لائسنس لگ گیا ÷ اب وہ شراب ریز بہارِ چمن کہاں
اب آگرے میں اور ہے لاہور میں مقام ÷ اب عاشقوں کے حصے میں دیوانہ پن کہاں
آتا ہے دو دھ ٹین میں بندھ کے ریل پر ÷ اس بیسویں صدی میں کوئی کوہکن کہاں
جنگل تمام چلتے ہیں ٹھیکے پہ آجکل ÷ جولانیاں دکھلائے کوئی خستہ تن کہاں

موٹر بھی ریل بھی ہے ہوائی جہاز بھی!
اب بے وطن کے دل میں ہے یادِ وطن کہاں

اکبر کی مستقل تصانیف جو شائع ہوچکیں ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں "روحِ جذبات (کلام کا انتخاب)" "عبرت کدہ" "رقاصہ" (ناول) "سیرِ خرابات" (ناول) "عیاش کی ڈائری" "ارتقاء تمدن اور مجنوں کی ڈائری"۔ ان کے علاوہ انگریزوں کے لئے اردو ہندی کی درسی کتابیں لکھیں جن میں "منشی" سب سے زیادہ مخصوص اور مقبول ہے جو مختلف فوجی درسگاہوں میں انگریز افسروں کے لئے کورس میں شامل ہے اور اس کے آٹھ نو اڈیشن اب تک شائع ہوچکے ہیں۔

محترمی پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے خوب فرمایا ہے ؎

اکبرِ حیدری وہ اہلِ قلم ÷ جسکے شعروں سے سب ہوئے مسرور
آہ وہ یارِ باصفا و خلوص ÷ آہ وہ شاعرِ فصیح و غیور
چھوڑ کر چل دیا ہمیں بے وقت ÷ کیوں احبا کا دل نہ ہو رنجور

بے سر و پا نشاطِ بزم ہے آج
کہہ کے کیفی کہ اکبرِ مغفور (۱۳۶۵ھ)

نادر شاہ کا آخری غیور سپاہی

ڈرامہ (۱)

اشہر لکھنوی

یہ ڈراما جدید فارسی زبان میں آقائے سعید نفیسی تبریزی نے لکھا ہے جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاوہ دوسری موثر تدابیر کے ایرانیوں میں جوش وطن پرستی پیدا کیا جائے اور اُن کے اسلاف کی شاندار روایات کو یاد دلا کے شجاعت قومی کی دبی ہوئی چنگاریوں کو دوبارہ مشتعل کیا جائے۔

اس کی تشکیل کے سلسلے میں مصنف نے آخری جنگ روس و ایران کا حوالہ دیا ہے جو میدان قفقاز میں ہوئی تھی۔ پلاٹ نہایت سادہ ہے جس میں ایرانیوں کے تمدن و معاشرت کے تمام خصوصیات موجود ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس غم انجام واردات کو نہایت خوش اسلوبی سے حوالۂ قلم کیا گیا ہے ؛؛

اشہر

اشخاص

(۱) اللہ یار بیگ۔ نادر شاہ کی فوج کا ایک عمر رسیدہ افسر (اکیس بیس سال عمر)
(۲) اردشیر بیگ۔ اوس کا فرزند (پچاس سال کا)
(۳) فلک ناز۔ اردشیر کی لڑکی (بیس سال کی)
(۴) میرزا مسیح طبیب (قراچہ داغی) (ساٹھ سال کا)

شہر تبریز میں ایک مکان ہے جس کے ایک وسیع کمرے کے دو دروازے مشرق و مغرب کی طرف اور تیسرا شمال کی سمت۔ مشرقی دروازے کے سامنے ایک توشک بچھی ہے جس پر صاف چادر ہے اور ایک بڑا گاؤ تکیہ لگا ہے۔ کمرے کے مغربی جانب دو اور موٹی قالینیں ہیں۔ اس کے علاوہ تمام کمرے کا فرش بھی قالین ہی کا ہے۔ اور شمال کی جانب پہلو میں ایک بڑا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا ہے۔

پردہ اوّل

(اللہ یار بیگ اور فلک ناز بیٹھے ہیں - بعد کو اردشیر بیگ بھی آجاتا ہے)

کمرے کے سیدھے رُخ توشک پر اللہ یار بیگ سست سا بیٹھا ہوا ہے اور فلک ناز اس کے بائیں جانب خاموش بیٹھی ہے۔

اللہ یار بیگ:۔ فلک ناز! بیٹی تیرا باپ کہاں ہے؟ آدھ گھنٹے سے میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ ابھی تک نہیں آیا۔ کھانے کے وقت بھی موجود نہ تھا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں اسوقت نہ آئے کہ پھر کچھ نہ ہو سکے۔

فلک ناز:۔ دادا جان۔ مایوس نہ ہوجیے۔ بابا کہیں ہوں مگر یہی وقت اُن کے آنے کا ہے۔ آپ خود جانتے ہیں کہ روزانہ تقریباً بارہ بجے گھر آتے ہیں۔ آج نہار کے وقت بھی نہیں آئے۔ بہت ممکن ہے کہ گرفتار ہو گئے ہوں۔ مگر دادا جان از برائے خدا یہ تو بتلائیے کہ آپکا مزاج کیسا ہے۔ آج صبح سے ابتک میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ کچھ بجھے سے بیٹھے ہیں! آپ تو برابر باتیں کیا کرتے تھے۔ اپنے دور و دراز سفروں کے دلچسپ قصے۔ نادری لڑائیوں کا حال برابر بیان کیا کرتے تھے جن کی وجہ سے مجھے تنہائی بالکل نہیں کھلتی تھی۔ آج کیا ہے کہ آپ سخت متفکر معلوم ہوتے ہیں۔ خدا کے لئے بتلائیے تو کیا معاملہ ہے؟ مجھے بھی تو معلوم ہو۔ اب مجھ میں اتنی طاقت و صبر نہیں کہ آپ کو زیادہ رنجیدہ دیکھ سکوں۔

اللہ یار بیگ:۔ جان پدر۔ بس تم دونو (باپ بیٹی) میری دکھ بھری زندگی کا سکھ ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ نہ تو میرے پاس کوئی اندوختہ ہے جسے دیکھ کر خوش ہوں۔ نہ میرا کوئی جاہ و وقار باقی ہے کہ اس میں مست رہوں۔ بیٹی چالیس سال سے (کچھ وقفے کے بعد) ہاں چالیس سال سے میں نے تبریز میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ابتداءً تو میرے لئے کافی دلچسپی کا سامان تھا۔ یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ ممکن ہے زمانہ پھر مجھے موقع دے کہ میں کسی قومی جنگ میں دوبارہ ان بازوؤں سے کام لوں۔ ان پنجوں کو (جو اس قدر کمزور ہو گئے ہیں) دشمنوں کے خون سے رنگین کر لوں! ۔۔۔۔

اس کے علاوہ۔ بیٹی! ۔۔۔ تمہاری دادی اور ماں زندہ تھیں۔

ایسے لوگوں کے لئے جنھوں نے اپنی طاقتور جوانی نادر شاہ ایسے جبّار بادشاہ کے ساتھ لڑائیوں میں گذاری ہو ضروری ہے کہ بڑھاپے کے دم چند روز گوشۂ عافیت میں بسر کریں۔ اپنے گرد تم ایسی معصوم ہستیوں کو دیکھیں اور انکی تفریح کیلئے دلچسپ باتیں کریں۔

پانچ برس ہوئے کہ موت کے بے رحم ہاتھ نے میری اس مسرت کے دائرے کو تنگ کر دیا۔ اور تمہاری بوڑھی دادی اور جوان ماں کو ہم سب سے جدا کر دیا۔ اب میری خوشی اور دل کا چین۔ بیٹی! تم سے اور تمہارے باپ کی ذات سے والبتہ ہے۔ تم دونو میری دھندلی آنکھوں کی روشنی اور مرجھائے ہوئے دل کی ٹھنڈک ہو اگر تم کبھی مجھے رنجیدہ پاؤ تو یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ اس کا باعث تم یا تمہارا باپ ہے۔ بھلا دنیا میں کون ایسا ہے جو اپنے مطیع اور فرمانبردار بچوں سے ناراض ہو۔

نہیں۔ بیٹی! نہیں۔ تم دونو میری آخری امید ہو۔ شاید آج یا کل میں اپنی آخری سانس تیری گود میں۔ نہیں ... تنہائی میں .... تیرے سینے پر سر رکھ کر ختم کر دوں! اور اس جاتی ہوئی دنیا کا آخری نقش جو میری بند ہوتی ہوئی آنکھوں میں رہ جائے وہ تیرا نورانی اور محبوب چہرہ ہو۔

لیکن نہیں ... نہیں ... میں اتنے جلد مرنا نہیں چاہتا۔ اگر دو تین روز قبل موت آتی تو شاید نہایت خوشی سے منظور کر لیتا۔ مگر اسوقت محسوس ہو رہا ہے کہ ممکن ہے چند روز اور زندہ رہوں کہ اس جنگ کو بھی دیکھ لوں اور اس آخری فتح کی مسرت کو بھی اپنے ساتھ قبر میں لے جاؤں۔

فلک ناز:۔ دادا جان کیسی دہشت انگیز باتیں آپ کر رہے ہیں! لڑائی؟ کیا پھر لڑائی ہو رہی ہے! ہم ایرانیوں میں اب اس بدقسمتی کے برداشت کرنے کی طاقت بالکل نہیں رہی۔ دادا جان! جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ اسوقت تک اطمینان سے پانی کا گھونٹ حلق سے نہیں اترا۔ برابر زحمت و پریشانی سے سابقہ رہا۔ آج گرجیون سے لڑائی ہے تو کل کردوں سے۔ پرسوں اور کسی سے۔ روزانہ ایک تازہ مصیبت نازل ہوتی ہے۔ آج پھر آپ جنگ کی خبر بد سنا رہے ہیں .... خدا کا واسطہ۔ دادا جان۔ جلد بتائیے کہ کیا خبر ہے۔ میرا تو کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔

اللہ یار بیگ:۔ نا بیٹی۔ پریشان نہو۔ کوئی ہماری طرف رخ نہیں کر سکتا۔ ایرانی فوج طاقت دار اور تجربہ کار ہے۔ ہم اپنے دشمنوں کے باپ کو پچھاڑ دیں گے اور انھیں پیوند زمین کر دیں گے!

ابھی ایرانی نادر شاہ کو نہیں بھولے ہیں .... جنگ خراسان و بغداد .... و گرجستان انھیں یاد ہے (جوش میں) اور خود میں کسی سے کم ہوں .... جب تک یہ ہاتھ میرے جسم میں ہیں۔ مجھ سے برداشت نہ ہوگا کہ دشمنوں کے منحوس پاؤں سے ایران کی مقدس زمین ناپاک ہو....... فلک ناز! ... بیٹی اطمینان رکھو! یقین رکھ! (اس درمیان میں اردشیر بیگ کے پاؤں کی آہٹ بائیں جانب سے آتی ہے۔)

ہا! تیرا باپ آگیا! بیٹی ذرا خاموش رہ۔ میں اردشیر سے کچھ باتیں کر لوں۔

اردشیر بیگ:۔ پدر جان سلام علیکم۔ اب تک آپ میرے منتظر ہونگے۔ اگر مجھے کچھ دیر ہوگئی ہو تو معاف فرمائیے۔ میں صبح کو مسجد گیا تھا۔ وہاں سب احباب جمع تھے۔ سلطنت روس نے دو ہفتہ قبل سلطنت ایران سے اعلان جنگ کیا ہے اسی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ چونکہ یہ ایک اہم معاملہ تھا اس وجہ سے دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ میں نے بارہا صحبت سے اٹھنے کا ارادہ کیا مگر دل نے نہ مانا۔

اللہ یار بیگ:۔ جان پدر! یہ انتظار معمولی نہیں تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ذرا جلدی چلے آتے کہ اس معاملے میں میرے تمہارے درمیان کچھ گفتگو ہو جاتی۔ اب یہی وقت ہے۔ اس کے متعلق ہم مفصل گفتگو کر سکتے ہیں ...... ہاں تو مسجد میں کیا گفتگو ہو رہی تھی۔ اور تازہ خبر کے متعلق لوگ کیا کہہ رہے تھے؟

اردشیر بیگ:۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ دو ہفتے ہوگئے کہ سلطنت روس کا اعلان جنگ پایہ تخت طہران میں پہونچ گیا ہے۔ شاہ نے بڑی کوشش کی کہ روس اعلان جنگ واپس لے مگر کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ روسی جنگ کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ شاہ کج کلاہ بھی مجبور ہے کہ تمام قبائل کو جنگ کے لئے تیار کرے۔ لہٰذا تمام اطراف ایران سے شاہی فوج کو طلب کیا گیا ہے تاکہ قفقاز کی طرف کوچ کرے۔ .... کل شہر میں علماء کی طرف سے اعلان جہاد بھی ہو گیا ہے۔ اور ایک جم غفیر جنگ میں حصہ لینے کے لئے آمادہ ہے۔ وزیر جنگ بھی کل اپنی فوج کے ساتھ کوچ کر دیں گے۔

روسی فوج کے متعلق سنا گیا ہے کہ ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور ماسکو سے چل پڑی ہے۔ مزید براں ان میں کی کچھ تعداد گرجستان پہونچ بھی چکی ہے۔ آج وزیر جنگ نے تمام قبائل آذربائجان کو طلب کرکے حکم دیدیا ہے کہ اپنے اپنے سوار رسالوں کو ساحل ارس پر جمع کر دیں ..... تبریز میں یہ عالم ہے کہ جو شخص ہاتھ میں تلوار پکڑ سکتا ہے لڑائی پر جانے کے لئے تیار ہے اور شاہراہوں پر تو ایک عجیب ہمہمہ ہے۔ جوانان جنگ جو اپنے دوستوں سے

رخصت ہو رہے ہیں۔ کاٹھیاں۔ زین۔ اور جنگی سامان بنانے والوں کی دکانوں پر بڑی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بڑے بڑے عمائدین نے اپنے خاص گھوڑے شاہی رسالوں کو پیش کر دئے ہیں۔ نیز چوپایہ فروشوں کے پاس جتنے گھوڑے۔ خچر۔ اونٹ وغیرہ تھے سب تحفۂ جنگ کی نذر کر دئے۔ میرے احباب میں سے اسوقت تک تقریباً انتیس جوان فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں بابا جان! جن میں سے آٹھ آدمیوں کو تو آپ بھی جانتے ہیں۔ محمود بیگ۔ ارسلان بیگ وغیرہم۔ اور کل یہ سب وزیر جنگ کے ساتھ کوچ کر دیں گے۔ احباب مجھ سے بھی شرکت جنگ کے لئے مصر ہیں۔۔۔۔ مگر میں.....

اللہ یار بیگ:۔ جان پدر! کیا تمہارا جانے کا ارادہ نہیں؟

اردشیر بیگ:۔ نہیں تو۔

اللہ یار بیگ:۔ بیٹا! کیوں نہیں جاتے۔ کونسی شے مانع ہے؟

اردشیر بیگ:۔ بابا جان! آخر میری ذمہ داریوں کو تو ملاحظہ کیجئے۔

اللہ یار بیگ:۔ ان سب سے بڑھ کر تم پر ایک اور ذمہ داری ہے۔

اردشیر بیگ:۔ میں آپ کو اور فلک ناز کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔

اللہ یار بیگ:۔ اردشیر! شرم کر۔۔۔۔۔ شرم۔ تو میرے لئے اور اپنی لڑکی کی محبت میں اس ایران کو نظر انداز کر رہا ہے جس کے لئے میرا اور تیرا دونوں کا خون بہ جائے تو اچھا۔ کیا اسی کے لئے مادر وطن نے ہمیں پرورش کیا تھا۔

اردشیر بیگ:۔ بابا جان! ۔ آپ کمزور بھی ہیں اور بیمار بھی۔ آپ کے لئے ایک تیمار دار کی ضرورت ہے۔ فلک ناز کمسن ہے۔ اس کے سر پر اور کوئی بزرگ نہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کے دشمن نہ رہے تو..... میری پیاری۔ با عصمت فلک ناز! اس دیار غربت میں تنہا کیا کرے گی۔ جہاں جنگی دور دورہ ہوگا۔ تباہی ہوگی۔ قحط ہوگا! ۔

اللہ یار بیگ:۔ اردشیر۔ کیا تو بھول گیا کہ تو اللہ یار بیگ کا فرزند ہے۔ کیا تو بھول گیا کہ تو اس کا فرزند ہے جس نے نادر شاہ..... ہاں..... نادر شاہ۔ کے ہمراہ رکاب خونی لڑائیاں لڑی ہیں!!...... شیر مادر تجھ پر حرام ہ! اردشیر! سن! میں پندرہ سال چین سے نہیں بیٹھا۔ کرمان و خراسان۔ اصفہان و شیراز۔ خوارزم و بغداد۔ گرجستان و ہندوستان۔ ہر میدان جنگ میں موجود تھا۔۔۔ نہ برف و بارش کی پروا کی۔ نہ خستگی و مرض کی۔ نہ زخم و تکلیف کی۔ نہ شکست و فرار کی۔ غرض یہ ہے کہ کسی بلا سے کبھی نہیں ڈرا۔۔

..... اردشیر! ذرا اس بڈھے کا دل گردہ دیکھ!

اس مدت میں کسی رات آرام کی نیند نصیب نہیں ہوئی۔ اطمینان کا ایک گھونٹ پانی حلق کے نیچے نہیں اترا۔ نہ تو کسی عورت کی صورت دیکھنے کو ملی کہ اس کے نازک ہاتھوں سے ایک جام شربت پیتا۔ نہ جاڑے میں گرم بستر ملا جس پر پاؤں پھیلا کے آرام کی نیند سوتا........ ہم شیر درندہ کی طرح اس صحرا سے اس صحرا۔۔۔ اور اس شہر سے اس شہر۔ دشمن کا تعاقب کرتے رہے!

.... ہم نے بلخ سے لیکے بغداد تک۔ سلیمانیہ سے لے کے محمود آباد تک بادشاہوں اور امیروں کے عالیشان محلوں کی دیواروں پر (نوک خنجر سے) جلی حرفوں میں اپنا نام کندہ کر دیا!

وائے ہو تجھ پر۔ اے انقلاب زمانہ! اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ایسے بہادروں کے لڑکے۔ محبت پدر و دختر کا بہانہ ڈھونڈ کے چاہتے ہیں کہ ایسے نازک موقع پر مادر وطن کی خدمت سے منہ موڑ لیں جبکہ وہ ان کی مدد کی محتاج ہے۔ عورتوں کی طرح اوڑھنی اوڑھ کے گھر میں بیٹھ رہیں، اور دور سے تماشا دیکھیں کہ حمایت وطن میں برادران وطن کا خون زمین پر بہ رہا ہے۔

اردشیر! اگر تو جنگ میں کام آئے گا تو مجھے بھی ختم سمجھ۔ تیری دختر عزیز۔ فلک ناز کا۔ فلاں روسی افسر کی کنیز ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم اس گھر میں جان چرائے بیٹھے رہیں! ۔ اور کل یا پرسوں ان سفید چہرے والے روسیوں کے سامنے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ جھک کے سلام کریں۔ اردشیر! شرم کر! شرم کر! بس خاموش رہ!

آج نادر شاہ نہ ہوا جو تیرا سر تن سے اڑا دیتا! لیکن اگر وہ نہیں ہے... تو میں جو اس کے دروازے کے کتے کی حیثیت بھی نہیں رکھتا۔ خدا کا شکر ہے کہ زندہ ہوں۔ میرے بازوؤں میں ابھی اتنی سکت ہے کہ تیرا نجس خون اس پاک سرزمین پر بہا دوں!!!

فلک ناز:۔ (بیتاب ہو کے۔ اور اللہ یار بیگ کے قدموں پر سر رکھ کے) دادا جان! آپ تو کبھی ایسے سخت دل نہیں تھے۔ ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ ہم لوگوں سے پیش آتے تھے۔ اور محبت آمیز باتیں کیا کرتے تھے۔ آج آپ کو کیا ہو گیا۔ کہ یک لخت آپ نے اس اچھے برتاؤ کو بھلا دیا؟ دادا جان! اپنی ضعیفی پر

اور میری معصوم بیکسی پر ترس کھائے - خیر - میری طرف نہ دیکھئے تو نہ سہی . . . - مگر اپنے بڑھاپے پر - للہ اپنے بڑھاپے پر رحم کیجئے!

اللہ یار بیگ: - بیٹی! تو چپ رہ - یہ معاملہ ایسا معمولی نہیں جس میں عورتیں دخل دیں - تو ابھی بچہ ہے - تجھے ماں بننے کا موقع نہیں ملا ہے - تو کیا سمجھ سکتی ہے کہ مادر وطن کے لئے فرزندان وطن کی کیا روش ہونی چاہئے؟ جان پدر! میں وہی مہربان اور نازک دل مرد ضعیف ہوں - جیسا پہلے تھا - لیکن اسوقت ایران کی نازک حالت دیکھ کے میرا دل سخت اور مزاج تند ہو گیا ہے - بہی تو اپنے امور متعلقہ کو سہولت اور دلجمعی سے انجام دے اور مجھے اپنے ذاتی خرخشوں میں چھوڑ دے تاکہ میں تیرے بے سمجھ باپ کو ان برے خیالات سے باز رکھوں . . . . . .

تو جانتی ہے کہ ہمارے خاندان کی شرافت صرف اسی وجہ سے ہے کہ میں نے اپنے زمانۂ شباب کے پندرہ برس نہایت سخت مصیبتوں اور ناگوار زحمتوں میں گذارے ہیں - ایک ایسے صاحب جلال بادشاہ کے ہمراہ رکاب جنگ کی ہے جس کے خوف سے رود جیحوں سے لے کے دریائے جمنا تک لوگوں کو رات کو نیند نہیں آتی تھی . . . . بیٹی! تجھے کیا معلوم کہ میں نے یہ تمام فخر و شرف اپنے قوت بازو سے اور دشمنوں کے خون سے پیدا کیا ہے!

آج زمانے نے پھر ایک موقع دیا ہے کہ مجھ ایسے سپاہی کا اکلوتا لڑکا جو دنیا میں میرا قائم مقام ہوگا - میرے فخر و شرف کی تکمیل کرے . . . . . . میں یہ نہیں چاہتا کہ یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے . . . . بس اب مجھے اپنے باپ سے دو ٹوک بات کر لینے دے!

(اردشیر کی طرف متوجہ ہو کر) اردشیر! یاد رکھ - تیرے ضعیف باپ نے جو شاید دو ایک روز کا اس دنیا میں اور مہمان ہے - ایک سو بیس برس میں صرف دو چیزیں اپنے لئے مہیا کی ہیں اور وہ بھی صرف آج کے دن کے لئے!

اے بے رحم فرزند! تو یہ چاہتا ہے کہ سب میرا کیا کرایا خاک میں مل جائے - پہلی چیز میری شرافت ذاتی ہے جو پندرہ سال تلواروں کے سائے میں . . . موت کے منہ میں رہ کے حاصل کی ہے - اور وہ بھی - نادر شاہ افشار . . . . ہاں . . . نادر شاہ افشار کے فتحمند پرچم کے نیچے! اردشیر! فقط تو نے نادر شاہ کا نام ہی سنا ہے - تیرے تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ یہ شجاع مرد - اور مرد میدان فرد کیا تھا - اور کون تھا . . . . . میرے عزیز فرزند! نادر نام کا بادشاہ نہیں تھا - وہ ایسا صاحب جبروت تھا کہ اب ایران میں اس کا ثانی پیدا ہونا دشوار ہے . . . . نادر شاہ وہ تھا کہ صرف جس کے خیال سے مجھ ایسے ایک سو بیس سال کے بڈھے میں جوش جوانی کی لہر دوڑ جاتی ہے - اس جلیل القدر انسان کی بدولت میں نے یہ ذاتی شرف حاصل کیا ہے! اردشیر - جان پدر! تیری ذات مجھے سو درجہ عزیز ہو سکتی ہے لیکن میں تجھے اس شرف و عزت پر نثار کرنے کو تیار ہوں!

دوسری چیز - اردشیر! تیری عزیز ذات میرا اندوختہ - تو ہی میرا میوۂ زندگی ہے - تیری ہی ذات ہے جسے میں نے زمانۂ شباب سے اسوقت تک ذخیرہ کیا ہے - اردشیر! آج جبکہ میں اس شرافت دیرینہ کی حفاظت کرنے سے مجبور ہوں مجھے امید ہے کہ تیرے قوی بازو اس کی حفاظت کریں گے -

اے بے رحم سخت دل - اردشیر! کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میرا تمام ثمرۂ زندگانی تباہ و برباد ہو جائے؟ نہیں - نہیں . . . .

میں نہیں مان سکتا! یا تو میرے یہ ہاتھ تیرے خون سے رنگین ہونگے جنھوں نے تجھے پرورش کیا ہے - یا تو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل ہوگا!!! اور کوئی تیسری صورت نظر نہیں آتی - اردشیر! تیری زندگی جسکو تو اسقدر عزیز سمجھتا ہے - تیری نہیں - بلکہ میری ملکیت ہے میں نے تجھے بخشی ہے - مجھے حق ہے کہ میں خود اسے واپس لوں - یا میرے دشمن اسے ختم کر دیں - اب جیسی تیری مرضی! بول تجھے ان دونو صورتوں میں کونسی صورت پسند ہے؟

اردشیر: - پدر جان! میری دلی خواہش ہے کہ حیات کی دولت پانے کے بعد آپ ہی کے پاک ہاتھوں سے مجھے موت کی نعمت بھی نصیب ہو!

اللہ یار بیگ: - اردشیر! مجھے ایک بات اور کہنا ہے - شاید یہ آخری فقرے ہوں جنہیں تو اپنے بوڑھے باپ سے . . . . . . ہاں! شریف خیال باپ سے . . . سنے گا! - اردشیر! غور سے سن میرے لئے دنیا کی کوئی شے اس سے زیادہ باعث ننگ و عار نہیں کہ اس موقع پر جبکہ مملکت ایران خطرے میں ہے اور ہزاروں ہمارے برادران وطن جو ظاہری حیثیت سے مجھ سے اور تجھ سے بہت کم ہیں حفاظت ایران کے لئے کمر بستہ نظر آتے ہیں -

تبریزی جوان... نہیں... بلکہ تمام ایرانی رود جیحون سے لیکے دریائے فرات تک جاں نثاران وطن نظر آ رہے ہیں۔ہم دونوں پر ان کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں تاکہ دیکھیں کہ آتش نادری کے یہ آخری شعلے جنہوں نے پندرہ سال تک دنیا میں آگ لگا رکھی تھی۔وطن کے لئے کیا کارنمایاں کر کے دکھاتے ہیں؟ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ کل تبریز سے انیس نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ہیں جن میں سے ایک بھی فوج نادری کے سپاہیوں کی اولاد سے نہ تھا اب لوگوں کو کہنے کا موقع ہے کہ سب گئے لیکن اللہ یار بیگ۔نادر شاہ کی خاص پلٹن کے افسر کا لڑکا۔اردشیر بیگ نہ گیا۔اور گھر میں اپنے بڈھے باپ اور نوجوان لڑکی کے ساتھ گھسا بیٹھا رہا... یا اللہ... آج میرے لئے موت کا سامنا ہے! اردشیر! تیری اس کوتاہی خدمت وطن سے جب نادر شاہ قبر میں تڑپ اٹھا ہوگا... میں... کل روز قیامت کس منہ سے اس کے سامنے جاؤنگا!!!۔اچھا۔اچھا! تو اس طویل داستان کے بعد۔اردشیر تیرا کیا ارادہ ہے؟ میدان جنگ میں جانا ہے یا نہیں؟

اردشیر:۔ پدر جان! کیا عرض کروں!

اللہ یار بیگ:۔ کیا تو نہیں جائیگا! نہیں جائیگا! (اپنا ہاتھ غصے میں۔اردشیر کے گریبان کی طرف بڑھاتا ہے۔مگر کچھ سوچ کر رک جاتا ہے اور کہنے لگتا ہے) میں تیری طرح بے رحم نہیں ہوں... بےغیرت۔نہیں ہوں۔اردشیر! گھر میں عورتوں کی طرح چادر اوڑھ کے بیٹھ... تیری طرف سے میں خدمت وطن انجام دونگا۔اللہ یار ابھی زندہ ہے! اس کی رگوں میں خون جاری ہے!

(غصے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔اور دروازے کی جانب دو تین قدم تیزی سے بڑھاتا ہے۔لیکن چوتھی بار اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں اور زمین پر گر کر بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔جیسے فالج گر پڑا ہو۔کمرے میں خاموشی پھیل جاتی ہے۔اردشیر اور فلک ناز دونوں اس کے پاؤں پر سر رکھ دیتے ہیں۔)

فلک ناز:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کے) پدر جان! آپ کو کیا ہو گیا؟

اردشیر بیگ:۔ پدر جان! مجھ سے سخت غلطی ہوئی۔معاف کیجئے۔برائے خدا اتنا غصہ نہ کیجئے۔آپ کا جو حکم ہو میں اسے بجا لانے کیلئے تیار ہوں!

فلک ناز:۔ (اللہ یار بیگ کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کے) پدر جان! اپنی ضعیفی پر رحم کیجئے۔اس قدر جوش اچھا نہیں درد نے لگتی ہے،

...... (باقی دارد)

حیات محمد علی جناح

از رئیس احمد جعفری

قائد اعظم کے سوانح حیات کے ساتھ ساتھ اسلامی سیاست پر اتنی مکمل و مدلل کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔تنسیخ بنگال اور مسلم لیگ کی داغ بیل سے وزارتی وفد کے فیصلے تک ملک کے تمام اہم واقعات و حادثات درج ہیں۔پونے نو سو صفحات مع تصاویر

مجلد سات روپے آٹھ آنے

کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

سیرت کی کتابیں

خاتم النبین:۔ ولادت رضاعت ہجرت و معجزات کے مستند حالات عہ/
حسین ابن علی:۔ واقعہ کربلا کے نفسیاتی اور اخلاقی پہلو کی تاریخ مجلد ۳/۸
الصدیق:۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کے سوانح حیات عہ/
سیرۃ الفاروق:۔ حضرت عمر بن الخطاب کے حالات زندگی ۴/
ذی النورین:۔ حضرت عثمان غنی کی سوانح عمری ۱۰/
اسد اللہ:۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کے سوانح حیات ۴/
سیف اللہ:۔ خالد بن ولید کی جنگی خدمات کی تاریخ ۴/
تذکرۃ الاولیا:۔ تمام اولیا اللہ کے مفصل حالاتِ زندگی ۸/
سوانح عمری غوث الاعظم: شیخ عبد القادر صاحب جیلانی کی سیرت ۱۲/
قصص الانبیا:۔ حضرت آدم سے لیکر حضور اکرم تک انبیاء کے حالات ۸/
موازنہ صلیب و ہلال:۔ مسلمانوں کے تمدنی اور معاشرتی شعبوں کی مستند تاریخ ۴/
دوست درزیاں:۔ ہر فیشن کے کپڑوں کی کاٹ کا بہترین رہنما۔ مجلد ۸/
ہوم ڈاکٹر یا گھر کا حکیم:۔ سر سے لیکر پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا علاج للعہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کشمیری بازار لاہور

رُخصت

احمد ندیم قاسمی

ترے کہنے پہ کی ہے کوششِ ضبطِ فغاں میں نے
مجھے ماضی کے فردوسِ حسیں میں گھوم لینے دے
وہ تیرے التفاتِ جانفزا کی مختصر گھڑیاں
وہ دن جب تیری دھن میں اک سفر تھی زندگی اپنی
وہ لمحے جب سجا کر بیڑیوں سے اپنے ہونٹوں کو
وہ پل، خوف و خطر سے کھیلتا تھا جب شباب اپنا
ہدف بننے کی خاطر کہکشاں دامن بڑھاتی تھی
ترے ہونٹوں سے جو گیتوں کی صورت میں ٹپکتا تھا

مگر اٹھتا ہوا دیکھا ہے اب دل سے دھواں میں نے
تجھے پایا تھا اکثر جس میں اپنا ہم عناں میں نے
چکھا تھا اُن دنوں کیفِ حیاتِ جاوداں میں نے
پلوں میں چھان ڈالی وسعتِ کون و مکاں میں نے
تری بندہ نوازی کا لیا تھا امتحاں میں نے
بنائے تھے شکستہ ڈالیوں پر آشیاں میں نے
کچھ اس شدت سے کھینچی تھی محبت کی کماں میں نے
پیا تھا ایک مدت تک وہ خونِ ارغواں میں نے

وہ جس کو دیکھ کر جی چھوٹ جائیں ناخداؤں کے
کیا تھا اس سمندر میں سفینے کو رواں میں نے

یہ سب کچھ خواب تھا، اور خواب بھی ساون کی راتوں کا
بچھڑ کر تجھ سے آخر روح کی تسکین کی خاطر
حسینوں میں پھرا، باغوں میں گھوما، دشت میں بھٹکا

بہاروں پر نہ دیکھا سایۂ دورِ خزاں میں نے
کیا ہر ذی نفس پر اپنا دردِ دل عیاں میں نے
کہیں پایا نہیں لیکن مسرت کا نشاں میں نے

اگر تو اذن دے تو یہ جہاں تج کر چلا جاؤں
ذرا اس آسماں کی چار دیواری میں گھوم آؤں

نئی مرکزی حکومت کے اراکین
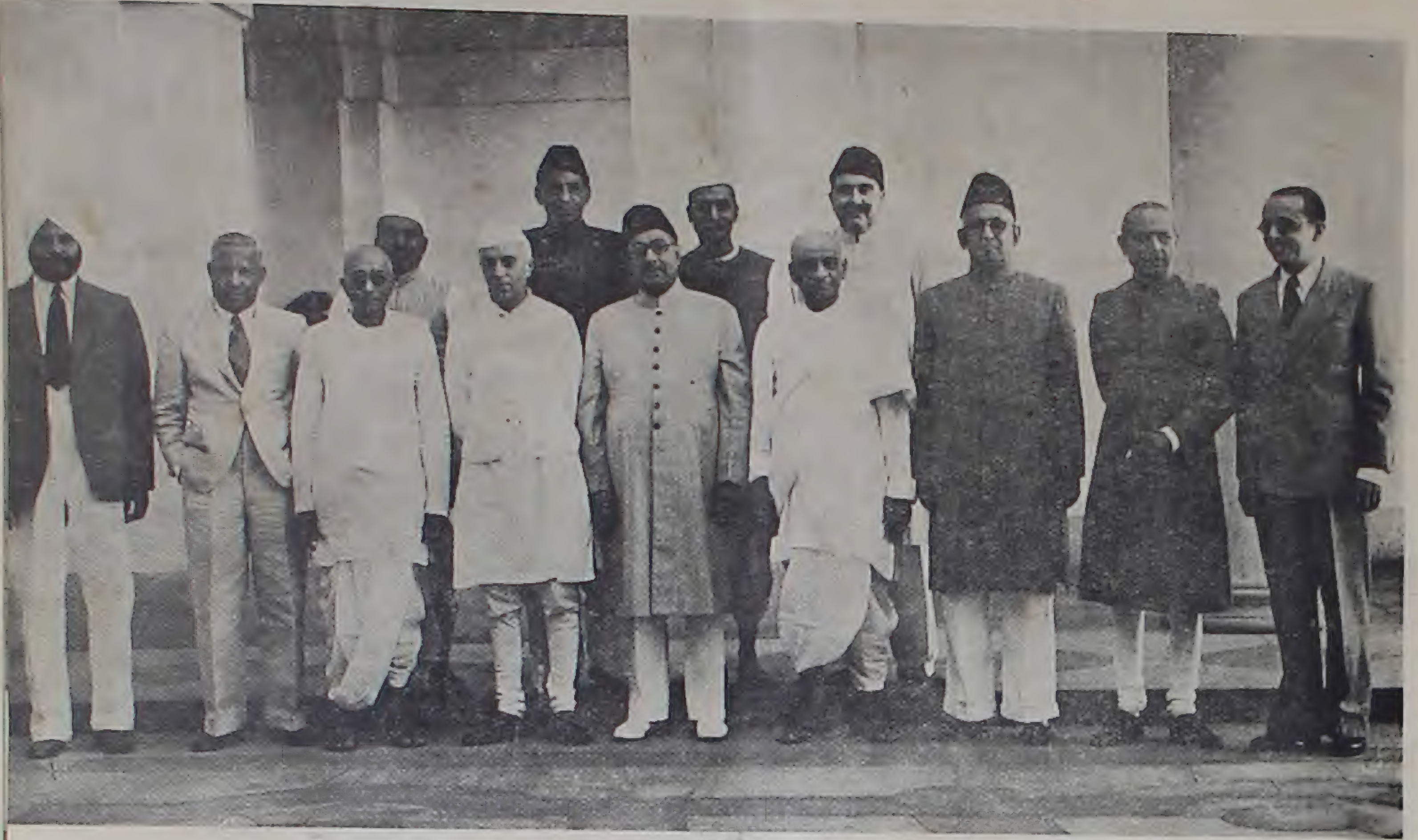
(اگلی صف میں بائیں طرف سے) سردار بلدیو سنگھ۔ ڈاکٹر جان متھائی۔ مسٹر سی راجگوپال اچاریہ۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ مسٹر لیاقت علی خاں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل۔ مسٹر آصف علی اور مسٹر سی ایچ بھابھا۔ (پچھلی صف میں بائیں طرف سے) مسٹر جگ جیون رام۔ مسٹر غضنفر علیخاں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اور سردار عبدالرب نشتر۔

کئی ہفتے کی مسلسل گفت و شنید اور خط و کتابت کے بعد انجام کار ہندوستان کی دو بڑی جماعتیں یعنی کانگریس اور مسلم لیگ ایک مرکز پر آکر عبوری حکومت میں حصہ لینے کیلئے آمادہ ہوگئیں۔ مسلم لیگ کے نمائندوں کو مناسب عہدے دینے کی خاطر تفویض شدہ عہدوں کو نئے سرے سے تقسیم کرنا پڑا۔ انکی تفصیل اسی شمارے کے ‹ رفتار زمانہ › میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۶ اکتوبر کی صبح کو مسلم لیگ کے چار اراکین نے حلف وفاداری اٹھایا۔ اسکی طرف سے نامزد کئے ہوئے پانچویں رکن مسٹر جوگندر ناتھ منڈل' جو اچھوت ذات کے نمائندے ہیں' اس وقت دھلی میں موجود نہیں تھے۔ اسلئے انھوں نے اپنے عہدے کا چارج تار کے ذریعہ لے لیا لیکن حلف وفاداری بعد میں اٹھایا۔

مسٹر جوگندر ناتھ منڈل

مصر کے میلے

مصر کے شہر طنطا میں جو نیل کے دھانے پر واقع ہے ' ہر سال سید احمد البدوی کے یوم پیدائش پر ایک عظیم الشان میلہ لگتا ہے ۔ یہ مصری ولی اٹھارویں صدی میں مراقش کے شہر فاس میں پیدا ہوئے تھے ۔ حج اور بیت اللہ کی زیارت کے بعد انکے زھد وتقوی کی شہرت ساری دنیا میں پھیل گئی ۔ اس میلے کا زور خاص طور پر آخری رات میں ہوتا ہے ۔ جو عموماً جمعہ کی شب ہوتی ہے ۔ جمعہ کے روز آخری جلوس نکلتا ہے جسکا تماشا دیکھنے کیلئے لوگ صبح ہی سے بازاروں میں جمع ہو جاتے ہیں ۔ جلوس میں ایسی بڑی بڑی گاڑیاں بھی شامل ہوتی ہیں جن پر مختلف جھنڈے اور کتبے لگے ہوتے ہیں ۔ اس موقع پر تماشوں اور تفریحوں کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے ۔

اس میلے کا جلوس سب سے زیادہ قابل ذکر ہوتا ہے ۔ اس تصویر کے عین بیچ میں احمدا لبدوی کے جانشین نظر آرہے ہیں ۔ یہ انھی کے خاندان کے رکن ہیں ۔

میلے کے دوران میں اس ھنڈولے کی آواز ہر وقت سنائی دیتی ہے ۔ بچے اس میں بیٹھ کر بہت خوش ہوتے ہیں ۔

اسی جلوس کا ایک اور منظر ۔ اگلے حصے میں گاڑیاں دکھائی دے رہی ہیں

بلقرانی (قفقاز)

قرقز (قرقزستان)

بلوچی (جنوبی ترکمانستان)

سویٹ ایشیا کے لوگ

ہندوستان میں سینکڑوں ملی جلی نسلوں کے لوگ آباد ہیں لیکن اسکی مغربی سرحد سے چند میل کے فاصلے پر ملک روس کے باشندے اور بھی زیادہ مخلوط النسل ہیں۔ اگرچہ کل آبادی کے اسی فیصدی لوگ روسی یا سلافی ہیں، تاہم یونین میں پونے دوسو مختلف قومیتوں کے لوگ شامل ہیں۔ جو ڈیڑھ سو کے قریب زبانیں اور بولیاں بولتے ہیں۔

کالمک (شمالی قفقاز)

تاجک (تاجکستان)

بریات منگول (سائبریا)

قازق (قازقستان)

ازبک (ازبکستان)

ہندوستان کے ماہرین اثریات نے ہڑپا (پنجاب) کے کھنڈروں کی کھدائی کے بعد اب سے اہم ثبوت فراہم کئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وادئی سندھ اور عراق کی قدیم تہذیبیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں تھیں۔ نئی تحقیقات میں زیادہ اہمیت دفن کرنے کی رسم کو دی جاسکتی ہے۔ یہ ہندوستان میں اپنی قسم کی پہلی چیز ہے۔ مردے کو لکڑی کے صندوق میں سرکنڈوں سے ڈھک کر رکھا جاتا تھا مردے کے قریب برتن وغیرہ رکھنے کا دستور تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے عراق میں بھی یہ رسم رائج تھی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اینٹوں کی ۴۰ فٹ اونچی اور ۴۰ فٹ چوڑی دیوار بناکر شہر کو محفوظ کیا جاتا تھا۔ اندازہ ہے کہ اس تہذیب کی داغ بیل ڈھائی ہزار قبل مسیح میں پڑی تھی۔ اور سیلاب کے ہاتھوں ڈیڑھ ہزار قبل مسیح میں اسکا خاتمہ ہوگیا۔

ڑپا کا ایک اونچا ٹیلا۔ کھدائی سے پہلے مٹی کی اینٹوں کی ایک دیوار نے اسے بچا رکھا تھا۔

ہڑپا کے نئے انکشافات

ہڑپا میں دفن کرنے کا ایک اور نظارہ۔ ٹھلیاں وغیرہ غالباً روایتی عقیدے کے ماتحت رکھی گئی ہونگی۔
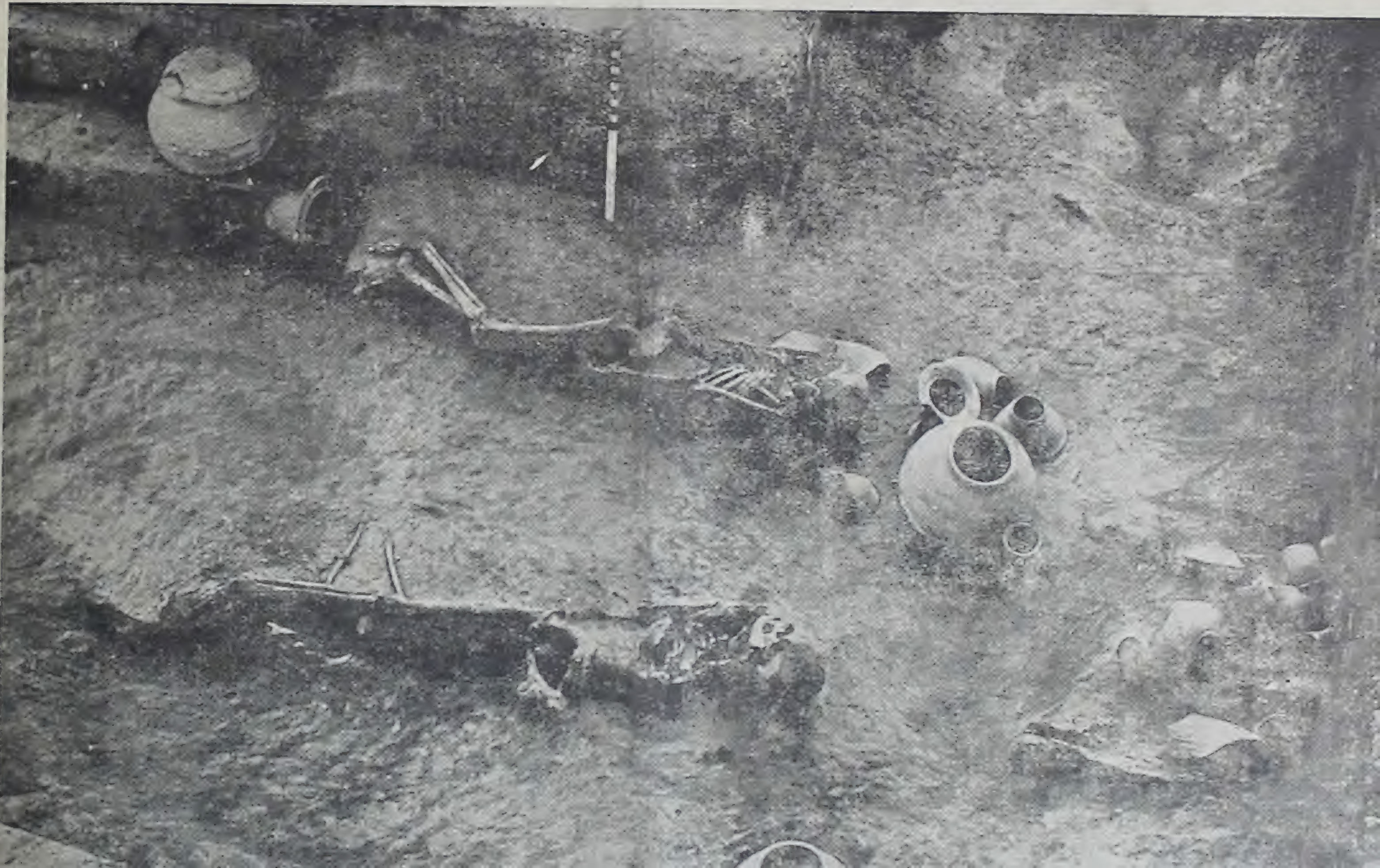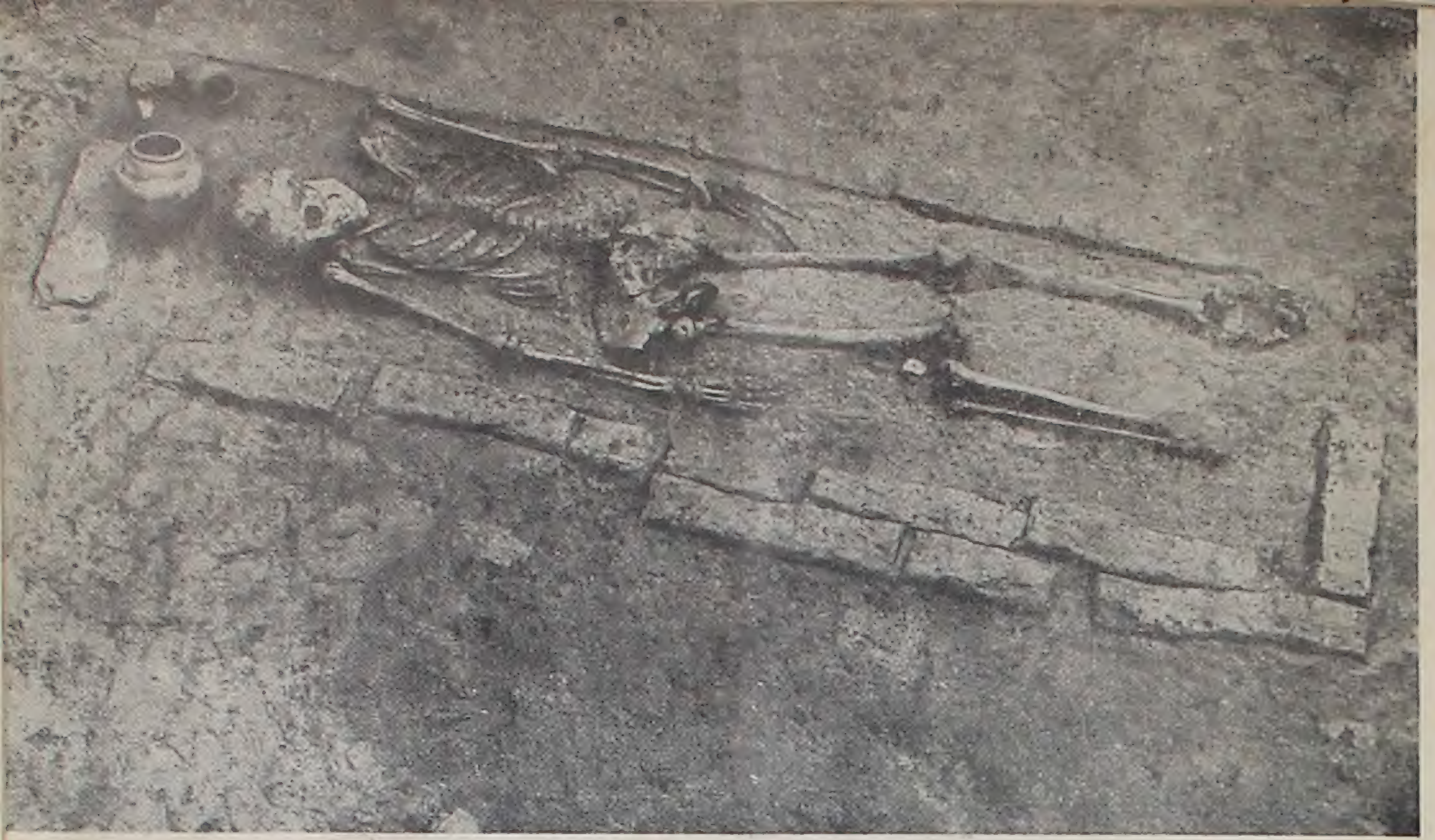
ہڑپا کا قبرستان۔ چاروں طرف لگی ہوئی مٹی کی اینٹیں لاش کی حفاظت کرتی ہیں۔ (نیچے) اوکھلی کی وضع کا ایک پختہ گڑھا
جس میں اناج کٹتا تھا۔ چاروں طرف لگی ہوئی بہت سی اینٹیں کثرت استعمال سے گھس گئی ہیں۔
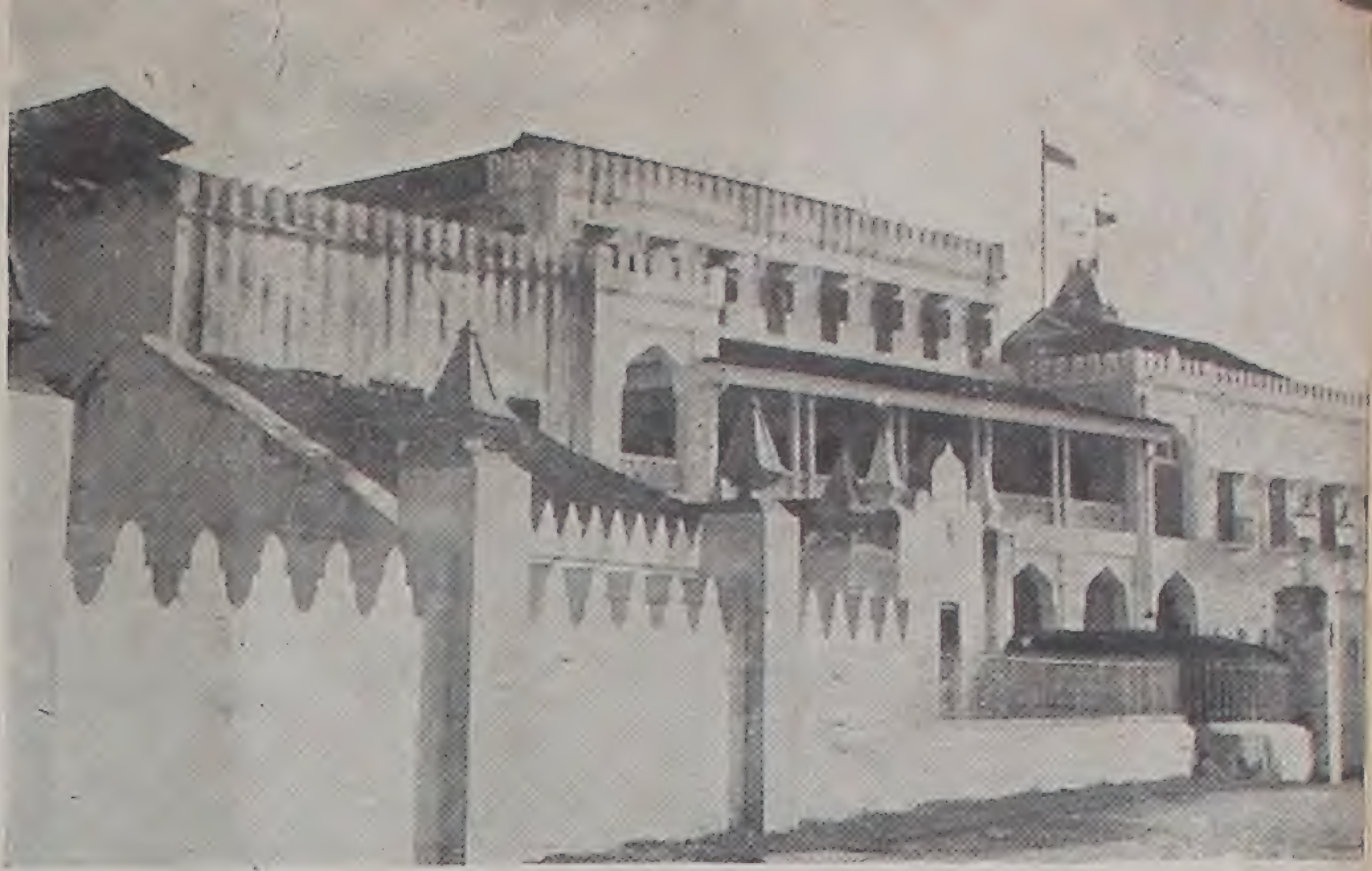
طان زنجبار کا عالیشان محل۔ اسکے قرب و جوار میں قحط کبھی اپنا رنگ نہیں جماتا۔

اعلیحضرت سلطان زنجبار

زنجبار

جزیرہ زنجبار افریقہ کے مشرقی ساحل سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اسکا رقبہ ۶۴۰ مربع میل اور آبادی ۱۴۰۰۰۰ ہے ہزهائی نس سید سر خلیفہ بن حارب بن نوبنی سلطان زنجبار کی حکومت آس پاس کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر بھی ہے وہ نہایت ملنسار، خوش خلق، عالم باعمل اور ترقی پسند حکمراں ہیں۔ کسی زمانے میں یہ جگہ غلاموں کی تجارت کے لئے مشہور تھی لیکن اب لونگوں نے انکی جگہ لے لی ہے۔

یہ کشتیاں کسی زمانے میں غلاموں کو زنجبار سے غیر ملکوں میں بکنے کیلئے لے جاتی تھیں۔ لیکن اب جزیرے کی سب سے بڑی پیداوار یعنی لونگیں لادکر لے جاتی ہیں۔

تنگ اور سانپ کی طرح بل کھانے والی گلیوں میں مکانات ایک دوسرے کے بالکل قریب بنائے جاتے ہیں۔

موصل

عراق کا ایک مشہور شہر۔

موصل کا ایک پرانا پل جو ابتک قائم ہے۔ ↓

شہر موصل کا ایک عام نظارہ۔

موصل عراق کا تیسرا اہم شہر ہے۔ یہ دریائے دجلہ کے کنارے تاریخی شہر نینوا کے بالمقابل واقع ہے۔ باشندوں میں عربوں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ شمالی علاقہ ایک اہم تجارتی مرکز ہے۔ چمڑے اور دھات کی بنی ہوئی چیزوں کا تبادلہ غیر ملکی اشیا سے کیا جاتا ہے۔ جنوبی علاقہ پٹرول کی وجہ سے اہم اور مشہور ہے۔ آثار قدیمہ کے لحاظ سے بھی یہ مقام قابل دید ہے۔ تعمیرات و آرائش میں نئے پرانے دونوں رنگ ملے جلے نظر آتے ہیں۔
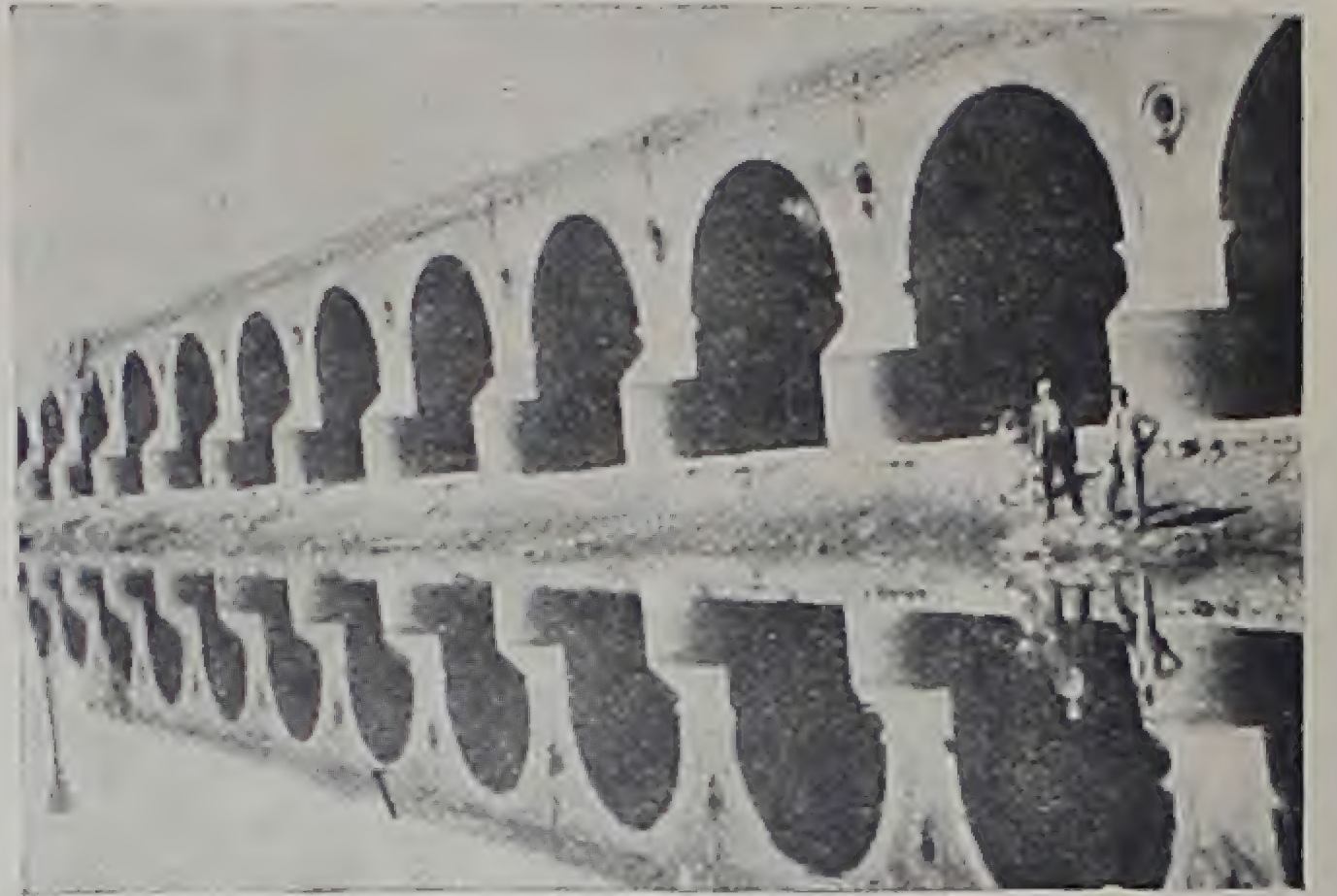
حاجیوں کا ہوائی جہاز

۱۳ اکتوبر کی صبح کو پہلا ہوائی جہاز حاجیوں کو لیکر نئی دهلی سے جده روانہ ہوا ان حاجیوں کی پیٹھ کے پیچھے ان کا جہاز روانگی کیلئے تیار کھڑا ہے۔
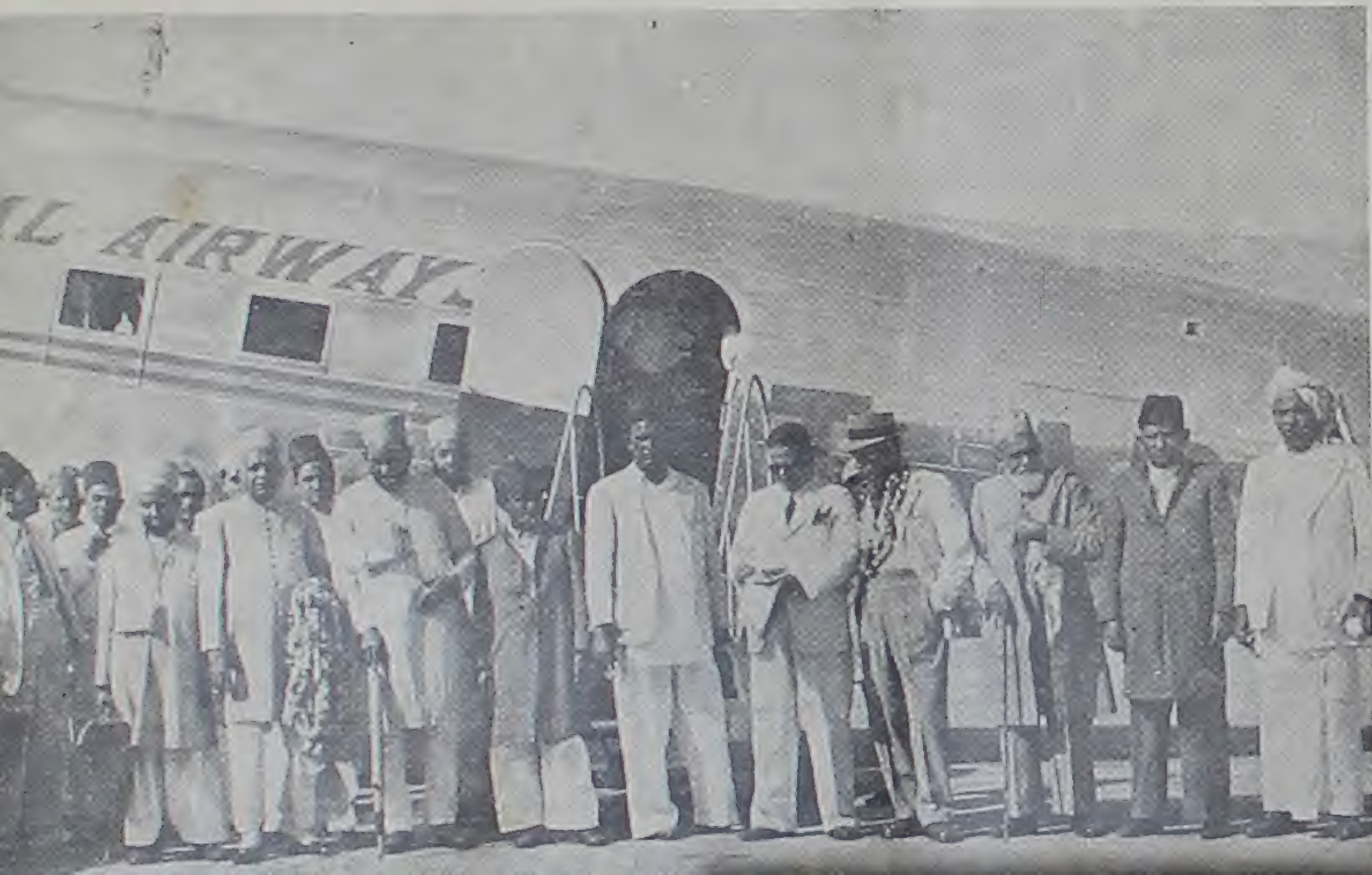
مس ثریا —— ایک فلمی ستارہ۔

کیا معنی!

عرش ملسیانی

جس غم سے دل کو راحت ہو اس غم کا مداوا کیا معنی
راحت میں رنج کی آمیزش عشرت میں الم کی آلائش
خود شیخ و برہمن مجرم ہیں اک جام سے دونوں پی نہ سکے
اخلاص و وفا کے سجدوں کی جس در پہ روا دنہیں ملتی
اے صاحبِ نقد و نظر مانا انساں کا نظام نہیں اچھا
جلووں کا تو یہ دستور نہیں پردوں سے کبھی باہر آئیں
مئخانے میں تو اے واعظ تلقین کے کچھ اسلوب بدل
ہر لحظہ فزوں ہو جوشِ عمل تسلیم و رضا کی راہ پہ چل

جب فطرت طوفانی ٹھہری ساحل کی تمنا کیا معنی
جب دنیا ایسی دنیا ہے پھر دنیا دنیا کیا معنی
ساقی کی بخل پسندی پر ساقی کا شکوا کیا معنی
اے غیرتِ دل اے عزم خودی اس در پہ سجدا کیا معنی
اس کی اصلاح کے پردے میں اللہ سے جھگڑا کیا معنی
اے دیدۂ بے توفیق ترا یہ ذوقِ تماشا کیا معنی
اللہ کا بندہ بننے کو جنت کا سہارا کیا معنی
تقدیر کا رونا کیا مطلب تدبیر کا شکوا کیا معنی

اظہارِ وفا لازم ہی سہی اے عرش مگر فریادیں کیوں
وہ بات جو سب پر ظاہر ہے اس بات کا چرچا کیا معنی

سوگند

قمر فاروقی

نگار خانۂ فطرت کی آب و تاب مدام
سرور و کیف کی ہے ایک داستانِ تمام
رواں دواں ہے بدن میں شرابِ گلگوں سی
ادا ادا سے نمایاں جھلک قیامت کی
نگاہ، مدسے ہی بڑھ کر چمن چمن ہے عذار
وہ کیف و رنگِ شفق، وہ سپیدۂ سحری
وہ ٹھنڈا چاند ستاروں کی وہ گلوں کی نمی
سما گئی ہے رگ و پے میں تیری رچ رچ کر
ادائیں، جوشِ جوانی کی کیف میں ڈوبی
قدم قدم پہ ہویدا شرارتوں کے شرارے

فضا ہے راگ سے لبریز تیری آہٹ سے
کلی جو تجھ کو کہیں دیکھ لے، مچل جائے
بہار عیش کا پالا ہے انگ انگ ترا
محال ہے کہ مرا دل ترا بدل پائے
یہ سادگی ہے تری جس کا شور برپا ہے
ترا جمال ہے مشاطگی سے بے پروا
نہ جانے کتنے حسیں نقش دیکھتا ہوں میں
سیاہ رات میں کرتا ہوں جب دھیان ترا
یہ تیرے قامتِ رعنا کی دلکشی، محبوب
کشاں کشاں لئے جاتی ہے مجھ سے ہوش مرا

حیا کے بوجھ کی سوگند تجھ کو دیتا ہوں،
کہ تھوڑی رات گئی ہے ابھی نہ سو جانا

جھولے سے اُتر آنے کے بعد

(ایک چینی نظم)

باغ میں پھر بہار آئی ہے،
اور جھولے کی دو سنہری ریشمی رسیاں،
اونچی ہوتی ہوئی،
بید کی ٹہنیوں اور پتوں میں جا کر چھپی ہیں۔
سامنے کے مکاں سے نکل کر وہ لڑکی
جھولے میں بیٹھ جاتی ہے اور جھولتی ہے
بن کے پر اڑنے لگتا ہے ملبوسِ رنگیں
بار بار اڑتی ہے آسماں کی طرف وہ
چاہتی ہے وہ شاید کہ جنت میں جا کر
کوئی تیتری بن کے اڑنے لگے
تھوڑی دیر اڑنے کے بعد وہ
چھوڑ دیتی ہے جھولا
اور سبزے پہ استادہ ہوتی ہے یوں
کر کے نیچی نگاہیں
جیسے جنت کی وہ حور ہو کوئی جس کو
وہاں سے نکالا گیا ہو
اور وہ شرم سے
اپنی نظریں جھکائے کھڑی ہو۔

(ہینگ چوفان) — راجہ مہدی علی خاں

برطانیہ کا نظام تعلیم

برطانوی مجلس قانون ساز کے اکثر موضوعات کی تاریخ بہت پرانی ہے اور بلاشبہ انگریزی نظام تعلیم پر یہ بات بالکل صادق آتی ہے کیونکہ قرون وسطیٰ اور عہد نشاۃ الثانیہ کے تعلیمی طریقوں پر اس نظام کی بنیادیں قائم ہیں بعض انگریزی مدرسے جو اس وقت پوری شان دکھا رہے ہیں، اس زمانے کے راہنمایانِ مذہب نے قائم کئے تھے جب مغربی یورپ میں رومن کیتھولک کا مد مقابل کوئی نہیں تھا۔ کچھ مدرسے ان امیر مردوں اور عورتوں نے قائم کئے تھے جن کا عقیدہ تھا کہ فیاضی اور خیرات کا مناسب بدلہ آخرت میں ضرور مل جاتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ مدرسے ایسے بھی تھے جو لندن کے تجارتی اداروں کی طرف سے قائم ہوئے تھے۔ عہد نشاۃ الثانیہ میں انگلستان پر ٹیوڈر خاندان کی حکومت تھی جس نے زبان دانی کے مدرسے قائم کرنے کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی تاکہ متوسط طبقوں کے بچوں کو یونانی اور لاطینی کی تعلیم دی جا سکے۔ ٹیوڈر خاندان کے لوگ متوسط طبقے کے افراد کو اس لئے ابھارنے کے شائق تھے کہ وہ کسی طرح ان امراء کے ہم پلہ ہو جائیں جن کو سیاسی اقتدار حاصل تھا۔ غرض یہ کہ ۱۸۷۰ء تک انگلستان کے عام لوگوں کی تعلیم ان خاص طریقوں پر مبنی تھی۔

بعض مذہبی فرقوں کے لوگ قدرتی طور پر اس بات کے آرزو مند تھے کہ ان کے مقلدین کے بچے صرف اس ماحول میں پرورش پائیں جسے وہ اپنے عقیدے کے مطابق صحیح اور سچا سمجھتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے اپنے ہم مسلک امیروں اور دولتمندوں کو ایسے مدرسے قائم کرنے کے لئے ابھارا جہاں غریب بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو سکے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں ان مدرسوں کے پہلو بہ پہلو کچھ ایسے مدرسے بھی قائم ہوتے چلے گئے جو لوگوں نے ذاتی منفعت کے خیال سے قائم کئے اور اس میں شک نہیں کہ ان مدرسوں میں ایک خاص رقم کے عوض اچھی تعلیم مل جاتی تھی۔ مشہور ناول نویس چارلس ڈکنس نے اپنے ایک ناول میں ایک فرضی مدرسے کے نام سے ان اداروں کے نکمے پن اور وہاں کے ظلم و ستم پر اظہار خیال کیا ہے جو ذاتی منفعت کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ اس قسم کے بعض مدرسوں میں استاد کم پڑھے لکھے تھے اور انھیں تنخواہیں بھی کم ملتی تھیں۔ نیز طلبا اتنی زبوں حالت میں زندگی بسر کرتے تھے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ سمجھ لینا بالکل غلط ہوگا کہ اٹھارویں اور انیسویں صدیوں کے سبھی پرائیویٹ مدرسے اس قسم کے تھے جس کا ذکر ڈکنس نے اپنے ناول میں کیا ہے۔ بہرحال اب ایسے مدرسے انگلستان میں نہیں ہیں درانحالیکہ کم سن بچوں کے بہت سے مدرسے ایسے ہیں جو کسی وقف کے بغیر قائم ہیں اور بالکل ذاتی مفاد کے اصول پر چل رہے ہیں۔ یہ مدرسے تیرہ سال کی عمر تک بچوں کی تعلیم و تربیت کا صحیح مقصد پورا کرتے ہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ ثانوی جماعتوں کے مدارس میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس طرح یونیورسٹی تک ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

انیسویں صدی کے دوسرے چوتھائی حصے میں انگلستان کی آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی تھی اس لئے حکومت نے ملک بھر میں ذرائع تعلیم کو وسیع کرنے کے مسائل پر زیادہ سے زیادہ غور کرنا شروع کیا تاکہ ایک صنعتی ملک کی صحیح ضرورتوں کو اچھی طرح پورا کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں پہلا قدم ۱۸۳۹ء میں اٹھایا گیا جبکہ پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تعلیمی نظم و نسق کے لئے بنا دی گئی۔ اس طرح سب سے پہلے ادارہ تعلیم کی داغ بیل پڑی اور پھر موجودہ وزارتِ تعلیم کا قیام عمل میں آیا۔

تعلیم سے متعلق پریوی کونسل کی کمیٹی کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ تعلیم کو ترقی دیے اور اس سلسلے میں لوگوں کی ہمت بڑھانے کے لئے سرمایہ عوام میں سے مدارس کو امدادی رقمیں عطا کرے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت حصول مقصد کے لئے ممکن نہیں ہو سکتی تھی ۱۸۳۹ء کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پارلیمان نے لگاتار کئی قانون نافذ کئے جن کی رو سے بہت سے پرانے تعلیمی اوقاف کی نئے سرے تنظیم کی گئی۔ ان قوانین کی رو سے بعض قدیم ترین مدرسوں کے وقف نامے شروع سے آخر تک دوبارہ لکھے گئے اور بعض مدرسوں اور وظیفوں کو کسی پابندی کے بغیر ہر شخص کے لئے عام کر دیا۔

نتیجہ یہ کہ ۱۸۷۰ء میں تمام بچوں کے لئے جبریہ تعلیم کا قانون نافذ کرنا پارلیمان کے لئے ممکن ہو گیا۔ چنانچہ اس سال منظور ہونے والے اہم تعلیمی قانون نے ان تمام کم سن لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مدرسے میں جبریہ حاضری لازمی قرار دے دی جن کو کسی اور طریقے سے قابل اطمینان تعلیم و تربیت نہیں دی جا رہی تھی۔ اس زمانے کے تعلیمی نصب العین کی جھلک ۱۸۷۶ء کے ایک واحد قانون میں بھی دکھائی دیتی ہے جس کی رو سے تمام والدین پر پابندی عائد ہو گئی کہ وہ اپنے بچوں کو لازمی طور پر مناسب تعلیم و تربیت دلوائیں۔

اس میں شک نہیں کہ غریب لوگوں کے بچوں کی جبریہ تعلیم و تربیت کے لئے کوئی قانونی زبردستی نافذ کر دینا بالکل بے معنی اور ناقابل عمل ہے تاوقتیکہ وہ تعلیم مفت اور بلامعاوضہ نہ ہو۔ اسی لئے ۱۸۷۰ء میں ان تمام

ایس، بی، آر، گک

ضلعوں میں درسی ادارے قائم کردیئے گئے جہاں ابتدائی تعلیم کی مروّجہ صورتیں اور امکانات ناقص یا ناکافی تھے۔ مذکورہ بالا قانون نے ان اداروں پر یہ فرض عائد کیا کہ وہ حسب ضرورت ابتدائی تعلیم کے مدارس قائم کیا کریں۔

ان درسی اداروں کی طرف سے قائم کئے ہوئے مدرسے "بورڈ کے مدرسے" کہلانے لگے اور اس طرح انگلستان میں اس نظامِ تعلیم کی داغ بیل پڑگئی جو "دوعملی نظام" کے نام سے مشہور ہے۔ ایک طرف غریب بچوں کی ابتدائی تعلیم کے ایسے نجی مدرسے قائم تھے جن کو خیراتی سرمائے سے چلایا جاتا تھا۔ ایسے مدرسوں کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی۔ دوسری طرف بورڈ کے مدرسے تھے۔ مذہبی تعلیم ان میں بھی دیجاتی تھی لیکن کسی خاص مسلک یا فرقے کے مطمح نظر کا پرچار قانوناً ممنوع تھا بلکہ وہاں عیسائیت کے عام ارکان ذہن نشین کرائے جاتے تھے۔ حکومت قومی سرمائے کی مدمیں سے ان دونوں قسم کے مدرسوں کو مالی امداد دیتی تھی۔ لیکن وہ رقمیں اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھیں کہ مدرسوں کے تمام اخراجات کی پوری طرح کفالت کرسکیں اور اس کے علاوہ نجی مدرسوں کو پبلک فنڈ سے بھی کوئی رقم نہیں ملسکتی تھی۔ البتہ بورڈ کے مدرسوں کے لئے یہ دقتیں نہیں تھیں کیونکہ قومی سرمائے کی مد سے ملی ہوئی امداد کے علاوہ تھوڑی بہت فیس بھی بچوں کے والدین سے وصول کرلی جاتی تھی۔ ان کے علاوہ باقی خرچ مقامی ٹیکسوں کی رقم سے پورا کیا جاتا تھا۔

نجی مدارس کی دقّتوں کو ۱۹۰۲ء کے تعلیمی قانون نے ایک حد تک کم کردیا۔ اس وقت انگلستان بھر میں مقامی حکام کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا یعنی ایسی منتخبہ جماعتوں کا جن کے ذمے بہت سے مختلف کام ہوتے تھے اور جن کو ٹیکسوں کے ذریعہ مالیانے میں اضافہ کرلینے کا اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ ۱۹۰۲ء کے قانون کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے ہر حصے میں ان منتخبہ جماعتوں کا ایک ایک رکن ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں مقامی طور پر مختار سمجھا جائے اور اس پر یہ فرض عائد ہو کہ وہ اپنے علاقے میں تعلیم عامّہ کے ابتدائی مدرسوں کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور فروغ دے۔

نجی مدارس کے منتظمین جو اصل بانی کے دنی مقاصد کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے، سب سے زیادہ اس امر کے ذمہ دار ٹھیرائے جاتے کہ وہ مدرسے کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو قائم رکھیں۔ لیکن روزمرّہ کے اخراجات جن میں استادوں کی فیس بھی شامل ہوتی تھی، تعلیم کے مقامی حکام کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ اس کے برعکس استادوں کی تقرری کا اختیار پھر بھی منتظمین ہی کو حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ۱۹۰۲ء کے قانون نے مقامی حکّام کو یہ اختیار دیدیا تھا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کا خود انتظام کریں یا اس سلسلے میں امداد دیں۔

لیکن ۱۹۰۲ء کا قانون نافذ کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ان بڑی عمر کے بچوں کے لئے ثانوی تعلیم کے اچھے ذرائع پیدا کئے جائیں جو اپنی ابتدائی تعلیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچا چکے ہوں۔ مقامی حکام نے اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اپنے فرائض اس طرح پورے کئے کہ انھوں نے زیادہ تر ان قدیم مدرسوں کو مالی امداد دی جو اپنے افتتاح کے زمانے سے اس وقت تک بدستور لاطینی اور یونانی تعلیم دیتے چلے آئے تھے۔ اسی اثنا میں زیادہ وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے ثانوی مدارس کے نصابِ تعلیم کو زیادہ بلند کیا جانے لگا اور سائنسی موضوعات نے بھی اپنے قدم جمانے شروع کردئے۔

تاہم بعض صورتوں میں مقامی حکام بالکل نئے ثانوی مدارس قائم کرنے کے لئے مجبور ہوگئے خصوصیت کے ساتھ مقامی حکام نے تعلیمِ نسواں کی ترقی کے لئے ایسی صورتیں پیدا کیں جن کی طرف اس وقت تک عملی طور پر کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی محض ت، یہ بجا طور پر ہم انیسویں صدی کے اس انوکھے خیال سے اپنا دامن بچا سکے ہیں کہ لڑکیوں کے لئے زیادہ تعلیم حاصل کرلینا خلاف نسائیت ہے۔

۱۹۰۲ء کا قانون نافذ ہونے کے بعد سے تعلیم کے مقامی حکام جن مختلف مفید کارروائیوں میں لگے رہے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسے وظائف کا انتظام کیا جن کو حاصل کرنے کے بعد غریب طبقوں کے لڑکے اور لڑکیاں یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل ہوسکیں۔

ان کے علاوہ ۱۹۴۴ء سے پہلے ہمارے نظامِ تعلیم میں کچھ اور ترقیاں بھی ہوئی ہیں جن کا ذکر مجھے اس مختصر سے مقالے میں کرنا ہے۔

اس صدی کے شروع میں مقامی حکام کو اقتدار دیدیا گیا تھا کہ وہ ان بچوں کی خوراک کا انتظام بھی کریں جو ابتدائی مدارس میں داخل ہوں تقریباً اسی زمانے میں پارلیمان نے ان مقامی حکام پر یہ فرض بھی عائد کردیا کہ وہ ان مدارس کے طلبا کی طبی دیکھ بھال اور علاج معالجے کا خیال رکھیں جو ان کے دائرۂ انتظام میں شامل ہوں اور اب ۱۹۱۸ء میں جبریہ تعلیم کے ضمن میں عمر کی آخری حد چودہ سال مقرر کردی گئی ہے۔ اور پھر چودہ سال سے زیادہ عمر کے بچوں کے لئے بھی یہ قاعدہ بنادیا گیا کہ اگر وہ مدرسہ چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ گئے ہوں تب بھی اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے تک وہ کچھ دیر کے لئے تھوڑی بہت تعلیم ضرور حاصل کیا کریں۔

غرض یہ تھا وہ نظامِ تعلیم جس میں ۱۹۴۴ء کے قانون نے مناسب ترمیمات کیں۔ اس نظامِ تعلیم سے کسی قدر الگ ہٹ کر لیکن اس کی افادیت کو صحیح معنوں میں ملحوظ رکھتے ہوئے سوچا جائے تو ان مدرسوں کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑیگا جو کچھ تو اپنے وقف کی آمدنی کی بدولت اور کچھ فیسوں کے ذریعہ جمع ہوجانے والی رقم کے باعث اپنی آزادی کو برقرار رکھ سکے۔ کچھ اور ایسے مدرسے بھی تھے جن کو وقف اور فیسوں کی آمدنی کے بعد بھی محکمۂ تعلیم سے براہِ راست کچھ نہ کچھ مدد لینی پڑی۔

حیوان سے انسان تک

عبد المجید

آج سے لاکھوں برس پیشتر کا ذکر ہے کہ اس کرۂ ارض پر زندگی کا نام ونشان تک نہ تھا زمین اس قدر گرم تھی کہ اس کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ زمین سے حرارت کا انتشار ہوتا گیا اور اس کا درجہ حرارت کم ہوگیا جس سے کہ اس کی سطح سرد ہوکر سکڑنے لگی۔ اس لئے اس میں جابجا شگاف اور دراڑیں پڑ گئیں۔ کچھ وقت کے بعد ہوا کے بخارات نے پانی کی شکل اختیار کرکے ان گڑھوں اور نشیبی جگہوں کو پُر کردیا۔ اب زمین اس قابل ہوگئی کہ اس پر زندگی کے وجود کا آغاز ہوسکے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ زندگی پانی کے اندر وجود میں آئی۔ ماہرین علم ارتقا کا خیال ہے کہ مادہ حیات سمندری مادہ میں کیمیائی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے۔

ابتدا میں جاندار صرف ایک خانہ (Cell) پر مشتمل تھے۔ انکی شکل وشباہت بکٹیریا یا جرثومہ کی طرح تھی۔ بعض ایک خانے والے جراثیم جن کی زندگی ہوا، پانی اور پانی میں حل شدہ نمکوں پر تھی اپنی ادنیٰ اور ابتدائی حالت سے ترقی کرکے اعلیٰ اور ترقی یافتہ قسم کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوئے۔ پھر ان میں سبز مادہ یا (Gblorophyll) پیدا ہوا۔ یہی سبز مادہ ہے جس کی وجہ سے درختوں کے پتے ہرے رنگ کے دکھائی دیتے ہیں۔ مادہ حیات کے کیمیائی عمل سے یہ سبز مادہ ہوا کی کاربن ڈائے اکسائیڈ اور پانی میں حل شدہ معدنی اشیاء سے پودوں کی غذا تیار کرتا ہے۔ اس قسم کے ادنےٰ جراثیم سے عالم نباتات وجود میں آیا۔ بعض ایک خانہ والے جراثیم کی قسم کے جاندار جن میں سبز مادہ پیدا نہ ہوا۔ اور جس کے بغیر وہ اپنی خوراک تیار کرنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے ان سبز مادہ نہ رکھنے والے جراثیم کی قسم کے جانداروں سے عالم حیوانات ظہور پذیر ہوا۔

مسلسل تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ مادہ حیات کے عناصر کی ترکیب کیچڑ میں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عالم حیوانی میں سب سے پہلی ابتدائی اور سادہ ترین مخلوق جس کو امیبا (Amoeba) کہا جاتا ہے جوہڑوں کے کیچڑ یا ساکن پانی کے ذخیروں کی تہوں میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں نشو ونما پاتا ہے۔ ابتدا میں امیبا یا اسی قسم کے بعض دوسرے جاندار اپنی حالت پر قائم رہے۔ رفتہ رفتہ بعض اپنے ماحول کی تبدیلیوں کے باعث بدلنے لگے۔ پس ان کے اندر کئی قسم کے جسمانی تغیرات رونما ہوگئے۔ چنانچہ طویل مدت کے بعد ایک خانہ والے جانداروں سے ایسی مخلوق معرض وجود میں آئی جن میں جسم متعدد خانوں سے بنا ہوا تھا۔ امیبا کو اگر "یک خانہ" جاندار کہا جائے تو یہ "کثیر خانہ" جاندار ہیں۔ کثیر خانہ جاندار ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جماعتیں بناکر رہنے لگے تاکہ بیرونی خطرات سے محفوظ رہیں اور زیادہ آسانی سے ترقی کے مدارج طے کرسکیں۔

یہ ابتدائی زندگی سالہا سال نئے نئے تغیرات اور نئی نئی تبدیلیوں کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اس میں طرح طرح کی رنگینیاں اور گوناگوں قسمیں پیدا ہوتی گئیں۔ ایک خانہ والے امیبا سے بہت سے خانہ والے جاندار، حلقہ دار کیچوے، اسفنج، مونگے، کیڑے مکوڑے، پھر ریڑھ کی ہڈی والے ادنےٰ و اعلےٰ حیوانات پیدا ہوئے اور اپنے اپنے مخصوص ماحول میں زندگی گذارنے لگے۔ ماہرین علم حیات نے یہ متفقہ طور پر تسلیم کرلیا ہے کہ امیبا ہی مختلف مدارج ارتقاء طے کرتا ہوا، انسان کی ساخت اختیار کرلیتا ہے گویا پیچیدہ ترین ساخت کا جاندار "انسان"، سادہ ترین جاندار "امیبا" کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

غور کیا جائے تو سب جانور اپنی اندرونی ساخت کے اعتبار سے دو حصوں میں منقسم ہیں:—

۱- صلبی یا ریڑھ کی ہڈی والے جانور

۲- غیر صلبی یا ریڑھ کی ہڈی کے بغیر جانور

"صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہے جو پسلیوں کے ڈھانچہ کا مرکزی سہارا اور مجموعہ ہوتی ہے۔

"غیر صلبی" وہ جانور ہیں جن کے جسم میں ریڑھ کی ہڈی اور پسلیوں کا ڈھانچہ نہ ہو۔

علم حیاتیات کے سرسری مطالعہ سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ وہ جاندار جن کے جسم ریڑھ کی ہڈی اور ڈھانچہ کے بغیر ہیں اور جنہوں نے صفحۂ ہستی پر ابتدائی ایام میں فروغ پایا نہایت ہی حقیر اور بے وقعت تھے۔ ان میں سے اکثر تو مٹ گئے کیونکہ وہ نئے ماحول کے مطابق اپنی زندگی کو نہ ڈھال سکے۔ کچھ ایسے سخت جان اور ڈھیٹھ مزاج بھی ہیں جو اب تک اپنی ابتدائی صورت میں پائے جاتے ہیں بعض نے اپنی شکل اور ساخت بدل لی تاکہ وہ نئے ماحول میں زندہ رہ سکیں۔ ان جانوروں میں سے بتدریج ریڑھ کی ہڈی والے جانور پیدا ہوئے۔ یہ اپنی بناوٹ اور قوائے جسمانی کے لحاظ سے غیر صلبی جانوروں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ ریڑھ ان کی ترقی کی ایک نمایاں اور مستقل نشانی ہے۔ پس اسی ایک اعتبار سے ترقی یافتہ حیوانات کو پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱- صرف پانی کے اندر رہنے والے جانور مثلاً مچھلیاں۔

۲- خشکی پر اور پانی کے اندر رہنے والے جانور یا جل تھلیئے مثلاً مینڈک۔

۳- خشکی پر رینگنے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور مثلاً چھپکلیاں، سانپ۔

۴۔ ہوا میں اڑنے والے جانور یا پرندے مثلاً کوا۔ فاختہ۔
۵۔ دودھ پلانے والے جانور یا شیر خوار مثلاً گائے بندر، انسان۔

ریڑھ کی ہڈی والے یا صلبی جانوروں میں سب سے پہلے مچھلی ظہور میں آئی۔ یہ جانور صرف پانی کے اندر ہی رہے اور یہاں ہی سے زندگی بسر کرنے کا سامان پیدا کرتے رہے۔ رفتہ رفتہ ایک زمانہ ایسا آیا کہ خشکی (زمین) پر نباتات کی بہتات ہونے لگی تو بعض مچھلیاں پانی سے نکل کر کنارے پر آگئیں۔ جب زمین سے ان کا تعلق ہوا تو ان کے اعضا میں تغیر و تبدل ہونے لگا اور وہ جانور عالم ظہور میں آئے جو خشکی اور پانی دونوں میں رہتے ہیں اور جن کو ہم جل تھلیے کہتے ہیں۔ مینڈک ان کی واضح مثال ہے۔

جل تھلیے جانوروں کے بعد رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانوروں کا وجود ہوا۔ ان جانوروں کے ہاتھ اور پاؤں اس قدر کمزور اور مختصر ہوتے ہیں کہ ان کی رفتار سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ پیٹ کے بل رینگ رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے ہاتھ پاؤں نہیں ہوتے۔ مثلاً سانپ اور وہ حقیقتاً اپنے پیٹ پر رینگ کر چلتے پھرتے ہیں۔

اب عالم حیوانی کے ارتقائی دور میں ایک طویل مدت ایسی آتی ہے جب کہ رینگنے والے یا پیٹ کے بل چلنے والے جانور بکثرت ظہور پذیر ہوئے۔ یہ حیوانات دیکھنے میں بعید خوفناک، جسمانی لحاظ سے لحیم و شحیم اور عادات کے مطابق بڑے ہی خونخوار اور پیٹو تھے۔ اکثر دریاؤں کے قرب و جوار میں اگی ہوئی سبزی چٹ کر جاتے یا سمندروں کے ساحلوں پر شکار کی گھات میں پڑے لیٹے رہتے۔ (Brontosaurus) اس وقت کے رینگنے والے حیوانات کا سردار تھا۔ اور اپنے جسم کی لمبائی کے لحاظ سے جو ستر فٹ سے زیادہ تھی آج تک سب سے طویل قامت حیوان مانا گیا ہے۔ اس کے پتھرائے ہوئے ڈھانچہ (Fossil) کو دیکھ کر عقل مبہوت رہ جاتی ہے۔ یہ حیوان اور اس کے بھائی بند اس قدر عظیم الجثہ تھے کہ موجودہ زمانہ کا سب سے زیادہ جسیم حیوان ہاتھی بھی ان کے سامنے ایک چڑیا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ ظلم و استبداد کی بے پناہ قوت کے باعث انہوں نے زمین پر ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ادنےٰ، چھوٹے، اور عاجز جانور ہراساں اور پریشان ہو کر رہ گئے۔ مگر قدرت کا قانون زور اور زبردستی پر مبنی نہیں۔ یہ عظیم الشان جانور اپنی ناقابل برداشت جسامت کے باعث تنازع للبقا میں کامیاب نہ ہو سکے اس لئے معدوم ہو گئے۔ ان کے مقابل میں وہی کمزور و ناتوان رینگنے والے جانور مثلاً کچھوے، گرگٹ اور ننھی ننھی چھپکلیاں جنہوں نے زمانہ کے ساتھ مطابقت کی آج بھی روئے زمین پر آرام و عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

زمین اپنے ارتقائی دور میں اس وقت گرم اور مرطوب تھی۔ رینگنے والے جانوروں نے اپنے ماحول میں تغیرات پائے تو ان میں بھی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ وہ عظیم الجثہ چھپکلیاں بھی (Dinosaurus) جو اب تک زمین پر اپنی حکمرانی کا سکہ جمائے بیٹھی تھیں آہستہ آہستہ مفقود ہونے لگیں۔ مگر چھپکلیوں کی وہ اقسام جن کی جسامت موزوں اور متناسب تھی زندہ بچ رہیں۔ انہوں نے گڑھوں اور بلوں میں چھپ کر گذارنے کا طریق اختیار کیا۔ ان میں سے بعض کے پر نکلنے لگے۔ چونکہ ان کے جسم ہلکے پھلکے اور کم وزن واقع ہوئے تھے اس لئے ان میں طاقت پرواز جلد آنے لگی۔ ابتدائی پرندوں کی جسمانی ساخت میں رینگنے والے جانوروں کی بہت سی خصوصیتیں موجود تھیں۔ چونچ ندارد، دم گرگٹ کی طرح، انگلیاں ناخن دار، چمگادڑ کی طرح کا جھلی دار آلہ پرواز اور جبڑوں میں بڑے بڑے نوکیلے دانت تھے۔ اس قسم کے جانوروں نے ترقی کی اور وہ پرندے کہلائے۔

زمین پر کشمکش حیات پوری سرگرمی سے کار فرما تھی۔ اس عہد میں نباتات کی نوعیت عہد حاضر کی نباتات سے بہت قریب ہو گئی۔ پانی کم ہو گیا، خشکی کا رقبہ بڑھ گیا۔ رطوبت پسند نباتات (Moisture-Loving Flora) ناپید ہونے لگی۔ اس کی جگہ میلوں تک پھیلی ہوئی ہری بھری چراگاہیں منظر عام پر آگئیں۔ انہی سرسبز وادیوں اور میدانوں میں چھپکلیوں، کیڑے مکوڑوں اور پرندوں کی بستیاں آباد ہو گئیں۔ ماحول کی تبدیلیوں نے بعض رینگنے والے جانوروں میں حیرت انگیز تغیرات پیدا کر دیئے۔ اب ان کی ساخت ایسے حیوانات میں منتقل ہونے لگی جو انڈوں کی بجائے بچے جنتے تھے اور انہیں اپنی چھاتیوں سے دودھ پلاتے تھے یہ حیوانات دودھ پلانے والے یا **شیر خوار** جانور کہلاتے تھے۔ دودھ پلانے والے جانور عالم حیوانی کے سرتاج ہیں۔ یہ حیوانات اپنی جسمانی، دماغی اور قوی کی خوبیوں میں سب سے اعلیٰ ہیں۔ ویل مچھلی، کنگرو، دریائی گھوڑا، سم دار مویشی کترنے والے چوہے، گوشت خور درندے، کرم خور خار پشت، چمگادڑ، گینڈے اور بندر نما حیوانات مثلاً لنگور، گبن، اورنگ اوٹان اور چمپانزی ان ترقی یافتہ حیوانات میں شامل ہیں۔

ان ہی دودھ پلانے والے جانوروں نے رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسانی شکل اختیار کر لی۔ عرصہ دراز تک انسان غیر متمدن رہا۔ اس کی زندگی ان وحشی جانوروں سے کچھ بہتر نہ تھی جن کا یہ شکار کیا کرتا۔ لاکھوں برس تک وہ وحشی جانوروں کی غاروں میں زندگی بسر کرتا رہا۔ ان ہی کی طرح لڑتا، جھگڑتا اور چیختا چلاتا پھرتا رہا۔ غالباً آج سے ایک لاکھ سال قبل انسان میں گفتگو کی قوت پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں نہ صرف منصوبے بناتے

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

یونیسکو اور اُس کے کام

جولین ہکسلے

یونیسکو (UNESCO) یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل، سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن کا مخفف ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی ادارہ ہے جو چند خاص مقاصد کے لئے کھولا گیا ہے۔

اسی قسم کے چند بین الاقوامی ادارے اور بھی ہیں مثلاً الف، اے، او یعنی فوڈ اگیری کلچرل آرگنائزیشن اور آئی، ایل او یعنی انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن یا ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن جو ابھی حال میں بنا ہے اور پروویژنل انٹرنیشنل سول ایوی ایشن آرگنائزیشن۔ ان میں سے ہر ایک ادارہ کا اپنا الگ الگ مقصد ہے۔

دماغی کاموں میں بین الاقوامی شرکت کی ابتدا پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں لیگ آف نیشنز کے ماتحت پیرس میں "انسٹی ٹیوٹ آف انٹلیکچوئل کوآپریشن" قائم ہوا لیکن یہ انسٹی ٹیوٹ آج کے "یونیسکو" سے بہت مختلف تھا۔ اس زمانہ میں انسٹی ٹیوٹ کے پاس روپیہ بہت ہی کم تھا، اسے تعلیم کے مسائل سے کوئی واسطہ نہ تھا کیونکہ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ تعلیم ہر ملک کا خاص اندرونی معاملہ ہے جس میں دوسرے ملکوں کو دخل نہیں دینا چاہیے اسی طرح انسٹی ٹیوٹ کو ریڈیو جیسی چیز سے جو ساری دنیا میں گھر گھر موجود ہے کوئی تعلق نہ تھا۔ اب آج کے "یونیسکو" کو دیکھیے۔ اس کا پندرہ سال کا بجٹ تقریباً ساڑھے سات ملین ڈالر ہے۔ لفظ ایجوکیشنل یعنی لفظ تعلیم خود ادارے کے نام میں شامل ہے۔ لاسلکی کے متعلق ادارے کے دستور میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ یہ آلہ اور اسی قسم کی تمام وہ چیزیں جن سے ہم اپنے خیالات عوام تک پہنچا سکتے ہیں مثلاً پریس اور فلمیں قوموں کے درمیان آپس کا اتفاق اور اتحاد پیدا کرنے کے لئے استعمال کی جائیں گی۔

"یونیسکو" کے دستور میں اس ادارے کے جیسے مختلف اغراض اور مقاصد بیان کئے گئے ہیں ویسے شاید ہی کبھی کسی بین الاقوامی معاہدے میں بیان کئے گئے ہوں۔ اس دستور کا پیش لفظ مسٹر اٹیلی کے ان الفاظ کے ساتھ شروع ہوتا ہے کہ "چونکہ لڑائی کا تخیل انسانوں کے دماغوں میں پرورش پاتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ امن کے تحفظ کے لئے جو قلعے بنائے جائیں وہ بھی انسانوں کے دماغوں ہی میں ہوں، آگے چل کر دستور میں بتایا گیا ہے کہ تمام قوموں کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ انسانیت کے رتبہ کو پہچانیں، انسانوں میں تہذیب پھیلائیں اور ان کو انصاف، آزادی اور امن کی تعلیم دیں ...... وہ امن جس کی بنیاد حکومتوں نے اپنی سیاسی اور معاشی مصلحتوں پر رکھی ہو دنیا کی قوموں میں مقبول نہیں ہو سکتا اور نہ اسے پائیداری حاصل ہو سکتی ہے، صرف وہی امن دنیا میں قائم رہ سکتا ہے جس کی بنیاد نوع انسان کے ذہنی اور اخلاقی اتحاد پر ہو۔"

اس دستور میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں نے اس عقیدے کو ماننے کا اقرار کیا ہے کہ "تعلیم کے لئے سب کو پورے پورے اور برابر کے موقعے حاصل ہونے چاہئیں، سچائی جہاں بھی ہو تلاش کی جائے اور دنیا کی قومیں آپس میں ایک دوسرے کے خیالات اور علم سے بے روک ٹوک فائدہ اٹھائیں"

ابھی حال میں کوپن ہیگن میں سر جان اور نے کہا کہ الف اے او کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے نئے ورلڈ فوڈ بورڈ کے ذریعہ ساری دنیا میں بھوک اور افلاس کا مقابلہ کرے، ہم "یونیسکو" کے کام کو بھی مختصر لفظوں میں ذرا سی ترمیم کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں کہ یہ دنیا میں روحانی بھوک اور ذہنی افلاس کا مقابلہ کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اس مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے اپنی چند مہینوں کی زندگی میں متعدد عملی تجاویز پر کام شروع کر دیا ہے۔ مثلاً "انرا" (UNRRA) کو اختیار نہ تھا کہ وہ تعلیمی، تہذیبی اور سائنٹفک میدانوں میں کچھ کام کر سکے اس لئے اب ہم ان مقاصد کے لئے روپیہ فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اور جنگ نے جن ملکوں کو اجاڑ دیا ہے ان میں اس قسم کی تنظیم شروع کر رہے ہیں۔ ہماری یہ تنظیم یورپ میں بھی ہوگی اور مشرق بعید میں بھی۔

اپنے اس کام کے سلسلہ میں ہم یہ محسوس کر رہے ہیں کہ دنیا کے بعض ملکوں کو تو ہر قسم کے سائنٹفک آلات میسر ہیں اور بعض کو بالکل میسر نہیں۔ اس کمی کی وجہ سے تعلیم کو خاصہ نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے ہم ایسی سفارشات تیار کر رہے ہیں جن سے یہ خرابی دور ہو سکے۔

ہمارا دوسرا کام ان پڑھ لوگوں کو تعلیم دینا ہے، ایک ایسی دنیا میں جہاں کے بسنے والوں میں آدھے سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہوں۔ یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ "یونیسکو" کو اپنے مقاصد میں پوری کامیابی حاصل ہو سکے گی، اسی لئے ہم تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ

ہوئے ہیں۔ ہم نے مختلف ملکوں مثلاً میکسیکو، چین، روس، ترکی اور برطانوی، فرانسیسی اور دوسری نوآبادیات کے ان مختلف طریقوں کا جائزہ لیا ہے جو ان ملکوں نے اپنے یہاں سے جہالت دور کرنے کیلئے اختیار کئے ہیں ہر قوم کا اپنا جدا طریقہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ تمام قوموں کو ایک دوسرے کے طریقہ میں کوئی نہ کوئی مفید بات ضرور ملے گی۔

یونیسکو نے اس طرف بھی قدم اٹھایا ہے کہ کاپی رائیٹ یعنی حقِ تصنیف و تالیف کے متعلق ایک نیا قانون تیار کرے اور اس قانون کی تیاری کے لئے ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ کاپی رائٹ کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور اس اہمیت کی دو وجوہ ہیں، اول یہ کہ دنیا کو دو سب سے بڑی طاقتوں یعنی امریکہ اور روس میں سے کسی ایک نے بھی کاپی رائیٹ کے متعلق برن کنونشن کی پیروی نہ کی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ریڈیو میں فلموں میں اور آرٹ کے تمام کاموں میں کاپی رائیٹ کی حیثیت نہایت مبہم اور لغو ہے۔

ہم درسی کتابوں کا مطالعہ بھی شروع کر رہے ہیں۔ تاریخ، جغرافیہ اور عمرانیات کی کتابوں پر ہم خاص کر نظر ڈالیں گے، پھر ہم یہ سوچیں گے کہ بین الاقوامی نفرت اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لئے ہم ان درسی کتابوں میں کیا کیا تبدیلیاں کریں۔

یورپ میں تعلیمی براڈکاسٹ کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہم ایک کانفرنس منعقد کرنے والے ہیں۔ ہم اس مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہتے ہیں کہ عام تعلیم میں آرٹ سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے — آرٹ سے فائدہ اٹھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم پیشہ ور آرٹسٹ یا گویئے تیار کریں گے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ آرٹ کی مدد سے ہم بچہ کی شخصیت اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ترقی دیں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ زبان ان بڑی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے دنیا کے ایک ملک کے بسنے والے دوسرے ملک والوں کے خیالات سمجھنے سے مجبور رہتے ہیں۔ اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ کتابوں کے ترجمے فراہم کرنے کا ہم کوئی معقول انتظام کریں، اس کے لئے ہم نے دو تدبیریں سوچی ہیں ایک تو یہ کہ ان تمام نئی اور پرانی کتابوں کی فہرستیں تیار کر دی جائیں جن کے ترجمے ضروری ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کے ترجمہ کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت مقرر کر دی جائے جو مختلف زبانوں میں ان کتابوں کے ترجمے کر سکے۔

اصل میں "یونیسکو" قائم کرنے کا خیال اس تعلیمی کانفرنس میں پیدا ہوا جسکے اجلاس جنگ کے پر آشوب زمانہ بھر لندن میں ہوتے رہے اور جسمیں اتحادیوں کے تعلیمی وزیر شریک ہوتے تھے۔ ان سب نے مختلف تجاویز تیار کیں جو ۱۹۴۵ء کی گرمیوں میں سین فرانسسکو، کے مقام پر اپنی آخری شکل میں مرتب کر لی گئیں۔ اسی جگہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ایک ایسا یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن قائم کیا جائے جو تعلیم اور تہذیب کے معاملات کو طے کرے اور جس کا صدر مقام پیرس ہو۔ اس کے بعد گذشتہ نومبر میں لندن میں ایک بڑی کانفرنس کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس قائم ہونے والے ادارہ کا خاکہ تیار کیا جائے اور اس کے لئے دستور بنایا جائے۔ اس کانفرنس میں جہاں اور بہت سی باتیں طے ہوئیں وہاں ایک یہ بھی تھی کہ اس کے نام میں حرف "ایس" اور بڑھا دیا گیا جو سائنٹفک کا مخفف ہے۔ اس کانفرنس نے ایک ابتدائی کمیشن بھی مقرر کر دیا۔ تمام کاموں کا مفصل پروگرام تیار کرے گا اور ایک عارضی بجٹ تیار کر کے "یونیسکو" ایس سی او کی پہلی کانفرنس میں پیش کرے گا۔ یہ کانفرنس اس سال نومبر میں پیرس میں منعقد ہو گی، ایک انگریز ہونے کی حیثیت سے مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ "یونیسکو" نے لندن میں جنم لیا اس لندن میں جو لڑائی کے کل زمانہ بھر دنیا کا تہذیبی مرکز بنا رہا حالانکہ ہم نے اس کے لئے کبھی کوئی کوشش نہیں کی بعض اوقات تو ہمیں اس کا پتہ بھی

غزل

کرامت فاطمہ بیگم

دیتا ہے سر محفل کیوں جان کا نذرانہ — کیوں شمع کو کرتا ہے بدنام یہ پروانہ

کم بخت کے ہاتھوں ہے دشوار مجھے جینا — تعزیر کے قابل ہے میرا دل دیوانہ

یہ جام ہی بس پی کر توبہ مجھے کرنی ہے — قربان ترے ساقی بھر دے مرا پیمانہ

اپنوں میں جو اپنایت باقی رہے کچھ بھی — یکساں ہی ہیں دونوں اپنا ہو کہ بیگانہ

کیا کیجئے گا سنکر کچھ لطف نہ آئے گا — درد و غم و حسرت سے پُر ہے مرا افسانہ

آزاد یقیں سے ہو جائیں اگر نظریں — ہر جگہ وہ ملتا ہے کعبہ ہو کہ بت خانہ

کیا ہوں میں حقیقت میں معلوم نہیں بیگم
دیوانہ سمجھ لیجئے یا جانئے فرزانہ

نہیں چلا کہ لندن کی یہ مرکزیت کس طرح بڑھ رہی تھی لندن کا باشندہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ میں دنیا کا باشندہ بھی ہوں اور مجھے خوشی ہے کہ "یونیسکو" لندن سے منتقل ہو کر پیرس کے شہر میں جا رہا ہے جو دنیا کے ان شہروں میں سے جہاں علم، ادب اور سائنس ہمیشہ پھلے پھولے ہیں۔

ابتدائی کمیشن کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ اس ادارہ کا ایک مفصل پروگرام تیار کر کے نومبر میں کانفرنس کی منظوری کے لئے پیش کرے۔ کمیشن کی یہ رپورٹ تقریباً ستر اسی ہزار الفاظ پر مشتمل ہوگی، الفاظ کی اتنی بڑی تعداد کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ "یونیسکو" کی کاروائی تعلیم کے ہر پہلو سے متعلق ہوگی، اس کے پروگرام میں تمام قسم کے طبعی، سماجی، نظری، اور عملی علوم شامل ہوں گے، تخلیقی آرٹ مثلاً مصوری، موسیقی اور ادب بھی اس کے پروگرام کا ایک حصہ ہیں، پھر ریاضی اور عمرانیات کے علوم ہیں، میوزیم میں کتب خانے ہیں اور علوم کی نشر و اشاعت کا انتظام ہے اور آخر میں رسل و رسائل کے وہ تمام طریقے ہیں جن کے ذریعہ سے عوام تک ہم اپنے خیالات پہنچائے جا سکتے ہیں، ان طریقوں میں پریس ہے، ریڈیو ہے، فلم ہیں اور ٹیلی وژن ہے ان تمام کاموں کے پروگرام تیار کرتے وقت ہمارے سامنے چند عام اصول رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ "یونیسکو" ہمیشہ اپنا کام ان اداروں کے ذریعے انجام دے گا جو پہلے سے موجود ہیں، پھر "یونیسکو" کی ہمیشہ یہ کوشش رہے گی کہ موقعوں کے درمیان ہر قسم کے تبادلے عمل میں آئیں، مثلاً ایک ملک کے طالب علم دوسرے ملک میں جائیں، مدرسین اور علمی تحقیقات کا کام کرنے والے بھی اسی طرح بدلہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجے جائیں۔ کتابوں، فلموں، موسیقی، اور آرٹ کے کاموں کے تبادلے ہوں، عام معلومات اور سائنٹفک تحقیقات کے نتائج آپس میں ایک قوم دوسری قوم سے سیکھے۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو امید ہے کہ ہمارے درمیان سے وہ تمام پردے ہٹ جائیں گے جنہوں نے قوموں کو ایک دوسرے سے دور کر رکھا ہے۔

"یونیسکو" ان تمام تبادلوں کے متعلق ایک ایسا نظام تیار کرے گا جس کے ذریعہ سے تعلیم تہذیب اور سائنٹفک علوم سے فائدہ حاصل کرنے میں دنیا کے تمام ملک برابر کے حصہ دار ہیں۔ ہم دنیا سے جہالت کو مٹانا چاہتے ہیں، ہماری خواہش ہے کہ پس ماندہ ملکوں کو تعلیم کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائے جائیں، ہم چاہتے ہیں کہ دنیا میں اب تک جتنی سائنٹفک تحقیقات ہوئی ہے اسے دنیا کے ملکوں کی ملکیت بنا دیا جائے "یونیسکو" کے سامنے ایک دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ وہ ہر ملک کے مخصوص مسائل کا جائزہ لے اور ان کا گہری نظر سے یا تو خود مطالعہ کرے یا ان لوگوں کی مدد کرے جو اس قسم کے کام میں مصروف ہیں۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے میں دو ایک مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ سائنس نے اب تک اس تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے کہ خود اس کی یہ ترقی اس کے راستے میں ایک خطرہ بن گئی ہے، سائنٹفک اشاعتوں میں انتشار نظر آتا ہے سائنٹفک تحقیقات کے جو خلاصے اور اس پر جو ریویو عوام کے سامنے آئے ہیں وہ نہایت ناقص ہوتے ہیں۔ "یونیسکو" کے سامنے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ وہ اس مسئلہ کی طرف توجہ کرے ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں بہت سے ایسے ملک ہیں جو خود اب تک صنعتی نہیں ہوئے ہیں لیکن صنعتی تہذیب وہاں پہنچ چکی ہے، اس تہذیب نے اس ملک کے قدیم فن اور دستکاریوں کو یا تو بالکل ختم کر دیا یا اتنا دبا رکھا ہے کہ ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گیا ہے۔ ان حالات نے ہمارے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم ان ملکوں کی دستکاریوں کو برباد ہونے سے کس طرح بچائیں ہمیں علم ہے کہ دو ایک موقعوں پر مثلاً امریکا میں "نواہو انڈینز" کے معاملہ میں اس قسم کی کوشش خاصی کامیاب رہی،

اسی قسم کا ایک اور مسئلہ بھی ہمارے سامنے ہے، لڑائی کے زمانہ میں بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کو تعلیم کے لئے جماعتی بحث کا طریقہ "ڈسکشن گروپ سسٹم" ایجاد کیا گیا تھا، یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا لیکن دنیا میں بہت سے ملک ایسے ہیں جہاں اس طریقہ پر تعلیم نہیں دی جاتی، مثلاً چین، افریقہ اور ہندوستان ہم چاہتے ہیں ان ملکوں میں بھی اس طریقہ کو رائج کر دیا جائے۔

بہت سے لوگوں کی یہ تجویز ہے کہ ایک بین الاقوامی یونیورسٹی قائم کی جائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا معلوم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے یونیسکو اس مسئلہ پر پوری طرح غور کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کرے گا۔ اخیر میں مجھے یہ بتانا ہے کہ ان منصوبوں کے علاوہ اور بھی متعدد منصوبے ہیں جن کو یا تو یونیسکو خود چلائے گا یا ان لوگوں کی مدد کرے گا جو ان کو چلا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات قابل ذکر ہے اور وہ یہ کہ یونیسکو کے پاس جو رقم ہے وہ محدود ہے اور اسی میں اسے یہ تمام کام کرنے ہیں۔ اس لئے بہترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ نمونے کے منصوبے چلاوے تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہر کام کے سلسلہ میں کیا کچھ کیا جا سکتا ہے چنانچہ ہماری ایک تجویز ہے کہ ایک انٹرنیشنل یوتھ کیمپ (بین الاقوامی نوجوانوں کی جماعت) تیار کریں جو تعمیری کاموں کی ذمہ داری لے۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ اس سلسلہ کی تمام مشکلوں کا

جائزہ لینے کے بعد ہم ایک "انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہوم اینڈ کمیونٹی پلاننگ" قائم کریں جس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ دنیا کے مختلف جغرافی علاقوں کے حالات کا اندازہ کرکے وہاں شہروں قصبوں اور گاؤں کے تعمیری نقشے تیار کرنے کے اصول مقرر کرے۔ اسی طرح ہمارا ارادہ ایک "انٹرنیشنل تھی ایٹر انسٹی ٹیوٹ" قائم کرنے کا بھی ہے۔ ہمارا یہ بھی ارادہ ہے کہ ہم یونیسکو "کا ایک انسٹی ٹیوٹ آف اپلائیڈ میتھے میٹکس" قائم کریں یہ انسٹی ٹیوٹ غالباً ہندوستان میں بنے گا۔ اور اس میں موجودہ زمانہ کی تمام وہ مشینیں مہیا کی جائیں گی جو اعداد و شمار کرتی ہیں، اور جن کا کام ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ آخیر میں میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جرمنی چڑیلوں کی داشت اور ان کی مہاجرت کا جو اسٹیشن ہیلی گولینڈ میں ہے اسے ہم خریدنا چاہتے ہیں مستقبل کی کامیابی کی امیدوں سے ہمارا دل لبریز ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میری یہ باتیں سن کر بہت سے لوگ یہ کہیں گے کہ "ایٹم بم اور ایک نئی جنگ کے خطرے تو سامنے کھڑے ہیں، پھر یونیسکو جیسی چیز بنانے سے فائدہ کیا؟ ان لوگوں کو میں یہ جواب دوں گا کہ جنگ تو صرف ایک امکانی چیز ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے رہ گیا ایٹم بم، تو اس کے متعلق میں یہ کہوں گا کہ اس کی تباہ کاریوں نے انسان کو ایسا خوف زدہ کر دیا ہے کہ وہ جنگ کو روکنے کا کبھی اتنا خواہشمند نہ تھا جتنا آج ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ یونیسکو، اگر ایسے مواقع بہم پہنچا سکا جن سے دنیا کی قوموں کو ایک دوسرے کے صحیح حالات آزادانہ طریقہ پر معلوم ہو سکے اور دنیا میں تعلیم، سائنس اور فنون کے بین الاقوامی ادارے قائم ہو سکے تو یہ کام خود ایسا ہوگا جس سے جنگ کے امکانات کم ہو جائیں گے۔ پھر اخیر میں میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر خدانخواستہ وہ بری گھڑی آ ہی گئی اور دنیا کو ایک نئی جنگ کا سامنا کرنا پڑا تب بھی مجھے یقین ہے کہ یونیسکو کا کام بیکار نہ جائیگا اور اس جنگ کے بعد بھی جاری رہے گا۔ ہمارے سامنے ایسی ایک مثال پہلے سے موجود ہے اور وہ انٹرنیشنل لیبر آفس کی ہے، باوجود اس کے کہ لیگ آف نیشنز کبھی کی ختم ہو چکی تھی اور دوسری جنگ عظیم بھی پانچ سال تک لڑی گئی انٹرنیشنل لیبر آفس آج تک زندہ ہے اور اپنے اس کام کو جو اس نے پچیس سال پہلے شروع کیا تھا نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیتا رہا ہے۔ ("لسنر" سے)

اعلان

دفتر رسالہ "آجکل" میں مضامین نثر و نظم کافی تعداد میں جمع ہو گئے ہیں۔ اس لئے قلمی معاونین سے التماس ہے کہ آئندہ ہمارے خاص مطالبے کے بغیر اپنے رشحات قلم روانہ نہ فرمائیں ——— (ادارہ)

اختر شیرانی کے شاہکار

ہندوستان کے مشہور و معروف رومانوی شاعر حضرت اختر شیرانی کا بے نظیر کلام چار حصوں میں شائع ہو گیا ہے جب دنیا سوتی ہے شاعر سوچتا ہے جب مزدور محنت کرتا ہے سرمایہ دار روپیہ کی جھنکار سے غریب کی عصمت لوٹنے پر غور کرتا ہے، کسان خون پسینہ ایک کرکے دنیا کی قوت لایموت کا انتظام کرتا ہے تو شاعر ان مشاہدات کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ مندرجہ ذیل تصنیفات انہی جذبات کی منہ بولتی تصویریں ہیں ایک ایک شعر کیف و سرور کا چھلکتا پیمانہ ہے۔

صبح بہار تین روپیہ لالہ طور تین روپیہ اخترستان تین روپیہ۔ طیور آوارہ تین روپے آٹھ آنے
عمدہ کاغذ۔ مضبوط جلد۔ دیدہ زیب گرد پوش

جدید اردو شاعری مصنفہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ادب اردو میں ایک اچھی تصنیف کا اضافہ اردو شاعری کے نئے دور پر سیر حاصل تبصرہ فاضل مصنف ہندوستان کے تنقید نگاروں میں حاصل درجہ رکھتے ہیں اس تصنیف میں جدید شاعری کے اسباب و علل اور محرکات اور اس کے بانیوں کے کلام و جذبات کا تذکرہ وسیع النظری سے کیا گیا ہے شاعری کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرکے اردو کے عروج کے تمنی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں جدید شاعری کے دلدادہ اور نئے رجحانات کے حامیوں کے زیر مطالعہ رہنے والی تصنیف جو غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے تیسری دفعہ طبع ہوئی ہے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے

ماڈرن اردو ڈکشنری مرتبہ صاحبزادہ عبدالحکیم خاں نشتر جالندھری۔ اس لغت میں ہر حروف کے تحت تمام ضروری الفاظ درج کئے گئے ہیں اور اس کے بعد ضرب الامثال اور قانونی اصطلاحات بھی دی گئی ہیں یہ کتاب انتہائی طور پر مستند اور مفید ہے عام تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بالعموم اور غریب طلبہ کے لئے بالخصوص یہ لغت ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔
ضخامت ۵۵۲ صفحات مجلد تین روپے آٹھ آنے للعہ

ہمارا قائد قائد اعظم محمد علی جناح کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن ان کی قومی خدمات کے بعض پوشیدہ پہلو انگریزی کتاب ٹائی لیڈر کے فاضل مصنف زیڈ اے سلہری نے نہایت خوبی سے اجاگر کئے ہیں ہمارا قائد اسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے جسکو جہاں گرد صاحب نے نہایت قابلیت سے مزین کیا ہے اور یہی معلوم ہوتا کہ اصل تصنیف ہے۔ قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے عہ

کمال اتاترک مسیحائے ترکی مصطفےٰ کمال پاشا کے گہرے دوست محترم استاد محمد توفیق پاشا نے ترکی کے ڈکٹیٹر اور جلیل القدر رہنما کے سوانح حیات کمال تدبر اور محققانہ طرز بیان سے مزین فرمائے ہیں جسکی وجہ سے کمال اتاترک، موجودہ تمام سوانح عمریوں سے مکمل و افضل ہے کتاب کی مقبولیت اس امر سے عیاں ہے کہ فاضل مصنف نے اپنے ذاتی مشاہدات کو اس خوبصورتی سے مرتب کیا ہے کہ اس وقت پانچواں ایڈیشن چھپ رہا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے للعہ

بہترین اخلاقی افسانے

نیلوفر :- دلچسپ اور نتیجہ خیز افسانوں کا مجموعہ عہ
قسمت :- دنیاوی کشمکش کے دلچسپ پاکیزہ افسانے عہ
صبر و ضبط :- معاشرتی و پاکیزہ افسانوں کا مجموعہ عہ

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل
کشمیری بازار لاہور

آپ بیمار ہیں

دُنیا میں کامیابی کا راز دو لفظوں میں یہ ہے کہ محنت کیجئے اور خوب محنت کیجئے محنت سے دولت پیدا ہوگی اور دولت سے عیش و آرام، مگر اس کیلئے تندرستی کی ضرورت ہے اگر یہ نہیں اور آپ بیمار ہیں تو محنت، دولت آرام، صرف خواب خیال ساری عمر تکلیف و مصیبت میں گزارنا ہوگی کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہوسکتی۔

بیمارِی

خدا دشمن کو بھی نہ دے، پیسہ کا خرچ، روزگار بند، مصیبت پر مصیبت، علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہا ہے مگر فائدہ نہیں "مرض بڑھتا گیا جُوں جُوں دوا کی"۔ یہ مرض کیوں بڑھتا ہے فائدہ کیوں نہیں ہوتا! اس کا جواب ہے کہ مرض کی تشخیص نہ ہوسکی، دوا خالص اور عمدہ نہیں ملی سڑی گلی دواؤں اور ناتجربہ کار طبیب سے فائدہ کی کیا امید ہوسکتی ہے

اگر آپ کے دوستوں میں سے کوئی صاحب کسی پیچیدہ اور پرانے مرض میں گرفتار ہیں تو ان کے حالات ناظم شعبہ تشخیص مجلس اطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی کو فوراً لکھ کر روانہ کیجئے!

یہاں مرض کے حالات تجربہ کار کہنہ مشق طبیبوں کی مجلس میں پیش ہوتے ہیں اس مجلس کے صدر دہلی کے مشہور طبیب پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین صاحب اجملی سینیئر ہاؤس فزیشن وائس پرنسپل جامعہ طبیہ ایڈیٹر رسالہ "مسیح الملک" ہیں

مجلس اطبا میں مرض کے تمام پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے بحث ہوتی ہے، ہر طبیب اپنے تجربہ کی بنا پر رائے ظاہر کرتا ہے اور بالآخر متفقہ رائے سے مرض کی صحیح تشخیص عمل میں آتی ہے دوا تجویز ہوتی ہے، مریض کو اطلاع دیجاتی ہے اور اس طرح روزانہ صدہا پیچیدہ مسئلے حل ہوتے ہیں تشخیص و تجویز کا یہ طریقہ اس قدر صحیح اور بہتر ثابت ہوا ہے کہ اب نہ صرف ملک کے ہر گوشے کے مریض بلکہ بہت سے اطبا بت پیشہ اصحاب ڈاکٹر حکیم اور وید بھی اپنے زیر علاج مریضوں کے پیچیدہ امراض کی بابت مجلس اطباء کا مشورہ طلب کرتے ہیں اس طرح ہزاروں مایوس مریض اس مجلس کی صحیح تشخیص کی بدولت نئی زندگی حاصل کر چکے ہیں۔ اگر آپ کسی پیچیدہ یا پرانے مرض میں گرفتار ہیں اور آپکا وقت خراب ہو چکا ہے اور دولت برباد ہو چکی ہے، تو ایک بار ہمیں حالات لکھکر یا اجملی شفاخانہ باڑہ ہندو راؤ میں تشریف لاکر مشورہ کیجئے، جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ یا لفافہ آنا ضروری ہے، رسالہ مسیح الملک بطور نمونہ طلب فرمائیے، اوقات مشورہ:- صبح ۱۰ سے ۱۲ بجے تک شام ۶ سے ۹ بجے شب تک

عہد حاضر کا مایۂ ناز طبی شاہکار
مسیح الملک کا علاج
رعائتی قیمت پر

جو ماہنامہ مسیح الملک کی جانب سے اپریل ۱۹۴۶ء میں خاص نمبر کی صورت میں نہایت شاندار طریقہ پر شائع کیا گیا ہے۔ اس میں سر سے پاؤں تک کے وہ تمام پیچیدہ اور پرانے امراض نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں جن کے علاج میں اکثر مریضوں اور معالجوں کو ناکامی ہوتی رہتی ہے اور ساتھ ہی ہر ایک مرض کے ذیل میں "اجمل اعظم" مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے خاص تخصیصی موثر نکات طریقہائے علاج اور بیش قیمت مجربات پیش کئے گئے ہیں جن کی تلاش میں دنیا بے چین ہے ضخامت تین سو صفحات سے زائد، کتابت طباعت نہایت نفیس، قیمت ان سب خوبیوں کے باوجود صرف عام خاص عایت لیکن جو لوگ تین روپیہ سالانہ چندہ بھیجکر ماہنامہ مسیح الملک کے مستقل خریدار بنیں گے، ان سے دو روپیہ کے بجائے اسکی قیمت صرف ایک روپیہ لی جائیگی، اور اسطرح وہ پانچ کے بجائے چار روپے میں حاصل کر سکیں گے، لہذا آپ بھی آج ہی مبلغ چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجدیجئے ایک سال تک مسیح الملک بھی پڑھئیے اور بیش قیمت مجربات کا ذخیرہ بھی رعایت کے ساتھ حاصل کیجئے منی آرڈر بھیجنے والوں کیلئے محصولڈاک معاف بطور نمونہ مفت طلب کیجئے

دفتر:- مسیح الملک پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی

مینیجر مجلس اطبا پوسٹ بکس نمبر ۵۹ دہلی

تیسری ملاقات

افسانہ

اختر انصاری

ایک خواب کی روداد سُناتا ہوں۔ اور اگر شروع ہی سے یہ کہہ دوں کہ یہ ایک غیر معمولی خواب تھا تو اس سے میرا مقصد نہ تو یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے شوقِ مطالعہ کو زبردستی بھڑکایا جائے اور نہ یہ کہ خواہ مخواہ رعب گانٹھ کر اپنی یا افسانے کی اہمیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ یہ محض حقیقت کا اظہار ہوگا۔ اس اظہارِ حقیقت میں مجھے یوں اور بھی کوئی تامل محسوس نہیں ہوتا کہ اس سے میرے افسانے کی فنّیت کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔

خواب کی روداد شروع کرنے سے پہلے ایک بات اور بتادینی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ گو میرا خواب غیر معمولی ہے، مگر میں خود ایک بالکل معمولی یعنی نارمل انسان ہوں۔ یونان کے بوڑھے فلسفی سقراط یا فرانس کی الہڑ دیہاتی دوشیزہ جون آف آرک کی طرح میں نے کبھی کوئی غیبی آواز نہیں سنی۔ میں نے کبھی رات کو نیند کے عالم میں بستر سے اٹھ کر نہ شب گردی کی، نہ سڑک پر چہل قدمی کی، نہ چھت پر سے کودنے کا خطرناک اقدام کیا۔ اور نہ ہارڈی کے ایک ناول کے ہیرو کی طرح اپنی محبوبہ کو بازوؤں میں لے کر گھر سے باہر کی سیر کی۔ میں کبھی کسی دماغی بیماری یا کسی نفسیاتی عدم اعتدال یا کسی قسم کی عارضی یا مستقل دیوانگی ــــ مثلاً غش یا مالیخولیا یا ہسٹیریا ــــ کا شکار نہیں ہوا۔ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی انوکھی یا ان ہونی بات کے ہونے کی خواہش کی ہو اور وہ خواہش ایک معجزانہ انداز میں پوری ہوگئی ہو۔ میں بارہا مصیبتوں میں گھر گھر گیا ہوں۔ مگر کبھی یہ نہیں ہوا کہ خلافِ عادت امور کے ذریعہ مجھے مصیبتوں سے چھٹکارا ملا ہو۔ میں نے اکثر ہوائی محل تعمیر کئے ہیں اور بیداری کے خواب دیکھے ہیں، مگر ان خوابوں اور محلوں نے کبھی مادّی شکل اختیار نہیں کی۔ مجھے بھوتوں اور آسیبوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے کسی جن یا چھل پیری کو دیکھا۔ میں بچپن میں بالکل ایک معمولی بچہ تھا اور طالب علمی کے زمانے میں ایک بالکل معمولی طالب علم۔ اپنی زندگی کے کسی دور میں میں نے کسی حیرت انگیز ذہانت یا طباعی کا ثبوت نہیں دیا۔ غرضیکہ ہر طرح سے ایک نارمل انسان ہوں اور رہا ہوں۔ سوتے میں جو خواب اکثر دیکھتا ہوں وہ بھی بالکل معمولی آدمیوں کے سے خواب ہوتے ہیں۔ سوا اس ایک بات کے (اور ضروری نہیں کہ یہ بات بھی کوئی غیر معمولی چیز ہو اور دوسروں کو اس کا تجربہ نہ ہوا ہو) کہ میں کبھی کبھی "خواب در خواب" دیکھتا ہوں۔ یعنی خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں ابھی سو رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا اور اب جاگ گیا ہوں۔ اور پھر خواب ہی میں اپنے "خواب در خواب" پر غور کرتا ہوں، اور اپنے آپ سے کہتا ہوں، "اُف میں نے کیسا بھیانک خواب دیکھا! کیسا عجیب خواب دیکھا! مگر خیر اب تو میں جاگ گیا ہوں۔ اب کوئی اندیشے کی بات نہیں۔ آخر وہ محض ایک خواب ہی تو تھا، ایک بے حقیقت خواب ......" یہ ایک قدرے غیر معمولی کیفیت تو ضرور میں نے اپنے خوابوں میں پائی ہے، ورنہ کیا سوتے میں اور کیا جاگتے میں میرا ذہن بالکل ایک نارمل انسان کے ذہن کی طرح کام کرتا ہے۔

اور اب سنئے میری زندگی کے تنہا غیر معمولی خواب کی روداد!

روز کی طرح اس دن بھی میں نے دوپہر کا زیادہ وقت سونے میں گزارا، اور رات کو ڈیڑھ دو بجے تک اپنے مطالعے کے کمرے میں رہا، جو مکان کے بڑے دروازے کے پہلو میں ہے اور جس کے دروازے اور کھڑکیاں گلی کی جانب ہیں۔ حسبِ معمول کبھی ایک کرسی پر بیٹھتا، کبھی دوسری پر اور کبھی کمر سیدھی کرنے کو جی چاہتا تو صوفے پر دراز ہو جاتا۔ اس دوران میں میں نے پڑھا بھی لکھا بھی، سوچا بھی اور خالی الذہن بھی رہا۔ اور عادت کے مطابق تقریباً مسلسل سگار پیتا رہا، یہاں تک کہ کمرے کی نصف درجن راکھ دانیاں سگار کی راکھ سے اٹ کر رہ گئیں۔ ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان کمرہ بند کر کے گھر کے اندر چلا گیا جہاں برآمدے میں ایک طرف ملازم سو رہا تھا اور دوسری طرف میرا پلنگ بچھا تھا۔ بستر پر پہنچ کر سونے سے پہلے میں نے اس دن کا آخری سگار سلگایا۔ رات اندھیری تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا تھا، مگر ستارے کجلائے ہوئے سے تھے اور ان کی روشنی میں ابھی وہ جگمگاہٹ اور براقیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو عام طور پر رات کے آخری حصے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ برآمدے میں قدرتی طور پر صحن سے زیادہ اندھیرا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے سگار پینے میں کچھ زیادہ لطف نہ آیا۔ سگار کا دھواں جو بجلی کی روشنی میں ایک خاص حسن اور رومانی کیفیت کا حامل نظر آتا ہے، تاریک کثافت کی ایک لہر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سگار بجھا دیا۔ کلی کی اور سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ عادت کے مطابق فوراً نیند آگئی اور میں خوابوں کی اس دنیا میں پہونچ گیا جس میں ہر شخص اپنی زندگی کا آدھا نہیں تو ایک تہائی حصہ تو ضرور بسر کرتا ہے۔

اس دنیا میں منتقل ہو کر میں نے دیکھا کہ میرے سامنے صحن کے اس پار جو دیوار ہے اس کی منڈیر پر ایک شخص اکڑوں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ کبھی مکان کے مختلف حصوں کی طرف نظر دوڑاتا ہے۔ کبھی پیچھے مڑ کر

دبی آواز میں اور ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ کسی سے باتیں کرتا ہے۔ اور کبھی آگے کی طرف جھک کر صحن کی زمین کی طرف نظر ڈالتا ہے۔ گویا کود کر نیچے آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ میں اس خوفناک شخص کو دیکھتا ہوں اور اس کے خوفناک ارادوں کو بھانپ کر سر سے پاؤں تک لرز جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ لیٹنر سے اٹھوں اور بچاؤ کی کوئی تدبیر کروں، مگر محسوس کرتا ہوں کہ میرے بدن میں ہاتھ پاؤں ہلانے تک کی بھی سکت باقی نہیں ہے۔ میں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں اور کانوں سے سن سکتا ہوں مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ملازم کو جگانے کے لئے آواز دینا چاہتا ہوں لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ بار بار پلکیں جھپکاتا ہوں اور متعدد مرتبہ آنکھوں کو بند کر کر کے کھولتا ہوں۔ اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں، بلکہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں حقیقت سے دوچار ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہ سوچتا ہوں کہ خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اتنی صفائی اور ٹھیٹ واقعیت کبھی نہیں ہوتی۔ خواب میں ہر چیز دھندلی، الجھی ہوئی، بے ربط، غیر یقینی اور غیر مستقل ہوتی ہے۔ خواب میں تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ ابھی آپ اپنے مکان کے اندر کسی پُر تکلف کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں اور ابھی کسی درخت کی ٹہنی پر پہونچ گئے ہیں، یا یہ کہ جس شخص سے آپ الجھ رہے ہیں وہ ابھی آپ کا بھائی ہے اور ابھی ذرا دیر میں آپ کے کسی دوست یا دشمن کا روپ دھار لیتا ہے۔ مگر یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے جو منظر ہے وہ بالکل ٹھوس ہے اور واقعیت اور اصلیت سے بھرپور ہے۔ اس منظر کی جزئیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ برآمدے میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں۔ داہنی جانب سرہانے کے پاس چھوٹی میز ہے اور اس پر سگار کیس اور دیا سلائی کا بکس اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا گلاس۔ اسی جانب ذرا آگے بڑھ کر کھانے کی میز اور کرسیاں ہیں، اور ان کے برابر ایک کھلا ہوا شیلف ہے جس میں برتن اترے ہیں اور جو سائڈ بورڈ یا ویگن کا کام دیتا ہے۔ بائیں طرف دیوار سے لگا ہوا ایک لوہے کا ٹرنک ہے جو معمولی سائز کے آٹھ نو ٹرنکوں کے برابر ہے، اور برآمدے میں اس لئے رکھا ہوا ہے کہ کمرے میں پوری ایک بڑی میز کی جگہ گھیر لیتا ہے۔ ٹرنک کے برابر دو تین کرسیاں پڑی ہیں اور کرسیوں کے اس طرف ملازم اپنی چارپائی پر بے خبر سو رہا ہے۔ برآمدے کے بعد صحن ہے جس کے چپے چپے سے کیا، ذرے ذرے سے مجھے گہری واقفیت ہے، کیونکہ میں اس مکان میں آٹھ دس سال سے رہتا ہوں۔ صحن کے خاتمے پر دس

گیارہ فٹ اونچی دیوار ہے جس کی بلندی میں مزید اضافے کے لئے میں ہمیشہ مالک مکان پر ایک بے نتیجہ اور بے سود تقاضہ کرتا رہا ہوں۔ اسی دیوار کے ایک حصے پر کھپریل کا وہ سائبان ٹکا ہوا ہے جو باورچی خانے کو دھوپ اور بارش کے حملوں سے بچاتا ہے اور کھپریل کے برابر دیوار کی منڈیر پر یہ شخص، یہ بن بلایا مہمان، اکڑوں بیٹھا ہے۔ اور خطرناک ارادوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ نہ اس کے حلیے میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے، نہ وہ خود بندر کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا وجود یقینی ہے۔ اس کی ہر حرکت بالکل واضح ہے اور پورے طور پر سمجھ میں آتی ہے۔ میں یقیناً خواب نہیں دیکھ رہا ہوں بلکہ بیدار ہوں —— سوتے سوتے جاگ گیا ہوں اور اس ناخوشگوار صورت حال سے دوچار ہوں۔

اپنی بیداری کا یقین کر لینے کے بعد میں اپنی پھٹی ہوئی آنکھیں منڈیر اور منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص پر جما دیتا ہوں۔ اس کے جسم پر ایک کسے ہوئے لنگوٹ اور ایک چست شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہاتھ اور ٹانگیں بالکل ننگی ہیں۔ سر پر ایک مٹیالے رنگ کا صافہ بندھا ہے، اور شاید اسی کا کچھ حصہ ہے جو اس کے گالوں اور ٹھوڑی کو بھی ڈھانپے ہوئے ہے۔ تاہم اسکا چہرہ، یعنی آنکھیں، ناک، اور منہ صاف نظر آ رہا ہے۔ میں اس کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں تو میری حیرت زدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا ہے، اس کا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا ہے۔ اور پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی مانند ہیں۔ میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوندجاتی ہے، اور میرا حافظہ چیخ کر کہتا ہے "بدو!"

اس مقام پر میں اپنے پڑھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لئے خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس لانا چاہتا ہوں۔

میری ساری عمر بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی شہروں میں گزری ہے، اور کسی گاؤں یا قصبے میں چند دن گزار دینے کو میں تعطیلات کا بہترین مصرف خیال کرتا ہوں۔ لوگ ایام فرصت میں کلکتہ اور بمبئی یا مسوری اور کشمیر جانے کے پروگرام بناتے ہیں۔ میں اس کے برعکس کسی اداس گاؤں یا ویران قصبے کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ میرے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے ایک ہم پیشہ وہم مشرب دوست مظہر نے گزشتہ سال کرسمس کی چھٹیوں میں مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ یوں میں نے چند روز ایک چھوٹے سے پرسکون قصبے میں بسر کئے۔ مظہر کا مکان جو کچھ خام ہے اور کچھ پختہ، قصبہ کے ایک سرے پر واقع ہے۔ مکان کے ایک طرف ایک پکی سڑک ہے جس پر صبح سے شام تک اونگھتی ہوئی بیل گاڑیاں، بے ضرورت شور کرنے والے بچے، مویشی اور انسان گزرا کرتے ہیں، اور جو اس سارے ہنگامے کے باوجود

بے رونق ہی رہتی ہے۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا برساتی تالاب اور اس سے آگے کھیتوں کا لا متناہی سلسلہ ہے۔ مکان کی پشت پر ایک سایہ دار املی کا درخت ہے۔ اسی درخت اور اس کی بہاروں اور اس کے سائے میں برپا ہونے والی صحبتوں کو مظہر نے اپنے قصبے کی سب سے بڑی کشش بتایا تھا۔ شاید اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ آس پاس کے ہر مرتبے اور ہر قماش کے لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں یہاں جمع رہتے ہیں اور ہر وقت اور ہر موسم میں ایک جلسے کا سا سماں بندھا رہتا ہے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہ تھا کہ برسات کے زمانے میں اس درخت کے نیچے بیٹھنا کس قدر لطف و مسرت کا موجب ہوتا ہوگا۔

اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں میں ایک دن جو صبح کو سو کر اٹھا تو دیکھا کہ آسمان پر ابر چھایا ہوا ہے اور ٹھنڈی ہوا غیر معمولی تیزی کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن اس پر بھی مظہر اور اس کے چند دوست پاس کے دار درخت کے نیچے حسب معمول جمع تھے۔ کوئی گرم کوٹ پہنے تھا، کوئی کمبل لپیٹے ہوئے تھا اور کوئی لحاف سمیت ہی آنکلا تھا۔ مگر ایسا کوئی نہیں تھا جو سی سی نہ کر رہا ہو اور سردی کے مارے ٹھٹھرا نہ جاتا ہو۔ سب اس حال میں کھڑے تھے کہ مظہر نے ایک شخص کو جو ادھر سے گزر رہا تھا بدو کہہ کر پکارا۔ وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی گھٹنوں تک اونچی دھوتی اور کھدر کے ایک کثیف نیم آستین شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس برہنگی سے زیادہ جاذب توجہ اس کی صورت تھی۔ وہ حد سے زیادہ کریہہ المنظر تھا۔ اس کا سر گنجا تھا، ایک آنکھ بھینگی تھی، ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا، اور ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی طرح پھولے ہوئے تھے!

”میاں بدو! ایسی سردی میں آج صبح ہی صبح کہاں چل دئے؟“ کسی نے اس سے پوچھا۔

”کیا بتاؤں میاں!“ اس نے جواب دیا، ”مجھ بدبخت کو تو موت بھی نہیں۔ سچ جانیو، آدھی رات سے جب سے کہ ہوا تیز چلی ہے اور بادل ہوئے ہیں صبح تک دونوں میاں بیوی بچّی کو بغل میں دبائے، گھٹنوں میں سر دئے بیٹھے رہے ہیں۔“

”پھر اب اتنے سویرے سردی میں کیوں نکل کھڑے ہوئے؟ اس وقت کہاں کا ارادہ ہے؟“

”میاں اور سویر کی کیا بات ہے۔ یہاں تو ہر وقت سردی ہی ہے۔ رات جس طرح کاٹی ہے بس اپنا ہی دل جانتا ہے۔ اب تمہیں بتاؤ میاں! ایک کھدر کی چادر اس کڑکڑاتے جاڑے میں کیا کام آسکتی ہے؟ اور وہ بھی تین آدمیوں کے بیچ میں!“

”ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت جا کہاں رہے ہو؟“

”میاں! جاتا کہاں، مزدوری کی فکر ہے۔ آنے دو آنے کی پیداوار کر کے پیٹ کو لگاؤں گا۔“

”اچھا اچھا، جاؤ،“ سب نے مل کر کہا۔ اور وہ رخصت ہوگیا۔

یہ میری اور بدو کی پہلی ملاقات تھی۔

اس سال ستمبر کے پہلے ہفتے میں مظہر کے کنبے میں ایک شادی تھی اور مجھے ایک مرتبہ پھر اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ کنوار کا مہینہ تھا اور برسات کا آخری زمانہ۔ سب جانتے ہیں کہ اس موسم میں کیسی چلچلاتی دھوپیں پڑتی ہیں۔ صحیح یا غلط مشہور ہے کہ انھیں دھوپوں میں ہرن کالا ہوتا ہے۔ ایک دن یہ اور غضب ہوا کہ ہوا بالکل بند ہوگئی۔ قیامت کی دھوپ اور اس پر حبس! گھروں کے اندر ٹھہرنا ناممکن ہوگیا۔ اگر کہیں کچھ امن تھا تو املی کے درخت کے سائے میں ہی تھا۔ چنانچہ دوپہر کے وقت میں اور مظہر اور کچھ اور لوگ درخت کے نیچے اپنے ہاتھوں میں پنکھے لئے بیٹھے تھے کہ چند مزدور گھاس کے گٹھے سروں پر رکھے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ سب کے چہرے گھاس کے گٹھوں میں چھپے ہوئے تھے۔ درخت کے نیچے پہونچ کر سب نے اپنے اپنے سر کا بوجھ زمین پر لڑھکا دیا، اور بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپنے لگے۔

”کہو بھئی بدو! کیا حال چال ہیں؟“

مظہر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں نے اپنے حافظے میں ایک ہلکی سی جنبش محسوس کی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور بیک نظر اس گنجے سر اور بھینگی آنکھ کے ٹوٹے نتھنے اور پھولے ہوئے ہونٹوں والے شخص کو پہچان لیا جس سے پچھلے جاڑوں میں پہلی دفعہ واقفیت حاصل کی تھی۔

”اچھا ہوں میاں!“ بدو نے کہا۔ ”اب کے تو میاں تم بہت دنوں میں گھر کو آئے۔“

”ہاں بھئی، کیا بتائیں چھٹی نہیں ملتی۔ کہو اب تمہاری کیسی گزر رہی ہے؟ جاڑوں میں تو تم بڑی تکلیف اٹھا رہے تھے۔“

”میاں! غریب کے لئے جاڑا گرمی سب برابر ہے۔ جاڑوں میں سردی کے مارے اکڑے جاتے تھے اور اب گرمی میں یہ دھوپ جلائے ڈالتی ہے۔ لو دیکھو۔“

یہ کہہ کر بدو نے اپنی پشت ہماری طرف کی، اور ہم نے دیکھا کہ اسکی پشت پر چونّی کی گولائی کے برابر بیسیوں آبلے پڑے ہوئے ہیں۔

”یہ آبلے کیسے؟“ مظہر نے پوچھا۔ ”کیا کہیں جل گئے؟“

”میاں! جل نہیں گئے،“ بدو بولا۔ ”کپاس کے کھیت میں بیٹھے گھاس صاف کر رہے تھے۔ اپنے پاس کوئی کپڑا تھا نہیں جو پیٹھ پر ڈال لیتے۔

دھوپ کی تیزی سے آبلے پڑ گئے ہیں۔"

مظہر اور اس کے ساتھی "ارے...." کہہ کر خاموش ہو گئے اور آسمان کی طرف منہ کر کے بارش کی دعائیں مانگنے لگے۔

یہ میری اور بدّو کی دوسری ملاقات تھی!

اور تیسری ملاقات خواب کی دنیا میں ہوئی جس کی روداد کا ایک حصہ میں سنا چکا ہوں اور باقی حصے کی طرف اب متوجہ ہوتا ہوں۔

میں منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان لیتا ہوں، اور زور سے چیخ کر کہنا چاہتا ہوں، "بدّو، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟" مگر آواز حلق میں سے نہیں نکلتی، اور میں بے دست و پائی کے عالم میں اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور ہوں۔ اتنے میں ایک اور شخص کا سر منڈیر سے اونچا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ایک لمحے میں وہ بھی بدّو کے برابر آن بیٹھتا ہے۔ میں صورت حال کو اس اتفاقی تبدیلی میں پوری طرح غور بھی نہیں کر پاتا ہوں کہ اسی طرح ایک تیسرا شخص دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور منڈیر پر آ کر اپنے ساتھیوں کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا دیوار کے اس طرف زمین شق ہو گئی ہے اور کسی غلیظ اور ملعون دنیا کے بسنے والے اپنے ناپاک مسکنوں سے نکل نکل کر میرے مکان پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ میں اپنی نظریں یہ دیکھنے کے لئے منڈیر پر جما دیتا ہوں کہ ان تین حملہ آوروں میں اور کتنے حملہ آوروں کا اضافہ ہونے والا ہے۔ بارے یہ اضافہ تو نہیں ہوتا، مگر یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ تینوں شخص کھپریل کے سائبان کا سہارا لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے نیچے صحن میں اتر آتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی کوشش کرتا ہوں، اور پلنگ سے اٹھنے کے لئے اپنے جسم کی انتہائی قوت کو کام میں لاتا ہوں۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ میری آواز میرے دماغ میں گونج کر رہ جاتی ہے اور میرے جسم کی قوت تحلیل ہو کر مجھے پہلے سے زیادہ مفلوج بنا دیتی ہے۔ وہ تینوں شخص آگے پیچھے ایک قطار سی باندھے ہوئے، مکان کے بڑے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز مجھے سنائی دیتی ہے۔ وہ دروازے کو چوپٹ کھول دیتے ہیں، گویا فرار کے راستہ کا انتظام سب سے پہلے کرتے ہیں، اس انتظام سے فارغ ہو کر تینوں دوبارہ صحن میں آ جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر متامل رہتے ہیں اور آپس میں اشاروں سے باتیں کرتے ہیں۔ اسکے بعد برآمدے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ میں برق زدہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ میری حالت بیہوشی کی حالت سے کہیں بدتر ہے، کیونکہ بیہوشی میں انسان شعوری احساس سے بہرحال عاری ہوتا ہے۔ برآمدے میں لوہے کا ضخیم ٹرنک سب سے پہلے ان کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک جھک جھک کر اس کے قفل کو دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی کام بنتا نظر نہیں آتا اس لئے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس دروازے میں بھی ایک قفل پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ ادھر سے بھی پسپا ہوتے ہیں، اور تینوں برآمدے سے نکل کر صحن میں چلے جاتے ہیں۔ تقریباً دو منٹ تک کھپریل کے سائبان کے نیچے کھڑے رہتے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور آپس میں مشورہ کرتے ہیں اس کے بعد دوبارہ برآمدے کی طرف بڑھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی اور پلنگ سے اٹھنے کی زبردست کوشش کرتا ہوں، مگر آواز میرے حلق میں مر چکی ہے اور بستر میرے لئے قبر بن کر رہ گیا ہے۔ ایک شخص ملازم کی چارپائی کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہو جاتا ہے دوسرا برآمدے کے بیچ میں ٹھہر جاتا ہے۔ اور تیسرا یعنی بدّو میرے پلنگ کی طرف اپنے قدم بڑھاتا ہے۔ وہ میرے سرہانے کے پاس پہونچ کر چند لمحوں تک بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد آگے کو جھکتا ہے اور میرے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں چیخنے کی ایک آخری اور بے پناہ کوشش کرتا ہوں اور کامیاب ہوتا ہوں۔

ایک بھیانک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں خواب کی دنیا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ خواب کے تاریک غار سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ جاتا ہوں۔

اور یہ تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا۔

"لیکن" آپ کہیں گے، "یہ تو بالکل معمولی خواب تھا"

ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو، مگر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص میرے سرہانے کھڑا ہے اور جھک کر میرے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ اسکا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا۔ اور اس کے پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی مانند تھے۔ وہ بدّو تھا!

حیوان سے انسان تک ——— بقیہ صفحہ ۳۹

اور تدبیریں سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوئی بلکہ یہ بھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے تبادلہ خیالات کر سکے اور اپنا مافی الضمیر ان کو بتا سکے۔ ان خصوصیات کی بدولت اس کو دنیا کے سب جانوروں پر غیر معمولی فوقیت اور سرفرازی حاصل ہو گئی۔ اس کی فطرت نے اب اسے مجبور کر دیا کہ وہ صحیح معاشرتی زندگی اختیار کرے جس سے کہ اس کے ذہنی اور دماغی قوٰی میں حیرت انگیز ترقی ہوئی اور بالآخر موجودہ دور کے مہذب اور ترقی یافتہ انسان کی خلقت کی تکمیل عمل میں آئی۔

سوویٹ ایشیا کے لوگ

جان لورنس

جس طرح برطانیہ عظمیٰ کے معنی صرف انگلستان کے نہیں بالکل اسی طرح سوویٹ یونین محض روس کا نام نہیں روسی ایک طرح کے لوگ ہیں مگر سوویٹ یونین میں انھیں بہت اہمیت حاصل ہے۔ اب میں آپ کو سوویٹ ایشیا کے متعلق کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جغرافیائی نقطۂ نظر سے "سائبیریا" ایشیا کا ایک حصہ ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو سائبیریا یورپی روس ہی کا پھیلاؤ ہے۔ اس میں ویسے ہی لوگ بستے ہیں اور اس کی آب و ہوا بھی ویسی ہی ہے۔ اصلی ایشیا تو آپ کو درحقیقت کاکیشیا اور سوویٹ ترکستان ہی میں نظر آئے گا۔ یہیں زرخیز وادیاں اور سمرقند و بخارا جیسے مشہور عالم شہر ہیں اور یہیں وہ صحرا ہیں جو وادیوں کو ایک دوسری سے جدا کرتے ہیں۔ یہ دراصل اس قسم کا ملک ہے جس کا ذکر "الف لیلیٰ" میں آیا ہے۔ یہاں اونٹ ہیں اور اسی طرح کی چیزیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں جاڑوں میں خاصی سردی ہوتی ہے۔ اور جب برف پڑتی ہے تو برف گاڑیاں اونٹ ہی کھینچتے ہیں البتہ انھیں گرم رکھنے کے لئے دریاں اوڑھا دیتے ہیں۔ مرد لمبے لمبے سلکی چغے اور منقش ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ اور عورتیں اپنی لمبی کالی زلفیں پشت پر لٹکا لیتی ہیں۔ ان سب کے بال کالے ہوتے ہیں۔ روسی زندگی کا یہ دلکش پہلو مجھے بہت پسند ہے۔ مگر "الف لیلہ" میں نظر فریبی بہت کم ہے اور ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اسکے پس منظر میں خوفناک غربت چھائی ہوئی ہے۔

سوویٹ ایشیا ہمیشہ غریب رہا ہے۔ روس کے مقابلے میں اسکی مفلسی کہیں زیادہ ہے۔ یہاں مسلمان آباد ہیں۔ تمام سوویٹ یونین میں کوئی دو کروڑ مسلمان ہوں گے۔ وہ عموماً روسی میں نہیں بلکہ اپنی مادری زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ البتہ جو لوگ مدرسوں میں روسی سیکھتے ہیں وہ کبھی کبھی روسی بول لیتے ہیں۔ لیکن ان دونوں زبانوں میں کچھ زیادہ اختلاف بھی نہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ تھوڑی سی مشق سے مختلف قبیلوں کے لوگ ایک دوسرے کی بات بہ آسانی سمجھ لیتے ہیں۔ روسیوں کے مقابلے میں یہ لوگ بہت پیچھے تھے پچیس سال قبل ان میں صرف دو تین فیصدی لوگ پڑھنا جانتے تھے وہ بھی اپنی زبان میں نہیں بلکہ زیادہ تر عربی اور فارسی میں اس لئے کہ ان زبانوں کو ان کے نزدیک فوقیت حاصل تھی چھپی ہوئی کتابوں کی تعداد نفی کے برابر تھی۔ ملک بھر میں معدودے چند ڈاکٹر تھے۔ ایک پورے ضلع میں جہاں کی آبادی کوئی اڑھائی لاکھ تھی صرف ایک ڈاکٹر تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بیمار کو مرض کے ایام میں موت سے کھیلنا ہوتا تھا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے لوگوں کو شہری آزادی حاصل نہ تھی اور ان کا دار و مدار محض حکام کے رحم و کرم پر تھا۔ یہ حاکم بعض صورتوں میں روسی افسر ہوتے اور کبھی ان کے اپنے "امیر" اور "خان"۔ قصہ مختصر یہ لوگ قرون وسطیٰ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض وجوہ سے قرون وسطیٰ کی تہذیب کا معیار بہت بلند تھا اور وسط ایشیا کے یہ لوگ وسطی بلند تہذیب کے وارث ہیں۔ چونکہ وسط ایشیا زیادہ تر صحرا ہے اس لئے ان لوگوں کی زندگی کا مدار پانی پر ہے۔ البتہ اگر وہاں بند بنا لئے جائیں اور نہریں کھود لی جائیں تو زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے اور یہی بنجر زمین زرخیز بنائی جا سکتی ہے۔ بند سے بجلی حاصل ہو سکتی ہے اور پھر یہی پانی کیمیائی مشینوں کے ذریعے کھاد کے طور پر استعمال ہو سکتا ہے یا پھر زمانۂ جنگ میں اس سے بارود وغیرہ تیار کر سکتے ہیں جب کبھی وسطی ایشیا میں کسی اچھی حکومت کا دور دورہ ہوا تو اس نے بند بنائے اور نہریں کھدوائیں۔ اس لحاظ سے سوویٹ حکومت ان لوگوں کے لئے رحمت ثابت ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ بند بندھوانے اور نہریں کھدوانے کے لئے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد درکار ہوتی ہے۔ یہاں کھدائی کے کام کے لئے زیادہ تر مقامی لوگ لگائے گئے ہیں اور حقیقت میں یہ انکے اپنے فائدے کی چیز ہے۔ جب کبھی اس قسم کی مہم درپیش ہوتی ہے تو پوری آبادی دل و جان سے اس میں لگ جاتی ہے۔ اور یہ ان کی زندگی کا دلچسپ پہلو ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی دور رہ کر حکومت ان لوگوں کا اعتماد کیسے حاصل کرتی ہے جب کہ یہ لوگ دیگر پس ماندہ اقوام کی طرح بڑے شکی واقع ہوئے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ سوویٹ حکومت نے ان لوگوں کے معاملے میں کئی غلطیاں کھائیں، اور اول اول حکومت کی سخت مخالفت ہوئی اور لوگ مسلح بغاوت پر اتر آئے لیکن رفتہ رفتہ معاملات سلجھ گئے۔ سوویٹ یونین ایک طرح کا وفاقی نظام حکومت ہے گو ویسا نہیں جیسا ریاستہائے متحدہ یا سوئٹزرلینڈ یا آسٹریلیا کی جمہوری حکومتوں میں ہے۔ قانون یہاں جلد حرکت میں آجاتا ہے اور تمام احکام ماسکو سے صادر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے وزرا میں سے ایک نے مجھ سے کہا کہ "ماسکو ہی سب کا آقا ہے۔"

لیکن واقعہ یہ ہے کہ مقامی کاموں کے لئے سوویٹ یونین کی طرف سے مقامی لوگ ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ لوگ مقدور بھر کوشش کرتے ہیں کہ عوام ان اپنے کاموں میں حصہ لینے کو فخر سمجھیں۔ پچھلے بیس سال میں انھوں نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ ان دور دراز علاقوں میں سوویٹ نظام کو قائم ہوئے ابھی بیس برس سے کچھ ہی اوپر گزرے ہیں۔ آج کل سب بچے اسکول جاتے ہیں۔ یہ ہر چیز مادری زبان میں سیکھتے ہیں۔ بہت سے طالب علم (جن میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں) ثانوی درجوں بلکہ یونیورسٹی تک پہونچ جاتے ہیں۔ میں نے تاشقند اور سمرقند کی دونوں یونیورسٹیاں دیکھیں۔ ان میں سینئر پروفیسر ابھی تک زیادہ تر روسی ہیں لیکن اب اُزبک نوجوانوں کی کافی تعداد معلمی کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ اس زمانے میں چونکہ اکثر لوگ پڑھنا سیکھ گئے ہیں اس لئے اب ہر علاقے میں مقامی ادب سے دل چسپی لی جا رہی ہے۔ ان لوگوں نے اپنے قدیم ادب کو پہلی مرتبہ بہت بڑی تعداد میں چھپوا کر محفوظ کر لیا ہے۔ مجھے ایک ناٹک دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ ایک قدیم نظم سے تیار کیا گیا تھا۔ میں الفاظ سمجھنے سے تو قاصر رہا لیکن اداکاری ایسی واضح تھی کہ پورے کا پورا منظر آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میرے خیال میں آج سے پچیس سال پہلے کسی مقامی زبان میں کوئی کھیل نہیں کھیلا گیا۔ لیکن اب وہاں ایسے تھیٹر قائم ہو چکے ہیں جو ماسکو کے بہترین تھیٹروں سے کسی طرح کم نہیں۔

مگر ناٹک اور تھیٹر تو محض ضمنی چیزیں ہیں کسی متمدن معیار زندگی کے لئے اصل چیز مناسب طور پر کاشت کردہ کھیت اور جدید کارخانے ہیں جہاں تک مجھے معلوم ہے وسط ایشیا میں کوئلے کی کانیں نہیں ہیں اور غالباً اسی وجہ سے وہاں عام طور پر صنعت وحرفت کو کچھ زیادہ فروغ حاصل نہیں۔ البتہ پارچہ بافی کی صنعت وہاں بڑے زوروں پر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وسط ایشیا میں کپاس بہ کثرت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے تاشقند میں کپڑے کا ایک بہت بڑا کارخانہ دیکھا۔ لنکاشائر کے کارخانوں سے اس کا مقابلہ تو کوئی ماہرِ فن ہی کر سکتا ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس کارخانے کو سرسری نظر سے دیکھنے کے لئے بھی کئی گھنٹے وقت درکار ہے۔ میں نے دُھنکنے سے کپڑے کی چھپائی تک کے سارے عمل دیکھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مستقبل قریب میں ان لوگوں کو پہننے کے لئے بہت عمدہ کپڑا مہیا ہو جائے گا گو انھیں مغربی یورپ کی صف میں کھڑا کرنے کے لئے بہت عرصہ درکار ہے۔ اس کے علاوہ وہاں کپڑے کے اور بھی کارخانے ہیں۔

آبادی وہاں کی بڑھ رہی ہے لیکن اس قسم کا کوئی خطرہ نہیں کہ زمین اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے ناکافی ہوگی کیوں کہ زمین کو آبپاشی کے ذریعے کارآمد بنایا جا سکتا ہے حکومت برطانیہ میں بھی آب پاشی کی بعض بڑی بڑی اسکیمیں عمل میں آچکی ہیں اور شاید یہ خیال کرنا درست نہ ہو کہ روس ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں اس قسم کی بڑی بڑی اسکیموں پر عمل ہو سکتا ہے۔ ہاں ان کے متعلق یہ بات بالکل صحیح ہے کہ جب یہ لوگ کسی کام کو کرنے کا تہیہ کر لیتے ہیں تو اس میں سر توڑ کوششوں سے تیزیِ رفتار پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر وادیٔ فرغانہ کو لے لیجئے۔ قدیم زمانے میں یہ زرخیز ترین علاقوں میں سے تھی لیکن آب پاشی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی وجہ سے یہ پھر سے بنجر ہو گئی۔ نہر فرغانہ کھدگئی تو اس علاقے کی زرخیزی بحال ہو گئی مجھے اس کے متعلق جو قصے بتائے گئے اوّل اوّل میں نے انھیں باور نہیں کیا لیکن اب میں اسے بچشم خود دیکھ چکا ہوں۔ اس کا صرف ایک حصہ کئی سو میل لمبا ہے۔ جن لوگوں کو اس نئے پانی سے فیض یاب ہونا تھا ان کو اس کے فوائد اچھی طرح سمجھا دئے گئے۔ انجنیروں نے اس نہر کی حدود زمین پر قائم کر دیں اور ٹیلوں وغیرہ کے نشانات بھی لگا دئے۔ گویا کھدائی کے سوا ہر چیز تیار ہو گئی۔

اب دیکھئے کہ کھدائی کس طرح عمل میں آئی۔ اس علاقے میں کپاس

غزل

شفق جوالاپوری

ہو گیا نقش دل پہ تیرا نام ٭ بس محبت کا مل گیا انعام
حسن ہر چند بے نیاز سہی ٭ عشق کو لیکن اپنے کام سے کام
ہم کو مرنا تھا عشق کے ہاتھوں ٭ حسن نے مفت لے لیا الزام
رنگ اب اور ہے زمانے کا ٭ کب تلک! یہ حدیث بادہ وجام
اب نہ منزل، نہ راہ منزل ہے ٭ عشق میں پیش آگیا وہ مقام
لاکھ طوفاں ہیں اور سفینۂ زیست ٭ ایک دل اور صد ہزار آلام
جس میں کیف و سرور و سوز نہیں ٭ وہ مئے شوق مطلقاً ہے حرام
نظروں نظروں میں کہہ گئے سب کچھ ٭ آنکھوں آنکھوں میں دے گئے پیغام
کسی رنگیں ادا کا صدقہ ہے ٭ ہم کہاں! اور کہاں یہ رنگ کلام
زلف مشکیں گھٹائیں ساون کی ٭ چشم مخمور یعنی بادہ بجام

تم چھپاتے تو ہو شفق لیکن
صاف غماز ہے یہ طرزِ کلام

خوب پیدا ہوتی ہے۔ سال بھر میں قریب قریب ایک مہینا ایسا ہوتا ہے کہ کھیتوں پر کوئی کام نہیں ہوتا۔ ایک بار ایسے ہی موقع پر مجوزہ نہر کے کنارے سب لوگوں نے پھیل کر ڈیرے ڈال لیے۔ ان کی تعداد ایک لاکھ ترسیٹھ ہزار تھی۔ ان کو اچھا کھانا دیا جاتا اور ان سے دن بھر کام لیا جاتا تھا۔ شام کو انھیں سوویٹ یونین کے بہترین نغمائی کھیل دکھائے جاتے تھے۔ دن بھر تقریریں کرنے والے ایک گروہ سے دوسرے گروہ کے پاس جاتے اور انھیں ایک دوسرے کی مستعدی کا حال بتا کر اکساتے۔ اس طرح انھیں جذبۂ مسابقت پیدا ہو جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورا کام تین ہفتے میں ختم ہو گیا یعنی سو میل لمبی نہر تیار ہو گئی جس نے اتنے بڑے بنجر علاقے کو زرخیز بنا دیا۔ بعد میں اس نہر میں اضافہ کیا۔ اسی طرح کئی بند اور نہریں اسی قومی اشتراک کی بدولت معرض وجود میں آئیں۔

جو لوگ ان کھیتوں میں کام کرتے ہیں عام طور پر ان کی کنشتواری تنظیم ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ہر گاؤں کے گرد جو زمین ہوتی ہے اسے ایک بڑا قطعۂ اراضی مان کر مشترک طور پر کاشت کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ اپنے منتظم کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ ہر خاندان کو کچھ مویشی وغیرہ پالنے کی اجازت ہوتی ہے اور تھوڑی سی جداگانہ نجی زمین کاشت کرنے کا بھی حق ہوتا ہے۔ مجھے ایک گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں انکا اپنا ہائیڈرو الیکٹرک اسٹیشن (بجلی گھر) تھا۔ اس کی بدولت ہر گھر میں بجلی موجود تھی۔ اُزبکستان میں ترانوے گاؤں ایسے تھے جن کی بجلی اپنی تھی۔ لیکن اس چیز کو عام کرنے کے لئے بڑی مدت درکار ہے۔

مکانات وہاں گارے کے ہوتے ہیں اور گارا اس قسم کی آب و ہوا کے لئے کوئی بری تعمیری چیز نہیں۔ مجھے چند مکانات کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ نہایت چھوٹے اور تاریک تھے لیکن میں نے وہاں جدید مکانات بھی دیکھے جن میں باقاعدہ صحن، پھل دار درخت اور ہوادار کمرے تھے۔ ان کے رخ عموماً شمال کی طرف تھے۔ اس سے انھیں دھوپ سے بچاؤ رہتا تھا۔ مکان کے ایک حصے میں مردانہ کمرے تھے اور دوسرے میں زنانہ۔ آجکل لڑکیاں بھی اسکول جاتی ہیں اور انھیں ایک گونہ آزادانہ زندگی بسر کرنے کا موقع مل رہا ہے لیکن ابھی تک کسی غیر مرد کو زنانہ کمروں میں جانے کی اجازت نہیں۔ آج سے چند سال پہلے تک عورتیں پردوں میں رہتی تھیں۔ یہ پردہ کیا تھا۔ ایک عجیب وضع کا کالا بدنما برقع جسے لکڑی کے ایک تکونے فریم کے ذریعہ سر سے چہرے پر لٹکایا جاتا تھا۔ سوویٹ حکومت نے کبھی پردے کی ممانعت نہیں کی حالانکہ ترکستان اور ایران میں ایسا ہو چکا ہے البتہ "اشتمالی جماعت" (کمیونسٹ پارٹی) پردے کے خلاف تبلیغ کرنے کی پوری پوری کوشش کرتی ہے۔ ایک جوان عورت نے مجھے بتایا کہ "میں سب سے پہلی عورت ہوں جسے پردہ ترک کرنے کا فخر حاصل ہے۔" اس نے اس سلسلے میں مجھے کئی دردناک باتیں بتائیں۔ ایک یہ تھی کہ پرانے خیال کے لوگ اس حرکت سے سخت برہم ہوتے اور بعض اوقات چہرہ ننگا کرنے والی لڑکی کو خفیہ طور پر ختم کر دیا جاتا۔

سوویٹ ایشیا بلاشبہ ترقی کر رہا ہے لیکن یہ لوگ ابھی تک بہت مفلس ہیں اور انھیں مغربی یورپ کے معیار تک پہنچانے کے لئے ابھی بہت عرصہ درکار ہے۔ لیکن روس میں ان پسماندہ لوگوں کی امانت داری کے فرائض انجام دینے کے لئے حالات سازگار ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان دو کروڑ نفوس کی دیکھ بھال کے لئے روسیوں اور دیگر متمدن لوگوں کی تعداد کوئی سترہ کروڑ ہے جن میں سے اکثر برطانوی نو آبادیات کے لوگوں کے مقابلے میں بھی کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ سوویٹ یونین کے لئے افریقہ کے منطقۂ حارہ کی سی مشکلات نہیں ہیں۔ ان کے لوگوں میں سب سے زیادہ پسماندہ انتہائی شمال کے "اسکیمو" ہیں لیکن ان کی تعداد کچھ اتنی زیادہ نہیں۔ روس میں اس قسم کے لوگوں کی کثیر تعداد موجود ہے جو دور دراز علاقوں میں صنعتی کام اپنے ہاتھ میں لے کر زیادہ پسماندہ لوگوں کو اپنی حفاظت آپ کرنے کے طریقے سکھلا سکتے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ تمام سوویٹ یونین کا علاقہ زمین کا ایک ہی بڑا قطعہ ہے۔ چنانچہ ہم ریل کے ذریعے ماسکو سے تاشقند چند روز میں پہونچ سکتے ہیں۔ اس سے ملک کو متحد کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پھر وہاں نسلی بکھیڑے بھی نہیں ہیں کیونکہ پوری سوویٹ یونین میں صرف دو نسلیں ہیں یعنی یورپی اور منگولی۔ اگر کوئی انگریز جادو کے زور سے یکایک ماسکو پہنچ کر روسی لباس پہن لے تو اس کے چہرے کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ یہ روسی نہیں ہے۔ دوسری قوم ہو بہو چینیوں کی سی ہے لیکن وہاں کسی معاملے میں نسلی امتیاز کی ضرورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔ روسیوں کو ہر خوددار قوم کی طرح اپنے آپ پر ناز ہے لیکن ان میں جرمنوں جیسی "خود نمائی" کا رجحان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بنیادی طور پر صلح جو واقع ہوئے ہیں۔

لکھنے والوں سے

رسالہ آجکل میں تمام مضامین نثر و نظم اس شرط کے ساتھ قبول کئے جاتے ہیں کہ اُن کو اسی رسالہ میں شائع کر لیا جائے یا اس ادارے کے کسی دوسرے رسالے میں شائع یا نقل کر لیا جائے۔ قلمی معاونین اس شرط کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کریں۔

(ادارہ)

نئی وضع کے ناول

تاحدِ نگاہ ناول — فلمی دنیا کے نامور افسانہ نویس ضیاء سرحدی کا حسین و رنگین دلکش ناول۔ رومانوی فلموں کے نظاروں سے بھی زیادہ پُرلطف۔ قیمت

تلاش و نگار ڈرامے — ضیاء سرحدی کے تجربات زندگی کا نچوڑ یہ دو بہترین ڈرامے ہیں قیمت عار دو روپے

عروج و زوال ناول — مضطر ہاشمی کا اسلامی گھریلو زندگی کا خاکہ لئے ہوئے۔ اصلاحی و اخلاقی ناول تین روپے

آگ ناول — از عزیز احمد جس میں مصنف نے کشمیر جنت نظیر کی سماجی اور سیاسی زندگی بڑے عجیب انداز میں پیش کی ہے تین روپے

بیسوا ناول — از مظفر حسین شمیم جس میں شریف عورت طوائف کیوں بنتی ہے الحد دلچسپ ڈیڑھ روپیہ

باغی ناول — رئیس احمد جعفری کا حیرت انگیز و حیرت آفریں ناول، یہ ناول بہت مقبول ہوا ہے ضرور ملاحظہ فرمائیے قیمت چار روپے ۱۲

کالی گھٹائیں ناول — احمد شجاع پاشا۔ اپنی نوعیت کا انوکھا ناول قیمت صرف۔ تین روپے آٹھ آنے

پھر بھی؟ — مرزا عظیم بیگ چغتائی کے بلند پایہ مزاحیہ افسانوں کا آخری مجموعہ جو تیسری بار شائع ہوا ہے قیمت دو روپے آٹھ آنے

حسن و شباب — ماہر القادری کے خاص افسانے۔ قیمت صرف دو روپے

چیتھڑے — ماہنامہ ایشیا کے دس سالہ منتخب افسانے۔ منتخبہ ساغر نظامی قیمت صرف پانچ روپے

رشید اختر ندوی کے ناول نشیمن۔ نسیم۔ نشانِ راہ۔ کانٹوں کی سیج۔ تلخیاں۔ قیمت فی ناول تین روپے آٹھ آنے۔ تشنگی ناول چار روپے باد و باراں ناول تین روپے۔

ملنے کا پتہ

شیخ نذیر احمد کتب خانہ تاج آفس
محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳

دو قابلِ قدر تصانیف

سید الانبیاء۔ خاتم النبیین۔ محبوبِ خدا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور عالم سیرتِ مبارک

رحمۃ اللعالمین کامل تین جلد

مصنفہ:۔ علامہ قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان منصورپوری

فاضل مصنف نے آقائے عربی کی سوانح حیات کو جس بالغ نظری سے مرتب کیا ہے اس نے رحمۃ اللعالمین کے شائع ہوتے ہی غیر معمولی مقبولیت عنایت کر دی۔ چنانچہ کتاب کو ملک کے ہر حصہ میں ہاتھوں ہاتھ قبول کیا گیا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقفیت پیدا ہو جائے گی۔

طرز بیان محبت اور عقیدت سے منجھا ہوا ہے۔ سیرت کے ساتھ ہی بہت اہم مذہبی امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتابت خوشخط کاغذ چکنا عمدہ طباعت دیدہ زیب۔ کامل تین جلد مجلد قیمت ۱۷ روپے

اردو زبان میں قرآن حکیم کی بے نظیر و لاثانی تفسیر

تفسیر حقانی اردو کامل

مصنفہ:۔ فاضل اجل علامہ مولانا مولوی عبدالحق صاحب حقانی دہلوی

اردو زبان میں آج تک ایسی تفسیر نہیں لکھی گئی۔ اس سے آپ عمر کے ہر حصہ میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں زبان عام فہم اور سلیس بامحاورہ اردو استعمال کی گئی ہے حوالہ کتب ربطِ آیات، شانِ نزول اور دیگر متعلقات بھی درج کئے گئے ہیں۔ مشتاقانِ علم و دین کے مسلسل اصرار پر لوا ایڈیشن آٹھ جلدوں میں شائع کیا گیا ہے جو اڑھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔

قیمت کامل آٹھ حصے بلا جلد چھبیس روپے مجلد اکتیس روپے

ہم اسلامی ادبی کتابیں اور قرآن مجید شائع کرتے ہیں فہرست مفت طلب فرمائیے

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران کتب کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

ہندوستانی فلموں میں ڈرامانگاری

ابھی کل کی بات ہے کہ ہندوستان میں پہلی بولتی فلم "عالم آرا" بنائی گئی۔ عالم آرا میں بس خوبی یہ تھی کہ فلم تھی اور بولتی ہوئی۔ لیکن اس وقت کے شائقین اس سے زیادہ کچھ چاہتے بھی نہ تھے۔ اور یہ فلم ہر طرح مقبولِ خاص و عام ہوئی۔ یہ فلم دیکھنے والوں کے لئے ایک نیا ذریعہ دلچسپی بنا اور بنانے والوں کے لئے ایک نیا ذریعہ آمدنی۔ اور فلمی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے آج کیا! ایک زمانہ گذرنے کے بعد بھی کچھ کم دلچسپ نہ ہوگی۔

شروع ہونے کی دیر تھی کہ فلموں کا تانتا بندھ گیا۔ فلم دیکھنے والوں نے فلم بنانے والوں کے دل بڑھائے اور فلم بنانے والوں نے فلم دیکھنے والوں کے۔ سینماؤں میں طوطی بولنے لگا اور تھیٹروں میں اُلّو۔ راستہ میں کئی کئی تھیٹر چھوڑ کر لوگ سینما کی طرف بڑھنا شروع ہوئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ان دنوں نہ صرف بمبئی۔ پونا۔ حیدر آباد۔ دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ کلکتہ وغیرہ میں بے شمار تھیٹر کمپنیاں قائم ہوگئی تھیں بلکہ ہندوستان کے بہت سے چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی تھیٹر عام ہوگیا تھا۔ اور دوسری طرف سینما بھی تھیٹر سے کچھ کم دلچسپ جگہ نہ تھی۔ سینما کے دروازوں پر لوگوں کے استقبال کے لئے مستقل مسخرے رکھے جاتے تھے۔ اور چونکہ مشین ایک ہی ہوتی تھی اس لئے ایک ریل ختم ہونے کے بعد دوسری ریل چڑھانے میں وقت لگتا تھا۔ اس لئے سامعین کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے ہر ریل کے خاتمہ پر اسٹیج پر ناچ وغیرہ کا باقاعدہ انتظام رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ فرسٹ کلاس اسکرین سے نیچے ہی ملا ہوا ہوتا تھا۔ اور اوپر گیلری میں وہ لوگ بیٹھتے تھے جو "کم خرچ اور بالانشیں" کے قائل تھے۔ یہاں بھی سامعین کے حقوق کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ اور ان کے اصرار پر ناچ وغیرہ ہر بار مکرر سہ کرر دھرانے میں تکلف نہ کیا جاتا تھا۔ فلم تو یوں کچھ ایسی لمبی نہ ہوتی تھی مگر اس طرح دیگر لوازمات سے وقت تھیٹر کی نسبت کچھ کم نہ لگایا جاتا تھا۔

بدر العظیم

زمانے کا مذاق بدلنا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ وقت خواہ مخواہ زیادہ ضائع ہونے کا خیال آنے لگا ادھر لوازمات میں کمی آنی شروع ہوئی۔ اُدھر فلم میں دلچسپی کی زیادتی۔ مسخرے بجائے باہر کے فلم میں آنے لگے اور ناچ بجائے اسٹیج کے اسکرین پر پہنچ گیا۔ اگلی کرسیاں پیچھے اور پچھلی کرسیاں آگے کی گئیں۔ بجائے بار بار وقفہ دے کر تسلسل قائم نہ رکھنے کے فلم لگاتار دکھانے کا انتظام کیا گیا بس ایک بار وقفہ دیا جانے لگا۔ وہ بھی کسی مجبوری سے نہیں بلکہ سامعین کے اکتا نہ جانے کے خیال سے۔

اس کے بعد فلم کمپنیاں کھلنے کی باری آئی اور انھوں نے بھی رفتار دکھائی۔ لیکن دقت ڈراموں کی کمیابی تھی۔ جو کچھ قدیم ڈرامے موجود تھے وہ اسٹیجوں پر بار بار کھیلے جا رہے تھے۔ اور وہ ڈرامے جو کمپنیوں کے منتظم خود لکھتے تھے کامیاب نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ اول اول تو کھیلے ہوئے ڈرامے ہی پھر فلم میں دھرائے گئے لیکن یہ کب تک ممکن تھا۔ اس لئے ڈرامے لکھنے کے لئے اس زمانے کے پڑھے لکھے لوگوں کو ملازم رکھنا شروع کیا۔ پرانے ڈرامے پھر لکھے گئے اور ان میں کہیں کہیں تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ گجراتی۔ مرہٹی۔ بنگالی ڈراموں کا اردو ہندی میں ترجمہ کیا جانے لگا۔ لیکن ایسے ترجموں کی زبان بس برائے نام ہی ان کی اہلی زبان سے بدلی ہوئی ہوتی تھی۔ مکالموں میں بھی ویسی ہی تک بندی کا خیال رکھا جاتا تھا جیسے کہ اسٹیج پر بولے جاتے تھے یعنی! باوزن اور تلے ہوئے مکالمے ڈرامے کی جان سمجھے جاتے تھے۔ فلم کمپنیوں کو علاوہ ازیں چارہ نہ تھا کہ شُدبُد زبان جاننے والوں کے جیسے بھی برے بھلے ڈرامے ملیں انھیں فلمائیں۔ اور دیکھنے والے بھی اس کی زحمت نہ کرتے تھے کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ سب سے بڑا معیار دلچسپی تھا اور اس کے ساتھ گانے سونے پر سہاگے کا کام کرتے تھے۔

ہر فن کی ترقی اس کی ضرورت پر مبنی ہوتی ہے۔ زمانے نے کروٹ بدلنی شروع کی۔ رفتہ رفتہ سمجھدار ڈائرکٹر میدان میں اترنے لگے اور ڈرامانگاری بھی اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں نے شروع کی۔ لیکن یہاں آکر ڈرامانگار اور ڈائرکٹر دونوں یک زبان ہوکر ایک ہی اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ نہ آسکے۔ اگر ڈائرکٹر پرانی روش سے ہٹ کر نئے راستہ کی جستجو کرتے تو ڈرامانگار قدیمی خوبیوں کو ڈرامے کی جان سمجھتے۔ اور اگر ڈرامانگار ہمت کرکے ڈرامے کو تیا رنگ دینے کی کوشش کرتے تو ڈائرکٹر اس کے کامیاب ہونے میں شک کرتے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ بیچارے ڈرامانگار نہ تو ڈرامانگاری کے فن سے واقف تھے اور نہ زبان و بیان کی خوبیاں سمجھتے تھے۔ چنانچہ نہ تو وہ خود اپنے نئے ڈرامے لکھ سکتے تھے اور نہ غیر زبانوں کے عمدہ ڈراموں کے اپنی زبان میں اچھے ترجمے کر سکتے تھے۔ دوسری طرف ڈائرکٹر بھی ظاہری دلچسپی پیدا کرنے کو فنی خوبی سمجھتے تھے۔ اور پرانی روش کو بدل کر نئی چیز پیش کرنے میں مالی نقصان ہوجانے کا خیال بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ فلمی کہانی اس وقت تک صحیح معنوں میں ڈراما کہلانے کی مستحق نہ تھی۔

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی - اب اور تعلیم یافتہ - فن کو سمجھنے والے - باہمت ڈائرکٹروں نے قدم بڑھایا اور آن کی آن میں فلمی دنیا کی صورت بدل گئی - قابل ڈائرکٹروں نے اندازہ کر لیا کہ فلم صرف ہنسی مذاق یا جسمانی کودپھاند کے کرتب دکھانے کا ذریعہ نہیں بلکہ اس میں ادبی اور فنی خوبیاں جھلک رہی ہیں - فلم علاوہ ظاہری دلچسپی کے جذبات لطیفہ کے لئے بھی باعثِ لطف بن سکتا ہے - یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ہر فن کی ترقی کی صورت یہی ہے کہ ترقی یافتہ اقوام کی نقل کی کوشش کی جائے - اور علاوہ ازیں چارہ نہیں کہ اول اول غیر زبانوں کے اچھے ڈراموں کے اچھے ترجمے کئے جائیں چنانچہ فن کو سمجھنے والے زباں داں ادیبوں کی تلاش ہوئی جو کم از کم غیر زبانوں کے ڈراموں کو بجنسہ تمام خوبیوں کے ساتھ اپنی زبان میں بدل سکیں - ڈرامانگاروں نے ڈائرکٹروں کو سہارا دیا اور ڈائرکٹروں نے ڈرامانگاروں کو اور دونوں دست بدست ترقی کے زینہ پر چڑھنے لگے - دونوں نے فن کو اپنانا شروع کیا - ادھر ہیملٹ بنا ادھر کپال کنڈلا - ادھر باغبان تیار ہوا ادھر باغی سپاہی اور فلمی دنیا کی فضا ہی بالکل بدل گئی -

ڈرامانگاروں اور ڈائرکٹروں کا باہم اتفاق اور کامیابی نہ محض ان کے ہم مشرب اشخاص کے لئے باعث ترغیب ہوا بلکہ اس نے ایک حد تک سامعین کا مذاق بدل دیا - ان کو بتا دیا کہ فلم صرف دفع الوقتی کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ بھی ایک صنف ادب ہے - ان میں باریکیوں اور خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت کی بنیاد ڈال دی - چنانچہ اب وہ ذی علم اشخاص جو اب تک ڈرامانگاری کو مذاق یا بیرون ادب خیال کرتے تھے اس طرف راغب ہوئے اور ان اشخاص نے بھی جو اس میں ناکامیاب ہو کر بیٹھ رہے تھے پھر قلم اٹھایا - اور اصولی خوبیوں پر توجہ دینی شروع کی اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا جس نے دوسری اقوام کو ترقی کی راہ دکھائی - چنانچہ ہر چند کہ یہ درست ہے کہ ہماری فلمی دنیا ابھی عالم طفلی سے گذر رہی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کل کی بنی ہوئی فلموں چترلیکھا اور پکار نے اپنی عمد گی خود منوا لی اور آنے والی دنیا بھی جب دیکھے گی تعریف لکھے بغیر نہیں رہ سکے گی - ہر عمدہ اور شاندار کامیابی آہستہ آہستہ ہوا کرتی ہے اس لئے اگر ہماری فلم سازی نے اپنی فنی حیثیت منوانے میں وقت لیا تو اسے لینا چاہیے تھا لیکن اس کامیابی کا سہرا ڈرامانگار اور ڈائرکٹر دونوں کے سر ساتھ ساتھ بندھا -

آج ہمارے ڈرامانگاروں اور ڈائرکٹروں کو خوش ضرور ہونا چاہیے مگر خاموش ہو کر نہیں بیٹھ جانا چاہیے - دونوں کو اپنی اپنی قابلیت اور محنت سے ترقی کی رفتار گھٹنے نہیں دینی چاہیے - ان کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ جلد از جلد ہماری فلمیں ڈرامائی اصولوں کو اپنا لیں اور تماشہ کی صف سے نکل کر حقیقت نمائی کا اونیٰ درجہ حاصل کر لیں - اور ہماری کل آنے والی فلمیں موضوع اور پلاٹ کی دلچسپی - کردار اور سیرت نگاری - اور برمحل و پرزور مکالموں کی خوبیوں سے پر ہوں -

ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ اب ہمارے موجودہ ڈائرکٹر و فلم کمپنیوں کے منتظم فلموں کا معاوضہ بڑھانے میں پوری کاوشوں سے کام لے رہے ہیں - قابل ادیبوں سے ترجموں میں مدد لی جا رہی ہے اور عمدہ ڈراموں کو فلمانے کی کوشش ہو رہی ہے - لیکن ذرا سی دیر کو بھی اس خیال سے نہ ہٹنا چاہئے کہ اچھے ڈائرکٹر اچھے ڈرامانگاروں کے بغیر یا اچھے ڈرامانگار اچھے ڈائرکٹروں کے بغیر ساتھ دئے کامیاب ہو سکتے ہیں - دونوں یک رائے ہو کر محنت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری فلم سازی بہت جلد دوسری ترقی یافتہ اقوام کے ہم پلہ نہ ہو جائے - ضرورت اس کی ہے کہ فلم کمپنیوں کے منتظم - قابل ڈائرکٹروں یا ادیبوں - آرٹسٹوں اور فوٹوگرافروں کو دوسرے ممالک میں بھیجیں تاکہ وہ کہنہ مشق کمپنیوں کا معائنہ کریں اور فلم سازی کی فنی حیثیت کا مطالعہ کریں - اور واپس آ کر اپنی قابلیت کا اسکرین پر مظاہرہ کریں اور پھر اپنی کامیابی سے ان کی کامیابی کا مقابلہ کریں - یہ مانا کہ ہمیں وہ کامیابی فوراً حاصل نہیں ہو سکتی لیکن کوشش کی جائے تو آج نہیں کل ہماری محنتیں ضرور پھل لائیں گی -

ہر دور میں ہر فن کی کامیابی ایک حد تک اس دور کے رؤسا کی قدر پرندی کی وجہ سے ہوا کرتی ہے - ہمارے ملک کا کونہ کونہ ذی عزت اور بامذاق اشخاص سے بھرا ہوا ہے - اگر وہ فلمی دنیا میں دلچسپی لینا شروع کریں جیسا کہ اور ملکوں میں رواج ہے تو ہماری فلم سازی کا معیار دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگے - اگر سالانہ مقابلہ ہوا کرے اور ادبی و فنی لحاظ سے جو فلمیں اول اور دوم آیا کریں ان میں محنت کرنے والوں کو انعام وغیرہ دیا جانے لگے تو یہ نہ محض ایک دلچسپ مشغلہ بن جائے بلکہ ہمارا ملک اس فن کی ترقی میں چند ہی دنوں میں اور ممالک سے پیچھے نہ رہے گا -

اگرچہ ہمارے معیاری فلمی رسالے فلم کے مختلف پہلوؤں پر برابر مضامین شائع کر رہے ہیں لیکن انہیں یہ بھی چاہئے کہ وہ سامعین کو ہر اچھی فلم پر بے دھڑک تنقید لکھنے کی ترغیب دیں اور ان کے تنقیدی مضامین اپنے رسالوں میں چھاپنے کا مستقل انتظام کریں تاکہ دیکھنے والوں میں بھی فنی خوبیوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو - ہمارے ادبی رسالے بھی اگر ڈرامانگاری پر اچھے مضامین شائع کریں تو ایک طرف تو ادب کی خدمت ہو گی اور دوسری طرف عوام میں ڈرامے کی باریکیاں سمجھنے کا مادہ پیدا ہو گا - اس طرح اگر ادبی اور فلمی رسالے دست بدست کوشش کریں تو بہت جلد ہمارے ملک میں اچھے ڈرامانگار پیدا ہو سکتے ہیں اور یہ صنف ادب بھی جو اب تک تاریکی میں رہی اور زیادہ دن تاریکی میں نہ رہ سکے گی -

بازی گر

فیچر

افراد

(۱) بازی گر (۲) رمضانی - ایک تماش بین -

(ڈگڈگی کی آواز سے شروع کیا جائے)

بازی گر:- حضرات! اب میں آپ کو تاش کے دو چار دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں جس سے آپ کی عقل دنگ رہجائیگی۔ آپنے شعبدے تو بہت دیکھے ہونگے۔ لیکن ہاتھ کی جو صفائی میں پیش کرتا ہوں۔ اس کی مثال مشکل ہے۔ (ڈگڈگی کی آواز) اچھا۔ آپ حضرات ایک ایک قدم پیچھے ہٹ جائیں۔ (مختلف قدموں کی آواز) ہے کوئی نوجوان جو میرے ساتھ کھیل میں حصہ لے۔ تم آجاؤ میاں۔ کالی ٹوپی والے! اچھا کیا نام ہے تمہارا؟

رمضانی:- رمضانی۔

بازی گر:- بہت خوب! کیا کام کرتے ہو میاں رمضانی؟

رمضانی:- کام کاج کیسا۔ ابھی تو چوتھی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ مدرسے کی ہوا کھاتے ہیں۔

بازی گر:- کیا کہنے۔ بہت ہونہار معلوم ہوتے ہو۔ اتنی زیادہ عمر اور چوتھی جماعت۔ خیر۔ ذرا دیکھو تو میرے ہاتھ میں کیا ہے؟

رمضانی:- تاش کی گڈی ہے۔

بازی گر:- تاش کے پتے پہچانتے ہو؟

رمضانی:- اچھی طرح۔

بازی گر:- چڑی تن کا غلام دیکھا ہے۔

رمضانی:- جی ہاں آپ کھڑے تو ہیں میرے سامنے۔

(ناظرین کا قہقہہ)

بازی گر:- نہایت مرد معقول ہو۔ (تاش پھینٹنے کی آواز) اچھا اب اس گڈی میں سے ایک پتا لے لو۔

رمضانی:- معاف کیجئے۔ میرے پاس اپنی بہت سی گڈیاں موجود ہیں مجھے کسی اور پتے کی ضرورت نہیں ہے۔

بازی گر:- اوہو۔ میرا مطلب ہے کہ ایک پتا نکال کر دیکھو اور گڈی میں رکھ دو۔ (تاش پھینٹنے کی آواز)

رمضانی:- آخر اس سے فائدہ۔ یہ بھی کوئی کمال کی بات ہے۔

بازی گر:- کیوں نہیں۔ تم ایسا کرو تو سہی۔ میں فوراً بتادونگا کہ تم نے کون سا پتا نکالا تھا۔

رمضانی:- اچھا تمہاری مرضی۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ کس رنگ کا پتا نکالوں۔

بازی گر:- (ڈگڈگی بجاکر) جو تمہاری مرضی ہو۔ کسی رنگ کا کوئی پتا۔

رمضانی:- پان کی ببیا نکال لوں۔ یا اینٹ کا بادشاہ؟

بازی گر:- جو تمہیں پسند ہو۔ مجھ سے مت پوچھو۔

رمضانی:- اچھا تو یہ تاش کی گڈی ذرا مجھکو دیدو۔ مجھے حکم کا یکہ بہت پسند ہے۔ تین پتی میں سب سے پہلی چال اسی کی ہوتی ہے۔

بازی گر:- پھر وہی غلطی۔ (تاش پھینٹنے کی آواز) میرا مطلب ہے کہ پتا چھپا کر اس طرح نکالو۔ کہ میں اسے نہ دیکھ سکوں۔

رمضانی:- اچھا تو تم آنکھیں بند کر لو۔ میں ایک پتا نکال کر پھر گڈی میں رکھ دوں گا۔

بازی گر:- ہاں یہ ٹھیک ہے۔ (تاش پھینٹتے ہوئے) لو صرف ایک پتا نکالنا۔

رمضانی:- جی نکال لیا۔ اور یہ لو۔ رکھ بھی دیا۔

بازی گر:- اچھا میاں رمضانی۔ ذرا داہنی ہتھیلی منہ کے سامنے تو پھیلاؤ۔ اور زور سے کہو۔ "میرے پتے آجا"

رمضانی:- یہ بعد میں کہوں گا۔ پہلے سب پتوں کو پھینٹ لو کیونکہ پھینٹے بغیر بتانا آسان ہے۔ میرا پتا سب سے اوپر رکھا ہوا ہے۔

بازی گر:- ارے رے رے۔ غضب کرتے ہو یار۔ میں نے کہا تھا کہ گڈی کے بیچ میں کہیں رکھ دو۔

رمضانی:- اچھا پھر سہی۔ (چند قدموں کی ایسی آواز گویا لوگ چلا جانا چاہتے ہیں)

بازی گر:- اجی صاحب! ذرا ٹھہریئے۔ اس چھوکرے نے تو میرے کھیل کا ستیاناس کر دیا۔ واللہ ایسے ایسے کمالات دکھاؤنگا۔ کہ آپ حیران رہ جائینگے۔ (ڈگڈگی بجاکر تاش پھینٹتا ہے) لو میاں رمضانی! دیر نہ کرو۔ جلدی سے ایک پتا نکال لو۔

رمضانی:- آنکھیں بند کر دو۔ ہاں ٹھیک۔ ایک۔ دو۔ تین۔ کھول لو اپنی آنکھیں۔

بازی گر:- بس اب ہاتھ پھیلاؤ۔ اور زور سے اپنے پتے کو آواز دو۔

رمضانی:- آجا میری اینٹ کی نہی۔ آجا۔

(لوگوں کا قہقہہ)

بازی گر:- لاحول ولا۔ نرے کاٹھ کے الو ہو۔ پتے کا نام کیوں بتادیا

رمضانی:- تم ہی نے تو کہا تھا کہ اپنے پتے کو آواز دو۔ بھلا نام لئے بغیر کس طرح آواز دی جاسکتی تھی۔

بازی گر:- تم یوں کہتے کہ میرے پتے آجا۔ (لوگوں کے قدموں کی آواز) اجی قبلہ! ذرا ٹھہریئے۔

رمضانی:- اچھا۔ تم کہتے ہو تو اسی طرح آواز دے لونگا۔

بازی گر:- لو جلدی سے نکالو پتا۔ اور اب کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا۔ خدا کی قسم! عجیب ہی احمق انسان سے پالا پڑا ہے۔

رمضانی:- اس میں کیا شک ہے لیکن پھر بھی تم سے کم احمق ہوں۔

(لوگوں کا قہقہہ)

بازی گر:- اچھا اب باتیں نہ بناؤ۔ جلدی سے پتا نکال لو۔

رمضانی:- بہت خوب آنکھیں بند کرو۔ دیکھنا مت۔ ایک دو۔ تین۔ بس کھول لو آنکھیں۔

بازی گر:- (ڈگڈگی بجاکر) غور کیجئے مہربان۔ میری آنکھیں بند تھیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ کون سا پتا نکالا۔ اور گڈی میں کس جگہ رکھا گیا لیکن پھر بھی.........

رمضانی:- اوہوں۔ معاف کرنا بھائی۔ تمہارے جلدی مچانے سے میں اسقدر گھبرایا کہ اس دفعہ پتا رکھنا بھول گیا۔ یہ دیکھو وہ میرے ہاتھ میں موجود ہے۔

بازی گر:- ہت تمہاری ایسی تیسی۔ لاؤ۔ اب جلدی سے رکھ دو۔ (وقفہ پھر تاش پھینٹنے کی آواز) خبردار۔ اب کوئی حماقت نہ کرنا اور جبتک میں نہ کہوں پتے کا نام نہ بتانا۔

رمضانی:- پتے کا نام غضب خدا کا۔ وہ تو میں نے جوں کا توں رکھدیا اسے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ بتاؤنگا کیا خاک۔

(لوگ چلنے شروع ہوجاتے ہیں۔ قدموں کی چاپ)

بازی گر:- بھائیوں۔ ذرا ٹھہرو۔ ایک منٹ اور ٹھہر جاؤ۔ (مایوسی کے ساتھ) نہیں ٹھہرتے۔ اچھا تمہاری مرضی چلے جاؤ۔ اور تو بھی بھاگ جا منحوس تو اب کیوں کھڑا ہے۔ نہ تو میری نظروں کے سامنے سے اچھا خاصہ رنگ جم گیا تھا۔ وصلی یا دولا ضرور جمع ہوجاتا۔ کم بخت تو نے میری روزی خاک میں ملادی۔ اب کیا تیری بوٹیاں چبا کر اپنا پیٹ بھروں گا۔

رمضانی:- بھیا! قصور خود تمہارا ہے بھلا تاش کا کھیل کس طرح دلچسپ ہوسکتا ہے۔ میری بات مانو۔ تو بندریا کر دو بندر۔ بہت کچھ کماؤ گے۔ یہ کام میں نے بہت عرصہ کیا ہے۔ مجھے اپنا شریک بنالو۔ تمہارے ساتھ دونوں پیٹ بھر لیں۔ مانگ کھائیں ہم ہاں ہم تم ڈگڈگی بجاؤ تو بندریا ہم (ڈگڈگی کی آواز)

(ختم)

فضل حق قریشی

جرمن قوم کی حالت

پریم چند کھنہ

میں حال ہی میں جرمنی سے واپس آیا ہوں۔ وہاں میں نے قریباً دو ہفتے انگریزی اور برلن حلقوں میں گذارے۔ سب سے پہلا اور اہم ترین نقش جو میرے دل پر جما شہروں کی بربادی اور تباہی کا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس خوبی اور حسن اسلوبی سے رائل ایرفورس اور امریکن ایرفورس نے اپنے کام کو سرانجام دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریباً تمام بڑے بڑے شہروں کی کم و بیش دو تہائی عمارتیں یا تو بالکل برباد کر دی گئیں یا ان کو اس قدر نقصان پہنچایا گیا کہ وہ بالکل قابل رہائش نہیں رہیں۔ باقیماندہ ایک تہائی عمارتوں میں سے بہت سی خراب ہو چکی ہیں جن کی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور جن کی چھتوں پر سے پانی ٹپکتا ہے۔

شہروں کی اس تباہی نے (اور انگریزی علاقہ تو زیادہ تر شہری ہے) ایک خوفناک رہائشی مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر کہیں رہائشی مکان ہیں بھی تو وہاں یہ حالت ہے کہ جس مکان میں پہلے ایک کنبہ رہتا تھا اب وہاں تین کنبے رہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو تو عام طور پر بڑے بڑے شہروں میں کوئی جائے رہائش ملتی نہیں۔ ایک ایک کمرہ میں یا ایک ایک چھپر کے نیچے دس دس آدمی رہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض ان ہوائی حملوں سے بچانے والے ان حجروں میں مقیم ہیں جو ہمارے ہوائی حملوں سے محفوظ رہ گئیں زمین دوز گڑھوں میں رہنا گویا ایک قسم کا قبر میں رہنا ہے۔ جس میں نہ تو روشنی داخل ہو سکتی ہے اور جس میں نہ ہی سوائے دیواری تختے کے اور کوئی آراستگی کا سامان ہوتا ہے۔ اور جس میں نہ ہی کھانے پکانے کی کوئی سہولیت مہیا ہوتی ہے۔ اس کے باوجود آج کئی مہینوں سے لوگ اس طریقہ سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کو ایسی حالت میں نہ جانے کب تک رہنا ہو گا۔

اس خوفناک رہائشی مسئلہ کے ساتھ ساتھ زندگی کی دوسری ضروریات، مثلاً خوراک، کوئلہ اور کپڑا، کی بھی کمی ہے۔ قدرتی طور پر خوراک کی ہر ایک چیز کا راشن ہو چکا ہے۔ اس راشن بندی کی بدولت خوراک اس مقدار سے جو ہم برطانیہ میں صحت کے لئے لازمی خیال کرتے ہیں نصف بھی نہیں ملتی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ چربی، گوشت، چینی اور پنیر کا راشن جو برطانیہ میں ایک ہفتہ کے لئے کم سمجھا جاتا ہے۔ ایک مہینہ کے لئے اکتفا کرے۔ حالات میں بہتری ہونے کی امید تو ہے لیکن جس کو ہم کافی اور تسلی بخش بہتری کہہ سکیں وہ ابھی بہت دور ہے۔

پچھلے جاڑے میں گھریلو استعمال کے لئے کوئلہ کا راشن نہ تھا اور موجودہ تجاویز کی بنا پر نہ ہی اگلے جاڑے میں راشن ہو گا۔ جرمنی ایک سرد ملک ہے۔ اور شہروں میں ایسے مکانات ہیں جن میں لوگ رہتے ہیں کافی عرصہ تک شیشہ نہ لگ سکے گا۔ عملی طور پر نہ صرف نئے کپڑے نہیں بن رہے بلکہ پرانے کپڑے پھٹے جاتے ہیں۔ اگلے جاڑے میں یا تو بہت سے بچوں کو ننگے پاؤں برف میں سے گذر کر اسکول جانا ہو گا یا اسکول چھوڑنا ہو گا۔ باقی ہر ایک چیز مثلاً صابن اور دوا دارو کی چیزیں نہایت کم مقدار میں میسّر ہوتی ہیں۔

بے شک کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف راشن شدہ خوراک پر گذارہ نہیں کرتے اور وہ کر بھی کس طرح سکتے ہیں۔ انگریزی علاقہ میں تو قریب قریب ہر ایک چیز کی کمی ہے۔ گرد و نواح کے دیہاتوں میں قدرتی طور پر خوراک آسانی سے اور زیادہ مقدار میں ملتی ہے۔ شہروں سے کارکنوں کی غیر حاضری کا باعث ایک یہ بھی ہے کہ وہ ہفتہ میں دو تین روز خوراک کی تلاش میں دیہات میں پھرتے ہیں لیکن ہر ایک شخص کے لئے یہ غیر ممکن ہے۔ بعض شخص خاصکر تن تنہا ضعیف آدمی شہروں میں بھوکے مرتے ہیں۔ دیہاتوں میں جہاں خوراک زیادہ ملتی ہے وہاں رہائشی مکان بھی تباہ نہیں ہوئے۔ لیکن ایک دیگر سبب کی بنا پر وہاں بھی مکانوں کی قلت ہے۔ انگریزی علاقہ کی معمولی آبادی پناہ گزیں اور دوسرے ممالک سے منتقل شدہ اشخاص کی درآمد کی وجہ سے پہلے کی نسبت دوگنی ہو گئی ہے۔ پناہ گزینوں سے مراد وہ جرمن لوگ ہیں جو جرمنی کے دیگر حصوں سے یا جرمنی کے پڑوسی ممالک مثلاً پولینڈ اور چیکوسلاواکیہ سے یا تو بھاگ کر آئے ہوئے ہیں یا وہاں سے نکالے گئے ہیں منتقل شدہ سے ایسے لوگ مراد ہیں جو جرمن قوم سے تعلق نہیں رکھتے لیکن کسی وجہ سے اپنے گھروں کو لوٹ نہیں سکتے۔ ایسے پناہ گزیں اشخاص لاکھوں کی تعداد میں اپنے گھروں سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور انھوں نے جرمنی کی اپنی حالت کو اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے۔

اگر آج کوئی جرمنی کو جا کر دیکھے تو اسے سخت صدمہ ہو گا۔ آج جرمنی میں ہر طرف مصیبت ہی مصیبت نظر آتی ہے۔ کیا جسمانی ضروریات کی کمی۔ کیا بھوک اور سردی اور کیا رہائشی مکانوں کی قلت۔ ایسی بیچارگی کی حالت چھائی ہوئی ہے کہ کیا بچے اور کیا بوڑھے سب عاجز ہیں۔

بیکاری عام ہے۔ سائنسدان اور فنکار یا تو اپنے وطن کو واپس جا نہیں سکتے یا جانے سے ڈرتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہونہار نوجوان بھی ہیں جن کے لئے یونیورسٹی کے دروازے بند ہو گئے ہیں کیونکہ وہ لڑکپن میں نازیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے ہی جانکاہ نظارے اور بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہزاروں لاکھوں کنبے ایسے ہیں جن کے افراد ایک دوسرے سے بچھڑ گئے ہیں، لاکھوں ایسے ہیں جن کی عورتیں اور مائیں جنگی قیدی ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں ایسے خاوند اور بیویاں ہیں جو جرمنی، پولینڈ، یوگوسلویا اور بالٹک ریاستوں سے تعلق رکھتی ہیں اور جنہوں نے سالوں سے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں اور نہ ہی وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کے ساتھی زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

مجھے اس بات کا کامل احساس ہوا کہ اپنا کام کرنے سے کس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے جب میری ملاقات لنغوائی کیمپ میں خوش اور خرم لوگوں سے ہوئی۔ دو ڈاکٹر اور ایک نرس اپنے ساتھیوں کی صحت کے نگراں تھے۔ وہ ایک نوزادہ بچہ کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ بچہ ایک چادر میں جو ہاتھ سے کاڑھی ہوئی تھی لیٹا ہوا تھا۔ خانگی محبت سے جو خوشی پیدا ہوتی ہے مجھے اس کا احساس تب ہوا جب میں دو ہیمبرگ کوٹھریوں سے جن میں اکیلی اکیلی عورتیں نہایت بری حالت میں رہتی تھیں۔ ایک تیسری کوٹھری میں گیا جہاں خاوند اور بیوی اکھٹے رہ رہے تھے۔ وہاں ہم نے ایک نئی یعنی انسانی فضا پائی جس نے ایک منکوحہ جوڑے سے گفتگو کی جن کے گھر کی جسامت صرف اٹھ مکعب فٹ تھی اور جس میں نہ کوئی کھڑکی تھی نہ کوئی سامان۔ وہ رات کا چوکیدار تو دیواری تختے پر آرام کر رہا تھا اور اس کی بیوی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ پوچھنے پر دونوں کہنے لگے کہ ہم گذارہ کر رہے ہیں۔

اگرچہ جرمنی کی سیر ان دنوں ایک جانکاہ تجربہ ہے تاہم ملک (جرمنی) کی حالت بالکل مایوس کن نہیں ہے۔ حالات اس بات کے شاہد ہیں کہ انسانی فطرت کس قدر حیرت ناک تحمل اور برداشت کی طاقت رکھتی ہے۔ ایک انگریز میڈیکل افیسر نے مجھے بتلایا کہ اگرچہ تپ دق کے پھیل جانے سے خطرہ کے آثار نمایاں ہو گئے ہیں، لیکن جرمنوں کی صحت اچھی ہے، گو یہ بات بظاہر غیر معقول سی نظر آتی ہے، وہ غیر معمولی طور پر صاف ستھری اور باقاعدگی پسند قوم ہے، تمام یونیورسٹیوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے اور وہ طالب علموں سے بھرپور ہیں۔ کتابوں کی مانگ ویسی ہی شدید ہے جیسی خوراک کی، میں نے سامعین کے ہجوم دیکھے جو میری معاشرتی سلامتی اور مستقل روزگار کے عنوان پر تھی،

سننے کے بیحد شائق تھے۔ میرے سے انھوں نے بہت سے معقول سوال کئے۔

ان موجودہ جانکاہ حالات کے پس پردہ ہٹلر کی بارہ سالہ حکومت کو جس میں سے وہ بچ نکلے منتظر ہے۔ اگر آپ کسی تجارتی یونین کے لیڈر سے بات کریں تو وہ آپ کو تبلائے گا کہ اگرچہ ظاہر طور پر صحتمند نظر آتا ہے دراصل اس کی صحت اس قدر بگڑ گئی ہے کہ سدھر نہیں سکتی۔ کیونکہ سیاسی قید خانے میں لوگوں نے اس کے جسم کو خوب کچلا تھا۔ اکثر کیمپ میں عورت بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایک کمرہ میں چار چار کنبے رہتے ہیں دو دو پردے برائے نام لگے ہوئے ہیں، اس سے پوچھا کہ تمہارا خاوند کہاں ہے تو جواب ملا کہ اب تو میرے پاس ہے۔ لیکن تین سال تک ایک ممنوع اخبار کو گھر میں رکھنے کی وجہ سے ہٹلر نے اس کو تین سال کی سزائے قید دی۔ ایک کیمپ میں ایک عورت بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس سے پوچھا کہ یہ بچے تمہارے ہیں تو اس نے جواب دیا۔ نہیں۔ میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔ میرا خاوند ایک انجینیر تھا جس نے نازی پارٹی میں ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہماری شادی کے بعد ہی وہ اس کو سیاسی قید خانے میں لے گئے۔ اور تین مہینہ کے بعد مجھے بذریعہ ایک خط کے اس کی موت کی خبر ملی۔ کیا نازیوں کے ستائے ہوئے کیا دوسرے، سب اس قسم کی مصیبت میں گرفتار ہیں۔

انگریزی علاقہ کی حالت بہت تشویشناک ہے۔ یہ اس لئے کہ اگرچہ آج لڑائی کو ختم ہوئے پندرہ ماہ ہو چکے ہیں لیکن بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ اس حالت کو بہتر بنانے کے لئے میں یہاں کوئی تفصیلی تجویز قلمبند نہیں کر سکتا جس سے زیادہ مقدار میں کوئلہ، خوراک اور دیگر روزمرہ کے استعمال کا سامان مل سکے، رہائش کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے، دنیا کے باقی حصوں کے ساتھ ذرائع آمدورفت مہیا ہو سکیں اور مصیبت زدہ لوگ باقاعدہ زندگی بسر کر سکیں۔ لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں چند اخلاقی نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں پہلا اخلاقی نتیجہ شہروں کی مکمل تباہی سے پیدا ہوتا ہے۔ گھر بھار، دوکانیں، اسکول اگرچہ گھر، ہسپتال، لائبریریاں، تاریخی اونچی عمارتیں جو ایک زیادہ مہذب زمانہ کی یادگار ہیں سب ٹوٹی پھوٹی مٹی کا ڈھیر بنی پڑی ہیں۔ یہ اچھا ہوا کہ جرمنوں نے جنہوں نے دوسرے ممالک کو اپنی وحشیانہ جنگ کا شکار بنایا خود اپنے ہی ملک میں موجودہ زمانے کی جنگ کے نتائج کا مشاہدہ کیا۔ چند مجرمی لیڈروں کے ماسوا تمام جرمنوں کو اسے انصاف کی رو سے کافی سزا سمجھنی چاہیئے۔ ہمارا فرض ہے کہ اب ہم سزا کا خیال چھوڑ کر ان کی بہتری کے متعلق سوچیں۔

دوسرا اخلاقی نتیجہ، ہم اسے پسند کریں یا ناپسند، یہ ہے کہ ہم کو چاہئے کہ جرمنی کے انگریزی علاقہ کو بلحاظ اقتصادی زندگی کے کامیاب بنایا جائے۔ ہم اس علاقہ سے ہٹ نہیں سکتے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ عمدہ نتائج جس کے لئے ہم نے لڑائی لڑی بحال رہیں تو ہمیں وہاں ٹھہرنا ہوگا۔ اور یقیناً ایسا بندوبست کرنا ہوگا جس سے کہ اہل جرمنی دوبارہ لڑائی کا جھنڈا بلند نہ کرسکیں۔ اور جب تک کہ وہ، اور باقی قومیں بھی لڑائی کا خیال ہی نہ چھوڑ دیں ہم جرمنی میں اپنے موجودہ پروگرام پر جس کا مدعا جرمنی کو مفلس کر دینے کا ہے بغیر کافی خرچ کرنے کے قائم نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ دو کروڑ جرمن ہمارے پنشن خوار بنے رہیں، بھوکے مریں اور ہم سے نفرت کرتے رہیں تو ہمیں چاہئے کہ جرمنی کے برطانوی علاقے کی درآمدی پیداوار بڑھانے کی اتنی ہی کوشش کریں جتنی خود برطانیہ کی۔

تیسرا اخلاقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے علاقہ کو نفسیاتی طور پر کامیاب بنائیں، وہاں کی آبادی کو امن چین کی زندگی بسر کرنے کا موقع دیں اور ان کو دوست بنانے کی کوشش کریں۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں پوٹسڈم کے مقام پر خفگی اور گھبراہٹ کی وجہ سے ۱۹۴۱ء کے ایٹلانٹک چارٹر کو خیرباد کہا گیا۔ اس چارٹر میں ہمارے نصب العین یہ قرار دئے گئے تھے: ہر ایک قوم کے اندر مزدوروں کے حالات بہتر بنائے جائیں، اقتصادی ترقی اور معاشرتی سلامتی کے حالات پیدا کئے جائیں، تمام ملک، فاتح، مفتوح دونوں تجارتی لحاظ سے یکساں خیال کئے جاویں۔ ہر ایک قوم کو اس کی اقتصادی بہبودی کی خاطر ان اشیا کی ضرورت ہے، مساوی پیمانہ پر مہیا کی جائے۔ اس کے برخلاف پاٹسڈم میں ہم نے جرمنی کے زندگی کے معیار کو کم، اس کی صنعت کو تباہ کرنے اور اس کی تجارت کو چھین لینے کا تہیہ کیا۔ جب سے جرمنی نے ہتھیار ڈالے ہیں، اتحادیوں کے عمل نے ایٹلانٹک چارٹر کو ریاکاری کا نمونہ بنا دیا ہے۔

جرمن لوگوں نے اس بات کا ثبوت دے دیا ہے کہ ان میں کچھ خوفناک صفات ہیں۔ لیکن ان میں صنعت و حرفت، حسن انتظام اور خانگی محبت کی اعلیٰ صفات بھی موجود ہیں۔ علم موسیقی اور سائنس میں وہ لاثانی ہیں۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی خوفناک صفات کو نظر انداز کریں۔ ہمیں نازیوں کے ہاتھوں ستم زدہ لوگوں کو نہ بھولنا چاہئے اور دوبارہ ان کو اپنی وحشیانہ ظلم اور فریب کو عمل میں لانے کا موقع نہ دینا چاہئے۔

انجام کار برائی کو دور کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس کی بجائے نیکی کی جائے، انسانی مروت سے ظلم کی آگ کو بجھایا جائے مطلق العنانی کے بجائے جمہوریت قائم کی جائے اور ریاکاری کو دور کرنے کے لئے خودداری اور عزت کا مادہ پیدا کیا جائے۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ بچوں کو بھوکا رکھنے اور بوڑھوں کو سردی میں مارنے سے انسانیت کا سبق نہیں سکھایا جاسکتا، نہ ہی سختی سے جمہوریت کا ریاکاری کے طریقوں کو عمل میں لاکر ت کے اصول سکھانا ممکن ہے۔

آؤ ہم تمام اتحادیوں کو ایک دفعہ پھر اس بات پر آمادہ کریں کہ پاٹسڈم کے معاہدہ کو خیرباد کریں اور ایٹلانٹک چارٹر کے اصولوں کو جرمنی سے سلوک کرتے وقت استعمال کریں۔ اگر اس کوشش میں کامیابی نہ ہو تو ہمیں چاہئے کہ کم از کم جرمنی کے انگریزی علاقہ کو ایٹلانٹک چارٹر اور جمہوریت، رواداری، انصاف اور کفایت کے برطانوی نظریوں کے مطابق منظم کرنے کا فیصلہ کریں۔

غزل

خمار دہلوی

میں خود بھی سراپا جلوہ ہوں جلوؤں کو فقط دیکھا ہی نہیں
جو پھونک دے میری ہستی کو ایسا تو کوئی جلوا ہی... نہیں

احساس نظر کے ساتھ مجھے احساس دل بھی حاصل ہے
ہر جلوہ ہے حسن ذات ترا مستور بھی ہے پیدا ہی نہیں

ان مدبھری آنکھوں سے دل کا انجام تصادم اے توبہ
اس طرح لٹی دل کی بستی جیسے کہ کبھی کچھ تھا ہی نہیں

حیرانی چشم شوق بھی شاید حسن میں تیرے شامل ہے
ہر جلوہ ہے مثل آئینہ حیراں تو نے مجھے دیکھا ہی نہیں

ہر چند نگاہیں حیراں ہیں وہ حسن تجلی عام تو ہے
اس دل کی بدولت ذوق نظر مشہور بھی ہے رسوا ہی نہیں

احساس طلب کا ہوش کسے، کہنے کو طلب تو باقی ہے
کیا خاک ملے گا تیرا پتہ، اپنا تو پتہ ملتا ہی نہیں

اس دور سے پہلے بے کیفی بھی کتنی سرور آگیں ہے خمار
وہ درد نہ جانے کیا ہوگا جو درد ابھی پیدا ہی نہیں

نقد و نظر

دکھیا سنسار

مصنف: - جناب عشرت رحمانی - ناشر - الہ آباد بلڈنگ ہاؤس - الہ آباد - ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۲۱۶ صفحات - مجلد - قیمت ڈھائی روپے - عشرت صاحب آل انڈیا ریڈیو میں عرصہ دراز سے ڈرامہ انچارج ہیں اور چونکہ اس محکمہ میں آنے سے پہلے بھی ایک اچھے ادیب تھے، اس لئے ریڈیو ڈرامے کے ضمن میں ان کی تخلیقات کا ادبی اور فنی معیار اپنے ہمعصروں میں سب سے زیادہ بلند ہے۔ پیش نظر مجموعے میں ان کے چھ ڈرامے شامل ہیں جو حزنیہ ہیں اور مزاحیہ بھی۔ زبان اور عمل کے لحاظ سے فطری عنصر سب میں نمایاں ہے یعنی افراد تمثیل کے اقوال و افعال ان کے صحیح ماحول اور کردار کی ترجمانی کرتے ہیں "دکھیا سنسار" اور "پریم دان" ٹیگور کے ڈراموں سے ماخوذ ہیں لیکن ان میں بھی ان کا انفرادی رنگ اپنی جھلک دکھا رہا ہے "منکہ ایک مصنف" پڑھ کر گمان ہوتا ہے کہ یہ عشرت صاحب کی آپ بیتی ہی نہ ہو۔ اسے ختم کر لینے کے بعد بھی "بیوی کا یہ مسلسل مطالبہ کہ گھر کے خرچ کے لئے ستر روپے دلواؤ، دماغ کے پردے پر گھومتا رہتا ہے۔ زبان و بیان میں اردو ہندی کے مناسب امتزاج نے بڑی حلاوت پیدا کر دی ہے۔ کتابت کی غلطیاں بہت ہیں۔ امید ہے کہ ناشران کتب اگلے ایڈیشن میں اس کا لحاظ رکھیں گے۔

دیس سے باہر

مصنف: - جناب آغا محمد اشرف - ناشر - شیخ غلام علی اینڈ سنز کتاب منزل لاہور - ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۳۲۲ صفحات - مجلد - قیمت ڈھائی روپے - "لندن سے آداب عرض" "اڈ بیچوں کا لندن" پیش کر چکنے کے بعد اب آغا صاحب نے یہ تیسرا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اسے موصوف کی یادداشت یا ایک قسم کی ڈائری کہا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی سمندر پار ملکوں کے کوائف جمع ہیں۔ آٹھ نو سال ہندوستان سے باہر رہ کر انھوں نے سیر و سیاحت کا لطف خود ہی نہیں اٹھایا بلکہ اپنے تاثرات کو قلمبند کر کے دوسروں کو بھی استفادہ کا موقع دیا ہے۔ انگلستان والے حصے کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دیس سے باہر اردو زبان کس قدر رائج اور مقبول ہے اور انگلستان کے مستشرقین نے اس کی ترقی کے لئے کیسی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں "لندن کی ادبی زندگی" کا جائزہ، نیز جان گلکرسٹ اور جارج گریرسن پر تحقیقی مقالے بہت قابل قدر ہیں۔ چند مضامین میں زمانہ جنگ کے بعض ایسے حالات شامل ہیں جن کا مطالعہ کسی دوسری جگہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب بڑی مفید ہے۔ ایران والے حصے میں کئی مضمون تاریخی اور سیاسی اعتبار سے دلچسپ اور مفید ہیں۔ ایک مقالے میں حافظ کے مزار پر شراب لنڈھانے کا واقعہ بہت ہی پر لطف ہے "کچھ بھولی بسری باتیں" موضوع کے اعتبار سے اس میں نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

BENGAL LAMENTING

مصنفہ: - محترمہ فریڈا بیدی - ناشر: - لائن پریس - ہسپتال روڈ لاہور - ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۰۸ صفحات - مجلد - انگریزی زبان۔ قیمت تین روپے۔ اس کتاب میں اس قحط عظیم کے تفصیلی حالات اور کچھ اعداد و شمار درج ہیں جو ۱۹۴۲ء کے آخر میں بلائے ناگہانی کی صورت میں سارے مشرقی ہندوستان پر نازل ہوا تھا۔ محترمہ بیدی نے بنگال کے دیہاتوں میں جا جا کر صورت حالات کا جائزہ لیا اور جو باتیں اپنے مشاہدے میں نہ آ سکتی تھیں وہ دوسروں سے پوچھ پوچھ کر یادداشت میں محفوظ کر لیں۔ اس دوران میں ان کے مضامین مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ یہ کتاب انھیں مقالات و تصاویر کا مجموعہ ہے۔ اس میں عام حالات بیان کرنے کے ساتھ کہیں کہیں قحط کے اسباب و علل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر چند وہ مصیبت باشندگان بنگال کے سروں سے ٹل چکی ہے لیکن اس کی یاد اب بھی دردناک ہے اور دردناک رہے گی۔ اگر اس کتاب کا مقصد جیسا کہ بیان بھی کیا گیا ہے، یہ ہے کہ لوگ متاثر ہو کر اتحاد عمل کی صورت پیدا کریں تاکہ ایسے حادثات کی بازگشت ممکن نہ ہو تو کہنا پڑتا ہے کہ اس کی قیمت باعتبار لاگت ایک روپے سے زیادہ نہ ہونی چاہئے تھی۔ اس کے برعکس ۱۰۸ صفحات کے تین روپے وصول کرنا ظاہر کرتا ہے کہ سماجی فلاح و بہبود کی بجائے ذاتی مفاد پیش نظر ہے۔ گویا بنگال کا قحط مصنفہ اور ناشر دونوں کے لئے نفع بخش ثابت ہوا۔ وہی مثل ہوئی کہ کسی کا گھر جلے اور کوئی ہاتھ تاپے۔

روح تبسم

مصنف ظریف الملک حضرت ظریف دہلوی - ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو کھاری باؤلی دہلی - ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۸۴ صفحات - مجلد - قیمت دو روپے۔ اس دور رنج و محن میں جبکہ بہت سے روح فرسا سیاسی اور معاشی حالات کے ماتحت زندگی اجیرن اور وبال جان ہو گئی ہے، لطف و مزاح کی باتیں دل بہلانے کے لئے بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ پھر اگر وہ باتیں کلام موزوں کی صورت میں جلوہ گر ہوں تو کیا کہنے۔ لہذا ظریف صاحب کے مزاحیہ کلام کا یہ مجموعہ برمحل ہونے کے باعث ایک ادبی اور روحانی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ ان غزلوں، نظموں اور رباعیوں وغیرہ میں بعض اشعار اتنے قہقہہ انگیز ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ انسان بھی ہنسی ضبط کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عہد جدید کے خاص موضوعات مثلاً جنگ اور راشننگ وغیرہ پر ان کا کلام اور بھی زیادہ مزا دیتا ہے۔ یوں تو ہر چیز اپنی جگہ خوب ہے لیکن صنعت الکن (ہکلے پن) کے ماتحت جو غزلیں لکھی ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ تحت اللفظ یا ہکلا کر دونوں طرح پڑھنے پر مصرعے وزن اور بحر میں رہتے ہیں یہ خصوصیت قاآنی کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ چند سلام اور نعت جو بالکل سنجیدہ ہیں اس مجموعے میں شامل نہ کئے جاتے تو اچھا ہوتا۔ شاید "مزامنہ کا بدلنے کے لئے" یہ التزام کیا گیا ہے بحیثیت مجموعی یہ کتاب خوب ہے ——— اسے پڑھ کر بہتوں کو ہنسی آئے گی۔

ف - ح

تانیں

مصنف جناب منوہر متحیر: - ملنے کا پتہ: - کتب خانہ علم و ادب - اردو بازار جامع مسجد دہلی - ۲۰×۳۰/۱۶ کے ۱۴۰ صفحات - مجلد - قیمت پونے دو روپے۔ شاعری جذبات قلب کا آئینہ سمجھی جاتی ہے لیکن یہ قول سب سے زیادہ گیتوں پر صادق آتا ہے کیونکہ تصنع اور بناوٹ سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے۔ پھر جس طرح ڈرامے اسٹیج پر کھیلے جاتے ہیں، اسی طرح گیت گائے جانے کے لئے ہوتے ہیں: ترنم کی

فراوانی ان کو اور چار چاند لگا دیتی ہے۔ منجز صاحب کے یہ گیت پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فن موسیقی سے پوری طرح واقف ہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ ایسے اچھے گیت لکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے گیتوں کا معیار، عام فلمی گیتوں کے معیار سے لاکھ درجہ بلند ہے۔ کاش وہ لوگ جو فلمی دنیا کے اس شعبے میں دخل رکھتے ہیں، تانیں پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ وہ کچے راستہ کی کس منزل میں اب تک خاک اڑاتے رہے ہیں۔ اور آئندہ اس سطح سے ابھر کر آگے بڑھنا ان کے لئے کیونکر ممکن ہے۔ "تانیں" چونسٹھ گیتوں کا مجموعہ ہے جن میں زبردست ترنم کے علاوہ زبان کا لوچ بدرجۂ اتم موجود ہے۔

گھریلو صنعتیں

مصنف:۔ جناب افتخار علی ملک ایم اے، جے ڈی۔
ملنے کا پتہ:۔ اردو بک سٹال۔ بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ ۲۰×۳۰ کے ۲۰۳ صفحات۔ مجلد۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔ ہندوستان کے تقریباً اسی فیصدی باشندے دیہاتوں میں رہتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا مشغلہ کھیتی باڑی ہے لیکن انھیں سال میں کئی مہینے مسلسل اور کبھی بیچ بیچ میں بیکار رہنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ کنبے کے افراد جب بڑھ جائیں اور کاشت کی زمین محدود ہو، تب بھی کچھ لوگ فالتو ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے لئے زراعت سے الگ کوئی اور کام ضروری ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی صنعتوں پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ وہ کام بتائے ہیں جن کو گھریلو طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اچار، مربے، چٹنیاں اور شربت بنانے کے علاوہ مرغیوں، اور شہد کی مکھیوں کی پرورش اور تجارتی اعتبار سے ان کے رکھ رکھاؤ کے طریقے سمجھائے ہیں۔ دیہاتیوں کے علاوہ شہر والے بھی ان صنعتوں کو تجارتی یا ذاتی طور پر اختیار کریں تو یہ کتاب فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔

مست قلندر کا آپ بیتی نمبر

اس خاص نمبر میں بعض حضرات نے اپنی ہی اور بعض نے دوسروں کی آپ بیتیاں لکھی ہیں۔ صرف اول الذکر صورت کا اہتمام کیا جاتا تو کہیں زیادہ مناسب ہوتا۔ کیونکہ دوسروں کی آپ بیتیاں تو ویسے بھی عام اشاعتوں میں شامل ہوتی رہتی ہیں۔ علی عباس صاحب حسینی، جناب ماہر القادری، جناب میرزا ادیب، کوثر صاحب چاندپوری اور ڈاکٹر کاہن سنگھ کے مضامین دلکش ہیں (اکثر حضرات نے دوسروں کی آپ بیتی میں مبالغے سے کام لیا ہے۔) رئیس صاحب امروہوی کا اسم گرامی بھی لائق ذکر ہے۔ جو نصف درجن مضامین نظم و نثر کے ساتھ اس رسالہ کے اجارہ دار بن کر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ ایکٹرسوں کی گھسی گھسائی تصویریں اور مختلف اشتہاروں نے بھی اس خاص نمبر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ۔

دفتر رسالہ "مست قلندر" لاہور سے طلب کیجئے

مسٹر عبدالقادر مصنف "لاشوں کا شہر" کی تازہ تصانیف

"وادیٔ قاف" (۱۲؍) اور "راہبہ" (۱۲؍)

مسٹر عبدالقادر اس دور کی ممتاز اور صاحب طرز افسانہ نگار ہیں۔ آپ کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "لاشوں کا شہر" اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے باعث غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ "وادیٔ قاف" اور "راہبہ" آپ کے افسانوں کے تازہ مجموعے ہیں۔ جن میں فن، زبان اور بیان کی خوبیاں جا بجا اجاگر ہیں نیز تفنن طبع، مناظر فطرت کی صحیح ترجمانی اور مشاہدات و تجربات کے عنصر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

دیگر تصانیف

"صدائے جرس" (۱۲؍) اور "لاشوں کا شہر" (۱۲؍) جو پر اسرار و ہیبت ناک افسانوں پر مشتمل ہیں۔ نیز جذبات کی عکاسی اور زندگی کے بعض حقائق کی نقاب کشائی کرتی ہیں۔

ناشر

اردو بک اسٹال بیرون لوہاری دروازہ لاہور

آئندہ اشاعت کے چند متوقع مضامین

۱:۔ تبرکات .... حضرت آسی لکھنوی (مرحوم)...
۲:۔ آسی لکھنوی .... جناب سید اظہار حیدر
۳:۔ ہندوستان کی مشترک تہذیب (۲) ڈاکٹر سید عابد حسین ......
۴:۔ چنگی کا صدر (روسی افسانہ)........ جناب بشیر الدین ....
۵:۔ نادر شاہ کا آخری غیور سپاہی پروفیسر آغا اشہر لکھنوی...
.......(ڈرامہ) (۲)......................
۶:۔ ایک نہ بھولنے والی رات........ ادیب الملک خواجہ محمد شفیع
.........(افسانہ)...........................
۷:۔ اردو اور سائنس .... ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ......
۸:۔ برطانیہ اور نئے شہروں کی تعمیر. جناب فتح چند کپور.........
۹:۔ ہنسی (افسانہ).............. محترمہ زہرا انور لباش.....
۱۰:۔ جاپان اتحادی تسلط کے ایک سال بعد جناب ہر لال گپتا.....
۱۱:۔ دو غزلیں................ جناب اختر شیرانی .....
۱۲:۔ سوڈان .... سردار امانت سنگھ......

ایٹم بم ۔ سمندر کی تہ میں

بکینی کے مقام پر دوسرا ایٹم بم پھٹنے کے بعد دھوئیں کے ایسے بہت سے غبار اٹھے تھے۔

شدید دھماکے سے پیدا ہونے والے آبشار۔

ALLAMA IQBAL LIBRARY
118732

نرخنامۂ مطبوعات ادارۂ متحدہ

			چندہ سالانہ	فی کاپی
النفیر	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
شیپور	(فارسی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آہنگ	(فارسی انگریزی)	(سہ ماہی)	چار روپیہ	ایک روپیہ
العرب	(عربی)	(ماہوار)	بارہ روپیہ	ایک روپیہ
آجکل	(اردو)	(پندرہ روزہ)	نو روپیہ	چھ آنہ
آجکل	(ہندی)	(ماہوار)	چار روپیہ آٹھ آنہ	چھ آنہ
نو نہال	(اردو)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
ھے ڈے	(انگریزی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
فارین ریویو	(انگریزی)	(ماہوار)	چار روپیہ	آٹھ آنہ
اون ورڈ	(انگریزی)	(ماہوار)	چھ روپیہ	آٹھ آنہ
انڈیا	(انگریزی - چینی)	(سہ ماہی)	تین روپیہ	چار آنہ
پرسپیکٹو	(انگریزی)	(سہ ماہی)	چھ روپیہ	ایک روپیہ آٹھ آنہ
دنیا	(انگریزی - فارسی)	(ماہوار)	تین روپیہ	چار آنہ
	(اردو - ہندی)			
	(پشتو - روسی)			
	(برمی - رومن اردو)			
انڈیا ۱۹۴۵	(انگریزی)	(سالانہ)		ایک روپیہ آٹھ آنہ
انڈیا ٹریڈ بلیٹن	(انگریزی)	(پندرہ روزہ)	تین روپیہ	دو آنہ

J & K UNIVERSITY LIB.
Acc No. 118732
Date 17.12.75

انڈین اسٹڈیز (انگریزی) کے

کل پرچے کتابی صورت میں - ایک سو اسی صفحات - دو نقشے - کپڑے کی جلد - قیمت دو روپیہ (بہت تھوڑی کاپیاں باقی رہ گئی ہیں) -

«میزان نیوز لیٹر» (بزبان انگریزی) فرمائش آنے پر بھیجی جاسکتی ہے (محصول ڈاک معاف) -

خاص رعایت «عربی - انگریزی جملے» نوے صفحات - گتے کی جلد - قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ - کپڑے کی جلد قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ -

«فارسی انگریزی جملے» کپڑے کی جلد - قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ (دونوں کتابوں پر محصول ڈاک معاف) -

منیجر ادارہ مطبوعات متحدہ - پوسٹ بکس نمبر ۱۶۶ - دہلی